ساقی

سیاسی رسالہ "نئی زندگی" کا اگست ۴۵ء نمبر

"سان فرانسسکو" نمبر ہوگا

جسمیں

موجودہ انقلاب انگیز بین الاقوامی سیاسیات، سان فرانسسکو میں دول عالم کے اتحاد و تنظیم اور اُس کی نوعیت و اہمیت پر ملک کے بہترین مفکرین اور رہنماؤں کے مضامین ہونگے۔

اگر آپ دُنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور اسکی پیچیدہ سیاسیات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپکیلئے اس نمبر کا مطالعہ ضروری ہے

جو

اُردو کے سیاسی ادب میں بالکل ایک نئی چیز ہوگی اور اسمیں اس قدر ٹھوس مواد اور اعداد و شمار ہونگے جو آپ کو کہیں بھی ایک جگہ فراہم کئے ہوئے نہیں مل سکتے!

کاغذ کے کنٹرول کے سبب چونکہ اشاعت محدود ہوگی اس لئے فوراً ۱؎ (مع محصولڈاک) روانہ فرما کر اپنی کاپی محفوظ کرالیں مستقل خریداروں کو مفت نذر ہوگا۔ ایجنٹ حضرات جلد از جلد کاپیوں کی تعداد سے دفتر کو مطلع کردیں اور مشتہرین حضرات اپنی جگہ محفوظ کرالیں۔

سالانہ چندہ ۶ روپے — قیمت سان فرانسسکو نمبر ایک روپیہ

مینیجر رسالہ نئی زندگی (دیش چندر باسو روڈ) الہ آباد (یو۔ پی)

ادارہ

شاہد احمد دہلوی

محمد حسن عسکری

سالانہ چندہ چھ روپئے

ششماہی ساڑھے تین روپے

قیمت فی پرچہ سوا روپیہ

جُرعات

جلد ۳۲ | ساقی، دہلی (افسانہ نمبر) بابتہ جولائی ۱۹۴۵ء | نمبر (۱)

میراجی

باتیں

ہر چیز کسی کی پسند کی نہیں ہوتی۔ یہ سن کر میرے ایک دوست کہنے لگے، دُنیا کے قیام کے لئے یہ ضروری تھی۔ غالباً دُنیا سے ان کا مطلب زندگی تھا۔ میں نے اُن کی بات کو نہ سمجھا۔ اور مجھے خیال آیا کہ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر چیز ہر کسی کے لئے بنی ہی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود انسانوں کی اکثریت عمر بھر اس بات کی خواہاں رہتی ہے کہ کاش فلاں بات ہوتی، کاش فلاں چیز ہمیں مل جاتی۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ کسی خاص مصلحت سے اُس کی قدرت نے انھیں بعض اور چیزیں دے رکھی ہیں۔ [illegible] جو نہیں حاصل ہو سکیں، انھیں حاصل ہو جاتیں تو نہ صرف کسی اور کے پاس کچھ نہ بچتا بلکہ اُن کے پاس ہر چیز ہوتی۔ تو سب کچھ ہوتا اور وہ پھر محسوس ہی نہ کر سکتے کہ اس ایک ہی حاصل کی ہوئی چیز سے پہلے ان کے پاس کیا کچھ تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے ہی انھیں اس کا احساس تھا کہ یہ بھی ہے، یہ بھی ہے اور یہ بھی ہے۔ صرف وہی نہیں۔ اور اب ہر چیز کے حصول کے بعد صرف یہی احساس ہوگا کہ سب کچھ ہے، چاہے کچھ بھی نہ ہو۔ نتیجہ یہ سمجھ میں آیا کہ کسی حد تک یافت اور کسی حد تک محرومی ہی اصل زندگی ہے۔ اور دُنیا کے قیام کیلئے ضروری۔ اسی لئے ہر چیز ہر کسی کیلئے نہیں ہے۔ اور اسی لئے ہر چیز ہر کسی کو پسند نہیں۔ بات سے بات نکلتی ہے اس لئے یہاں پہنچ کر یہ خیال آیا کہ معلوم نہیں آپ کو یہ بات پسند ہو یا ناپسند۔ مجھے تو پسند ہے اور میرا خیال ہے کہ میرے دوست کو بھی پسند ہوگی کیونکہ ان کا بھی یہی خیال ہے اور میرا بھی یہی خیال اور ظاہر ہے کہ اپنا خیال کسے پسند نہیں ہوتا۔ یہیں سے ایک اور بات نکلی۔ یعنی اپنی باتیں، اپنی چیزیں انسان کی پسندیدہ چیزیں ہیں اور دوسروں کی باتیں، دوسروں کی چیزیں ناپسندیدہ چیزیں۔ لیکن پھر جو چیزیں حاصل نہ ہوں، جو باتیں اپنی نہ ہوں ان کی طرف رغبت کے کیا معنی؟ کیا اسی میں محبت اور نفرت کا نفسیاتی حل موجود ہے۔ یہ اب آپ سوچئے۔ ہم نے جو کچھ سوچا تھا کہہ دیا۔

پڑھی لکھی ہو یا ان پڑھ، حسین ہو یا گوارا، ہوشیار ہو یا سیدھی سادی۔ بیوی ہو، اور اچھی ہو، اب یہ کہ اچھی بیوی کیسی ہوتی ہے، تو سب سے پہلے یہ سن لیجئے کہ اچھی بیوی اسے کہتے ہیں جو نہ صرف بُری نہ ہو بلکہ اچھی بھی ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کا خاوند بھی اچھا ہو۔ کیونکہ چاہے ایک بیوی اچھی ہو اس کے باوجود اس کا خاوند بُرا ہو یا کم سے کم اچھا نہ ہو تو اب ممکن ہے کہ وہ بھی اچھی نہ رہے بلکہ بُری بن جائے۔ یہ تو ہوئیں دو باتیں۔ ان کے علاوہ وہ تمام باتیں بھی ایک بیوی میں ہونی چاہئیں جو ایک اچھی بیوی میں ہوتی ہیں۔ کم سے کم ارد گرد والوں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ کتنی بڑی اچھی بیوی ہے۔ چاہے اس کا خاوند اور اس کے بچے اور اس کے ہمسائے جان کر [illegible] یہ رائے نہ رکھتے ہوں بلکہ اس سے مختلف رائے رکھتے ہوں۔ اب شاید آپ یہ سوچیں کہ اچھے ہمسائے اور اچھی اولاد یا اچھا خاوند کسے کہہ سکتے ہیں۔ تو اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہی کہی جا سکتی ہے کہ جب تک آپ اچھی بیوی کے بارے میں آخری اور قطعی فیصلے پر نہ پہنچ لیں دوسروں کے بارے میں سوچنا بیکار یا کم سے کم فالتو ہے۔ انہی باتوں کے بعد امید ہے کہ آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ اچھی بیوی کسے کہتے ہیں۔

ایک خواہش۔ جی چاہتا ہے کہ بازاری گویّا بن کر گلی گلی بستی بستی گھومتا پھروں۔ یونہی زندگی گذار دوں، ایک عورت اور ایک ہارمونیم کی پیٹی پہلو میں لئے۔ اور دُنیا یہ سمجھے کہ وہ ہمارا تماشہ دیکھ کر رحم کھاتی ہے۔ اور میں یہ سمجھوں کہ میں تماشائی ہوں۔ یہ ہارمونیم کی پیٹی، یہ میرے ساتھ گاتی ہوئی عورت، یہ ہجوم سب تماشا ہے، یہ سب دُنیا ہے، اور میں ہی دُنیا کا تماشہ دیکھ رہا ہوں۔ کبھی گاتے ہوئے، کبھی ہارمونیم کی پیٹی کو بجاتے ہوئے۔ اور کبھی خلوت کے لمحوں میں اس عورت سے "تبادلۂ خیال" کرتے ہوئے جو حقیقتاً مجھے کبھی نہیں مل سکتی۔ لیکن بظاہر ہارمونیم کی پیٹی کے مقابلہ میں میری بیوی بن کر شعر کو مکمل کر دیتی ہے۔

پھیلاتے ہوئے کہ زندگی تشنگی کا دوسرا نام ہے۔ کبھی یہ نام اولاد کی تربیت بن جاتا ہے، کبھی ماں باپ کی خدمت اور کبھی بیوی کے حقوق پورے کرتے ہوئے۔ چاہے بیٹی کو حاصل کرے چاہے بیٹی کو حاصل نہ کرے۔ اپنی ذات، اپنے نفس، اپنی خودی کی تسکین کے انتظام کو منزل تک پہنچاتے جاتا ہے۔

. . .

وہی سراب جو پہلے تھے اب بھی ہیں۔ فرق شاید اتنا ہو کہ وہ پہلے سراب ہوش مندی کی حالت میں دیکھے تھے اور یہ سراب — کم سے کم ہوشمندی کی حالت میں نہیں دیکھے ہیں وجہ اگر پوچھئے تو ایک سے زائد کئی ہیں۔ لیکن کیا کسی وجہ سے آج تک کسی نے تسکین پائی ہے۔ چاہے وہ سبب یا دلیل ہو، یا چہرہ یا صرف وجہ شاہی — اتنی بات کے بعد علوم کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ لیکن دنیا بھر کے مختلف علوم میں سے کون سے علم کو سبب دلیل یا چہرہ یا صرف چہرہ شاہی سمجھا جائے۔ اس کا جواب دینے کیلئے کم سے کم اس وقت میرے پاس نہ کوئی سبب ہے نہ دلیل، نہ کوئی صورت دکھائی دیتی ہے۔ رہا چہرۂ شاہی تو وہ صرف ایک دھوکا ہے جو کبھی انسان خود کھاتا ہے۔ اور کبھی دوسرے کو دیتا ہے۔

. . .

خواہشیں — جو کچھ میں ہوں وہی ہوں، اگر چاہوں بھی تو نہ کچھ اور ہونا چاہتا ہوں نہ ہوسکتا ہوں۔

اگر میں . . — یا — اگر مجھے . .

اچانک، میں کسی دن، (آج سے)، بالکل بدل جاؤں

(مصرع، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن)

کئی سال ہوئے بچوں کے رسالہ "نونہال" میں ایک نظم پڑھی تھی (ہفتہ وار تھا یہ رسالہ) نظم کا عنوان تھا "کاش میں پھول ہوتا" شروع کے دو ایک مصرعے یاد ہیں　کوئی پھول میں ہوتا ننھا سا، کسی باغ میں کاش لگا ہوتا۔ مری بو سے مہکتا سارا چمن، مرا پھولوں میں رنگ　ہوتا۔ بھول گیا۔ مگر یہ یاد ہے کہ دوسرے ہفتہ کے پرچے میں ایک اور نظم چھپی تھی جس کا عنوان تھا "پھول نہیں بلبل ہوتا"، اس دوسری نظم کا کوئی بھی مصرع یاد نہیں — خواہش — کاش! اس نظم کا بھی ایک آدھ مصرع یاد ہوتا۔ خیر، امانت کا شعر ہے . . . جی ہاں، امانت لکھنوی ہی

جنھوں نے اندر سبھا لکھی ہے — کاش اردو کا پہلا ڈراما یعنی اکیلا میں لکھتا، خیر چھوڑیئے۔ شعر ہے ؎ جی چاہتا ہے صانع قدرت پہ ہوں نثار، بت کو بٹھا کے سامنے یادِ خدا کروں — یہاں تک لکھ ڈالا، اب آگے کیا لکھوں؟ کوئی نئی بات ہی سوجھتی۔ (یہ بھی ایک خواہش ہے) —

جو یوں ہوتا تو یوں ہوتا — اگر یہ کرتے تو یہ ہوتا کاش یہ ہوتا۔ یہ کیوں نہیں ہوتا — یہ کیسے ہو — نہ کہ ہوگا — کہیں شرط و جزا ہے۔ کہیں ماضی تمنائی، کہیں حرف استفہام سب قواعدِ زبان کی مختلف صورتیں ہیں، افسوس انسان کی خواہشیں بھی اس کے اپنے بنائے ہوئے اصولوں کی پابند ہیں۔ ایسا کیوں نہیں کہ بغیر قاعدہ زبان کے، بغیر کسی لفظ کی محتاجی کے خواہش کا اظہار ہو جائے۔ تکمیل چاہے ہو نہ ہو — (میں بتا دوں ایسا کیوں نہیں؟ بتاؤں؟ سنیئے۔ اس لئے کہ — اس لئے کہ — ابھی تو خیال آیا تھا اور ابھی کھو گیا۔ سننے والا کہتا ہے ع بہانا ہی بھی کیا بھول جانے کی خو ہے۔ سننے والا تو یہ کہتا ہے مان لیا، مگر میں کہتا ہوں — اگر میری یادداشت پختہ ہوتی، کاش میرا حافظہ اچھا ہوتا تو مجھے آج بھی یاد ہوتا کہ آج تک کیا کچھ چاہا۔)

اور آخر میں مرزا غالب ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

لیکن غالب نے یہ بھی تو کہا ہے کہ "سنتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا"، تو پھر میر نے کیا قصور کیا ہے، میر بھی سہی تو لیجئے (لیکن پہلا مصرع یاد نہیں، دوسرا حاضر ہے) ع

میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ —

. . .

ایک صاحب اٹھے۔ انھوں نے کسی سماجی انجمن کی بنیاد ڈالی، لیکن یہ انسان کا ابتدائی زمانہ تھا، ایک دوسرے کو نام دھرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اس لئے اس انجمن کا بھی کوئی نام نہ تھا۔ ایک اور اٹھے۔ ان کا نام قابیل تھا۔ ان کے مسلک کو قائم رکھنے کیلئے لوگوں نے کئی — بلکہ ہزارہا صدیوں کے بعد جاسوسی ناول ایجاد کیا۔ اس کے بعد ایک اور حضرت کے دل میں یہ سمائی کہ یہ دنیا دار المحن ہے۔ یہ دنیا قابیل اور اس کی سماج

کی انجمن ہے۔ شاید اسی لئے انھوں نے کوئی کلب انجمن قائم نہ کی۔ بلکہ ان کے بعد ان کی بجائے ان کے پیرووں نے خودکشی کی انجمن قائم کی۔ حالانکہ جن کی یاد میں یہ انجمن قائم کی گئی ان حضرات نے خودکشی نہیں کی تھی بلکہ ان کا خون کیا گیا تھا۔ اور قاتل نے قتل کے بعد خودکشی کر لی تھی۔ کیونکہ اس وقت تک پھانسی پانے والوں کی کوئی انجمن قائم نہ ہوئی تھی۔ خیر۔ اب بعض ایسے لوگ پیدا ہو گئے جن کے دماغوں میں کسی انجمن کے قائم کرنے کا خیال ہی نہ آسکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے دوسروں کے خیالوں کو اپنایا اور اپنا کام شروع کیا۔ اور "حال چوروں کی انجمن" قائم کی۔ جب اس دنیا میں چور پیدا ہو گئے تو ہر طرف انجمنیں ہی انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ کوئی پہلے کی طرح سماجی، کوئی خودکشی کی انجمن، اور کوئی چوروں کی انجمن قائم کرنے میں کبھی ناکام اور کبھی کامیاب ہوتا رہا۔ اور پھر قاتلوں، تاجروں، عاشقوں، سمندروں، مسافروں درختوں، پتھروں، کیڑے مکوڑوں نہ جانے کن کن کی انجمنیں قائم ہوتی اور مٹتی رہیں۔ ایک نہ ہی تو وہ تھی مجہولوں کی انجمن۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ ـــــ لیکن وہ تو بدلتی انجمن ہوتے ہیں۔ انھیں انجمن قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہر انجمن ان کی ملکہ ہر خلوت بھی ان کی اور بجا طور پر۔ لیکن اس انجمن آرائی کے سلسلہ میں غالب پر بھی غور کیجئے کہ کہا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

میر تقی کا ایک شعر ہے۔ باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا، کہتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا ــــ یہ شعر پڑھنے کے بعد یا کبھی اکیلے یا لوگوں میں بیٹھے ہوئے یاد آنے کے بعد میں اکثر یہ کہا کرتا ہوں کہ میراجی بات کرتے شرم تو نہ آئی ہوگی۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات یہ تو محض کہاوت سہی لیکن تو جسمانی طور پر چھوٹا منہ رکھتے ہوئے بھی بعض دفعہ بڑی بات کیوں کہہ دیتا ہے۔ اور میرا مخاطب یعنی میراجی مجھ سے کہتا ہے کہ جب قدرت نے تمہارے کہنے کے مطابق میرا منہ ہی چھوٹا سا بنایا ہے یعنی ایسا منہ جو کسی کو دکھانے کے قابل نہیں یا جسے کوئی اچھی طرح دیکھ ہی نہیں پاتا تو پھر میں بڑی بات کہہ کر ہی کیوں نہ دل کا بخار نکالوں اور اس کے ساتھ ہی ایک طرف پردے کے پیچھے سے کبھی سیاہ اور کبھی حاشیۂ سرخ میں لپٹی لپٹائی ایک عورت برآمد ہوتی ہے لیکن نقاب کو یہ سمجھ کر کہ وہ چاند پر چھا جانے والا بادل ہے اٹھا دیتی ہے شاید یہ حرکت، یہ نقاب کشائی اس لئے کہ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے۔ اور دل ہی دل میں ـــ مصرع "آسودہ ہوتا" سیکھنے میں بہر خوں کیسے ہم مصوری"! لیکن ہمارا نہ تھی کہاں تھک کر چوک گیا۔ یہ نہ بتایا کہ اگر ہمیں ہی کو مصوری سے شوق ہو تو کیا طریق کار اختیار کیا جائے لیکن عادت کو بطور اصرار کرتے ہوئے میراجی ایک ملنے والی کے دھندلکے میں حسن اخلاق کے بل پر اس نازنین سے کہتا ہے کہ آپکو مصوری کا شوق ہے تو کبھی میراجی کی بھی تصویر بنایئے۔ اور وہ کہتی ہے کہ یہ ایک ناممکن فعل ہے۔ میراجی کی تصویر کیونکر بناؤں؟ مجھ سے ملنے والا اپنے اخلاق کو اور بڑھاتے ہوئے پوچھتا ہے کہ اس میں کیا مشکل ہے۔ اور وہ کہتی ہے کہ ایسی باریک پنسل (یا شاید قلم) کہاں سے لاؤں جس سے ان ہونٹوں کو صفحۂ قرطاس پر لایا جا سکے۔ اور حسن اخلاق یہاں پر ایک تبسم بنکر ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ؎ ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ، ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے۔ لیکن میراجی ختم نہیں ہوتا کیونکہ اس واقعے کے بعد جب میراجی سے ایک دفعہ گہری ملاقات ہوئی تو اس نے کہا سب باتیں ہی باتیں ہیں، زندگی، محبت، موت، سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ پھر راقم الحروف کو خیال آیا کہ انجیل مقدس کے پرانے عہد نامہ میں ٹھیک لکھا ہے کہ اس دنیا میں ہر بات خود پرستی و خودکامی ہے۔ خود پرستی و خودکامی ـــ اگرچہ یہ فلسفہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس سے شعر کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ اور خیال آتا ہے کہ کہیں انسانی فطرت کی اسی کمزوری کے باعث تو میر تقی نے یہ باتوں والا شعر نہیں کہا۔ اور شاید اسی کمزوری کی وجہ سے یہ لوگوں کو یاد بھی رہتا ہے۔ اور وہ یہ سمجھے ہوں کہ جس طرح اپنا گھر ہے اپنا گھر، اسی طرح اپنی باتیں اپنی باتیں ہیں بلکہ "باتیں" ہیں!

لیکن یہ باتیں جو میں کہتا ہوں یہ تو (شاید) آپکی باتیں ہیں کیونکہ باوجودیکہ میں یہ باتیں کرتا ہوں یہ آپ تک پہنچتی ہیں اور آپ تک پہنچکر ختم ہو جاتی ہیں یا شاید ختم نہیں ہوتیں آپکو یاد رہتی ہوں لیکن اگر یہ میری باتیں ہوں تو مجھی تک رہتیں بلکہ مجھے یاد رہتیں۔

اور اب خیال آیا کہ کیا وہ بات باقی ہے جو کسی دوسرے تک پہنچ جائے۔ اور پہنچکر ختم ہو جائے۔ یا وہ بات جو اپنے ہی تک رہکر اور باقی رہے۔

...اس کی اصلیت یہ ہے کہ بہت سی ایسی باتیں جنھیں دوسرے ناول نگار حذف کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے، ان دونوں کے یہاں حذف ہو جاتی ہیں۔ اور انھیں اپنے تصور کی مدد سے سمجھنا پڑتا ہے۔ جن چیزوں کے بیان میں غیر فطرت نگار بھی صفحے کے صفحے لگاتے ہیں یہ دونوں ایک چوتھائی جملے میں بیان کر دیتے ہیں۔ [illegible] مثال دیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ایک طرف تو فطرت نگاری کا ایک بہترین نمونہ رکھیے یعنی زولا کے ناول Germinal کے وہ باب جن میں اس نے Maheu خاندان کا بیان کیا ہے۔ یہ مجھے تسلیم ہے کہ فطرت نگاری ادب کے ایسے کامیاب نمونے بڑی مشکل سے پیش کرسکتی ہے (فلابیئر کو میں فطرت نگاروں میں شامل نہیں کر رہا ہوں۔ فلابیئر اتنا بڑا فنکار ہے کہ اسے صرف فطرت نگار کہنا اس کی توہین ہے)۔ زولا کے یہ دو باب اور کچھ نہیں تو تیس صفحے کے تو ضرور ہوں گے۔ اس کے مقابلے میں Ulysses کے وہ چار صفحے ہیں جن میں Daedalus خاندان کا ذکر ہے۔ یہ چار صفحے مسلسل بھی نہیں ہیں بلکہ جگہ جگہ سے ٹکڑے جمع کرنے پڑیں گے۔ واقعیت، جامعیت اور اثر انگیزی کسی چیز میں بھی جوئس کا یہ مختصر بیان زولا سے گھٹ کے نہیں ہے، بلکہ ادبی اعتبار سے کہیں بڑھ کے ہے بلکہ پھر زولا کے اس حصے میں بھی بہت کم جزئیات ایسی ملیں گی جنھیں غیر ضروری کہا جا سکے۔ لیکن اگر کوئی جوئس سے کم تفصیلات کے ساتھ یہی چیز اسی اثر اور ادبیت کے ساتھ بیان کر کے دکھا دے تو آج سے اسی کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا۔

جب ہم کسی مصنف کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ شخص "تفصیلات" استعمال کرتا ہے تو زبردستی فرض کر لیتے ہیں کہ وہ بھی ان چیزوں کو تفصیلات ہی سمجھتا تھا۔ کیا خبر ہے کہ اس کے لیے یہ تفصیلات "فروع" نہیں بلکہ "اصل" ہوں؟ ممکن ہے کہ یہ چیزیں اس کے لیے "جزئیات" نہیں بلکہ "کل" ہوں! "ایک وحدت" کے مختلف اجزا نہیں بلکہ بذات خود مختلف وحدتیں ہوں جو ایک جگہ مل کر کسی عظیم تر وحدت کی تشکیل کرتی ہیں ۔۔۔ یا ایسی وحدتیں ہوں جن کے ذریعے فنکار کسی عظیم وحدت، کسی عظیم حقیقت کی تلاش کر رہا ہے۔ شاید اس نے کسی ایک حقیقت کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ۔۔۔ بلکہ اس کے پاس صرف یہ ٹکڑے ہی ہیں جن کی مدد سے اسے ایک حقیقت مرتب کرنی ہے۔ ایک حقیقت کو تخلیق کرنا ہے، ایک نئی کائنات بنانی ہے۔ شاید اس نے اپنے ایک پورے تجربے کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا، بلکہ ہر ذرہ ایک مکمل تجربہ ہے، اور وہ ذرّوں کو ایک جگہ رکھ کر دیکھ رہا ہے کہ ان میں کونسی چیز مشترک ہے، یا ان چھوٹے چھوٹے تجربوں کی مدد سے کونسا جامع تجربہ مرتب ہوتا ہے جس کے اندر یہ سب تجربے سما جائیں ۔۔۔ مختصراً وہ کوئی جمالیاتی اور اخلاقی اصول ہے جو ان بکھرے ہوئے تجربوں کو ایک وحدت کی شکل دے دے۔ یہ نام نہاد "جزئیات نگاری" سیدھا سادا تصوف کا اصول ہے۔ اجزا میں اور اجزا کے ذریعے کل کی تلاش۔ تخیل دو طریقوں پر کام کرتا ہے۔ بعض لوگوں کو کل کا عرفان پہلے ہوتا ہے، کل اور اجزا کا رشتہ بعد میں نظر آتا ہے۔ اس کے برخلاف بعض اجزا کے ذریعے کل تک پہنچتے ہیں۔ ان دونوں طریقوں میں سے ترجیح کسی کو بھی حاصل نہیں، ناک چاہے یوں پکڑ [illegible] دوں۔ بلکہ غالباً یہ دونوں طریقے ایک ساتھ عمل کرتے ہیں۔ بہرحال، کچھ لوگوں کو اجزا کی ہفت خواں طے کرنے میں ہی مزا ملتا ہے!

اور نقاد اسے "جزئیات نگاری" کہتے ہیں! شعر مرا بمدرسہ کہ برد۔

غالباً اب اس کے بعد پروست اور جوئس پر تفصیل سے بحث کرنے کی تو ضرورت باقی نہیں رہی۔ ——

امتیاز علی

افعی

واقعی عجیب تھی وہ رات !!

عجیب تھی وہ رات ! میں اپنے کمرے میں پہونچ کر رقص کی زرتار پوشاک بھی تو نہ بدل سکی ۔

ہجوم خیالات اور وفور انبساط نے مجھے بوکھلا رکھا تھا ۔

بات یہ تھی کہ میں پوری شام اور آدھی رات تک ملکہ قمر کی حضوری میں محفل رقص میں مشغول رہی ۔ اور جب واپسی کا وقت ہوا تو ملکہ قمر کے مشیر امور خصوصی اعلیٰ مرتبت نواب مجوس نے از راہ شفقت میرے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیرا ۔ اور مجھے اپنی منقش اور سات گھوڑوں والی نقرئی رنگ کی گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھا کر محل تک پہنچایا ۔ یہ میرے لئے اتنا بڑا اعزاز تھا جس کا مجھ جیسی معمولی حیثیت کی لڑکی خواب بھی نہ دیکھ سکتی تھی ۔ کہاں وہ اور کہاں میں !!! ــــــ چہ نسبت خاک را با عالم پاک ! ان کی اس شفقت نے مجھے اپنے باپ مرحوم کی محبت یاد دلادی !

میں رقص کی پوشاک کا زریں پٹکا کمر سے باندھے اپنے سنہرے لمبے لمبے گیسو شانوں پر پریشاں کئے باغ کی لمبی وہ بیکی میں کھڑی مسرت نشاط اور احساس غرور سے ہلکے ہلکے ہانپ رہی تھی ۔

واقعی عجیب تھی وہ رات !

اور وہ گفتگو اب تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی جو اثنائے راہ میں سات گھوڑوں والی گاڑی کے مخملیں اور گداز گدیں پر بیٹھ کر ہمارے درمیان ہوئی تھی !

نواب مجوس فرمانے لگے "بچی ! اتنی خاموش کیوں ہو ؟"

اور میں نواب مجوس کی شاندار آواز سے مرعوب ہوگئی میری دادی مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ ہر مرد کی آواز سے مرعوب ہو جانا اور احتیاطاً مجوب رہنا نسوانی شائستگی کی نشانی سمجھی جاتی ہے ۔ اس لئے میں آہستہ لہجہ میں ڈرتے ڈرتے اتنا بولی : "یہ میرے لئے اعزاز ہے "

وہ ہنس پڑے "تم اس انداز سے بات کرتی ہو جیسے مجرم اپنے حاکم سے "

مگر اس میں میری کیا خطا تھی ۔ میں پرانی تعلیم و تربیت کی سنگین دیواروں اور قدیم تہذیب و ثقافت کی آہنی زنجیروں کے درمیان پلی اور بڑھی تھی ۔ شائستگی یہی سمجھی جاتی تھی کہ بزرگوں کے آگے کبھی بھولے سے اُف نہ کی جائے ۔ بلکہ بات بات پر بلاوجہ اور بلا ضرورت احساس جرم کا ہونا اور گونگوں کی طرح چپ سادھے رہنا ہی معیار شرافت تھا ۔ چنانچہ میں نے ان کے اس مذاق کا بھی کوئی جواب نہ دیا ۔ بلکہ پاگلوں اور شریف لڑکیوں کی طرح ایک کونہ میں دبکی دبکائی بیٹھ گئی ۔

باہر سڑکوں پر چاندنی کھلی ہوئی تھی ۔ اور سات گھوڑوں والی منقش اور نقرئی رنگ کی گاڑی بہار کے سبک رفتار جھونکے کی طرح اُڑی چلی جا رہی تھی ۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی جل پری کی بارات پرستان کی طرف کوچ کر رہی ہو ۔

آخر صد احد اکر کے نواب مجوس کی عظیم الشان گاڑی احاطہ میں داخل ہوئی ۔ انھوں نے پھر سے اپنا ایک ہاتھ میرے بالوں پر پھیرا ۔ اور خدا حافظ کہتے ہی یکلخت مڑ گئے ۔

جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو وارفتگی اور وفور مسرت کے باعث نیند مجھ سے کوسوں دور تھی ۔ اور ایسے خوشگوار حادثے کے بعد نیند آتی بھی کیونکر ؟ بقول خاتون روحی کے نیند پر لگا کر اڑ گئی تھی ۔ عجیب تھی وہ رات !

اور میں اب تک سوچتی ہوں کہ اگر وہ رات میری زندگی میں نہ آئی ہوتی تو میرے خواب زندگی کی تعبیر کچھ اور ہی ہوتی !

یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب میں ملکہ قمر کے محل قصر الماسین میں ملکہ کی خاص الخاص مشاطہ کی اعلیٰ خدمات پر مامور تھی ۔ یہ اعزاز مجھے کبھی نصیب نہ ہوتا اگر میرے والد ملکہ کے وفادار افسروں میں سے نہ ہوتے ۔ والد کے انتقال کے بعد میں ملکہ ہی کے سایہ عاطفت میں پرورش پاتی رہی ۔ اس زمانہ میں میں

بمشکل سولہ سال کی ہوں گی۔ اور وُسا کے سرد وگرم جھونکوں سے ایسی ہی ناآشنا جیسے کسی بلبل ہزار داستان کا نونہال چمن کی خزاں سے۔

محل کے متعلقین اور ملازمین کے آگے میں بحیثیت جوان ہو گئی تھی۔ اس لئے تقریباً سبھی مجھ پر مہربان تھے۔ اور اپنا حق سمجھتے تھے کہ ہر قدم پر مجھے تہذیب و شائستگی کا سبق پڑھائیں۔ چونکہ مجھے بحیثیت اعلیٰ منتظم کے ملکہ کے خاص کمروں میں اکثر بے تکلفانہ آنے جانے کی اجازت تھی۔ اس لئے مجھے ہر وقت تہذیب و شائستگی کی کڑی بندشوں میں جکڑا رہنا پڑتا۔

یکلخت کسی اندرونی ایوان میں گھڑیال نے موسیقی آمیز سُروں میں تین بجائے۔ رات کی زیادتی کے احساس سے گھبرا کر میں دریچے سے ہٹ ہی رہی تھی کہ محلسرا کی مسجد کے پاس کھجور کے درخت کے سائے میں مجھے خاتون روحی چہل قدمی کرتی ہوئی نظر آئیں۔ رات کے اس حصے میں انھیں پائیں باغ میں دیکھ کر مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ کیونکہ وہ عام طور پر نصف شب کے بعد تاروں کو دیکھنے کیلئے اپنی خوابگاہ سے صحنِ باغ میں نکل آیا کرتی تھیں۔ یہ اُن کا قدیم مشغلہ تھا۔

"ستارہ!" انھوں نے مجھے آواز دی۔

"خاتون روحی!" میں نے دروازے میں سے تیزی سے نکلتے ہوئے جواب دیا۔ وہ کھجور کے سبز زر افشاں پتوں کے نیچے ایک خیال پرست مخمور روح کی طرح چُپ چاپ ایستادہ تھیں۔ غالباً وہ رات کی خیال انگیز خاموشی اور رومان انگیز تاریکی سے بحد متاثر ہوا کرتی تھیں۔

"تم اس لباس میں ہو! رات گذر چکی ہے۔" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

خاتون روحی سے نہ معلوم کیوں میری کافی بے تکلفی تھی اس لئے میں نے ہمّت کر کے کہا: "بات یہ ہے میں، میں انتہائی خوش ہوں خاتون روحی!"

خاتون روحی کا مغرور مجسمہ اب تک ساکت تھا۔ اب یکلخت اس میں لرزش سی محسوس ہوئی۔ مجھے بہ غور دیکھ کر بولیں: "تو گویا باغ سے واپسی میں تمہاری ملاقات فیروز سے ہوئی؟"

"نہیں خاتون روحی فیروز سے نہیں۔ وہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

فیروز میرا ہمزاد بھائی تھا۔ اور فوج میں ابھی ابھی [illegible] کی حیثیت سے شامل ہوا تھا۔ وہ فوجی وردی میں کس قدر بھلا اور قابلِ پرستش معلوم ہوتا تھا! چمنِ زندگی کا اگر کوئی پھول مجھے محبوب تھا تو وہی تھا۔ وہ اس کی نیلی نیلی نشیلی آنکھیں!! مگر طلائی منقش چھتوں کے نیچے جہاں قدیم زمانہ کا پرانا اعلیٰ تمدن اپنے بلا پناہ شعلے ہر طرف پھیلائے ہوئے ہو محبت ایسی آزاد نہیں ہوتی جیسی آسمانوں کے نیلے تلے ہوتی ہے۔ محلسرا کی زندگی میں میری چھپی ڈھکی محبت سے اگر کوئی آگاہ تھا تو وہ صرف خاتون روحی کی واحد ذات تھی۔ مجھے ان پر اس سلسلہ میں اعتماد اس لئے تھا کہ وہ محبت کی لاتعداد کہانیوں کی مصنفہ تھیں۔ چنانچہ محبت کو عین آئینِ فطرت اور انصاف کی نظر سے دیکھنے کی عادی تھیں۔

"پھر و فورِ مسرت سے کھلی کیوں جا رہی ہو؟" انھوں نے سوال کیا۔

میں نے اپنی عزت افزائی کی کہانی انھیں سنائی جسے سن کر وہ پہلے تو چُپ رہیں پھر کہنے لگیں: "واقعی! بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور تم نواب مجوس کے مرتبے کو خوب جانتی ہو۔ میں خود انھیں انکی علم دوستی اور ان کے اعلیٰ درجہ کے کتب خانہ کی وجہ سے بیحد پسند کرتی ہوں۔ کیا اچھا ہوتا وہ تمھیں اپنی بیٹی بنا لیتے۔"

"مگر خاتون روحی!" میں نے ذرا لرز کر کہا: "ملکہ تم نہیں گی تو بخش دینگی نا؟ کیونکہ نواب مجوس کے ساتھ میرا تنہا گاڑی میں آنا ———!"

"بیشک بہت بڑا جرم ہے۔ یہی نا ...؟" خاتون روحی نے حقارت سے شانے سکوڑے اور فقرہ مکمل کیا: "ہماری سوسائٹی انسان سے انسان کو خوفزدہ کرنا سکھاتی ہے۔ اگر تم ایک کتے کے ساتھ تنہا چلی آتیں تو ملکہ شاید اسکا کچھ خیال نہ کرتیں۔ مگر ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ تنہائی میں ملنا اتنا سنگین جرم ہے کہ تمہارے خیال میں ملکہ اسکو بخش نہ سکینگی کیا آئین رواج اور تہذیب ہے۔ جاؤ سو رہو۔ اور یاد رکھو تمہیں کسی بات میں خوفزدہ [illegible] نہ ہونا چاہئے۔ شب بخیر۔ میں صبح کی اذان تک اس کھجور کے نیچے ٹہل کر ستاروں کو دیکھونگی۔ اور تم خواب میں فیروز کو۔" یہ کہہ کر وہ ذرا سا مسکرائیں اور پھر تاریکی میں گم ہو گئیں۔

دوبارہ جب میں اپنے کمرہ میں داخل ہوئی تو نواب مجوس نے جو عزت مجھے بخشی تھی اس کا احساس گھٹ رہا اور فیروز نے محبت کی جو دولت مجھے عطا کر رکھی تھی اس کا نشہ [illegible] تھا اور میں بے چین تھی۔ کہ کب صبح ہو اور کب فیروز کو میں اپنی عزت افزائی کی [illegible] سناؤں۔ اسی کشمکش میں محلسرا کی مسجد سے اذان [illegible]

ہنری جیمز اور قصہ گوئی

ہنری جیمز کے نزدیک کسی ناول پر اپنے مفروضہ اصول چسپاں کرنا اس کی قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کا قطعی غلط طریقہ ہے۔ البتہ ایک اصول ہمارے پاس ضرور موجود ہے جس کی مدد سے پہلے ہی اچھائی بُرائی کا حکم لگایا جا سکتا ہے، اور وہ اصول ہے ناول میں دلچسپی کے عنصر کی موجودگی۔ مصنف کی تمام ذمہ داری کا انحصار اسی ایک اصول پر ہے۔ اب اس مقصد کے حصول کے ذرائع لاتعداد ہو سکتے ہیں، انسان کے مزاج کی طرح بے شمار۔ جس قدر مخصوص اور انفرادی دماغ کی کیفیات کا اظہار کیا جائے گا اسی قدر ناول کامیاب ہوگا۔ ناول کی جامع تعریف یہ ہے کہ ناول زندگی کا ایک شخصی اور براہ راست تاثر ہے، چنانچہ ناول کی قیمت میں کمی بیشی کا دارومدار شدتِ تاثر کی مناسبت سے ہے۔ لیکن جب تک احساس اور اظہار کی آزادی میسر نہ ہو، تاثر میں شدت پیدا کرنا ناممکن ہے۔ اور اس طرح ناول کی قیمت بھی صفر ہی رہ جاتی ہے۔ اگر ہم پہلے سے ہی خود پر فرض قرار دے لیں کہ ہمیں فلاں ہئیت اور لہجہ اختیار کرنا ہے تو گویا ہم خود اپنی آزادی پر، جس کے ہم بڑے مشتاق اور متلاشی ہیں، پابندیاں عائد کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تصنیف ختم کر چکنے کے بعد اس کی ہیئت کو پرکھنا چاہیئے۔ اس کے اوصاف یا نقائص کا تخمینہ کرنے کیلئے اسی کے اندر سے اصول ملیں گے۔ ایک مصور اور ناول نگار میں یہی فرق ہے کہ ایک کے فن میں بڑی حد تک اصول وضوابط ہیں جن کی رہنمائی میں اُسے چلنا پڑتا ہے، دوسرا ایک حد تک اپنی مرضی کے مطابق کام کر سکتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ فنِ قصہ گوئی کے بھی اصول اور قواعد مقرر ہونے چاہئیں، مثلاً یہ کہ ناولسٹ کو اپنے تجربہ کے بل پر لکھنا چاہیئے، اس کے کردار حقیقی ہوں جو واقعی دُنیا میں ہمیں چلتے پھرتے نظر آ سکیں، ایک عورت کو جس کی عمر دیہات کی پُرسکون فضا میں گذری ہو، فوجی زندگی کے بیان سے احتراز لازم ہے، اپنے کردار کو [illegible] یا گفتگو کے ذریعے واضح کرنا برا طریقہ ہے۔ اور ان کو [illegible] بیان کرنا اس سے بھی بدتر انداز ہے۔ اصل کہانی ہی [illegible] ہے، یہ اور اسی قسم کے بہت سے اصول ہو سکتے ہیں

جن میں سے چند موقع کے لحاظ سے یقیناً درست ہیں۔ لیکن اصل میں ان احکام کی ــــ جو بڑے دلکش اور بڑے مبہم ہیں ــــ قدر و قیمت اس مفہوم پر منحصر ہے جو ان سے منسوب کیا جائے۔ کسی شخص کی نظر میں وہی کردار حقیقی قرار پائیں گے جو اسے کسی طرح متاثر کریں۔ اور بھلے معلوم ہوں، لیکن اب آ پڑتا ہے سوال واقعیت کی حد کے تعین کا۔ ڈوڈن کو تکزدٹ اور مکابر میں حقیقت تو ہے مگر بے انتہا لطیف۔ اس حقیقت میں مصنف کے تخیل نے ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ آپ اسے حقیقت کے ایک نمونے کے طور پر پیش کرتے ہوئے پس وپیش کریں گے۔ یہ توجیہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جب تک آپ کے ذہن میں حقیقت کا مفہوم نہ موجود ہو آپ کوئی معقول قسم کا ناول نہیں لکھ سکتے۔ لیکن آپ کے ذہن میں اس مفہوم کو بیدار کرنے کا گُر دریافت کرنا بھی ایک مہم سر کرنا ہے۔ فطرتِ انسانی بے پایاں ہے، حقیقت کی صورتیں اَن گنت ہو سکتی ہیں۔ اس بات پر زور دینا کہ اپنے مشاہدے اور تجربے کی مدد سے لکھنا چاہیئے بیک وقت دل خوش کُن اور غیر تشفی بخش امر ہے۔ آپ کا مقصد کس قسم کے تجربے سے ہے، اور اس تجربے کے حدود کیا ہیں؟ تجربہ نہ تو کبھی محدود ہوتا ہے اور نہ مکمل۔ تجربہ نام ہے بے پایاں ادراک کا! یہ گویا ایک قسم کا بہت بڑا، مہین مہین تاروں کا بنا ہوا مکڑی کا جالا ہے جو شعور کے حجرے میں معلق ہے، اور ہوا کی مدد سے لائے ہوئے ذرے اس جالے کے تانے بانے میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ تجربہ دماغ کی فضا کو کہتے ہیں! اگر دماغ قوتِ متخیلہ کا مالک ہو تو وہ ذرا ذرا سی اشاروں سے بھی کام لے سکتا ہے، اور ہوا کی تھرتھراہٹ تک کو کچھ کا کچھ بنا سکتا ہے۔ ایک ذہین انگریز ناول نگار عورت نے مجھے ایک دفعہ بتایا کہ فرانسیسی پروٹسٹنٹ نوجوانوں کا ایک خاکہ اس نے اپنی کسی کہانی میں پیش کیا تھا جس کی بڑی تعریف و توصیف کی گئی۔ حالانکہ معاملہ صرف اتنا تھا کہ پیرس میں ایک زینے پر سے گزرتا ہوئے ایک کھلے دروازے میں سے اس نے چند پروٹسٹنٹ نوجوانوں کو اس نے میز کے گرد بیٹھے دیکھا تھا۔ اس ایک جھلک

پوری تصویر تیار کر کے رکھ دی۔ وہ ایک لمحہ جب اس نے نوجوانوں کو دیکھا، تجربہ کا لمحہ تھا۔ اس نے براہ راست ایک ذاتی تاثر حاصل کر لیا۔ اور خوب اچھی طرح سمجھ گئی کہ نوجوانی کیا چیز ہے، ٹریننگ ہونا کسے کہتے ہیں۔ اور فرانسیسی ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ اب اس نے اپنے ان تمام خیالات کو ایک ٹھوس شکل میں منتقل کر کے صنعت پیدا کر لی۔ علاوہ ازیں اس میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ بچ بھر چیز کو گزوں میں پھیلا سکے۔ اس چیز میں قوت متخیلہ کی کارگزاری بھی شامل ہے۔ دیکھی ہوئی اشیا کی مدد سے بے دیکھی چیزوں کو بھانپ لینے کی قدرت، چیزوں کے الجھاؤ کا سراغ لگا لینا، ایک جز سے کل کی حقیقت کو پہنچ جانا، اور عام زندگی سے ایسی درجہ واقفیت کہ ہر مخصوص گوشے کا علم بھی رہے۔ — تقریباً انہی تمام ذرائع سے تجربہ ترکیب پاتا ہے، اور یہ سب دیہات اور شہر ہر جگہ اور تعلیم کے ہر دور میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ اگر تجربہ تاثرات پر مشتمل ہے تو اسی بات کو صاف طور پر ہم یوں کہیں گے کہ تاثرات ہی تجربہ ہیں۔

ناول کی معراج یہ ہے کہ وہ حقیقی معلوم ہو، اور اس میں ہر چیز بھیس رکھتی ہو۔ ناول کے دوسرے اوصاف مذکورہ بالا خوبی کے تابع ہیں۔ اگر اس وصف سے ناول بے بہرہ رہ جائے گا تو اس کی دوسری خوبیوں پر پانی پھر جائے گا۔ اور اگر فرض کیا وہ باقی بھی رہیں تو مصنف نے جس کامیابی سے زندگی کی نقاب کشائی کی ہے وہی کامیابی داد کی مستحق ہے۔

ناول نگار سے دوسرا مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ اس کے کرداروں کا خاکہ واضح ہو۔ اس سلسلے میں ایسا مقصد حاصل کرنے کیلئے تفصیل بیان کی مدد لغو معلوم ہوتی ہے؛ اسی طرح بیان سے قطع نظر کر کے یا مکالمہ کو پس پشت ڈال کر" واقعات کا سہارا لینا" بھی لغو ہے۔ لیکن ناول نگار کو یہ بیان اور مکالمے، اور واقعات اور بیان کے عجیب و غریب اختلافات لایعنی معلوم ہوں گے۔ میرے ذہن میں اس وقت کوئی ایسا قابل ذکر ناول نہیں ہے جس کی عبارت بیانیہ نہ ہو، یا جس کے مکالمہ کے کسی حصے میں مصنف کا انداز بیانیہ نہ رہا ہو، اسی طرح ایک عمدہ ناول میں میں نے کسی قسم کی خفیف سی حقیقت ایسی نہیں دیکھی جس میں 'واقعہ' کا دخل نہ ہو۔

ناول ایک جیتی جاگتی چیز ہے؛ جسم حیوانی کی طرح واحد اور مسلسل: ناول جس قدر جاندار ہوگا اس کے تمام اجزا اسی قدر مربوط ہوں گے۔ ہر حصہ دوسرے تمام اجزا کی کیفیات کا تھوڑا بہت حامل ضرور ہوگا۔

کرداری ناول اور واقعاتی ناول میں لوگ امتیازی خط کھینچا کرتے ہیں، لیکن حد بندی اسی قدر بے سر و پا ہے جتنا ناول اور افسانے میں حد فاصل قائم کرنا۔ جس طرح برے ناول بھی ہوتے ہیں اور اچھے بھی اسی طرح بری اور اچھی تصویریں بھی ہوتی ہیں، اور یہی وہ حد بندی ہے جس کے کچھ معنی ہیں۔ میرے دماغ میں جس طرح کرداری تصویر کا کوئی تصور نہیں آ سکتا، اسی طرح کرداری ناول کا تصور میرے لئے ناممکن ہے۔ کردار کیا ہے؟ واقعات کا تعین! اور واقعات کسے کہتے ہیں؟ کردار کی تشریح اور توضیح کو! ایک عورت اپنے ایک ہاتھ سے میز کا سہارا لئے کھڑی ہے اور آپ کی جانب کسی انداز سے دیکھ رہی ہے؛ یہ محض ایک واقعہ ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ کردار کی خصوصیت کا اظہار بھی اس سے ہوتا ہے۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ اس میں آپ کو کرداری خصوصیت نظر نہیں آتی، بالکل بجا، لیکن خود فن کار کے پاس دلائل موجود ہیں۔ اور اس کی دلی خواہش ہے کہ آپ اس کا منشا صحیح طور پر سمجھ جائیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ اور اسی قسم کے دوسرے واقعات بڑے خلاف معمول اور حیرت انگیز ہیں، ایسی ایسی باتوں کو غیر معمولی بنا دینا فن کار کے ہنر پر موقوف ہے۔ یہ کہنا کہ بعض واقعات دوسروں سے یقیناً اہم ہوتے ہیں بے حد معمولی بات ہے۔ اسے دہرانے کی احتیاط سے بچنے کیلئے مجھے ان اہم تر واقعات کی تائید میں یہ کہہ دینا چاہیے کہ ناول کی کوئی تقسیم اگر میری سمجھ میں آتی ہے تو وہ یہ ہے! وہ ناول جن میں جان ہے، اور وہ ناول جو بے جان ہیں۔

ناول اور رومان، واقعاتی ناول اور کرداری ناول — یہ بے ڈھنگی تقسیم پڑھنے والے نقادوں نے اپنی سہولت کیلئے کی ہے، لیکن مصنف کی نظر میں یہ تقسیم قطعی بے حقیقت ہوتی ہے۔ اسی زمرے میں ایک اور بے اصل حد بندی کی گئی ہے اور وہ ہے "موجودہ انگریزی ناول"۔ کسی شخص کے متعلق یہ تصور کرنا کہ وہ جدید یا قدیم انگریزی ناول لکھ رہا ہے ناممکن ہے۔ فرانسیسیوں کے ان حصوں نے قصہ گوئی کے مسئلہ کو غیر معمولی حد تک حل کیا ہے، ناول کا صرف ایک ہی نام ہے۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر رومان نگار کو ناول نگار کے دوش بدوش کیوں نہیں کھڑا کیا جا سکتا، دونوں کے یہاں فن کاری کا معیار یکساں ہے۔ ہمیں فن کار کو موضوع، خیال

[illegible] انتخاب کی آزادی دے دینی چاہیئے [illegible] کے بعد ہماری
[illegible] ان کے استعمال پر ہونی چاہیئے۔ اگر فن کار سے ہمیں
[illegible] ہمدردی ہے تو ہمیں اس کی بھی آزادی دے دینی چاہیئے
[illegible] سودمند تربیت کا معتدبہ حصہ قیاس سے حاصل کرتا ہے اور
[illegible] سب سے دلچسپ تجربات ہمیں چند معمولی اشیا کے
[illegible] میں پنہاں ہوتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کسی ادبی تخلیق کے متعلق پسند اور
ناپسند کا حکم ہمیشہ اسی طرح قائم و برقرار رہے گا اور بے حد
ترقی یافتہ تکنیک اس قدیم اور بنیادی کسوٹی کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔
ہم کسی فن کار کا اس وقت تک ایمانداری سے جائزہ نہیں لے سکتے،
جب تک اُسے موضوع کی مکمل آزادی نہ دے دیں۔ آپ اس کے
موضوعات پر معترض ہیں، اگر وہ آپ سے اُلٹا سوال کر بیٹھے کہ
اگر یہ موضوعات اختیار نہیں کر سکتا تو آپ ہی میرے لئے موضوعات
تجویز کر دیں، تو آپ اپنے ہی جال میں پکڑے جائیں گے۔ جب
تک آپ اس کے نقطۂ آغاز کو قبول نہ کر لیں تب تک اسے جانچنے
کا حق آپ کو نہیں پہنچتا۔ ہاں، آپ اس کے جال کو قطعی ناپسند
کر سکتے ہیں، اسے بالکل فرسودہ اور بحث طلب قرار دے سکتے ہیں اور
یہ سوچ کر کہ مصنف دلچسپی کا رشتہ قائم رکھنے میں ناکام رہا ہے اس
سے دست بردار ہو سکتے ہیں، مگر آپ اس پر رائے زنی نہیں
کر سکتے۔ ایسی صورت میں آپ کو اس کی طرف سے بالکل غافل ہو جانا
پڑے گا۔ یہ مطالبہ کرنا کہ آدمی کو فلاں چیز پسند یا ناپسند کرنی چاہیئے،
مہمل بات ہے۔ 'پسند' اپنی جگہ خود پیدا کر لیتی ہے؛ اس کی تہ
میں ہمیشہ ایک مقصد پوشیدہ ہوتا ہے، اور وہ مقصد ہے تجربہ۔
جس طرح لوگ زندگی کا شعور رکھتے ہیں اسی طرح ادب کا بھی
احساس انہیں ہوگا کیونکہ ادب زندگی سے بے حد قریبی تعلق رکھتا
ہے۔ ناول کی بحث میں ادب اور زندگی کی اس قرابت کو کبھی فراموش
نہ کرنا چاہیئے۔ بہت سے لوگ ناول کو مصنوعی اور غیر حقیقی
سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایسی کاریگری کی پیداوار ہے جس
کا کام ہمارے گرد کی اشیا کو تبدیل کرنے کے بعد ترتیب دیگر
[illegible] ایک قالب میں ڈھال دینا ہے۔ اُن کا ادب کو محض چند
[illegible] قرار دے دینا بالکل بے بنیاد بات ہے
[illegible] زندگی کے ننگ، حرکت اور بے ترتیب ترنم
[illegible] زندگی کو دوبارہ ترتیب دے کر پیش

نہیں کیا جاتا تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے حقیقت کو پا لیا ہے۔

ادب لازمی طور پر پسند کا نام ہے جس کا پہلا مقصد مثالی اور
ہمہ گیر ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ادب میں ناخوشگوار
اور بد صورت چیزوں کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ لوگ ادب کے
حلقے میں ایسی حاجز اور بندشیں یا اُفتادہ چیزیں لٹکاتے ہیں کہ اس کو جہالت
کی حدود سے تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی شخص
کسی عظیم الشان تصنیف کا مالک نہیں ہو سکتا جب تک اُسے ہر قسم
کی مکمل آزادی کا احساس نہ ہو۔ اس حالت میں یہ بات پایۂ ثبوت کو
پہنچ جاتی ہے کہ ادب کے حدود میں پوری زندگی، تمام احساسات
مشاہدات اور تصورات، سب یکساں طور پر شامل ہیں۔ ہر قسم کے
تجربے کا نام ادب ہے۔ جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ ادب کو زندگی
کے معصوم پہلو سے ذرہ برابر واسطہ نہیں ہے ان کیلئے یہ جواب کافی
ہے۔ اصل میں ان لوگوں کی کیفیت کچھ اس قسم کی ہے کہ یہ ادب
کے مقدس سینے پر بھی ایسے سائن بورڈ گاڑ دینا چاہتے ہیں جیسے
عام پارکوں میں نظر آتے ہیں — "گھاس پر چلنا منع ہے! پھول
توڑنے کی ممانعت ہے! کتوں کو اپنے ساتھ اندر لانے کی اجازت
نہیں ہے! غروب آفتاب کے بعد یہاں ٹھہرنا ممنوع ہے"! مصنف
ناول لکھتے وقت اگر اپنی پسند اور مذاق کے آگے کسی چیز کو حائل
ہو جانے دیگا تو اس کی ناکامیابی یقینی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں
وہ اپنی آزادی سے کوئی مصرف نہیں لیتا۔ لیکن وہ اپنی پسند
کے مطابق آگے بڑھے گا تو سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوگا کہ ان
سائن بورڈوں کی لغویت ظاہر ہو جائیگی۔ اپنی پسند سے کام کرنے
کا مطلب یہ بھی ہے کہ مصنف میں کاریگری کا مادہ بھی موجود ہے۔
ابھی میں نے اس کاریگری کا ذکر ذرا بُری طرح کیا تھا، اس کا
مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اسے قصہ گوئی کیلئے بالکل بے سود سمجھتا
ہوں؛ مگر ہاں میں اسے ثانوی حیثیت دیتا ہوں، میرے نزدیک
سب سے پہلی ضرورت صحیح طور پر تاثرات حاصل کرنے کی صلاحیت
ہے۔

میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ آیا ناول کا کوئی حصہ ایسا ہوتا ہے
جسے کہانی کہتے ہیں، اور ایک دوسرا حصہ بھی ہوتا ہے جو کہانی
نہیں ہوتا۔ 'اصل کہانی' میں ہی ناول کا موضوع، خیال، نقطۂ
سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ یہ بات قیاس سے باہر ہے کہ کچھ لوگ
اس پر زور دیں کہ ناول بغیر موضوع کے محض فن ہو۔ لیکن سوال یہ ہے

ہستہ کچھ تو ہوگا جس کے سلسلے میں فن کو کام میں لایا جائے۔ یہ بات ہر شخص قبول کرے گا۔ کہانی اور ناول یا اصل خیال اور ہیئت میں وہ نسبت ہے جو سوئی اور تاگے میں۔ میں نے سنا تک نہیں کہ درزیوں کی کسی انجمن نے کبھی تاگے کو بغیر سوئی کے، یا سوئی کو بغیر تاگے کے استعمال کرنے کی تحریک پیش کی ہو۔ کچھ لوگ ایک اور عجیب بات کہتے سنے گئے ہیں کہ زندگی کی کچھ چیزوں پر تو کہانی کی بنیاد قائم کی جا سکتی ہے، اور کچھ اس قابل نہیں ہوتیں، صرف یہ کہ کچھ باتیں ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں، اور کچھ نہیں کرسکتیں، مگر اس شخص کو میں بڑا ہوشیار سمجھوں گا جو ایسا اصول وضع کر دے جس کی مدد سے ہم آسانی سے پہچان لیں کہ کونسی چیز کہانی بن سکتی ہے اور کونسی نہیں۔ کم سے کم میں تو کسی ایسے قاعدے کا تصور تک نہیں کرسکتا جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ زندگی میں کروڑوں چیزیں ہیں جن میں ہر ایک ناول کیلئے مناسب موضوع ہے اور بلاشبہ اس اصول کو جو یہ حکم لگاتا ہو کہ ایک چیز کو استعمال کرنا جائز ہے اور دوسری کا استعمال ناجائز، ایک لمحہ سے زیادہ ثبات نہیں۔ اصنافِ ادب میں سب سے زیادہ شاندار صنف مجھے ناول نظر آتا ہے۔ سٹیونسن کا Treasure Island اور ایک فرانسیسی کا لکھا ہوا قصہ، دونوں میں نے ابھی ساتھ ساتھ پڑھے ہیں۔ اسٹیونسن کے ناول میں قتل و خون، ہیبت ناک جزیرے، حیرت انگیز واقعات مدفون اشرفیوں اور لوگوں کے بال بال بچ جانے کے بیانات ہیں۔ دوسرا قصہ یوں ہے کہ ایک چھوٹی سی فرانسیسی لڑکی پیرس میں ایک نفیس مکان میں رہتی ہے۔ اس سے کوئی شخص شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، اور اس کے احساسات اس قدر مجروح ہو جاتے ہیں کہ اسی میں اس کی جان تلف ہو جاتی ہے۔ میرے نزدیک اسٹیونسن کا ناول زیادہ دلکش ہے۔ اور اس کا سبب میں یہ قرار دیتا ہوں کہ جو بات پیش کرنی تھی اس میں مصنف نے حیرت انگیز طور پر کامیابی حاصل کی ہے۔ دوسرے مصنف کی تنقید ہوائی کرنے سے میں مجبور ہوں، وجہ یہ کہ قصہ کا اصل مدعا ایک بچے کے اخلاقی شعور کے ارتقا کا چربہ اتارنا تھا، لیکن مصنف اپنا منشا پورا کرنے سے افسوسناک حد تک قاصر رہا ہے۔ مجھے دونوں تصنیفات میں یکساں طور پر ناول کی خصوصیات نظر آتی ہیں اور کہانی کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اسپین کے سمندر کے جزائر زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ اسی طرح ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ایک [illegible] شعور بھی زندگی کا ویسا ہی حصہ ہے۔

ناول کی بحث میں ایک اور سوال خاص اہمیت رکھتا [illegible] یعنی ناول کا شعوری اخلاقی مقصد۔ اس بحث میں مبہم [illegible] ہو جانے کا بڑا خطرہ ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کو اس کی وضاحت کر دینی چاہئے کہ آپ اخلاق سے کیا مراد لیتے ہیں۔ اس کے بعد میں آپ سے یہ سوال پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی تصویر (ناول ایک تصویر ہی ہوتا ہے) اخلاقی یا غیر اخلاقی بھی ہو سکتی ہے؟ آپ ایک اخلاقی تصویر یا ایک اخلاقی مجسمہ تیار کرنا چاہتے ہیں، بتائیے آپ کس طرح اپنا مقصد پورا کر سکیں گے؟ ہمارے سامنے اس وقت قصہ گوئی کے فن کا مبحث ہے۔ اخلاقی مسئلوں کو اس سے دور کا بھی لگاؤ نہیں، پھر آپ ان دونوں کو گڈ مڈ کر دینے پر کیوں مصر ہیں؟

البتہ ایک مقام ایسا ہے جہاں اخلاق اور ادبی حیثیتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ مقام یہ صرف یہ حقیقت ہے کہ مصنف کی دماغی کیفیت کی سب سے بڑی خصوصیت ہوتی ہے۔ مصنف میں جس قدر فہم و فراست ہوگی اسی مناسبت سے ناول میں حسن اور حقیقت پیدا ہو جائیگی۔ اگر ناول ان عناصر پر مشتمل ہو تو میری رائے میں اس کے لئے یہی مقصد بہت کافی ہے۔ کسی سطحی دماغ رکھنے والے شخص کیلئے کوئی عمدہ ناول وجود میں لانا قطعی ممکن نہیں۔"

انقلابے چند

(۱)

ہر آدمی کے ذہن میں سائنسوں کی دھن ہی — نہ سائنسوں سے لے غرض نہ معتدی نہ منتہی
نقد نظرت سب نے کی سائنس خود آگہی
ترا انہیں تو اس لیے ہم اعتراف گمرہی — حق آگہی کی آرزو متاعِ دیں رہی سہی
سکوت نا پسند کیا نہیں لسانِ الٰہی
اک انقلاب یہ بھی ہے — یہ انقلاب ہی سہی

(۲)

مرید سجدہ ریز ہوں! عجب طرح کا ہے ادب — نہ یہ روایتِ عجم نہ یہ روایتِ عرب
پرستش اپنے پیر کی سمجھ رہے ہیں فرض سب
رواں دواں صنمکدہ خود آ رہا ہے بے طلب — رواں دواں صنمکدہ شکست پائی ہم کراب
صنم جس سے زندہ ہو معبد ہے عمل وہی
اک انقلاب یہ بھی ہے — یہ انقلاب ہی سہی

(۳)

سکھا رہا ہے مولوی کہ یوں کرو مقابلہ — اسی کی درسگاہ میں "فسادِ لکھنؤ" پلا
مناظرہ مکابرہ مجادلہ مقاتلہ
ترقیوں پہ اس کا ہے شعور سور و لولہ — نہ فتنہ گر ہے اسکو ہم کریں دلیل بر ملا
اٹھائیں نازِ مولوی یہ تاب ہی نہیں رہی
اک انقلاب یہ بھی ہے — یہ انقلاب ہی سہی

(۴)

ستمگروں کی زلف ہائے مشک بیز خم بہ خم — امیر فرد کیلئے سرور حیدر دمبدم
امیر کی بہشت کا میں رازداں ہوں بیش و کم
زمانہ بھر کے حسن کو سمیٹتا ہے یہ ارم — یہی ارم سقر ہے چلیں کچھ ایسی چال ہم
نگاہ نکتہ فہم میں روش ہے اسکی رو بہی
اک انقلاب یہ بھی ہے — یہ انقلاب ہی سہی

(۵)

دکان سودخوار کی بنی ہوئی ہے کانِ زر — نگاہ سودخوار کی نہ کیوں ہو "کیمیا اثر"
نہ کان زر دکان ہے نہ کیمیا اثر نظر
لہو ہمارا چوس کر دکاں میں جو ہے جلوہ گر — کریں ہم اس کا لال منہ طمانچے مار مار کر
ہنسی کی بات ہے مگر بڑی جچی تلی کہی
اک انقلاب یہ بھی ہے — یہ انقلاب ہی سہی

علی منظور

ایم اسلم

دوشیزہ کی فریاد

گڑھی یا "ہو" جانگلیوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ قریب ہی دریا بہتا تھا۔ اور کنارا اسا اونچا تھا کہ گاؤں میں پانی آنے کا کوئی احتمال نہ تھا۔ کھیتی باڑی کا انحصار بارش پر تھا۔ بارش اگرچہ ان علاقوں میں کم ہی ہوتی تاہم سیلاب کے باعث گھاس اچھا پیدا ہوتا مویشیوں کے لئے چراگاہیں تھیں جہاں نہ پٹواری کی دھونس نہ پولیس والے کا ڈر۔ کھلی فضائیں۔ زندگی تصنع اور بناوٹ سے پاک۔ مرد جفا کش اور وجیہہ، عورتیں پیکرِ حُسن مردوں کے چوڑے چکلے سینے۔ گٹھے ہوئے بدن کھلی پیشانیاں، گردن پر گرتے ہوئے پٹے۔ اور پٹوں میں سیدھی مانگ۔ آنکھوں میں کاجل۔ بشرے سے جوانمردی اور مردانگی کے تاثر۔

عورتوں کے نکھرے نکھرے رنگ۔ ترچھے ترچھے خدوخال آنکھوں میں سرمہ کی ہلکی سی تحریر اور وہ بھی مشاطۂ قدرت کی لگائی ہوئی کسے ہوئے بدن سڈول اور نازک جسم سہرے رنگ۔ اور سیاہ چمکدار بال کمر سے نیچے بہتے ہوئے چہروں پر سرخی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آواز میں لوچ، رفتار میں لچک، کنواریوں کے کانوں میں بُندے۔ گلے میں ہیکل۔ سہاگنوں کی سُرخ چوڑیاں۔ کانوں میں بالیاں۔ ہاتھوں میں کنگن گاؤدم بانہوں میں۔ رنگ برنگ کی چوڑیاں مشتوں کے سروں پر چاندی کے پھول کالے کُرتے اور کالے تہمد۔ سپید دوپٹے۔ جہاں دو چار کھڑی ہو کر باتیں کریں یہی معلوم ہو بلبلیں چہک رہی ہیں۔

اسی گڑھی میں علی محمدؐ جسے سب الی کہتے تھے رہتا تھا۔ اور اسی الی کے پاس ایک بھینس تھی ایسی نادر ایسی خوبصورت کہ بھینسوں کے شوقین دُور دُور سے دیکھنے آتے چھوٹا سا سر ماتھے پر چاند۔ چمکتی ہوئی سیلی آنکھیں۔ مبو بری لیکن نازک تھوتھنی۔ کنڈلدار چمکتے ہوئے سینگ۔ گردن بھاری لیکن گردن سے سینے تک سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ پیٹھ کچھوے کی پیٹھ کی طرح صاف اور پھسلتی ہوئی۔ بھرے ہوئے پٹھے گھٹی ہوئی ٹانگیں، چاروں ٹانگیں ٹخنے سے سُم تک سپید۔ زمین کو چھوتی ہوئی دُم اور دُم بھی ایسی سپید جیسے کالی رات میں کہکشاں چمک رہی ہو۔ کان ایسے کہ گاؤدم جیسے غازیوں کی برچھیاں بشکیزہ کی طرح بھرا ہوا "ہوانہ" لمبے لمبے تھن۔ بدن ایسا تیار کہ مکھی نہ بیٹھ سکے۔ سیاہ چمکتا ہوا رنگ۔ الی کو اپنی بھینس پر بہت ناز تھا اور وہ اسے محبت سے بلّو کہا کرتا اور اسی گاؤں میں نوراں ایک جوان لڑکی تھی جسے الی دل سے چاہتا تھا اور اس سے بیاہ کرنے کی تمنا دل میں لئے بیٹھا تھا۔ نوراں کا باپ بیٹی دینے کو تو تیار تھا لیکن نوراں کے عوض بلّو مانگتا تھا اور بلّو سے جُدا ہونا الی کو گوارا نہ تھا۔ ادھر نوراں کو بھی الی سے محبت تھی۔ جانگلیوں کے اس دلکش رومان کا حل میں پیش کروں گا یہ بس مختصر تھا

ساون کے دن تھے۔ اُودی اُودی اور کالی کالی گھٹائیں جھومتی ہوئی آئیں لیکن گڑھی والوں کو کبھی مغرور اور بددماغ حسینہ کی طرح ترسا ترسا کر گذر جائیں لیکن دریا میں کسی دوشیزہ کے اُٹھتے شباب کی طرح سیلاب آیا ہوا تھا گڑھی کے اکثر جوان لڑکے اور لڑکیاں دریا میں جا کر نہاتے اور تیرتے۔

رات کا وقت تھا اچانک بارش ہونے لگی سونے والے اپنے اپنے بستر سمیٹ کر چھپروں اور کوٹھوں کے نیچے ہو گئے۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلیاں کوندتی تھیں اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور دریا کا پانی کناروں سے اُچھل کر گڑھی کی طرف کسی زبردست غنیم کی طرح یلغار کرتا ہوا بڑھا چلا آ رہا تھا۔ لیکن سونے والوں کو کچھ خبر نہ تھی اور خبر ہوئی بھی تو اس وقت ہوئی جب دریا کی ستم رانیوں سے کئی گھر برباد ہو گئے اور مال مویشی تھانوں سے کھل کر [illegible] اجل ہو گئے رات کے اندھیرے میں جو کچھ ہو سکتا تھا ستم رسیدہ اپنے بچاؤ کے لئے کرتے رہے۔ گاؤں میں جو گھر برباد ہوئے اُن میں الی کا گھر بھی تھا اور ستم پر ستم یہ کہ بلّو کا بھی کچھ پتہ نہ تھا اس صدمے نے الی کو حواس باختہ کر دیا۔ وہ دیوانوں کی [illegible] اور بلّو بلّو پکارتا پھرتا آخر جب دو چار دن [illegible]

[illegible] اور بلّو کا کہیں پتا نشان نہ ملا تو اُنھوں نے ارادہ کیا
[illegible] دریا کے کنارے کنارے بلّو کو تلاش کرے اور جس جگہ دریا
ختم ہوتا ہے وہاں تک جائے۔

گاؤں والوں کو جب الّی کا ارادہ معلوم ہوا تو اُنھوں نے
سمجھایا کہ الّی جس طرح اور مویشی دریا کی رو کے ساتھ بہہ کر
تباہ ہو گئے ہیں تمہاری بھینس بھی اسی طرح کہیں مر کھپ گئی
ہوگی اب تم اُسے کہاں تلاش کرو گے اور کب تک یوں مارے
مارے پھرو گے۔ اب گھر بسانے کا فکر کرو۔ ہم نوراں کے باپ
سے کہہ کر تمہاری شادی کا انتظام کروا دیتے ہیں۔ لیکن الّی
کے دل کو لگی تھی وہ ایک آہ بھر کر بولا۔

دُنیا مجھے پاگل سمجھتی ہے۔
عاقل وہ ہے جو فراقِ محبوب میں دیوانہ ہو۔
پنوں کی تصویر دل کے آئینہ میں کھنچ گئی
سسی کے لئے تپتے ہوئے تھل گلزار بن گئے
دل میں محبت کی آگ فروزاں ہو
تو آگ بھی گلزار بن جاتی ہے۔
دُنیا پاگل ہے۔
وہ محبت کی ریت کیا جانے
محبت کی رمز سوہنی نے سمجھی
اس کی روح چناب کے بھنور میں مہینوال کو ڈھونڈتی ہے۔
محبت کا درس مرزا اور صاحباں سے لے۔
جھنگ سیال کی ہیر چوچک کی لاڈلی۔
رانجھا تخت ہزارے کا سردار
عشق کی راہ میں قربان ہوئے
کونج ساتھی سے بچھڑی
نہ وطن یاد رہا نہ ڈار۔
پنچھی کی فریاد سے
[illegible] اور جنگل روتے ہیں
الّی کی ماں نے شیر کو جنم دیا۔
شیر ہار مانے تو شیر نہیں۔
[illegible] بزدل کے لئے ہے۔
عاشق مر کر زندہ ہوتا ہے۔
[illegible] کا دامن تھاما۔

کشتی ڈوبے یا ترے
اب یار کی مرضی پر ہے۔

عشق کی فریاد اور دلِ کیفِ درد سے آشنا۔ سننے والے
متاثر ہو گئے۔ الّی گاؤں سے کیا نکلا گاؤں میں ماتم بپا ہو گیا۔
جو آنکھ تھی وہ اشکبار تھی اور جو سہاگن تھی وہ سوگوار تھی۔
نوراں بھی اپنے کوٹھے پر کھڑی رو رہی تھی ایک سہیلی نے پاس
آ کر کہا

"نوراں! الّی تو چلا۔ اس سے مل تو لے"
نوراں دوپٹے سے آنکھیں پونچھ کر بولی۔ "مل تو لوں لیکن
دنیا کیا کہے گی۔ الّی کو میری چاہ ہوتی تو کیا مجھ سے ملے بغیر ہی
چلا جاتا"

سہیلی بولی "ملنا ہے تو راستہ میں بتاتی ہوں۔ تو گھڑا
لے کر دریا پر آ۔ میں الّی کو روک لوں گی"

چنانچہ نوراں کی سہیلی اپنی بھینس کو پانی پلانے کے
بہانے گھر سے نکلی اور دریا کی راہ لی۔ الّی ابھی کچھ دور نہیں
گیا تھا۔ وطن وطن ہی ہوتا ہے دس بیس قدم جاتا تو پلٹ کر
پیچھے دیکھ لیتا نوراں کی سہیلی آوازیں دیتی چلی آ رہی تھی۔ الّی
نے آواز سنی تو رُک گیا اور جب وہ پاس آئی تو پوچھا۔

"بہن! تم مجھے بلا رہی تھیں کیا؟"

"ہاں!" نوراں کی سہیلی نے جواب دیا "تمہیں ہی بلا
رہی تھی"

"کیوں؟" الّی نے پوچھا
نوراں کی سہیلی بولی۔

الّی! تھاہ سمندر کی کس نے پائی۔
پانی اور آگ کس کے متر بنے
انساں کے دُکھ کا علاج انسان ہے۔
اسے فرشتوں پر فضیلت ملی۔
موت لکوڑی!
جُدائی کے فکر میں لگی ہے۔
جُدائی ڈالنے والا
ایمان سے محروم
عاقبت سے مایوس
تف ہے اس نار کی جوانی پر

جس کا محبوب امدعا ہو۔
الّی نے سر جھکالیا۔ پھر ایک آہ بھر کر بولا:
بہن! جب قسمت گھاٹے میں آئی
تدبیر جھٹ سے مات کھا گئی۔
بیتے ہوئے پہر
کون واپس دیتا ہے۔
تف ہے انسان کی لاف پر
جسے ایک سانس پر بھروسہ نہیں۔
جس طرح تنکے آندھی کی آغوش میں مجبور
تدبیر تقدیر کے ہاتھوں میں مجبور۔

نوراں کی سہیلی نے کہا: "بھائی الّی! تم کس خیال میں پڑے ہو۔ ایک بے درد مولیشی کے لئے اتنی چنتا۔ نوراں جیسی لڑکی تو اس دھرتی میں اور نہ ہوگی۔ تمہیں اس پر بھی ترس نہیں آتا اسے کس کے سہارے چھوڑ چلے!"

الّی بولا "بہن! خدا تمہیں اس چنتا سے بچائے جو مجھے بےقرار رکھتی ہے۔ میں غریب اور مفلس ہوں۔ نوراں اور نوراں کا باپ آبرودار ہے۔ جس نے بلّو نوراں کو نذر کرنے کو پالی تھی۔ لیکن نوراں کا باپ لالچی تھا۔ نوراں کو مجھ پر ترس آیا اور نہ اس کے باپ کو۔" پھر وہ ایک آہ بھر کر بولا۔

جو گندم دکھائے جو بیچے
ایسے باپ پر بیر دستگیر کی پھٹکار
ریت پر پانی پڑا
نہ وہ زر خیز ہوئی
نہ قطرہ گوہر بنا
بلّو کی شہرت قصائی تک آئی۔
نظر کا تیر!
خنجر کی انی سے خوفناک!
موت انتظار سے اچھی
صبر کا جام کڑوا تھا۔
لیکن
اُمید کے جھوٹے وعدے سے میٹھا نکلا

"لیکن!" نوراں کی سہیلی نے پوچھا "اس میں نوراں غریب کا کیا دوش (قصور)، پگلے! تم جو کس خیال میں وہ غریب تو تمہارے ہی نام کا کلمہ پڑھتی ہے۔ وہ دیکھو (نوراں کی سہیلی نے گاؤں کی طرف سے آنے والے راستے کی طرف اشارہ کرکے کہا) وہ غریب کس پریشان حالی میں چلی آرہی ہے۔"

الّی نوراں کو آتے دیکھ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ نوراں کی سہیلی دس بیس قدم آگے جاکر نوراں سے ملی اور اسے الّی کے پاس لے آئی اور آپ نوراں کی گاگر اٹھا کر دریا پر چلی گئی۔ جب دونوں اکیلے رہ گئے تو نوراں بولی:

"الّی! سنا ہے تم گاؤں چھوڑ چلے۔ کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"جہاں تقدیر لے جائے۔" الّی نے جواب دیا۔ "تم کیوں پوچھتی ہو؟ نہیں مجھ سے کیا!" پھر آسمان کی طرف دیکھ کر بولا:

پیار کا تمبر خود غرضی سے اٹھا
ہاجرہ کے لال نے گردن کٹار کے نیچے رکھ دی۔
ربِّ قدیر کو ادا پسند آئی۔
قربانی کی رسم یادگار رہی۔
حوّا! وفا کی رسم سے ناآشنا تھی
خالق کے حکم سے سرتابی کی
آدم! محبت اور وفا کا پتلا۔
عورت کے پیچھے لگ کر جنت سے نکلا۔
آدم کی نسل پر تباہی آئی۔
تاروں کی قندیلیں ماند پڑ گئیں
مسافر سوزار رہا۔
مکس کی قسمت کی طرح۔
قسمت کا چاند جب گہن میں آجائے
نزدیک کی منزل بھی دور ہوجاتی ہے۔

نوراں نے جواب دیا۔

موسیٰ یار کے جلوے کو آگ سمجھا۔
لیکن تاب نہ لایا۔
کتنا بیقرار دل ہے مرد۔
پہاڑ جل کر خاک ہوگیا
لیکن آدم کا بیٹا پھر بھی زندہ رہا۔
جب سونا اور پیتل[1] مل جائیں

[1] تانبا۔ پیتل۔

آنکھ تمیز نہیں کرتی۔
لیکن جب عشق کی آگ تیز ہوتی ہے
تو جس طرح سنار کی کٹھالی میں
سونا پیتل تانبے سے الگ ہو جاتا ہے
اسی طرح انسان کا جوہر کھلتا ہے۔

آلی بولا:
محبت نہ زبان والے کو دیکھتی ہے نہ بے زبان کو،
بلّو بے زبان سہی۔
بلّو کے دم سے تھاں رشکِ گلستاں تھا
لیکن رہا نہ،
نوراں! زمانے وفادار نہیں ہے۔
اب نہ تھنوں میں تازگی
نہ چراگاہوں میں رونق
دونوں اس طرح اداس
جیسے آلی کا دل
ہری ہری دوب نے سر جھکا لیا
بیریوں نے پتّے پھینک دیے
پیلو سوکھ گئے
اب نہ آجڑی کی بنسری کی آواز میں سوز ہے
نہ بلّو کی ڈکار روح کو تازگی عطا کرتی ہے
جب پنچھی اُڑ جائے
پنجر کی طرف کون دیکھتا ہے۔

نوراں آہ بھر کر بولی:
حیف ہے حوّا کی بیٹی پر
جب آنکھ کھلی
مصائب نے اپنی آغوش میں لے لیا۔
عزازیل پر سات طبق کی پھٹکار
جس نے ایک عفیفہ کو دھوکا دیا
سامری نے سونے کا بُت بنایا
جبریل کے گھوڑے کے سم کی خاک سے میں میں کرنے لگا
جس نے میں کا ہنکار بولا
دُنیا میں ذلیل اور خوار ہوا۔
آلی نٹ کا فریب کھا گیا
اس بے زبان سے کیا کھیلنا
جو نہ سمجھے نہ بات کرے۔
عورت کی محبت نسیم کی طرح پاک
کوثر کی طرح پوتر۔
جس نے عورت کو نہ پہچانا
زندگی کے راز سے محروم رہا

آلی نے جواب دیا
نوراں! تم جو کچھ کہتی ہو سچ ہے۔ لیکن دل پر تو کسی کو اختیار نہیں۔ بلّو بیشک بے زبان تھی لیکن یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ میری آواز سن کر جہاں بھی ہوتی کیسے بھاگتی آتی تھی! اب میں اُسے کیسے بھول جاؤں نوراں!—
تازہ پتّے اور پتیاں پھول اور پھل کا پیام لاتی ہیں۔
لیکن اس پیڑ کی بہار ہی کیا
جس کی شاخیں راہگیر نے کاٹ ڈالیں۔
رُکھ[3] کی رونق پتوں اور پھل سے ہے۔
اُجڑے درخت پر کبھی پنچھی بیٹھتے ہیں کبھی۔
آلی کے گھر کی رونق بلّو سے تھی
جب بلّو نہیں تو گھر بھی نہیں۔

نوراں بولی۔
آلی! بلّو کے عشق میں اگر لاچار ہے
سلیمان[ع] ہی سے فریاد کر
جس کا تخت ہوا پر اُڑتا تھا
جو پرندوں سے باتیں کرتا تھا
تاج الملوک سے اُڑن کھٹولا مانگ
تو ناداں ہے۔
اصل کو چھوڑ کر نقل پر مر مٹا
جوگی نے جوگ لیا تو کیا۔
نہ دل کا رنگ اُترا
نہ عقل کی آنکھیں کھُلیں

[illegible] کٹھالی: جس میں سنار سونا یا چاندی گلاتے ہیں۔ [2] آجڑی۔ گوالہ۔ [3] رکھ۔ درخت۔

جس کے من کی آنکھ کھلی
اس کے اندھیارے میں بھی اُجالا۔

اَلّی یہ جلی کٹی سُنکر اُٹھا اور بولا۔

" نورآں! اچھا ہوا کہ تُو نے بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑ لئے کچھ اور بھی کہنا ہو تو کہہ لے کوئی حسرت رہ نہ جائے "

نورآں بولی ۔

" اَلّی اب بلّو کی جان پر بنتی ہے تو وہ بچوں کو بھی پاؤں میں روند ڈالتی ہے۔ اب میں کس مُنہ سے واپس جاؤں سیانے ہوکر انجان بنتے ہو۔ دُنیا یہی کہے گی نا کہ اَلّی سے چوری چھپے مل کر آتی ہے۔ اب کون مجھے گھر میں قدم رکھنے دے گا گاؤں والیاں طعنوں سے جینا اجیرن کر دیں گی۔ جہاں تم جاؤ گے اب میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ "

" تم میرے ساتھ نہیں جا سکتیں " اَلّی نے ذرا غصّے سے کہا " لوگ دیکھیں گے تو یہی سمجھیں گے کہ ملک گاؤں کی ناری کو بھگا کے لئے جاتا ہے۔ تم واپس جاؤ۔ تمہارا دل بہلانے کو گاؤں میں بہتیرے مُسٹنڈے ہیں۔ اگر مجھ سے ایسی ہی محبت تھی تو باپ کو سمجھایا ہوتا۔ میں نے بلّو بھی تو تمہارے ہی لئے پالی تھی۔ لیکن تمہارا باپ تو پورا بنیا نکلا۔ جو مجھ سے بیٹی کا سودا کرنا چاہتا تھا "

" اَلّی! " نورآں آبدیدہ ہوکر بولی " قسم ہے مجھے پیدا کرنے والے کی میں بن کی ہوا کی طرح پاک ہوں۔ دریا کے سیپ کی طرح پوتر ہوں۔ میرا گاؤں کے کسی لڑکے سے ملنا جلنا نہیں۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن میں تمہیں چھوڑ کر اب واپس نہیں جا سکتی "

لیکن اَلّی نے کچھ التفات نہ کیا اور لٹھ اُٹھا کر آگے کی راہ لی۔ نورآں بھی پیچھے ہولی۔ اَلّی کبھی رستے کبھی کسی سے اُسے واپس چلنے کو کہتا۔ لیکن وہ کب اس کی بات پر کان دھرتی تھی۔ اَلّی اپنی قوم کے رسم و رواج خوب جانتا تھا اُسے معلوم تھا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ نورآں اس کی بیاہتا بیوی نہیں تو پھر اس کی قوم کے لوگ اسے کبھی پاس بیٹھنے بھی نہیں دیں گے اور نہ کسی گاؤں میں اسے کوئی پناہ دیگا اور نہ اس کے مرنے کے بعد کوئی اس کے جنازے میں شریک ہوگا۔ اُس نے تنگ آکر نورآں کو خوب پیٹا نورآں غریب پٹتی رہی

اور بار بار اُسے اپنی پاکدامنی اور محبت کا یقین دلاتی رہی۔ لیکن اَلّی کے سر پر تو جنون سوار تھا وہ کب اس کی سُنتا تھا۔ نورآں آبدیدہ ہوکر بولی :

" ظالم! ایک پاکدامن دوشیزہ کی آہ سے ڈر [illegible] سا اب میں کیسے واپس جا سکتی ہوں "

" دوشیزہ! پاکدامن! " اَلّی نے نورآں کی طرف دیکھ کر کہا۔ " تم؟ لیکن ایک پاکدامن دوشیزہ کی فریاد تو کبھی بے اثر نہیں رہتی۔ اگر تم ایسی ہی پاکدامن ہو تو خدا سے فریاد کرو کہ وہ میری مُراد پوری کرے "

" اور اگر خدا نے میری فریاد سُن لی تو " نورآں نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا

" تو مجھے بھی خدا کی قسم ہے کہ اگر مجھے بلّو مل گئی تو میں تم سے شادی کروں گا " اَلّی نے جواب دیا۔

دونوں دریا کے کنارے کنارے جا رہے تھے سائے ڈھل چکے تھے فضا میں کچھ نرمی اور خنکی پیدا ہو چلی تھی۔ نورآں نے کنارے پر بیٹھ کر وضو کیا۔ اور نماز پڑھنے کے بعد دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولی۔

ربِ قدیر!
تجھے معلوم ہے میں تیرے اس دریا کے پانی کی طرح پاک ہوں۔
تیرے بنوں کی ہوا کی طرح مجھے آج تک کسی نے چھوا نہیں
تجھے واسطہ ہے اپنی خدائی کا
اپنی رحمت کا اور اپنے جلال کا۔
تجھے واسطہ ہے اپنے حبیب ؐ کا
آمنہ کے لال کا۔
اس دُرِّ یتیم کا۔ جس کی پاس خاطر سے
تُو نے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔
جس کا کلمہ تُو نے کنکروں سے پڑھوایا۔
جسے سات آسمانوں سے پار بُلا کر
ہم کلامی کا شرف بخشا۔
عائشہ رضؓ کی پاکدامنی کی شہادت دینے والے مولا۔
بیریوں کو بیر عطا کرنے والے خدا۔
پیلو کو مٹھاس دینے والے
ان کالے کالے بادلوں کے مولا

جو مری ہوئی زمین میں جان ڈالتے ہیں
جنگل کی اس پاک ہوا کے خالق
جس میں پاکدامنیں سانس لیتی ہیں
آج نوراں کی فریاد سن!
جسے آج تک کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا
جس نے تیرے قہر و غضب سے ڈر کر
کسی مرد سے ہنس کر بات نہیں کی
اگر اس کی بھینس دریا کی آغوش میں ہے
تو خواجہ خضر کو حکم دے
اس کی بھینس اسے واپس کر دے
اس کی چنتا دور ہو
نوراں کا گھر آباد ہو

اب روایت اس طرح ہے کہ نوراں کی دلکش آواز ہوا میں گونج رہی تھی اور اللہ دتہ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر کہیں بیٹھ کر لیٹا ہوا تھا کہ اچانک دریا کی طرف سے ایک بھینس کی آواز آئی۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلا "بلو!" دونوں نے دیکھا کہ ایک سپید ریش بزرگ بلو کو ہانکتا لا رہا ہے۔ اس کی آواز سنتے ہی بلو بھاگتی ہوئی اس کے پاس آ گئی اور اس نے فرطِ محبت سے دونوں بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں لیکن جب اپنے محسن کو ادھر ادھر دیکھا تو وہ کہیں نظر نہ آیا۔

اس نے پہلے ریت پر سر رکھ کر خدا کی بارگاہ میں سجدہ کیا پھر نوراں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"نوراں! مجھ سے قصور ہوا معاف کر دو بیشک تم پاکدامن ہو۔ اور آج سے اللہ دتہ تمہارا غلام ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے سر سے پٹکا اتار کر بلو کے گلے میں ڈال دیا۔ اور نوراں نے کہا "یہ اس کی طرف سے محبت کا تحفہ قبول کرو۔"

جب دونوں خراماں خراماں گاؤں واپس آئے تو ان کی بھینس دیکھنے کے لئے گاؤں کے زن و مرد گھروں سے باہر نکل آئے۔ اس نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

خدا نے بیکسوں کی فریاد سنی۔
پیر دستگیر نے ڈوبا بیڑا تیرایا۔
جب نوراں نے فریاد کی
[illegible] سے بلا گئے
دشمنوں کے کلیجے تھام لئے
رحمت کا دریا جوش پر آیا
حوا کی بیٹی کی فریاد قبول ہوئی
جس طرح آدم اور حوا کے
گڑھی والو!
اس کو اللہ نے نوراں بخش دی
بلو دریا کی آغوش میں سوتی تھی
خواجہ خضرؑ کو ترس آیا
جس نے بلو مجھے واپس دلوا دی۔
سب بڑائی اللہ ہی کے لئے ہے
جو زندہ سے مردہ نکالتا ہے
اور مردہ سے زندہ!
بندہ وہ ہے جو مایوس نہیں ہوتا۔
جس نے آس اور صبر کا دامن تھاما
دریائی موجیں ہوں
یا قہر کی آندھی
بیڑا اس کا پار ہے۔

کوئی مانے یا نہ مانے۔ لیکن سادہ لوح جانگلیوں کا آج بھی اس پر ایمان ہے کہ اس کی بھینس خود حضرت خواجہ خضر علیہ السلام ہی دریا سے نکال کر لائے تھے۔

حکایت و حقیقت

(نظام نو)

حکایت ہے کہ قارون[1] تھا کوئی
مریضِ درہم و دینار جوئی
مجسم آرزوئے لعل و گوہر
شہیدِ تیغِ سیم و دشنۂ زر
پیاسا اس قدر وہ آبِ زر کا
کہ گویا سر بسر "زر تشنگی" تھا
پجاری سومناتِ سیم و زر کا
زر اندوزی کی خاطر در بدر سا
حضر ہو یا سفر زر کا طلب گار
مثالِ کرگساں جویائے مردار
قضارا اس کی اک بحری سفر میں
پھنسی کچھ اس طرح ناؤ بھنور میں
یہی دھڑکا تھا اب ڈوبی کہ ڈوبی
لگی منہ پھیرنے قسمت کی خوبی

(۲)

مصیبت میں خدا آنا ہی تھا یاد
یہی ہوتا ہے جب پڑتی ہے افتاد
جبیں سا ہو کے جھٹ اس نے دعا کی
"خدایا عمر بھر میں نے خطا کی"
"مری گندی ہے بیشک فردِ اعمال
مجھے تسلیم ہے اپنی بُری چال"
"تجھے تیری کریمی کی قسم ہے
تجھے عفوِ قدیمی کی قسم ہے"
"مرے مولا مری فریاد سن لے
کنارے تو مری کشتی لگا دے"
"کروں خیرات میں بکرا بڑا سا
یہی ہے میری نیت میرے مولا"
خدا کے فضل سے بیڑا ہوا پار
ہیں بالا فہم سے قدرت کے اسرار

(۳)

رہا خدشہ نہ جب غرقابیوں کا
پڑا دورہ اسے سرتابیوں کا
رہی نیت نہ ظالم کی ٹھکانے
لگا کرنے بہانوں پر بہانے
غرض بکرے سے وہ چوزے پہ آیا
یہ حیلہ بھی مگر اس کو نہ بھایا
اسی خبط میں سر کھجلا رہا تھا
پریشاں حال تھا بھنا رہا تھا

1 Capitalist کا ترجمہ سرمایہ دار ہے مگر میں نے اس کے لئے "قارون" کا جامع و مانع لفظ اختیار کیا ہے۔ [illegible] "[illegible]" اس سے یکسر عاری ہے۔ امینِ حزیں ک

گو اک مریل سی جوں چٹکی میں آئی
اب اس کے ذہن کی دیکھیں رسائی

لگا کہنے وہ اس کو مار کر یوں
"کہ کارِ خیر میں ہو ڈھیل اب کیوں؟"

"بحمد اللہ کہ سر سے بوجھ اترا
بہت منت کا مجھ کو اپنی ڈر تھا"

"ہو یکتا یا کہ جوں یہ جان ہے ایک
خدا ایک اور اس کی شان ہے ایک"

"نہیں جب فرق جانوں میں ذرا بھی
نہ ہوگا معترض اس پر خدا بھی"

(۴)

"نظامِ نو، نظامِ نو" کا کھٹراگ
الاپیں کیوں نہ شرق و غرب کے گھاگ

یہ قارونی بھنور سے ڈر رہے ہیں
دعائیں ڈر کے مارے کر رہے ہیں

رچائے جائینگے کچھ دن یہی ڈھونگ
دلے گا اب نہ سینے پر کوئی مونگ

مگر وقتی ہیں یہ حیلے بہانے
رہیں گے ٹہنیوں پر آشیانے

(۵)

گذارش ہے مری اہلِ زمیں سے
سنا ہے میں نے جبریلِ امیںؑ سے

"نہیں روح و روانِ جن کی مواخات
نہیں جسکی رگ و پے میں مساوات"

"نہیں جس کو کھٹکتے ظلم و بیداد
نہیں جس کی مودّت خشتِ بنیاد"

"خیالِ سروری جسمیں ہے ساری
جو ہے دشتِ جنوں کی تاجداری"

"تمیزِ رنگ ہے جس کی نظر میں
ہے سودائے تفوّق جس کے سر میں"

"نظامِ نو وہ آفاقی نہیں ہے
کہ تلخابہ مئے باقی نہیں ہے

امین حزیں
سیالکوٹی

سید وقار عظیم

نئے افسانے کا موضوع

ہمارے افسانے نے مغرب سے نیا فن اور اس کی نئی نئی نزاکتیں سیکھیں اور جو ہندوستان کی بوقلموں زندگی اور اس کی بے شمار الجھنوں نے اسے اَن گنت موضوع دیئے۔ اور اس طرح یہ افسانہ جو فن کی حیثیت سے لطیف و جمیل بنا، اس زندگی کا ترجمان بھی رہا جس نے اُسے پیدا کیا تھا۔

یہ زندگی!

بیسویں صدی کے ابتدائی دنوں میں اس زندگی پر مغرب چھایا ہوا تھا۔ اور اس کی مشرقیت جیسے رفتہ رفتہ ایک گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چھپ کر اس طرح نظر سے اوجھل ہو رہی تھی جیسے دیکھی ہی نہیں۔ اور ہمارے شاعر اور افسانہ نگار دونوں نے لوگوں کو اس بڑھتے ہوئے گھٹا ٹوپ اندھیرے کے خطروں سے آگاہ کیا۔ دونوں نے مغرب زندگی کے سیلاب کی روک تھام کی۔ اور جذبات کی شدت میں فن سے بہت دور جا پڑے۔ آرٹسٹ نے مصلح کی خدمتیں اپنے ذمے لے لیں پھر بھی مغرب کسی کے روکے نہ رکا۔ زندگی کے ہر شعبے پر چھا گیا۔ اور مغرب کی بہت سی چیزیں مشرق کی ہو کر رہ گئیں۔

لیکن زمانہ کو ابھی اور بہت سی کروٹیں لینی تھیں۔ اور افسانہ نگار کو بھی بہت کچھ کرنا تھا۔ مغرب بہت پھیلا پھر بھی شہروں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ دیہات اور دیہات کے مسئلے مغرب زدہ شہروں کے مسئلوں سے زیادہ اہم تھے اور ان کی اہمیت افسانہ نگاروں نے محسوس کی۔ افسانہ میں دیہاتی زندگی کی مصوری کی گئی اور افسانہ اب زندگی سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ لیکن زندگی یہاں بھی نہیں ٹھہری تھی۔ اسے ابھی بہت بدلنا تھا۔

بیسویں صدی کے ان چالیس پینتالیس برسوں میں ہندوستانی زندگی میں اتنے اتار چڑھاؤ ہوئے اور اس کے مختلف شعبے آپس میں اس طرح الجھ کر رہ گئے کہ ان کا سلسلہ وار تصور ذرا مشکل سا ہے۔ پھر بھی شروع سے آخر تک کچھ باتیں ایسی ہیں کہ ان میں درجے کے فرق کے علاوہ اور کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا۔ ناسور شروع سے تھے۔ زمانہ کی ہوا کبھی انہیں خشک کرتی رہی اور کبھی پہلے سے بھی زیادہ ہرا۔ اور ناسور جہاں تھے وہیں کے وہیں رہے۔ ان کا کوئی مداوا نہ ہو سکا۔

یورپ کی بڑی لڑائی سے ذرا پہلے تک ہندوستانی زندگی کا نقشہ کچھ اس طرح کا تھا۔ دیہات کے رہنے والے دیہاتوں میں کھیتی باڑی کر رہے تھے۔ زمینیں کم تھیں اور ان کے گاہک زیادہ۔ ایک انار سو بیمار۔ ہر بیمار کے ہاتھ ایک ایک دانہ سے زیادہ نہ آتا تھا۔ اور بہت سے اس ایک دانہ سے بھی محروم تھے۔ اس لئے مرض دن کا دونا رہا۔ زمینیں جو ملی ہوئیں، دکھ جھیلے اور سال بھر کے بعد زمین اتنا بھی نہ دے سکی کہ پیٹ بھر کے روٹی اور زمیندار کے دیئے لوگان کی رقم نکل سکتی۔ نتیجہ؟ سارا گاؤں مہاجن کے آگے ہاتھ پھیلاتے۔ جو کچھ ملا اس سے ایک وقت کی روٹی کا سہارا ہوا۔ اور زمیندار کا آدھا تہائی لگان ادا ہوا۔

لیکن جس زمین کی آس پر قرضہ لیا گیا تھا اس نے لاکھ جتن کرنے پر بھی سونا نہ اگلا۔ مرض بڑھتا گیا۔ زمیندار کے لگان کی بقایا پاپ کی گٹھڑی کی طرح دن بدن زیادہ بوجھل ہوتی گئی۔ آخر ایک دن ساہوکار نے نالش کر دی۔ زمیندار نے زمین سے بے دخل کر دیا۔ اور اس طرح ایک وقت کی روٹی کا جو بُرا بھلا سہارا تھا وہ بھی چھن گیا۔ سو بیماریوں کی ایک بیماری بیکاری لگ گئی۔ دیہاتیوں نے سوچا کہ محنت مزدوری کریں۔ دیہاتوں میں محنت مزدوری تھی نہیں اس لئے انھوں نے شہروں کا رُخ کیا۔

مشرق اور مغرب کا جو تصادم برسوں ہوئے شروع ہو چکا تھا وہ اب بھی جاری تھا۔ مغرب مشرق پر غالب آ رہا تھا۔ ہندوستانی رگوں میں مذہبی اختلافات کا زہر آہستہ آہستہ سرایت کر رہا تھا۔ مسلمانوں میں نئے فتنے پیدا ہو رہے تھے۔ ہندوؤں میں روشن خیالی آ رہی تھی مذہب کی پرانی چھوت چھات دور ہو رہی تھی۔ اور سارے ملک میں مذہبی بیداری کی ایک رَو ادھر سے ادھر تک دوڑتی نظر آ رہی تھی۔

ایک تیسری چیز ان دونوں سے زیادہ اہم تھی جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ توہین آمیز سلوک ہو رہا تھا۔ وہ اس سلوک کے خلاف بغاوت کر رہے تھے یہ خواہش "غلامی" کے آگے جھکتی دکھائی دے رہی تھی۔ بہادروں کی بغاوت نے حامیوں کی آنکھیں کھول دیں۔ ہندوستان میں اپنے پردیسی ہموطنوں کی بہادری کی خبریں پہنچیں تو ان کی سوئی ہوئی رگوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ سیاسی جذبے کو ایک تازگی ملی۔ اور جس ہندوستان کے دیہاتی بھوکے مر رہے تھے اس کے شہریوں نے پہلے سے زیادہ شدت سے زندگی کے زخموں کا ذمہ دار سیاسی غلامی کو سمجھنا شروع کر دیا۔

عین اسی زمانہ میں جب دیہاتی ہندوستان روزگار کی تلاش میں شہر کا رُخ کر رہا تھا پرانی مذہبی قیدیں اپنی گرفت ڈھیلی کر رہی تھیں۔ دوسری طرف "غلامی" کروٹیں بدل رہی تھی۔ جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ اس نے زندگی کے ان تینوں شعبوں میں شعلہ کی سی بھڑک پیدا کر دی۔ جو دھواں اس تک اندر ہی اندر گھٹتا اور دبا ہوا تھا ایک ہی جھونکے نے اسے شعلے کی شکل دیدی۔

حکومت نے پہلی دفعہ ہندوستان میں صنعتی ترقی کی ضرورت محسوس کی۔ صنعتیں جو کچھ انگلستان میں نہیں کر سکتی تھیں ضرورت تھی کہ ہندوستان اسے پورا کرے۔ اس لئے سارے ملک میں جنگی صنعتوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اور ان صنعتوں کے ساتھ ساتھ بعض امن کی صنعتوں نے بھی کارخانوں کی شکل اختیار کر لی۔ اور اس طرح جو دیہاتی روزگار کی تلاش میں شہر کی طرف آئے تھے انہیں سہارا مل گیا۔ نئے کارخانوں میں ان کی زیادہ سے زیادہ کھپت ہونے لگی۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو سہارا دیا۔ اور زندگی کی لوٹ زندگی پر ایک چمکدار ملمع ہو گئی۔ بہت سے بدحال خوشحال نظر آنے لگے۔ لیکن یہ حالت زیادہ دن تک قائم نہیں رہی۔ کارخانوں نے بڑے بڑے منافع کمائے۔ دیہاتیوں کا پیٹ بھرا تو انھوں نے اور بہت سے دیہاتیوں کو شہروں کی طرف کھینچا۔ زیادہ کام کرنے والے ہاتھ سرمایہ دار کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن گئے۔ آدمی بہت تھے اس لئے انہیں منہ مانگی مزدوری دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک کے مقابلہ میں دوسرے کی مزدوری توڑی جا سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جتنے زیادہ مزدور بڑھے اتنی ہی ان کی تکلیفیں زیادہ ہوئیں۔ سرمایہ دار کو پیٹ بھرنے اور مزدور بھوکوں مرنے لگا۔ جنگ نے عام زندگی کو مہنگا بنا دیا۔ اس لئے ہندوستان میں بیزاری کا جذبہ عام ہو گیا۔

سیاسی حیثیت سے ایک اور بات ہوئی۔ ترکی اور جرمنی انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ہندوستان کی ہمدردی ترکی کے ساتھ تھی۔ اور اس لئے جرمنی کے ساتھ۔ اور اس لئے گو ہندوستان کے دل میں سیاسی جذبے نے اب زیادہ شدید شکل اختیار کر لی تھی لیکن اس کے اظہار کے موقعے نا پید تھے۔ زندگی کی تکلیفیں اس سیاسی بیزاری کے شعلہ کو اور بھڑکا رہی تھیں۔ جنگ ہوتی رہی اور اس دوران میں ہندوستان کی عام فضا میں ایک گھٹن پیدا ہوتی رہی۔

جنگ ختم ہو گئی۔

ساری دنیا کے ساتھ ہندوستان کی فضا میں پھیلاؤ پیدا ہوا۔ جو جراثیم اب تک دبی گھٹی تھیں جیسے کسی قید سے نکل کر باہر آ گئیں۔

جنگ کے زمانہ میں ہندوستانی سرمایہ داروں نے بغیر کسی مقابلہ کے لاکھوں روپئے کا نفع کمایا۔ اب وہ اُسے صنعتوں میں لگانا چاہتے تھے۔ حکومت سرمایہ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اس لئے اُسے زیادہ سے زیادہ کارخانے کھولنے کے موقعے ملے۔ غیر ملکی سرمایہ کے لئے ہندوستان کا میدان نسبتاً زیادہ کھلا ہوا اور صاف تھا۔ اس کی حیثیت اکھاڑے کی سی نہ تھی۔ اس لئے جنگ کے بعد ملکی اور غیر ملکی سرمایہ ہندوستان میں آیا اور کارخانوں کی تعداد اور بھی زیادہ بڑھی۔ جنگ کے تجربہ نے خود حکومت کو بھی یہ سکھا دیا تھا کہ کسی آنے والی جنگ کی تیاری کیلئے ہندوستان کو صنعتی بنانا ضروری ہے۔ اس لئے جنگ کے فوراً بعد دیہاتی ہندوستان صنعتی ہندوستان بن گیا۔ اور زندگی کے جسم پر ایک نیا ناسور پڑنے کی ابتدا ہو گئی۔

چند مہینوں تک صنعت اور تجارت کا بازار خوب گرم رہا۔ لیکن پھر یکبارگی ایسا سرد ہوا کہ سرمایہ دار پر بھی اس کی چوٹ لگی۔ اور اس کا اثر مزدوروں تک پہنچا۔ اُن کی مزدوریاں کم ہوئیں۔ ان کی تکلیفیں بڑھیں۔ جنگ نے ہندوستان کی بیکاری کو ختم کر دیا تھا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہی جنگ کے پیدا کئے ہوئے روزگار بھی ختم ہو گئے۔ اور ملوں سے ماہر مزدوروں کے علاوہ عام زندگی میں پریشانی اور ابتری پھیل گئی۔ مزدوروں نے اپنی مصیبتوں کا علاج کرنے کیلئے ٹریڈ یونینیں بنائیں۔ کارخانوں میں اسٹرائیک ہونے لگے۔ جو لوگ [illegible]

ذکر بیکار ہو گئے تھے انھیں سیاست نے اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ کسان اور چھوٹے زمیندار جو اب تک پہلے کی طرح زندگی کے دلدل میں پھنسے ہوئے تھے اس میں سے نکلنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ ان کی نظر بھی ہر طرف سے ہٹ کر اب صرف سیاست پر پڑنے لگی۔ سیاست، جو اب تک لفظوں کی سیاست تھی عمل کے میدان میں آنے کیلئے بیقرار تھی۔ اس لئے کہیں کہیں یہ جذبہ انقلابی عمل کی صورت میں نمودار ہوا۔

حکومت نے اس سیاسی جذبے کو دبانے کیلئے سخت سے سخت قانون بنائے۔ لیکن سیاست کا جذبہ جتنا دبایا گیا اتنا ہی ابھرتا گیا اور اسے نہ دبا سکے۔ اسی زمانہ میں (۱۹۱۵ء) گاندھی جی جنوبی افریقہ سے واپس آ گئے۔ سیاسی جذبے کی جو آواز ملک کے ایک کونے سے دوسرے گوشے تک پھیلی ہوئی تھی اُسے اور تقویت مل گئی۔ گاندھی جی نے اپنی آواز اس آواز میں ملا دی۔ اور ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو ہندوستان میں ستیہ گرہ منایا گیا۔ سارے ملک نے متفقہ طور پر اپنے جذبے کا اظہار کیا۔ اسی مہینے میں حکومت اور رعایا دونوں کی طرف سے اپنی طاقت کے [illegible] مظاہرے ہوئے۔ سیاسی تحریک کے اس عملی دور میں ہزاروں ہندوستانیوں نے اپنی جانوں کی قربانی دی۔ اس سال سے سیاست آگ کی طرح سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

۱۹۲۰ اور ۱۹۲۱ء میں رعایا نے حکومت کے مائیکاٹ کئے۔ ہندو مسلمان اس طرح کاندھے سے کاندھا ملا کر چلے کہ وطن کی زمین [illegible] گئی۔ کھدّر کی تحریک شروع ہوئی۔ دلوں میں چھوت چھات کے خلاف نفرت کا جذبہ پھیلایا گیا۔ اور ان سب باتوں نے مل کر ہندوستانی سیاسی تحریک کو ایسی کامیابی دی، جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۹۲۲ء میں اس تحریک نے بعض جگہ خونریزیوں کی شکل اختیار کر لی۔ رعایا نے حکومت سے بغاوت کی۔ حکومت نے اس بغاوت کو [illegible]۔ اور اسی سال گاندھی جی کو چھ سال کیلئے جیل بھیج دیا۔ بھڑکی ہوئی آگ رفتہ رفتہ سرد ہونے لگی۔ لیکن اس جلی ہوئی راکھ میں اب تک [illegible] چنگاریاں باقی تھیں وہ برابر چمکتی رہیں اور کوئی طاقت برابر انھیں بجھانے میں لگی رہی۔

حالات کا انداز اس کے بعد سے بالکل بدل گیا۔ ملک میں ہر جگہ ہندو مسلمانوں اور سکھوں مسلمانوں میں بلوے ہوئے۔ جو ہندو مسلمان [illegible] اور ایک قالب بن کر سیاسی جنگ لڑنے کیلئے میدان میں آئے تھے اب ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے۔ ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان بن گیا۔ [illegible] کا مطالبہ دوسرے کا انکار۔ ہندوستان میں سادھو اور [illegible] بڑھ گئے۔ مولویوں اور پنڈتوں کی آوازیں پہلے سے زیادہ تر پیدا ہو گیا۔ اور نہ معلوم کیوں، بلوے بڑھتے رہے۔ دونوں میں فاصلہ زیادہ ہوتا رہا۔ ہندو مسلمانوں اور سکھوں کے ساتھ ساتھ ہم ذاتوں کا مسئلہ بھی پہلے سے زیادہ شدید صورت اختیار کر رہا تھا۔ نیچ ذات کے نمائندے اپنے اُن حقوق کیلئے لڑ رہے تھے جو اونچی ذات والوں نے اب تک غصب کر رکھے تھے۔ اس طرح ہر فرقہ اور ہر جماعت "قومیت" کا ایک نیا مفہوم (جس میں باقی ہر چیز کے مقابلے میں خود غرضی زیادہ تھی) لکر میدان میں آ رہی تھی۔ اور ہر ایک دوسرے کے حصے میں سے کچھ نہ کچھ ہڑپ کرنے کی فکر میں تھا۔ اور اسی لئے اس کی لڑائیاں جو نر [illegible] ہی تھیں۔

۱۹۲۴ء میں لیڈروں نے ہندو مسلمانوں کے باہمی فسادوں کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ اور اسی لئے لیڈر [illegible] رستے ہوئے زخم کو اپنی حالت پر چھوڑ کر دوسرے دھندوں میں لگ گئے۔ دیہاتی کسان رفتہ رفتہ سیاسی میدان میں آنے لگے۔ اور اس سیاسی احساس نے [illegible] کے اور زمیندار کے رشتے میں کافی فرق پیدا کر دیا۔ شہروں میں مزدوروں دن بدن زیادہ متحد ہوتے گئے۔ اور سرمایہ داروں سے اپنے مطالبات حاصل کرنے کیلئے [illegible] جماعت کی شکل اختیار کر لی۔ ہر جگہ مزدوروں کی انجمنیں بن گئیں۔ صنعت برابر بڑھتی رہی۔ چھوٹے شہروں کا کاروبار سمٹ کر بڑے شہروں میں آ گیا۔ چھوٹے شہر قصبے بن کر رہ گئے۔ اور بڑے شہر اتنے بڑھے کہ چھوٹے سے صوبہ کی آبادی ان میں سما گئی۔ اور امیری غریبی کا فرق اب پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گیا۔ زخم اتنا ناسور بن گیا کہ سرکار نے مزدوروں کی بہبودی کیلئے قانون بنائے۔ لیکن ان کی حالت [illegible] اور بھی ابتر ہوتی گئی۔ گاؤں والے سیاسی بیداری کے باوجود اب تک ساہوکار اور زمیندار کے پنجے کے نیچے دبے رہے۔ اور اسی پنجے کی گرفت سے نکلنے کیلئے وہ شہروں کی طرف آئے، اور شہر کی غریبی پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ گاؤں میں زمیندار اور مہاجن اور شہر میں کارخانہ کا مالک سرمایہ دار، روش کے کافی تبدیل ہو جانے کے بعد بھی اب تک غریبوں کو چوس رہے تھے۔ شہر اور گاؤں اب بھی پہلے کی طرح اپنی زندگی کو زندگی بنانے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ اور دونوں کی نظر کہیں

لو پھٹے۔ اس کا بس چلتا تو ان لوگوں کی قید سے آزاد ہو جاتی۔ سے مہندی کے عطر پر بھی بُری طرح غصہ آرہا تھا۔ مجھے نہیں پتا ہے یہ خوشبو ناجو کو ملا کرتی رہی تھی آج وہ اندھی ہوگئی۔ وہ مجھے اپنی آنکھیں سمجھتی رہی اب وہ کیسے دیکھے گی۔ وہ چاہتی تھی کہ زور زور سے چلائے۔ اور کہاروں سے کہے کہ وہ اُسے واپس لے جائیں۔ کسی طرح برات والے اُسے چھوڑ سکتے تو وہ ہمیشہ کیلئے کنواری رہنا منظور کرلی۔

وہ چاہتی تھی نتھ اتار پھینکے۔ اس طلاقی کی کیا ضرورت ہے؟ نہ ماتھے کا جھومر، نہ کانوں کی بالیاں، نہ گلے کا جس دن ہار۔ اُسے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اُسے اپنے سنگار سے نفرت تھی۔ لال شلوار، قمیص اور سر پر لال سالو، یہ کیسا کھیل ہے؟

کاش اپنی شہنائیوں کے ساتھ ناجو کا بھی بیاہ ہو جاتا۔ برات میں اتنے لڑکے آئے تھے کیا کسی کو ناجو سے بیاہ کرنا منظور نہ تھا؟ ناجو کو شہنائیاں پسند ہیں۔ اب اس کیلئے کون شہنائیاں بجائے گا جانے اس کا بیاہ کبھی ہوگا بھی یا نہیں۔ اس کا دولہا کہاں سے آئیگا۔ وہ چاند ستاروں کی باتیں لے شوق سے۔ معلوم ہوتا ہے وہ چاند ستاروں کو دیکھ سکتی ہے۔ اب چاند ستاروں کی باتیں اس سے کون سُنے گا۔

تین کہار نوجوان تھے اور ایک بہت بوڑھا۔ نوجوان کہار تیز تیز قدم اٹھانے لگے تو بوڑھے کیلئے مشکل پیدا ہو جاتی۔ راستہ ریتیلا تھا۔ ہر کسی کے پاؤں ریت میں دھنس جاتے تھے۔ برات کچھ پیچھے رہ گئی تھی۔ اور دولہا اپنے یار دوستوں کے ساتھ ذرا آگے نکل گیا تھا۔

بڑے کٹھن دن ہیں ۔ بوڑھا کہار بولا۔ یہ مہنگائی کاٹے نہیں کٹتی۔

سستائی ہو چاہے مہنگائی ۔ نوجوان کہار نے سند دی۔ لڑکی والے لڑکی کو گھر میں کب تک بٹھا سکتے ہیں۔

ہماری کوئی نہیں سُنتا ۔ دوسرا کہار بولا۔ یہ امیر تو کچھ بھی نذر کر ہی دیتے ہیں۔

پنچایت نے ہمارا "لاگ" نہیں بڑھایا ۔ تیسرا نوجوان کہہ اٹھا۔ اتنے پیسوں پر اب کون ڈولی اٹھائے۔

یہی حالت رہی تو ڈولی کہیں نظر نہیں آئیگی ۔ بوڑھا کہار پیشین گوئی کے انداز میں بولا۔ بس اب ڈولی چند ہی دنوں کی مہمان

دُلہن کو یوں محسوس ہوا کہ کہار ڈولی رکھ کر کھڑے ہو جائینگے۔ سانس۔ ماپ رہے۔ چلو اسی بہانے پیپل یا بڑھ کے نیچے دم لینے کا موقع مل جائیگا۔ لیکن کہار بدستور چلتے رہے۔ ان لوگوں کا "لاگ" ہمیشہ یہی رہے گا۔ دُلہن سوچ رہی تھی۔ اپنے حق کے لئے لڑنے جھگڑنے کی ہمت ان میں کہاں۔

ناجو کیلئے سب شہنائیوں والے مر گئے۔ تو کیا ناجو عمر بھر کنواری رہے گی۔ ہے بھگوان۔ کیا تیرا نیائے ہے۔ تو نے جنم ہی سے اس کی آنکھیں کیوں چھین لیں۔ آواز ایسی کہ اس کے سامنے پائل کی جھنکار بھی مات ہو جائے۔ ناچ میں وہ آنکھوں والیوں سے بازی لے جاتی ہے۔ جب بن ٹھن کر گھونگھٹ کاڑھے بیٹھ جائے تو شاید کوئی شہزادہ بھی اُسے اپنی دُلہن بنا لے۔ تو کیا اب اس کا بیاہ نہ ہوگا۔ اُس کے بال ایڑیوں کو چھوتے ہیں۔ ناچتی ہے تو ایسے کہ کوئی کونج پر تول رہی ہو۔ کاش میری آنکھیں سچ مچ اس کے چہرے پر لگ جائیں۔ پھر میں دیکھیں کہ اس کیلئے کون کون ترستا ہے لیکن میں کیسے دیکھیں میری آنکھیں تو ناجو کے چہرے پر لگ جائیں۔

اسے یاد تھا کہ ایک بار ناجو نے کہا تھا " میں کب اندھی ہوں تم مجھ سے چاند ستاروں کی باتیں سُنتیں رہو۔ میری باتیں کبھی ختم نہیں ہو سکتیں "

پورب کی ایک لڑکی کے قہقہے اس کے ذہن میں جھانجھ کی طرح گونج اٹھے۔ ناجو اس کے ساتھ کھڑا ہو کر گا اٹھتی۔ اور وہ ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ اری ناجو! تو پچھلے جنم کی بہن ہے۔ دونوں مل کر ناچنے لگتیں اور گاتیں۔

پنجاب دیس ری سندی
بڑی دور دور دور
پنجاب دیس کے چھوہرے
برسے نور نور نور!

اُسے یوں لگتی تھی کہ دولہا کی آنکھوں سے نور برستا ہے۔ لیکن سے جھیک آتے آتے پلٹ جائے۔ اس کی طبیعت پھر پریشان ہوگئی جیسے اس نے ناجو سے اس کا دولہا چھین لیا ہو۔

اب تو تیز ہوا چل پڑی تھی۔ ڈولی کا پردہ پھڑپھڑا رہا تھا ڈولی آگے ہی آگے چلی جارہی تھی۔ اس نے سوچا نائن سے بات کرے۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ یہ تو نائن کا فرض ہے کہ مجھ سے پوچھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ آخر وہ میرے ہمراہ کیوں آئی

ہے؟ پیدل چلنا پڑ گیا تو چل چل کر رہ گئی۔ بے دیکھے گل ساٹ کوس کا تو سفر ہے۔ دو اور تین پانچ اور دو سات کوس کا سفر۔ اس اگر میں اسے سو وار بھی دوں تو وہ سنی ان سنی کر دیگی۔ وہ ایک پہیلی ہے جسے میں نہیں بوجھ سکتی۔ کیا اب وہ راستے بھر مجھ سے بات نہیں کریگی؟

اس نے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ارے ارے میرا چہرہ تو لال ہو رہا ہے۔ اور میری ستارہ سی آنکھیں شرمسار نظر آتی ہیں جیسے انہوں نے کوئی جرم کیا ہو۔

ہوا اب ڈولی کے پردے سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔

اس نے سوچا اب آسمان پر بادل گھر آئیں تو مزہ آجائے۔ جب وہ چھیمی میں ماں سے کھرچن مانگتی ہمیشہ یہی جواب ملتا کہ بیاہ پر موسلا دھار مینہ برسے گا۔ لیکن اسے تو اس کی کچھ پروا ہی نہ تھی۔ حیرت سے وہ آسمان کی طرف دیکھتی رہی۔ جہاں بادلوں کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ آجکل موسلا دھار مینہ تو برس ہی نہیں سکتا۔ بوندا باندی ہو جائے وہی غنیمت ہے۔ اس کی بابت بڑے سیانے کہا کرتے ہیں کہ بھینس کا ایک سینگ بھیگا ہوا اور ایک سوکھے سے خشک۔ وہ ٹکٹکی باندھے نو کی طرف دیکھتی رہی۔

کہار سونے میں ڈھلا ہوا بھی کیوں نہ ہو — بوڑھا کہار بولا اس کے کندھے تو پیتل کے ہونے چاہئیں۔

بڑھاپے میں تو پیتل بھی سونا بن جاتا ہے — ایک نوجوان کہار نے پھبتی کسی۔ اب یہ کام چھوڑ دو۔ تم بوجھ نہیں ڈھو سکتے۔

بابا کو یونہی ساتھ لے لیا — دوسرا بولا۔ ڈولی کا بوجھ تو ہم تینوں کے کندھے پر ہے۔

ہاں ہاں — تیسرا کہار کہہ اٹھا۔ ہم اسے 'لاگ' میں سے بابا کو برابر کا حصہ کیسے دے سکتے ہیں!

تم مجھے کچھ بھی نہ دینا — بابا بولا۔ بس مجھے ڈولی اٹھانے سے روکو مت۔

روکتا کون ہے بابا! — پہلا جوان کہہ اٹھا — تیز تیز قدم بڑھاؤ۔

کیوں ڈولی اٹھانے میں کچھ مزہ آتا ہے بابا! — دوسرے نوجوان نے لقمہ دیا۔ ڈولیاں اٹھاتے اٹھاتے من نہیں بھرا۔

یہ سب پیٹ کا دھندا ہے — تیسرے نوجوان نے حاشیہ چڑھایا۔ روٹی سو سو غلامیاں کراتی ہے۔

روٹی بھی ضروری ہے — بابا بولا۔ پر خالی روٹی کیلئے میں ڈولی نہیں اٹھاتا۔ اپنے کام کا مزہ بھی تو ہوتا ہے۔

دلہن خوش تھی کہ بابا کو اس کی ڈولی اٹھاتے ہوئے مزہ آرہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ بابا افیمی ہے۔ اور اب معلوم ہوا کہ افیم ہی کی طرح اسے ڈولی اٹھانے کا بھی نشہ ہے۔ سب پیٹ کا دھندا ہے یہ سچ کہتے ہیں۔ روٹی سو سو غلامیاں کراتی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہونگے کہ میں شہزادی ہوں — ڈولی کی دلہن۔ پر میں بھی غلام ہوں۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے۔ انھیں بھی مجھ سے ہمدردی ہونی چاہیئے۔

کیا بیاہ ضروری ہے۔ ڈولی میں بیٹھ کر سسرال پہنچے کے بعد کیا بیاہ نہیں ہو سکتا؟ اس وقت اس کے ذہن میں وہ گیت گونج اٹھا۔ جس میں ایک لڑکی کہتی ہے — میں نے تجھ سے کہا تو سہا بابل کہ میرا بیاہ اسوج میں کیجیو تاکہ کوٹھڑی میں پڑے پڑے بھوانوں سے سڑاہند نہ اٹھنے لگے۔ اور دہی بھی کھٹاس نہ پکڑ سکے۔ ارے ارے میرے سپنے تو بلبلے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں پانی میں صابن گھول کر گیہوں کی نلی سے پھونک مار مار کر بلبلے اڑایا کرتی تھی۔ ان بلبلوں کے رنگ سورج کی روشنی میں کیسے بھلے لگتے۔ لیکن بلبلوں کی عمر ہی کیا۔ بیاہ کی اتنی فکر؟ ماں میری سو تیرا بیاہ اسوج ہی میں کریں گے۔ بھوانوں سے سڑاہند نہیں اٹھے گی۔ دہی کھٹاس نہیں پکڑ سکے گا۔ وہ لڑکی سچ کہتی تھی جس نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ مجھے کنواری ہی رکھ لو۔ تم گیہوں کے کھیتوں میں آبیاری کیا کروگے تو میں تمہارا ہاتھ بٹایا کروں گی۔ لیکن ہمیشہ میکے ہی میں رہنے کی شرط بھی تو فضول ہے۔ میں تو عمر بھر میکے میں رہنا کبھی پسند نہ کروں۔

ایک بار پھر بڑی شدت سے اسے ناجو کا دھیان آیا۔

جیسے کسی برات بھوانوں سے سڑاہند محسوس کرتے ہی اٹھ کر چلی گئی ہو۔ دہی نے بھی تو کھٹاس پکڑ لی تھی۔ براتی یہ دہی کیسے کھا سکتے تھے۔ ناجو رد کر دی گئی۔ واہ ری ناجو اب موج کر۔ تیرے لئے میکے کی گلیاں کبھی سنگ نہیں ہو سکیں، آنگن پردیس نہیں ہو سکتا۔

ارے! نے عمر بھر میکے میں رہنا بھی تو کٹھن ہے۔

یہ تھوڑی مہندی کے عطر کی خوشبو۔ ناجو کبھی بھی ہے ناحق عطر کا پھویا لیتی آئی۔ اور میری مینڈھیوں پر مل دیا۔ یہ میری لال مخملی قمیص۔ مجھے ان سے نفرت ہے۔ ہر دری کے پھول بوٹے۔ میرا بس چلتا تو یہ کپڑے ناجو کو پہنا دیتی۔ ہونہہ ناجو تو بھاگی ہے۔

سات کی پہیلی، شہتیروں سے بغل گیر ہونے کا دعویٰ۔ چاند ستاروں کی باتیں۔ ہونہہ۔ اس نے چاند ستارے کب دیکھے ہیں۔ چاند ستارے تو اس کا منہ چڑاتے ہیں۔

مہا میا کرتا تو کہتی ہے ستارے سے پرے ایک ستارہ ہے۔ جیسے کوئی ستارے دیکھ رہی ہو۔ سات سہیلیوں سے ایک پہیلی ہے جو شہتیروں سے بغلگیر ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ آج تو نظر نہیں آتے۔ ستارے دیکھنے کا دعویٰ۔

میں دلہن ہوں میرے ہاتھ میں آئینہ ہے۔ اس ڈولی میں مجھ سے خوبصورت دلہن سوار نہ ہوتی ہوگی۔ ارے ارے میں خود ہی اپنے حسن کی تعریف کر رہی ہوں۔ دولھا نے تو ابھی مجھے دیکھا بھی نہیں۔ وہ پوچھے گا کے برس ہوگی میری عمر۔ میں کہوں گی سولہ برس۔ جھوٹ تھوڑی ہے۔ سولہ برس ہی کی تو ہوں۔

جیسے کوئی لمبا خواب دیکھتے دیکھتے وہ چونک پڑے۔ یہ کون تھا جو مجھ کو پیچھے سے ... کھا رہا تھا۔ ابھی تک میرا پیچھا ختم نہیں ہوا۔ چلاتے ہوئے ... ہی لادے جاتے ہیں۔ میری چیخوں کی کسی نے پرواہ نہ کی۔ مجھے ڈولی میں سوار کرا دیا۔ اب تو یہ ڈولی مجھے منزل پر پہنچا کر ہی چھوڑے گی۔ یہ میرے تن میں جھرجھری سی کیا دوڑ جاتی ہے۔

یہ میری ٹھوڑی آج اتنی لمبوتری کیوں ہو رہی ہے۔ آئینہ تو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اور یہ گالوں میں گڈھے سے کیا ہیں۔ ارے ارے یہ تو اچھے نہیں۔ ہائے رام۔ میرا چہرہ بدل کیوں رہا ہے۔ جی چاہتا ہے آئینہ کو چوم لوں۔ آئینہ ... ہے۔ لیکن نئے آئینے ہی کی وجہ سے تو میرا چہرہ بدلا ہوا نظر نہیں آ سکتا۔

کیا وید منتر بہت سچے ہوتے ہیں۔ گیہ کی آنچ اتنی ہی ... ہوتی ہے؟

یہ میرے گالوں پر گھی ملکیں یوں کاہے کیوں لگی ہیں۔ یہ سالو اتنا لال کیوں ہے۔ مجھے منتروں کی پروا نہیں۔ بھلے ہی وہ سالو کی طرح لال ہی کیوں نہ ہوں۔ بھلے ہی ان سے مہندی کے عطر کی لپٹیں کیوں نہ آ رہی ہوں۔

مجھے یہ متلی سی کیا ہونے لگی ہے۔ الائچی منہ میں ڈال کر دیکھوں۔ بس بس۔ الائچی میں بھی کچھ نہیں رہا۔ لونگ منہ میں ڈال کر دیکھوں۔ آخ تھو۔ لونگ بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آج تو میں ناتھ کے ہاتھ سے بھی لونگ قبول نہ کروں۔

جدان کے بیاہ پر موٹر آئی تھی۔ میرے بیاہ پر بیل گاڑی بھی نہیں آئی۔ ماں ناراض ہے۔ پیدل چلنا پڑ گیا۔ تو چال بھی گئی۔ ابھی ... دیکھے تو سات کوس ہیں۔ کبھی پیدل بھی چلنا پڑتا ہے۔ وہ سوچتی ہوگی جہاں بیاہ پر اتنا خرچ کیا وہاں ... گاڑی پر کونسے سکڑے خرچ ہو جاتے۔ بھگی۔ ... کام نائن سے پوچھ کر کئے جائیں۔

ڈولی کے آگے آگے چلتا ہوا دولھا سوچتا ہے۔ رات اب راستہ میں آرام نہیں کر سکتی۔ وہاں دلہن کا انتظار کیا جا رہا ہوگا۔ گاؤں کی لڑکیاں گھونگھٹ اٹھا اٹھا کر دیکھیں گی۔ ارے ایسی دلہن تو پہلے اس گاؤں میں آئی نہیں۔ کوئی کہے گی دیوی ہے۔ کوئی اپسرا بتائیگی۔ پہلے گھر کی دہلیز پر تیل ڈالا جائیگا۔ جب کہیں دلہن گھر کے اندر جائے گی۔

دلہن چاہتی تھی دولھا سے بات کر سکے۔ یکبارگی اس کے ذہن میں وہ نغمہ گونج اٹھا جو اس وقت گایا جاتا تھا جب چاندنی راتوں کا ناچ عروج پر ہوتا تھا۔

"ملنو آج دی رات نہ چھیڑیں، مہندی والے ہتھ مہندی"

کسی نے اپنے مہندی رچے ہاتھوں کا واسطہ دیکر دولھا سے سہاگ رات ملتوی کرنے کی التجا کی تھی۔ دلہن نے جھٹ مہندی رچے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ ڈولی کا پردہ دھیمے سے آنیوالی ہوا میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ جیسے یہ دلہن کے پوشیدہ جذبات سے آشنا ہو۔ دلہن کو پردے کی ہر حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔ یہ ہلتا ہوا کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ جیسے یہ بھی آج وہی گیت گانا چاہتا ہے۔

آئینہ سامنے رکھا تھا۔ وہ چاہتی تھی اپنی مینڈھیاں کھول ڈالے اور کسی نائن کی مدد لئے بغیر خود ہی اپنے بال سنوارے۔

جدان سے ملاقات ہوئے کئی مہینے ہو گئے۔ اب وہ گاؤں میں کیوں نہیں آتی۔ کوئی سہیلی بدھوا ہو گئی۔ کوئی بچے کے ہوتے ہوئے بھی بدھوا سے بری حالت میں ہے۔ جدان ہی سب سے خوش قسمت ہے۔ گھر گھر اس کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں بھی اپنے پی کو خوش رکھوں گی۔

سات کوس کی منزل اتنی بھاری۔ گھر کی دہلیز پر کب پاؤں رکھونگی۔ بیا دیا کب رخصت کروں گی۔ دولھے سے کب باتیں کروں گی؟

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر)

قتل برائے قتل

ناکارہ حیدرآبادی

ہاں تہذیب! تم ٹھیک کہتی ہو آدمی اظہارِ عشق یا اسی قسم کے دوسرے ضروری کام میں لگا ہو اور کوئی نئی بات دماغ سے اتار کر معشوقہ کے فائدے کے لئے پیش کر رہا ہو، اس وقت کوئی احمق نازل ہو کر قطع کلام کرے اور دخل دے اس کچھ نہ پوچھو اس وقت کتنا غصہ آتا ہے۔ ایسے موقعے بسا اوقات مقدم پیش رہے ہے نہیں ہوتے۔ شیکسپیئروں کی پوری موت تھے گو ہے کہنے کے ہوتے ہیں اس ستے میں مجھے خوب یاد آیا، ایک دفعہ میں قتل کی کارروائی میں ہمہ تن مصروف تھا کہ ایک ناہنجار نے آکر دخل اندازی کی ——— تہذیب نہ ایک لو۔ مرید اور بس اتنے کہ ہم ایک ہی جگہ ملتے ہیں وٹامن ہوٹل میں ——— کیا؟ وہ! وہ قتل؟ بھلا ایسے میں بھی کوئی آکر توجہ ہٹاتا ہے! ——— کس کا قتل؟ میرے دادا کا قتل ضرورت نصب کرے بہت متحرک سی تھی ——— آہ! تم نے آخر پوچھ ہی ڈالا قتل آخر کیوں کیا۔

تہذیب! قتل کی وجہ موجہ کیا ہوتی ہے؟ عداوت، رقابت، دولت، دیوانگی عام طور سے یہی دوچار محرکات تو ہیں سیاسی قتل بھی ہوتے ہیں۔ قتل عام بھی، اور ان کے لئے معشوق اور تیمور اور چنگیز اور نادر ——— ہٹلر بدنام ہیں قتل ان کے نزدیک ایک ——— ہوگا۔ آرٹ تھا میرے نزدیک بھی ایک آرٹ ہے۔ اب تم جانو۔ آرٹ دو طرح کا ہوتا ہے آرٹ برائے آرٹ اور آرٹ برائے زندگی ابھی ابھی میں نے قتل کے دوچار محرکات کے نام گنوائے وہ آرٹ برائے زندگی کے تحت آتے ہیں مگر میں اس نقطۂ نظر کو عامیانہ بلکہ سوقیانہ سمجھتا ہوں اس میں نہ کوئی جذب یا ندرت ہے اور نہ تازگی ہی اسی لئے میرے نزدیک قتل برائے زندگی کی کوئی اہمیت نہیں میں تو بس قتل برائے قتل کا قائل ہوں اس میں چونکہ ذاتی یا صفاتی عنصر نہیں ہوتا اس لئے وہ ایک پاکیزہ ایک بلند، ایک بے لوث فعل بن جاتا ہے جس کی پرخلوص خدمت ہمیشہ میرا مطمح نظر رہا۔

وجہ سمجھ میں آگئی۔ اب آگے بڑھو میں نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی۔ اس کا قصہ شاید آسکر وائلڈ کی کہانی سے ماخوذ تھا۔

ہوتا یہ ہے ایک پارٹی میں ایک ماہر علم الید شہر کے دوسرے معززین کے ساتھ ساتھ ایک وکیل کا ہاتھ بھی دیکھتا ہے۔ دوسری باتیں بتلانے کے بعد کہتا ہے کہ آپ کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آئے گا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ وکیل اصرار کرتا ہے ماہر پہلے تو انکار کرتا رہتا ہے پھر مجبور ہو کر کہتا ہے کہ آپ ایک قتل کریں گے۔ اس پیشین گوئی سے وکیل کی زندگی پر بڑا اثر مترتب ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت اسی کے متعلق سوچ بچار کرتا رہتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے اس طرح کڑھتے رہنے سے کیا حاصل؟ قتل کرنا ہی ٹھہرا تو کر چکنا ہی بہتر۔ اس کا دشمن کوئی نہ تھا۔ کئی آدمی البتہ ایسے تھے جو اس کے ہاتھوں قتل ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے بعض رشتہ دار بعض رقیب صنعت وکیل بادشاہ سے موکل ایک آدھ نامہربان جج۔ متعدد مقدمات کے گواہ دوچار منافق دوست چنانچہ اس نے ان سب کی ایک فہرست مرتب کی نام بہ ترتیب حروف ہجی لکھے تھے یا نہیں، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ اب سوال یہ تھا کہ آخر ان قسمت کے ماروں میں سے کس کو قتل کیا جائے؟ کیا قرعہ ڈالا جائے؟ ہاتھ کی لکیریں تو کہتی تھیں، ایک اور صرف ایک قتل یہی اصل مشکل تھی، ہینڈی کیپ تھا، کوتاہی تھی۔ قتل جب مقصود بالذات ٹھہرا تو کیوں نہ ان سب کو یکے بعد دیگرے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تاکہ حسرت باقی نہ رہے۔ یہ کیا کہ بس ایک پر اکتفا کرکے بیٹھ رہے؟ نہ تو مستوجب ذلت ہی کافی ہوئی اور نہ دنیا چند خاصے ناپسندیدہ افراد سے پاک ہوئی وہ اپنی کم نصیبی پر افسوس کرتا۔ اسی ادھیڑبن میں رہتا۔ اس کی ذہنی حالت ابتر ہوتی گئی قوتِ فیصلہ جواب دینے لگی پیشہ پر اثر پڑنے لگا۔ بالآخر اس نے ارادہ کرلیا کہ اپنی خالہ جان کو قتل کرنے کی سعادت حاصل کرے۔ وہ بہت بوڑھی تھیں اور بیمار اس طرح ضمیر کے آلودہ ہونے کا اندیشہ نہ تھا بلکہ یہ ایک انسانی خدمت تصور کی جاسکتی تھی کہ ان کو درد و مصیبت سے نجات دلائی گئی اس کے علاوہ وہ جائداد جلد اس کے قبضہ میں آجاتی جو انھوں نے اس کے نام لکھ رکھی تھی۔ چنانچہ اس نے ان کی دوا میں رات کو زہر ملادیا اور گلاس ان کے پلنگ کے پاس چھوٹی میز پر رکھ [illegible]

بڑی بی جو سو رہی تھیں رات کو وقت پر اٹھ کر خوراک پی لیں گی۔
علی الصباح نوکر نے کمرے میں آکر اطلاع دی کہ بڑی بی چل بسیں۔ وہ اپنی پیٹھ ٹھونکنے لگا کہ شاباش! وہ سمجھا اصلی وہ قتل تو بڑا آسان کام ہے۔ لوگ اسے خواہ مخواہ ہیبت ناک شکل میں پیش کرتے ہیں۔ وہ پہلی فہرست میں اس ماہر سے شاگرد کے کارنامے مبارکباد قبول ہو تم بڑے ریسرچ اسکالر ہو۔ آؤ میں تمہارا ہاتھ چوم لوں۔ مگر مرحوم کے کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ جولاک تو جوں کی توں ہے اور بڑی بی عالم بالا جانے والے ہوائی جہاز میں سوار ہو گئی تھیں اس کا دل بیٹھ گیا۔ امیدوں پر پانی پھر گیا اس نے دوا پھینک دی۔ ڈاکٹر کی رائے تھی کہ حرکت قلب بند ہو گئی۔ کیا ستم ظریفی تھی۔ قدرت کا کیا بگڑتا اگر وہ بلا وجہ موت مرنے کی بجائے وہ دوا پی کر جیتے آبا و اجداد سے جا ملتیں۔ منطقی اعتبار سے یہ حرکت بلا ارادہ ہم کے نزدیک درست ہوتی کہ وہ سبب تھا اور یہ نتیجہ۔ یوں بھی اس سے مطمئن ہو جاتا۔ ایک کرشمہ دو کار کے مصداق بھی ہوتا مگر قسمت کے اکثر کام ایسے ہی بے ڈھنگے نے ٹکے ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح ندامت ملامت کے گھونٹ پیتا رہا کہ بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ اسے نگاہِ التفات کس پر پڑے؟ خوف اور کلفت کے مارے حالت روز بروز بدتر ہوتی گئی۔ اگر وہ پہلی منزل میں آئندہ بھی کچا ثابت ہوتا رہے تو وہ کہیں کا نہ رہے گا۔ اس کے حوصلہ اور سلیقہ اور قابلیت پر حرف اور ماموری پر دھبہ آئے گا اور وہ اس کا مطلق روادار نہ تھا۔ قبل اس کے کہ ایسی روح فرسا صورت پیش آئے وہ دوسرے کو قتل کرنے سے پہلے اپنے آپ کو قتل کر دیتا۔ ایسا کامیاب آدمی، اس سے ایک قتلِ عمد کا بھی ارتکاب نہ ہو سکے! یہ خیال سوہان روح بن گیا تھا۔ اتفاق سے ایک دن وہ سڑک پر جا رہا تھا کہ دریا کے پل پر سے وہی ماہر علم الصدا سے آتا ہوا نظر آیا۔ اس کو دیکھتے ہی اسے بڑا طیش آیا۔ بڑا آیا کہیں کا ماہر! زندگی تباہ کر دی، اور مزے سے پھر رہا ہے۔ وہ بسم قسم کی پُرمغز گالیاں دیتا ہوا جھپٹ پڑا اور اُس کا گلا دبوچ لیا اور بالآخر اُسے اُٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ پولیس نے وجہ پوچھی تو بس یہ کہتا ہے کہ میرے مقدر میں لکھا ہے! یہ میرے ہاتھ میں لکھا ہے۔
تہذیب۔ انگور تو تم نے کھائے ہی نہیں بہت میٹھے ہیں۔ لو اور لو تم انگور کھاتی ہو مگر اس کا شربت نہیں پیتیں۔ یہ کیسی بات ہے؟ گڑ کھائیں گلگلوں سے پرہیز!

کیا؟ وہ! دادا جان۔ وہ میرے سگے دادا تو نہیں تھے۔ والد مرحوم کے رشتے کے چچا تھے ایک زمانہ سے ہمارے ہاں رہتے تھے ہاں تو فن برائے فن کی خاطر قتل میرا نصب العین تھا شکر ہے مجھے اس وکیل کی طرح وقت پیش نہیں آئی۔ فہرست تیار کرنی نہ پڑی، ایسی فہرست کہ معلوم ہو قتل کے لیے نہیں بلکہ ——— دعوت کے لئے بنائی گئی ہے۔ فہرست مرتب کرنے میں یہ خرابی تھی کہ انتخاب کا مرحلہ بہت سخت ہوتا۔ میں اس مصیبت سے بچا چاہتا تھا۔ گھر میں جو موجود ہو پھر کیوں نظریں باہر دوڑائیں اس پر گھر کی مرغی کی پھبتی آتی تھی۔ دادا جان کی عمر ۸۰ کے لگ بھگ تھی۔ مٹتی تہذیب کی یادگار تھے، وہ جوانی میں بہت خوبرو تھے اور بڑھاپے میں بھی عجیب رعب اور دبدبہ تھا ایسا کہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ ان کی صحت ماشاء اللہ ایسی تھی کہ نوجوان بھی رشک کریں۔ منہ میں دانت بھی تھے، اور پیٹ میں آنت بھی۔ وہ سرو قد تھے اور بہت مضبوط۔ ان کی سفید داڑھی پھریرے کی طرح لہراتی رہتی تھی ان کی آواز بڑی سُریلی، بڑی شیریں تھی ان کی بڑی بڑی آنکھوں کی روشنی کبھی بلیک آؤٹ کی زد میں نہیں آئی وہ مجھے بہت چاہتے تھے۔ میں بھی انہیں دل سے عزیز رکھتا تھا۔ اور اس لئے اس خیال سے کہ مجھے ان کو قتل کرنا ہے واقعی بڑی تکلیف ہوئی ——— کیا؟ ہا ہا! ہمدردی کا شکریہ لیکن تہذیب غور کرو۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ان کی زندگی بے مصرف ہو کر رہ گئی تھی۔ حقہ پینا، شطرنج کھیلنا، تاریخی قصے پڑھنا، گذشتہ دور کے واقعات سنانا، بس یہی ان کے روزمرہ کے کام تھے۔ اس طرح وہ موت کے انتظار میں بیٹھے تھے میں دیکھ رہا تھا، اس زمانے میں آدمی ہارٹ فیل ہونے سے مر رہے ہیں۔ اندیشہ رہ رہ کر ستاتا تھا کہ کہیں یہی سانحہ پیارے دادا جان کے ساتھ بھی پیش نہ آجائے۔ میں اُن کو اس پامال راہ پر گامزن ہونے سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا میرا فیصلہ تھا کہ ان کی موت کی سطح بلند ہو۔ اس میں جدت و انفرادیت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا کہ سوتے میں انہیں دوسرے جہاں کا ٹکٹ دلوا دیا جائے ——— تہذیب شکر دو چمچے یا ایک چمچہ؟ دو چمچے اچھی بات ہے۔

ہاں تو برسات کا زمانہ تھا۔ ہم شہر سے دور اپنے باغ میں

پُرلطف موسم گذار رہے تھے۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت مکان تھا جس
نے بڑی محنت سے باغ سجایا تھا۔ قسم قسم کے نایاب پھول اور
پھل کے درخت لگائے تھے۔ اب بھی وہ باغ موجود ہے۔ میں کبھی
تمہیں وہاں لے چلوں گا۔ جنت ہے جنت۔ ایک بار داخل ہونے
کے بعد وہاں سے نکلنا محال ہوگا۔ کیا؟ ہاں وہ قتل۔ موضوع
سے بھٹکنے کی بری عادت پڑ گئی ہے۔ ہاں تو اس روز رات کو
حسبِ معمول ہم دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ دادا جان حسبِ
عادت ایک قصہ سنا رہے تھے شکار کا قصہ۔ وہ اپنے دو
دوستوں کے ساتھ شیر کے شکار کو گئے۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ
مچان پر جا بیٹھے۔ نیچے بکرا باندھ دیا گیا۔ کیا؟ اچھا اچھا
دیکھو میں بے ـــــ خبر تہذیب تمہارا شکریہ۔ تم شکار کے
قصے اس قسم کے نقشہ کو دیکھ [illegible] رہی ہو۔ مگر [illegible] یہ
کہ یہ ایک معمولی کہانی ہے۔ کھانے پر میں اُن کے ساتھ ضرورت
سے زیادہ محبت و اخلاص سے پیش آیا۔ اُن کا آخری ڈنر تھا
اور اس لئے بار بار جی چاہا کہ ان کا جامِ صحت نوش کروں۔ تہذیب
یقین مانو میں ان کا بڑا ادب و احترام کرتا تھا۔ ان کی شخصیت
میں عجیب کشش تھی۔ ان کی شرافت، ان کی فیاضی، ان کی
شائستگی۔ غرض ہر شخص ان کا گرویدہ تھا اور چونکہ میں ان کو
قریب سے دیکھتا آیا تھا اس لئے میں تو اُن کی پرستش کرتا تھا۔
تم سمجھ ہی اندازہ لگا سکتی ہو کہ ان کے قتل کے بعد
مجھے کتنا رنج اور صدمہ ہوا ہوگا۔ اب بھی رنج رہتا ہوں۔ اکثر
ان کی یاد آتی ہے، ان کا خوبصورت چہرہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے،
ان کی شیریں آواز کانوں میں گونجتی ہے تو دل بے چین ہو جاتا
ہے۔

کھانے کے بعد شطرنج ہوئی۔ میں نے مات کھائی۔ اس کے
بعد دادا جان خدا غریقِ رحمت کرے اپنی خوابگاہ میں گئے۔ وہ
بہت بے خبر سویا کرتے تھے۔ اور بڑی مشکل سے جاگتے تھے کیونکہ وہ بیحد
تندرست تھے۔ فکر و افکار بھی نہیں تھے۔ چنانچہ ان کی گہری نیند
ان کی اور میری دونوں کی آسانی کا باعث تھی اور اسکا نتیجہ
میں نے بہت اطمینان آفریں طور پر تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔
قبلہ دادا جان پرانے وقت سے گیارہ بجے سو جاتے تھے اور
ابھی تو دس بھی نہیں بجے تھے۔ میں اپنے کمرے میں شب خوابی کا
لباس پہن کر انتظار کی کٹھن گھڑیاں کاٹنے لگا۔ تہذیب۔ وقت کی
رفتار کا اندازہ میں عجیب طریقہ سے لگایا کرتا ہوں۔ میرا سگریٹ پورے
دس منٹ جلتا ہے۔ اس طرح سے ایش ٹرے میں سگریٹ کی تعداد
کو دیکھ کر میں معلوم کر لیتا ہوں کہ کتنے منٹ یا کتنے منٹ یا کتنے
گھنٹے صرف ہوئے۔ دادا جان کے طور طریق لاکھ قابلِ
تقلید سہی، ان کے حقّے میں یہ وصف کہاں! چنانچہ اُس وقت بھی
میں آرام کرسی پر لیٹا سگریٹ سے سگریٹ جلاتا رہا۔ دئے سے
دیا جلانے کے دن تو ختم ہو رہے تھے۔ چھٹا سگریٹ ختم ہوا۔ میں
اُٹھا۔ عمل کا وقت آ گیا تھا۔ ایک اور پیگ چڑھا گیا۔ شیکسپیئر کا
ایک ڈراما ہے میکبتھ۔ شیکسپیئر واقعی لاجواب ڈراما نگار ہے۔
فطرتِ انسانی کے کیسے رنگا رنگ پہلو اس نے پیش کئے ہیں۔ اس
ڈرامے میں ہوتا یہ ہے کہ ڈنکن ـــــ کیا؟ اوہ! تم نے وہ
ڈراما پڑھا ہے۔ بہرحال تذکرہ مجھے یاد آ گیا تھا۔

ہاں تو اللہ کا نام لے کر ـــ نہیں میں نے غلط کہا میں
نے بسم اللہ نہیں کہا تھا۔ وہ فقرہ تو محض محاورے کے طور پر
زباں سے نکل گیا۔ میں خوابگاہ کی طرف چپکے سے چلا۔ مجھے نمود و
نمائش سے چڑ ہے۔ میں ہمت کا ہر کام رازداری سے انجام دیتا ہوں
اس طرح کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ چنانچہ اب بھی محتاط طریقہ پر
اپنی مہم پر روانہ ہوا۔ اگر کوئی اس وقت مجھے دیکھتا تو یہ نہیں کہہ
سکتا تھا کہ عام قاتلوں اور مجرموں کی طرح چوری چھپے کام
کر رہا ہوں۔ سنتا آیا ہوں ایسے وقت آدمی بدحواس ہوتا
ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ ہوتا ہے۔ ٹانگیں بے دم ہوتی ہیں۔
دل بے قابو ہوتا ہے۔ پسینہ چھوٹ جاتا ہے مگر میں بالکل سکون
اطمینان کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ میں
دولت کے لالچ میں یا عداوت کی دیوانگی میں آ کر یہ کام نہیں
کر رہا تھا۔ میری ذاتی اغراض اس سے وابستہ نہیں تھیں۔ جذباتی
پہلو کا عمل دخل نہیں تھا بلکہ ایک اعلیٰ و ارفع مقصد پیش نظر
تھا۔ تمہیں کہو آرٹ کا ارتکاب کوئی جرم ہے؟ کیا جس [illegible]
کو سرانجام ہونا پڑے؟ خیر دادا جان خدا انہیں جوارِ رحمت
میں جگہ دے، خوابگاہ کا دروازہ فقط بھیڑ کر سویا کرتے تھے۔
آسانی ہر قدم پر میرے قدم چوم رہی تھی۔ داخل ہو کر میں نے
دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کھڑکی کے پاس وہ پلنگ پر خراٹے
لے رہے تھے۔ چاند کی شعاعیں ان کی بہت سی [illegible] داڑھی اور بالوں
سے کھیل رہی تھیں۔ ویسے بھی اُن کا چہرہ نورانی تھا اور اب [illegible]

ستمزادہ پر نور آسمان سے برس رہا تھا، ایمان سے کہتا ہوں، چار چاند لگ گئے تھے۔ اس سے پہلے وہ کبھی ایسے پُرشکوہ حُسن کے مالک نظر نہ آئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں سوتے میں چاندنی چہرے پر پڑے تو ناگوار گزرتا ہے مگر دادا جان مرحوم تو سالہا سال سے اسی طریقہ پر سوتے آئے تھے۔ اس میں انھیں کوئی نقص نظر نہ آیا تھا۔ ان کی مثال سے یہ نظریہ باطل قرار پاتا ہے۔ مجھے افسوس ہوا کہ اس سے قبل ان سے اس بارے میں گفتگو کرنے کا موقع نہ ہوا لہٰذا اب وہ بہت بے از وقت تھا۔ وہ بچے کی طرح میٹھی نیند میں تھے بہت ہی مطلب انداز سے دراز تھے ان ہی کی خاطر میں نے شکر ادا کیا کہ وہ اس نہایت موزوں و مناسب طریقہ پر سو رہے تھے میرے ہاتھ میں پستول تھی مگر اس کو میں چلانا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے آس پاس کے لوگوں کی نیند میں خلل آتا۔ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بن جاتا میں نے پستول کو اُلٹا پکڑا اور پوری قوت کے ساتھ دستے سے ضرب لگائی —— تہذیب دیکھو تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے کہو تو دوسری بنا دوں؟ نہیں؟ اچھی بات ہے۔

ہاں تو —— مگر یہ تم حیحس کیوں نہیں؟ بیٹھی مسکرا رہی ہو —— ہاں ہاں مجھ سے جرم بالکل تو سرزد نہیں ہوا تھا آرٹسٹک نقطۂ نظر چاہئے شکریہ —— ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ اس ضرب کا اثر نہایت لائقِ تحسین رہا۔ دادا جان صدا کے بہترین طریقہ پر خواب میں بیہوش ہو گئے۔ تب مجھے اس کی کوئی مشق نہ تھی اور مجھے واقعی حیرت اور مسرت ہوئی کہ میں نے بڑی نفاست سے اتنا کام کیا۔ تہذیب اسے خودستائی نہ سمجھو لیکن حقیقت یہ ہے کہ نئے کام میں مہارت یا مشق کے بغیر اس آسانی اور خوبی سے کرتا ہوں کہ اچھے اچھے مدتوں کی مشق کے بعد بھی نہیں کر سکتے۔ اس بات پر مجھے ناز ہے —— کیا؟ ہی ہی ہی! اب یہ تم تعریفیں رہنے دو۔ بھلا تم کو میں جانتا ہوں۔ بہرحال اتنا تو میں بھی مانتا ہوں کہ اس قتل کے معاملے میں ٹینس کی مشق بہت کام آئی۔ یعنی میں نے بہت سیدھے اور بہت زور سے وار کیا جیسا کہ تم جانتی ہو۔ مجھے ٹینس سے بڑی دلچسپی ہے۔ اچھا کھلاڑی ہوں۔ اس میں بڑی ورزش ہوتی ہے —— کیا؟ اوہ! پھر میں نے گریز کیا۔ جیسا کہ میں کہہ رہا تھا وہ بڑی [illegible] کے ساتھ ہوش کھو بیٹھے۔ میں نے دوسری کاری ضرب [illegible] اٹھایا۔ تب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا —— تہذیب کچھ اور تو میں نے بھی کہا بیکار قصہ شروع کیا، تم نے تو کچھ کھایا ہی نہیں —— کیا؟ اچھا اچھا قصہ ختم کروں۔

اس دخل در معقولات پر بہت غصہ آیا۔ نوٹ کرو غصہ آیا گھبراہٹ نہیں ہوئی تمہیں یاد ہوگا تم نے کہا تھا، لوگ کام میں دخل دیتے ہیں تو بہت ناگوار گزرتا ہے۔ اسی بات پر مجھے یہ واقعہ یاد آیا اس وقت رہاں بلا ناغہ خلافِ مصلحت۔ ہوتا تو مجھے ابدلتے ہی کچھ دلاور نا گفتہ تھا۔ اس شخص کی شان میں نکل جاتے۔ میں چپ چاپ کھڑا رہا امید تھی کہ دادا جان کو محو خواب سمجھ کر وہ چلا جائے گا لیکن یہ توقع نے [illegible] اس نے اور زور سے دروازے پر طبلہ بجایا۔ اب تو میں آ—— باہر ہو گیا کمبخت جین لینے نہیں دیتے مگر یہ تکلیف دہ دخل اندازی ختم ہونی چاہئے میں نے حتی الامکان حسبِ نصیب دادا جان کی آواز بنا کر اس طرح پکارا کہ گویا نیند سے اُٹھے ہیں۔ "کس ہے؟" میرے ملازم نے جواب دیا "سرکار۔ گھر کو آگ لگ گئی!" میں نے اُسی آواز میں کم سمجھی کا ثبوت دیا۔ "چل جا!" اور تکیوں کو اس طرح اُلٹ پلٹ کیا کہ گویا پھر سونے کی تیاری ہے۔ میرے ملازم جانتے تھے کہ دادا جان اعلیٰ اللہ مقامہ دوسرے وقت تو بڑی نرمی سے پیش آتے تھے مگر نیند سے کوئی انھیں جگاتا تو اُن سے بُرا کوئی نہ ہوتا میرا ملازم کچھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا اس کے بعد کی داستان مختصر ہے میں نے رہا سہا کام بڑے اطمینان اور بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ختم کر دیا۔ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے اس تک ہی میں ایک ناحق آپ بیتی سنانے میں تمہارا بہت سا وقت خراب کر چکا ہوں دادا جان خدا مغفرت کرے، انھوں نے نعیم احمت کے سکوں کے ساتھ ہلاک ہو کر مجھے سہولت بہم پہنچائی اسکے اعتراف کے طور پر میں نے جہلم کی بہت شاندار دعوت کی تمہیں شب کہ اُس وقت املاح کی ایسی دولت وگرانی اور راتب بندی نہیں تھی اس پُرتکلف دعوت کو دیکھ کر دوست تو دوست دشمن بھی یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ دادا کے اتفاقیہ طور پر جل مرنے سے پوتے کو بیحد صدمہ ہوا ہے کیا؟ ہاں وہ آگ تہذیب ایسی خبریں عموماً بعد از وقت آتی ہیں ہنگامہ ہو تو پولیس اور آگ لگے تو فائر بریگیڈ چنانچہ اس بریگیڈ کے آتے آتے اور پانی ڈھونڈ کر پہلی دھار چھوڑنے تک میرا وہ خوبصورت مکان مع دادا جان کے جل کر خاکستر ہو گیا اور اس طرح قتل کا وہ قصہ ہی دب کر رہ گیا۔ کہا؟ آگ کی وجہ؟ مجھے کہانی سنانے کا ڈھنگ ہی نہیں ہے دیکھو میں یہ بتانا ہی بھول گیا کہ قتل کو نکلنے سے پہلے آگ میں نے ہی لگا دی تھی۔ —— تہذیب قصہ تو ختم ہوا۔ اب کہو میرے سوال کا جواب کیا سوچا۔

مرقسم رشی دہلوی

"ہز ایکسلینسی ڈان جان کی ایک رات"

یہ روایت صحیح ہو یا غلط مگر مشہور ضرور ہے کہ ان کی عمر میں میری
سے جب کہ وہ شائع ہوا، پہلی اور آخری مرتبہ "ڈان جان" ایک
رات بالکل تنہا سویا ـــــ اس کے پاس کوئی رفیق شب نہ تھا۔
رات ڈان جان کے لئے انتہائی صبر آزما تھی مگر اتفاق ایسا
کہ اس رات اسے کوئی رفیق شب میسر ہی نہ آسکا کیونکہ وہ
سفر کر رہا تھا اور پیدل

یہ قصہ اُس رات ہے جب ڈان جان ـــــ وہ آتش
مزاج فسوں طراز ایک بے برگ و گیاہ ویران وادی میں پہنچا ـــــ
ایسی وادی تھی جس کے چاروں طرف آسیب کی "دیوار قہقہہ" کھڑی
تھی، جیسے ہی آدمی اسے چھونے کے لئے آگے بڑھتا وہ دیوار اور
پیچھے سرک جاتی تھی اور صحرا میں ایک قہقہہ بلند ہوتا تھا جیسے
جن بیابانی اُس کا مذاق اُڑا رہے ہوں۔

اس رات ڈان جان اپنے وطن واپس آرہا تھا۔ وطن
میں اپنے باکمالوں کی کہاں قدر ہوتی ہے، یہی حال ڈان جان
کا تھا اور ہماری تمہاری طرح وہ بھی اپنے وطن میں احمقوں کی طرح
رہتا تھا اور اس کے کمالات سے اگرچہ ساری دُنیا واقف تھی لیکن
تھی، مگر اس کے اہل وطن کی سرد مہری اور ڈان جان کے کمالات
سے محرومی و عدم التفاتی بھی ایک طرفہ کہانی ہے۔ خیر تو ایک
دفعہ ایسا ہوا کہ "ڈان جان" اپنے وطن واپس آرہا تھا۔ سانپ
جب اپنے بل میں گھستا ہے تو بالکل سیدھا ہو جاتا ہے یہی حال
ڈان جان کا تھا چونکہ وہ اپنے وطن واپس آرہا تھا اس لئے
کوئی عورت اس کے ساتھ نہیں تھی اور یہ دُنیا کا "آٹھواں عجوبہ"
تھا!

کہتے ہیں کہ ڈان جان کے وطن کے سامنے ایک دریا بہتا تھا۔
اس رات بارش بہت سخت ہو رہی تھی، اور اس دریا میں طغیانی
آ رہی تھی اس لئے وہ عبور نہ کر سکا۔ سواری مجبوراً دریا کے
اس پار روک لی گئی۔ فرض کر لیجئے کہ وہ پالکی میں بیٹھا ہوا تھا
وہ اس میں سے اُترا چاروں طرف نظر دوڑائی نہ قریب کوئی پناہ
کی جگہ ہے یا نہیں سامنے دور ایک محلسرا نظر پڑی جس کی اوپر کی

منزل میں ایک شمع جھلملاتی ہوئی نظر آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ کسی امیر کا مکان
ہے جس نے شہر کی اذیت آوازوں اور شور و غل کی تکلیف دہ
دُنیا سے بچنے کے لئے یہ خاموش مکان بنا رکھا ہے اور اس وقت
وہ اپنی خلوت گاہ میں ہے ـــــ خلوت گاہ کا خیال آتے ہی
ڈان جان کے خون میں حرارت پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ اس نے
سوچا کہ اگر اہل وطن کے جیرکا نہ لگایا تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی
آج کی رات اگر ڈان جان تنہا سویا تو گویا ساری عمر اُس نے
جھک مارا۔ کیا عجب ہے کہ اس امیر کی کوئی اکلوتی لڑکی یا اکیلی
بیوی اس وقت تنہا ہو، امیر کو خرگوشوں کے شکار کا شوق
صبح سے ہی دیہات کی طرف لے گیا ہو اور بارش کی وجہ سے
وہ مع اپنے کتوں اور شکاریوں کے واپس نہ آسکا ہو۔ مجھے
مسافر جان کر خاتون خانہ اپنے مکان میں صبح تک رہنے کی اجازت
دے دے اور قدرت اس کی رات کو تنہائی کی کوفت سے بچالے۔

یہ سب باتیں سوچ کر ڈان جان اس محلسرا کی طرف
چل پڑا۔ سامان اُتروایا دستک دی۔ ایک نوکر نے آکر
دروازہ کھولا اور نام دریافت کیا۔ ڈان جان نے پوچھا۔
"صاحب خانہ تشریف رکھتے ہیں؟" جواب ملا "ہاں لیکن وہ ایک سال
سے اپنے مکان سے باہر نہیں نکلے۔ دن رات غم و الم کی تصویر
بنے لائبریری میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ترک لذات کی قسم کھالی
ہے کیونکہ آج پورا ایک سال ہوتا ہے کہ ان کی جوان اور خوبصورت
دُلہن کا عین شب عروسی کو انتقال ہو گیا تھا۔ مکان میں سوائے
ایک مرد نوکر کے کوئی دوسرا نوکر نہیں ہے وہی سب کام کرتا ہے
صاحب خانہ کو عورتوں سے نفرت ہے اور وہ ہر وقت اپنی دُلہن
کی شبیہہ کو تصور کے سامنے دیکھتے دیکھتے کافی حد تک پاگل
ہو چکے ہیں۔"

ڈان جان کو یہ معلومات بہت اچھی معلوم ہوئیں اور
دل میں سوچنے لگا کہ ایسے محروم العیش انسان سے مل کر ضرور
کوئی نئی بات معلوم ہو گی۔ چنانچہ ملازم نے اندر جا کر اطلاع
دی اور جب اندر داخل ہونے کی اجازت مل گئی تو ڈان جان محلسرا

میں دبا دیا۔ ہر چیز پر سوگ سوار تھا۔ پردے کالے تھے کالے اور نیلے پھولوں کے گجرے دیواروں پر لٹک رہے تھے نیم سوختہ شمعیں جابجا بکھری پڑی تھیں۔ غرض ہر شے سے وحشت و تردّد۔ موت اور اُداسی کا اثر نمایاں تھا۔

مالک مکان نے رسمی ملاقات کے بعد کہا "ہز ایکسلینسی ڈان جان اس کو اپنا ہی مکان سمجھئے اگر میری بیوی زندہ ہوتی تو میں آپ کو ہرگز اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیتا کیونکہ ہمارے شہر کا کوئی شوہر ایسا نہیں ہوگا جو ایک شب تک بیوی کو بھی ڈان جان کی طرف سے محفوظ سمجھے لیکن مجھے اطمینان ہے کہ آپ میری مسرت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اس لئے آپ کے لئے اس محل کے دروازے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں۔"

ڈان جان کو سخت ملال تو اس پر ہوا کہ مکان میں کوئی عورت ہی نہیں ہے حد یہ کہ ملازمہ تک نہیں ہے۔ مالک مکان نے بتایا کہ جب سے میری دلہن کا انتقال ہوا ہے عورت کی شکل ہی نہیں دیکھی۔"

مالک مکان کو معلوم تھا کہ دنیا میں ڈان جان سے بڑھ کر عورتوں کا دل جلانے والا کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔ ایسے بے مثل لذت کش کو جلانے میں بڑا مزا آتا ہے اس لئے مالک مکان نے اپنی بیوی کے حسن کی داستان چھیڑ دی۔ کہنے لگا کہ "ایسی نازک ایسی حسین اور سب درست کی عورت دوبارہ پیدا نہیں ہوگی افسوس کہ عین شب عروسی کو اس نے بستر عیش پر جان دیدی اس کا بستر اب تک جوں کا توں خلوت خانہ میں موجود ہے وہی دوہرا پلنگ۔ وہی تکیئے۔ سفید چادریں۔ پھول اور خوشبو کی چیزیں ویسی ہی اردگرد رکھی ہیں۔ میں نے ہر قسم کی لذت سے منہ موڑ لیا ہے حد یہ کہ اپنی دلہن کے غم میں کھانے سے بھی فراغت حاصل کر لی ہے۔ بس اتنا اور ایسا کھا لیتا ہوں کہ زندگی برقرار رہے یہی وجہ ہے کہ کسی قسم کے اعلیٰ اہتمام کے بغیر میری غذا تیار ہو جاتی ہے اور میں اس خیال میں مگن ہوں کہ جسم اور روح کو ہر طرح کی اذیت پہنچا رہا ہوں۔"

ڈان جان نے بھانپ لیا کہ یہ جنسی دیوانہ ہے اور شاید شب عروسی بھی اس نے اچھی طرح نہیں گذاری بس باتوں ہی باتوں میں رات کٹ گئی اور صبح کو اس کی دلہن کا دم اس صدمہ سے نکل گیا کہ ایسے محروم تمنا [illegible] ۔ زمانے میں ڈان جان کو بھی مزا آتا تھا چنانچہ اس نے اپنی عیاشی کے قصے سنانے شروع کر دیئے۔

یورپ کا کون ایسا ملک اور شاہی خاندان اور امیر گھرانہ تھا جہاں اس نے اپنے عیش کی داغ بیل نہ ڈالدی ہو۔ وہ جہاں پہنچتا تھا لوگ اپنی عورتوں کو چھپا دیتے تھے۔ سات پردوں میں بند رکھتے تھے مگر اس میں نہ جانے کیا مقناطیسیت تھی کہ عورتیں خاص کر شادی شدہ عورتیں اُڑ کر اسکے پاس پہنچتی تھیں۔ فرانس۔ جرمنی۔ اسپین۔ آسٹریا میں اس کے کارنامے زبان زد عام تھے ـــــــ ان تمام لذت بخش حکایتوں کے سنانے کا مقصد صاحب خانہ کو ذہنی کلفت میں مبتلا کرنا تھا مگر صاحب خانہ بھی ایک پاگل تھا اور وہ ڈان جان کو جیسی جلن کے دہکتے ہوئے دوزخ میں جھونک دینے پر تلا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے نوکر کو آواز دی اور حکم دیا۔

"آپ کو ہمارے خاص کمرے میں سلایا جائے۔" نوکر اس حکم کو سنکر ہکا بکا رہ گیا۔ کیونکہ اس خاص کمرے کو ہر وقت مقفل رکھا جاتا تھا صرف رات کے وقت نوکر اندر جاکر شمع جلا کر باہر نکل آتا تھا۔ بستر کو چھونے یا کمرے کی کسی چیز کو اُلٹ پلٹ کرنے کی اجازت نہ تھی جب سے کہ دلہن کا انتقال ہوا تھا اس کمرے میں پانچ چھ دفعہ سے زیادہ صاحب خانہ نہیں سویا تھا اور وہ بھی صرف اس وقت سویا تھا جب گرمیوں کے دنوں میں جنونی کیفیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور چاند پورا تھا اور اس کی ساری روشنی خلوت خانہ میں آجاتی تھی۔ ان راتوں کو دلہن کے پلنگ سے لپٹ کر جب صاحب خانہ روتا تھا تو در و دیوار لرز اُٹھتے تھے۔ نوکر نے جو یہ سنا کہ اس خاص کمرے میں مہمان کو ٹھہرایا جائے گا تو اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

ڈان جان سے مخاطب ہو کر کہا "آپ نے اسپین اور فرانس میں معطر و مزین بستروں پر اپنی راتیں گذاری ہیں اس لئے آپ کے شایان شان ایک ہی بستر ہے جو میرے پاس ہے وہ شب عروسی کا بستر ہے جس پر میری بیوی نے صبح عروسی کو جان دی۔ آپ اس پر استراحت فرمائیں۔ باقی ایک کمرہ اور ہے اس میں غیر معمولی بستر ہے اور وہاں میں نے ایک بکری باندھ رکھی ہے تاکہ اس کے پیشاب کی بدبو سے میری خوابگاہ ہمیشہ سڑتی رہے، ظاہر ہے کہ یور ایکسلینسی کہ جنہیں

کبھی تنہا سونے کی عادت نہیں اور نہ دلہن والا بستر کبھی ان کے تصور میں آتا ہوگا، اس جگہ نہیں سُلائے جا سکتے!"

ڈان جان کو اس جیسی دلہن پر سخت غصہ آ رہا تھا مگر پھر یہ خیال آیا کہ اسے نیچا دکھاتا ہے۔ مجھے اپنے بستر عروسی پر سُلا کر بدلہ لینا چاہتا ہے۔ مجھے روحانی اذیت میں مبتلا کر کے خوش ہونا چاہتا ہے۔ خیر دیکھا جائے گا۔

خاص کمرہ کھولا گیا۔ خوشبو کی لپٹ نے ڈان جان کے حواسِ خمسہ پر ایک آرزو انگیز حملہ کیا۔ کنکھیوں سے صاحبِ خانہ کی طرف دیکھا۔ بدی اور انتقام کے جذبات کی دو شمعیں اُس کی سیاہ آنکھوں میں جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ ڈان جان نے سوچا کہ اگر اس قفس میں چڑیا قید ہوتی تو بلّی کو بھلا اندر چھوڑا جا سکتا تھا۔ خالی پنجرے میں مجھے بھیج کر اپنا دل خوش کرنے کی ٹھانی ہے۔ ڈان جان کو لمبی رات صحرا کی طرح پھیلتی ہوئی دکھائی دی۔

صاحبو! کیا عرض کروں کہ وہ بستر عروسی کہلاتے تھے۔ اوّل تو دو انسانوں کے لیٹنے کے لئے لمبی چوڑی مسہری اور پھر جب ڈان جان کو یہ معلوم ہوا کہ پچھلی پانچ چھ نسلوں سے اس خاندان کے ہر فرد نے اپنی شبِ اوّل اس ہی بستر پر گذاری ہے تو اُس کے تن بدن میں ایک گرم سا لرزہ سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اتنے بڑے پلنگ کی وسعتوں اور ناقابلِ بیان خلا کا اندازہ لگایا تو ڈان جان کو دُنیا اندھیر معلوم ہونے لگی۔ بھلا یہ کیا قیامت ہے کہ اتنا بڑا پلنگ اور اس پر ایک مرد کونے میں پڑا سُکڑا ہوا لیٹا رہے۔ ڈان جان نے کپڑے اُتارے اور مالکِ حقیقی کا نام لیکر بستر پر لیٹ گیا۔ چادریں اوپر ڈال لیں۔ ڈان جان کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی منحوس بستر عروسی پر نہیں برف کی قبر میں لیٹا ہوا ہے۔ پیر جس حد تک پھیل سکتے تھے پھیلا دئے مگر چادر کی وسعت شاید ابھی اور باقی تھی۔ جدھر ہاتھ ڈالتا تھا خنکی محسوس ہوتی تھی جس شے کی گرفت کی ایسا معلوم ہوا قبر کی مٹی سے مصافحہ کر رہا ہے۔ خوشبوئیں ہی خوشبوئیں۔ سُرخی ہی سُرخی۔ سرسراہٹ ہی سرسراہٹ مگر خنکی ہی خنکی۔ تنہائی ہی تنہائی۔ ایک طرف ذرا کروٹ لی اور مسہری کے بقیہ خلا کا اندازہ لگایا تو معلوم ہوا کہ میلوں لمبی قطب شمالی کی ایک گلی ہے کہ چلی گئی ہے۔ اُف یہ ٹھنڈا صحرا۔ ڈان جان کی یہ رات کیسی منحوس رات تھی۔ ایسا ہی ہے جیسے کسی غازی مرد کو میدانِ کارزار میں دادِ شجاعت دینے کے بدلے گورکنی کے کام پر لگا دیا جائے!

مگر ڈان جان نے سوچا کہ اگر اس بستر پر بے حس و حرکت لمبے لمبے پڑے رہے تو قبر کا قبل از وقت مزا آ جائے گا اور یہ تصوّر حرارتِ غریزی کے لئے سخت مضر ہے اور وہ حرارتِ غریزی کا کھلاڑی ہے۔

بالکل صاحبِ خانہ نے اسے جو غذا کھلائی تھی وہ وہی تھی جو خود کھایا کرتا تھا۔ اس کی صحیح تعریف کرنی مشکل ہے۔ وہ اس وقت ڈان جان کے پیٹ میں گڑ بڑ پیدا کر رہی تھی اور جونہی وہ غنودگی پر مائل ہوتا پیٹ کا درد شروع ہو جاتا۔

"ڈبل بیڈ" میں تنہا سونا بجائے خود ایک آرٹ ہے اور ظاہر ہے کہ ڈان جان کے لئے اپنی عمر میں اس چیز سے پہلا واسطہ پڑا تھا اس لئے اسے قدم قدم پر مشکلات محسوس ہو رہی تھیں اور وہ اس آرٹ کو از خود سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مثلاً ابتدائی تکلیف تو اس طرح دُور ہو سکتی ہے کہ اگر بستر کے اس حصّہ پر لیٹنے میں کوئی تکلیف محسوس ہو تو دوسرے رُخ جا لیٹو۔ اس سے اکثر افاقہ محسوس ہوتا ہے۔ ایک طرف پڑے پڑے ڈان جان کو کوئی دو گھنٹے گذر گئے تھے کہ یکایک اُسے یہ خیال آیا کہ پلنگ کا دوسرا سرا ابھی قابلِ استعمال ہے۔ چنانچہ پلنگ کے جغرافیہ کا یہ انکشاف اسے بہت ہی حیرت انگیز محسوس ہوا۔ بہت خفگی کے ساتھ وہ قلا بازی کھاتا ہوا ادھر سے اُدھر جا پڑا مگر خنکی اور تنہائی کی یہاں بھی وہی کیفیت تھی۔ ڈان جان خنکی سے کپکپانے لگا۔ سردی کم کرنے کے لئے اُس نے پھر ایک لڑھکنی کھائی اور دوسرے تکیے پر آ ٹپکا۔ پلنگ کی چادر ایسی خنک تھی جیسے فاحشہ کا بوسہ!

ان تکیوں اور چادروں کے لئے اگر کوئی لفظ اس وقت ڈان جان کے ذہن میں آ رہا تھا تو وہ "برف" تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برف کی ٹانگیں اس کی ٹانگوں پر لپٹی جا رہی ہیں۔ برف کے بازو اس کے بازوؤں کو لپیٹے لیتے ہیں۔ ڈان جان کے دل میں دھڑکن شروع ہوئی۔ اور دونوں ہاتھوں کا سہارا لیکر وہ

...سے تکیے کی طرف غور سے دیکھا کمرہ تاریک تھا نبض ...تیز تھی۔ نبض معرکہ رہی تھی۔ کنپٹیاں گرم ...اس نے جنونیوں کی طرح سب کپڑے، ساری چادریں ...کو شال سمیت اُٹھا اُٹھا کر پھینکنی شروع کر دی۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی ٹھنڈا جسم اُسے لپٹا جا رہا ہے اسے تکیے ...گر اُسے ...رہا ہے ــــــ اسے مُردہ دلہن کے بھوت کا ...ہی ہو رہا تھا اور یہ ہو سکتا تھا کہ خوف کے مارے اس کی ...جان نکل جائے مگر یکایک اسے ایسا محسوس ہوا کہ برف کی دو ...قاشیں اس کے گرم لبوں سے آ کر پیوست ہو گئی ہیں ...ان قاشوں کا مس محسوس ہوتے ہی اس کے ہونٹ کپکپانے لگے ...دھڑ سے اس تکیے پر گر پڑا جس پر مالک مکان کی بیوی کا سر شب عروسی کو رکھا ہوا ہو گا ــــــ اس کے لب تکیے سے پیوست رہے حواس جاتے رہے اور وہ صبح تک ٹھنڈا برف پڑا رہا۔

چند قدم کے فاصلے پر مالک مکان اپنے کمرہ میں لیٹا ہوا تصور میں ڈان جان کے توحش کا سماں باندھ رہا تھا۔ خود اسکو مردہ بیوی کی روح آ کر وحشی بنا چکی تھی۔ ایک دفعہ نہیں کئی مرتبہ اس کا واہمہ اسے کھیل کھیل چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ڈان جان کا ہوس انگیز دماغ ضرور میری بیوی کے بھوت سے سرد آ رہا ہوگا۔ وہ پاگل ہو جائے گا۔ وہ اندھیرے میں ہڑبڑا کر اُٹھے گا ممکن ہے گر پڑے۔ زور کا دھماکہ ہو اس کی چیخ نکل پڑے۔ دروازے کے زور زور سے گھونسے مارے ــــــ مگر میں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے وہ وحشیوں کی طرح اندر چلاتا رہے گا اور میں صبح کو جب اُسے جا کر جگاؤں گا تو وہ رات کے ...سے بیجان نظر آئے گا ہلدی کی طرح زرد ہوگا اور ...کی طرح لیٹا ہوگا اس کے جسم میں خون کا نام نہ ہوگا۔ ...ایسا زبردست انتقام ہوگا کہ ڈان جان کے کسی ہموطن نے آج تک نہ لیا ہوگا اور اسے بھی معلوم ہو جائے گا کہ پرائی ...عورتوں کو ورغلانے کا انجام کس قدر حسرتناک ہوتا ہے۔

صبح کو ڈان جان کے کمرہ کا دروازہ باہر سے کھول دیا ...وہ کپڑے پہن کر باہر آیا۔ صاحب خانہ کو ایسا معلوم ہوا کہ ...اس کے چہرے پر مُردنی سی کھنڈی ہوئی ہے۔ مگر کیا واقعی ڈان جان پیلا پڑ گیا تھا۔ صاحب خانہ اپنی انتقامی سکیم کے کامیاب ہونے پر نازاں تھا۔ کہنے لگا۔ "نیند تو اچھی طرح آئی؟"

"بہت اچھی طرح ــــــ!"

صاحب خانہ دل ہی دل میں کچھ جل گیا اور چھیڑنے کے لئے کہنے لگا "عروسی بستر پر مجھے تو اچھی طرح نیند آتی نہیں"۔

ڈان جان اس پر مسکرایا اور صاحب خانہ سے کہنے لگا کہ "مجھے تو عروسوں کے بستروں پر ہی شب گزاری کا اتفاق ہوا ہے اس لئے جانتا ہی نہیں کہ اپنا بستر کسے کہتے ہیں"!

صاحب خانہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ایسا معلوم ہوا کہ گلے میں خشکی کا پھندا اٹک گیا ہے۔ پھر کچھ سنبھل کر کہنے لگا "معاف کیجئے گا پلنگ بڑا ہینڈ تھا، آپ کو تکلیف تو بہت ہوئی ہوگی"۔

"جی نہیں چھوٹے پلنگ پر سونے کا عادی نہیں ہوں مجھے یاد نہیں کہ کبھی سنگل بیڈ پر سویا ہوں"۔

یہ سُنکر صاحب خانہ اُنگلیوں کے ناخن دانتوں سے چبانے کے شغل میں مصروف ہو گیا۔

"رات کو آپ کے کمرے سے کچھ آوازیں سی سنائی دی تھیں۔ کچھ گڑبڑ۔ نوکر نے بھی کہا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی جیخا ہو۔ خدانخواستہ کہیں آپ کو کوئی خیالی شکل تو نہیں دکھائی دی؟"

"میں نے جب سے عیاشی بطور پیشہ کے شروع کی ہے عجیب عجیب اتفاقات سے واسطہ پڑا ہے۔ عجیب و غریب آوازیں، روشنیاں۔ نابالغ بچے کی آواز۔ خوبصورت عورتوں کے بھوت اور اس ہی قبیل کے دوسرے وہم مجھے اب نہیں ستا سکتے کیونکہ اُجاڑ جنگلوں۔ اُداس محلسراؤں۔ پرانی عمارتوں، بھوت کے مسکنوں میں بھی میں ہی داد عیش دیتا ہوں اور یورپ کے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندانوں اور حکمرانوں کے شبستانوں میں بھی میرا ہی گذر ہے اس لئے اب تو میں نور و ظلمت۔ خوف و نشاط تردد و تعیش کے فرق سے بالکل بے نیاز ہو چکا ہوں اور ہر موقع کو اپنے لئے رنگین و دلچسپ بنا لیتا ہوں"!

صاحب خانہ بھی ہار ماننے والا نہ تھا۔ ڈان جان کا یہ جواب سُنکر وہ کچھ پست ضرور ہو گیا تھا اور اُنگلیاں زور زور سے ہتھیلی میں گھسا رہا تھا مگر ڈان جان کو جلانے کے لئے کہنے...

اُس نے ایک قہوہ بچا رکھا تھا۔

"بستر بہت ٹھنڈا ہوگا۔ اکیلے سونے کی یہی تو خرابی ہے۔ آدمی جم کر رہ جاتا ہے"

ڈان جان اس فقرہ کا پہلے ہی سے متوقع تھا اس نے مؤدبانہ عرض کیا۔ "ابتدا میں ہر بستر ٹھنڈا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن اسے گرم بنایا جاسکتا ہے۔ مجھے تنہا سونے کا کم یا شاید کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن گذشتہ رات کی تنہائی کو میں نے زیادہ محسوس نہیں کیا کیونکہ اصل چیز تو خون کی گرمی ہے اور وہ تخیل کی بجلی سے اکتساب حرارت کرتی رہتی ہے لیکن جس کا تخیل سرد ہو وہ ایسی شمع کی مانند ہے جس میں شوت نہ ہو۔ جلنے کا مادہ ہو مگر جلنے کی صلاحیت سلب ہوگئی ہو"

صاحب خانہ کنکھیوں سے ڈان جان کو دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں جل رہا تھا کہ یہ ہار ماننے والا نہیں ہے۔ بہت ہی بیہودہ لفاظ ہے۔ ڈان جان مزے سے قہوہ پی رہا تھا اور کبھی کبھار ناشتہ کی پلیٹ میں سے بھی کچھ اُٹھا کر منہ میں ڈال لیا کرتا تھا۔

ناشتہ کرکے ڈان جان باہر نکلا اور گاتا ہوا شہر کی طرف چل پڑا۔

صاحب خانہ کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی، جلد میں کھجلی ہو رہی تھی اور وہ برابر کھجائے جا رہا تھا۔

سیدھا اُس کمرے میں پہنچا جہاں ڈان جان رات کو سویا تھا۔ اُسے طرح طرح کے شبہات تھے۔ کمرہ کی ہر چیز کا جائزہ لیا پلنگ کو اچھی طرح دیکھا۔

پھر ملازم کو بلا کر کہا "میں آج رات کو اس کمرے میں سوؤنگا"

نوکر حکم سنکر نیچے چلا گیا۔ مالک پر پھر جنون طاری ہو رہا تھا مگر ابھی تو چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں مگر جنون حدیں اور راہیں کب پہچانتا ہے۔

تمام دن صاحب خانہ ڈان جان کے وطن کی طرف دیکھتا رہا۔ بارش کے بعد سے گرمی اور بڑھ گئی تھی۔

صاحب خانہ شام کے وقت اپنے شبہات پر خوب کھل کھلا کر ہنسا۔ دل ہی دل میں کہنے لگا کہ "میں بھی تم ہی عجب احمق ہو۔ بھلا روح بھی کسی کے ساتھ سو سکتی ہے نہیں۔ روح اور پھر میری بیوی کی روح کیسے آسکتی ہے۔ وہ برف کی انگلیاں ــــ وہ برف سے ٹھنڈے بارد جواس کے گرد حائل ہوتے ہیں ہرگز اس بات کو گوارا نہیں ہوتے ہونگے۔ میری بیوی عفیفہ ہے ــــ کیا پاس عصمت ہے کہ غیر مرد کو خوابگاہ میں دیکھ کر روح بھی اُلٹی پھر گئی اور رات بھر ڈان جان تکیے پر سر رکھے روتا رہا۔ اُس کے آنسوؤں سے تکیہ گیلا گیلا ہو رہا تھا!

رات ہوئی اور وہ کپڑے اُتار کر اپنے بستر عروسی پر دراز ہوگیا۔ اگر آج اس کی بیوی کی روح نظر آئی تو وہ سارا واقعہ سُنا کر خوب کھل کھلا کر ہنسے گا اور معافی چاہے گا کہ اس نے اس کی عفت کا امتحان لینا چاہا۔

وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور بارہ بجنے کی آواز کی طرف کان لگائے لیٹا رہا۔ جیسے ہی بارہ بجے اسے اپنے بستر پر کچھ سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ جیسے کوئی جسم اس کی طرف آ رہا ہو۔ گرم تنفس اس کے رخساروں کے قریب محسوس ہوا۔ ڈر رہا تھا مگر مجبوراً اس نے اپنے ہاتھ اس جسم کی طرف بڑھا دئے۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ گرم گرم لب کسی نے اس کے لبوں پر پیوست کر دئے ہیں۔ کیا یہ شبہ کی خلاقی تھی یا حقیقت نہیں۔ مُردہ کیسے زندہ ہوسکتا ہے۔ اُسکے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے تکیے اور چادریں دیوانوں کی طرح پھینکنی شروع کردیں ہڑبڑا کر اندھیرے میں اٹھا زور زور سے دروازہ پر گھونسے مارے باہر سے نوکر نے چلانا شروع کیا۔ اسے معلوم تھا یہ واقعہ اکثر ہوتا تھا جنون میں اسکا مالک چیخ پکار ضرور مچاتا تھا وہ زور زور سے کہہ رہا تھا "مجھے بچاؤ مجھے بچاؤ۔ یہ عورت کون ہے جو میرے بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ اسکا جسم گرم ہے۔ اسکے لبوں میں دوزخ کی حرارت ہے پھر ہونٹ ملیں ایکبار اسکے لبوں سے پیوست ہوگئے ہیں مگر جل رہے ہیں کیا یہ آگ کا تودہ ہے یا برف!"

غرض وہ پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا:

"اس بستر کو جلا دو اس میں ایک عجیب طرح کی بو آ رہی ہے ڈان جان سے خالی بستر کو بھی بچانا چاہئے اسکے جسم کی بو سے پلنگ خراب ہوگیا ہے اسے خاکستر کردو!"

پیچ و خم

[illegible] جالندھری

[illegible] دھوئیں میں گم
[illegible] کہیں نہ کہیں نقش کے داغ
[illegible] ہجوم یاس و گماں پاؤں میں جمود
[illegible] کے خارزار میں اُلجھا ہوا دماغ
[illegible] کے حریم حسن میں سود سود کا رواج
[illegible] کا گذر چکا ہے خیالوں کا کارواں
یہ ذہن یہ خیال و تصور کی رہگذر
کیوں بڑھتے بڑھتے ہو گئی مسدود نا گہاں
کیوں خضرِ راہ بنتی نہیں ہے کوئی دلیل ــــ

میں جانتا ہوں منزلِ مقصود ــ دُور ہے
دامن میں آ کے گرتی نہیں خود بخود مُراد
ایثار کے بغیر میسر نہیں ہوا
اس دل کو کامیاب تمناؤں کا سواد
ایثار کیا ہے جبر، خلافِ مزاج صبر
اس دل کی سرخوشی کیلئے کوششِ حصول
خوشیاں ہیں تیز گام، مصائب ہیں سُست رَو
ایثار کیلئے ہے احتیاط، غم فضول
اک عارضی خوشی کیلئے جبر، صبر و ضبط ــ !!
اس خام فہم دل کی حماقت نہیں ہے کیا ــــ ؟
لیکن بجائے دل کو تدبر سے واسطہ
عقل و خرد بھی تابعِ فطرت نہیں ہے کیا ــ ؟
اور ــــ یہ لاکھ خیالوں کا سلسلہ
کھولا گیا ــــ مگر نہ کھلا عقدۂ حیات
[illegible] رہے ہیں ــ بڑھتے ہی جاتے ہیں [illegible]
[illegible] بات سے پیدا ہوئی ہے بات
[illegible] گئے [illegible] پیچ و خم
[illegible] خالق [illegible] ژولیدگی ہوا
[illegible]

صناعِ دہر ــــ مائلِ پیچیدگی ہوا
اُس کی رمیں یہ نور سے کھینچی ہوئی شراب
طوفانِ رنگ و بو میں ڈبوئی ہوئی بہار ــــ
زلفیں طلوعِ صبح کی کرنوں کا آبشار
آنکھیں کنول، گلاب، سمن زار، نغمہ زار
تشبیہ جس کے حسن کی موزوں نہیں ہوئی
اُس نورِ مشتعل سے بنایا ہوا شرار
عصمت، وفا، گناہ، محبت، ریا، فریب
اک پیکرِ جمیل ــ سمن زارِ رنگ و بو
راحت فزا عیوب و محاسن کا امتزاج
رادھا کہیں، زلیخا کہیں، جولیت کہیں
بالانشیں کہیں ــ کہیں تزئینِ تختِ تاج ــــ !!
راتوں کا نور، دن کی ہنسی، شام کا نکھار
تخلیقِ دلربا ہی نئی حشرِ خلفشار
پہلا ہی پیچ خالقِ ژولیدگی ہوا
موجوں کی جیسے موج کے پیچھے حسیں قطار
کتنے جھڑے ہیں شعلۂ رخشندہ سے شرار
جنگ و جدل، رقابت و لعب، غم و ملال
تخلیق کے عمل میں تسلسل ہے کارگر
یہ زندگی ــ مسافتِ مبہم کٹھن سفر
آغازِ کار ہی سے ہوا حشرِ جلوہ گر
اک چھیڑ ہی سے ہے غم و آلام کا ورود
نظروں کی چھیڑ ــ چھیڑ بنے عمر بھر کا روگ
موجوں کی چھیڑ ــ مان چٹانوں کے ٹوٹ جائیں
سازوں کی چھیڑ ــ تاروں ہی کیلئے سرود و سوگ

میں سوچتا ہوں ــ سوچ نہ ہوتی تو زندگی
بڑھتی ہر ایک راہ پہ آندھی کے جوش سے
میں سوچتا ہوں ــ سوچ نہ ہوتی تو انقلاب

سوچتا تو مجھ پہ کوئی تاثر نہ چھوڑتا
آبادیوں کو دیکھتا اوڑھے ہوئے خواب
میں سوچتا ہوں — سوچ نہ ہوتی تو یہ پہاڑ
دریا، درخت، سرمئی بادل، گرج، کڑک
ہوتے مرے خدا، مرے ہیبت فزا صنم
ان سے نبرد آزما ہوتا نہ بے دھڑک
پیڑوں کو کاٹ کاٹ کے بنتی نہ کشتیاں
تبدیل پھر سفینے نہ ہوتے جہاز میں —
ہوتے نہ پھر یہ موت اگلتے ہوئے جہاز
سوئی ہی رہتی — آگہی دامانِ راز میں —
اک پیچ سے نکالے نہ جلتے ہزار پیچ
میں سوچتا ہوں — سوچ نہ ہوتی تو بے دھڑک
اس راستے پہ بڑھتا میں بیگانہ نشیب
ہے سوچ کا فساد، تذبذب یہی جھجک —!!
حیران کھڑا ہوں موڑ پہ، گھبرا رہا ہوں میں
یہ سوچ بھی مرض ہے، بہت سوچتا ہوں میں
کتنے ہی موڑ، کتنے ہی گہرے ملال سبب
آتا نہیں یقیں مجھے طے کر چکا ہوں میں
نظریں ہیں واقعات کی منظر کشی میں فرد
تنہائیوں میں آئی ہے اکثر نگاہ کام
شامِ فراق کی یہی تنہا ہے غمگسار
لایا اسی کو پاس لیا میں نے جس کا نام
میں صبح و شام دیکھتا رہتا ہوا وہ عام
میں صبح و شام سوچتا رہتا ہوں وہ خیال
پہنا سکوں جو ان کو حقیقت کا پیرہن —!!
برسے زمیں پہ نکہتِ فرحت، سرور و کیف
جس سمت بھی نگاہ اٹھے، کھل اٹھیں چمن
چہروں میں ہو شگفتہ مہ و مہر کا سماں
سینے ہوں بے پناہ محبت کی انجمن
لیکن مری یہ سوچ، مری سادہ لوح سوچ
رکھتی نہیں ہے دشنہ و خنجر، فساد و شر
میں سوچتا نہیں کہ مرے پاس ہوں محل
آ جائیں میرے قبضے میں کہسارِ سیم و زر

وسعت ہو جن کے سامنے دامانِ مختصر
میرے تو گھر میں رات کو گھی کے جلیں چراغ
میرے پڑوس میں ہو فلاکت کی تیرگی
اپنے لئے جلال و حکومت روا رکھوں
ہمسائے رکھوں صرفِ ستم، وقفِ خودکشی
میں سوچتا ہوں، سوچ مری سادہ لوح سوچ —!!
رکھتی ہے لطف، مرہم و تسکیں سکوں خوشی
میں سوچتا ہوں کیا نہیں ممکن علاجِ غم —؟
میں سوچتا ہوں نکبت و افلاس کے ستون
کیا ہو نہیں سکیں گے کبھی مل کے منہدم
میں سوچتا ہوں گریۂ مجبور کے لئے
دامانِ جاں فزا، کوئی ریشم کی آستیں
میں سوچتا ہوں ظلمتِ عالم کے واسطے
خورشید و ماہ سے بھی کوئی جلوہ حسیں —!!
یہ میری سوچ، اور یہ میرے خیال کاش —!!
پہنا سکوں میں ان کو حقیقت کا پیرہن
کیونکہ ہر اک دور میں سعیٔ سکوں مری
پروردگارِ رنج ہوئی، خالقِ محن —!!

میں نے کبھی بنائی تھی لوہے کی تیغ تیز
یہ تیغ تیز — بھوک مٹانے کا ساز تھی
یہ تیغ تیز — تھی کہ درندوں سے لڑ سکوں
یہ تیغ تیز — میری حفاظت کا راز تھی
اس تیغ تیز سے وہ جرائم کئے گئے
تاریخ — خاک و خوں میں ڈبوئی گئی تمام
میں نے بنائے کتنے ہی سازِ نشاطِ زیست
میں نے ابھی بنائے تھے طیارے تیز گام
سڑکوں کے دور دور بچھائے تھے میں نے جال
چھوڑے تھے راہیوں میں سبک گام کارواں
راتوں کو دوڑتی ہوئی سڑکوں کے ساتھ ساتھ
کھمبوں پہ کر دیا تھا ستاروں کو ضو فشاں
میں نے بنائے تھے سر و سامانِ انبساط
تعمیر انہیں کیا تھا مجھے سرخوشی سے

بلونت سنگھ

خوددار

جن دنوں صوبہ بہار میں زلزلہ آیا میں آسام کی ایک غیر معروف ریاست میں بحیثیت ایک انجینئر کے ملازمت کرتا تھا۔ زلزلے کے بعد جب ریلیف کا کام شروع ہوا تو میں نے بھی سرکاری ملازمت کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ ریاست کا وزیر ایک بارسوخ شخص تھا اور مجھ پر مہربان۔ چنانچہ مجھے ملازمت مل گئی۔ میرا کام تسلی بخش ثابت ہوا اس لئے جلد ہی ایگزیکٹو انجینئر ہو کر موتی ہاری کے مقام پر چلا گیا۔

ان دنوں زندگی میں پہلی مرتبہ قدرت کی تباہ کاریوں کے مناظر دیکھنے میں آئے۔ دفتر بھی ہماری کوٹھی کے قریب ہی تھا۔ زلزلے میں دفتر کی عمارت بھی بیٹھ گئی تھی چنانچہ نئی عمارت زیر تعمیر تھی۔ چار کمرے ہمارے تصرف میں تھے۔ سوائے میرے کمرے کے دوسرے کمروں میں ابھی فرش بھی نہ ہوتی تھی۔ فرش کی بھدی اینٹوں کو چھپانے کے لئے دری بچھا دی گئی تھی۔ میرے کمرے میں دو بڑی کھڑکیاں اور دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا اور دوسرا بڑے کمرے کی جانب جہاں کلرک بیٹھے کام کیا کرتے تھے۔ اس وقت عملے میں کل تیرہ کے قریب اشخاص موجود تھے۔

زلزلے کی وجہ سے اگر ایک طرف خاندان کے خاندان تباہ اور بدحال ہو گئے تھے تو دوسری جانب مکاروں کے لئے روزی کے دروازے بھی کھل گئے تھے۔ کئی اشخاص کے لئے یہ زلزلہ دولت و شادمانی کا مژدہ لے کر آیا تھا۔ شام کے وقت جب ہم لوگ سیر کے لئے باہر نکلتے تو جگہ جگہ دھرتی ناگ کو پھن کی طرح منہ کھولے پاتے۔ ہم حسرت سے زمین کے سینے میں کھلے دراڑوں کے اندر جھانک کر دیکھتے تھے۔

سردیوں کی ایک صبح کو جب میں دفتر میں پہنچا تو رگھوناتھ نے کاغذوں کا ایک بڑا سا پلندہ میرے سامنے رکھ دیا۔ پچھلی شام کو میں دورے سے واپس آیا تھا۔ تین چار روز کے کاغذات جمع ہو گئے تھے ـــــ عموماً رگھوناتھ کاغذات میز پر رکھ کر فوراً دوسرے کمرے میں واپس چلا جاتا تھا۔ لیکن آج وہ ہاتھ سہلاتا ہوا میری میز کے قریب ہی کھڑا رہا۔ یہ سمجھ کر کہ شاید وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا ہی تھا کہ چپڑاسی نے خبر دی کہ پنڈت دیوی دیال اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ میں اس چاپلوس شخص سے ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن میری غیر حاضری میں وہ کئی مرتبہ کوٹھی کے چکر لگا چکا تھا۔ بچوں کے لئے پھل اور مٹھائیاں بھی دو تین مرتبہ دے گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے اندر بلوا لیا۔ رگھوناتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

دیوی دیال سینما کے پاس لایا تھا۔ ہر چند وہ شہر کا ایک متمول رئیس تھا لیکن بڑا خوشامدی اور چاپلوس۔ مجھے اس کی خوشامدانہ باتوں سے دلی نفرت تھی جی چاہتا تھا کہ دھکے دے کر باہر نکلوا دوں۔ میری بے اعتنائی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے بڑی ہیر پھیر کی باتیں کیں۔ مدعا دراصل یہ تھا کہ میں ٹھیکیداروں سے اس کے بھٹے کی اینٹوں کی سفارش کر دوں۔

وہ باتیں بنائے جا رہا تھا لیکن میرا دھیان رگھوناتھ کی طرف تھا۔ رگھوناتھ ہمارے عملے میں سب سے معمر شخص تھا بلکہ دوسرے تو سب کے سب جوان تھے۔ دسویں پاس ٹائپسٹ بات چیت میں ہوشیار نشست و برخاست میں چاق و چوبند لیکن مجھے رگھوناتھ پر بہت اعتماد تھا۔ اس کی گفتگو ایک طرف خوشامد سے یکسر خالی اور دوسری طرف حد درجہ مودبانہ لیکن اس کی سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ وہ ایک ذمہ دار شخص تھا۔ اسی خوبی کی وجہ سے اسے کام بھی دوسروں کی نسبت زیادہ کرنا پڑتا تھا۔

ملازمت کے لئے وہ براہ راست مجھی سے ملنے آیا تھا۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے کے بعد میں نے پلنگ پر پاؤں رکھے ہی تھے کہ نوکر نے رگھوناتھ کا ملاقاتی کارڈ لا کر دیا۔ میں نے مدعا پوچھنے کے لئے نوکر کو بھیجا تو جواب ملا کہ نوکری کے لئے آئے ہیں۔ میں نے جواب بھجوا دیا کہ دفتر میں ملیں۔

اتفاق سے اسی وقت مجھے ڈرائنگ روم میں ایک کتاب لینے کے لئے جانا پڑا۔ کھڑکی میں سے رگھوناتھ واپس جاتا دکھائی دیا۔ بالائی حصے کا سِل لگا ہوا پائجامہ۔ نہایت بوسیدہ کا ایک پرانا گرم کوٹ۔ سر پر ملے رنگ کی گول ٹوپی۔ نیچے کو لٹکتی ہوئی سفید گھنی مونچھیں۔ دل میں خیال آیا کہ یہ ضعیف شخص نہ معلوم کہاں سے چل کر آیا ہے ــــ چنانچہ میں نے اسے اندر بلوا لیا۔ اس نے آتے ہی بے موقع آمد کے لئے معافی چاہی اور کہا کہ وہ میرا زیادہ وقت ضائع نہیں کرے گا۔ وہ نوکری کے لئے آیا تھا۔ ٹائپ کرنا جانتا تھا ہر قسم کی کاروباری اور دفتری خط و کتابت سے بخوبی واقف تھا ــــ میں اس کی شخصیت اور بات چیت سے بہت متاثر ہوا۔

میں نے اسے شام تک بٹھائے رکھا۔ وہ اسی جگہ کا باشندہ تھا۔ زلزلے کی بابت میں اس سے مختلف باتیں پوچھتا رہا۔ اسکے چشم دید واقعات بڑی دلچسپی سے سنتا رہا باتوں ہی باتوں میں اس کے ذاتی حالات بھی معلوم ہو گئے۔ پہلے وہ ایک متمول شخص تھا۔ لیکن اس نے اپنی ساری پونجی بچوں کی تعلیم پر صرف کر دی۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا وٹرنری ڈاکٹر بن کر سرکاری ملازمت کرنے لگا۔ اس کے ملازم ہو جانے پر گھر والوں کو کچھ تسلی ہوئی کیونکہ وہ سب کچھ اس کی تعلیم پر خرچ کر چکا تھا اخراجات زیادہ تھے اور اس کی آمدنی کفالت نہ کرتی تھی۔ جب بُرے دن آتے ہیں تو آنکھ جھپکنے میں تقدیر کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ زلزلے میں اس کا بھرا پُرا گھر تباہ ہو گیا اتفاق کی بات زلزلے کے روز سوائے بڑے بیٹے کے سارا کنبہ گھر پر تھا۔ معلوم ہوتا تھا قدرت نے سازش کر رکھی تھی کہ ان سب کو یکجا کر کے کچل دیا جائے ــــ اب گھر میں اس کی بوڑھی بیوی تھی جس کے حواس قائم نہ تھے بیوہ بہن تھی اور ایک تین سالہ پوتا۔ زلزلے کے بعد اس کا سب سے بڑا لڑکا یعنی وٹرنری ڈاکٹر دق میں مبتلا ہو کر گھر پہنچا۔ رہی سہی پونجی اس پر خرچ ہو گئی لیکن وہ موت کے چنگل سے نکل نہ سکا۔ اس کی آپ بیتی سن کر دل کو یقین نہ آتا تھا کہ انسان اس قدر صابر بھی ہو سکتا ہے ــــ لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔

شام کی چائے کے بعد رخصت کرتے وقت میں اس سے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ رگھوناتھ جی! اتنے مصائب کے بعد بھی آپ کا یہ حوصلہ اور ثابت قدمی دیکھ کر میں آپ کی عزت کرنے لگا ہوں۔

اُس نے اپنی چھڑی سے زمین کریدتے ہوئے کہا "آپ کی بندہ پروری ہے"۔ اس کے بعد اس نے سکوت کیا پھر وہ آنکھوں سے آنکھیں ملائے بغیر بولا "لیکن . . . لیکن ان صدموں کی وجہ سے میرا حافظہ خراب ہو گیا ہے۔ میں اب باتیں بھول جاتا ہوں"

اس کے بعد وہ میرے دفتر میں بطور ہیڈ کلرک کے کام کرنے لگا۔ دفتر میں اس کی موجودگی میرے لئے اطمینان کا باعث تھی۔ مجھے اس امر کی تسلی تھی کہ دفتر میں کم از کم ایک ذمہ دار شخص موجود ہے۔ غیر ذمہ دار کلرکوں کا مجھے بڑا تلخ تجربہ تھا۔ کئی مرتبہ مجھے رگھوناتھ سے بعض امور میں مشورہ بھی کرنا پڑا۔ بارہا میں ضروری کام پڑے پر دورے پر روانہ ہو جاتا تھا۔ لیکن میری غیر حاضری میں بھی کام حسن و خوبی انجام پاتا رہا۔

اپنی میز کے سامنے بیٹھے بیٹھے بعض مرتبہ رگھوناتھ کی بابت سوچنے لگتا۔ اس کی بعض حرکتوں سے دل پر چوٹ سی لگتی۔ مثلاً اس کے کوٹ کا کالر گردن کے پاس سے پھٹ گیا تھا۔ اس حصے کو چھپانے کے لئے وہ اس پر قمیض کا کالر چڑھا لیتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ ایک فائل لے کر میرے کمرے کی طرف بڑھتا۔ پردے کے قریب پہنچ کر ایک دم رک جاتا۔ مجھے فوراً معلوم ہو جاتا کہ اس وقت وہ کوٹ کے کالر پر قمیض کا کالر چڑھا دیا ہے ــــ اور کبھی کبھی اس کی قمیض کے بوسیدہ کف کوٹ کے کفوں سے باہر نکل آتے تھے۔ وہ زخمی کبوتر کی طرح انگلیوں سے کفوں کو کوٹ کی آستینوں کے اندر دھکیل دیتا۔ ہر چند وہ یہ حرکتیں اس انداز سے کرتا تھا کہ مجھے پتہ نہ چلے لیکن میری متجسس نگاہوں سے کوئی بات پوشیدہ نہ رہتی تھی۔

دیوی دیال کی باتیں بہت بیزار کن تھیں میں نے جس قدر جلد ہو سکا اسے ٹالا۔ مجھے یہ خیال تھا کہ آج رگھوناتھ مجھ سے کوئی خاص بات کہنے والا تھا چنانچہ دیوی دیال کے چلے جانے کے بعد میں رگھوناتھ کا منتظر رہا۔ لیکن وہ نہ آیا۔ میں بھی اپنے کاغذات پر جھک گیا۔ میں نے دو تین مرتبہ بلا پیاس کے چپراسی سے پانی منگوا کر پیا۔ سگرٹ سلگا کر کھڑکی کے آگے کھڑے ہو کر

ہ لیے کش لیتا رہا تاکہ رگھوناتھ کو معلوم ہو جائے کہ میں اتنا
مصروف بھی نہیں ہوں۔ اگر وہ چاہے تو آ کر مجھ سے گفتگو کرے۔
یہاں تک کہ دوپہر کا کھانا بھی میں نے دفتر ہی میں منگوا لیا
لیکن وہ نہ آیا۔

دفتر کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ عملہ میری روانگی کا منتظر
تھا میں نے چپڑاسی کی زبانی کہلوا دیا کہ سب لوگ جا سکتے
ہیں میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں میں ان لوگوں کو اپنے
اپنے حقوں کے قریب سے ہو کر واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔
یہ اسکول کے چھوکروں کی طرح ماتم کرتے، شور و غل مچاتے
ایک دوسرے پر لپکتے جھپٹتے چلے جا رہے تھے۔ لیکن ان میں
رگھوناتھ نہ تھا۔ چپڑاسی نے بتایا کہ وہ ابھی کام کر رہے ہیں۔
میں نے ایک اور سگرٹ سلگا لیا۔

دس پندرہ منٹ بعد رگھوناتھ اندر آیا میں نے قلم
ہاتھ سے رکھ دیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا کر بولا۔
کیا آپ کا کام ختم نہیں ہوا۔ آج آپ نے دوپہر کو آرام بھی
نہیں فرمایا . کیا میرے لائق کوئی خدمت ہے؟"

میں ہنس پڑا۔ اور معمول کے سبب زیادہ بے تکلفانہ
انداز میں جواب دیا۔ "آپ بزرگ ہیں۔ خدمت کرنا تو ہمارا
فرض ہے۔ . آپ ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے۔ اگر کچھ
کام باقی رہ گیا ہو تو کل ہو سکتا ہے۔"

"جی بس اب چلا جاؤں گا . . آپ، کیا آپ ابھی یہیں
تشریف رکھیں گے؟"

"جی ہاں! آج میں ایک صاحب کا منتظر ہوں۔"

وہ اِدھر اُدھر بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا
پھر بولا۔ "آپ باہر لان پر بیٹھنا پسند کریں گے؟ فرمایئے تو
کرسیاں بچھوا دوں۔"

میں رگھوناتھ کے سامنے زیادہ افسرانہ شان کا
مظاہرہ نہیں کیا کرتا تھا۔ کچھ تو اس لئے اور کچھ اپنی عمر کے
تقاضے سے مجبور ہو کر وہ بھی کبھی کبھی کوئی پدرانہ لہجہ میں کہہ
ڈالتا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ "نہیں رگھوناتھ جی! میں ذرا
یہ کاغذات دیکھوں گا۔ ... ..."

قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔
لیکن کچھ تذبذب میں تھا وہ دفتر کی عمارت، فرنیچر، شیلف اور

اور ایک حد سے زیادہ رشوت خوار افسر کی باتیں کرتا رہا میں
اُس کی ہر بات میں خندہ پیشانی سے دلچسپی لیتا رہا۔ میرے
دل میں یہ کرید تھی کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتا تھا۔

بالآخر اُس نے کچھ کہنے کے انداز میں میری طرف دیکھا۔
میں ہمہ تن گوش تھا۔ . "اچھا.. تو، تو ... اگر آپ
اجازت دیں . کیا میں جا سکتا ہوں؟"

میں کچھ مایوس ہو گیا تاہم ہنس کر جواب دیا۔ "ضرور
ضرور۔"

اُس نے کھانس کر چھڑی اُٹھائی۔ ٹوپی کو سر پر درست کرتے
ہوئے رُک رُک کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے سوچا
غریب نسیان کا مریض ہے شاید وہ بات جو وہ کہنی چاہتا
تھا بھول گیا ہو۔ میں نے آواز دی۔

"رگھوناتھ جی!"

"جی!" وہ واپس چلا آیا۔ میرے سامنے میز کے آگے
کھڑا ہو گیا۔

میں نے سگرٹ کا لمبا کش لے کر اُس کے چہرے کا بغور
جائزہ لیا۔ "کیا آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

وہ خاموش کھڑا ہو کر زمین کی طرف دیکھنے لگا پھر اُسکے
لبوں سے ایک مبہم سی آواز نکلی۔

"کہیئے . کہیئے نا!"

"میں . میں!" اُس نے اُچٹتی ہوئی سی نگاہ مجھ پر ڈالی
"مجھے . " وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا
"رگھوناتھ جی آپ کرسی پر تشریف رکھیئے کوئی ہرج نہیں آپ
تشریف رکھیئے!"

وہ بیٹھ گیا۔ اور مجھے منتظر پا کر دھیمی آواز میں
بولا۔ "میں . میں بہت شرمسار ہوں ... میں . "

میں نے کھِل کھِلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ "رگھوناتھ جی! آج
تو آپ نے حد کر دی۔ آخر اس قدر تکلف بھی کیا!"

اُس نے لاٹھی سے فرش بجاتے ہوئے بڑی جرأت سے
کام لے کر کہا۔ "دراصل مجھے ...... مجھے ایک روپیہ درکار ہے۔"

"ایک روپیہ؟" میں حیرت سے ذرا بلند آواز میں چلایا۔
اُس نے پھر میری طرف اُچٹتی ہوئی نظر سے دیکھا شاید
وہ میرے چہرے پہ اپنی بات کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

اس نے پھر دھیمی آواز میں کہا "شاید آپ کو یاد ہو آپ نے ایک بار مجھ سے ایک روپیہ لیا تھا...... یہ تین چار مہینے ہوئے ہیں"

... وہ کب؟ میں دل ہی دل میں سوچنے لگا ... کے آثار دیکھ کر وہ پھر بولا "اس دن ... آیا تھا۔ آپ اسے ایک روپیہ دینا چاہتے تھے لیکن آپ کے پاس دس سے کم کا نوٹ نہیں تھا۔ آپ نے مجھ سے ایک روپیہ مانگ لیا تھا... آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر آپ کو روپیہ واپس کرنے کا خیال نہ رہے تو میں آپ کو یاد دلا کر روپیہ واپس لے لوں۔" اس کے بعد وہ پھیکی ہنسی ہنسا "اور میں نے جواب میں کہا تھا کہ ایک روپیہ بھی کوئی بڑی رقم تھی کہ میں یاد دلاتا پھروں۔"

ہاں مجھے یاد آ گیا۔ مجھے رگھوناتھ پر اعتماد نہیں تھی۔ مجھے افسوس اس امر کا تھا کہ میں نے ایسے ضرورت مند شخص کا ایک روپیہ رکھا ہی کیوں۔ لیکن وہ روپیہ تو میں نے اسی دن شام کے وقت واپس کر دیا تھا۔ بعد ازاں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے وہ روپیہ واپس دے دیا تھا۔

رگھوناتھ معذرت کئے جا رہا تھا۔ میں نے میز کی دراز میں سے حساب کتاب والی بڑی نوٹ بک نکالی بیشک اکتوبر کی سات تاریخ کو رگھوناتھ سے ایک روپیہ لیا گیا تھا میں نے روپیہ لیتے ہی اس جگہ نوٹ کر لیا تھا۔ اسی روز شام کو روپیہ واپس کرتے وقت میں نے اس کے آگے انگریزی میں لفظ "Paid" لکھ دیا تھا۔

"میں رگھوناتھ کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں اسقدر بے اصول اور غیر ذمہ دار شخص نہیں ہوں کہ اس کا روپیہ لے کر بھول جاتا۔ رگھوناتھ جی! آپ کا وہ ایک روپیہ میں......"

"میں بصد دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں" وہ مارے شرم کے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ "مجھے ضرورت ہی نہیں آن پڑی... ورنہ آپ کو اس روپے کی ہرگز یاد نہ دلاتا...... کسقدر شرمسار ہوں۔ ایک حقیر روپے کے لئے۔"

... ہو گیا۔

... رگھوناتھ جی! معمولی بات ہے۔" یہ کہکر میں مسکرایا

اور پیچھے کی طرف جھک گیا "شرمندہ تو میں ہوں ... معافی کا خواستگار تو مجھے ہونا چاہئے۔"

اس کی آنکھوں میں شکر گزاری کے آنسو چھلکنے لگے "آپ سے کیا چھپانا ... کل سے گھر پر روٹی نہیں پکی۔ تنخواہ ملے میں تین دن ... تھی۔ مجھے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی عادت نہیں ... یہ بات تھی ورنہ ... ورنہ ایک روپے کی حقیقت ہی کیا ہے میں ہرگز آپ سے ایک روپے کے لئے تقاضا نہ کرتا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا "آپ کو کتنے روپے درکار ہیں ... میرا مطلب ہے تنخواہ ملنے پر مجھے لوٹا دیجئے گا۔"

رگھوناتھ کے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے۔

"میں پرانے خیالات کا شخص ہوں ... اگرچہ یہ گستاخی ہو گی کہ میں آپکی ہمدردانہ پیشکش کو قبول نہ کروں لیکن اس خیال سے آپ پر اپنے گھر کے حالات ظاہر نہیں کئے تھے۔"

میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر میز پر رکھ دیا تھا اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے روپیہ اٹھا کر مٹھی میں بھینچ لیا۔ اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے لڑکھڑاتے قدم اٹھاتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا اور پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

صلاح الدین قریشی

یہ زندگی!

تینوں دوست حسبِ معمول دن بھر کی باتوں پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ سلامہ آفندی ایک نوجوان دراز قد، دُبلا پتلا، عمر تقریباً ۳۵ سال، سیاسی اقتصادیات اور علم التجارت کا طالب علم جس کا دعویٰ تھا کہ وہ عنقریب مصری مصنوعات کے لئے ایک مستقل مرکز کی بنیاد ڈالے گا اور اسے بوڑھے دولتمند والد کی وفات کے بعد بہت جلد اس خیال کو عملی جامہ پہنائے گا۔ وہ ایک نہایت پست خیال نوجوان تھا۔ اس نے کسی گری ہوئی بازاری عورت کو اپنے جال میں پھنسا کر شہر کے ایک متعفن محلے کے حقیر سے مکان میں ڈال رکھا تھا۔ اپنے والد سے تیس پونڈ ماہوار منگایا کرتا تھا جو بادلِ ناخواستہ کسی نہ کسی طرح اسے بھیج دیئے جاتے تھے ابھی آدھا مہینہ بھی گزرنے نہیں پایا تھا اس کی جیب خالی ہو جاتی تھی اور پھر ہر ایک سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ زندگی کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ ہر قسم کی حرام و حلال لذات سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ علی الاعلان معصیت انگیز زندگی بسر کر رہا تھا جس کا اُسے مطلق احساس نہ تھا گناہ کی زندگی نے اس کی صحت پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا اس کا چہرہ کسی بُرائی ممی کی طرح بھیانک اور بہت ناک تھا۔ وہ حسبِ ضرورت ایمان بن کر سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ سمجھ لیتا تھا تاکہ کسی طرح اپنے لئے سامانِ مسرت مہیا کرے۔ ہر وقت ہنستا رہتا تھا اور اس کے قہقہے کبھی دھیمے نہیں پڑتے تھے۔ دوسروں کیلئے اس کا تبسم انتہائی تکلف دہ ہوتا تھا جس میں بعض و حسد کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اس کی نظریں نہایت تیز تھیں جن میں رشک کی چنگاریاں چمکتی تھیں۔ اپنے دوستوں کے ساتھ خواہ مخواہ اُلجھنے میں وہ مشہور تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات وہ اُن حقائق میں بھی حجت پر اُتر آتا تھا جو کسی دلیل یا ثبوت کے محتاج نہیں ہیں۔

دوسرے دوست کا نام توفیق بک تھا۔ اس کو کسی رئیس نے اپنا بیٹا بنا لیا تھا، لمبا قد، چوڑا چکلا سینہ، لوکدار موٹی ناک۔ وہ اپنے کو غیر معمولی طور پر ذہین سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ احساس کی لطافت اور روشنی طبع اس کا پیدائشی حق ہے۔ اس کی گفتگو میں عام طور پر بے عیب قراتی کا حزو غالب ہوتا تھا تھیٹر سے اسے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ اسے یہ غلط فہمی تھی کہ ایک نہ ایک دن ضرور وہ اسٹیج پر نظر آئے گا۔ لیکن بدقسمتی سے اب تک اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر بیٹھا خیالی ڈراموں کی منظر کشی کرتا اور ڈرامیٹک سوسائٹیوں کا پروگرام سناتا رہتا تھا۔ اور جب کبھی کوئی پوچھ بیٹھتا۔

——— ہاں تو کب کھیل رہے ہیں آپ اپنا ڈرامہ توفیق بک؟

تو وہ اونچی آواز میں مسکراتے ہوئے کہتا:۔

——— میں عنقریب اپنا ڈرامہ پیش کرنے والا ہوں۔ لیکن سٹیج پر لانے میں مجھے ذرا ابھی دیر لگے گی۔

تیسرا دقیق آفندی ایک نوجوان جو ابتدائے جوانی میں سِل کا شکار ہو گیا تھا جس کے نتیجے کے طور پر وہ قبل از وقت بوڑھا ہو گیا تھا اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ اس کی عمر ابھی پچیس سال سے زیادہ نہیں ہو گی لیکن دیکھنے والے اسے چالیس سال سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ ہر وقت پریشان حال، فکرمند۔ کبھی کبھی شعر کہتا تھا اور ہمیشہ الم و یاس کے فلسفے کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ اس کو بہت سے مالی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ پندرہ سال کی عمر میں اس کی تمام خاندانی دولت تباہ ہو گئی۔ وہ ایک مفلوج ماں اور لنگڑے باپ کا کفیل تھا۔ اس کی دو بدصورت بہنیں تھیں ایک کی عمر ۳۵ سال اور دوسری کی چالیس سال دونوں کی اب تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ ان دونوں کی ذمہ داری بھی بھائی کے سر تھی۔ وہ ایک مقامی روزنامے کے دفتر میں ملازم تھا جہاں سے اسے صرف چار پونڈ ملتے تھے اور یہی اس کی ماہوار آمدنی تھی۔ وہ روزانہ اپنے دونوں دوستوں سے ملتا تھا اور کچھ وقت ان کے ساتھ گزار لیتا تھا۔ اکثر رات کے وقت بھی ان کے ساتھ تفریح میں شریک ہوتا تھا اور اس سلسلے میں ان ہی دونوں کے

تمام خرافات سے نفرت کرتے تھے۔ اپنے مسلک کے اعتبار سے وہ اشتراکیت کا دلدادہ تھا اور دُنیا کے نظام کو یکسر بدل دینے کے درپے تھا۔

یہ تینوں بہت دیر تک مختلف موضوعوں پر باتیں کرتے رہے۔ اچانک کمال بک ان کے پاس سے گزرا۔ یہ ایک جاہل لیکن دولتمند نوجوان تھا۔ رسمی سلام دعا کے بعد توفیق بک نے تھوڑی دیر بیٹھنے کے لئے کہا لیکن اس نے عذر کیا اور بتایا کہ اسے کہیں جانا ہے۔ اس کے بعد وہ قریب ہی پڑے ہوئے بنچ کی طرف چلا جہاں اس کا ایک دوست منتظر تھا۔ وہ اسکے قریب بیٹھ گیا اور کچھ باتیں ہونے لگیں۔ دقیق آفندی اپنے دونوں دوستوں سے کہنے لگا:۔

—— اوفوہ! یہ لوگ بھی کیسے بیڈھب ہوتے ہیں۔ یہ حضرت بھی بڑے متکبر ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کے دماغ کھوکھلے اور جیبیں بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ توفیق بک نے ہنستے ہوئے کہا۔

—— بھئی دقیق کہنے کو تو تم بالکل ٹھیک ہو واقعی یہ کندۂ ناتراش ہے بہت مغرور۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ آخر اسے کس طرح برداشت کر لیتے ہیں

اب کیا تھا سلامہ آفندی جنہیں چند بحث میں مزا آتا تھا سنبھل بیٹھے اور انہوں نے طعنہ آمیز لہجے میں جس میں غصے کی تلخی بھی پائی جاتی تھی کہنا شروع کیا۔

—— آخر اس بیچارے پر اتنے لعن طعن کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اس لئے کہ وہ متموّل ہے؟ یا اس وجہ سے کہ وہ کسی کی پروا نہیں کرتا اور ہمیشہ خوش رہنا پسند کرتا ہے۔

اس کا روئے سخن دقیق کی طرف تھا دقیق کہنے لگا:

—— بھئی تم تو ہر بات پر لڑ پڑتے ہو۔ اس نوجوان کے متعلق کل جناب نے جس رائے کا اظہار کیا تھا اور آج جو اس سلسلے میں گوہر افشانی فرما رہے ہیں بھلا ان دونوں میں مطابقت کس طرح پیدا کی جائے؟ کیا کل جناب نے بدترین سے بدترین الفاظ اس کے لئے استعمال نہیں فرمائے تھے؟ کیا جناب نے اس کے متعلق یہ نہیں کہا تھا کہ . . .

سلامہ آفندی تلملا اٹھا اور بات کاٹتے ہوئے کہنے لگا:

—— کل تو اس نے مجھے بلیرڈ میں بہت پریشان کیا تھا، لیکن یہ تو کوئی بات نہیں کیا انسان کو کبھی اپنی رائے بدلنے کا حق نہیں ہے؟

اِس دوران میں جب کہ یہاں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی ایک لڑکا پھٹے ہوئے کپڑے پہنے، ننگے پاؤں بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گذرا۔ اس کے پاس کتابوں کے بنڈل تھے اور وہ برابر ایک مقررہ لہجے میں آواز لگا رہا تھا۔

—— فتحی زغلول کی کتابیں۔ مذکرات ہنڈسرگ حدیث الاربعاء۔ الاہرام کے ناول۔

توفیق بک اسے روک کر پوچھنے لگا۔

—— اور "ایکٹر کی ڈائری" بھی ہے تمہارے پاس؟

لڑکا اپنے میلے گندے ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے کہنے لگا

—— نہیں جناب! یہ کتاب میرے پاس نہیں ہے۔

—— کیا ڈرامے کے متعلق تمہارے پاس کوئی کتاب نہیں ہے؟ ڈرامے یا مختلف پروگرام وغیرہ؟

سلامہ آفندی نے ایک قہقہہ لگایا اور ذرا طعنہ آمیز انداز میں کہنے لگا:

—— بھئی تم بھی عجیب شخص ہو! کیا ہمیشہ تھیٹروں کے پروگرام اور اشتہارات ہی جمع کرتے رہتے ہو؟

—— جناب میرے پاس پانچ سو جلدوں سے بھی زیادہ ہوں گی۔

اس دوران میں اس لڑکے نے سب کتابیں زمین پر رکھدی تھیں اور اب وہ کسی ایسی کتاب کی تلاش میں تھا جو توفیق بک کو پسند آجائے۔ وہ برابر آواز لگائے جا رہا تھا:

"جوسن" کا آخری حصہ۔ شیخ محمد عبدہ اور اسلام۔ شرح معلقات۔ دیوان جبری۔

توفیق بک نے ایک چیخ لگائی اور کہنے لگا:

—— مجھے ڈراموں کی ضرورت ہے، تیرے پاس ہیں یا نہیں؟

لڑکا پھر جلدی جلدی اپنی کتابوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ لیکن اب بھی ذرا خوفزدہ دھیمے لہجے میں کہے جا رہا تھا۔

—— بہترین ناول دھوکہ باز راہب "راسپوٹین"۔ مشہور

ناول "مجدولین"۔ "آبجرات" "منظرات" تیسرا حصہ ... "مگرالین"!

ایسے سلامہ آفندی کو بھی جوش آگیا اور چیختے ہوئے کہنے لگا

— اے! ان کوڑاموں کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ہیں یا نہیں؟ مختصر جواب دیدے!

لڑکا اس کی طرف دیکھنے لگا اور رحم طلب انداز میں بولا

— خدا آپ کا بھلا کرے حضرت! میں چاہتا ہوں آپ کے ہاتھ کچھ بیچوں ابھی میں نے بوہنی بھی نہیں کی ہے مجھ سے ضرور کچھ خرید یئے۔ ایک ہی کتاب سہی۔

توفیق بک نے آخری حصہ آئس کریم کا حلق میں اتارتے ہوئے نہایت سرد مہری سے جواب دیا

— نہیں! مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔ صرف "ایکٹر کی ڈائری" کی ضرورت ہے۔

دقیق اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

— کیا جناب کو اصرار ہے کہ یہ کتاب خواہ مخواہ ضرور شائع کی جائے؟

— نہیں، نہیں، یہ بات نہیں بلکہ میں نے کسی ہفتہ وار اخبار میں اس نام سے کچھ مضامین پڑھے تھے۔

لڑکا اب بھی اپنی کتابوں کو چھانٹ رہا تھا اور برابر اپنے مخصوص انداز میں پکار رہا تھا۔

— دیوان عمر بن ربیعہ المکتبات مقالات خلیل جبران۔

سلامہ آفندی نے پھر ایک چیخ ماری اور اس لڑکے کو بہت بُری طرح دھکا دیدیا اور پھر زور سے ایک لات لگائی وہ زمین پر گر پڑا اور اس کی کتابیں اور دوسرا سامان اِدھر اُدھر پھیل گیا۔ وہ بیچارہ ڈرتے ڈرتے اپنی کتابیں وغیرہ جمع کرنے لگا اور دقیق نے غضبناک لہجہ میں کہا:

— پناہ بخدا سلامہ! آخر یہ کیا جہالت ہے؟

پھر اس نے اس لڑکے کو ایک قرش دیا اور کہنے لگا۔

— جاؤ، جاؤ، شاید تمہیں اور کوئی زیادہ رحمدل انسان مل جائے، چلو، جلدی بھاگو!

لڑکے نے اپنی کتابیں سنبھال لیں اور دقیق کو دعائیں دیتا ہوا حسبِ سابق آوازیں لگانے لگا:

— فتحی زغلول کی کتابیں۔ "مذکرات ہنیڈنبرگ"۔۔۔۔ "راسپوٹین" الاہرام کے ناول۔

اور دقیق اس کی کمزور آواز کو آس پاس کے شور و شغب میں ڈوبتے ہوئے برابر سن رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور پھر گویا اپنے کو مخاطب کر کے کہنے لگا،

— کیا یہ ہمارے لئے باعث شرم نہیں ہے کہ ہم یہ سمجھتے رہیں دُنیا میں انصاف اور خوش نصیبی کا وجود ہے۔ حالانکہ زمین پر ایسے لڑکے ہیں! استغفر اللہ املکہ ایسے کیڑے بھی موجود ہیں۔

توفیق بک مُسکراتے ہوئے کہنے لگا،

— لو بھئی! دقیق آفندی نے اپنا فلسفہ بگھارنا شروع کر دیا۔ دقیق نے جواب دیا۔

— آہ! پیارے دوست! یہ رنج و غم کی وجہ سے میرے دل کے ٹکڑے اُڑتے جا رہے ہیں۔ اس زندگی نے مجھے مصائب اور پریشانیوں کے راستے پر لا ڈالا ہے جس پر میں برابر چلا جا رہا ہوں اور یہی وہ بدنصیبی ہے جس کی وجہ سے میں دوسرے بدنصیبوں کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھنے پر مجبور ہوں میں ان سب چیزوں کو محسوس کرتا ہوں جنہیں وہ تمام بدنصیب انسان جو زندگی کی تلخیوں کو محسوس کرتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں ـــ صرف اس لئے کہ میں بھی انہیں میں سے ہوں۔ میں نے اس سارے نظامِ معاشرت کو اپنے تجربات کی کسوٹی پر کسا ہے اور مجھے یقین ہے کہ زندگی ایک نہایت حقیر گندی اور باعث شرم حقیقت ہے یہاں نہ تو انصاف ہے اور نہ رحم!

سلامہ آفندی کا چہرہ شدتِ اضطراب سے تمتمانے لگا وہ بولا۔

— مہربانی کر کے ہماری خوشیوں کو ایسی منحوس باتوں سے مکدر نہ کیجئے میں آپ کے برعکس اس زندگی کو مسرت آمیز مُسکراہٹوں سے شگفتہ پاتا ہوں۔

لیکن دقیق نے اس کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی گویا کہ اس نے کچھ سُنا ہی نہیں۔ وہ اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے کہنے لگا:-

—— اور اگر بفرضِ محال ہم اس دُنیا میں انصاف اور رحم کا وجود
سلیم بھی کرلیں تو پھر یہ مفلوک الحال غریب آخر کیوں پائے
تے ہیں؟ دُنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ چند لوگوں کے لئے سامان
یش مہیا کرنے کے لئے بھوکا مرتا ہے۔ کیا یہ صریح ظلم نہیں
؟ آخر یہ کیا بات ہے کہ یہ بیچارہ لڑکا تو سوکھی روٹی
ر معمولی ساگ پات پر گزارا کرتا ہے حالانکہ سلامہ آفندی
وزانہ گوشت سبزی، میوے اور حلوے کھاتے ہیں۔ میں تو
ناصرہ جیسے گندے متعفن محلے میں رہتا ہوں اور کمال بک
ہ بولیس جیسے صاف ستھرے علاقے میں زندگی گذارتا ہے
یا یہ انصاف ہے؟ کیا اسی کو رحمدلی کہا جاتا ہے؟
سلامہ نے تمسخر آمیز لہجہ میں کہا۔
—— رفیق! تم خواہ مخواہ سوسائٹی کی اصلاح کے خیال میں
دن دُبلے ہوتے جاتے ہو؟ تم از راہ کرم انسانی معاملات
ں دخل اندازی مت کرو۔ لوگوں نے تمہیں اپنی طرف سے وکیل
اکر کھڑا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اپنی پریشانی اور مفلسی کے
رے میں مبالغے سے کام لے رہے ہو۔ میں تو دیکھتا ہوں کہ تم
شحال ہو اور تمہاری زندگی نہایت آرام سے گزر رہی ہے۔
رفیق چلا اُٹھا اور کہنے لگا
—— میں نے اپنی پریشان حالی کے بارے میں مبالغہ کیا؟ میں
وہ شخص ہوں سلامہ! جسے صرف چار پونڈ ملتے ہیں جنہیں
ب کان کھول کر سن لو جنہیں میں اپنی ماں، باپ، دو بہنوں
ر خود اپنے کھانے، کپڑے اور گھر کے کرائے وغیرہ میں خرچ
تا ہوں۔ میں کیا کھاتا ہوں اور کیا پہنتا ہوں؟ سارے دن میں
رف ایک دن گوشت نصیب ہوتا ہے۔ اور اگر میرے کوٹ
اتار کر دیکھو تو معلوم ہو کہ میں کیسے چیتھڑوں سے اپنا تن ڈھانکنے
کی کوشش کرتا ہوں۔
اچانک ان کے سامنے سے ایک اخبار فروش المقطم، البلاغ
ر الکوکب وغیرہ اخبارات بیچتا ہوا گزرا۔
رفیق خاموش ہو گیا اور اس نے اپنا رومال نکال کر
پیشانی سے پسینے کے قطروں کو خشک کرنا شروع کیا۔ توفیق بک
ر سلامہ آفندی شام کے اخبارات خریدنے لگے۔ وہ دونوں
خبار پڑھنے لگے۔ اور رفیق خاموشی کیساتھ اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے
وں کو دیکھنے لگا۔ ابھی تھوڑی دیر گذری تھی کہ توفیق نے
ایک چیخ لگائی اور کہنے لگا
—— ارے! یہ کیا؟ سلامہ تم نے بھی پڑھا، یہ کیا خبر ہے؟
رفیق چونک اُٹھا اور سلامہ نے پوچھا:
—— کیوں؟ کیا بات ہے؟ میں نے تو کچھ نہیں پڑھا۔
توفیق بک نے ایک حسرت آمیز انداز میں کہا:
—— بکری، ہمارا پیارا دوست چل بسا۔
رفیق اور سلامہ دونوں ایک ساتھ بولے
—— بکری؟ کیا بکری کا انتقال ہو گیا؟
—— ہاں! کل ہی اس کا انتقال ہوا ہے۔ آج اس کی تجہیز و
تکفین کی گئی اور ہم لوگوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ لو رفیق تم خود
پڑھ لو!
رفیق نے اخبار لے لیا اور یہ خبر پڑھکر اخبار کو ایک
ایک طرف ڈال دیا۔ پھر اسی یاس انگیز لہجے میں کہنے لگا:
—— میں نہیں سمجھتا اس میں پریشان ہونے یا تعجب کرنے
کی کیا بات ہے؟ میں خود سوچتا ہوں کہ یہ خبر سُن کر آخر میرے
مُنہ سے چیخ کیوں نکل گئی؟ ایک شخص مر گیا، یہ کونسی بڑی بات ہے؟
توفیق بک نے ذرا سنبھلتے ہوئے کہا،
—— حقیقت میں یہ ایک بہت بڑی بات ہے۔ بکری ایک نوجوان
تھا اور پھر ہمارا دوست بھی، اس کی شادی ہو چکی تھی اور بچے
بھی تھے۔ میرا خیال ہے شاید اس کی ماں بھی موجود ہے۔
رفیق نے پہلو بدلتے ہوئے کہا:
—— یہ کوئی غیر معمولی خبر نہیں ہے، توفیق! لیکن ہم اس کو صرف
اس لئے اہمیت دیتے ہیں کہ بکری ہمارا دوست تھا اور ہم لوگوں
میں رشتۂ محبت قائم تھا۔
سلامہ کو اب ذرا ہوش آیا تو اس نے حصولِ اطمینان
کے لئے حیلے تراشنے شروع کئے، کہنے لگا:
—— بیکس وہ بیچارہ تھا بیمار.. کیا تم نے کبھی اس چیز کا
اندازہ نہیں لگایا؟ اس کی ظاہری حالت سے صاف پتہ چلتا
تھا کہ اسے کوئی پرانا اندرونی مرض ہے۔
توفیق بک نے جواب دیا۔
—— میں نے کبھی اس قسم کی کوئی چیز محسوس نہیں کی۔ بظاہر
تو اس کی صحت بہت اچھی تھی۔
رفیق نے نفرت انگیز تلخ انداز میں کہا:

—— سلامہ خدا کی قسم مجھے تو تمہارے مرنے کی اُمید تھی۔ بکری بیچارے کے متعلق تو میرا سان وگمان بھی نہ تھا۔ تمہارے لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب اس دُنیا سے کوچ کر جاؤ گے۔

سلامہ نے ذرا تنگ دل ہو کر جواب دیا۔

—— دفیق! یہ مذاق کا موقع نہیں ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے سمجھ لیا کہ واقعی اس کی صحت بہت خراب ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اپنے خاص ڈاکٹر سے جلد مشورہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ کچھ دنوں کے لئے اُسے موت کے مُنہ سے بچا لے۔

شام کو آٹھ بجے کے قریب وہ تینوں تعزیت کے لئے گئے۔ ان کے چہروں پر رنج و غم کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سلامہ آفندی برابر وہی رٹ لگائے جا رہا تھا۔

—— بکری بیچارہ بہت دنوں سے بیمار تھا اس کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے کوئی بُرا مرض ہے۔

وہ لوگ ایک ایسے کمرے میں بیٹھ گئے جہاں اور بھی بہت سے جان پہچان کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ رسمی دعا سلام اور اس افسوسناک خبر پر اظہار خیال کے بعد سوائے دفیق کے سب لوگ باتیں کرنے لگے۔ موسم، فصل، سیاست اور مشہور لوگوں کے حالات یہ سب ان لوگوں کی گفتگو کے موضوع تھے۔

لیکن ان کا دوست دفیق خاموش تھا۔ اسکے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک خاص مرکز پر اپنی نظریں جما رکھی تھیں اور ادھر ہی دیکھے جا رہا تھا، خاموش چند باتیں اس کے سینے میں آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹے پڑ رہے تھے۔ اس کے احساسات کے سمندر میں لرزہ خیز خیالات سیاہ مچھلیوں کی طرح تیرتے پھر رہے تھے۔ وہ اپنے عزیز دوست بکری کو یاد کر رہا تھا اور بڑے دردناک طریقے پر ان گذشتہ صحبتوں کو یاد کر رہا تھا جن میں وہ دونوں شریک تھے وہ سوچ رہا تھا کہ بکری کیسا ہنس مکھ شگفتہ مزاج انسان تھا۔ ساتھ ہی وہ خیال کرتا تھا کہ اب اس کا کیا حال ہو گیا ہے۔ بار بار وہ اس کی گندی لاش کو دیکھ رہا تھا جس سے بکری کے عزیز ترین رشتہ دار بھی بچتے پھر رہے تھے۔

اس نے بہت کچھ ضبط کرنا چاہا لیکن آخر اس کے مُنہ سے لوگوں کے سامنے نکل ہی گیا۔

—— دوستو! کیا یہ انصاف ہے کہ بکری نوجوانی میں موت کا شکار ہو جائے؟

ایک نوجوان جو زندگی کے باغ میں ایک پھول کی طرح تھا۔

سب لوگ خاموش ہو گئے اور اپنے چہروں سے ایک گہرے غم کا اظہار کرنے لگے۔ اور رہ رہ کر حسرت آمیز آہیں بھرنے لگے۔

دفیق برابر اسی مرکز پر نظریں جمائے ہوئے تھا اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری کیا۔

—— آخر بکری بیچارا کیوں ہوا تھا؟ کیا یہی چند سال اسے زندگی گزارنے کے لئے ملے تھے۔ وہ ایک ذہین اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا نوجوان تھا۔ یہ کیا ہو گیا؟ کیا کوئی شخص مجھے ان سب باتوں کا جواب نہیں دے سکتا؟

اس کے بعد اس نے اپنی ٹوپی اُتار لی اس کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔ وہ اچانک اپنی جگہ سے اُٹھا اور کمرے سے ہٹتے ہوئے چیخنے لگا

—— میرا سانس گُھٹا جا رہا ہے! میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے!!

حاضرین میں سے کسی نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگا —— انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سلامہ آفندی بھی ایک دفعہ پھر ہوش میں آیا وہ برابر کہے جا رہا تھا

—— میں آپ سب لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ بکری ایک بُرے مرض میں مبتلا تھا۔ کیا آپ لوگوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا؟

لیکن کسی نے اسکی بات کا جواب نہیں دیا۔ (محمود تیمور)

"ساحلی"

ماں کی محبت

کوہستان ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے سرسبز وادیوں اور ٹھنڈی ہواؤں سے مجھ کو اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ ملازمت سے کنارہ کش ہونے کے بعد میں نے شہروں سے دور پہاڑی علاقہ میں ایک مکان بنا لیا اور اپنے کتب خانہ میں زندگی کے باقی دن سکون سے گذار رہا تھا۔ جاڑے کے موسم میں بالکل تنہائی رہتی تھی۔ لیکن گرمیوں میں کوئی نہ کوئی دوست آجاتے تھے اور وقت اچھا گذرتا تھا۔

گذشتہ اپریل کا ذکر ہے کہ میرے عزیز دوست من موہن میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے خلاف معمول سردی پڑ رہی تھی ایک شام کو ہم دونوں کتب خانہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ گلاسوں میں آتش سیال رکھی ہوئی تھی اور کھانے کا انتظار تھا۔

"بھئی منبر۔ اگر میں جانتا کہ یہاں اپریل میں بھی ایسی سردی پڑتی ہے تو شاید اپنا آنا ایک مہینے کے لئے ملتوی کر دیتا۔ اور لتن کے ساتھ ہی آتا اُس کا امتحان شروع مئی تک ختم ہو جائیگا۔ تمہارا ملازم سلطان کہتا ہے کہ آج رات برف پڑنے والی ہے"

"حال تو میرا بھی ہے۔ اچھا ہے تم بھی برف باری کا لطف اٹھالو گے۔"

"اب کیا لطف اٹھائیں گے بوڑھے ہو گئے۔ یاد ہے دسیکشہ میں ولایت میں تھے تو سردیوں میں کیا کیا عیش کئے تھے۔"

اِس پر ہم دونوں نے ایک ایک ٹھنڈی سانس لی اسکے بعد قہقہہ لگایا پھر من موہن ذرا سنجیدہ ہو گئے۔

"یہ حیدر۔ بڑا لڑکا ولایت میں بہت پیسے ضائع کر رہا ہے۔ میں اُس کو کافی بھیجتا ہوں۔ پھر بھی ہر دوسرے تیسرے مہینے تار سے روپیہ منگواتا ہے۔"

میں مسکرایا۔ "آخر کس باپ کا بیٹا ہے۔"

من موہن نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

اُستاد۔ بات تو ٹھیک ہی کہتے ہو۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ [illegible] نکلے۔ اگر شادی کرتے اور دو چار لڑکے لڑکیوں کو ٹکٹکی باندھنا پڑتا تو اپنی جوانی کے سب عیش بھول جاتے۔"

میں کچھ دیر خاموش رہا۔

"بھائی موہن۔ تم تو جانتے ہی ہو میرے والدین نے میرے ساتھ کیا ظلم کیا اُدھر بیچاری نرگس بھولی بھالی لڑکی کو اس کے والدین نے اُس احمق احسان اللہ کے ساتھ زبردستی باندھ دیا معلوم نہیں بیچاری کی زندگی کیسی گذری"

"کبھی ملاقات ہوئی ہے؟"

"کبھی نہیں۔ پُرانا زخم تازہ کرنے سے کیا حاصل احسان اللہ نے سنا رشوت لے کر بہت کمایا ہے۔"

اتنے میں سلطان اندر آیا

"حضور ایک صاحب اور دو تین بیگم صاحب باہر ہیں۔ ڈاک بنگلہ میں جگہ نہیں ملی رات کو کوٹھی میں قیام کرنیکی اجازت چاہتے ہیں معزز لوگ معلوم ہوتے ہیں۔"

میں ایسی دور افتادہ جگہ پر رہتا تھا کہ ایسے غیر متوقع مہمان کبھی کبھی آجاتے تھے لیکن تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب معلوم ہوا کہ یہ احسان اللہ۔ نرگس اور اُن کی دو بیٹیاں تھیں۔ ساتھ ساتھ ایک نوجوان جو غالباً بڑی لڑکی کا منگیتر تھا احسان بیچارے معقول آدمی معلوم ہوتے تھے۔ فرمانبردار سعادت مند شوہروں میں تھے۔ بیوی کو میری جان میری جان کہہ کے پکارتے تھے۔ اور جب اُن کی ذرا تیوری چڑھتی تھی تو خاموش ہو کر سر جھکا لیتے تھے نرگس کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی بھولی بھالی لڑکی ہے۔ کیونکہ اب ان کا پہلوان ہیویٹ میں شمار ہوتا تھا۔

مجھ سے تعارف ہونے کے بعد البتہ نظروں میں کچھ وہی پُرانی جھلک آگئی اور آواز میں چند لمحے کے لئے وہی نرمی۔ بعد کو من موہن مجھ سے کہنے لگا۔ "تمہاری پسند کی داد دیتا ہوں۔ ماشاء اللہ اب بھی دلکشی ہے۔"

لیکن میں اِن نئی خاتون میں اپنی پُرانی محبوبہ کو تلاش کر رہا تھا۔ اور کامیاب نہ ہوا۔

دوسرے دن ناشتہ کے بعد نرگس نے مجھ سے سیر کو چلنے کی خواہش کی۔ باقی سب لوگ تاش کھیلنے بیٹھ گئے تھے۔ صنوبر کے درختوں کے نیچے ہم دونوں بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ میں کبھی کبھی متوسط العمر دوستوں سے بھی عشق و محبت کی باتیں کر لیتا تھا۔ لیکن آج یہ غلط ثابت ہوا۔ اور جب دوپہر کے کھانے کے لئے ہم دونوں واپس گئے تو بالکل خاموش تھے۔ اور نرگس رنجیدہ تھی۔

شام کے وقت میں آرام کرسی پر لیٹا ہوا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ نرگس آئی اور کھڑکی کے شیشوں سے غروب آفتاب کا سماں دیکھنے لگی۔

"منیر تم کو میرا کچھ خیال باقی ہے۔ یا پرانی باتیں بالکل ہی بھول گئے۔"

میں نے روہانسی شکل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"اب ہماری محبت کی صرف ایک ہی یادگار ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ میری بڑی لڑکی یاسمین سے شادی کر لو وہ مجھ سے ہر طرح بہتر ہے۔ تمہاری زندگی کو یقیناً دلچسپ بنا دیگی۔"

"لیکن میں تو بڈھا ہوں یاسمین اور میری کیا مناسبت۔"

"منیر۔ تم بہت احمق تھے۔ شادی میں عمر سے کیا تعلق۔ یاسمین چند دنوں یہاں رہے گی تو تم سے محبت کرنے لگے گی کتابوں سے بھی اسکو بہت شوق ہے۔"

"اور وہ لڑکا اختر جو تمہارے ساتھ ہے میرا خیال ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اور یاسمین بھی ۔۔۔"

"لڑکے لڑکیوں کی محبت ہی کیا اختر اچھا لڑکا ہے لیکن اس کی اتنی حیثیت نہیں جو میری لڑکی کو اس آسائش سے رکھ سکے جس کی وہ عادی ہے۔"

آفتاب پہاڑوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ میری طرح دھوکا دے رہی تھیں۔ میرے کان گونج رہے تھے۔

"یہ جملہ تو میں پیشتر بھی سن چکا ہوں۔"

تہی دامانی

یہ گاؤں کا سنسان سناٹا اور شام کی دھندلی تاریکی
اک شام بہت رنگیں مگر مفلس کی نگاہوں میں پھیکی
دھرتی پہ یہ پانی سونے کا آکاش پہ لہریں چاندی کی
یہ چاند یہ تارے یہ دریا میرے لئے کیا ہیں کچھ بھی نہیں

یہ شہر کی چلتی سڑکوں پر ہر سمت دکانیں نورانی
بجلی میں بھی جلنا ہو جیسے افلاس کے تپتے کا پانی
چیزوں کی گرانی میں شامل غربت کے لہو کی ارزانی
یہ سارا یہ ساماں عشرت کا میرے لئے کیا ہی کچھ بھی نہیں

راتوں کے اندھیرے میں جگمگ جگمگ یہ فضا میخانوں کی
میزوں پہ لطافت مستی کے بہکی ہوئی لے دیوانوں کی
بوتل کی یہ نوائے قلقل میں ہلکی سی کھنک پیمانوں کی
یہ شیشہ یہ ساقی یہ صہبا میرے لئے کیا ہی کچھ بھی نہیں

سڑکوں پہ حسینوں کا تانتا جادو کا پیرا چلتا پھرتا
ملبوس کے بیچوں سے چھلکے چھلکے ہے جوانی کی صہبا
مستی کے قدم سنبھلے سنبھلے آنچل کا سرا ڈھلکا ڈھلکا
یہ حسن و جوانی رنگ ادا میرے لئے کیا ہی کچھ بھی نہیں

آنکھوں پہ مری احسان ہے کیا سبزہ وہ اگر ہے برسائی
کیوں پوچھنے جاؤں کیاری میں پھولوں کا مرجھائی
کیا کام ہے مجھکو گلشن سے کلیاں ہوں کھلی یا مرجھائی
یہ پھول یہ شبنم سیر و فضا میرے لئے کیا ہی کچھ بھی نہیں

کالج کی یہ تعمیر خنداں ممنون غم و آلام نہیں
اس میں کسی مفلس کے گھر کے غمگین پسر کا نام نہیں
سامان تجارت ہے یہ بھی سامان معاد عام نہیں
یہ علم یہ حکمت ہوش ربا میرے لئے کیا ہی کچھ بھی نہیں

بیجان ہو جب نقش ہستی تصویر تمنا کیا بولے
تاراج کے جو میں پنجے میں تہذیب کی مینا کیا بولے
چیلوں کے نجاست خانے میں بیچارا پپیہا کیا بولے
یہ نغمہ یہ شعر و ساز و نوا میرے لئے کیا ہی کچھ بھی نہیں

(حلقۂ ارباب خیال کانپور)　نشور واحدی

اکالی گربچن سنگھ

نہ جانے کب

چھوٹے سے چھوٹا کنکر اٹھا کر دیکھو تو کالا زمیں کالی زمیں کا ذرّہ ذرّہ کالا۔ اور بھی پاتال تک چلے جاؤ کالی ہی کالی چٹانیں نظر آتی تھیں۔ لیکن ایسی نہیں جنہیں معمولی تیشہ ٹکڑے ٹکڑے نہ کر سکے۔ جس کی ضربیں انہیں کمزور نہ کر دیں

ہتھوڑوں کی ضربوں سے وہ زمین دوز کوئلہ کی کان جھڑ جھڑ کر دن بدن کھلتی جا رہی تھی۔ سطح زمین سے نیچے ایک سیاہ اور تاریک تہہ خانہ سا بنتا جا رہا تھا۔ اُس تہہ خانہ میں اس بات کا خوف نہیں تھا کہ یہاں کوئی بھوت بستا ہوگا۔ کوئی چڑیل رہتی ہوگی رات کو خوفناک صدائیں گونجا کرتی ہونگی۔ یا ایک دردبھری غم میں ڈوبی ہوئی آواز۔ کچھ پھر کاٹو مارو کی صدا۔ بگل اور نقاروں کی آواز۔ گھوڑوں کی ٹاپ۔ ہنہناہٹ۔ ہاتھیوں کی چنگھاڑ اور پھر اس کے بعد سکون ایک سہما سا سکون جو دلوں پر ہیبت طاری کر دے۔

یہ سب کچھ نہیں تھا۔ لیکن اگر کچھ تھا تو اُس کان میں صدیوں پہلے کی ——— شاید جب کرۂ ارض پر ذوی الارواح میں سے صرف نباتات ہی کا وجود تھا ——— ایک داستان مضمر تھی۔ دنیاوی تعمیر کی داستان کوئلہ کی تہوں پر کچھ اُلٹے سیدھے، ٹیڑھے ترچھے داغ۔

تاریکی میں بڑھتے جاؤ، کیا مجال جو ذرا سی آہٹ بھی سنائی دے۔ کسی جھڑ کر گرنے والے کوئلہ کے ٹکڑے کی۔ چپ چپ کرنے والی چھپکلی کی۔ یا بھنبھناتے ہوئے مچھّر کی۔ اندھیرے میں یہ بھی کبھی سوچا نہیں جا سکتا تھا کہ وہاں شاید کوئی لگا کھڑا ہے۔ موقعہ پاتے ہی وار کر بیٹھے گا۔ لیکن یہ خدشہ ضرور لگا رہتا تھا کہ بے ترتیب کٹے ہوئے کسی گوشے میں ابھری ہوئی کوئلہ کی تیز نوک زخم نہ لگا دے۔ وہاں ایک عجیب قسم کی بُو آتی تھی۔ کچھ ایسی ہی جیسے انجن میں جھونکنے والے کچے کوئلہ کی ہوتی ہے۔ لیکن بہت زیادہ مقدار میں۔ اندھیری دُنیا جہاں آفتاب کبھی طلوع نہیں ہوتا تھا۔ صبح کبھی نہیں ہوتی تھی۔ شام کب ڈھلتی کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ رات تو سدا چھائی رہتی تھی۔ لیکن فلک پر تارے کبھی نظر نہیں آتے تھے۔ ہوا گم رہتی۔ دم گھٹتا۔ برقی پنکھوں کی مدد سے بُو میں بسی ہوئی ہوا پھیپھڑوں تک پہنچتی۔ دل دھڑکتا، آنکھوں تلے اندھیرا چھایا رہتا تھا۔

ہر صبح جب بھونپو کے مُنہ سے شدّت کے ساتھ بھاپ کی چیخ نکلتی تو ایک عجب سماں بندھ جاتا جسے سُن کر دل بیٹھ جاتا ہاتھوں کے طوطے چھوٹ جاتے۔ وہ سب کچھ بھول جاتے اور سر قدم بڑھاتے ہوئے کھدان کی طرف بڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ چاہتے تھے بہت جلد کام پر پہنچ جائیں۔ حاضری دیں۔ اور پھر گہرے تاریک زمین دوز تہہ خانوں میں گھس جائیں۔ جہاں کولتار کی بُو۔ پھاوڑوں کی آواز۔ گھنوں کی ضربیں اور چھوٹے چھوٹے ٹھیلوں کی گڑگڑاہٹ کے سوا کچھ سنائی نہ دے۔

وہاں دن کی روشنی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ تمازت سے پسینہ نہیں چھوٹتا تھا۔ گرم لُو کے جھونکے جسم کو جھلسنے سے قاصر تھے اس لئے وہ تیزی سے کوئلہ کی کان کی طرف دوڑ لیتے تھے۔

جاڑا ہو یا گرمی یا برسات۔ وقتِ مقررہ پر بھونپو کی آواز کے ساتھ انہیں وہاں حاضر ہو جانا چاہئے تھا۔ یہ منیجر کا حکم تھا منیجر کو مالک کے حکم کی تعمیل لازم تھی۔ کہا نہیں جا سکتا شاید مالک بھی کسی کے حکم کا پابند تھا۔

قانون کیا تھا انصاف کس شے کا نام تھا انسانیت کیا تھی ہمدردی اور اُنس کیا تھا۔ مجبوری کیا تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اُن کی حالت یہ دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آتے تھے تو کیوں؟ اگر چند لمحات کے لئے کوئی خدا کا بندہ تفکرات کا مرکز بن جاتا تو کیوں۔ کیوں ایسا ہوتا تھا۔ وہ سوچنے سے مجبور تھا۔ کیوں ایسا ہوتا ہے؟ وہ پوچھنے سے مجبور تھا ہاں جب بھونپو کی آواز کسی جابر و بدخصلت جلاد کی طرح گرجتی۔ ننگے پاؤں عورتوں اور مردوں کا ایک ہجوم ہراساں اونچی نیچی ناہموار بے سطح زمین کو پار کرتا کھدان کی طرف بڑھتا چلا جاتا تھا۔ کوئلے کی سیاہی سے اُن کا آدھا تن ڈھانکنے والے پھٹے پُرانے کپڑے کالے نظر آتے تھے۔ عورتوں کی گود میں بچے،

سروں پر کپڑوں کی ہلکی سی گٹھڑی اور کچھ کھانے کا سامان۔ مزدوروں کے سر پر کچھ اپنی ضروریات کی چیزیں۔

چلو، بڑھو نہیں تو . ۔ ایک خیال اُن کے دلوں میں کھلبلی مچا دیتا۔ وہ سرعت سے آگے بڑھتے۔ چلو، بڑھو نہیں تو ۔ ایک سیاہ تصور تھا جس کا حقیقت میں آجانا اُن کے لیے قیامت تھا۔ وہ بہت تیزی سے بڑھتے تھے۔ بھونپو کی آواز بجتی ہوتی ہے۔ وہ سوچتے۔ لیکن اگر وہ یہ کہہ دیتے کہ اُسے بند کر دیا جائے۔ کمزور مزدور اس کی آواز برداشت کرنے سے قاصر ہیں۔ تو کیا بند کر دیا جاتا؟ اُن کے کانوں پر دردِ کرب کی کراہ اور بھوک کے پیاسوں کی گریہ و زاری کا اثر ہی کافی ہے۔ بھونپو کی آواز کیسے برداشت کرتا۔ لیکن اُسے بند کرنے کا حکم ایک جُرم تھا جس کی پاداش میں قید خانہ تھا۔ کوڑوں کی مار۔ وزنی آٹے کی چکّی یا کولھو۔ بھونپو کو بجنا تھا اور وہ بجتا تھا۔ مزدوروں کو جو لازم تھا وہ کرتے تھے۔ اُن کے قدم سرعت سے کوئلے کی کان کی طرف بڑھتے اُنہیں بھی کوئی روکنے سے مجبور تھا۔

اُنہیں کون روکتا۔ سطحِ زمین پر ہی کیا۔ چلتے چلتے زمین دور گہرائیوں میں پہنچ جاتے تھے ناسور کے کیڑے کی طرح دھرتی کے کھوکھلے زخمی تن میں اُچھلتے کودتے۔ ہانپتے سسکتے مر بھی جایا کرتے تھے۔ آہنی ڈنک مارے نوچتے اور لوٹتے، جیسے قصائی گوشت کی بوٹیاں کاٹتے ہیں جس میں رحم و کرم کا مادّہ رتّی برابر نہیں ہوتا۔

جبکہ بھونپو کی صدا کا رُکنا محال تھا تو اُن کی حرکت رُک کر معدوم ہو جاتی۔ اُنہیں تیزی سے بڑھنا تھا اور خاص کر اُن عورتوں کو جن کے سروں پر بوجھ اور کمر سے دودھ پیتا بچہ بندھا ہوتا تھا۔ اُن پر کتنی ذمہ داریاں تھیں۔ بھلا کون سوچے؟ اُن کو ایسا آپا سنبھالنا مشکل تھا۔ پھر من من بھر کے بارک حالت پھر کان کی زمیں دور گہرائیں۔ سیاہ دُنیا تاریک ماحول۔ لوگ کہتے ہیں کہ کوئلے سے دُنیا کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ جس شخص نے کوئلے کی ماہیت کا انکشاف کیا بڑے معرکہ کا کام کیا۔ اپنی جان تک قربان کر دی۔ شاباش! شاباش!! شاباش!!!

لیکن اُن کانوں کی گہرائیوں سے دم کن کے گھُٹا کرتے تھے؟

دن کو رات سمجھ کر بجلی کی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کون سیاہ پہاڑوں سے اپنا سر پھوڑا کرتے تھے؟۔ وہ کون تھے؟ وہ کیا تھے؟ وہ جنسِ نازک جسے بزرگوں نے دیویاں کہا تھا تعظیم و تقدیس کے لائق۔ شبنم کا ایک قطرہ۔ خدا کا بہترین روپ۔ پاک محبت۔ خوشبودار پھول کشش سرل کی رہبر کامل۔ خلقت کے بھیدوں کا مخزن۔ خوشی کا سرچشمہ۔ شاعر کا ایک بدیع تخیّل۔ ایک گوہر بے بہا اور جوہرِ نایاب۔ قناعت کی جان اور آرزوؤں کا ایمان۔ سارِ حقیقت اور رازِ مسرت۔ ایک درد ایک مسرت۔ لوگ کہتے ہیں اس سے محبت کی جاتی ہے۔

لیکن وہ کوئلہ کی کھدانوں میں جھونکی جاتی تھیں مزدوری کرنے کے لئے پیٹ پالنے کی خاطر وہ سمجھتے ہیں عورت مشین ہے۔ جو کام کرتی ہے۔ پہلو بھی گرم کرتی ہے نظروں کا سرور بھی بنتی ہے۔ آج دُنیا میں نا انصافی ستم اور نفس پرستی کا نام عورت ہے۔

اُنہیں کانوں میں جھونکا جاتا تھا۔ تاکہ بڑے بڑے کوئلوں کے ٹکڑے اُٹھائیں۔ ٹھیلوں میں لادیں۔ اور وہ کارخانوں ملوں جھک جھک کرنے والے انجنوں میں دھواں اور راکھ بن کر اُڑ جائیں۔ سارے مزدوروں کی تقدیر کا چکّر ایک ہی محور پر گھومتا تھا۔ ایک ہی محور پر جہاں اُنہیں باندھ دیا گیا تھا من مانے طریقے سے حرکت میں لایا جاتا۔ وہ گھومتے۔ وہ کیا گھومتے وہ تو اُن کی تقدیر کا چکّر تھا۔ جو ایک ہی محور پر گھومتا تھا اُسی ایک محور پر۔

وہ بھی مزدور تھی۔ عورت تھی۔ بے انصافی کا مرکز۔ وہ! پھر وہ!! اُس نے کھدان کی گہری کھوئیں دیکھی تھیں۔ کالی سیاہ چٹانیں توڑی تھیں اُن میں اندھیری تنہائیاں بھی دیکھی تھیں۔

وہ بھونپو کی آواز سُنتے ہی کمر سے بچّہ باندھ لیتی۔ کچھ بوجھ سر پر لاد لیتی۔ پھر کچھ اونچی نیچی ناہموار زمین کی اُگی ہوئی گھاس پیروں تلے روندتی کھدان کی طرف بڑی تیزی سے بڑھا کرتی تھی۔ جہاں اُسے پہنچنا ضروری تھا۔ پیٹ کی آگ بڑی ظالم ہوتی ہے۔ اُسے وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچا کرتی تھی۔ وقت پر پہنچنا بہت ضروری تھا۔ سبھوں کے ساتھ اُسے حاضری دینی پڑتی تھی۔ سب سے پہلا کام

ی ہی تھا۔ کوئی اُس سے ہنس کر باتیں نہیں کرتا تھا۔ کسی کی نظروں
ا وہ تارا نہیں تھی۔ جیسے سب مزدور تھے ویسی ہی وہ بھی تھی۔
جو اُن کے ساتھ ہوتا تھا وہ اس کے ساتھ۔ ہاں کچھ عورتوں اور
مردوں میں فرق ہوتا ہے جو عورتوں کے ساتھ اس غلام دیش
میں ننگے اور بھوکوں کے دیش میں ہر دور دمتیہ در عورتوں
کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس سے بھی وہی کچھ ہوتا تھا جس کام
کے لئے شاید وہ پیدا کی گئی تھی وہی کچھ ہوتا تھا۔ اُسے تو
پیدا کرنے والا بھی اپنی کارگذاری پر شرمسار تھا۔ پھر جو کچھ
ہوتا تھا ٹھیک ہی ہوتا تھا۔ اُس سے آگے کچھ ہوا تھا بتلانا
عبث ہے۔ ہاں، بھونپو بھی بجا کرتا تھا۔ حاضری ہو جانے
کے بعد وہ آواز اُس وقت بہت دردناک محسوس ہوتی تھی
ایک ذبح ہونے والے جانور کی طرح جس کی زبان پر آخری
فریاد ہو۔ صبح کا سہانا وقت ہوتا۔ باہر کوئلوں کے سجائے
ہوئے ڈھیر دور تک پھیلی ہوئی گھاٹیوں کی طرح دکھائی
دیتے اور اُن کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے ببولوں نے گھنے
درخت جن کے پتوں پر کوئلے کی راکھ کی تہ جمی ہوتی عجیب
ہی منظر پیش کرتے تھے۔ ایک ادھ جلی ویران چتا کی طرح
سارا نقشہ کسی غمگین تصویر میں کھویا کھویا سا دکھائی دیتا۔
اور پھر آفتاب کی روپہلی تر و تازہ کرنیں ساری سیاہ دنیا
کو چومتیں کوئلے کے ٹکڑے کس قدر چمکتے کہ آنکھیں چندھیا
جاتیں کوئی یہ کوئی کوئلے کا ٹکڑا ہونا ہی ایسا ہے۔
سہانی صبح۔ اور بہت سہانی صبحیں اُنھوں نے جب سے
ہوش سنبھالا تھا نظر بھر کر نہیں دیکھی تھیں۔ جب اُن کی
حاضری ہو جاتی۔ اُنکے بچوں کو اُن سے الگ کر دیا جاتا تھا۔ اُنکو
اپنے بھولے بچوں کو کھدان میں لیجانے کی مناہی تھی۔
ٹوکریاں دیکر بجلی کی لفٹ سے اُنھیں نیچے اُتارا جاتا۔
کھدان کی تاریکیوں میں۔ بہت نیچے کہ اوپر کی آواز نہ سن سکیں۔
نیلگوں فلک نہ دیکھ سکیں وہ بڑے وقت پر پہنچا کرتی تھی۔
کھدان کی گہرائیوں میں سر پھوڑنے کو اُس کا بچہ اوپر ہی رہ
جاتا تھا۔ ایک شیشی بھر کر اُس کا نپل اُس کے منہ میں دے آتی
وہ اُسے چوستا۔ جب روتا تو کوئی لوری دینے والا نہیں تھا۔
اور جب ہنستا تو ہنسی دیکھکر کوئی خوش ہونے والا بھی نہیں
[illegible] بہت سارے کالے کلوٹے دبلے پتلے، سوکھی
ہڈیوں کے ڈھانچے۔ چھوٹے بڑے بچے رہتے تھے۔

وہ ایک ابر آلود صبح تھی۔ بے ترتیب ابر کے ٹکڑے متوالوں کی
طرح جھومتے بھٹکتے دکھائی دے رہے تھے چار سُو ایک ہنگامہ عرق
کے سبب پڑی ہوئی گھاٹیاں کنکریلی زمین کے ٹیلے بارش کے شفاف
پانی میں نہائے اپنے اپنے رنگ سرائے ہوئے تھے۔ ایک بھیگا بھیگا
اُجڑا اُداس تھا۔ کچھ دیر ہوئی بارش تھم چکی تھی۔ عین اُس وقت
جبکہ بھونپو بجنے والا تھا۔ بھونپو کو بجنا تھا اور وہ بجتا تھا اپنے
وقت پر اور عین وقت پر۔

آخرش بھونپو بجا کیونکہ صبح ہو چکی تھی۔ یہ عجیب بات کہی
جا رہی ہے بھونپو تو دور مشرق کی گھاٹیوں سے اُبھرنے والے
سورج دیوتا کے درشنوں کے بعد ہی بجا کرتا تھا۔ صبح تو ہونی ہی
جانی تھی اور آج بھی صبح ہو چکی تھی۔ وہ اونگھ رہی تھی۔ رات
بھر سو نہ سکی تھی۔ کچھ دن بھر کی مشقت سے تھکی ماندی۔ کچھ
ملیریا کے مچھروں کی مہربانی ہلکا سا بخار چڑھ گیا تھا۔ تنگ
تاریک گھٹی ہوئی کوٹھڑی کی حرارت نے اور ظلم ڈھایا۔ اُس کا
مرد بھی بکواسی تھا۔ سارا دن کدال چلاتا اور پھاوڑے مارتے
کھٹ کھٹ کی آواز سے اُس کا نازک دماغ اپنی جگہ سے مل
چکا تھا۔ اُس نے رات بھر اپنی فرمائشوں کی رٹ لگائے رکھی۔
سر دبوایا، پیر سہلوائے۔ کمر میں مالش کرائی۔ اب اس کی جان
تھکی جاتی تھی وہ اونگھ رہی تھی۔ رات کو ایک منٹ کے لئے بھی
آرام نہ کر سکی تھی۔ سو پوچ رہا تھا ایک خبیث جلاد کی گرج کے
مانند۔ اُسے بہت جلد پہنچ جانا چاہیے تھا۔ یہ اُس کا فرض تھا۔
وہ غلاموں کی غلام تھی۔ وہ ایسی سرزمین میں پیدا ہوئی تھی۔
جہاں گلے کا ہار بنا کر رکھے جانے کے قابل نہیں تھی بلکہ پیٹ
کی خاطر محنت مزدوری کرنے پر مجبور تھی۔ وہ اُس گھر میں پیدا
ہوئی تھی جس گھر میں اُن کی ایک مسکراہٹ سے سینکڑوں
تتلیاں جاگ اُٹھنے کی بجائے وحشت کے بھوت ناچنے لگ
جاتے تھے ہر کام سے مجبور تھی۔ پیر من من کے بھاری جسم سے
ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارا خون نکال لیا گیا ہے۔ سر پر پیک
کی بجائے دو کوئلوں کی ٹوکریاں رکھ دی گئی ہیں آنکھوں تلے
اندھیرا۔ کھدان کی سیاہ دنیا کا نقشہ آج کسے کھدان کی
کالی کالی دیواریں اور ننگی جھکنے والی سیاہی قید محسوس ہوتی تھی۔
چلنے سے معذور تھی ہر حالت میں چلنے سے مجبور تھی۔

آخر وہ چل ہی پڑی۔ وہ مجبور تھی لیکن جانا ضروری تھا۔
ہو بیوی کی آواز تو گونج ہی رہی تھی اُسے پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ وہ
ہی دیکھتی اور قدم قدم پر لڑکھڑاتی ایسی کی طرح۔ کچھ سوچتی ہوئی
یک ضروری بات سوچتی ہوئی۔ شاید آج کچھ ہونے والا تھا۔
مکن ہے اُسے ہی کچھ کرنا ہو۔

اُسے وہیں تک پہنچنا تھا۔ وہاں تک جہاں سے سفید دھوئیں
کا ایک ہلکا سا غبار فلک کی طرف پرواز کر رہا تھا اور نیچے زمین
کھوکھلی۔ کھوکھلی ایک وسعت تک کھوکھلی

وہ اُسی سُرعت سے وہاں تک پہنچی جس طرح پہلے پہنچا
کرتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا۔ آج وہ تھکی ماندی تھی پسینہ کی
بوندیں جسم سے ٹپک رہی تھیں۔

اُسی طرح بجلی کی لفٹ سے وہ نیچے اُتاری گئی انسان
کے سیاہ تصور میں جہاں وہ مرنے سے پہلے پہنچا دیئے جاتے ہیں
اتار دی گئی۔ کسی طرح اُس نے کام شروع کیا۔ کوئلے کے بڑے بڑے
ٹکڑے دیواروں سے ٹوٹ ٹوٹ کر لوٹ رہے تھے جھڑ رہے تھے
شعلے جل رہے تھے لیمپوں کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔
کوئلہ کی دیوار چمک رہی تھی کہیں نم، خشک کہیں نم کھٹاکھٹ
کدالوں کی صدا آ رہی تھی۔

بجلی کے ذریعہ کوئلہ کا انبار اوپر سطح زمین پر لایا جا رہا
تھا وہ صرف تاریک انسان کے گھناؤنے تصور میں تھی۔ اُسے
خوف نہیں تھا۔ ڈر نہیں تھا۔ فکر نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے۔
زمین کی کھائیوں میں جہاں سانس لینے کو مصنوعی ہوا۔ فضا کی
پستگی کا نام نہیں قدرت کا اُکھڑا ہوا۔ دبا ہوا ایک قیمتی دھبہ
جسے موت کو ظالم سمجھتے ہیں اور یہ بھی وہ یہ بڑی ظالم
موت بُری طرح آتی ہے۔

ایک سیاہ بھیانک اور بہت بڑی کوئلے کی سل کھسک کر
گر کے ادھر آ رہی وہ نیچے دب گئی ناک اور مُنہ سے خون کی
دھار بہہ نکلی۔ وہ چیخی اور چلائی، تڑپی اور دم توڑ دیا مزدور
مڑے چیخے دوڑو۔ بچاؤ۔ ہٹاؤ۔ ہٹاؤ۔ لیکن وہ کچل بسی تھی۔
آنے سے پہلے کسی امداد سے پیشتر۔ یکایک ایک دھما کا
ہوا۔ کوئلہ کی راکھ اُڑی اور ایک بھیانک تاریکی موت کا سیاہ
کفن بن کر جسم سے لپٹ گئی۔ ہر سُو اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ برقی
روشنیاں کانپ کر گل ہو چکی تھیں۔ پھر ایک روشنی دکھائی

دی۔ لال سُرخ لپٹوں والی۔ جو اپنی خونی زبان نکالے بے بس مزدوروں
کو چاٹ جانے کے لئے لپک رہی تھی۔ سنسناہٹ سُنائی دی۔ دلوں
کی دھڑکنیں کانوں تک آنے لگی۔ بتیاں رُک گئیں۔ شیلے تھم گئے۔ بھاگو
دوڑو کی صدا آنے لگی۔ کوئی سمجھا کوئی سوچتا ہی رہا۔ لیکن بھگدڑ
مچ گئی۔ جس طرف کا رُخ کرتے سنسناتے ہوئے شعلے جھلس دینے کو
لپکتے۔ شاید موت فاتحانہ قہقہہ لگا رہی تھی۔ بے بسی اور مزدوری کے
ذریعہ اُن کی تقدیر پر آخری داؤں پھینکا تھا۔ بازی جیت
چکی تھی —— کام ختم ہو چکا تھا۔

اُس کھدان میں کام کرنے والے صدہا مزدوروں کے دل
جلا کرتے تھے۔ ایک دن آیا اُسے خود آگ لگی۔ جو بجھائے نہ بجھی اور
آج بھی جل رہی ہے نہ جانے کب تک جلتی رہے گی۔

بھونپو کی صدا خاموش ہو گئی۔ اب وہ کبھی نہ گونجے گی۔
بلڈ ٹنڈیوں پر گھاس اُگ آئی ہے۔ کوئلہ کے انبار لیجائے جا چکے
ہیں۔ اس جگہ اب چھوٹے چھوٹے پیڑوں کے پیڑ اور جنگلی درخت اُگ
آئے ہیں قریب ایک وسیع اور کھلے میدان کے اُبھرے ہوئے
ویران ٹیلوں پر پڑی ہوئی کوئلوں کی راکھ آندھی اور طوفان
کے دھکوں سے لا علمت کی گہری تاریک گھاٹیوں میں کھو گئی
ہے پہاڑی کے جنگلی پھولوں کی خوشبو اُس جلتی ہوئی مزدوروں
کی حسرتناک چتا پر آتی ہے اور جھلس جاتی ہے۔ آفتاب چوٹیوں
کی اوٹ سے صبح صبح ایک چور کی طرح جھانکتا ہے۔ لیکن مزدوروں
کے کوئلوں کی راکھ سے لپٹے ہوئے سیاہ چہرے اپنی طرف جھکتے
ہوئے نہیں دیکھتا۔ سیاہ گھٹائیں وحشی دیووں کی طرح لڑتیں جھگڑتیں
چیختیں اوپر اُٹھتی ہیں اور زندگی کی مجتمع قوت مٹا کر فنا ہو جاتی ہیں۔
لیکن وہ آگ بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ نہ جانے کہاں تک زمین کی گہرائیوں
میں پھیلتی رہے گی چھک چھک کرتی ریل گاڑیاں اس طرح دھوئیں دھواں
اُڑاتی چلتی نظر آتی ہیں۔ کارخانوں اور ملوں کی اونچی اونچی سیاہ
چمنیوں سے سیاہ دھواں اب بھی فلک کی طرف پرواز کرتا ہے اب بھی پیٹ
کی آگ یعنی بھوک سے لاچار قسمت کے ہاتھوں تنگ اندھے لیڈروں کی
آنکھوں سے روپوش سینکڑوں دلہنیں کچھ کنواریاں کچھ بیوائیں۔ کچھ
حاملہ۔ کچھ بوڑھی۔ ایسی ہی جہاں ایک دن کوئلوں کی سیاہ راکھ سے اپنے چہرے
کالے کیا کرتی ہیں۔ نہ جانے ان کوئلوں کی کھدان میں کب آگ لگے گی کب بھیانک
بھبکتے ہوئے شعلے آسمان کی طرف لپک لپک کر اُسے جھلس دیں گے سینکڑوں ستارے
نظر آئیں گے ظالم اور ظلم کانپے گا۔ معصوم غریب پہلے ہی سے کالا کفن پہنے

...یسی رامپوری

کپڑے ہی کپڑے

درازیٔ عمر کے نسخوں میں مجھے صرف وہ نسخہ پسند ہے جو عمر تو بڑھادے مگر اس کے ساتھ عمر کی تکرار تعلق کو نہ بڑھائے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ درازیٔ عمر کی کوشش یا آرزو کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم زندگی کے خوب مزے لوٹے جائیں۔ مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے اور نہ گاندھی جی کو ہے۔ ہم دونوں بزرگوں کے عدم اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ چادر کی آڑ میں زیادہ مزے رہتے ہیں اور چادر ہے عنقا۔

مجھے ایک سو بیس سال اور زندہ رہنا ہے۔ بڑھ گئی کہ لیجئے عمر۔ اس وقت کوئی سن ہو میرا انتقال سنہ ۲۰۶۶ء میں ہوگا۔ سن تو انسانوں نے بنائے ہیں عیسوی، ہجری، بکرمی وغیرہ چنانچہ اپنی عمر طبعی کے لئے یا بد سن ہوں بھی کہو! سب مجھے اس وقت اپنی صحیح عمر معلوم نہیں یہی وجہ ہے کہ میں لاکھیں سن اور غیر خیالی عمر وہ باتیں بیان کرنے والا ہوں جو اپنی لمبی عمر کے متعدد سنوں میں میری اپنی نظر سے گزر چکی ہیں

سنہ ۲۰۴۰ء کا واقعہ ہوگا کہ ایک دفعہ میرا دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ میری تینوں پرپوتیاں اور دونوں پرپوتے بھی ساتھ تھے۔ بہت سی چیزیں خریدنی تھیں۔ لڑکیاں بولیں کہ دادا ابا تین چار بنڈل "کمل کپڑ" کے لینے ہیں۔ میں نے کہا اچھا۔ ابھی یہیں آجائیں گے۔ لڑکوں نے کہا کہ ہمیں دس تھان "سوس کپڑ" کے درکار ہیں۔ میں نے ان کی فرمائش بھی نوٹ کرلی مجھے خود بھی بدر سوٹ کی ضرورت تھی۔

تمام چیزیں بڑی گراں تھیں۔ حکومت اور اس کا قانون دستور چل رہا تھا۔ انصاف سے دیکھا جائے تو بہتر حکومت ہندوستان کو مل بھی نہ سکتی تھی کیونکہ ہندوستانی تو حکمرانی کے باب میں دوسری ہی جنگ عظیم میں اپنی نااہلی کا ثبوت دے چکے تھے انہوں نے غلہ دبایا، کپڑا دبایا، قوم کا گلا دبایا زندہ رہنے کی ہر چیز دبائی اور بلیک مارکیٹ کھولا اور نتیجتاً حکومت نے اُن کو دبایا، فتنہ دبایا، ملک دبایا، مرنے کی تمام سہولتیں مہیا کیں اور ایسا مارکیٹ کھولا جو مارکیٹ کا مارکیٹ تھا اور بیاباں کا

بیاباں یعنی جس میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ مل سکتا تھا اور کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ مل جاتا تھا صرف "اتر" کی ضرورت تھی۔

اور اب جس زمانہ کی میں بات چیت کر رہا ہوں اس وقت تک تو چھٹی جنگ عظیم ہو چکی تھی اور حقیقت تو یہ ہے تمام کرۂ ارض کو چھٹی کا دودھ یاد دلا گئی تھی۔ اس چھٹی جنگ تو ہندوستان والوں نے اپنے کو بس ـــــ بس بالکل ہی ناکارہ ثابت کر کے رکھ دیا تھا۔ اس دوران میں کئی حق پرست و صاف گو "نونی" انسان پیدا ہوتے رہے اور علی الاعلان کہتے رہے کہ نااہل ہندوستان کو درجۂ نوآبادیات ملا ہوا ہے۔ اور بہت سی بندر بائیں بھی پیدا ہوئیں جو خواہ مخواہ انکو جھٹلاتی رہیں۔ جن کا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ثابت کریں کہ حکومت نہیں بدلی تھی صرف مسلسل جنگوں کی بھرمار سے دنیا کا رنگ بدل گیا تھا خصوصاً ہندوستان کا۔ کپڑا یہاں لنگوٹی تو کجا حسینوں کے رومال کے لئے بھی نہ رہا تھا اور ان کے لگائے ہوئے زخموں کو عشاق بڑی بے بسی سے بغیر پھائے کے کھلا لئے پھرتے تھے۔ ہمہ تن داغ داغ شد ہر شخص روتا تھا لیکن اس مصرع کے دوسرے حصہ کو قطعاً بھول چکا تھا کیونکہ پنبہ کا تخیل تک لوگوں کے دماغ سے مٹ چکا تھا۔ کپڑا ایک تاریخی چیز ہو کر رہ گئی تھی اور اس کے ذکر ستر پوشی، آسودگی بخشی و حسن افزائی کو بڑی حیرت سے سنا جاتا تھا۔

اب کپڑے کا بدل حتی الوسع پیدا کر لیا گیا تھا۔ مثلاً درختوں کے چوڑے چوڑے پتے کام میں لائے جا رہے تھے۔ ڈھاک، ساگوان اور برگد وغیرہ کے پتوں کو بڑے اہتمام کے ساتھ چھال کی باریک سُتلی سے جسم پر لپیٹ لیا جاتا تھا۔ جن اعضا کے کھلے رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اُن پر تو چھوٹے بڑے ہر قسم کے پتے بندھ جاتے تھے لیکن جن اعضاء کے نہ چھپنے سے خطرات کے امکانات تھے اُن پر احتیاط سے بڑے بڑے پتے متعدد باریک سُتلی سے باندھے جاتے تھے۔ زیریں لباس کچھ پاجامے کی

قسم کا ہوتا تھا۔ میں "تھا" اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ سنہ [illegible] تک لباس کی ہیئت میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ جس تو مردوں کا پاجامہ گھٹنے کے اوپر سے شروع ہوتا تھا اُس کو نیکر کہہ لیجئے اور عورتوں کا گھٹنے سے نیچے سے، لیکن ان کا اصرار تھا کہ وہ گھٹنے سے کافی دس انچ پرے سے شروع کیا جائے۔ مدتوں تک اخبارات میں اس مسئلہ پر ردوکد ہوتی رہی معلوم نہیں نتیجہ کیا ہوا عورتوں کے جامے گھٹنے سے اونچے اور بعض نیچے نظر آتے رہے بہرنوع یہ موسم ولولوں سے چلتا رہا۔

دوسرے قسم کے لباس میں کوئی خاص اہتمام نہ تھا ہاں عورتوں کے ملبوس میں اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ پتے اس طرح جماتے جائیں کہ ان کی بدنمائی پر حُسن نسوانی ہر طور غالب رہے۔ غرض اچھا خاصہ لباس تھا ہاں ایک دقت ضرور پیدا ہو گئی تھی پتے جلد مرجھا کر خشک ہو جاتے تھے اور جھڑنے لگتے تھے۔ اس مصیبت کو مٹانے کے لئے یہ تدبیر کی گئی تھی۔ کہ وقتاً وقتاً ہر لباس پر پانی چھڑک دیا جاتا تھا اس سے پانی کے اخراجات تو بڑھ گئے تھے۔ جس کو افسوس حکومت نے ہٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بہرنوع دشواری بہت بڑی حد تک حل ہو گئی تھی۔

تاریخ تمدن اُٹھا کر دیکھ جائیے۔ ماحول کے مطابق بدلتا رہا ہے۔ اس لباس کی وجہ سے مجلسی قوانین و آداب بھی بدل گئے تھے۔ مثلاً فرض کیجئے میرے ہاں جائیے پرچند مہمان آئے تو میں ان کو دیکھ کر پرانی اور دقیانوسی رسم نہیں برتوں گا اُٹھ کر تپاک سے مصافحہ کروں یا معانقہ کے لئے بڑھوں یا عطر ہاتھ میں لے کر تکلف سے اُنکے عطر ملنے کھڑا ہو جاؤں۔ ان تمام ادویات کے بجائے میں ایک گرمائی سے بھری ہوئی بڑی سی بالٹی لوں گا، خوش آمدید میرے منہ سے نکلے گا اور بڑی پھرتی سے پچکاری بھر کر تر بتر ان کے لباسوں کو تر کرنے لگوں گا پہلے لیڈیز کے لباس کو اور ان کے بھی ان پتوں کو جو لطیف مقامات ہمری زبان میں خطرناک جگہ لگے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مردوں کے پتے تر کروں گا۔ پھر ہم جاتے بیٹھیں گے بہت دیر تک باتیں کرتے رہیں گے جب مہمان جانے لگیں گے تو یہ میرا آخری اخلاقی فرض ہو گا کہ ان کو تر کر کے رُخصت کروں۔

جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا لباس میں بھی ترقیاں ہوتی گئیں حتیٰ کہ کچھ عرصہ بعد پتے صرف غُربا کے لباس کے لئے رہ گئے۔ متوسط طبقے کے لئے کپڑے کا ایک بدل پیدا ہو گیا جو باریک اور ملائم تنکوں سے بُنا ہوا تھا۔ اسکا کچھ حصہ تنے کے گھونسلے کی طرح کا ہوتا تھا اور کچھ حصہ چھال کی باریک کشتی کی مدد سے تیار ہوتا تھا۔ اسکے صرف کوٹ پتلون بن سکتے تھے ساڑیاں تیار نہیں ہو سکتی تھیں اسلئے عورتوں کے لئے کیلے کے پتوں کے تاگے نکال کر اُن سے ایک قسم کا کپڑا بنایا گیا۔ ہرچند یہ بہت قیمتی ہوتا تھا مگر تھا بڑا نفیس آپ کہیں گے کہ ریشم کہاں گیا تھا کہاں ایک پچھلی صدی کی بات لے بیٹھے ہیں آپ بھی۔ ریشم کے کیڑوں کی بساط ہی کیا تھی لاکھ انکو حشرات الارض کہہ لیجئے مگر اُن سے کہیں زیادہ تعداد میں ہوائی جہاز اور ہوا باز سپاہیوں کی چھتریاں بن چکی تھیں اور تباہ ہو چکی تھیں۔ اُسکے لئے انسان گھلاتے گھلاتے ختم ہو گئے بیچارے ریشم کے کیڑے بھی۔

جو نو دلی میں میری بیویوں نے جو کمبل کپڑے کی فرمائش کی تھی اس سے مراد وہی کمبل کا سا بنا ہوا کپڑا تھا اور ٹھوس کپڑے کے لئے جو میرے بزرگوں نے کہا تھا اسکا مطلب وہی تنکوں سے بنا ہوا کپڑا تھا چمڑے کے سوٹ میں اپنے لئے بنانا چاہتا تھا جو بے انتہا گراں تھے وجہ یہ تھی کہ اب جانور کم مر رہے تھے اور انسان زیادہ۔ مگر انسان کی کھال بالکل ناکارہ ہوتی ہے یہی کمبخت ایک ایسا جانور ہے کہ جو نہ زندگی میں کسی کے لئے سودمند نہ مرنے کے بعد۔

ان واقعات سے تقریباً ساٹھ سال پہلے جب کسی جسم پر کبھی کبھی کپڑا اس طرح نظر آجاتا تھا جس طرح اس نیک معاش دنیا میں کا دُکا عمر۔ میں ایک دفعہ کلکتہ گیا۔ ابھی میں نے پلیٹ فارم پر قدم ہی رکھا تھا کہ آٹھ دس ننگے قلیوں نے مجھے گھیر لیا اور جلدی سے ایک نے جھپٹ کر میرا کوٹ اُتار لیا۔ بدقسمتی سے میری قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور بنیان نظر آ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر دوسرا قلی آگے بڑھا اور اس نے کہا "اچھا بابو ایک فالتو کپڑا اور ہے تمہارے پاس" یہ کہہ کر اُس نے میری قمیص بھی اُتار لی اب تیسرے نے میری گھیردار دھوتی پر نظر ڈالی میں کپکپا اٹھا۔ قلی نے ہنس کر کہا "اس کے نیچے بھی کچھ ہوگا" یہ کہہ کر ظالم نے میری دھوتی گھسیٹ لی۔ "ارے اس کے نیچے کچھ نہیں ہے" میں نے چیخ کر کہا مگر دھوتی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ شکر ہے میں نے نیچے جانگیا پہن رکھا تھا آخر میں اپنا جانگیا اور بنیان لے کر وہاں سے بھاگا اور اپنے ایک دوست کے مکان میں جا کر پناہ گزیں ہوا۔

تیسرے روز عید تھی۔ میرے دوست نے مجھے ایک قمیص اور پاجامہ دیا اور ہم پندرہ بیس آدمی مل کر عید گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کیونکہ ننگوں نے شہر میں باسیوں پر دھاوا بول رکھا تھا۔ خدا کی پناہ عید گاہ کے باہر اس طرح ننگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے جس طرح محلے کی دیواروں اور چھتوں پر بیشمار چیل کوّے بیٹھے رہتے ہیں۔ پولیس ننگوں کو منتشر کرنے کی کوشش میں لگی ہی تھی کیونکہ وہ خود بھی ننگی تھی اور شہریوں کے ساتھ ساتھ اس کا لباس بھی نوچوں کے کام آگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد نماز شروع ہوئی۔ دفعتہً ننگوں نے نمازیوں پر حملہ بول دیا۔ نمازیوں نے پولیس کے بھروسے پر نماز خوف ادا نہیں کی نتیجہ یہ ہوا کہ بجلی کی طرح ننگوں کی قینچیاں کام کرنے لگیں اور انہوں نے چشم زدن میں نمازیوں کو لباس سے آزاد کرکے راہِ فرار اختیار کی۔ جب ہم نے سلام پھیرا ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ماہر کے سبھی تو نماری بن گئے ہیں اور لباسی باہر بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ مغلوب بےبس ہوگیا تھا کہ نہیں سکتے کہ ننگوں کی اس حرکت سے بڑا خوش ہوا یا ناخوش کیونکہ یہ کمبخت ننگے ایسے بڑے رحیم تھے انہوں نے لوٹے ہوئے لباسوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اور بیشمار دوسرے ننگوں کو ستر پوشی کے لئے دھجیاں دے دیں تھیں۔

دوسرے روز محلے میں ایک موت ہوگئی تھی۔ ننگے میت کا احترام کرتے تھے چنانچہ جنازہ بخیر و عافیت قبرستان تک پہنچ گیا میں بھی ساتھ تھا۔ دفعتہً چند پڑھے لکھے نوجوانوں کی زبان سے میں نے اپنا نام سنا مجھے تو یہاں کوئی جانتا نہ تھا آخر میں حیران حیران ان لوگوں کے پاس گیا اور ان سے بولا "کہیے آپ ارتند کا کیا ذکر کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں جی۔ اُن کی کتاب کوثر کا ذکر ہے جس کے اوراق سے اُس مُردہ کا کفن بنایا گیا ہے"، ایک صاحب نے کہا میں نے اب تک کفن پر غور ہی نہیں کیا تھا کیا دیکھتا ہوں کہ میری تصنیف کوثر کے ایک غلاف کی شکل میں جڑے ہوئے ہیں اور اس غلاف کے اندر مُردہ رکھا ہے۔ اللہ! اگر اس طرح ہماری تصانیف مُردوں کے ساتھ تہ زمین چلی گئیں تو چند ہی روز میں ہمارا تو نام و نشان مٹ جائے گا۔ مگر کیا یہ میری کتاب کا بہترین مصرف نہ تھا۔ اسکو ایک ہزار بے فکر پڑھتے اور اگر وہ اُنکے اخلاق کی ستر پوشی سے قاصر رہ جاتی تو بیکار تھی ایک مُردے کے جسم کو ڈھانک کر وہ اُس کو آخری منزل تک عزت سے لے آئی یہ اس کی انتہائی کامیابی تھی!

بیسٹھ سال بعد ایک دفعہ پھر میرا اتفاق کلکتہ آنے کا ہوا اب زمانہ بدل چکا تھا اور کپڑے کا بدل لوگوں کی ستر پوشی کر رہا تھا۔ لیکن میں اب بھی یہاں آنے سے ڈر رہا تھا، مگر اپنے پرپوتے سگڑ پوتا پوتی کے اصرار پر آنا پڑا اُن لوگوں کا اصرار تھا کہ کلکتہ کے عجائب خانہ میں وہ کپڑے کا لباس دیکھیں گے بالکل اسی طرح جس طرح مصر کی ممی دیکھتے ہیں ویسے میوزیم ہندوستان میں کئی ہیں جن میں کپڑے کا لباس اور کسی عجائب خانہ میں نہ تھا۔

میرے پڑپوتے سگڑ پوتا پوتی نے اس کو بڑے تعجب سے دیکھا اور بڑی دیر تک اس کو سراہتے رہے۔ آگے جا کر انہوں نے ایک کمرے میں سیفٹی ریزر، اُسترے، ہیئر کلپر، پاؤڈر اور بال صفا صابون بھی دیکھے۔ مجھ سے حیرت سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا ہے۔ اس زمانے میں بزرگوں کا احترام کوئی معنی نہیں رکھتا ہے لیکن میں پچھلی صدیوں کا آدمی تھا وہاں سے ہٹ گیا وہیں کے کسی آدمی نے انکو ان اشیا کا مصرف سمجھایا بات یہ ہے کہ برہنگی سے بچنے کے لئے اب بال بڑھائے جا رہے ہیں۔ مرد ڈاڑھیاں عورتیں چوٹیاں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں تمام بال آزاد ہیں اور ڈاڑھی اور چوٹی کے بال تو واقعی اسقدر بڑھ جاتے ہیں کہ اُن سے بآسانی ستر پوشی کر لی جاتی ہے مگر یہ عمل صرف سوتے وقت کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ لباس شب خوابی ہے۔ امرد اور نوجوان دوسرا طریقہ استعمال کرتے ہیں۔

اب تو عمدہ لباس کی ایک آخری آس رہ گئی ہے۔ وہ یہ کہ بہشت میں حُلہ بہشتی ملے گا۔ لیکن وہاں کا موعودہ لباس بھی اگر یہاں کے اعمال پر موقوف ہے تو گئے دونوں جہان سے۔ یہاں بھی ننگے رہے اور وہاں بھی۔ بشرطیکہ وہاں کی حکومت یہاں کی حکومت سے مختلف نہ ہوئی۔ مگر حکومت ——

"انور"

کاٹھیاواڑ میں سے

لفٹننٹ نارائن کی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے اپنے دل میں سوچا: ہوکر کب... مد صورت ہے۔ میری خوشی میں اور بھی اضافہ ہو گیا جب میں نے دیکھا کہ مسز نارائن لفٹننٹ سمتھ کی کسی بات کا جواب نہیں دیتی۔ دال بھات پر گذارا کرنے والے اس مدراسی نے سفر شروع کرنے سے پہلے ضرور اپنی بیوی سے کہا ہوگا کہ گرے، گائے اور سور کھانے والے انسانوں سے بات نہ کرے۔

جام نگر ماچس فیکٹری کا مالک ایک سرے کے کونے میں بیٹھا گجراتی کا اخبار "سندیش" پڑھ رہا۔ میں ایک موٹی مرچی کی طرف دیکھنے لگا۔ بھاونگر ماں نے ماتس نو کھون کھئی گیو۔

لفٹننٹ سمتھ نے میرے بستر کا سہارا لے کر سارے رقبہ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"کمانڈر ہال کو رخصت نہیں مل سکی اب وہ بیچارہ اپنی دلہن کے ساتھ ہنی مون بھی نہیں منا سکے گا!"

جام صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ مسٹر آئر نے جواب دیا "سمتھی، کیا تم کو یقین ہے کہ کمانڈر ہال نے اپنی شادی سے پہلے ہی ہنی مون نہیں منا لیا ہوگا؟ مغرب میں شادی کرنے کے لئے محبت کی جاتی ہے مستقبل میں محبت کرنے کے لئے شادی کی جاتی ہے۔ کمانڈر ہال نے تو یقیناً ڈنر کھانے سے پہلے پڈنگ کھا لی ہوگی۔ اگر مسٹر نارائن کو رخصت نہ ملتی ——"

مسز نارائن کے چہرے کے سامنے ایک کتاب تھی۔

جام نگر ماچس فیکٹری کے مالک کے نزدیک ہماری باتوں کی قیمت گجراتی اخبار "سندیش" کی قیمت ایک آنہ سے بھی کم تھی ——

"دکا سا موں طاقت آپے چھے ——"

جام نگر سے چل کر ۲۸ منٹ کے بعد ٹرین ایک سٹیشن پر ٹھہری۔ لفٹننٹ نارائن نے ٹائم ٹیبل دیکھا — ایبا باڑا — میں نے پوچھا کتنے سٹیشن پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا: یہ پہلا سٹیشن ہے جام نگر سے سات میل۔

یا خدا ان ریاستوں کی چھوٹی لائنوں پر سفر!

لفٹننٹ سمتھ راجکوٹ میں اتر گیا۔ اس کی جگہ ریاست گوندل کے دیوان نے لی۔ نواب گوندل کا دیوان پرسوں شام کو میرے ساتھ جام نگر کلب میں ٹینس کھیلا تھا۔ اور معلوم نہیں کیوں ہار گیا تھا۔ کل رات کو جام صاحب کی بھانجی کی شادی کے موقع پر وہ جام صاحب کے قریب ہی کھڑا تھا۔ جام صاحب نے ہم کو کہا:-

"خوش قسمتی سے میں کسی قدر بیمار ہوں اس لئے آپ کے ساتھ ناچ گانوں اور وسکی کی محفل میں شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن میری جگہ مہاراجہ بیکانیر آپ کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے"

اس کے تھوڑے عرصے بعد محل کے اوپر بچھے ہوئے بجلی کے بلب اس چھوٹی عمر کی بھدا ناچنے والی اور بھدا گانے والی خوبصورت پنجابی رنڈی کے سروں میں گھنگرو بن گئے اور محل ایک گہرے سرخ رنگ کی پھولدار اچکن پہن کر اور نارنجی رنگ کی کلغی والی راجپوتی پگڑی باندھ کر فضا میں ناچنے لگا۔

سامنے سٹیشن پر اسباب اٹھانے والی دو قلی عورتوں میں جھگڑا ہو گیا جوان عورت نے بوڑھی عورت کو دھکا دے کر پلیٹ فارم پر گرا دیا۔ بوڑھی عورت لڑکھڑاتی ہوئی ہمارے کمپارٹمنٹ کے پاس آکر گجراتی میں بولی۔

"دیوان جی، وہ دونی میں سے مجھے کچھ نہیں دیتی۔ وہ کہتی ہے دونی آپ نے صرف اس کو دی ہے اور آپ مجھے جدا پیسے دیں گے!"

"شٹ اپ یو بلڈی ایڈیٹ!"

گاڑی چل پڑی۔

میں مسز نارائن کی خاموشی سے تنگ آ گیا۔ وہ کبھی کبھی اپنے شوہر سے تامل میں باتیں کرتی تھی۔ اور تامل میں بول تو سکتا ہوں لیکن سمجھ نہیں سکتا۔ شاید مسز نارائن کو انگریزی آتی ہی نہ ہو۔

میں نے لفٹننٹ نارائن سے کہا: "ڈک، تمہیں شادی پر ضرور جانا چاہیئے تھا۔ والٹ ڈزنی کا مختلف رنگوں میں نہایت عجیب کارٹون تھا۔ ریاست کے باشندوں نے اپنی بھدی بھدی ٹانگوں کو اور ٹیڑھی ٹانگوں کو دکھانے کے لئے رنگ برنگی تنگ چکنیں

اور چوڑی دار سفید پاجامے پہنے ہوئے تھے۔ اُن کی راجپوتی شان کی پگڑیاں اور سورج جیسی تلواروں کی مخملیں میانیں ——— میانیں بے شک ہیں اُن میں تلواریں نہیں ہیں ——— اعلان کر رہی تھیں کہ گو توندیں بڑھی ہوئی ہیں اور ٹانگیں ٹیڑھی ہیں، لیکن پھر بھی وقت آنے پر تمہیں خنجر کا نشانہ بننا ہے۔ اور راجپوت آگے کو بڑھ جاتے ہیں پیچھے مڑ کر ان پہاڑیوں کی طرف کو بھاگ جاتے ہیں جہاں مہارانا پرتاپ کی شوخ ابھی چھپی ہوئی ہے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا یہ سونے چاندی سے سجے ہوئے موٹے مارے گھوڑوں والی کیوں لئے جاتے ہیں اُس نے کہا۔ کوتل گھوڑے کہلاتے ہیں۔ ان پر سواری نہیں کی جاتی۔ ریاست کی شوبھا ہوتے ہیں۔ خوشی کے موقعوں پر سجا کر باہر نکالے جاتے ہیں میرے پیچھے سے ٹینس کورٹ کے گنبد پھیکنے والے ایک چھوکرے نے ہولے سے آکر کہا صاحب اختتش پنڈال میں مہاراجہ سکا ہر کے دونوں طرف دوسرے مہاراجے بیٹھے تھے۔ اُن کی پگڑیوں پر اس قسم کی کلغیاں لگی ہوتی تھیں جیسی لاہور کے شوقین مزاج تانگے والے اپنے گھوڑوں کے سروں پر لگا دیتے ہیں، اُن کے گلوں میں ایسے موتیوں کے ہار تھے جیسے ایک دفعہ میں نے مصر میں ایک یہودی کے ہاتھ میں دیکھے تھے اور جن کو جھوٹے سمجھ کر میں نے نہیں خریدا تھا ایک ۔پی کی رنڈی گانے لگی ——— ایسے راجہ کو آج میں مبارکبادی دینے آئی ——— پرے ایک صاحب کی رنڈی اُس کو کبھی کبھی حقارت سے دیکھ لیتی تھی۔ مجھے کسی نے آکر کہا وسکی یا وائٹ لیڈی؟ میں نے کہا دونو ———

ریاست گردگیٹری کے دیوان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا معلوم ہوتا ہے آپ اب بھی وائٹ لیڈی کی آغوش میں ہیں"!

مسٹر نارائن کی تجسس آمیز حیرت کتاب کے اوپر سے ظاہر ہو گئی میں نے کہا، "مسٹر نارائن، میں شراب سے بے تحاشا نفرت کرتا ہوں، اِسی لئے جب میں کبھی شراب پیتا ہوں تو بے تحاشا شراب پی کر یہ بھول جانا چاہتا ہوں کہ میں شراب پی رہا ہوں"۔

مسٹر نارائن نے کچھ جواب نہ دیا میں نے اپنا شراب میں ڈوبا فلسفہ اس طرح ضائع جاتا دیکھا تو انتقام میں جام بنگر ماچس کے گجراتی اخبار کی طرف دیکھنے لگا ——— نیم تو کیس سو چکے تھے ———

نوجوان ——— دیوان جی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئے ———

"آپکو ہندوستان سے محبت نہیں؟"

"بالکل نہیں"۔ میں نے کہا۔

"آپکو ایسا کہتے ہوئے شرم آنی چاہیئے"!

"شراب اسی لئے تو پیتا ہوں کہ شرم نزدیک نہ آئے"!

سب نے حقارت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اکیپارٹمنٹ میں خاموشی چھا گئی۔ کاٹھیاواڑ کی کالی زمین پیچھے کی طرف بھاگی جا رہی تھی کپاس کے کھیتوں میں کہیں کہیں بانسوں کے درمیان ٹیلے گجراتی اگر تھے یہی کہتے تھے محمود غزنوی ان لڑاکوں سے ڈر کر سومنات کو لوٹنے کے لئے نہیں آسکے گا۔ چھوٹی لائن پر گاڑی کے پہیئے گا رہے تھے۔ بھاگ او بزدل بھاگ، بھاگ او بزدل بھاگ! کتاب کے اوپر سے مسٹر نارائن کی آنکھیں نظر آئے لگیں کیسی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں ہیں۔

جام صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ مسٹر آتر نے اپنی پہلی کامیابی کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے کہا "ہندوستان کی عظمت ہندوستانی لباس میں ہے انگلستان میں مہاراجے اگر اپنے قومی لباس میں نظر نہ آئیں، تو اُن کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اچکن چوڑی دار پاجامہ اور راجپوتی پگڑی ———"

دیوان گردگیٹری نے دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھی تو فوراً بولے "اور آپ نے پچھلے ہفتے کا اخبار نہیں دیکھا لنڈن نے ہندوستانیوں کی گورکھا آرمی کا شاندار استقبال کیا۔ انگریز عورتوں کو ہندوستانی سپاہیوں کی یونیفارم میں سب سے زیادہ اُن کی پگڑیاں پسند آئیں چند لیڈیوں نے تو سپاہیوں کی پگڑیاں اُتار کر اپنے سروں پر رکھ لیں اور خوش ہو کر کہا دشمن کی گولیاں تو ان پگڑیوں کی تہ میں اس طرح رہ جاتی ہوں گی جس طرح پرانے قلعے کی دیواروں میں توپوں کے گولے۔ چنانچہ ایک سپاہی نے اپنی پگڑی کھولکر اس کی تہوں میں سے چند گولیاں نکال کر ایک خوبصورت لیڈی کو پیش کیں ———"

ڈاکٹر نارائن نے میرے قہقہے کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "دور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہندوستانی تہذیب کو چھوڑ کر ایک ہندوستانی ہندوستانیوں کی نظروں میں بھی گر جاتا ہے۔ اب میرا ہی کیس لیجئے میرے پتاجی میری موجودگی میں کھانا نہیں کھاتے۔ اپنے کپڑے مجھ سے چھونے نہیں دیتے۔ مجھ سے ہمیشہ دور رہ کر بات کرتے ہیں یہ سب کچھ اس لئے کہ میں انگریزی لباس

دیتا ہوں۔ اوپریشن کرتے وقت مریض کے گوشت اور خون کو چھوتا ہوں۔ میرے بتاجی یہ بھی جانتے ہیں کہ میں انڈا، گوشت اور مچھلی بھی کھاتا ہوں۔ اور سگریٹ نہیں پیتا، لیکن پھر بھی وہ مجھے ملکش کہتے ہیں یعنی دوسرے ——"

دودھاون کے سٹیشن پر ایک بوڑھے فقیر نے میرے ڈبے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بابو، اگر بیس تو ایک آنہ آپو، اے بابو بابو —— بابو —— اے بابو ——"

میں نے کہا، "معاف کرو بیٹا!"

اُس نے پھر اصرار کیا، "بے روج تو بھوکا چھوں، سیٹھ"

میں نے کہا "آئس کریم والے —— او آئس کریم والے ——"

شاید مسز نارائن کو انگریزی آتی ہی نہ ہو۔ میں کتاب کی طرف دیکھنے لگا۔ انگریزی ہے یا تامل؟ اگر لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ میں مسز نارائن کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہوں تو بُرا کریں۔ میں تو کتاب کو دیکھ رہا ہوں۔ باہر پلیٹ فارم پر دیہاتی آدمیوں اور عورتوں کا ایک ہجوم تھا۔ عورتوں کے بھاری بھاری لہریے گھیردار سُرخ اور سبز کپڑے ٹخنوں سے لے کر آدھی پنڈلی تک چاندی کے موٹے موٹے مختلف سانولوں کے کڑے اور گھونگٹ آدمیوں کے کولھوں تک میلے لٹھے کے انگرکھے اور چوڑی دار پاجامے اور لاٹھیاں۔ مسز نارائن لعبتِ دلفریب کی توجہ اُن کی طرف کر کے ہنسنے لگی۔ مسز نارائن کے دانت کتنے خوبصورت ہیں!

میں نے سب کو آئس کریم کی ایک ایک پلیٹ دیتے ہوئے کہا "آئیے ہم آئس کریم کھا کر ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کریں۔"

مسز نارائن کے چہرے پر مُسکراہٹ کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے ——
میں کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کے ہر باشندے کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ ہندوستان سے نفرت کرے۔ اگر وہ نفرت کے اس مکروہ جذبے کو پسند نہ کرتا ہو تو اُس کو چاہیئے کہ وہ گرے کی حد تک شراب پیا کرے۔ ہندوستانیوں کی اُن حرکتوں میں سے جو ہم میں نفرت کے جذبات پیدا کرتی ہیں، ایک حرکت یہ ہے کہ وہ ماضی کو بے حد محبت کرتے ہیں۔ مستقبل کے محاذ پر سینہ سپر ہو کر لڑنے کے بجائے ماضی کی خندقوں میں چھپ کر زندگی بسر کرنے کی تمنّا رکھتے ہیں۔ سُنیئے، مغربی تہذیب کی چُھری کے نیچے مشرقی تہذیب کے بکرے کی آخری باتیں باتیں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ مرنے والا بڑبڑا رہا ہے، "میرے سر پہ چوٹی دھاری پاجامہ رہنے دو۔ میرے پاؤں میں پھولدار اچکن پہنا دو۔ دیکھو، دیکھو، میری پگڑی مت اُتارو۔ یہ میری عزت ہے۔ اس کی تہوں میں بارود کی ہزاروں گولیاں چھپی ہوئی ہیں، مشرقی تہذیب مر جائے گی مغربی تہذیب ساری دُنیا پر چھا جائے گی۔ لیکن ہم اس کو مشرقی اور مغربی تہذیب کیوں کہتے ہیں۔ پُرانی اور نئی تہذیب کیوں نہیں کہتے۔ تہذیب مشرق اور مغرب نہیں۔ تہذیب ایک غیر محدود وسعت ہے۔ تہذیب کو مقام کی قید میں ڈال کر ہم اپنی نظر کو تنگ کر لیتے ہیں۔ تنگ نظر ہی ہندوستان کے ساحلوں کو عبور کر کے دوسری دُنیاؤں میں نہیں پہنچ سکتیں۔ تنگ نظری ایک مہلک مرض ہے۔ تنگ نظری کے مریض کو چاہیئے کہ وہ صبح اُٹھ کر مدر انڈیا کی تلاوت کیا کرے اور رات کو سونے سے پہلے بارہ دفعہ کارل مارکس کی "کیپٹل" کا مطالعہ کرے۔

میں نے اپنی عالمانہ تقریر ختم کرنے کے بعد سب سے پہلے مسز نارائن کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر پسندیدگی کی مُسکراہٹ تھی۔ پھر میں دوسروں کی حقارت کی کیا پروا کرتا۔

جام نگر ماچس فیکٹری کا مالک گجراتی اخبار کے آخری صفحے پر تمام اشتہار پڑھ چکنے کے بعد اخبار کو ساتھ لے کر لیٹرین میں چلا گیا۔ اور دروازے کو اپنے پورے زور کے ساتھ بجا کر بند کر لیا۔

مسٹر آئر نے غصّے سے کہا۔ "دیکھئے بہتر ہے کہ آپ اپنا مُنہ بند رکھیں۔ آپ ہم کو لامذہب معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا "مذہب قدیم زمانے کی ایک تحریک تھی۔ انسانی افعال کو حدود میں رکھنے کی ایک ناکام کوشش۔ جہالت کے رفتار سمندر، خوف اور اُمید کے کا عذوں سے بنی ہوئی کشتی، ڈوبتے دلوں کا سہارا، اتنی شکست کا اعتراف، خدا کا وجود تھا لیکن اس بات کو تو ہزاروں ہزاروں صدیاں گذر گئیں ہیں ....

کھڑ ڈر —— کھڑ ڑ —— کھڑ ڑ ڈرر —— گاڑی ویرم گام میں داخل ہو رہی تھی۔

جام نگر ماچس فیکٹری کا مالک جلدی جلدی لیٹرین سے باہر آیا۔ اُس کے گجراتی اخبار کا آدھا آخری صفحہ پھٹا ہوا تھا۔ سینٹرل کسٹم کے انسپکٹر نے اندر آ کر کہا۔ "آپ کے پاس کوئی نئی خریدی ہوئی چیز تو نہیں؟" میں نے کہا، "کوبرا بوٹ پولش کی ایک ڈبیہ ہے۔" اُس نے کہا۔ "ویرم گام میں ہم کو کوبرا بوٹ پولش تو کیا بوٹوں کے تسمے بھی نہیں ملتے۔" میں نے کہا۔ "میں جانتا تھا۔ آپ کے لئے خرید کے لایا ہوں۔" اُس نے نہیں نہیں کرتے ہوئے پولش کی ڈبیا اپنی جیب میں ڈال لی۔

نیچے کے طور پر میری ایمانداری سے مرعوب ہو کر اس نے میرے سوٹ کیسوں کو کھول کر نہیں دیکھا۔ لفٹننٹ نارائن بھٹی جانے والی ٹرین میں برتھوں کی ریزرویشن دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ مسز نارائن نے مجھے انگریزی میں کہا "سب لوگ میری طرف گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کیا سٹیشن پر میں ہی ایک خوبصورت عورت ہوں؟" میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا کوئی مسز نارائن کو گھور گھور کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ مسٹر گانگرا اور دیوان [illegible] نہ معلوم کہاں چلے گئے۔

میں نے کہا "خوبصورت عورت ہونے کی وجہ سے نہیں۔ آپ کو لوگ اس لئے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں کہ آپ [illegible] سے زیادہ خوبصورت عورت ہیں۔" مسز نارائن مسکرا دیں۔ لفٹننٹ نارائن بھاگا ہوا آیا [illegible] پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا "لوئر نمبر ۲۱۶۴ اور [illegible] میں [illegible] پھر [illegible] کیا "مسٹر [illegible] نہیں ہیں" میں نے کہا "[illegible]" مسٹر اور مسز نارائن قلیوں کے سروں پر سامان لدوا کر لوئر نمبر ۲۱۶۴ کی طرف چلے گئے۔

اُلجھن

مایا جال میں پھنس کر دُنیا بھولی بریم کہانی   اُلٹی گنگا بہتی ہے اب اگیانی ہے گیانی

کس سے کہوں میں من کا دھڑکا کس کو سناؤں گیت

کس کو سناؤں گیت سکھی ری کس کو سناؤں گیت

سُندر سپنے دیکھ رہے ہیں سورج چاند اور تارے   مست ہیں اپنی اپنی دُھن میں دھرتی کے متوالے

اپنا اپنا مارگ سب کا، اپنی اپنی ریت

اپنی اپنی ریت سکھی ری کس کو سناؤں گیت

جھیڑوں میں اب کھو کر اپنے من کے ٹوٹے تارے   پیتم بھی تو بھول گئے ہیں مجھ کو جا کر پیارے

اُن کی جیت بھی جیت نہیں ہے میری ہار بھی جیت

میری ہار بھی جیت سکھی ری کس کو سناؤں گیت

کون سُنے اور کس کو سناؤں کچھ نہ کہوں تو ٹھیک   چپکے چپکے ہی سارے دُکھ درد سہوں تو ٹھیک

آگ سُلگتی ہے جو اندر اندر ہی وہ پریت

آگ ہو گویا پریت سکھی ری کس کو سناؤں گیت

کوئل کوکے اور پپیہا پی پی شور مچائے   بھونرا گونجے اور پتنگا چپکے سے مر جائے

چپکے سے مر جانا ہی تو پریت کی سچی ریت

یہ ہے پریت کی ریت سکھی ری کس کو سناؤں گیت

ضیا فتح آبادی

کا مقابلہ کرتے ہیں!

وہ کون روحیں ہیں جو ابدالآباد تک زندہ رہیں گی — ؟

نوجوان، نوجوان!

دیکھو آسمان کا چاند یہ اذان دے رہا ہے — نوجوان، نوجوان!

جو موت سے خوف نہیں کھاتے وہ کون ہیں — ؟ نوجوان، نوجوان!

کون ہیں وہ جو شعور اور عقل کا دامن پکڑتے ہیں — ؟

نوجوان، نوجوان!

لیکن جو بزدل منطقی اور ڈرپوک مفکر ہیں وہی قبل از وقت بیکار بحث و مباحثہ کرتے ہیں — وہ بستر مرگ پر لیٹے سے خوف کھاتے ہیں! اور جو آگے بڑھنا چاہتے ہیں انہیں یہ بزدل پیچھے کھینچ لیتے ہیں —!

لیکن طوفان کی ہولناکیوں میں اور سیلاب کی تباہ کاریوں میں بھی نوجوان برابر آگے ہی بڑھتے جاتے ہیں —!

بیابانوں کی پُر پیچ راہیں ان کے مستحکم ارادے توڑ نہیں سکتیں اور برق و باد کے دلشکن قہقہے ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں لا سکتے!!

ان ہی کے بلند عزائم اس آسمان میں نئے چاند کی تخلیق کریں گے اور سمندر کے پرانے کمزور ساحل توڑ کر نئے ساحل کی تعمیر میں حصہ لیں گے — لیکن عیش پسند اور سرمایہ پرست انسان ان کے مقاصد میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

کمزور انسان سچ بولنے سے کانپتے ہیں، لیکن وہ کون ہیں حقیقت بیان کرنے سے نہیں گھبراتے — سنو ہمدم! وہ ہیں جوان! وہ نوجوان ہیں جن سے خود زندگی نجات چاہتی ہے —!

بہادر کسی کی نہیں سنتا، اس کا تو صرف ایک ہی نعرہ ہے

"چل آگے نوجوان!"

ناممکن جان کر بھی وہ پیش قدمی کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتا کہ آگے عظیم الشان سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو، اسے دل کی آواز پر پورا بھروسہ ہے۔ اور بزدل کے دل و دماغ میں ہمیشہ غیر مستقل خیالات ہنگامہ آفریں بنکر داخل ہوتے ہیں!

نوجوان لامحدود سمندر ہے، اسکی قوت بے پناہ ہے
اُس کے خیالات میں طوفان کی ہولناکیاں ہیں، اسکی جوانی مستقبل جنون سے آزاد ہے۔

اُس کے مقاصد بلند ہیں، وہ ساہرا پر پرواز کرنا چاہتا ہے!

اُس کے دل میں بداعتمادی کی بو نہیں — ایسی بداعتمادی جو دنیا کے گوشے گوشے میں تخریب کی رگیں جھنجھوڑتی ہے!

وہ بار بار یہی کہتا ہے — "میں غیر فانی ہوں"

اُس کے طبعی جذبات میں شام کی تیرگی نہیں چھا سکتی۔

وہ ہتھیلی میں ہمیشہ اپنی جان رکھتا ہے

اور بندوق کی گولی اُس کا دل ہے

اُسے جان کی بازی لگانے میں کوئی خوف نہیں — وہ بے دھڑک آگ میں کود پڑتا ہے! سنو ہمدم! وہ سارے درختوں کی شاخوں کو جلا کر یہ کہتا ہے —

"آؤ میں تمہیں روشنی دونگا، چاند کے دیس میں خطرہ ہے"

اور اسے چھونے کے لئے پہاڑ پر کون چڑھتا ہے — ؟ نوجوان،

نوجوان!

سانپ کی تلاش میں وادیاں کون طے کرتا ہے — ؟ نوجوان،

نوجوان!

صور اسرافیل کون پھونکتا ہے — ؟ نوجوان، نوجوان!

کس کے ہاتھ کی آمد سے طوفان جاگ اٹھتا ہے۔ ؟ نوجوان،

نوجوان!

اس کے آہنی ہونٹ سے یہ آواز نکلتی ہے "میں بجلی ہوں!"

آگ کی سرخ چنگاریوں سے کون برسرپیکار نظر آتا ہے۔ ؟

نوجوان، نوجوان!

نوجوان کی متحد جماعت زلزلے سے مقابلہ کے لئے آگے بڑھتی ہے — اُسے کسی سے خوف نہیں!

آگ کا کھیل اُس کی خوشی ہے،

حرکت اُسکا تماشا ہے!

دنیا اُس کا تماشا دیکھکر کانپ اٹھتی ہے، وقت لرز اٹھتا ہے اور مستقبل کی رگیں سُن ہو جاتی ہیں —!

یہی نوجوان روشنی کا مینار دیکھیں گے جہاں "نیا چاند" رقص کرے گا۔

ان کے پاس صرف سچ کا اشارہ ہے، جسم اور دل کی جنبشیں نہیں۔ نوجوان، نوجوان!!

نوجوان کو راہ دکھانے کے آسمان کی مہریں چھاتی ہیں نئے

چاند کی روشنی پھوٹی ہے! بزدل اسے دیکھ دیکھ کر گھبرا رہے ہیں اور اپنی
عقل کا خسارہ پڑھ رہے ہیں۔
اور موت کے خوف سے یہ چھوٹے چھوٹے ٹیلے سمندروں
اور پربتوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے!
نوجوان مسافروں کی جو راہ نمائی کرتا ہے اُس کے لبوں
سے یہ آواز نکلتی ہے۔
۔۔۔ اپنی اپنی جان کی قربانی پیش کرو تم نوجوان ہو ملک
کے سپاہی!
جنہیں زندگی سے مطلق محبت نہیں، اور جو موت کی بھیانک
شکل سے خوف نہیں کھاتے وہی نوجوان ہیں اور اُن ہی کی راہوں
میں نہ دریا، نہ انسانوں کا گذر ہے!
نوجوان خوف کا دشمن ہے، اور بزدلی کیلئے فولاد ہے
اُس سے موت بھی گھبراتی ہے!
دیکھو ہمدم! نوجوان کی ہر سانس کے اندر تیز دھار تلواریں
پوشیدہ ہیں جو "عروسِ نو" کو پہلی رات میں سجاتی ہیں!
بولو نوجوان، نوجوان!!

پیشین گوئیاں

مظلوم کی آہوں کا اثر ہو کے رہے گا
یہ نظمِ جہاں زیر و زبر ہو کے رہے گا

یہ شعلۂ جاں سوز جہاں سوز بنے گا
اب تک نہ ہوا ہو یہ مگر ہو کے رہے گا

آندھی کی طرح خاک نشیں اُٹھ کے رہینگے
ہر تخت نشیں خاک بسر ہو کے رہے گا

چلتا ہے جو اب حضرتِ انساں کے گلے پر
خنجر یہ کبھی زیبِ کمر ہو کے رہے گا

رہ پھر کے ترے راہ میں آجائینگے گمراہ
مسجود جہاں پھر ترا در ہو کے رہے گا

اسباب وہی پھر ہوں تو اسلام کا غلبہ
اک بار ہوا بارِ دگر ہو کے رہے گا

پھر خانۂ دل میں وہ مکیں ہو کے رہینگے
آباد یہ اُجڑا ہوا گھر ہو کے رہے گا

ہاں، منزلِ جاناں پہ پہنچ کر میں رہونگا
پورا یہ مرا عزمِ سفر ہو کے رہے گا

فضلی نہ پیمبر نہ ولی ہے نہ برہمن
جو اُس نے کہا ہے وہ مگر ہو کے رہیگا

فضل احمد کریم فضلی!

مہندر ناتھ

میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں

اس وقت چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے، مارچ کی رات بھی اس اندھیرے میں دکھائی نہیں دیتی، میرا لحاف اوس کی وجہ سے بھیگ چکا ہے، میں سونا چاہتا ہوں، لیکن نیند نہیں آتی، یہ کمبخت نیند بھی عجب چیز ہے، کبھی آتی ہے اور کبھی نہیں آتی، اکثر میں ذہنی طور پر پریشان رہتا ہوں، اپنے متعلق سوچتا ہوں، مستقبل کے متعلق خیال آرائیاں کرتا ہوں، ماضی کے دھندلکے میں نا امیدی کے سائے تیرتے نظر آتے ہیں، اور حال ایک بے کیف، بے جان سا نقطہ بن کر رہ جاتا ہے، اور اس دھندلکے میں ایک تم ہی ہو جو ایک روشنی کے مینار کی طرح درخشاں نظر آتے ہو، اور کبھی میں تمہارے متعلق سوچتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم سے باتیں کروں، میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں، بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن جب کبھی تم میرے سامنے آتے ہو، تو میں خاموش ہو جاتا ہوں، میں اپنے دل کا حال تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن کہہ نہیں سکتا۔ میں تمہارے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، لیکن زبان گنگ ہو جاتی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔

——— اس وقت تم مجھ سے کافی دور ہو۔ صرف تمہاری نگاہیں مجھے گھور رہی ہیں، جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہیں۔ کہ جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو، مجھے اچھی طرح معلوم ہے! ——— اور کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ واقعی تم ان باتوں سے اچھی طرح واقف ہو! ——— لیکن ہو سکتا ہے کہ تم جان بوجھ کر ان باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہو۔

دراصل بات یہ ہے، کہ میں تمہاری عزت کرتا ہوں، یہ کوئی بڑی بات نہیں ——— خیر اس بات کو جانے دو۔ میں اس دنیا میں اور آدمیوں کی بھی عزت کرتا ہوں۔ نام گنوانے سے کیا فائدہ۔

اور اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں عزت کے علاوہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، اور تم ہنسو گے یہ پڑھ کر، کتنا عامیانہ جذبہ ہے۔

محبت کے جذبے کا اظہار خود ایک کمینہ فعل ہے۔ اس جذبے کو کافی عرصے سے دل میں جگہ دے چکا ہوں، اس کی کیا ضرورت تھی اگر ضرورت نہ ہوتی تو میں اس کا اظہار نہ کرتا ——— تم مسکرا رہے ہو۔

شاید تم مجھے بچہ سمجھتے ہو۔ کہ میں کتنی عامیانہ باتیں کرتا ہوں۔ زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب ہر آدمی عامیانہ باتیں کرتا ہے، ——— کہ میں سگرٹ سلگا سکتا ہوں جب سگرٹ پیتا ہوں، تو ذہن میں ایک عجب تھرتھراہٹ محسوس ہوتی ہے دھواں آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے، اور رات کے اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے، اوس آہستہ آہستہ گر رہی ہے، ٹھنڈی، یخ بستہ اوس رات کے آنسو کتنے ٹھنڈے ہوتے ہیں، کتنے پاک، اور صاف اور میں چھوٹے چھوٹے بالوں کے متعلق سوچتا ہوں کہ مجھے ان چھوٹے چھوٹے بالوں سے بے پناہ محبت ہے، یہی کہ میں تم سے کیوں محبت کرتا ہوں، میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ میں تمہاری کیوں عزت کرتا ہوں ایک عام انسان کے لئے یہ جواب کافی ہے کہ تم مجھ سے بڑے ہو، میرے بڑے بھائی ہو۔ اور کافی روپے کماتے ہو، ——— اور چونکہ میں ایک عام آدمی ہوں، ایک بڑا انسان نہیں، مشہور نہیں، جیب روپیوں سے ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ ہر لمحہ کسی نہ کسی کا دست نگر رہتا ہوں ——— اور اکثر تم سے ہی روپے لیتا ہوں تو ان حالات میں اور کیا کر سکتا ہوں کہ میں اس شخص کی عزت کروں، اس سے محبت کا اظہار کروں۔ اور اس جذبے کو اس لحاظ سے بیان کروں کہ اس شخص کو میری سچائی اور محبت پر پورا بھروسہ ہو جائے ——— میں نے اکثر یہ چاہا ہے کہ میں تم سے کہہ دوں کہ مجھے تم سے انس ہے، پیار ہے، لیکن ہر بار میں نے اپنے آپ کو روکا، اور میں اکثر سوچتا ہوں، کہ محبت کا اظہار تو ہر شخص کر سکتا ہے، اور کرتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں، دراصل انسان کی فطری کمزوری ہے، ہر انسان اپنی کمزوری سے دوسرے شخص کو مرعوب کرنا چاہتا ہے، لیکن میں اس بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہوں کہ یہ جذبہ میرے دل میں کیوں موجزن ہے زندگی میں میں نے آج تک کسی شخص سے محبت نہیں کی، میں محبت کے معاملے میں بہت سنگدل ہوں، میں نے آج تک کسی عورت کو پیار بھرا خط نہیں لکھا کسی عورت سے اظہارِ عشق نہیں کیا۔ اور یہ سچ ہے کہ مجھے اپنی ماں سے اتنی محبت نہیں اپنے باپ سے اتنا پیار نہیں اپنے

چھوٹے پر فائز ہو جاؤں، لیکن بدقسمتی سے میں ہمیشہ بیکار رہا۔ اور تمہیں اس بات کا گلہ رہا، لیکن تم نے مجھ سے شکایت نہ کی، صرف ایک بار تم نے مجھ سے کہا تھا، ہم دونوں سڑک پر اکٹھے جا رہے تھے کیا تم اس شخص سے ملے تھے؟

نہیں ـــــ میں نے جواب دیا،

کیوں۔

میں لوگوں کی خوشامد نہیں کرسکتا، مجھے چاپلوسی سے نفرت ہے۔

اور تم میرا جواب سُنکر خاموش ہو گئے ـــــ چند لمحے گذر گئے، اور تم نے میری طرف دیکھ کر کہا خیر- کوئی بات نہیں، تم کسی کی خوشامد نہ کرو- اب تمہارے لئے مجھے ہی خوشامد کرنی پڑے گی۔

یہ الفاظ سُن کر میں شرمندہ ہو گیا۔ ـــــ وہ فقرہ ابھی تک میرے ذہن میں رینگ رہا ہے۔ ـــــ کیا کروں، چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں، لیکن میں انہیں بُھلا نہیں سکتا ـــــ دراصل میں بڑی باتیں نہیں کرسکتا، مجھ میں اتنی اہلیت ہی نہیں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ ہندوستان کی آزادی پر ایک لمبا چوڑا مضمون لکھوں، میں تو اپنی کمزوریوں کا رونا روتا ہوں، اپنی شکستوں کو دہراتا ہوں، اپنی کمینگی کا احساس لوگوں کو دلاتا ہوں۔ یا کبھی کبھی دوسروں کی کمزوریوں کا چرچا کرتا ہوں، ـــــ تو ہاں، میں تمہاری کمزوری کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، ـــــ اجازت ہے۔ ہنس رہے ہو، مُسکرا رہے ہو۔ شاید تم اپنی کمزوری کو جانتے ہو، اگر میں اس کمزوری کو دوہرا دوں تو کیا ہرج ہے! اس وقت تم مجھ سے بہت دُور ہو، کئی میلوں کا فاصلہ ہے، اسی لئے میں کھری کھری باتیں کہہ سکتا ہوں، بات معمولی ہے، بہت ہی معمولی ـــــ بات کیا ہے کہ تمہیں ایک عورت سے محبت ہے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہے، ہر شخص ایک عورت سے محبت کرتا ہے! اور اگر تم کسی عورت سے محبت کرتے ہو، یہ تو کوئی نئی بات نہیں، اس سے پہلے بھی تم عورتوں سے محبت کر چکے ہو، میں اُن عورتوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، پہچانتا ہوں، میں نے انہیں دیکھا ہے، تمہاری نند اچھی تھی، خوب تھی، جسمانی طور پر وہ خوبصورت تھی اور ذہنی طور پر بھی۔ اور وہ بنگالی لڑکی ـــــ اُس کا جسم ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے متحرک رہا ہے، اور اُس کی آواز جھنکتا ہوا گرتا ہوا کتنی نسائیت تھی، نند خوب تھی، مانا بہت خوب۔

لیکن اب کیا ہوا ـــــ اور یہ نئی لڑکی، عجیب سی لڑکی ہے، میں اس لڑکی کو اچھی طرح جانتا ہوں، میں نے اس سے باتیں کی ہیں، میں اس کے خاندان کے ہر فرد کو جانتا ہوں اور میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ میں ہر عورت کی عزت کرتا ہوں، چاہے وہ کسی کی بیوی ہو، داشتہ ہو، بیوہ ہو، رنڈی ہو، ـــــ میرے دل میں ہر عورت کی عزت ہے، اور عورت بھی تو انسان ہوتی ہے، میں طوائف سے نفرت نہیں کرتا، وہ بھی قابل عزت ہے ـــــ شاید تم یہ سمجھو کہ میرے دل میں اس عورت کے لئے اس لئے جگہ نہیں، کہ وہ بدنام ہو چکی ہے، میں بدنامی سے نہیں ڈرتا، وہ انسان ہی کیا جو بدنام نہ ہو، وہ سمندر ہی کیا جس میں طوفان نہ آئے، میں جانتا ہوں کہ یہ عورت اس سے پہلے کئی مردوں سے معاشقے لڑا چکی ہے، ـــــ تو پھر کیا ہوا ـــــ عورت گِر کر اٹھ سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس لڑکی نے مسرت کے سنہری لمحے تمہیں دیے ہوں، ہو سکتا ہے کہ اس عورت کے دل میں جتنا پیار، محبت، سچائی تھی، تمہارے حوالے کر دیا ـــــ اور تم اس کے پیار اور سچائی سے اتنے مرعوب ہوئے کہ تم نے باقی باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ـــــ کیا اس لڑکی کو خوبصورت کہا جا سکتا ہے ـــــ شاید۔ لیکن خوبصورتی جسمانی تشکیل کا نام ہی نہیں، بدصورت آدمی بھی خوبصورت ہو سکتا ہے، میرا مطلب ہے کہ ذہنی طور پر، یا سیرت کے لحاظ سے ـــــ میں تمہاری جمالیاتی حِس کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا۔ آؤ فرض کریں کہ وہ خوبصورت ہے ـــــ خوبصورت ـــــ واقعی خوبصورت۔ حسین۔ حسین حسین میں جانتا ہوں، تم خوش ہو، بہت خوش ہو، عورت کو حاصل کر کے کون خوش نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے، درست ہے۔ عورت اچھی چیز ہے، میں عورت کی توہین نہیں کر رہا عورت واقعی اچھی چیز ہے، عورت خوبصورت ہوتی ہے نرم ہوتی ہے، لچکدار ہوتی ہے، عورت میں زندگی ہوتی ہے، خوشی ہوتی ہے، عورت میں سورج کی گرمی ہوتی ہے چاند کی ٹھنڈک ہوتی ہے، عورت سرسبز گھاس کی طرح ملائم، ریشم کی طرح نرم ملائم شبنم کی طرح پاک اور صاف عورت عورت۔ عورت۔ گہرا۔ عمیق۔ اندھیرا۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا، اوس آہستہ آہستہ گر رہی ہے۔ اور ناریل کے درخت اس گُپ اندھیرے میں چپ چاپ استادہ ہیں، گرم سانس۔ پھیلتا ہوا۔ اندھیرے میں اور پھیل جاتا ہے، اس کی اور نرم ہو جاتی ہے سورج پگھلنے لگتا ہے، چاند اپنے مرمریں ہونٹوں سے شبنم کو چوستا ہے، اور چاند کی ٹھنڈی برفاب

کریں، ریل کے پہیوں پر ناچتی ہیں ـــــ اور ـ اور ـ سردیک ـ ـ ہیں
ملتی ہیں، ہلتی ہیں، تاریکی ـ تاریکی ـــــ ہم مدہوش تاریکی اگرم اور
مدہم تاریکی ـ انسانی وجود غائب ـ بالکل خلا ـ کچھ بھی نہیں ـ نہیں نہیں ـ
نہیں کچھ بھی نہیں ـ صرف خوشی ـــ خوشی ـ خوشی ـــــ یہ ٹھیک
ہے درست ہے، لیکن کب تک ـ یہی تو پوچھتا ہوں کب تک مجھے
اس عورت سے کوئی بغض نہیں، شکایت نہیں، شکوہ نہیں ـــ
لیکن تم سے ہے، اگر کوئی اور آدمی ہوتا تو میں اسے نظر انداز
کر دیتا، دنیا میں صرف عورت کی محبت ہی نہیں، انسانیت کچھ چیز
ہوتی ہے عورت کی محبت سے انسانیت کا رتبہ بلند ہے، اس لئے
میں نے شکایت کی ـ تم نے سوچا میں جانتا ہوں، سب کچھ جانتا
ہوں، اور میں خاموش ہو گیا ـ اگر سب کچھ جانتے ہوئے انسان اس
قسم کی حرکت کرے تو پھر کس کا قصور ـ اس بار جب میں تمہاری
[illegible] اپنے آپ کو بالکل اکیلا پایا اور ایسا محسوس
ہوا کہ مجھے یہاں نہ آنا چاہئے تھا [illegible]
[illegible] عورت کی محبت میں سرشار
[illegible] وہ محبت [illegible] کے درمیان
دیوار حائل کر دے ـ شکایت صرف اسی بات کی کر رہا ہوں
[illegible] جان پہچان والوں نے بھی، ہمارے دوستوں نے بھی
کی، مگر تم نے پرواہ نہ کی ـ اور مجھے رنج اس بات کا ہے کہ وہ لڑکی
صرف عورت ہے اور [illegible] اور تم صرف مرد ہی نہیں ہو
[illegible] ایک انسان ہو اور ایک انسان سے ـ
[illegible] وہ اپنی زندگی کا محور صرف ایک عورت کو
[illegible] اور تم سے یہ کبھی امید نہ تھی ـــــ ہو سکتا ہے، کہ میں
نہیں اچھی طرح نہ سمجھ سکا ہوں، اور تم اس خطرناک راستے کو
طے کر کے اسی راستے پر کامران ہو جاؤ جس پر پہلے چل رہے
تھے ـــــ کیوں، کیا بات ہے ہنس رہے ہو ـــــ رات اسی طرح
خاموش ہے، سردی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے اور میری آنکھیں
نیند سے چور ہو کر بند ہوتی جا رہی ہیں ـــــ اور ہوا ریل کے
پہیوں کو چومتی ہوئی آہستہ آہستہ کہہ رہی ہے اب سو جاؤ ـــ
سو جاؤ ـــــ سو جاؤ ـــــ

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا
کریں ـ اور اپنا پتہ خوشخط تحریر کریں ـ (منیجر)

تفاوتِ راہ

جاؤں گا ـ جاؤں گا ـ اک روز چلا جاؤں گا،
جم کے رہنا تو مسافر کے مقدر میں نہیں؟
جا بجا فرصتِ نظارہ لئے پھرتی ہے ـــ

رسم ہے اہلِ وطن بچھڑے ہوؤں سے مل کر
(چاہے بے ربط سہی) پوچھ لیا کرتے ہیں
"کہو؟ کب آئے؟ کہاں تھے؟ بھلا کیا کیا دیکھا؟"

اپنے کانوں سے سُنا، آنکھ سے دیکھا میں نے
چاہے اک رسم سہی خاطرِ مہماں ـــــ لیکن
لوگ مہماں کی تواضع تو کیا کرتے ہیں ـ
مجھ کو مدت ہوئی نکلے ہوئے، گھر چھوڑے ہوئے
جا بجا فرصتِ نظارہ نے بھی ساتھ دیا!
شکریہ بندہ نوازی کا کرم فرماؤ!!
اپنے مہماں پہ ذرا اور کرم فرماؤ!!
کاٹ لو میری زباں ـ نوچ لو میری آنکھیں
میرے کانوں میں گرجتی ہوئی چیخیں بھر دو
پھونک دو گلخنِ وحشت میں یہ انبارِ شعور
میرے احساس کی دُنیا میں اندھیرا کر دو
مجھ کو جانا ہے مسافر ہوں ـ چلے جانا ہے
ایک مدت ہوئی ـ نکلے ہوئے گھر چھوڑے ہوئے
رسم ہے اہلِ وطن بچھڑے ہوؤں سے مل کر
(چاہے بے ربط سہی) پوچھ لیا کرتے ہیں
کہو؟ کب آئے؟ کہاں تھے؟ بھلا کیا کیا دیکھا!

سید عصمتی (؟)

مضحک دہلوی

چچا کریلے

چچا کریلے دلّی کی مقتدر ہستیوں میں سے اور اہلِ دل ہونے کی حیثیت سے دلّی والے تھے۔ غدر کے بعد پیدا ہوئے مگر طریقِ معاشرت اخلاق کی پاکیزگی اور اطوار کی ستودگی اس پُر آشوب زمانہ میں بھی ایسی ہی تھی جیسی غدر سے پہلے۔ زندگی کا نصب العین اور واحد مقصد یہ تھا کہ "خوش رہو اور خوش رکھو"۔ خوش رہنے کے ذرائع تو قدرت کی طرف سے کماحقہ میسر تھے ہی مگر خوش رکھنے کے اسباب بھی صبح سے شام تک خود پیدا کیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے تو اُن کی وضع قطع تھی۔ صورت شکل تو خدا نے بنائی تھی مگر قدرت کی بنائی ہوئی شکل کو انہوں نے "خوش رکھو" کے اصول پر خود ہی وضع کیا تھا۔ مثلاً ڈاڑھی جس کے عدم جواز قطع نظر کرکے یہ مان لیا کہ اس کے دو ہی طریقے رائج الوقت ہیں۔ یا رکھی جائے یا مُنڈا دی جائے۔ چچا کو چونکہ "خوش رکھو" کا اصول مدِّ نظر تھا اس لئے کچھ ڈاڑھی منڈائی جاتی تھی اور کچھ رکھی جاتی تھی یعنی قلم سے لے کر جبڑے سے اُنگل دو اُنگل آگے تک اس قدر باریک بنوائی جاتی تھی کہ بال اور کھال میں تفاوت باقی نہ تھا اور مُنڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بعد ٹھوڑی کے اوپر ڈاڑھی "بقدرِ سنت" رکھی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں ڈاڑھی بکری سی بن گئی تھی۔ اسی طرح مونچھیں بھی دو طرح کی ہو سکتی ہیں یا مُنڈی ہوئی یا شرع طریقہ پر رکھی ہوئی۔ مگر چچا کی مونچھوں کی یہ کیفیت تھی کہ ناک کی کنگھی سے پہلے اگر ان مونچھوں کو سیدھا کیا جائے تو اتنی لمبی تھیں کہ اوپر کے ہونٹ سے ٹھوڑی کے نیچے تک آتی تھیں۔ ان مونچھوں کے بالالتزام چھلّے بنا کر دونوں طرف باچھوں سے ذرا اوپر چڑھا لیا جاتا تھا سرے پر پہنچے تھے جو گدّی کے پاس سے موڑ کر گھونگریالے سائے گئے تھے۔ ڈاڑھی مونچھ اور بالوں کی یہ وضع دیکھ کر اکثر منچلے احباب "چڑی تن کے بادشاہ" کی پھبتی کہتے اور ہنستے تو چچا خود بھی ہنستے۔ بعض تھا احباب اکثر کہتے کہ حضرت جی یہ کیا وضع بنائی ہے کہ لوگوں کو خواہ مخواہ اپنے اوپر ہنسواتے ہو تو چچا کمال خندہ پیشانی سے یہ کہتے کہ میاں تم کیا جانو اس مسرت کو جو مجھے دوسروں کو خوش کرنے میں حاصل ہوتی ہے۔ میرے اس فیشن کو

دیکھ کر احباب پھبتیاں برساتے ہیں۔ اپنی طبع موزوں پر خوش ہوتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ میں بھی خوش ہوتا ہوں۔ یہ کچھ کم ملتا ہے؟" چچا ہمیشہ پُرانی وضع کا لباس پہنتے تھے۔ "خوش پوش" تھے۔ نکہت باغ سیدھا سادا اچھال لمبی یعنی "چالیس ہزار" لٹھے کا پاجامہ جاڑے میں آڑا اور چُست گرمی میں سیدھی موری کا۔ باریک ململ کا گول دامن، سلا ہوا اکٹاوُ کا کُرتہ جس کی آستینیں باریک کھر یا سے چُنی ہوئی۔ یہی چولی کا انگرکھا۔ یہ لباس سر سے پاؤں تک سفید نہایت آبدار دھلا ہوا ہر موسم میں پہنا جاتا تھا۔ اخلاق کا یہ حال تھا کہ اپنے ملنے جلنے والوں میں خواہ امیر خواہ غریب سب کے ہاں جاتے تھے اور جس وقت گھر سے نکلتے تھے تو نکہت باغی کی یہ حالت تھی کہ عطر میں ڈوبے ہوئے رہتے تھے جس طرف سے نکل گئے راستہ مہک گیا جس محفل میں پہنچ گئے لوگ درود پڑھنے لگے۔ ایک آدھ دفعہ کسی نے پوچھا بھی کہ "چچا اس عمر میں عطر کا اتنا ذوق ہے کہ ہر وقت ڈوبے رہتے ہو" تو برجستہ جواب دیتے تھے کہ "میاں خوشبو اور عطر کا عمر سے کیا تعلق؟ اگر ہو بھی تو میں عطر اپنے واسطے تھوڑی لگاتا ہوں یہ تو آپ لوگوں کے دماغ کو فرحت پہنچانی مقصود ہے۔ اچھی خوشبو سے روح خوش ہوتی ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم درود ہی پڑھ لو گے"

چچا ورزش اور کسرت کے آخر دم تک شوقین رہے مگر دنبالہ اکّا ہلانے کا بہت ذوق اور ربط تھا۔ ایک من سے پانچ من تک کا "اکّا" ہلاتے تھے۔ دو ڈھائی من کا "سنگ لولا" بھی ہلایا کرتے تھے۔ ورزش ہمیشہ تنہائی میں کرتے تھے اور صبح کی نماز سے قبل اس سے فارغ ہو جاتے تھے۔ آج تک کسی نے اُن کو ورزش کے ٹھاٹھ میں نہیں دیکھا۔ اعضا تمام فولاد کے تھے مگر بدن اکہرا تھا اس لئے چچا نے بنائے لوہے کی سلاخ تھے۔ ایک روز چچا حسبِ معمول کسرت اور ناشتہ سے فارغ ہو کر اپنے دوسرے معمولات میں مشغول تھے۔ شذری اور احمد آ پہنچے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں ورزش کسرت کا ذکر چلا۔ شذری چونکہ چچا کی ذات کے نئے نقاد تھے مگر نہ کہ لوگوں کی طرف دیکھ کر بولے

دنیا میں ایسے بھی کسرت کے شوقین ہیں جو کرنے کرانے کچھ نہیں مگر صرف لوگوں پر دھونس جمانے کے لئے اور کچھ نہیں تو آلات ورزش اکٹھے رکھتے ہیں۔ چاہے اُن کو کبھی چھوا نہ ہو، لوگوں پر رُعب دیں گے"
احمد نے پورا تائید کی "ہاں ٹھیک ہے چچی کو دیکھئے خواہ مخواہ مگدروں کے قبلہ گاہ کو چھوڑے ہیں"۔ "نہیں میاں خواہ مخواہ نہیں ان سے کچھ کام بھی لیا جاتا ہے اور ان کو چھوا بھی جاتا ہے"۔ چچا نے کہا
تندری۔ "اچھا بھلا دو، ایک ہاتھ کسی ... دکھا دیجئے"
چچی "میاں تمہاری بھی وہی کہاوت ہے کہ دوڑ نہ ملا کس ٹیڑھی چیلا"
احمد "اس وقت اور ملا سے کہ ساٹھ سے ستر اگر ... تو دکھاؤ"
چچا "میاں ہر ایک کے سارے کام وقت پر ہوتے ہیں جیسا کہ اس کام کا بھی وقت مقرر ہے بات یہ کہ چکا ہوں اس وقت اس کا موقعہ نہیں ہے"
تندری اور احمد کے اصرار نے آخر چچی کو مجبور کر دیا کہ وہ خوش دلی کی پالیسی پر عمل کریں ہی کریں۔ الا اللہ کہہ کے کھڑے ہوئے اور دو مگدر اُٹھا کر سنبھال کر بولے "اچھا میاں لو تمہاری خوشی سے کچھ تکلف ہو جائے گی تو ہو جائے تم تو خوش ہو جاؤ گے"

چچا نے قاعدے سے دو مگدر کو کھوا دے کر اوپر ... اور ہاتھ آسانی سے اُلٹے سیدھے ملے ہیں ہاتھ ہلا کر اُنے کو ٹھیک رکھ دیا۔ چچی جس وقت اکا بار ہے تھے ان کی مہارت اور مشق قابل دید تھی۔ اپنے وزن سے زیادہ وزن کو اس آسانی سے اُٹھانا اور ہلانا حد درجہ کمال تھا۔ اگر ہاتھ بہک جاتا تو ... سے چھوٹ جاتا چچا کے لگتا یا کسی اور کے جا لگتا تو بڑی پسلی سرمہ ہو جاتی۔ چچا نے اس وقت اُن دونوں صاحبزادوں کی خوشی تو پوری کر دی مگر خود تکلف اُٹھائے بغیر نہ رہ سکے سٹھیا گئے تھے، ظاہر ہے کہ کسرت کا اثر تھکے ہوئے اعصاب پر ... اس سے چچی دو تین روز تک اور درد میں مبتلا رہے۔

چچا ہر موسم میں ہر ایک پھل پھلار کا لوردوز ٹھاٹھ سے کیا کرتے تھے سب سے پہلے تو موسم کا پھل عمدہ سے عمدہ خود تلاش کر کے لاتے اور نیاز دے کر آس پاس کی مسجدوں میں بھیجتے، دوستوں عزیزوں کو خوب کھلاتے، اپنے بعد دوست احباب کی تواضع خوب دل کھول کر کی جاتی تھی۔ خربوزہ اور تربوز فالسے پر اُٹھاتے۔ آم قطب جا کر کھائے جاتے۔ چچا کے زمانہ میں قطب کا سفر معمولی سفر نہیں تھا اور اچھا خاصا روپیہ صرف سواری ہی میں خرچ ہوتا تھا مگر چچا کے نزدیک بہت معمولی بات تھی۔ وہ ان خاص خاص موقعوں پر تو سیر ہوا ہی کرتی تھی مگر یوں بیٹھے بٹھائے بھی اگر کسی دوست نے کہہ دیا کہ قطب کے پراٹھے کھائے بہت دن ہو گئے۔ تو چچا فوراً جواب دیتے کہ میاں یہ کون سی بڑی نعمت ہے مگر قطب کے پراٹھے تو قطب ہی میں کھانے کا مزا ہے۔ لیجئے صرف پراٹھے کھانے قطب لے جایا جا رہا ہے ... کی طرح پھلک رہا ہے۔ یہی نہیں کہ قطب پہنچ کر پراٹھوں کا پکوانا اور پراٹھوں کے متعلق تمام لوازمات خود بنفس نفیس بہم پہنچانے سامنے بیٹھ کر پراٹھے پکوانے خود چاہے دو نوالے ہی کھائیں مگر دوست احباب کو کھلا کھلا کر خوش ہولے۔

چچا بالکل جیجی ہی نہیں ہے۔ پُرانے چاول اچھے خاصے عمر یافتہ جہاں دیدہ جہاں گشت مگر پہلو میں ایسا موم دل رکھتے کہ جس کسی نے اُلٹی سیدھی گپ اڑا دی سفید جھوٹ بولا۔ محض اس وجہ سے کہ چچا کو بنائے تو چچا کا فولادی کردار اس جھوٹ کو بھی مسلمہ حقیقت ہی سمجھ لیتا تھا۔ کیوں؟ محض جھوٹ بولنے والے کا دل خوش کرنا اور اس کی دلداری۔ ع؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است

ایک روز دو چار نوجوان لڑکے بیٹھے ہوئے چچا کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک دم سے گلی میں سے کڑاکے کی آواز آئی "کلکتہ سے آیا ہے گولا بارہ کروڑ کا گولا"۔ تندری نے چچی کو بنانا چاہا احمد اور تندری میں اشارے ہوئے۔ تندری نے ایک دم سے کہا "مار ڈالا"۔
احمد "خیریت ہے"
تندری "ارے میاں کیا سنا نہیں اخبار والا کیا کہتا گیا ہے۔ کلکتہ پر ... گولا خدا دلّی کی خیر رکھے"
چچا ان دونوں کو گھبرایا ہوا دیکھ کر خود بھی گھبرا گئے بلبلا کر اُٹھ بیٹھے اور بولے "کیا بات ہے۔ اللّٰہم احفظنا۔ کیسا گولا کہاں ہے اخبار والا ... اخبار لاؤ پڑھو دیکھو کیا بات ہے۔ خدا جلدی غارت کرے اس لڑائی کو"

شنذری اور احمد دونوں باہر بھاگے۔ دروازے سے نکلتے ہی قہقہہ لگا یا "کیا بنا یا ہے بڈھے کو۔ کیا مقصد تھا قسمت کا ایسے آدمی کو دنیا میں بھیجنے کا۔ کھاؤ کھلاؤ اور زمین کا بوجھ بنے رہو" وغیرہ وغیرہ قسم کے جملے کہتے ہوئے واپس آئے تو باوجود کوشش کے تبسم چھپا سکے۔ چچا مسکرا کر بولے "خیریت تو ہے کیا ہوا۔ کچھ تو بتاؤ"

"ہوتا کیا وہ کمبخت چلا ہی گیا اخبار والا" شنذری نے کہا۔

چچا نے کہا "میاں لاحول بھیجو اس واقعہ پر وہ تو اخبار والا اب ناریل بیچتا ہے اس محلہ میں آج سے نہیں برسوں سے سودا لے کر آتا ہے کلکتہ سے ناریل منگاتا ہے اور گلی گلی یہی آواز لگا کر بیچتا پھرتا ہے تم نے کیا بھلا فکر کیا۔ تو دیکھو یہ بادام کا فالودہ کھاؤ طبیعت کو فرحت بھی دیتا ہے اور قوت بھی"

شنذری نے خود کھا کر اُلٹی چپت پڑی تو کھسیانے ہو کر بولے "اچھا چچا پہلے تو بدحواس ہو گئے پیٹ پکڑنے لگے اب یہ باتیں"

چچا نے نہایت ملائم لہجے میں کہا "میاں تم پہلے گھبرائے پھر میرا گھبرانا مقدم تھا۔ بات کچھ بھی نہیں اگر تمہارا گھبرانا میرے حال کے لیے تھا تو میں بن گیا تم خوش ہو گئے۔ چھوڑو اس قصے کو لو فالودہ کھاؤ"

غدر کے بعد کی زبان میں چچا کو کمیونسٹ کہو یا جو جی چاہے مگر اپنی کرداری حیثیت سے چچا مرد شریف تھے لوگوں کے شدت سے حامی اور بہی خواہ تھے۔ اُن کے پاس پڑوس میں جتنے مزدور پیشہ رہتے تھے اُن کی خدمت کے لیے چچا ہمیشہ تیار اور آمادہ رہتے ایک طرف جہاں شنذری اور احمد وغیرہ جیسے مفت خوروں اور خود پسندوں کی خوشی پوری کرنا اپنا فرض عین سمجھتے تھے، وہاں ایک مزدور کو سرمایہ دار کی غلامی اور چنگل سے چھڑانا ان کا عین ایمان تھا۔ خود اپنے نوکروں کے ساتھ ان کا سلوک بہت منصفانہ رہتا تھا۔ پیسہ بہت انصاف اور آزادی سے دیتے تھے۔ ان کا اصول تھا جتنے دام اتنا کام۔ جبر واستبداد یا بونس وغیرہ اُن کے ہاں نہیں تھا وہ چاہتے تھے کہ جتنے کارخانہ دار اور سرمایہ دار ہیں۔ پیسے کے کام کا انصاف سے پیسہ دیں نہیں کہ کام تو لیں ڈیڑھ پیسے کا اور مزدوری دیں ایک پیسہ۔ چچا کے پڑوس میں زردوزی کا ایک بڑا کارخانہ تھا جس میں قریباً سو دو سو کاریگر کام کرتے تھے محلہ والوں میں سے ایک نوجوان کاریگر بھی جو اپنے کام میں بہت ہوشیار تھا اسی کارخانہ میں کام کرتا تھا۔ کارخانہ دار نے جب دیکھا کہ کاریگر ہوشیار ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادہ مزدوری پر دوسرے کارخانہ میں چلا جائے۔ لاؤ اس کو پھانسو۔ کارخانہ داری کی ہیبت اور غیرت انصاف اور مہربانی کے واسطہ سے برگشتہ ہی رہتی ہے۔ تو اس کو نصیب نہ ہوا کہ کاریگر غریب کے ساتھ انصاف اور رواداری کا برتاؤ کرے اُس کے پیسے بڑھا دے۔ وہ کاریگر جس کی دیدہ ریزی سے اُس نے فرمائشی کام لیا ہوا کہ ایک کے دو کماتے اس کی مزدوری میں اضافہ کر دے بلکہ اُس نے اُس کاریگر کو پھنسانے کا دوسرا ذریعہ نکالا کہ وقتاً فوقتاً اس کی ضرورتوں کے لئے ہاتھ آزادی سے پیشگی رقمیں دیں اور اس غریب کو اپنے کارخانہ کا باقی دار بنا [illegible] کارخانوں میں اس کا رواج ہے کہ جب کوئی کاریگر [illegible] ہو اس کی جانچ کی جاتی ہے کہ وہ کسی دوسرے کارخانہ کا باقی دار نہ ہو۔ [illegible] چچا سے اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی مگر انھوں نے اس کو ہمیشہ خستہ حال ہی دیکھا۔ ایک روز چچا نے خود ٹوک کر پوچھا "ارے میاں کلو یہ کیا قصہ ہے کارخانہ میں سب سے زیادہ ہوشیار کاریگر ہو پھر بھی ایسے خستہ حال رہتے ہو آخر تنخواہ زیادہ پاتے ہو گے کیا اور رنگوں میں پڑ گئے"

کلو "اجی حضرت کس کے رنگ یہاں صبح شام دو روٹی کا بھرنا ہی دوبھر ہے"

چچا "کیوں کیا بات ہے؟"

کلو "حضرت جی دوسرے کارخانوں میں دگنی اور ڈیوڑھی تنخواہ پر جا سکتا ہوں مگر "

چچا "مگر کیا"

کلو "خدا غارت کرے ان کارخانہ داروں کو اور ان کی باقیوں کو۔ میرے پاؤں میں تو حضرت ایسی بیڑی پڑی ہے کہ جیتے جی نہیں نکل سکتی میں اس کارخانہ دار کا باقی دار ہوں باقی دار"

چچا "تو پھر کیا بات ہے؟ ذرا سمجھا کر کہو"

کلو "حضرت جی بات یہ ہے کہ کارخانہ داروں نے اچھے اچھے کاریگروں کو باقیوں میں پھنسا رکھا ہے۔ میں بھی اسی کا شکار ہوں ہفتے میں مجھے سولہ روپے ملنے چاہئیں اس میں سے آٹھ روپے کارخانہ دار باقی میں کاٹ لیتا ہے اور آٹھ میرے ہاتھ دھرتا ہے اس طرح سے دو روپیہ روز کے مزدور کا ایک ہی رہ گیا۔ لڑکیا کی شادی میں تین سو روپیہ لیا۔ جب سے کٹتے کٹتے بھگتان کا موقعہ آیا

و کارخانہ دار کے بھاگ سے دوسرا کارخانہ کی مسلمانی کا ہوگیا تو والی سرچڑھ گئی کہ بچے کو گھوڑی چڑھایا جائے پھر دو سو ڈھائی سو باقی ہو گئی جو اب کٹ رہی ہے۔ جب اس کا حساب ختم ہوگا پھر سا ہی کوئی کاروبار ہو جائیگا۔ مقصد یہ ہے کہ جو تو ڑی بہت باقی بچے بیٹے جو ڑی تھی کچھ دھندا کھڑا ہو جاتا۔ غرض ساری عمر کا ٹنٹا ہے جو تم اس میں سے آدھ پاؤ حصہ بھی یہاں بیٹھ کر ہی ہے آج میں اس کم بخت باقی سے کیا حاصل ہوا، دھا روپے روز کی دوسری جگہ رکھی ہے۔"

"اچھا اب سمجھا" چچا نے کہا "مطلب یہ ہے کہ خدا کوئی سامان پیدا کر دے اور یہ باقی چُک جائے تو پھر سے دن پھریں ہی پھریں۔ تم آج سے مجھے جیتے جی باپ سمجھو"

چچا نے میاں کلو اتنا سا روپیہ ہوگا جو باقی ہے اور جب یہ ادا ہو جائے تو کارخانہ دار کوئی اور بیچ تو نہ لگائے گا؟"

کلو: "جی کوئی ڈیڑھ سو باقی ہیں بیچ لی بات نہ رہے کہ وسکی ابھی بیماری ہے ردیے پاؤں میں ہوں تو گر کر سے وہ منہ پر ماروں اور کمٹے کھرا حساب صاف کر یہ چاوہ جاؤں"

چچا: "تو میاں کلو خدا پر بھروسہ کرو۔ کل کسی وقت آؤ سب ٹھیک ہو گی"

چچا نے جیب خاص کلو کی باقی چکا دی اور دوسرے کارخانہ میں روپیہ روز پر لگوا دیا۔ کلو باقی داری کی بیڑیوں سے آزاد ہو کر اچھی سے اچھی جگہ پر ہی جاتا رہا اور باقی داری کی لعنت دور ہو جانے سے اچھی طرح کماتا کھاتا رہا۔ چچا کا روپیہ بھی چکا اور کلو کی مالی حالت بھی درست ہو گئی۔ چار پیسے جمع بھی ہو گئے۔

چچا ہر ایک قسم کا شکار کرتے تھے مگر بندوق سے احتراز تھا۔ معلوم نہیں چچا کا خیال تھا کہ یہ چیز تو لڑائی کے لئے ایجاد ہوئی ہے اسے شکار سے کیا واسطہ۔ ساری لذت اور لطف دوڑ دھوپ اور تاک گھات سب برباد ہوتی ہے۔ یہ بھی کوئی شکار ہے رجا اور سے آیا آپ نے مال سیدھی کی مار بیا۔ سب شکاروں میں مچھلی کے شکار کو زیادہ بے ضرر اور پسندیدہ سمجھتے تھے کسی زمانہ میں چچا کا گھر زندہ چڑیا گھر تھا۔ شاہین باز، ترمتی بہری لگڑ شکرا اور الو تک شکار پر سدھائے ہوئے موجود تھے حرہت ہریل، تلیر، تیتر، بھٹ تیتر کا شکار ہوتا تھا۔ انہیں شکاری پرندوں سے

چچا نے کسی زمانے میں مرغابی اور کلنگ تک مارے ہیں۔ ایک جوڑی تازی کتوں کی بھی موجود تھی جو خرگوش، لومڑی، چکارا وغیرہ کے شکار میں برتی تھی۔ مگر بے انتہا اخراجات کے بڑھ جانے سے رفتہ رفتہ یہ سب جانور غائب ہو گئے اور بچائے شوقین مزاجوں کے ہاتھ فروخت کر دیئے گئے یا زندہ چھوڑ دیئے گئے۔ فی الحال مچھلی کے شکار کا سب لوازمہ موجود تھا۔ شست، چرخی، چیڑ، ولایتی اور خانہ ساز ہر قسم کا کافی سٹاک میں رہتے تھے۔ چچا نے اس شکار میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ وہ مچھلی کبھی کیچوے یا روٹی سے نہیں پکڑتے تھے بلکہ ولایتی اور خانہ ساز چاروں سے پکڑتے اور خوب پکڑتے تھے ان کے ہاتھ پر مچھلی خوب چڑھتی تھی، اور کانٹے ڈور سے بڑی بڑی مچھلیاں آسانی سے پھنساتے تھے۔

مچھلی دوست احباب میں محلے والوں میں خوب تقسیم ہوتی تھی۔ ایک دفعہ رمضان شریف میں کچھ دوست احباب کے اصرار سے کچھ گھر والی کے اصرار سے مچھلی پکڑنے گئے دو چار دوست احباب ساتھ عصر کے بعد سے ڈور ڈال ڈال کر بیٹھے۔ ان سے کچھ دور فاصلے پر ایک غریب سے پرانے کپڑے پہنے دو ایک مسافر ڈلے بیٹھا تھا مغرب سے پہلے پہلے چچا نے چھوٹی بڑی کوئی بیس سیر مچھلی مار لی جب چلنے لگے تو وہی غریب آدمی بھی اٹھا اور چچا کے پاس آکر للچائی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ چچا نے بھی بھی سمجھا کہ چندہ قسم کی مچھلیاں مار لیں۔ ادھر چچا کو سلام کر کے چپکا کھڑا ہو گیا۔ بھلا چچا سے کب رہا جاتا پوچھا کیوں میاں تم کون ہو کچھ مجھ سے کام ہے؟ وہ بولا حضور مجھے حمّی کہتے ہیں تالے بانے کا کام کرتا ہوں اب کچھ زمانے سے نگاہ موٹی پڑ گئی سوت نہیں جچتا اب بال بچوں کا پیٹ پالنے کا طریقہ یہ ہے کہ دن بھر تیری میری مزدوری کرتا ہوں۔ گھڑی دو گھڑی یہاں آن بیٹھتا ہوں کبھی کم کبھی زیادہ مچھلی مل جاتی ہے اس کو بھی بیچ لیتا ہوں۔ اللہ میاں دو وقت کھر ہی دیتے ہیں آج کا موقعہ دیکھیے میری لڑکی کا روزہ ہے مزدوری کچھ لگی نہیں۔ سویرے سے آن بیٹھا تھا کہ شاید کچھ زیادہ ہاتھ آجائے تو آج روزے کا بھی کام ہو پیسہ دو پیسہ کی افطاری مسجد میں بھیج جائے گی اور سب بچے سالن روٹی بھی کھا لیں گے۔ تقدیر کی بات ہے آج وہ بھی گیا"

چچا کو اتنی داستان سننے کی کہاں تاب ساری مچھلی اٹھا کر اس کے حوالے کی اور جیب سے پانچ روپے بھی اس کے ہاتھ

سیج گاؤں کی قلوپطرہ

محمود ہاشمی

نکایک کھولی ہوئی باتوں سے جیسے ایک انگڑائی لی سیج
کی مختصر سی بستی میں ہلچل کے سے آثار پیدا ہو گئے۔ اور سب کی نگاہیں
خود بخود کھڑے سے نیچے کے پرائمری اسکول اور اسکول کے پڑوس
میں بسنے والے گھر وندے کے گرد گھومنے لگیں۔ بستی کے بڑے
بوڑھوں کی سرگوشیاں گہری ہو گئیں اور نوجوانوں کی مسکراہٹیں
پُراسرار۔ مدرسے کے نوجوان ماسٹر کا سر جیسے کسی بوجھل اسرار
سے جھک گیا۔ اس کی بیتابی بے کلی سی سوچ کی لہریں بڑھنے لگیں
اور مدرسے کے پڑوس میں رہنے والی "قلوپطرہ" اپنے گھر وندے
میں یوں دبک گئی جیسے سرمائی ہوائیں دفعتاً کسی برف باری
کا پیغام لے آئی ہوں اور گھر سے نکلنے کا موسم پل کی پل میں
ختم ہو گیا ہو۔

مراد واپس آ رہا تھا، گاؤں کا سب سے کڑیل جوان اور
سیج کی قلوپطرہ کا اصلی وارث مراد پورے دو سال گھومتے
اور اپنی رحمت کے ساتھ نہ جانے کہاں کہاں کے چکر کاٹنے
کے بعد واپس آ رہا تھا۔

سیج کے نوجوان کہنے لگے "اب دیکھیں گے اب اس چھلے
کی باری ماسٹر جی نکال باہر کرنے والا آ گیا!"

اور سیج کے بوڑھے اپنی دوہری کمروں پر ایک عمر کا
بوجھ اٹھائے کہتے تھے "دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو
کے رہتا ہے اسی دنیا میں ہو کے رہتا ہے۔"

اور سیج کی کنواریاں اپنی ہرن جیسی حیران آنکھوں
کو مٹکاتے ہوئے ایک دوسری سے کہتیں "اب کیا ہو گا۔ ہیں اب
کیا ہو گا کیا نوری کے بُرے دن آ گئے!"

اور نوری ــــ سیج گاؤں کی قلوپطرہ اپنے اُن سب بچوں
کو باری باری دیکھتی۔ جو مراد کے سامنے ہی اس گھر کی رونق سے
تھے اور اس کے بعد آج سے دس مہینے پہلے آئے ہوئے "نو وارد"
کو اپنی چھاتی سے چمٹا کر سوچتی۔ "اے اللہ اب تو ہی بچا سکتا ہے تو
بچا لے مراد کے فولادی پنجے سے ورنہ نجات مشکل ہے یہ بھی
کی جان تیری ہی دین ہے۔ جب دوسرے بچوں کو اپنا سمجھا تو کیا
اسی کی طرف سے نگاہیں پھیر لیتی؟ کیا اسے کنویں میں پھینک دیتی؟
اس کا گلا گھونٹ دیتی؟ ــــ"

البتہ کبھی کبھی ــ کبھی کسی شام کے دھندلکے میں جب وہ
اپنے گھر کے کسی نہاں گوشے میں گلی کی اوٹ میں یا کسی درخت
کی گھنی اور رات کے اندھیرے میں خلط ملط ہوتی ہوئی چھاؤں
میں اپنے پڑوسی نوجوان ماسٹر سے ملتی اور وہ اس سے کہتا
"پگلی تو ناحق اتنا ہلکان ہوتی ہے ... کاہے کو ہے۔ میں مر تو نہیں
گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ وہ تجھے گھر سے باہر کر دیگا۔
بس اتنی سی بات پر اتنی لاچار ہو رہی ہے" تو اسے ایک تسلی
سی مل جاتی۔ اس کا سر جو کچھ عرصے سے ماسٹر کو سامنے پا کر
اسی طرح گرنے کو آمادہ ہو جاتا تھا چپ چاپ ایک گرنے کے سے
انداز میں ماسٹر کے کندھوں سے جا لگتا اور پھر بسیط دھندلکے اور
طویل گہرائیاں ــــ اور وہ سب کچھ بھول جاتی سب کچھ۔ وہ اس
سے یہ پوچھنا بھی بھول جاتی۔ کہ "اے میرے راکھا تو کہتا تو ہے پر
کیا کرے گا بھی؟" اور یہ کہنا بھی بھول جاتی کہ مجھے اس کا اتنا فکر
نہیں جس نے یہ سارا بکھیڑا شروع کیا ہے بلکہ میں اس سے زیادہ
اس کے دوسرے بھائیوں بہنوں کے غم میں مری جا رہی ہوں۔ اگر
مراد نے لوگوں کی باتیں سن لیں دو سال اور دس مہینے کے ہیر
پھیر کی تہ تک پہنچ گیا۔ اور اس کے گول گول چہرے اور تمہاری
طرح کی اس نکیلی سی ناک کی اصل پہچان گیا تو میں تو خیر یہاں سے
نکالی ہی جاؤں گی۔ مگر ان دوسرے بچوں کا کیا بنے گا۔ میں آخر
اُن کی بھی تو ماں ہوں"

مگر دل کی دل ہی میں رہی اور ہونی کا دن آ گیا۔ سیج
کے رہنے والوں کی موہوم سوچیں اور مبہم سے اندازے گویا
اپنے اصلی روپ میں ڈھلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اور ان کی نگاہیں
اسے گاؤں کے اُن نقطوں پر جم گئیں جنہیں متواری رہنا تھا اور
مدتوں متواری رہے بھی تھے مراد کے ہوتے ہوئے بھی اور مراد
کے جانے کے بعد بھی۔ صرف فرق یہ پڑا تھا کہ پہلے یہ خط مراد اور
نوری کے سہارے چلتے تھے۔ اور اب کچھ عرصے مراد کی جگہ ماسٹر نے

بھی تھی اور بس ـــــ مگر اب یہ متوازی خط مراد کے آنے سے مثلث سی بننے لگے تھے۔ کہاں سیدھی سیدھی راہیں اور کہاں یہ ٹیڑھے ترچھے انداز۔ ماسٹر کیسے کر پہلے سے اس مثلث کو بننے سے پہلے ہی ہٹا سکتا تھا۔ مگر اس راہ کا روڑا ہٹائے نہ ہٹتا تھا۔ سیچ کی قلوپطرہ کی گود میں پچھلے دس مہینوں سے اچھلنے والا ایک گول مٹول سا کھلونا سب کچھ مایاں کرنے پر جیسے تُلا ہوا تھا۔

لوگ کہتے تھے۔ اب گاؤں میں ایک طوفان آئے گا جو سب کچھ بھسم کر دے گا۔ سیچ کی قلوپطرہ کا انجام بھی مصر کی قلوپطرہ کا سا ہوگا۔ وہ کہتے تھے۔ اب ایک آندھی چلے گی۔ جس کی رو میں نہ علم کی روشنی پہنچانے والا مدرسہ رہے گا اور نہ ہی اس مدرسے کا چراغ وہ ماسٹر سب کچھ گل ہو جائے گا۔ وہ کہتے تھے کہ مراد کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں بہت اچھی طرح، وہ اُن کے سامنے پیدا ہوا تھا، پلا تھا اور پھر جوان ہو کر پھولوں کی سی وہ دُلہن لایا تھا جو بعد میں سیچ کی قلوپطرہ ہی بنی بھلا اُن سے بہتر مراد کو کون جان سکتا تھا؟ انہوں نے مراد کے فولادی بازو بھی دیکھے تھے اور اس کے لمبے لمبے بال اور ایک انوکھی چمک کی حامل آنکھوں کے درمیان پڑنے والی ان گنت تیوریاں بھی۔ اس کی "قلوپطرہ" نے اگر اُن فولادی بازوؤں کو اپنے گرد پا کر سکون اور راحت کی لہریں سمیٹی تھیں تو اُن تیوریوں کو دیکھ کر اپنے خون کو منجمد ہوتے بھی محسوس کیا تھا۔ اور تو اور مراد کے ایسے خون کی پیداوار۔ اس کے اپنے بچے بھی مراد کے خون کی اُس طوفانی گردش سے پورے طور پر واقف تھے جو اپنے بہاؤ کے دور میں نہ چیونٹی کو دیکھنے کی عادی تھی اور نہ ہاتھی کو۔ رجمنٹ میں جانے سے پہلے گاؤں میں گھومنے کے بعد جب بھی وہ اپنے گھر کی دہلیز پر قدم دھرتا تھا تو جیسے سب کو سانپ سا سونگھ جاتا بچے اپنے کھیل بھول جاتے۔ باتیں بھول جاتے اور وہ گھر کے کسی کونے میں چُپ چاپ دبک جاتے تاکہ مراد کی نگاہوں سے اوجھل رہیں ـــــ غصیل سورما۔ غصیل شوہر۔ اور غصیل ابا ـــــ سیچ گاؤں کے لوگ مراد کو اچھی طرح جانتے تھے بہت اچھی طرح۔

مگر جب مراد کو دو سال اپنی رجمنٹ کے ساتھ نجانے کہاں کہاں کے چکر کاٹنے کے بعد دوبارہ گاؤں میں آئے کافی دن گذر چکے ہیں اور اس دوران میں لوگوں کے اندازے کے مطابق ۔ کوئی آندھی آتی ہے نہ طوفان۔ دُنیا اُسی طور اپنے پُرانے محور کے گرد گھوم رہی ہے سیچ کے گھر و مدرسے ویسے کے ویسے ہی محفوظ سلامت ہیں اور مدرسے کا چراغ اپنے علم کی شعاعیں اِدھر اُدھر بکھیرنے میں بدستور کوشاں ہے۔ سیچ کے رہنے والوں کو یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے مراد کو وہ کبھی نہ جان سکے تھے۔ نہ پہلے۔ اب اور نہ اب انہیں اُسے آئندہ جاننے کی کوئی اُمید ہی رہی ہے۔ البتہ یہ وہ اب تک نہیں طے کر پائے کہ اس گتھی در نہ سمجھنے کے مخمصے کی وجہ مراد کی شخصیت کا کوئی ایسا مبہم پن ہے جو انہیں بظاہر نظر نہیں آتا یا یہ کہ اُن کی اپنی سمجھ ہی کمی ہے جو ایسی باتوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ بس ادھ سچائی کی طرف ذرا سا اُڑتی ہے اور پھر بھٹک کر بیدم سی ہو کر وہیں رہ جاتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس میں نہ مراد کی شخصیت کو کوئی دخل ہے۔ اور نہ اس سلسلے میں اُن کی سمجھ کا کوئی قصور ہے۔ بلکہ یہ سب کچھ حُسن کے اُس جادو کی کرامات ہے جس سے سیچ کی قلوپطرہ مالا مال ہے۔ اور جس کو سامنے پا کر مراد سا سورما بھی۔ ساری کائنات اور زندگی کے سارے اونچ نیچ بھول کر پاگل سا ہو جاتا ہے پر بعض یہ بھی نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ اُس علم کی سازش کی بدولت ہے جو گاؤں کے مدرسے کے ماسٹر کا ہاتھ بندھا غلام ہے اور جس کے ذریعہ مراد تو مراد آسمانوں پر پھسلتی ہوئی جھلک دکھا کر دم کے دم میں غائب ہو جانے والی چنچل اور بے کلی کو بھی چٹکی بجاتے میں ایک ڈبے میں بند کر کے موم کی ناک سا بنا جا سکتا ہے ـــــ مگر میں جسے سیچ میں آئے بس ایک دو دن ہی ہوئے ہیں۔ اور جس نے اوپر لکھی ہوئی اکثر باتیں آتے ہی یہاں وہاں سے سُنیں اور پھر سیچ گاؤں کے اس ڈرامہ کا ایک ایسا تماشائی بن گیا جو اگرچہ بہت دیر سے پہنچتا ہے مگر جسے جلد ہی تماشائیوں میں امتیاز اور کرداروں کی قربت نصیب ہو جاتی ہے۔ اِن میں سے کوئی بات بھی نہیں مانتا۔ اگر آپ اِس معاملہ میں مجھ سے میری رائے پوچھیں تو بھی میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ تاہم اس کا مجھے یقین ہے کہ اس سلسلے میں سیچ کے لوگوں کی کوئی توجیہ بھی ٹھیک نہیں ایک بھی نہیں۔ میری سُنی سُنائی تو آپ سُن ہی چکے۔ اب وہ سُنیے جو میں نے خود آنکھوں سے دیکھا لیکن کیا یہ بہتر نہ ہو اگر میں آپ

ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے اُٹھ کھڑا ہوا "اب اجازت دیجئے انسپکٹر جی شام کو پھر حاضر ہوں گا۔ بچوں کی ماں میرا انتظار کر رہی ہو گی۔"

"بچوں کی ماں اور مراد کا انتظار ـــــ مگر میں نے اپنی حیرانیاں چھپائے رکھیں۔

اُس دن دوپہر کو جب میں اکیلا تھا ماسٹر خوشیوں سے بھرپور میرے پاس آیا۔ اس معاملہ میں اب وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا تھا۔ آتے ہی کہنے لگا "انسپکٹر صاحب اللہ نے بڑا کرم کیا۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ سنا ہے مراد ہر اُسی شخص سے جو اس سے اس طرح کی بات کرے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے وہ کہتا ہے دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے مگر اُس کی نوری بے وفا نہیں ہو سکتی۔ اُس نے بچے کی پیدائش کے جواز میں بھی کئی طرح کے نظریے گھڑ لئے ہیں۔ بڑے عجیب و غریب اور اوٹ پٹانگ سے۔ کہتا ہے یہ سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے فرانس اور امریکہ جہاں کہاں اُس نے خود اپنی آنکھوں سے ایسی باتیں دیکھی ہیں۔ بس سائنس سائنس پکارتا ہے۔ کہتا ہے سائنس سب کچھ کر سکتی ہے۔ اور یہ سائنس کا کرشمہ ہے۔ بعض ناسمجھ دوستوں نے چاہا تھا کہ اُس سے ذرا بحث کریں مگر اُس سے لڑے کون؟ وہ ان سب کو دشمن سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اُس کے گھر میں فساد پیدا کرکے اُس کا گھر اُجاڑنا چاہتے ہیں ورنہ وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔"

"اندھیرا اور روشنی روشنی اور اندھیرا!" میں نے سوچا روشنی پر سب جان دیتے ہیں مگر بعض اوقات لوگ اندھیرے میں پڑے رہنا صرف اس لئے پسند کرنے لگتے ہیں کہ روشنی میں پہنچ کر کئی طرح کی جان لیوا عریانیاں نگاہوں کے سامنے یوں آکھڑی ہوتی ہیں کہ اُن سے نگاہ ہٹائی جا سکتی ہی نہیں اور اُنہیں اپنی آنکھوں سے دیکھنا گویا ننگے پاؤں کانٹوں پر چلنا ہوتا ہے۔" کہیں مراد بھی سچ گاؤں کا سورما بھی اسی لئے تو حقیقت کی زد سے نہیں بھاگ رہا تھا؟

میں نے مذاق کے طور پر ماسٹر سے کہا۔ "اب کہو کیا اب بھی تبادلہ کے متعلق تمہارا وہی خیال ہے؟"

وہ مسکرا دیا۔ شرمیلی سی عجیب سی سوچ میں ڈوبی ہوئی سی مسکراہٹ۔ جیسے فیصلے کے دونوں پلڑے ابھی ڈول رہے ہوں۔

مگر جا "۔ اُس نے اپنا کوٹ اُتار دیا۔ "جیسے آپ مناسب سمجھیں۔ آپ سے اب کیا چھپانا ہے۔"

کب اُس کی اُمیدوں کی سنہری وادیوں میں ہوا پھر کسی بہار کی خوشخبری سنا رہی تھیں۔ ہائے المظفر سپنو مجبور اُمیدو!!

شام کو مراد پھر میرے پاس آیا اب کے اُس کا وہ دس مہینوں کا لاڈلا بھی اُس کی گود میں تھا۔ پھر باتیں چھڑ گئیں یہاں کی وہاں کی۔ اور رجمنٹ کی رجمنٹ کے ساتھ ساتھ اس نے کہاں کہاں کی سیر کی۔ کیا کیا دیکھا کیا کیا سیکھا وہ کافی دیر بیٹھا رہا۔ اور اسی دوران میں اُس نے ان گنت باتیں کر ڈالیں۔ گفتگو کی طوالت باتوں کے ٹکڑے کر دیتی ہے اور چونکہ موضوع بدلتے رہتے ہیں اس لئے اکثر ٹکڑے گفتگو کے دوران میں ہی آئی جائی ثابت ہوتے ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے ایک بات سنی اور پھر جب دوسری کے بعد کوئی تیسری سننے لگے تو پہلی بھول گئے ہماری اس گفتگو کے کئی ٹکڑے بھی بس یونہی وقت کی نذر ہو گئے تاہم مراد کے کچھ جملے جن کا کم و بیش ایک ہی موضوع سے براہ راست تعلق تھا میرے ذہن کے ساتھ گویا چپک سے گئے۔ اُسے اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر بہت ستا رہی تھی۔ اور اس مستقبل کو چمکانے کے لئے اُسے روشنی کا صرف ایک منبع نظر آ رہا تھا ـــــ علم پڑھائی وہ کہتا تھا۔ میں نے چار جماعتیں پڑھیں اور پھر مدرسے سے بھاگ نکلا میں دیکھوں گا میرے بچے کیسے بھاگتے ہیں؟"

"میرے بچے" ـــــ اور یہ وہی مراد تھا جس کے متعلق مجھے سنایا گیا تھا کہ اُس نے اپنے بچوں کے متعلق کوئی گہری سوچ سوچنا تو درکنار آج تک انہیں پیار کی کسی اُچٹتی ہوئی نگاہ سے بھی نہ دیکھا تھا آہ سب بدلنے والے وفا خیالو!

رات گئے چوروں کی طرح دبے پاؤں ماسٹر میرے پاس آیا "انسپکٹر صاحب میں تو لُٹ گیا نوری بے وفا نکلی آج شام جب مراد آپ کے پاس میٹھی باتیں کر رہا تھا۔ وہ اسکول کی پچھلی دیوار کی اوٹ میں کھڑی جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھا مجھ سے کچھ کہنے آئی ہے۔ سب کی نظریں بچا کر میں اُس کے پاس پہنچا۔ مگر وہ تو جیسے بپھر گئی۔ میں نے کہا "نوری میر

ہوں" لیکن اُس کے عقدہ کی کوئی انتہا نہ تھی "تم کون ہو پرائی عورتوں کے پاس یوں دبے پاؤں آنے والے"

میں نے اپنی وضاحت کرنا چاہی۔ مگر وہ پھر تڑپ اُٹھی "میں اپنے شوہر کو دیکھنے آئی ہوں۔ ہٹو یہاں سے۔ ورنہ میں شور مچاتی ہوں" جناب۔ وہ تو اس میری واقف بھی نہیں تھی"

ماسٹر جیسے کسی دیبک راگ سے اندر ہی اندر بھسم ہو چکا تھا۔ ساز کے تار اب تھرا اُس نے پر لرزنے لگے تھے۔

" انسپکٹر صاحب بس اب یہاں نہ رہ سکوں گا میرا استادلہ ہیں اور کروا دیجئے سوچتا تھا شوہر کے سامنے وہ لاکھ اُس کی سہی۔ تنہائی میں تو وہ میری ہی ہوگی مگر عورت ذات کا کیا بھروسہ ہے"

لیکن مراد کو تو اس عورت ذات پر ذرا بھروسہ تھا۔ اور نہ تھا کبھی ٹھیک ماسٹر کی توری سے دنیا دو ہو کر ارکم مراد کی توری نے دیا نہ تھی۔

اگلے دن میں نے سیج سے کہہ کر دیا ممکن ہے۔ میرے آنے کے بعد گاؤں میں کھیلے جانے والے اس ڈرامہ میں دو ایک منظر اور بڑھ گئے ہوں مگر مجھے جب بھی سٹیج گاؤں اور اس گاؤں میں کھیلے جانے والے اُس ڈرامے کا خیال آتا ہے۔ تو ڈرامے کا پلاٹ بڑھتے بڑھتے سیدھے یہاں آکر دفعتاً رک جاتا ہے خیال کہیں دھندلکوں میں بھٹک جاتے ہیں اور تصور بوجھل سا ہو کر جیسے ایک ہی نقطے کے گرد گھومنے لگتا ہے۔

پُل :- بسلسلہ صفحہ ۳۲

خشک چھلکے والے ناریل سے وہ بچوں کی طرح کھیلتی رہی۔ ارے ارے بادام کا چھلکا کتنا سخت ہے۔ ٹوٹتا ہی نہیں۔ کاغذی بادام ہوتے تو میں اب تک ختم کر چکی ہوتی۔ مٹھائی بھی پڑی ہے۔ میں کیسے کھا سکتی ہوں۔ سسرال والے کیا کہیں گے! دولھا اب گھر پہنچ کر مجھ سے باتیں کرے گا۔ ادھر کھیتوں میں امریکن کپاس لونے ہیں۔ بڑی بڑی پھٹیاں، ریشم کی طرح ملائم۔ دلیسی دھرتی، حسین امریکن بیج۔ تو دولھا اب دلھن سے باتیں کیوں نہیں کرتا کیوں نہ میں خود ہی اُسے بلالوں۔ اب آمدہ کبھی البانہ ہو نا چاہیے کہ دلھن راستہ بھر ڈولی میں قید رہے۔

ارے ارے سر پر سوسے کا "حونک" تو کسی مندر کا کلس معلوم ہوتا ہے۔ نہ سق، نہ ملاق، یہ ماتھے کا جھومر، کانوں میں بالیوں کے گچھے! یہ سنگار تو بہت عجب معلوم ہوتا ہے۔ ماتھے کا جھومر ہی کافی نہ تھا۔ کہاں ہے۔ میرا وہ سنگار ؟ کاش دولھا نے ایک مہینہ پہلے مجھے کھیتوں میں ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتے دیکھا ہوتا۔ کاش میں اسی روپ میں آج بھی دولھا کے سامنے کھڑی ہو سکتی۔

گاؤں کی سرحد آگئی۔ کہاروں نے پیپل کے نیچے ڈولی رکھ دی۔ جہاں گاؤں کی عورتیں پہلے سے دلھن کا انتظار کر رہی تھیں۔ ڈولی کا پردہ اُٹھا اُٹھا کر لڑکیاں دلھن کا روپ پرکھنے لگیں۔ دلھن کے سنگار کی تعریف سُن کر رو کتی ہوئی نائن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑنے لگی

تینوں نوجوان کہار پرے برات کے قریب سرک گئے۔

بوڑھا کہار ڈولی کے قریب ہی کھڑا رہا۔ وہ تھک کر چُور ہو چکا تھا اس نے اپنے کندھوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے کندھے پیتل کے نہ تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈولی بھی ایک پُل ہے۔ نہ جانے ابھی اور کتنی دلہنیں اسی پُل سے گذر کر میکے سے سسرال پہنچیں گی۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیے۔ ورنہ جواب میں تاخیر لازمی ہے۔ (منیجر)

پرتھوی ناتھ شرما

تالاب

قصبہ کے مغربی کنارے پر تالاب واقع تھا۔ اور اس کے ساتھ کتنی ہی کہانیاں وابستہ تھیں۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ یہ تالاب ایک بڑے پیر مرشد نے کسی بادشاہ کو حکم دے کر بنوایا تھا۔ شروع شروع میں یہ بالکل مربع کی شکل کا تھا چاروں طرف کئی کئی سو سیڑھیاں تھیں اور تہہ میں پتھر کے مربع ٹکڑے بچھے ہوئے تھے اور پانی کا ایسا انتظام تھا کہ بارہ مہینے تالاب لبالب بھرا رہتا تھا اتنا صاف اور معطر پانی کہ ننھا سا سکہ ڈالو تو صاف نظر آئے۔ لیکن میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب سے اس تالاب کو بہت خراب حالت میں ہی دیکھا ہے۔ ایک دفعہ ضرور سننے میں آیا تھا کہ اراکین ڈسٹرکٹ بورڈ اس کو پھر سے پختہ بنوانے کی سوچ رہے ہیں لیکن ماضی کے بوجھ کو حال کے کندھوں پر کون لادے۔ خیر۔ تالاب کی حالت دن بدن خراب و خستہ ہوتی جا رہی ہے۔ ماضی بھاگتا جا رہا ہے اور حال اپنا سکہ جما رہا ہے۔

آغاز میں میرا تعلق تالاب سے اس صورت میں ہوا کہ ایک روز میں اپنے دوست رام ناتھ کے ساتھ شام کو اس پر پہنچا۔ ہم دونوں کی عمر اس وقت نو سال کی تھی۔ رام ناتھ میرا ہم مکتب تھا۔ ساتھ ساتھ ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے اور اکثر اوقات دونوں کو بیک وقت مرغا بن کر کمر پر کسنوں کا بوجھ بھی سنبھالنا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ دونوں پسلیوں سے چور چور ہو جاتے تھے طمانچے اور لات گھونسوں سے بھی اکثر تواضع ہوتی رہتی تھی۔ لیکن جب سے تالاب اور اس کے اندر ننگے نہانے کی لذت سے آشنائی ہو گئی تھی۔ تب سے سکول کے اندر ملنے والی سزا کا خیال کم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پہلے روز ہم دونوں کچے گھاٹ پر ننگے نہائے تھے لیکن دو چار روز اس طرح نہانے کے بعد ہم گھر سے چوری چھپے کپڑے کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا پہننے کے لئے لے جانے لگے تھے۔ اور لنگوٹی باندھ کر کچے گھاٹ پر نہاتے رہتے تھے۔ ایک گھاٹ تو ویسے پکا بھی تھا لیکن ہم دونوں کو اس جگہ سے ڈر لگتا تھا کیونکہ چند دنوں پہلے وہاں ایک آدمی ڈوب گیا تھا اور بزرگوں نے قصبہ کے ہر ایک بچے کو ہدایت کر دی تھی کہ کوئی تالاب کی طرف نہ پھٹکے ورنہ تو اس سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اس لئے ہم نے کچے گھاٹ ہی پسند کیا تھا۔ کچے گھاٹ کے کنارے پر آم کا باغ تھا۔ اور آموں سے لدی اکثر ٹہنیاں پانی کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ لہٰذا، ٹہنیاں اکثر پانی میں بہتی رہتی تھیں اور رام ناتھ اور میں اُن کو ڈھونڈتے رہتے تھے گھٹنی گھٹنی اندیاں پانی میں کھڑے کھڑے کھانا اور پھینک دینا ناک اور کانوں کو دونوں انگوٹھوں اور دونوں کی انگلیوں سے دبانا اور غوطہ لگانا آہستہ آہستہ پانی کے نیچے جانا اور پھر سطح سے باہر نکلنا۔ اور اس کے بعد ہاتھ پاؤں مارنا ایک دوسرے کی طرف پانی کے چھینٹے دینا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گھٹنوں پانی میں بھاگنا ہم دونوں کا معمول تھا۔ گھر والوں کو اس معاملے سے قطعی لاعلمی تھی ہم گھر ہی جب گھستے تھے جب ہمارے بال سوکھ جاتے تھے اور نہانے کی کوئی علامت بدن پر باقی نہیں رہتی تھی۔

رام ناتھ اور میرے درمیان دوستی کا قائم ہونا ضروری بات تھی، وہ اکثر سکول کے بعد میرے پاس ہی بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے رال ٹپکتی رہتی تھی۔ اور بار بار آستین سے ناک صاف کرنا اس کی زندگی کا دوسرا حصہ بن گیا تھا۔ ماتا جی اُسے بونٹو کے نام سے پکارتی تھیں اور دادی کئی بار مجھ سے پوچھا کرتی تھیں "تیلو والے پیسے کی خیر تو ہے نہیں کھلاتا" اور میں اپنی گردن ہلا کر جواب دیتا "نہیں تو" اور دراصل معاملہ یہ تھا کہ رام ناتھ کتے کی مانند میری دُم کے ساتھ ساتھ لگا رہتا تھا اور مجھے جو چار پیسے روز خرچے کو ملتے تھے وہ اُن میں پورا حصہ دار تھا اور یہ بات میری سمجھ میں ہرگز ہرگز نہیں آتی تھی کہ رام ناتھ کا باپ بھگوان کی دیا سے جس کی حویلی قصبہ میں سب سے بڑی تھی اناج کی آڑھت تھی اور کچھ سو بیگھے زمین تھی ایک پیسہ تک اپنے بچے کو خرچے کے لئے نہیں دے سکتا۔ خود رام ناتھ کی ماں کم از کم سیر بھر سونا اپنے بدن پر پہنے تھی اور ہماری ماں کی گردن کے گرد ایک سونے کا لاکٹ پڑا رہتا تھا اور وہ ہفتہ میں ایک بار تو کم از کم والد صاحب سے رام ناتھ کی ماں کے سونے کے سیر بھر زیورات کا ذکر کرتی رہتی تھیں۔ بس یہ کمبخت لاکٹ ہی رہ گیا ہے۔

ان قسمت میں۔ لیکن والد صاحب ہر بار یہی کہہ کہہ کر ٹال دیتے تھے زیادہ رلو۔ پیسے سے بدن کالا پڑ جاتا ہے منتلو کی ماں۔ ٹال دیتے تھے اور ماں اندر ہی اندر گھلتی رہتی تھی۔ لیکن ہمیں اس سے کیا؟ جس دن پیسے روز خرچ کو مل جاتے تھے اور رام ناتھ کے کی دُم جاتو اسمارے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا جب میں بار بار سے گرم گرم جلیبیاں خریدتا تھا تو اُس کی رال زیادہ شدت سے بہنی شروع ہو جاتی تھی اور وہ پیسے کی کوشش کرتے کرتے رال کو آستین سے پونچھنے میں مصروف ہو جاتا تھا اور آدھی سے زیادہ جلیبیاں اُس کی نظر ہو جاتی تھیں۔

مجھے بار بار دادی کی ہدایت یاد آتی جو کبھی کبھی انھیں غصہ میں آتی۔ اور رام ناتھ کی چھاتی میں سر مارنے کی تمنا بھی اندر ہی اندر گدگدی کرتی لیکن دل مار کر رہ جاتا کیونکہ وہ تالاب کا راز کھول سکتا تھا میرے والدین پانی سے ڈرتے تھے اور اکثر مجھ کو اور عمروں کو ہدایت کرتے رہتے تھے کہ پانی سے بچنا چاہیے۔ آگ اور پانی کا کیا میل، کیا معلوم کب دھوکہ ہو جائے۔ اور مجھ سے کبھی کبھی دادی پوچھتی تھیں کیوں للّا تالاب پر تو نہیں جایا کرتے؟ تو میں سر ہلا کر جواب دیتا، نا دادی! چاہے تو کسی سے پوچھ لے آگ اور پانی سے دُور رہنا چاہیے۔ دادی میرے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی کہتی 'شاباش' اور تالاب کا راز پوشیدہ رہتا۔ رام ناتھ کو جلیبیوں میں حصّہ دار بنانا پڑتا اور غصّے کے جذبات کو دبانا۔ ..

تالاب کے کچّے گھاٹ پر نہاتے نہاتے چار مہینے سے زاید ہو چلے۔ اور ہم دونوں اُن تمام چمار، عیسائی، مسلمان اچھوتوں کے بیٹوں سے زیادہ بہتر ہو گئے تھے جو اپنی زندگی تالاب کے کچّے گھاٹ سے شروع کر کے پکّے گھاٹ تک پہنچ جاتے تھے۔ ہم دونوں کو تھوڑا تیرنا بھی آ گیا تھا اور اکثر بے دھڑک [illegible] پانی میں تیرتے چلے جاتے تھے۔ دس بارہ فٹ تک۔ جیسے کوئی پرندہ ہوا میں پر تول رہا ہو اور جب ہوا کا لمس اُس کے پروں میں پرواز بھر رہا ہو۔ یہ تجربہ یقینی طور سے نہایت مسرّت بخش تھا اور اب پکّے گھاٹ کی طرف جانے کی تجویزیں تھیں لیکن میں رام ناتھ کو یہی سمجھاتا تھا کہ ابھی نہیں۔ کیا پتہ ہم کچّے ہوں اور پکّا گھاٹ پھر پکّا گھاٹ ٹھیرا۔ لہٰذا ابھی مشق کچّے گھاٹ پر ہی جاری تھی۔

ادھر چند دنوں سے رام ناتھ نے ایک کہانی سی سنانی شروع کر دی تھی۔ کسی نے اُس کو بتا دیا تھا کہ بڈھائیوں کے میلے والے دن رات کو بارہ بجے تالاب کے بیچوں بیچ ایک سونے کا ہاتھ نکلتا ہے اور پانچ منٹ تک پانی کی سطح سے باہر اُٹھا رہتا ہے اور اس کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔

دیکھ رے منتلو! وہ لپ لپ پر بیٹھ کر کان میں انگلیوں کو گھماتے ہوئے کہتا اگر وہ سونے کا ہاتھ مل جائے تو کیسا کام بنے۔ اور سارے [illegible] میں تو———"

"ارے دلوں کا ہاتھ کس نے اب تک پکڑ پایا ہے؟" میں جواب دیتا۔

"تو تو یونہی کہتا رہتا ہے یار۔ چپکے چپکے تیر کر جاؤں گا اور ایکدم جھپٹ لوں گا، بس ایک دفعہ ہاتھ میں آ جائے۔ کنارے تک گھسیٹتا ہی لے آؤں گا۔"

"اور اگر ہاتھ نے اندر گھسیٹ لیا تجھ کو تو پاتال لوک میں لے جائے گا ہاتھ۔"

"لے جانے دے۔ اس سے تو کوئی بات اچھی نہیں۔ ارے پاتال لوک میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے جلیبیاں لڈّو۔ امرتی۔ گلاب جامن۔ خوب مزے سے کھاؤں گا۔ اور وہاں خوب پیسے خرچوں گا۔ یہاں تو دو دن میں ایک پیسہ ہی ملتا ہے۔"

"بس رے مرا باپ تو دھنا سیٹھ ہے۔ دو دن میں ایک پیسہ۔ یار کو چار پیسے ملتے ہیں چار۔"

رام ناتھ میری طرف اُداس نظروں سے دیکھتا۔ شاید وہ کہتا تھا کہ کاش اُس کا باپ بھی میرے باپ کی طرح کم پیسے والا ہوتا، اُس کی ماں کی گردن میں بھی میری ماں کی طرح ایک سونے کا لاکٹ ہوتا اور اُسے بھی چار پیسے روز خرچ کرنے کو ملتے۔ لیکن وہ پانی میں چھلانگ لگاتے ہوئے کہتا "اے دیوی کا ہاتھ قبضہ میں آ جائے تو چار چھ دس پیسے روز خرچ کر دوں گا اے دیوی میّا تیرا ہی آسرا ہے۔"

اور ہم دونوں جل مرغابیوں کی مانند ڈبکیاں لگاتے۔ پانی میں غُٹّے کرتے اور ڈبان پانی میں دس دس فٹ تک آگے بڑھ جاتے۔

تالاب پر بڈھائیوں کا میلا لگا۔ مدرسے کی چھٹی تھی، میں صبح کے کھانے سے فراغت پا کر رام ناتھ کے مکان پر گیا۔ آواز لگائی

لیکن اُس کی موٹی تھل تھل پل پل ماں نے اندر سے جواب دیا۔ چل یہاں سے آیا رام ناتھ کو بُلانے والا ۔۔۔ اور میں اکیلا ہی سٹک گیا۔

میرے پاس چار آنے کے پیسے تھے۔ دن بھر میلے میں گھومتا رہا۔ ہنڈولوں اور مختلف جھولوں میں جھولا۔ چرخی خریدی اور کرکرا کھٹ کٹ کٹ کی آواز نکالتا رہا۔ دودھ پانی غبارے حد سے زیادہ پھول کر پھٹ ہوگئے۔ جلیبیاں سے کی سونٹھ اور ہری بتاشے بھی کھائے لیکن دل میں ایک عجیب کھٹکا سا درد اُٹھتا رہا۔ اور شام کے وقت خاص طور سے طبیعت اُداس ہوگئی۔ تالاب کے پکے گھاٹ پر سیکڑوں بچے نہا رہے تھے ۔ جاتی لوگ الغوزے بجا رہے تھے لیکن میں اُداس تھا کیونکہ اور میرے دوست رام ناتھ نے اُس روز پکے گھاٹ پر تیرنے کی سکیم بنائی تھی

اُس روز میں سارے سے ہی گھر واپس لوٹ آیا اور رکھ کھا پکے بعد چھت پر لیٹ گیا سارے دن بھر کا تھکا ماندہ تھا لہٰذا لیٹ گیا اور لیٹتے ہی نیند آگئی

رات کے کوئی ٹھیک پہر ماں نے جھنجھوڑ ڈالا "تسلو، تسلو"

میں آنکھ ملتا ہوا اُٹھا نیچے چوک میں دو چار آدمی آپس میں بات کر رہے تھے ماں مجھے نیچے زینہ میں گھسیٹتی کھینچتی لے گئیں۔ میں خواب میں تیرتا تیرتا تالاب کے وسط میں دلوی کے سونے والے ہاتھ تک پہونچ چکا تھا لیکن خوشی میں سونے کے ہاتھ کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھانے والا تھا کہ یہ نوبت بیتی آئی۔

چوک میں رام ناتھ کے باپ نے مجھ سے دریافت کیا "کیوں بھیا شام کو رام ناتھ ملا تھا"

"نہیں تو" ۔ میں نے جواب دیا۔

سیٹھ شام ناتھ نے اپنے جوتے کا تلا جھاڑتے ہوئے کہا کیا کروں۔ بڑا تنگ کیا اس لونڈے نے۔ کون کونسی صحبت میں بیٹھتا تھا۔ پہلے ہی بلا اُس کے مانگے تانگے دو دو روز میں ایک پیسہ دے دیتا تھا۔ پر ایک ہفتے سے اُسے ضد ہوگئی تھی کہ میں ایک پیسہ روز لوں گا۔ اور آج سویرے ماں سے کہنے لگا میلا ہے دوآنی دو۔ بھلا سوچو تو بچے کی ذات کو دوآنی دے کر بگاڑنا ہے۔ میں نے پہلے دو پیسے۔ پر وہ روس گیا۔ روٹھ جا میری بلا سے۔ پر سنجا سے کہاں چلا گیا کیوں بیٹا تسلو تجھے تو کچھ معلوم ہوگا کہ شام کو کون سے بدمعاش لونڈے کے ساتھ رہتا تھا یہ ۔۔۔"

میں نے کہا مجھے کیا معلوم۔ میں تو سویرے گھر گیا تھا پکارنے لیکن رام ناتھ کی ماں نے جھڑکا دیا۔

"اچھا"، رام ناتھ کا باپ چلا گیا۔ اور میں پھر کھاٹ پر جا کر لیٹ گیا کھلا منہ تھے اگر میں اُس سے کہہ دیتا کہ میٹھا تالاب پر بیٹھے دلوی کے سونے کے ہاتھ کا انتظار فرما رہے ہوں گے تو ہم دونوں کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ رام ناتھ کے ساتھ ساتھ میری بھی کٹائی ہوتی اور دس بارہ دن تک شام کے وقت گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت بھی ہو جاتی۔ سکول میں تھوڑے کم پٹتے تھے جو گھر میں بھی خبر لی جائے۔ اس واسطے میں نے ایک پریشان باپ کی دعائیں حاصل کرنے کا لالچ ہوتے ہوئے بھی ٹھیک بات نہیں بتائی۔

لیٹنے کے باوجود مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ اور دادی کی بڑبڑاہٹ سُن رہا تھا "آگ پانی کا کیا میل ہو۔ آجکل کے لونڈے دیوانے ہوگئے ہیں۔ بڑوں کا کہا نہیں مانتے ہیں تسلو کا باپ بھی۔ جب پڑھانے لگا تھا وہ تو مجھے پتہ لگ گیا اُسے سولو جانے ہی نہ دیا۔ تالاب پر تو نہ جاتا تھا چھورا ۔۔۔"

"رہنے بھی دو سب آجائے گا۔ دو پیسے دلوئے تھا دھنا سیٹھ سیر بھر سونے کا زیور پہنے پھرتی ہے بہو رانی" ماں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

اور میں چُپ ۔۔۔ اگر بھانڈہ پھوڑ دیتا تو ایک جھوٹ دونوں کی شامت آئے گی لیکن آہستہ آہستہ ایک وہم سا دل میں گھر کرتا جا رہا تھا جیسے کچھ پہلے پکے گھاٹ پر ڈوبنے والے کی یاد آ رہی تھی۔ دادی کے کہنے کے مطابق تیس پینتیس سال کا جوان تھا۔ بہو سے لڑائی ہوئی تھی اور تالاب میں ڈوب مرا تھا۔ سُسرے کا بدن پھول کر کُپا ہوگیا تھا۔ ہاتھ پیر گل گئے تھے۔ سفید پڑ گئے تھے اور پیٹ نگارہ۔ سر بیٹھی بھی دائی تھی۔ جسم کی ڈھڈو پہلے تو میں نہیں لیے دبتی ہیں جسموں کو۔ نامراد کہیں کی ۔۔۔ آتا تالاب کس نے بنوا دیا قصبے میں جو کوئی لڑے جھگڑے ڈوب اس میں۔ کچھ اس قسم کی رائے کا اظہار دادی نے کیا تھا۔ نہیں، مگر رام ناتھ نہیں ڈوب سکتا۔ اُسے تو خوب تیرنا آتا ہے۔ سات دن پہلے ہم نے پچیس فٹ سے زیادہ راستہ طے کیا تھا۔ اور تین دن پہلے ہم قریباً پچاس فٹ تیر کر واپس آ گئے تھے۔ ہاں !۔ رام ناتھ ہار تھک مار کر واپس چلا آئے گا۔ میں نے سونے کی کوشش کی ..

"رام ناتھ ! رام ناتھ ! ٹھہرو تو میں بھی ساتھ چلتا ہوں"۔

رام ناتھ تیسری سیڑھی پر جس پر گھٹنوں تک پانی تھا رک گیا۔

میں نے جلدی سے لنگوٹی باندھ سیڑھی پر اُتر اُس کے ساتھ چھلانگ
لگا دی۔ پانی کافی گہرا تھا لیکن ہم دونوں جلدی سطح پر آ گئے چاند
کی روشنی سارے تالاب پر پھیل رہی تھی اور چمک پانی کی لہریں
سی کر رہی تھیں پانی بدن کو اس موافق چھو رہا تھا جیسے
دادی میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر رہی ہوں۔ اور میں مسکرا
رہا ہوں ہم دونوں سنگھاڑے کی بیلوں کو چیرتے ہوئے آگے
بڑھے جا رہے تھے چاند کی کرنوں میں تالاب کے وسط میں ایک
سونے کا ہاتھ صاف چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا کُندن کی دمک دیکھ کر
ہمارے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے اور ہم اس طرح سے تیر رہے
تھے جیسے برسوں کے مشّاق تیراک۔ رام ناتھ مجھ سے آگے
نکلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں بھی سارا زور لگا کر اس کا
ساتھ دے رہا تھا اور سنگھاڑے کی بیلوں اور اس کے پھول
سیوار کو جو کہ دن بھر باہر کی لوگ پانی میں چڑھاتے رہتے تھے
سے ہم دونوں ہاتھ کی طرف بڑھے جا رہے تھے ہمارا مقصد تھا
مقصود سونے کا ہاتھ تھا رام ناتھ کے دہن سے رال ٹپک رہی
تھی اور وہ پانی کے ٹکڑے کرتے کرتے آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

چاند عین دیوی کے ہاتھ کے اوپر تھا دونوں نے یکدم
ہاتھ آگے بڑھا لئے۔ دونوں نے یکدم ہاتھ کو پکڑا اور وہ نیچے کی طرف
جانے لگا۔ میں نے رام ناتھ سے کہا۔ "یار پاتال میں چلے جائیں گے
گھر والوں کو فکر ہو گی۔" اور گرفت سے آزادی حاصل کر لی
لیکن رام ناتھ مضبوطی سے سونے کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں باندھے
تھا میں نے کھڑکی سر کی لگاتے ہوئے ایک بار چلا کر کہا۔ "رام ناتھ
چھوڑ دے۔" لیکن وہ مانے نہ۔ میں کنارے پر تیر کر پہونچ
گیا تھوڑی دیر میں ہاتھ رام ناتھ سمیت غائب ہو گیا میں
نے ایک بار اور زور سے صدا لگائی "رام ناتھ!"

لیکن رام ناتھ پاتال میں پہونچ چکا تھا۔ اور میں ڈرا ہوا
پڑا تھا میرے بدن پر پسینے کی بوندیں تینوں پر تھیں
پھوٹ آئیں تھیں۔ ماں سکھا جھل رہی تھیں اور دادی
کہہ رہی تھیں کیا ہو گیا میرے لال کو۔ کیسے بدن کانپ رہا ہے
میں دیوی کے منہ پر تو سر نہیں۔ کہہ دیا۔ دھوبی در دھونی
رام ناتھ کے ساتھ دیوی کے منہ پر گیا تھا میں۔

"نہیں تو۔" میں نے ہوش میں آتے ہی جواب دیا۔ اور اپنے
دل کو یوں تسلی دیتا ہوا کہ رام ناتھ آرام سے پاتال لوک میں
تتلیاں اُڑا رہا ہو گا۔ سو گیا۔

تیسرے دن خبر ملی کہ رام ناتھ کی نعش تالاب کی سطح پر
تیرتی ہوئی ملی ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ اماں اور دادی ذکر کر رہی
تھیں میں باہر جانے کے لئے تیار ہوا لیکن دادی نے ہاتھ پکڑ کر
کہا "نا بیٹا۔ ابھی نہیں۔ پہلے رام ناتھ کی ارتھی کو نکل جانے دے
تب جا بیٹو۔"

میں بیٹھا گھٹتا رہا رام ناتھ کے گھر سے رونے کی آواز
برابر کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اور مجھے دادی کی پرانی بات یاد
آ رہی تھی۔ "آگ اور پانی کا کیا میل۔" اُف! اور میں نے اُن دو گھنٹوں
میں جو کہ جسم لگے اور رام ناتھ کی ارتھی کو رام نام ست کہہ کر لیجانے
کے سامنے گذر رہے تھے باہر فضا میں ایک پھولی ہوئی موٹی اور
سفید ہاتھ پاؤں والی لاش کو تیرتے ہوئے دیکھا۔

اُس کی رنگت سانولی تھی تلوں کی سی سیاہی لئے ہوئے آنکھیں بڑی سیاہ اور چمکدار تھیں جن کی گردش میں بیک وقت حیا اور بے حیائی اور شعلے جیسی تڑپ لپک اور پھرتی تھی پتلیوں کے قریب کی سفیدی پر نیلاہٹ پھیلی تھی، جیسے پرانی آنکھوں میں۔ موٹے ہونٹوں پر ستواں ناک ہلکا سا خم لئے تھی۔ گردن پتلی تھی مگر بھری بھری اور دراز۔ لیکن طبیعت کی پستی نے سر ایک طرف جھکا دیا تھا۔ نم اور غلیظ ساری سینے پر تنی ہوئی تھی۔ اور وہ سر سے پیر تک ایک لچک تھی ایک نرم گرم دبا۔ بھاری اور ہلکی نرم اور سخت کثیف اور لطیف ——

"آوارہ اس طرح مانگتی پھرتی ہے سڑکوں پر کسی کے ساتھ بیٹھ بھی جاتی" ایکدم سے ایک گھن دل میں پیدا ہوگئی اور خیال کے یہ جملے اُچک لیا نفرت سے ناک اوپر کو اُٹھ گئی ابروؤں کے درمیان بھینی بھینی دھاریاں سی اُبھر آئیں رستی بستی یکسر نئے کوٹ کا دامن ہاتھ سے دبالیا کنپٹی کی رگیں گرم خون سے زور زور سے پھڑکنے لگیں اور دور تک مجھے احساس رہا کہ دو بڑی بڑی آنکھیں سیاہ اور چمکدار میرے سفید کوٹ کو بے حیائی سے تک رہی ہیں۔ وہ حیران سی ہیں اور کھوئی بھی اور جیسے تنہائیوں میں کھوئی ہوئیں۔

سردیاں گذر گئیں رفتہ رفتہ ٹھٹھرن بھی جاتی رہی اور پھر ہوا میں خنکی ہو چلی۔ سورج کی کرنیں پہلے نرم اور بھلی معلوم ہوتی تھیں، اور اب جسم میں چبھتی محسوس ہونے لگیں فضا میں آگ کی لپٹ سی رینگ گئی۔ اس کے بعد آسمان پر رنگ رنگ کے بادل دوڑنے لگے۔ دنیا موسم کی ان تبدیلیوں کا آئینہ بنی رہی اور سال بھر میں اُس کا رنگ روپ بھی کافی بدل گیا۔ ابھی ایک آدھ ہی بارش ہوئی تھی کہ یونیورسٹی برسات بھر کے لئے بند ہوگئی۔ علیگڑھ سے وطن کی واپسی خود اپنی جگہ بڑی تبدیلی تھی اور پھر برسات کا موسم۔

بارش سے دُھلی ہوئی مال روڈ کالے فیتے کی طرح سیدھی شفق کی سُرخی سے جا ملی تھی۔ مغرب کی سمت آسمان پر کئی رنگ بکھرے تھے سڑک کے کناروں کی زمردی روشیں تازہ ترشی ہوئی تھیں اور اُن کی پتیوں کی نمی میں نارنجی رنگ کھیل رہا تھا۔ رائل ہوٹل کے حروف کے وسط میں ایک مرکز سے دوسرا برقی سُرخ لکیریں آسمان کی طرف اُبھری تھیں عشق پیچاں کی بیل میں سیاہی رنگ گئی تھی جس کے درمیان سے نرم و نازک اُودے پھول ننھے منے ستاروں کی طرح متبسم تھے۔

سڑک کے کنارے پر ایک کمزور عورت لنگڑاتی ہوئی چل رہی تھی اس کی جھولی میں کچھ پڑا تھا ہرانی لال اینڈ کو کی طرف قدم اُٹھاتے ہوئے نظریں نادانستہ طور پر اُس اپاہج پر پڑ گئیں۔

"وہی بھک منگی؟" گذشتہ نفرت کے احساس سے پیشتر خوف و دہشت کی ایک لہر مجھے مجرم کی طرح ہراساں اور مبہوت بنا گئی۔ پتلیاں بے حرکت تھیں اور لب ساکت اور میں گم سُم ایک گری ہوئی عمارت کو دیکھ رہا تھا جو بے جان تھی اور بے حس۔

اُس کے بال اب بھی غلیظ تھے مگر نہ اُن میں لہروں کا دھوکا تھا اور نہ سیاہی۔ وہ اب گھنے بھی نہ تھے۔ آنکھیں سکڑ کر چھوٹی ہو گئیں تھیں۔ طوفانی تموج کی جگہ اب اُن میں گدلی گدلی نمی تھی۔ اب اُن میں وحشت تھی۔ نہ بے حیائی نہ درد۔ نہ اُداسی۔ بس وہ صرف آنکھیں تھیں۔ پھیلی پھیلی۔ پیلی پیلی جیسے حباب جیسے سیاہ گندے پانی کے گڑھے۔ جیسے کیچڑ سے بھرے ہوئے مونگے اور وہ خود سر سے پیر تک پھیلی عورت کی ملگجی۔ مٹی مٹی لرزاں پرچھائیں یا وہ چیخ جو لبوں سے رُک کر آنکھوں کی کیچڑ میں پھیل گئی ہو!

سگرٹ کا دُھواں بدمزہ لکیر کھینچتا ہوا حلق سے اُتر گیا۔ مُنہ میں راکھ سی گھل گئی۔ جیسے سگرٹ کا دُھواں مُنہ میں راکھ بن گیا تھا پیر جسم کا بوجھ محسوس کر رہے تھے۔ قدموں میں لغزش تھی اور فضا میں گونجتے ہوئے انگریزی الفاظ میں ارتعاش۔

"کم اِن سر کمسٹ شوز۔ پیٹنٹ کموزر کم اِن پلیز" اُس کی گول گول آنکھیں چمک رہی تھیں اور پیلے بدنما دانت بھی۔

ہرہ ویوی شیرازی

تجاہلِ عارفانہ

بیگم معصوم علی کا خط مس جاں نثار کے نام

محترمہ! تسلیم

مجھے یقین ہے کہ جب یہ خط آپ کی خدمت میں پہنچے گا تو آپ
ت رہ جائیں گی بے شک! پہلے سے شرف ساز حاصل کئے بغیر
ی طرف سے یہ میا کی تعجب خیز بات ہو سکتی ہے۔ لیکن کیا کروں
کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

اس غیر معمولی جرأت کی ذمہ داری نواب میر معصوم علی
ائد ہو سکتی ہے جو میرے عزیز شوہر ہیں اور آپ کے ———
ہاں آپ کے دوست۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں
جا سکتا کہ ہم غائبانہ طور پر ایک دوسرے سے واقف ہیں
ے عزیز شوہر اکثر آپ کے اوصافِ حمیدہ کی تعریف کرتے
اور مجھے یقین ہے کہ مصداق "ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ
محفل میں ہے"۔ کبھی نہ کبھی آپ کی بزم نشاط میں کبھی نہ کبھی
ان مجھے یاد کر لیا جاتا ہوگا۔

اس وقت یہ خط لکھنے کی ضرورت اس لئے لاحق ہوئی
گذشتہ چار دن اور چار رات سے نواب صاحب گھر سے
ب ہیں۔ ان کی بابت کسی قسم کی اطلاع بھی نہیں ملی حالانکہ
سے قبل ہمیشہ یہ ہوا کہ اگر وہ خلاف توقع کسی دوسری جگہ
معمولی طور پر زیادہ دیر رک گئے تو فوراً میرے اطمینان
لئے ایک پیغام بھیج دیا گیا۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں
کی ایسی غیر حاضری سے حد درجہ پریشان ہو جاتی ہوں
یہ بالکل فطری چیز ہے کیونکہ میں انکی شریکِ حیات ہوں۔

آپ سے دریافت کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ
پ کے ساتھ آپکے عشرت کدے پر مقیم ہیں بلکہ دل کی دھڑکن
تی ہے کہ شاید آپ اس سلسلے میں مجھ سے زیادہ واقف ہونگی۔
وہ تشویش کا اصل سبب یہ ہے کہ ایک عرصہ سے میرے عزیز
ہر کی صحت جس کا آپ کو بھی علم ہوگا، کچھ زیادہ خراب
ضعفِ قلب کے باعث اکثر بے ہوشی کے طویل دورے
پڑتے رہتے ہیں۔ اور غشی کے عالم میں ان کے جسم کی بے حسی اس
درجہ بڑھ جاتی ہے کہ ان پر بے جان ہونے کا شبہ ہونے لگتا
ہے۔ ان کے اس موذی مرض کو صرف ہمارا خاندانی طبیب بخوبی
سمجھ سکتا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ نواب صاحب پر واقعی
اس دورے کا حملہ ہو گیا ہے تو میں فوراً اس معالج کو اُن
کی خبر گیری کے لئے بھیج دوں۔ کیونکہ دوسرا کوئی شخص انہیں
آسانی سے ہوش میں نہیں لا سکتا۔ لیکن یہ تدبیر صرف اسی
حالت میں ممکن العمل ہے جب مجھے یہ پتہ چل جائے کہ میرے
عزیز شوہر اس وقت کہاں اور کس حال میں ہیں۔

ان کی گمشدگی کی مختصر روداد یہ ہے کہ پچھلے جمعہ
کی شام کو وہ کلب کے ارادے سے روانہ ہوئے اور آج
منگل کی صبح تک نہیں لوٹے۔ میں نے کلب کے منتظمین اور دوسر
اراکین سے دریافت کرانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ مجھے
صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ وہ اس شام اس جگہ پہنچے
ہی نہیں۔ اور نہ اس کے بعد جا سکے۔ میں نے ہر طرف سے
مایوس ہو کر اپنی ایک خادمہ کو کل شام آپ کے دولت کدہ
پر بھیجا۔ مگر افسوس ہے کہ دربان نے باہر کے باہر ہی یہ کہہ کر
ٹال دیا کہ جاؤ نواب صاحب یہاں نہیں آتے۔ ٹھیک ہے۔
دربان کو ان نجی معاملات کا علم کیسے ہو سکتا ہے۔

اس سے قبل کہ میں ان کی روپوشی کا معاملہ محکمۂ
پولیس کے حوالے کرتی میں نے مناسب سمجھا کہ اس حقیقت
حال کو آپکے علم میں لا کر آپ سے بھی استصواب رائے کر لوں۔
ممکن ہے آپ کوئی مفید مشورہ دے سکیں۔

آپ یقیناً تسلیم کرینگی کہ میں صرف واقعات کی پیچیدگی
سے مجبور ہو کر یہ سب کچھ کر رہی ہوں اور میرا منشا، ہرگز یہ نہیں ہے کہ
میرے عزیز شوہر فوراً میرے پاس آ جائیں۔ بلکہ فی الحال فقط یہ معلوم
کر لینا چاہتی ہوں کہ وہ خیر و عافیت سے ہیں یا نہیں۔

امید ہے کہ میری یہ جسارت آپکو ناگوار نہیں گذرے گی۔

جواب کی منتظر بیگم معصوم علی

مس جاں نثار کا خط بیگم معصوم علی کے نام

محترمہ، تسلیم

آپ کا خط ملا۔ مجھے کوئی بات ناگوار نہیں گذری بلکہ آپ سے ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے اس لائق سمجھا۔

اگر آپ نے نواب معصوم علی کو پچھلے جمعہ کی شام سے نہیں دیکھا تو یقین مانیے کہ آپ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہیں کیونکہ مجھے جمعرات کی شام سے ان کا انتظار ہے۔ ایک سابقہ ملاقات کے موقع پر انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ میرے ساتھ سوا سات بجے چلیں گے تاکہ سرسری معائنے کے بعد غریب لڑکیوں کے اس خیراتی ادارے کے لئے کوئی مناسب رقم دان کی جائے۔ وہ نہیں آئے اور میں انتظار کرتی رہ گئی۔

پچھلی ملاقات، جس کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا ہے، جوہری بازار میں ہوئی تھی۔ میں پہلے سے موتیوں کے ہار کی تلاش میں اس جگہ پھر رہی تھی۔ حسنِ اتفاق سے آپ کے عزیز شوہر مجھے مل گئے اور انہوں نے اپنے ذوقِ انتخاب سے میری مطلوبہ چیز خریدنے میں میری مدد کی۔ اس موقعہ پر زمرد کی ایک خوبصورت تیتری بھی نظر پڑی جسے میری معیت میں آپ کے عزیز شوہر نے آپ کی ساڑی میں لگانے کے لئے خرید لیا تھا۔ امید ہے آپ نے اس تیتری کو قبول کرتے وقت میرے حسنِ انتخاب کی داد دی ہو گی۔

جمعرات کی شام سے نواب صاحب کے تشریف نہ لانے پر میں سخت ناراض تھی۔ لیکن آپ کا خط پڑھ کر وہ برہمی پریشانی میں بدل گئی۔ اب آپ کے ساتھ ساتھ میرے دل میں بھی اس بات کی تشویش پیدا ہو گئی ہے کہ اس وقت وہ خدا جانے کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔ گستاخی معاف! اس پریشانی کی تھوڑی سی ذمہ داری خود آپ پر عائد ہوتی ہے۔ آخر آپ کو اپنے عزیز شوہر پر پورا اختیار کیوں نہیں ہے۔ اگر وہ صرف آپ ہی کی مرضی پر چلتے ہوتے تو اس وقت کسی دوسری جگہ رہنے کی بجائے آپ کے ساتھ ایک ہی سنگھاسن پر براجمان ہوتے۔ فرمایئے کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟

بہرحال اب نواب صاحب کی خیریت معلوم کرنے کے سلسلے میں ہم دونوں کی دلچسپی یکساں اور تقریباً ایک ہی نوعیت کی ہے۔ لہٰذا یہ طے کر لیا جائے کہ ہم دونوں میں سے جس کو بھی ان کے حالات کا علم پہلے ہو، وہ دوسری ہستی کو لاعلم نہ رہنے دے۔ امید ہے آپ یہ تجویز پسند فرمائیں گی۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی اس مشترکہ وجہِ پریشانی کا تھوڑا بہت حال معلوم ہوتے ہی آپ کو خبر کر دوں گی۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مطلع فرمایئے۔

نیازمند

(مس) جاں نثار

بیگم معصوم علی کا خط مس جاں نثار کے نام

مخلص بہن! تسلیم،

آپ کا محبت نامہ ملا۔ میرے دل کو کسی قدر ڈھارس ہو گئی۔ آپ کی اس تجویز سے مجھے سو فیصدی اتفاق ہے کہ ہم دونوں میں سے جس کو بھی میرے عزیز شوہر کے حالات کا علم پہلے ہو، وہ دوسری ہستی کو لاعلم نہ رہنے دے۔

کیا اس بات کی پسند رمانے میں ایک تیتری اپنی رمز بیشان کے ساتھ کچھ کم ہلاکت آفریں نہیں کہ جوہر شناس نے اسے زمرد کے ٹکڑے سے تراش کر بنایا۔ بے شک حسنِ انتخاب کے سلسلے میں آپ کی ژرف نگاہی تعریف سے مستغنی ہے۔ آج سے میں اس تحفے کو آپ ہی کا عطیہ سمجھنے لگی ہوں۔ شکریہ قبول فرمایئے۔

میں اچھی طرح ہوں امید ہے آپ بھی مع الخیر ہوں گی۔

بیگم معصوم علی کا خط مس جاں نثار کے نام

مخلص بہن! تسلیم۔

اگرچہ یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہم دونوں میں سے جس کو بھی میرے عزیز شوہر کے حالات کا علم پہلے ہو، وہ دوسری ہستی کو لاعلم نہ رہنے دے۔ مگر پھر بھی میرے بے قرار دل کو چین نصیب نہ ہوا۔ اور آج صبح وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی خادمہ کو

دوبارہ آپ کے عشرت کدے کی طرف روانہ کر دیا۔ حسبِ معمول دربان نے استقبال کیا مگر وہ ایک آوارہ روح کی طرح وہیں بھٹکتی پھری یہاں تک کہ اس نے نواب صاحب کو دوسری منزل کی ایک کھڑکی سے آپ کے ساتھ چمن کا نظارہ کرتے دیکھ لیا۔ وہ مجھ کو جگا کر اس امر کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر مجھے ابھی تک اس کی صداقت پر شک ہے۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ نواب صاحب کے تصور میں غرق رہنے کے باعث اس کی نگاہیں ہر چیز میں نواب صاحب کا جلوہ دیکھنے لگی ہوں اور اس نے جو کچھ دیکھا وہ فریبِ نظر کے سوا کچھ نہ ہو۔

دوسری توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس نے صرف مجھ کو مطمئن کرنے کے لئے دروغِ مصلحت آمیز سے کام لیا ہو۔ خدمت گار طبقے کی یہ تملق شعاری کون نہیں جانتا؟

خادمہ کی بات نہ ماننے کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اگر یہ عرضِ حال میرے عزیز شوہر اسنے دن کی غیر حاضری کے بعد آپ کے دولت کدے پر آ جاتے تو آپ حسبِ وعدہ مجھے ضرور مطلع کر دیتیں مگر آپ کا کوئی اطمینان بخش پیغام مجھے اب تک نہیں ملا۔ یعنی یہ۔ میں اس وقت عجب تذبذب میں مبتلا ہوں اس کا علم ہے آپ ہی مجھے نجات دے سکتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اولین فرصت میں کسی نہ کسی طرح میرے لئے سکونِ قلب کا سامان پیدا کر دیں۔

اب نہ میں حیرت سے ہوں نہ دل و دماغ مطمئن۔

مس جاں نثار کا خط بیگم معصوم علی کے نام

محترمہ بہن! تسلیم!

مبارک ہو۔ آپ کے نواب صاحب کافی تلاش و تجسس کے بعد آخر کار مل گئے اور آج صبح سے بخیر و عافیت میرے غریب خانے میں ہیں۔ صرف نقاہت باقی ہے۔ اس لئے میں نے روک لیا ہے اور حسبِ وعدہ آپ کو بلا تاخیر اطلاع دے رہی ہوں۔

ہوا یہ کہ جمعہ کی شام کو آپ کے پاس سے رخصت ہو کر گھر جانے کی بجائے اپنے ایک دوست کے گھر پہنچے جو عیاشی کی دنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ وہاں سے ان دونوں نے مضافات میں حسن آباد کا رخ کیا جہاں ایک مکان میں دو اینگلو انڈین لڑکیاں رہتی ہیں۔ ظاہراں کا پیشہ شریفانہ ہے لیکن درحقیقت وہ بھولے بھالے مردوں کو دامِ حسن میں پھنسا کر دادِ عیش دیتی ہیں۔ آپکے عزیز شوہر ان دونوں کو دیکھ کر ایسے لٹو ہوئے کہ بس وہیں گھوم کر رہ گئے۔ جب "دشمنِ ایمان و آگہی" اور "رہزنِ تمکین و ہوش" دونوں بیک وقت نگاہوں کے سامنے موجود ہوں تو بھلا دنیا و مافیہا کی خبر کیسے رہ سکتی ہے۔ گویا ہر شب شبِ برات ہے اور ہر روز روزِ عید کے مصداق آپ کے عزیز شوہر تین دن اور تین رات حسن و شباب کے طوفانی سمندر کی رنگین موجوں میں ڈوبے رہے اُدھر وہ بنا دلۂ صہبا میں مصروف رہے اور اِدھر میں اور آپ دونوں اُن کی خیر و عافیت معلوم کرنے کے لئے حیراں۔ یہاں تک کہ کار سازِ حقیقی کو یہ بات ناگوار گذری اور نواب صاحب پر ضعفِ قلب کے دورے پڑنے لگے جب ہوش میں آنے کی کوئی صورت ممکن نہ ہوئی اور صدہا قسم کے اندیشے دامن گیر ہونے لگے تو ان لونڈیوں نے کسی نہ کسی طرح میرے مکان کا پتہ معلوم کیا اور انہیں ایک گاڑی میں سوار کر کے یہاں بھیج دیا۔ میری پُرخلوص تیمارداری سے بہت جلد ان کے ہوش ٹھکانے آ گئے مگر اس وقت سے عجیب کیفیت ان پر طاری ہے۔ وہ اپنی اس حقیقت لغزش پر حد درجہ نادم ہیں اور محض اس خیال سے ان کو بار بار غش آنے لگتا ہے کہ آپ حقیقتِ حال سے واقف ہو کر ان کی بابت ایک بری رائے قائم کر لیں گی۔ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ میں اپنی شریکِ حیات کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا تاہم میں نے مصلحتاً بڑی کوشش سے انہیں اس بات کے لئے آمادہ کر لیا ہے کہ وہ صداقت کے چہرے پر نقاب ڈال کر آپ سے یہ کہدیں کہ میں اس اثناء میں بوجہ علالت مس جاں نثار کے مکان پر مقیم رہا ہوں۔ انہیں یقین ہے۔ اس صورت میں آپ کو کسی قسم کا اعتراض نہیں ہو گا۔ کیونکہ مجھ سے واقف ہونے کے باعث مجھ پر ہر قسم کا بھروسہ کر سکتی ہیں۔

میں نے یہ تمام باتیں اس لئے لکھ دیں کہ میں ذاتی طور پر آپکو تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتی لیکن پھر بھی پوری تاکید کے ساتھ میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ اصل روداد سے واقف ہونے کے باوجود ان پر یہ ظاہر نہ کریں کہ گویا آپ کو ان کی رنگ رلیوں کا علم ہے اس لئے کہ انکشافِ راز ان کے اندر

انجام کار آپ کے حق میں مضر رہے گا۔ آپ سیدھے سادے ان کی دلجوئی کرنے میں مصروف ہو جائیں اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لائیں تو زیادہ مناسب ہے۔

اُمید ہے آپ خیریت سے ہونگی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مطلع کیجے۔

مس جاں نثار کا خط بیگم معصوم علی کے نام

محترمہ بہن السلام!

عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ آپ کے نام خط لکھنے کے فوراً ہی بعد آپ کا گرامی نامہ جو آپکے دلی جذبوں کی اضطراری کیفیات کا حامل ہے، میرے مطالعہ میں آیا۔ اس میں شک نہیں کہ آپکے عزیز شوہر جیسا کہ میں پچھلے خط میں لکھ چکی ہوں آج صبح سے میرے غریب خانے پر مقیم ہیں لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ آپ کی خادمہ نے ان کو دوسری منزل کی ایک کھڑکی سے میرے ساتھ چمن کا نظارہ کرتے دیکھا لیکن بات یہ ہے۔ وہ ضعف و نقاہت کے باعث ہرگز اس لائق نہیں ہیں کہ سیڑھیاں طے کر کے دوسری منزل تک جا سکتے اس لئے مجبوراً منزلِ زیریں ہی میں قیام پذیر رہے۔ مجھے اس سلسلے میں آپ کی رائے سے بالکل اتفاق ہے کہ اتنی دیر تک ہی تصور میں غرق رہنے کے باعث آپ کی خادمہ کی نگاہیں ہر جگہ میں نواب صاحب کا جلوہ دیکھنے لگی ہوں اور اس نے جو کچھ دیکھا، وہ فریبِ نظر کے سوا کچھ نہ ہو۔ میری بابت آپ کا یہ اعتماد کہ اگر آپ کے عزیز شوہر میرے غریب خانے پر آ جاتے تو میں حسبِ وعدہ آپ کو ضرور مطلع کر دیتی، ہرگز بے بنیاد نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے ان کے آتے ہی کسی قسم کی لاپروائی برتے بغیر اپنی اولین فرصت میں آپ کو پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

اگر آپ اپنی خادمہ سے ذرا دھمکا کر باز پُرس کریں تو شاید وہ اپنی دروغگوئی کا اعتراف کر لے۔ بے شک اس طبقے کے لوگوں کی کسی بات پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہمیشہ بات کا بتنگڑ بنا دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔

آپکے عزیز شوہر دو گھنٹے بعد آپ کی خدمت میں پہنچ جائینگے۔

اطمینان رکھیں۔ ابھی ابھی ان کو تقویت کا انجکشن دیا گیا ہے اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق انہیں دو گھنٹے سے قبل بستر سے اُٹھنا نہیں چاہیئے۔

اُمید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مطلع کیجئے۔

بیگم معصوم علی کا خط مس جاں نثار کے نام

مخلص بہن تسلیم!

میں بے حد خوش ہوں کہ میرے عزیز شوہر پانچ دن چھ گھنٹے اور اکیس منٹ کے بعد مجھ سے دوبارہ آ ملے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ میں آپ کی رہینِ منت ہوں، خصوصاً آپ کی تیمارداری کی۔ اس دفعہ غیر معمولی طور پر انہیں بہت جلد افاقہ ہو گیا۔ البتہ کمزوری ابھی باقی ہے۔ وہ بھی دور ہو جائیگی۔

وہ اپنی بے راہ روی پر کافی منفعل ہیں۔ شرم کے باعث میرے سامنے آنکھیں نہیں اُٹھا سکتے تاہم میں اُن کی دلجوئی کی پوری کوشش کر رہی ہوں۔ آپ کی ہدایات کے مطابق میں نے ایکٹرسوں اور لڑکیوں کے سلسلے میں کوئی جواب طلب نہیں کیا حتّٰی کہ اشارتاً بھی اُن کا ذکر نہیں چھیڑا۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ بھی ان تمام واقعات کو جو تا بداں تک سوہانِ روح بنے ہوئے ہیں، ہمیشہ کے لئے بھول جائیں۔

میں آپ کی بتائی ہوئی ایک اور بات پر اس وقت اچھی طرح غور کر رہی ہوں بے شک۔ اپنے عزیز شوہر پر مجھے پورا اختیار حاصل ہونا چاہیئے۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی ان کو تنہا باہر جانے نہیں دونگی وہ جب بھی گھر سے نکلیں، میں سائے کی طرح اپنے ساتھ رہا کرونگی۔ غالباً آپ بھی میری اس دوراندیشی کو پسند کریں گی۔

مجھے آپکی تحریر پر کامل اعتماد ہے اسلئے خادمہ سے مزید استفسار کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ اگر وہ جھوٹ بولی تو اسکا دین و ایمان جانے اسکا کام۔ اور ہاں زمرد کی تیتری، جو حقیقتاً مجھے بھی پسند ہے آپکو تحفۃً بھیج رہی ہوں کیونکہ خریدنے کے وقت وہ آپ کو بھی پسند آئی تھی۔ براہِ نوازش اسے قبول فرما لیجئے۔ میں اسکے بغیر بھی آپکے حُسنِ انتخاب کی قائل رہونگی۔ میں اچھی طرح ہوں اور آپکو یاد کرتی ہوں۔

تجاہل

ناگہاں اُس سے ملاقات ہوئی!
لوگ آتے ہیں، چلے جاتے ہیں
ریشم و اطلس و کمخواب کے ملبوس حسیں
فرش مرمر پہ گھسٹتے ہوتے، بہتے ہوئے، لہراتے ہوئے
نکہت و نور کا ایک سیل رواں!
سیمگوں شانوں پہ بکھری ہوئی زلفوں میں مہک
تمتماتے ہوئے گلنار سے ہونٹوں میں مہک
گرم سانسوں میں مہک!
اور میں زیست کے ہنگاموں سے اکتایا ہوا
بیٹھا رہتا ہوں کسی گوشے میں
میز پر کہنیاں ٹیکے ہوئے، خاموش، ملول!
جب تھرکتے ہوئے نغمات کے زیر و بم پر
ناگہاں اوس سی پڑ جاتی ہے
ہونے لگتا ہے صداؤں میں تموّج پیدا
میرا احساس کسی ہمدم دیرینہ کو
ڈھونڈتے ڈھونڈتے سو جاتا ہے!
ناگہاں اُس سے ملاقات ہوئی!
میں تو پہلی ہی نظر میں اُسے پہچان گیا
وہی ہلتے ہوئے پر پیچ سنہری گیسو
وہی بھیگی ہوئی آنکھوں میں گلابی ڈورے
وہی رفتار میں خاموش متانت کا غرور
"کیا خبر تھی کہ ہماری صحبت
چند دیرینہ روایات کا پرتو ہوگی
میں تو اک رہرو درماندہ تھا
پھر بھی دل کو تری تسکیں تھی تمہارے دم سے
مجھے اکثر یہ خیال آتا ہے
جانے کیوں ہم میں رفاقت نہ بڑھی
زندگی یوں بھی بہر طور گذر ہی جاتی
اسقدر بار نہ ہوتی لیکن!
میں تو تنہائی کا عادی ہوں، یہ شبہائے طویل
میری خلوت کو پر اسرار بنا دیتی ہیں
اور میں دیکھتا رہتا ہوں وہ مبہم نغمے
سائے بن بن کے فضاؤں میں جو تھراتے ہیں
میں یہاں بیٹھا ہوا سنتا رہوں گا پیہم
انہی نغمات کے تانے بانے!"
جب میں اُٹھتا ہوں تو مبہوت نگاہوں کا فسوں
میرے پیروں کو جکڑ دیتا ہے
تجھے احساس نہ تھا
سنو! اِس کا ذرا بھی مجھے احساس نہ تھا!"
اور پھر ایک جماہی لے کر
"ہاں تمہیں مجھ سے محبت تو نہیں ہو سکتی!"
آہ! کب تک میں یہاں بیٹھا رہونگا یونہی
میز پر کہنیاں ٹیکے ہوئے خاموش، ملول!
رات ڈھلنے لگی، ہنگامے سیہ پوش ہوئے
اب یہاں کوئی نہیں
جاؤ، کہہ دو کہ یہاں کوئی نہیں
کیوں کھڑے تکتے ہو، کہہ دو کہ یہاں کوئی نہیں!
یہاں ویرانی ہی ویرانی ہے!!

خلیل الرحمٰن

نئے اور بہترین افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
چھمی	عصمت چغتائی	عہ/
ننگا پاؤں	سید محمد اختر	۱۲/ عہ
انوکھی مصیبت	حیات اللہ انصاری	۱۲/ عہ
منزل	علی سردار جعفری	عہ
پہچانئے خدا	کرشن چندر	عہ/
نئے محل	ظفر قریشی	۱۲/
وسوسے	وصال حق قریشی	۱۲/
انارکلی اور بھول بھلیاں	اختر اورینوی	
چاندی کے تار	مہندر ناتھ	
نئے پرانے	سہیل عظیم آبادی	
ٹوٹے ہوئے دل	رام پرتاپ بہادر	۸/
جلوۂ رنگیں	ڈاکٹر نصیر الدین	سے
نئے افسانے	مرتبہ کرشن چندر	للعہ
پرواز	شفیق الرحمن	سے
لہریں		سے
آئینے	سراج الدین ظفر	۱۲/ عہ
شاعر اور چٹان	پرتھوی ناتھ شرما	۱۲/ عہ
سراب	مجنوں گورکھپوری	سے
منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو	للعہ
نوک جھونک	کوثر چاندپوری	عہ
ناسور	اوپندر ناتھ اشک	۱۲/
کھیل	خدیجہ مستور	عہ
زرد چہرے	ابراہیم جلیس	عہ
افسانچے	علامہ کیفی	
صبر و ضبط	حسن عزیز جاوید	
ساز مظفرت	″	
بلقیس	صادق الخیری	
سفینے	مترجمہ صادق الخیری	۸/
الحدیات	شوکت تھانوی	عہ

اسلامی و سیاسی کتب

کتاب	مصنف	قیمت
مولانا عبید اللہ سندھی، حالات، تعلیمات، سیاسی افکار	ایڈیٹر پروفیسر محمد سرور	للعہ
شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ	از مولانا عبید اللہ سندھی	
شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک		۱۲/
خطبات مولانا عبید اللہ سندھی	مرتبہ پروفیسر محمد سرور	
امام ربانی مجدد الف ثانی کی سوانح حیات اور ان کا نظریۂ وحدت شہود		۱۲/
قرآنی دستور انقلاب	از مولانا عبید اللہ سندھی	
مضامین ابو الکلام آزاد دو حصوں میں		
مضامین اسلام		سے
مقالات الہلال		
خطبات آزاد		سے
مضامین الہلال		
مسلمان عورت	ترجمہ مولانا ابو الکلام آزاد	
مقالات جمال الدین افغانی		
ہمارے ہندوستانی مسلمان		
مسلمانوں کا ماضی، حال، مستقبل		
چشمۂ کوثر / رود کوثر — مسلمانوں کی علمی مذہبی تاریخ	از اکرام آئی سی ایس	سے
مسلمانوں کا روشن مستقبل		عہ
مقالات محمد علی مرحوم دو حصوں میں		
حیات مفتی محمد عبدہ		عہ
اسلام کیسے پھیلا		سے
عہد حاضر کے بڑے لوگ مکمل		للعہ
اسلام کے معارف		
مقالات اسلم	مولانا اسلم جیراجپوری	سے
مضامین جمال الدین افغانی		۸/

محصول ڈاک بذمہ خریدار!

ملنے کا پتہ

سندھ ساگر اکادمی لاہور

ابن سعید

عتّو

اور پھر عتّو تو پیدا بھی اس کے سامنے ہی ہوا تھا۔

اس کو وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب اس کی چچی پہلی دفعہ دلی آئی تھیں۔ اس کے چچا نے جو کہ باہر کسی شہر میں کالج کے پروفیسر تھے اپنے پیسے سے باہر ہی شادی کر لی تھی جس کی وجہ سے گھر کے لوگ کچھ ناخوش سے ہو گئے تھے۔ اور اسی لئے جب وہ اپنی بیوی کو لے کر پہلی دفعہ دلی آئے تو ایک اودھم سا مچ گیا تھا۔

شمیمہ کو ابھی بھی یہ تو پوری طرح یاد نہ تھا کہ وہ اودھم کس بات پر مچا تھا۔ لیکن سارے کنبے میں جو ایک بے چینی ان کے آنے پر اور املی والی حویلی میں ٹھہرنے پر مچی تھی وہ اس کو تھوڑی یاد تھی۔ اور جلدی ہی اس کی چچی کے مزاج کی برائیاں سب بڑے بوڑھے کرنے لگے تھے۔ اور حالانکہ اُن کے ہونٹ ہر وقت ایک دھیمی سی مسکراہٹ سے کھلے رہتے تھے۔ اور وہ بات بھی نہایت ہی ملائم لہجے میں کرتی تھیں۔ پھر بھی لوگ ان کو بدمزاج اور تنک چڑھا ہی کہتے تھے۔ اور شمیمہ کو خیال آتا کہ شاید ان کو بدمزاج سمجھنے کی وجہ ان کی شکل تھی۔ جہاں تک اس کو یاد تھا جب وہ دلی آئی تھیں تو ان کی شکل کافی اچھی تھی۔ کم از کم اپنی تمام دیورانیوں جٹھانیوں سے تو بہتر ہی تھی۔ اس کو ابھی ان کی ہی شکل اچھی طرح یاد تھی۔ گو کہ اب وہ مر چکی تھی لیکن پھر بھی ان کا پکا کالا رنگ اور سوئی سی ناک جو ان کے چہرے پر بہت ہی اوپری معلوم ہوتی تھی اس کے ذہن میں اب تک ویسی ہی بسی ہوئی ہے۔

اور ایک بات تو اُسے اپنے بچپن کی اور بھی اچھی طرح یاد تھی۔ جب کبھی بھی وہ کھانا کھانے بیٹھتی اپنی انّا کے ہاتھ سے تو اَن کی امّاں آ بیٹھتی۔ اور خواہ مخواہ یہ چاہتیں کہ وہ ان کے ہاتھ سے کھانا کھائے۔ ان کی اس بات پر اُن پر تو ضد سوار ہو جاتی تھی۔ اور وہ زمین پر سے طرح مچل جاتی تھی۔ اور پھر لاکھ خوشامدوں اور منتوں کے بعد بھی اپنی انّا کے ہاتھ سے ہی کھانا کھاتی۔ اور اس کی ماں بیچاری اس کو غصے میں گھورتی رہتی۔ ان کی نظریں کچھ بھیگی بھیگی سی معلوم ہونے لگتیں۔ لیکن وہ صاف صاف اُن سے کہہ دیتی کہ اگر وہ ان کے ایسے کالے ہاتھ سے کھانا کھائے تو اس کا کھانا بھی کالا ہو جائے۔ اور پھر شاید اس کا اپنا رنگ بھی اتنا ہی کالا بھٹ ہو جائے!

پر اب جبکہ اس کی امّاں مر چکی تھیں یہ بات یاد کر کے کچھ افسوس سا ہونے لگتا تھا۔ لیکن پھر بھی ابھی وہ یہ بات مانے کو تیار نہ تھی کہ عتّو کی اماں کی شکل اس کی اپنی اماں کی شکل سے خراب تھی۔ اور اس کو یقین تھا کہ صرف یہی وجہ تھی کہ سارے سسرال والے ان کے پہلی دفعہ دلی آنے کے موقعے پر کچھ بے چین سے ہو گئے تھے۔ اور جلد ہی ان کی بدمزاج ہونے کی خبریں ہر طرف پھیلنی شروع ہو گئی تھیں۔

جب وہ دلی آئی تھیں تو ان کے ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ بڑا لڑکا ـــ جس کو سب پیار سے رفو کہتے تھے اور آج تک بھی شمیمہ کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا اصلی نام کیا تھا ـــ عمر میں کچھ اس کے ایسے ہی برابر تھا۔ لیکن پھر دلی آنے کے چند روز بعد ہی اس لڑکے کو ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ اور وہ پلنگ پہ پڑے ہی پڑے مر گیا تھا۔ شمیمہ کو یاد تھا کہ اس واقعہ پر اس کی چچی کی رنگت کتنی پیلی پڑ گئی تھی۔ ان کی آنکھوں کے کنارے پر شرخی کی لکیریں سی بن گئی تھیں۔ اور رونے کی وجہ سے وہ آنکھیں سوج سی گئی تھیں۔ اور ان کے کانوں کی لَویں تمتما اٹھی تھیں ـــ اس کو اپنی چچی کی اس حالت پر بہت رحم آتا تھا۔ اور جتنی دفعہ وہ ان کو دیکھتی اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر رونے لگے۔ اور پھر اس کا اپنا رنج اس لئے اور بھی بڑھ گیا تھا کہ ایک آدھ بار اُس نے اپنی چچی اور امّاں کو باتیں کرتے سنا تھا کہ وہ لوگ رفو سے اس کی بات ابھی سے ہی پکی کر دینا چاہتے تھے۔ اور حالانکہ اس کی عمر ابھی پندرہ کی بھی پوری نہ ہوئی تھی۔ لیکن سارے رشتہ داروں کو تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کا بڑھاپا آ گیا تھا اور رحم برسنے لگتے تھے۔ اس کو دیکھ دیکھ کر خواہ مخواہ شادی بیاہ کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ اور کھسر پھسر شروع ہو جاتی۔ اس سے چھپ چھپ کر دھیموں سے باتیں ہوتیں۔ جو خواہ مخواہ کسی بھی موقع پر جب اُن کو گھر میں گھس آنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس کے سامنے سرگوشیاں ہونے لگتی تھیں۔ اور وہ بہت ہی [illegible] شروع ہو جاتی۔ لیکن کوئی اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ اس کو یہ سب

باتیں بُری معلوم ہوتی تھیں۔ گو کہ کھلم کھلا وہ کسی پر یہ بات ظاہر نہ کرتی کہ اسے کہاں باتوں میں ایک طرح کی دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ پر جب وہ چھپ چھپ کر اس قسم کی باتیں سنتی تو اس کے دل میں گدگدیاں سی ہونے لگتیں۔ اور جیسے کوئی نوخیز لڑکی جو اس کے اندر بیٹھی ہوئی تھی، آپ ہی آپ مسکرا اٹھتی تھی۔ اس کو اس مسکراہٹ میں کسا مزہ آتا تھا جیسے وہ کوئی مزیدار چیز کھا رہی ہو۔ یا جیسے کوئی مزیدار سی کہانی سُن رہی ہو ــــ اور بس اس خیال سے اس کو رفو کا مرجانا بہت بُرا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا دل کچھ بیٹھ سا گیا تھا۔ اور وہ چاہتی تھی کہ وہ بھی اپنی چچی کے ساتھ سُر ملا کر رونے لگے۔

ــــــــ لیکن پھر جلدی ہی وہ رفو کو بھول گئی تھی۔ کیونکہ دراصل اس نے رفو کو دیکھا ہی اتنے تھوڑے عرصے کیلئے تھا۔ اور اس کی حرکتیں بھی کچھ وحشیانہ سی تھیں۔ وہ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں سے سُست سُست قدم ڈالتا ہوا ایک دم سے گھر میں گھس آتا۔ اور کسی پلنگ کی پائینتی اور ادوائن پر بیٹھ جاتا۔ اور ادوائن اس کے بوجھ سے ٹوٹ جاتی۔ اس پر وہ ایک بھاری سی سخت آواز میں ہنسنے لگتا۔ اسکی آواز بعض دفعہ تو بالکل ڈراونی سی بن جاتی تھی۔ اور اس کو گھن سی آنے لگتی تھی۔

اس کے بعد چچا اپنی ملازمت چھوڑ بیٹھے تھے۔ اور آن کے دلی میں ہی بس گئے تھے۔ اس کی وجہ سے شبنم کو بھی اپنی چچی کو دیکھنے کا کافی موقع مل جاتا تھا۔ اور وہ روز بروز اس کو اور بھی زیادہ اچھی لگتی چلی جاتی تھی۔

جب وہ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے اپنے سنگھار میں لگ جاتی تھی تو بھی وہ کسی نہ کسی بہانے سے اندر گھس جاتی تھی۔ اور خاموشی سے ان کو سنگھار کرتا دیکھتی رہتی۔ جیسے کوئی کسی خوبصورت سے بُت کو دیکھ کر اس کے گھڑنے والے کے متعلق سوچتا رہ جائے۔ اور وہ خاموش کھڑی ان کو دیکھتی رہتی۔ وہ اپنے کپڑے اُتار دیتیں۔ ان کے جسم کے سب خم اور اُبھار کمرے کی مدھم سی روشنی میں کچھ مدھم سے پڑتے اس کو نظر آنے لگتے۔ اور اس کی چچی کو اپنے بناؤ سنگھار کا شوق بھی بہت تھا۔ اور پھر کپڑے بدلنے میں بعض دفعہ انکی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک سی آ جاتی۔ کوئی چنگاری جیسے آن کے ان کی آنکھ کے کونے میں بیٹھ گئی ہو۔ اور یہی چھوٹی سی چنگاری اس کو مسحور سا کر دیتی۔ بلکہ وہ اس کو دیکھ کے سہم سی جاتی۔ اور وہ ایک لمحہ کیلئے چاہتی کہ اس کمرے کے چاروں طرف کے دروازے ایک دم سے کھل جائیں۔ اور اس کو چین حاصل ہو! ــــ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چنگاری اس کی چچی کی آنکھ میں سے نہ معلوم کہاں غائب ہو جاتی جیسے ان کی بھیگی بھیگی پلکوں نے اس چنگاری کو بجھا دیا ہو۔ اور وہ اپنے کپڑوں کی الماری کھول کے اس سے رائے پوچھنے لگتیں کہ وہ کونسا دوپٹہ اوڑھیں۔

ــــــــ نہ جانے اپنی چچی کی موجودگی میں اس کو یہ احساس کیوں ہونے لگتا تھا جیسے وہ کسی انسان کے سامنے نہیں بلکہ انسان سے بھی کسی بڑی پیکر کے سامنے آگئی ہو۔ وہ ان سے پوری طرح آنکھ بھی نہ ملا سکتی۔ جیسے ان کی ہر چیز میں ایک بڑائی سی پیدا ہو گئی ہو۔ کوئی چیز بھی اُن کی ہو جانے کے بعد اونچی ہو جاتی اس کی پہونچ سے باہر ــــ پر اس احساس کے باوجود بھی وہ ان کی موجودگی میں خوش سی رہتی۔

جیسے ہی اس کو اپنے کام سے فرصت ملتی وہ چھت پر پہنچ جاتی۔ اس کے اپنے مکان کی چھت اور چچی کے اپنے والے مکان کی چھت کے درمیان ایک نیچی سی دیوار تھی۔ جس میں چھوٹے بڑے کتنے ہی طاق بنے ہوئے تھے۔ جن کے درمیان سے اینٹیں نکلی ہوئی تھیں۔ ان طاقوں میں سے وہ دن دن بھر جھانک سکتی تھی۔ اور ایک چھوٹا سا کھڑکی کے برابر اونچا دروازہ بھی اس دیوار میں لگا ہوا تھا۔ جو کھولنے بند کرنے پر کھوڑا سا چرچرا اٹھتا تھا۔ وہ اس سلیٹی سے رنگ کے دروازے میں سے گذر کر دوسرے مکان کی چھت پر کود جاتی۔ دوسری چھت اس کے مکان کی چھت سے کوئی دو ڈیڑھ فٹ نیچی تھی۔ اور پھر جب وہ چچی کے مکان کے زینے کی اونچی نیچی سیڑھیاں آہستہ قدموں سے طے کرنے لگتی تو ایک دم سے اس کو خیال آتا کہ نہ معلوم چچی کو اس کا آنا پسند بھی آئے گا یا نہیں۔ اور اسی سوچ میں وہ زینہ طے کر لیتی۔ وہ بعض دفعہ سوچتی بھی کہ واپس بھاگ جائے لیکن اس کے قدم آپ ہی آپ آگے بڑھتے چلے جاتے اور جب وہ نیچے پہنچ جاتی تو اس کی چچی کی وہی سنجیدہ سی مسکراہٹ اس کا استقبال کرتی۔ اور وہ پوری طرح سمجھ بھی نہ پاتی کہ چچی نے اس کے آنے کو واقعی پسند بھی کیا یا نہیں ــــــ؟

اور پھر ایک رات اس کو اچھی طرح یاد تھی۔ اس کو یاد تھا کہ اس کی عمر کی وجہ سے نہ تو اس کو بچوں میں شمار کیا جاتا اور نہ بڑوں میں!

بچے اس کو اپنے ساتھ کوئی کھیل نہ کھیلنے دیتے کیونکہ وہ جلد ہی ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیتی تھی۔ اور اگر بالفرض وہ کھیلنے بھی لگتی تو اس کی نانی کی گھنی سی سفید بھویں سکڑ جاتیں۔ اور ان کے ہونٹ ایک چھپی ہوئی سی نفرت کے ساتھ کونوں پر سے جھک جاتے اور آخر اس کو جھلا کر اپنا کھیل چھوڑنا پڑتا۔ لیکن بڑوں میں تو اس کا نباہ بھی کدر نہ تھا۔ وہ لوگ اگر باتیں کر رہے ہوتے تو اس کو دور رہنے کا اشارہ مل جاتا۔ اور اس کو وہاں سے ہٹ جانا پڑتا۔ کسی کی شادی بیاہ کی بات چیت ہوتی تو نہ اسے بڑی عورتوں کی طرح رائے دینے کی اجازت ملتی اور نہ ہی بچوں کی طرح ان باتوں کو آزادی سے سننے دیا جاتا۔ اور پھر جب وہ اس رات کو سونے لیٹی تھی تو اس نے سنا کہ اس کی نانی اور بڑی بہن جو بیوہ تھی برابر والے کمرے میں آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ اس نے جھانک کر دیکھا تو اس کی چچی کے ہاں کی بڑھیا ماما آئی ہوئی تھی۔ جس کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک گھاؤنے سے رنگ کا پان جما رہتا تھا۔ اس نے کان لگا کر سننا شروع کر دیا تھا۔ جب وہ اپنی نانی اور ماما کی کھسر پھسر سن چکی تو اس کے پیٹ میں یونہی دوڑ سے سرور ہو گئے پلنگ پر لیٹے لیٹے ہنس دی۔ آہستہ سے۔ اور پھر سنجیدگی سے ان باتوں پر سوچنے لگی تھی۔

اور جب رات کو کوئی تین چار بجے اس کی آنکھ کھلی تھی تو اس نے دیکھا تھا کہ اس کی نانی اور بہن کا پلنگ خالی پڑا تھا۔ اور سبب اور کھڑکر وہ جیت بڑتے ہو کر اپنی چچی کے مکان میں در آئی تھی۔ اور وہاں وہی بڑھیا بڑھیی ہوئی تھی جس کی اس کو امید تھی۔ چچی نے بڑھیا ماما جس کی آنکھیں ساری رات جاگتے رہنے کی وجہ سے سوجی سی لگی تھیں اور ان میں جیسے بھر گیا تھا اپنے ہونٹوں پر پان کے زیادہ گہری دبی مسکراہٹ لا کے کہنے لگی تھی۔

"بھائی ہوا ہے!" یعنی اس کی چچی کے ہاں لڑکا ہوا تھا۔ اور جب اس نے جھلی کی سلاخوں دار کھڑکی میں سے جھانکا تو اس نے دیکھا کہ چچی پلنگ پر سمٹی سمٹائی پڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں اور چہرے سے تھکن اور کمزوری معلوم ہو رہی تھی۔ اور اس کے ہونٹ خاموش سے تھے۔ ان کے پلنگ کی پائینتی اس کی بڑی بہن بیٹھی ہوئی تھیں۔ جو سلاخوں میں سے اس کو صاف نظر آ رہی تھیں۔ اور ایکدم سے اس کا جی چاہا تھا کہ وہ سلاخوں دار کھڑکی چھوڑ کے الگ دھاکے کے ساتھ دروازہ کھول دے۔ اور اندر چلی جائے لیکن پھر وہ آہستہ سے سلاخوں دار کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر واپس اپنے پلنگ پر سمٹ گئی تھی۔

"بھائی ہوا ہے تمہارے! — ننھا سا بھائی — !" صبح سویرے اس کی نانی نے اس کو جھنجھوڑ کر جگاتے ہوئے کہا تھا۔

"معلوم ہے ہمیں" اور وہ کروٹ لے کر پھر سونے لگی تھی۔

"اوئی بیٹی۔ معلوم ہے!" نانی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تھیں جیسے وہ اس کی بات کا برا مان گئی ہوں۔ گویا وہ خواب میں پڑی پڑی بہک رہی تھی۔ اور اس کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ اچھا ہے کسی کو یہ سا با چلے کہ اس کو اپنی چچی کے اس نئے اضافے کا پہلے سے ہی پتہ تھا۔ اور جیسے وہ کچھ جانتی ہی نہ ہو۔

جلدی جلدی ناشتہ کر کے وہ بھاگی بھاگی چچی کے ہاں پہنچی تھی۔ چچی رات بھر کے جاگنے کے بعد سو رہی تھیں۔ ان کا سانس جلدی جلدی آ جا رہا تھا۔ اور ایک بھاری سی دھمک ان کے سینے ہی سے سنائی دے رہی تھی۔ اور نتھنوں کے ذریعے پھنکارے مارتی ہوئی یہ دھمک باہر نکل جاتی تھی — اور اس وقت اس کو اپنی چچی اور بھی اچھی لگی تھیں۔ جیسے ان پر لوگ ظلم کرتے رہے ہوں۔ اور اب وہی ایک انسان تھی جو ان پر رحم کھا رہی تھی۔ چچی کے قریب ہی بچہ اپنی آپا کی پرانی قمیص کے سلے ہوئے ہلکے نیلے رنگ کے ڈھیلی ڈھیلی آستینوں والے کرتے میں پڑا ہوا سو رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ اور اس کا چہرہ سرخ اور گلگلا تھا۔

"کیا نام رکھا جائے گا اس کا؟" اس نے بچے کے ہونٹوں پر اپنی انگلی آہستہ سے رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"عتیق۔ اور کیا — اس کے دادا کے بھائی کا بھی یہی نام تھا" اس کی نانی تحکمانہ سے لہجے میں بولی تھیں۔

اور اس گلگلے چہرے والے بچے کا نام عتیق رکھ دیا گیا تھا۔ نانی اماں کے اصرار پر اس کو پیار سے عتو کہا جانے لگا۔

اور اب بھی جبکہ عتو پندرہ سولہ برس کا ہو گیا تھا اس کو عتو کا پیدا ہونا اچھی طرح یاد تھا۔ آج بھی وہ اس کو اسی طرح اس ہلکے نیلے رنگ کے کرتے میں دیکھ سکتی تھی۔ آج بھی اسے وہ گلگلا گلابی گول چہرہ اچھی طرح یاد تھا۔ اور آج بھی اسے وہ رات اچھی طرح یاد تھی اور شاید اسی وجہ سے اس کو اپنے خیالات اور بھی مضحکہ خیز معلوم ہو رہے تھے۔

لیکن اس نے سوچا کہ صرف اتنے سے عرصے میں دنیا کس قدر بدل گئی۔ بالکل معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہی دنیا ہے۔ وہی جگہ ہے جس میں وہ آزادانہ طور پر رہا کرتی تھی۔ اب تو ہر وقت ایک طرح کی گھٹن کا احساس اس کو گھیرے رہتا تھا۔ جیسے جسم کے اندر ہی اندر کسی چیز کو دبایا جا رہا ہو، کچلا جا رہا ہو۔ آہستہ آہستہ۔ اور اس کو اس کی دھمک بھی تو سنائی دے رہی تھی۔ آج تک بھی اس کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ شروع شروع میں کئی رشتے آئے بھی تھے۔ لیکن نہ جانے اس کے ابا کو اماں کے مر جانے کے بعد کیا خبط ہو گیا تھا کہ ہر ایک سے کہہ دیتے تھے

"ابھی تو بیچاری بچی کے پڑھنے پڑھانے کے دن ہیں۔ شادی کے قابل ہو جائے گی تو دیکھا جائیگا۔"

اور رشتے آنے بند ہو گئے۔ آج تک بھی وہ کنواری ہی بیٹھی تھی۔ جیسے وہ دن ابھی گئے ہی نہ تھے۔ کاش وہ دن نہ چلے جاتے اب تو کچھ عرصے سے یہ خیال ہی جیسے کسی کو نہ ہوتا تھا۔ کہ اس کی بھی شادی ہو سکتی ہے۔ یا اس کو بھی شادی کرنے کی ضرورت ہے۔

اب تو اس قسم کی زندگی کی اُسے عادت سی ہو گئی تھی لیکن شروع شروع میں شمیمہ کو اس سے کافی بے چینی رہی تھی بعض دفعہ تو وہ اپنی شادی کے متعلق سوچ سوچ کر گھبرا اٹھتی تھی۔ پر اب وہ بغیر گھبرائے یا پریشان ہوئے وہ کافی کافی دیر سوچتی رہتی کہ آخر اس کے بھی رشتے کیوں نہیں آتے۔ اس کی بھی شادی کیوں نہیں ہوتی۔

چپکے ہی چپکے وہ اپنے سے باتیں کرتی رہتی۔ ہاتھ اس کے لگے ہوتے باورچی خانہ میں ہنڈیا کھوئے میں یا کپڑے دھو کر انگنی پر لٹکانے میں۔ اور دماغ میں اس کے وہی کھد بد مچی رہتی جو اس کے ساتھ چوبیسوں گھنٹے رہا کرتی تھی۔ پر اب تو گویا وہ کھد بد ایک ہی رفتار سے بہے جا رہی تھی۔ اس دھمک میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔۔۔ وہ چڑھتی ہی تھی نہ اترتی ہی تھی۔ اور اسی وجہ سے بعض دفعہ اس کو اس کھد بد کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہوتا — اور سب لوگ کہتے، وہ کتنی خاموشی سے اپنے کام میں لگی رہتی

—

۔۔۔ اور اس تمام عرصے میں چنو کی شادی ہو گئی۔ جو اس کی ماموں کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور جس کو سب بچپن سے کلو کہا کرتے تھے کیونکہ اس کا رنگ کافی سانولا تھا۔ اور اس کے گلے اور ٹھوڑی کا گوشت اتنا موٹا تھا کہ جب وہ خاموش بیٹھی ہوتی تو اس کے چہرے کا نچلا حصہ بس ایک گوشت کا لوتھڑا معلوم ہوتا۔ اور وہ کھانا کھاتی تو اس کے نچلے ہونٹ کے نیچے ایک ٹھوڑی سی بن جاتی۔ لیکن کیسے اطمینان سے وہ بھی شادی کر کے بیٹھ رہی تھی۔ اس کا میاں سپلائی کے کسی محکمہ میں کلرک تھا اور بیسیوں ہی چیزیں بازار سے کم داموں پر خرید کے لے آتا تھا۔ اور شمیمہ اس کو دیکھ کر اپنے دل ہی دل میں تعجب کیا کرتی تھی۔

— "قسمت بھی خوب ہوتی ہے" وہ اپنے سے کہتی۔

اور اس کے ماموں کی تینوں کی تینوں لڑکیاں جو اس سے عمر میں چھوٹی تھیں اب تک بیاہی جا چکی تھیں۔ بلکہ بڑی کے تو دو بچے بھی تھے۔ منجھلی اور چھوٹی دونوں پیٹ سے تھیں شمیمہ کو خیال آتا تھا کہ بس اب اُن دونوں کے بھی بچے ہو جائیں گے۔ گویا وہ اُن سے بھی چھوٹی رہ گئی!

اس کو خیال آتا کہ اس کے ماموں کو جو کہ ریلوے میں ملازم تھے اور اپنے کنبے بھر کو ریل میں مفت سفر کرایا کرتے تھے روپیہ جمع کرنے کی کتنی فکر لگی رہتی تھی۔ اور ایک بہت بڑی فکر جو ان کو کھائے جاتی تھی وہ یہ تھی کہ تینوں لڑکیوں کی شادیوں پر روپیہ خرچ کرنا پڑے گا۔ اس خیال سے وہ کتنے پریشان رہا کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی ان کی تینوں لڑکیوں کی شادیاں کیسی آسانی سے ہو گئیں۔ اور وہ پھر روپیہ جمع کرنے میں اطمینان سے لگ گئے۔ ان کی بڑی لڑکی کی شادی تو شمیمہ کے دوسرے ماموں کے بیٹے سے ہی ہو گئی تھی جس کو بتو کہا جاتا تھا۔ سب لوگ شمیمہ کو بتو سے چھیڑا کرتے تھے۔ اور وہ بھی اکثر خوش ہوا کرتی تھی کہ اس کی شادی بتو سے ہو جائیگی۔ لیکن پھر یکایک بتو کی شادی اسی فاطمہ سے ہو گئی۔ اور اس خیال پر وہ کھول سی جاتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ بتو کو فاطمہ میں کیا نظر آیا کہ — اور اس کو اپنے پر غصہ آنے لگتا۔ پھر اس کو اپنے پر رحم بھی آتا جیسے اس پر ظلم توڑے جا رہے ہوں — وہ روہانسی ہو جاتی۔

شروع شروع میں تو وہ عتیق سے بچوں کا سا برتاؤ کرتی رہی۔ وہ آتا تو اس کی طرف کوئی خاص توجہ ہی کرنے کی اس کو ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ اور عتیق تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلا جاتا۔ اور شمیمہ کو کوئی بھی خاص خیال نہ آتا۔ وہ عتیق سے باتیں کرتی

تھی تو ایسی کہ گویا وہ اس سے صرف عمر میں ہی نہیں بلکہ تجربے اور عقل میں بھی بہت بڑی ہو۔ اور عتو کو اس سے جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ وہ اس سے کسی بات پر بحث کرنے لگتا تو وہ اس سے کہہ دیتی — جاؤ بھی، تم کیا بحث کرتے ہو — کل تو پیاؤں پیاؤں کرتے میرے سامنے ہی پیدا ہوئے تھے — اور عتو اس فقرے پر تلملا کے خاموش بیٹھ جاتا۔ ایک بے بیاہی لڑکی سے اس قسم کی بات سن کر اس کو تھوڑا سا تعجب ہوتا۔ کنواری لڑکیوں کو تو بچوں کے پیدا ہونے کا پتہ بھی نہ ہونا چاہیئے۔ اور کہاں کہ تہمینہ اس قدر صفائی سے اس کو سنا دیتی کہ وہ اس وقت موجود تھی جب وہ پیدا ہوا تھا۔ چاہے وہ جھوٹ بول رہی ہو، پھر بھی —! اور وہ جھینپ جاتا۔ کچھ مرعوب بھی ہو جاتا۔ اصل میں تہمینہ باتیں ہی کچھ اس طرح پر کرتی گویا بہت بڑی بوڑھی ہو، تجربہ کار اور عقلمند۔ اور یہ بھی بھول جاتی کہ وہ کنواری ہے۔ اور جب تک شادی نہ ہو جائے اس کو اس قسم کی باتیں ہرگز نہ کرنی چاہئیں — پھر عتو کے سامنے تہمینہ کو کوئی خیال بھی نہ آتا۔ وہ اس سے بہت بڑی ہے۔ اس کی آپا کے برابر ہی سمجھو — اور پھر تو اس کو عتو سے اس قسم کی باتیں کرنے میں قطعی بھی کوئی جھجک محسوس نہ ہوتی۔

لیکن جب عتو دسویں کا امتحان پاس کر کے باہر کسی شہر میں پڑھنے چلا گیا تو تہمینہ کو ایک دم سے خیال آیا کہ عتو بھی عمر اور تجربے میں اس سے بڑھتا جا رہا ہے۔ جب وہ ایک دفعہ چھٹیوں میں گھر آیا تو وہ بالکل ہی اس کو بدلا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے سارے جسم میں ایک عجیب کی سختی اور کھردرا پن ہو گیا تھا۔ اس کی ہلکے ہرے رنگ کی مونچھیں جو ابھی تک پوری طرح گھنی بھی نہ ہونے پائی تھیں اس کے چہرے پر اور بھی سجی اکڑ رہی تھیں اور — سخت ہاتھ پیر تو گویا پتھر سے بن گئے تھے۔ جن کو دیکھ کر تہمینہ کو ایک دفعہ تو پھریری آ ہی گئی۔ اور اب کم از کم ایک دفعہ وہ عتو کو دیکھ کر جھینپ گئی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے دوپٹے کے آنچل کو اپنے سینے پر جما لینا چاہا۔ اور اس کو خیال آیا کہ اب تو اس کے جسم میں بھی کوئی جاذبیت باقی نہیں رہی ہے۔ اس کے بے قد کے ساتھ اس کے سینے کا ہلکا سا ابھار بہت ہی کم معلوم ہوتا تھا اور اس کو خیال ہوتا جیسے اس کے سینے کے اندر ہی اندر کوئی چیز سلجھان ہوتی چلی جا رہی ہے۔ وہ سوچتی کہ عتو کو تو شاید اس کے سینے میں کوئی دلچسپی ہی محسوس نہ ہوتی ہوگی۔ اور اس کا اس قدر احتیاط سے دوپٹہ جمانا بیکار ہے۔

اور نہ جانے کیوں اس خیال کے آتے ہی وہ عتو سے پہلی طرح آنکھ بھی نہ ملا سکتی۔ دوسری طرف عتو میں معلوم ہوتا تھا بے پناہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی باتوں میں وہ جھجک بھی باقی نہ رہی تھی جو اسکول کے زمانہ میں تھی۔ اور اب تو وہ آزادانہ تہمینہ سے بحث کرنے کو بھی تیار تھا۔ مگر اس کے چلے جانے کے بعد تہمینہ سوچنے لگی کہ اس کو عتو کے سامنے اس قسم کا رویہ نہ رکھنا چاہیئے۔ عتو بہر حال عمر میں اس قدر چھوٹا تھا اس کا پیدا ہونا تو اس کو آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔

پھر ایک شام کو جب عتو اس کے گھر آیا تو وہ باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مشغول تھی۔ وہ سیدھا اندر کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس جانے لگا تو اس کی نظر تہمینہ پر پڑی جو باورچی خانہ میں بیٹھی اس کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کھانا پک رہا ہے!" اس نے باورچی خانہ کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے کہا تھا۔ پہلے تو تہمینہ خاموش بیٹھی رہی تھی۔ اس کو محسوس ہوا کہ پھر عتو کے سامنے اس کو اپنے کمزور اور بے بیاہی ہونے کا خیال پیدا ہو رہا ہے۔ اور وہ جھنجھلا سی گئی۔ اور لاپرواہی سے کھڑی ہو گئی۔ اور اس نے پہلی دفعہ یہ محسوس کیا کہ باوجودیکہ عتو کا جسم سخت اور مردانہ ہو گیا ہے، وہ اب بھی قد میں اس سے کچھ لمبی ہی تھی۔ اور اس خیال سے اس کو کچھ ڈھارس سی بندھ گئی اور اپنے بڑے ہونے کا خیال پھر سے آ گیا۔ اور اس نے اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ عتو کے آ جانے پر قریب پیڑھی پر رکھا ہوا دوپٹہ اٹھا کر اپنے گلے میں ہی ڈال لے۔ اس کا میلا سا ریشمی کرتہ اور ذرا چھوٹے پائنچوں والا ڈھیلا پاجامہ اس کے جسم پر ننگا سا معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن نہ معلوم اس میں کہاں سے نڈری آ گئی تھی کہ اس کو عتو کے سامنے اس طرح پر کھڑا رہنا بالکل بھی عجیب نہ معلوم ہوا۔ اس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ عتو اس کے اس طرح ملنے کو دیکھ کر کچھ سٹ پٹا گیا اور اس کی وجہ سے اس کی ہمت اور بھی بڑھ گئی اور ایک طنزیہ سی مسکراہٹ تہمینہ کے ہونٹوں پر ابھر آئی تھی۔

"کب تک ہیں چھٹیاں؟" اس نے لاپرواہی سے پوچھا۔

"ابھی تو بہت دن ہیں" اور عتو کی نگاہیں اس کے لمبے سوکھے جسم پر پھسلی جا رہی تھیں۔ اس کی شاید گھبراہٹ اور بھی بڑھ گئی

ی ۔ اور اس نے ایک دم سے دروازے کی چوکھٹ تھام لی ۔ اس نے
جھاکہ ثمیمہ کی آنکھوں میں ایک خاص بات پیدا ہوگئی ہے جو اس نے
ج سے پہلے کبھی بھی محسوس نہ کی تھی ۔ وہ اور بھی گھبرا گیا ۔ اس نے
چاہا کہ وہ چلا جائے ۔ لیکن ایک دم سے ثمیمہ نے اس کی کلائی آہستہ
سے پکڑتے ہوئے کہا ۔

"تو بیٹھو تو ! ۔۔ یا کھڑے ہی رہو گے ۔۔ !" گو کہ ثمیمہ
نے اس کی کلائی آہستہ سے پکڑی تھی ۔ اس کو وہ گرفت بہت سخت
معلوم ہوئی ۔ اور وہ خاموش پیڑھی پر بیٹھا رہا ۔ اور ثمیمہ بے پرواہی
سے ہنڈیا میں کوئی چیز بگھارنے لگی ۔

چھٹیوں کے ختم تک عتو کا رویہ ہی بدل گیا تھا ۔ ثمیمہ کی طرف
وہ اب اس کے سامنے کچھ سہما سا رہتا ۔ اس کو محسوس ہوتا تھا کہ
جیسے اس کے جسم پر قبضہ کر لیگی ۔ اور جو اس کا جی چاہے گا اس کے
ساتھ کریگی ۔ اور وہ کوئی آواز بھی نہ نکال سکے گا ۔۔ اس
ال پر وہ اور بھی ڈر جاتا ۔

چھٹیاں ختم ہونے کے قریب کالج واپس جانے سے پہلے
شام پھر عتو ثمیمہ کے ہاں آیا ۔ وہ اس کی تائی اور اپنی چچی سے
آیا تھا ۔ کیونکہ صبح اس کی ریل بہت سویرے جانی تھی ۔ اور صبح
کو ان لوگوں سے ملنے کا وقت بھی نہ ملتا ۔ شام کو بھی اپنا سامان
سمیٹتے باندھتے کافی دیر ہوگئی ۔ اور جب وہ اپنے چچا کے ہاں پہنچا
اندھیرا کافی بڑھ گیا تھا ۔ اندر کمرے میں بجلی کی روشنی ہو رہی تھی
سامنے کے چھوٹے برامدے میں صرف ایک مٹی کا لیمپ جل رہا
تھا جس کی وجہ سے برامدے اور صحن میں کافی اندھیرا معلوم
رہا تھا ۔ اور ثمیمہ اس اندھیرے میں گھری ہوئی خاموش بیٹھی تھی ۔

"وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے" ثمیمہ نے آہستہ سے کہا ،
جب عتو کمرے کی طرف جانے لگا "سب گئے ہوئے ہیں"

۔۔ اور وہ خاموش آکر ثمیمہ کے سامنے تخت پر بیٹھ گیا ۔
دونوں کے بیچ میں مٹی کے تیل کا وہ لمپ رکھا تھا ۔ عتو کو ایسا
معلوم ہوا جیسے کہ یہ لیمپ اس کیلئے ایک سہارا ہے جو اس کو ثمیمہ
سے بچائے گا ۔ وہ خاموش بیٹھا رہا ۔ پھر اس نے اپنا گلا صاف
کرتے ہوئے کہا ۔

"کل تو صبح میں جا رہا ہوں اس لئے ملنے آیا تھا چچا وغیرہ کہاں
۔۔ وہ لوگ تو گئے ہوئے ہیں ۔ ماموں کے ہاں ۔ کسی بچے
کی سالگرہ ہے "

"تو تم کیوں نہ گئیں ۔۔ !"

"میرے پاس کپڑے ہی صاف نہ تھے ۔ دھوبی کمبخت لاتا ہی
اتنی دیر سے ہے " ۔ اور عتو نے کن انکھیوں سے دیکھا تو اس کو
محسوس ہوا جیسے ثمیمہ اس لیمپ کو بیچ میں سے اٹھا کر ایک طرف
رکھ دینا چاہتی ہو ۔ ثمیمہ نے لیمپ کو اٹھا کر تخت کے پائے کے قریب
زمین پر رکھ دیا ۔ اور اس وجہ سے اندھیرا ان لوگوں کے گرد اور بھی زیادہ
بڑھ گیا تھا ۔۔ اور عتو بالکل ہی گھبرا اٹھا ۔ اس کو محسوس ہوا جیسے کوئی
ٹھنڈی سی چیز پگھل پگھل کے اس کے سارے جسم میں اتری چلی جا
رہی ہے ۔ ثمیمہ کے ٹھنڈے اور سخت سے ہاتھوں نے اس کی
دونوں کلائیاں پکڑ لی تھیں ۔ اور اس کا ٹھنڈا سا چہرہ بالکل اس کی
گردن سے مل گیا تھا ۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا جو وہ
اپنے کان کی لو پر بخوبی محسوس کر سکتا تھا ۔ عتو نے پھڑپھڑا کر اپنے
کو چھڑا لیا ۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا ۔

عتو کے چلے جانے کے بعد ثمیمہ سنبھل کر بیٹھ گئی ۔ اس کا
سانس اب بھی زور زور سے چل رہا تھا ۔ اور اس کے دونوں ہاتھوں
میں ایک کپکپی سی پیدا ہوگئی تھی ۔ وہ اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی ۔
اس نے آئینے میں دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک پیدا
ہوگئی ۔ اس کو آج سے سولہ سترہ سال پہلے کی اپنی چچی یاد آگئیں جن
کی آنکھوں میں کبھی کبھی اس کو ایک چنگاری نظر آیا کرتی تھی ۔ اب اس
کو خود بھی محسوس ہوا کہ جیسے یہ چنگاری آہستہ آہستہ بجھتی جا رہی ہے ۔
اس کے ہونٹ خشک سے ہو گئے تھے ۔ اس نے اپنے ہونٹوں کی
کھردری سی سطح پر زبان پھیرتے ہوئے سوچا کہ عتو تو پیدا ہی اس کے
سامنے ہوا تھا ۔ آج بھی وہ اس کو وہاں پلنگ پر پڑا دیکھ سکتی ہے
ننھا سا ، سرخ سرخ ، گلگلے جسم والا بچہ ۔ پیلے رنگ کے کرتے
میں لپٹا پڑا تھا ۔ اور وہ چاہتی تو اس چھوٹے سے بچے کو اپنی سخت
گرفت میں بھینچ کے رکھ دیتی ۔ اور اس نے ایک بار آئینے میں بیٹھی
ہوئی ثمیمہ کی طرف پھر دیکھا ۔ اس کی آنکھ میں جو چنگاری نہ معلوم
کہاں سے آگئی تھی وہ اب اپنی چمک بالکل کھو چکی تھی ۔ اور اس کے
ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی ۔

ایک شام کی کہانی

"خاموشی میں کھوئی ساری ہا ںک پکار   ختم ہوئے اب گھیرے پھیرے، ختم شکار،
"بھیل کی بیٹی! رکھ دے اٹھا کر تیر کمان   ساز اٹھا، کچھ ناچ دکھا محفل کی جان!
"رات کی گود میں جھولنے دے اب گیتوں کو   اَن مٹ کر دے اپنے بل سے لمحوں کو،

"شام آئی ہے چل کر ہلکی ہلکی چال   بوجھ سے جوبن کے دھیمی چنچل کی چال
"ٹیلے پیڑ دھندلے سب پربت میدان   بھیل کی بیٹی! رکھ دے اٹھا کر تیر کمان،
"بادلوں کے جھرمٹ سے چہروں کا طوفان   جھانک رہا ہے، اب گیتوں کا سامان،

"سورج راجہ سیج پہ رحمی لیٹا ہے   درد سے آہیں بھرتا اور سسکتا ہے
"گیت کے جادو سے نکلیں دل کے ارمان   بھیل کی بیٹی! رکھ دے اٹھا کر تیر کمان
"تیری جوانی اور سندرتا ناچ کرے   جوش میں آکر وحشی، اندھا ناچ کرے،

"دور پہاڑی پر چپ بیٹھا ہے سردار   ختم ہوئے اب گھیرے پھیرے ختم شکار،
"ہلکے جھونکوں سے اڑتے ہیں اسکے بال   بھیل کی بیٹی! رک جھنک چل چنچل چال،
"اس کے مرجھائے دل میں لے آ طوفان   ساز اٹھا لے، رکھ دے سارے تیر کمان!

"ندی دھیمے سُروں میں گاتی ہے،   ان تھک چپکے چپکے بہتی جاتی ہے!
"آ ذجیدا! — کاہن سیلے منڈل کے،   جھکو کرشن کنھیا اونچے جنگل کے،
"سا سنہ ستاروں کی ہر گوپی کو لاؤ،   پھولوں میں کرنوں سے شبنم برساؤ،

"بھیل کی بیٹی کیوں دکھیا ہے روتی ہے   کیا سندرتا کی یوں دکھیا ہوتی ہے؟
"آنکھوں میں لالی گالوں میں گرمی ہے   آنسو بہتے ہیں سانسوں میں گرمی ہے،
"بکھرے بالوں میں یوں جیسے گھٹا میں چاند   جیسے راتوں کی تاریک فضا میں چاند!

"آؤ ہواؤ، ان زلفوں کو لہراؤ،   زلفوں میں پنہاں ہیں ستارے، دکھلاؤ،
"ندی ان گالوں کی گرمی دور کرے،   مست ہر سانسوں کی گرمی دور کرے،
"بکھرے بال نہیں ناگن اور بس کھولیں   سندرتا کے بھید اندھیرے میں کھولیں!"

(۲)

"ایسی باتیں تیر ہیں میرے ہردے کو،   سکھ کی راتیں تیر ہیں میرے ہردے کو،
"میرے پیتم ہی جب میرے پاس نہیں،   اور مجھ کو ان سے ملنے کی آس نہیں،
"یہ باتیں ہیں زہری ناگن شعلوں کی،   کیسے جاگیں دل سے تانیں نغموں کی؟
"میرے پیتم یہ کہہ کے پربت پہ گئے   لاؤں گا میں کر کے آج شکار نئے،

"پھر ہم دونوں مل کر عیش منائیں گے، کھا پی کر دیر اسے جی بہلائیں گے،
"جگ میں خوشیاں تیری میری ساتھی ہیں دیکھو ایسے خوشیوں کی راتیں آتی ہیں،
"کب لوٹے پیتم جنگل سے، شام ہوئی، پل پل سال بنے، میں بے آرام ہوئی
"جنگل میں خونخوار درندے رہتے ہیں اور ناگوں کے جھرمٹ بھی ہیں کہتے ہیں،
"رکھ لے لاج سہاگن کی میرے بھگوان پیتم جلد آ جائیں دل میں سمایا دھیان،
"کب لوٹے پیتم جنگل سے؟ میرا کام آن کے تپنے اور رہا بس ان کا نام،
"اب تو ساتھی سو صدیوں کی دوری ہے میل نہیں ہو سکتا ہے، مجبوری ہے،
"میری سکھ بھی بیتی، رہیں کیا جانو تم انجان ہو دل کی باتیں کیسا جانو؟
"تم پردیسی اس بستی میں آئے ہو، ریت نگر ماٹی کی کیوں لائے ہو؟
"کرم سبھاؤ دھرم کے بندھن بھول گئے، دھرم کی باتیں مرے کارن بھول گئے
"سندرتا کی، کمتا جگ کی سیوا ہے لیکن تم نے اور ہی رستہ دیکھا ہے"

(۳)

"چھل چھل، سندر، جھکمک، اندر پری! من موہن گیتوں کے جادو کی مستی،
"سیج کچھی ہے، مست یوں ہے اور ملواں بھول پرانی باتیں، آجا، کہنا مان،
"دل کو بس باتوں میں کیوں الجھائیں عیش کریں جیون کے سکھ کا پھل پائیں،
"دیکھ ستارے آتے ہیں اور جاتے ہیں پہلے ستاروں کو وہ دل سے بھلاتے ہیں،
"دیکھ بہاریں آتی ہیں اور جاتی ہیں، بیتی بہاروں کو کب دھیان میں لاتی ہیں،
"دیکھ جوانی جوں راجوں پھرتی ہے، سرجیوں میں نئے روپ سے گھرتی ہے"

(۴)

"صدیاں بیتیں ایک ستارہ ٹوٹا تھا، اس کو دیکھ کے دکھ کا سوتا پھوٹا تھا
"صدیاں بیتیں اک ساون مرجھایا تھا بیت جھڑ سے پہلے اس کو نگایا تھا،
"لیکن آہ! جوانی اندھی نادان ہے، دو لمحوں میں خوش ہے مورکھ نادان ہے
"اس تارے کے غم میں آ کر جاتے ہیں تارے آتے ہیں لیکن مرجھاتے ہیں،
"اور بہاریں آتی ہیں اور جاتی ہیں، بیتی رت کے کھوج میں خود کو مٹاتی ہیں،
"لیکن آہ! جوانی اندھی اور نادان ہے، دو لمحوں میں خوش ہے مورکھ نادان ہے،

"آخر جاگے گی جب نیند کے سایوں سے چونک اٹھے گی سکھ کے اندھے سپنوں سے،
"اونچی اونچی تیکھی تانیں نکلیں گی، دل سے جیتی زہری تانیں نکلیں گی،
"پچھتاوے کے گیتوں میں کھو جائے گی، رو رو کر آخر بیری ہو جائے گی!"

میراجی

ایک رات کی بات

فضل حق قریشی دہلوی

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں آج سے دو سال پہلے کوئنز روڈ کے شرقی سرے پر ایک مختصر سی کوٹھی میں آباد تھا۔ بیوی بچے ساتھ نہیں تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک بالکل ہی نئے شہر میں بے سوچے سمجھے کا معقول انتظام ہوئے بغیر گھر کے لوگوں کو ساتھ لے جایا جائے۔ پردیس میں سو طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اکیلا آدمی پھر بھی کسی قسم گذارا کر لیتا ہے۔ لیکن اہل و عیال کے ساتھ ایسی حالات میں زندگی اجیرن ہونے لگتی ہے۔

موسم سرما کی ابتدا تھی لیکن فضا میں کچھ زیادہ خنکی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں ایک روز حسب معمول کھانا کھا کر گھر سے روانہ ہوا۔ تو خیال آیا کہ آج سینما چلا جائے۔ اس قسم کی تفریحات سے لطف اٹھائے بہت دن ہو گئے تھے۔ لہٰذا حالاں کہ ملازم سے کہہ آیا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ ... گئے لوٹوں گا۔ تاکہ وہ میری غیر معمولی تاخیر سے پریشان نہ ہو۔ پکچر ہاؤس گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اور شو بھی سکنڈ شو تھا۔ شروع ہونے میں کافی دیر تھی۔ اس لئے دستور کے مطابق میں نیا بازار کی طرف ٹہلنے چلا گیا۔ کیونکہ وہاں زیادہ تر لمبے درخت لگے ہوئے تھے جن کی بھینی بھینی خوشبو شام کے وقت بڑا لطف دیتی تھی۔ پر اس سنسان سڑک پر بہت کم آمد و رفت رہتی تھی۔ بعض دفعہ پورے وقت چکر لگانے کے باوجود کسی سے تک مڈبھیڑ نہیں ہوتی تھی۔ جان پہچان والوں کا تو ذکر ہی کیا۔ زیادہ ضرورت نہ ہونے کے باعث روشنی کا انتظام بھی کم تھا۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سڑک پر تاریکی تھی۔

اس روز میں نے بمشکل نصف سڑک طے کی ہوگی کہ ایک پتلی دبلی کالی کلوٹی صورت عورت سیاہ ساڑھی باندھے میرے پاس سے نکل گئی۔ میں نے سوچا کہ یہ بھی یہیں قریب کی کسی کوٹھی میں رہتی ہوگی۔ اور شاید میری طرح کہیں سے ٹہل کر آ رہی ہوگی۔ سڑک ختم ہونے کے بعد میں اسی راستے سے پلٹا تاکہ دوسرا چکر لگایا جائے اس دفعہ پھر بیچ سڑک میں اسی عورت سے آمنا سامنا ہو گیا۔ جب وہ قریب پہنچی تو میں کسی قدر ٹھٹکا۔ غیر ارادی طور پر وہ بھی رکی۔ اور پھر دامن بچا کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک گدگدی سی پیدا ہونے لگی "کیا یہ عورت بھی میری طرح اسی سڑک کو پسند کرتی اور اسی پر ٹہلنے کی عادی ہے؟"

یہ سوال تھا جو قدرتاً میرے دل میں پیدا ہوا۔ میں نے معاملہ کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھنے کیلئے ایک چکر اور لگانا مناسب سمجھا۔ اس دفعہ بھی وہ عورت تقریباً اسی جگہ میرے سامنے آئی۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ اس کے قریب آنے سے قبل میں اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ اور جب وہ نزدیک پہنچی تو میں نے شریفانہ انداز میں کہا۔

"معاف کیجئے محترمہ! میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں سے پکچر ہاؤس کتنی دور ہے۔ میں اس شہر میں بالکل نووارد ہوں اس لئے صحیح راستوں اور گذرگاہوں سے ابھی پوری واقفیت نہیں ہوئی ہے اگر آپکو معلوم ہو تو میری مدد کیجئے۔"

عورت رک گئی۔ اس کی نگاہیں زمین کی طرف جھک گئیں۔ طویل وقفے کے بعد وہ بولی۔

"خود مجھے بھی معلوم نہیں۔ میں اس حصہ شہر میں بہت عرصہ سے رہتی ہوں۔ لیکن میرے لئے باہر نکلنا بہت کم ہوتا تھا۔ اس لئے ایک اجنبی کی طرح رستوں سے ناواقف ہوں۔"

"ناواقف ہیں تو شاید اس وقت بھی آپ اپنا صحیح راستہ بھول گئی ہیں۔ آپ نے غیر معمولی طور پر اس سڑک کے تین چکر لگائے ہیں۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں۔ اس وقت میرے گھر کی فضا کسی قدر خراب تھی۔ میں صرف ہوا کھانے کے خیال سے باہر نکل آئی۔ میرا قیام اگلی سڑک پر چودہ نمبر کوٹھی میں ہے۔"

اس گفتگو کے بعد اصولاً اسے آگے بڑھ جانا چاہئے تھا لیکن وہ نیچی نگاہ کئے جوں کی توں کھڑی رہی۔ مجھے گمان ہوا کہ شاید یہ ان عورتوں میں سے ہے جو بن ٹھن کر اندھیرے اجالے باہر نکلتی اور منچلے نوجوانوں کو اپنے دام میں پھنسا لیتی ہیں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہ نہ تو بن ٹھن کر نکلی تھی۔ اور نہ اس کے ترکش میں دل لبھانے والے تیر موجود تھے۔ وہ قابل رحم حد تک غمزدہ اور دلفگار معلوم ہوتی تھی۔ زیادہ دیر خاموش رہنا بھی مناسب نہیں تھا اس لئے

میں نے خود سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔
"میں روزانہ شام کے وقت اسی سڑک پر ٹہلنے نکلتا ہوں یہ سنسان مقام مجھے بہت پسند ہے۔ آپ اس سے پیشتر کبھی نظر نہیں آئیں۔ کیا آج پہلی دفعہ اس طرف کا رُخ کیا ہے؟"
"جی ہاں" وہ اس طرح چونک پڑی جیسے کسی نے جھنجوڑ کر اسے بیدار کر دیا ہو۔ "میں دو سال کے بعد تن تنہا گھر سے باہر نکلی ہوں میں نے اپنی زندگی کے تقریباً سات سو دن ایک قیدی کی طرح اس کوٹھی میں بسر کئے ہیں۔ آج میرا دل بہت گھبرایا اور میں باہر نکل آئی۔ اب مجھے روکنے والا کوئی نہیں تھا"
مجھے اس عورت کے ساتھ دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ میں نے سینما کا خیال ترک کر دیا۔ میرا جی چاہا کہ اسی طرح آدھی رات تک باتیں کرتا رہوں۔ لیکن ایک جگہ کھڑے رہنا مناسب نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اسی طرف قدم بڑھائے جدھر اس کا رُخ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ ہو لی۔
میں نے کہا: "مجھے معلوم نہیں کہ آپ طبعاً خاموشی پسند ہیں یا اسی وقت کسی خاص جذبے کے ماتحت سوچ کی نگری میں پہنچ گئی ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس چہل قدمی کے دوران میں آپ سے باتیں کرتا رہوں"
"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا" اس نے کسی قدر رُک کر جواب دیا۔ اور ساتھ ہی اس کے تمام جسم میں ایک تھرتھری سی پیدا ہوگئی۔
"آپ کا جسم کانپ رہا ہے" میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا بازو تھام کر کہا: "شاید سردی کی وجہ ہے۔ ایک تو رات کا وقت، پھر چاروں طرف سبزہ اور یہ گھنے درخت۔ ہوا میں کچھ خنکی بڑھ چلی ہے۔ اگر آپ کو فرصت ہو اور ناگوار خاطر نہ گذرے تو میرے ساتھ چل کر قریب کے ہوٹل میں چائے کی ایک پیالی پی لیجئے۔"
"جی نہیں" اس نے کسی قدر گھبرا کر کہا: "میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ اب مجھے گھر لوٹ جانا چاہئے۔ شاید ساڑھے نو بج گئے ہوں گے"
میں نے گھڑی دیکھی۔ نو بج کر چالیس منٹ گذر چکے تھے۔ میں نے اس کا بازو، جسے چھڑانے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ [illegible] سے کہا۔

"تو پھر میں آپ کو آپ کی کوٹھی تک پہنچا دوں۔ راستے میں سایہ دار درختوں کے پتوں سے کہیں کہیں زیادہ اندھیرا ہو گیا ہے ایسا نہ ہو کہ ان سنسان حصوں سے گذرتے وقت آپ کو ڈر معلوم ہونے لگے"
"جی نہیں۔ میں تنہائی کی اس درجہ عادی ہو گئی ہوں کہ اب کسی جگہ کے بھیانک ماحول سے بھی مجھے ڈر نہیں لگتا"
"پھر بھی اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے ساتھ چلا چلوں"
"آپ کی مرضی ہے" اس نے دبی زبان سے کہا۔ اور پہلی بار نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ! اسکی آنکھوں میں حسرت و ارمان کا ایک سمندر لہریں مار رہا تھا۔
ہم دونوں چلتے رہے۔ یہاں تک کہ کوٹھی نمبر ۱۲ کے سامنے پہنچ گئے۔ میں صدر دروازے کے قریب ذرا رُکا۔ میں نے سوچا کہ اس کوٹھی میں نہ جانے کون کون ہوگا۔ کاش! فرصت کے چند لمحے نصیب ہوتے اور میں خوب کھل کر اس اجنبی عورت سے باتیں کر سکتا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور اندر چلنے کیلئے اشارہ کیا۔ میرے تمام بدن میں ایک سنسناہٹ سی پیدا ہوگئی۔
"یہ سب کارروائی مجھے فریب دینے کیلئے تو نہیں کی جا رہی" ایک لمحہ کیلئے یہ خیال میرے دل میں پیدا ہوا اور دوسرے لمحہ میں کوٹھی کے برآمدہ میں کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کوئی متنفس موجود نہیں ہے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اور بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے کلائی چھوڑ کر میرا بازو تھام لیا۔ اور کواڑ کھول کر بیچ کے کمرے میں لے گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ ڈرائنگ روم ہوگا۔ کیونکہ تاریکی کے باوجود صوفوں اور گدیلے دار کرسیوں کے ہیولے آنکھوں کے سامنے چکر کھانے لگے تھے۔ اس خاموش اور تاریک فضا میں مجھے سہارا دیکر وہ برابر کے کمرہ میں لے گئی۔ وہاں بھی داخل ہوتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ خواب گاہ ہے۔ دونوں طرف دو پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ بیچ میں سنگھار میز تھی۔ اور اس کے سامنے کرسی پڑی تھی۔ اتنی دیر چُپ سوانگ کرتے رہنے کے بعد وہ بولی۔
"ذرا اسی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔ [illegible] دیکھو میری غیر موجودگی میں بجلی کا بٹن دبانے کی کوشش نہ کرنا۔"

میں خاموش بیٹھ گیا۔ مشکل سے چار پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ وہ خواب گاہ میں واپس چلی آئی۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر پلنگ کی طرف لے چلی۔ میں ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کیلئے تیار ہو گیا۔ حجابات کے تمام پردے اُٹھ چکے تھے شرم و حیا کا نام نہیں تھا۔ اور یہ سب حرکتیں اس تاریکی میں ہو رہی تھیں جو بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔

کوئی نصف منٹ گذرے وہ ایک دم سے پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بجلی کا بٹن دبا کر روشنی بھی کر دی۔

"ادھر آؤ تمہیں ایک عجیب چیز دکھاؤں جسے دیکھ کر تم یقیناً متحیرت ہو جاؤ گے۔"

وہ مجھے کھینچ کر دوسرے پلنگ کے قریب لے گئی۔ مجھے سخت تعجب ہوا وہاں پہلے سے کوئی سو رہا تھا۔ اس پر پڑی ہوئی ریشمی چادر اس نے ایک جھٹکے سے کھینچ لی۔

"اُف!" انتہائے خوف میں ایک ہلکی سی چیخ میرے منہ سے نکل گئی۔ بالکل برہنہ حالت میں ایک بڈھے کی لاش اس پلنگ پر پڑی تھی۔ تکیہ پر سے سر ڈھلک جانے کے باعث اس کی گردن ٹیڑھی ہو کر اکڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کسی نے ان کو بند نہیں کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہم دونوں کو لباس عریانی میں دیکھ کر نفرت، حقارت اور غصہ کے عالم میں گھور رہی ہیں۔ اس کی زبان دانتوں کے درمیان آ کر اس طرح بھنچ گئی تھی جیسے کھٹکے والے چوہیدان کے دندانوں میں کوئی موٹا چوہا پھنس کر رہ جائے۔ دیوانوں کی طرح قہقہہ لگا کر اس عورت نے لاش کے منہ پر تھوکا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "جانتے ہو یہ کون ہے؟" اور پھر خود ہی بولی "تم بھلا کس طرح جان سکتے ہو۔ سنو۔ یہ بوڑھا رئیس جس کی دولت اسے مرنے سے نہ بچا سکی دو سال تک میرا رفیق زندگی رہا ہے لیکن صرف سماج کی نظروں میں یہ میرا رفیق زندگی تھا۔ حقیقتاً نہیں۔ تم اور دنیا کا کوئی شخص یقین نہیں کر سکتا کہ میں نے اس کے ساتھ بالکل تجرد کی زندگی بسر کی ہے۔ میں نے بہت ضبط سے کام لیا۔ پوری شرافت کے ساتھ اس بوڑھے کی شریک زندگی بنی رہی۔ اس دوران میں جبکی طویل مدت میری قوت برداشت کیلئے کسی طرح دو صدی سے کم نہیں تھی میں نے ایک بار بھی کسی غیر مرد کی طرف نگاہ غلط انداز نہیں ڈالی۔ لیکن آج شام کو جب تین ماہ کی مسلسل تیمارداری کے بعد یہ دنیا ... [illegible] ... دق ہو گئی تو میری حسرت نصیب

روح جس کی گہرائیوں میں تڑپتی بجلیوں کا جوش اور پارے کی اضطرابی کیفیات یکایک خواب گراں سے بیدار ہو گئی تھیں سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو گئی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اس مردود کی لاش اٹھنے سے پہلے اپنے دھرم کی سب بندشوں کو توڑ کر، سماج کے جملہ اصولوں کو ٹھکرا کر اور اخلاق کے تمام تقاضوں سے منہ موڑ کر زبردستی وہ لذت حاصل کروں گی جسے زمانہ بھر کے دیوتا میرے حق زوجیت کے طور پر مجھے نہ دے سکے۔ اس بوڑھے کا دم نکلتے ہی میرے سوئے ہوئے جذبات میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اور میں نے تحفظ عصمت کے نام نہاد تصور سے زبردست انتقام لینے کی ٹھان لی۔ میں نے اپنے ملازم کو فوراً یہاں سے چلتا کر دیا تاکہ وہ ان عزیز و اقارب کو جو یہاں سے کافی دور رہتے ہیں اس "مبارک حادثہ" کی اطلاع دے آئے۔ میں نے اس کو ہدایت کر دی کہ صبح ہونے سے قبل واپس نہ آنا۔ کیونکہ یوں بھی ارتھی کی تیاری اور کریاکرم کی رسمی ادائیگی صبح سے پہلے ممکن نہ ہو سکیگی ملازم کے چلے جانے کے بعد ہی میں گھر سے باہر نکلی۔ اس ارادے سے کہ اپنی طرح کے کسی نوجوان کو باتوں میں لگا کر اپنے ہمراہ لے آؤں۔ شروع میں تھوڑی سی حیا مانع رہی۔ لیکن جلدی ہی خواہشات کی سرکشی عقل کی دور اندیشیوں کو کچل کر آگے بڑھ گئی۔ حسن اتفاق کہ تم راستہ میں جلد ہی مل گئے۔ میرا مقصد پورا ہو گیا۔"

یہ کہہ کر وہ پلنگ پر چڑھی اور پوری قوت سے لات مار کر شوہر کی لاش کو پٹی کی طرف لڑھکا دیا۔ اور قریب کی الماری کھول کر زہر کی ایک شیشی نکالی اور مجھے دکھا کر بولی:۔

"اس کے بعد زندہ رہنے کیلئے میرے دل میں کوئی امنگ باقی نہیں رہی۔ جو انتقام مجھے سماج سے لینا تھا لے لیا۔ اب میں نے خودکشی کی ٹھان لی ہے۔ مجھے مرنا ہی پڑے گا۔ میں دم نکلنے سے قبل بالکل عریاں حالت میں اس برہنہ لاش سے لپٹ کر لیٹ جاؤں گی تاکہ صبح کے وقت جب عزیز و اقارب اس کمرے میں قدم رکھیں، تو انہیں یہ دیکھ کر تسکین ہو کہ ہم دونوں مرتے وقت ایک دوسرے سے کس قدر قریب تھے۔ میرا دم نکلتے ہی تم یہاں سے چلے جانا۔ اور پھر میری حالت زار پر کبھی غور نہ کرنا۔ بس میرا خیال دل سے نکال دینا۔"

میں چاہتا تھا کہ اسے ارتکاب خودکشی سے روک لوں۔ مگر اتنی ہمت نہ ہوئی۔ آخری جملہ ختم ہوتے ہی شیشی کے اندر بھرا ہوا سیال مادہ اس کے حلق سے نیچے اتر چکا تھا۔ وہ خود پلنگ پر لیٹ کر لاش سے ہم آغوش ہو گئی۔ زہر بہت ہی مہلک تھا۔ ... مرنے میں زیادہ دیر نہ لگی اور ... [illegible]

موہن [illegible] اشک

تفاوت

شملہ میں رج کی سڑک جس مقام پر جا کر مال روڈ سے ملتی ہے وہیں (دونوں سڑکوں کے مقام اتصال سے ذرا اوپر کو) مال کی طرف ایک جنگلہ سا بنا ہے۔ نہ جانے پہلے پہل کس خوش ذوق شخص نے اسے "سکنڈل پوائنٹ" کا نام دیا تھا۔ لیکن اب یہ جگہ اسی نام سے مشہور ہے۔ اس جنگلے پر کہنی ٹیک کر بڑے اطمینان سے مال کی رونق دیکھی جا سکتی ہے۔ شملہ کی سیر کو آئے ہوئے لوگ بارہا اسی مقام پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ شملہ بھر میں کہیں اور ایسی تنہا جگہ نہیں جہاں کھڑے ہو کر نیچے مال پر گھومنے والیوں کی زلفوں کی بناوٹ سے لیکر جوتوں کے فیشنوں تک کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ اور کسی کی شکل، کسی کی چال، کسی کی آواز، کسی کی (بدصورت ہوتے ہوئے بھی) خوبصورت بننے کی کوشش، کسی حور کے پہلو میں چلتے ہوئے لنگور یا کسی یوسف کے پہلو میں محو خرام بد رہا کو دیکھ کر (کسی طرح کے خطرے کے بغیر) شخص اپنی طبیعت کو خوش کرنے کیلئے پھبتیاں اور آوازے کسے جا سکیں۔ چیتن اپنے خیال میں مگن اسی مقام کی طرف بڑھا جا رہا تھا کہ اچانک اپنے پڑوسی اور ہم جماعت کو سکنڈل پوائنٹ کی ریلنگ پر کہنی ٹکائے کھڑے دیکھ کر چونکا۔ اور "ارے امی چند" کہتا ہوا انتہائی مسرت سے اسکی طرف لپکا۔

امی چند نے ایک دور افتادہ مسکراہٹ کے ساتھ چیتن کی طرف دیکھا اور جیسے اتنی ہی دور سے بولا: "کہو تم کہاں ہو؟" اور پھر یہ دیکھ کر کہ چیتن نے مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھا رکھا ہے اس نے بھی ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

چیتن ششدر سا اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ یقیناً یہ اس کا ہم جماعت، اس کا پڑوسی، بچپن سے اس کے ساتھ کھیلنے اور پڑھنے والا، رٹو، کتابوں کا کیڑا، الجیلا، شرمیلا، ڈرپوک اور بزدل امی چند نہیں یہ تو آسمان سے بھی اونچے خودی کے سنگھاسن پر بیٹھا کوئی دوسرا ہی شخص ہے۔ محض اس کا رنگ روپ امی چند کا سا ہے۔ جواب دینے کی بجائے اس نے پوچھا "تم یہاں کیسے، کتابوں کی سیر سے مل گئی فرصت نہیں شملہ کا نظارہ کرنے کی؟" [illegible] سا ہو کر وہ ہنسا۔

اتنی ہی دور سے امی چند نے پھر کہا "میں ذرا آئی۔ سی۔ ایس کا کمپٹیشن (Competition) دینے آیا تھا۔"

"سالا آئی۔ سی۔ ایس کا" چیتن دل ہی دل میں جل بھن کر ہنسا "اور کوئی رہ تو نہیں گیا؟" "آئی۔ سی۔ ایس کیلئے" اظہار اس نے دراصل کرتے ہوئے کہا "تو بھائی آئی۔ سی۔ ایس ہو کر ہم غریبوں کو نہ بھول جانا۔"

اس وقت امی چند کا ایک دوست پیچھے سے گزرا۔

"ہیلو امی چند!"

اور امی چند چیتن سے ہاتھ ملا کر اپنے دوست سے ملنے مال پر چلا گیا۔ اس نے نہ اسکی بات کا جواب دیا۔ اور نہ اس طرح اچانک چل دینے کیلئے معذرت کی۔ اس کی وہ دور افتادہ مسکراہٹ ذرا اور پھیلی اور بس چیتن کے ہاتھ کو ذرا سا ہلا کر وہ چلا گیا۔

چیتن وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ سامنے ہر لحظہ چھانے والے بادلوں کے پردے پر جیسے امی چند کی مسکراہٹ منقوش ہو کر رہ گئی۔ اس نے ریلنگ پر اپنی کہنی ٹکا لی اور سامنے خلا میں دیکھنے لگا۔

سورج مغرب کی پہاڑیوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ آسمان سے سیسوں کے سے سرمئی سائے اتر آئے تھے۔ دھرتی کو اجالے سے ان کا ملاپ روشنی اور تاریکی کی عجیب دنیا بسا رہا تھا۔ بادل نیچے کی گھاٹیوں سے اٹھ کر اس دنیا کو اور بھی خواب آلود بناتے ہوئے مال پر چھا رہے تھے۔ سامنے کی دکانوں کے قمقمے، مال پر سیر کرنے والوں کے ملبوسات کی رنگینی، ان کی آوازوں کا ترنم، رس، راگ اور رنگ کا یہ دلفریب امتزاج اس دنیا کو ایک عجیب ارمان بھری فضا سے معمور کر رہا تھا۔

دیکھتے دیکھتے بادل مال سے ذرا اور اوپر اٹھ کر جاکو کی طرف بڑھ گئے۔ رج کے اوپر اپنی شوندر سریالی کے ساتھ جاکو کا پہاڑ کسی دھیان مگن جوگی کی طرح اچل کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بادلوں کی یہ حسین نازنین اسے چھو کر اپنے سامنے رقص کر کے اس کے گلے سے لپٹ کر اس کی ریاضت کو ناکام بنانے کی سعیٔ بلیغ میں مصروف ہے۔

مال کی رونق لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی تھی۔ اپٹوڈیٹ سوٹ، رنگیل بھڑکیلی ساڑیاں، بے نئے فیشن کے گاؤن، جدت اور ندرت سے سنوارے ہوئے بال، غازے اور روج سے دمکتے ہوئے چہرے، خود نمائی اور خود ستائی کا پتہ دیتی ہوئی چالیں، دلفریب ٹیپ ٹاپ اور تنوع کے سبھی نمونے۔

لیکن چیتن کو گویا یہ سب کچھ وہاں نظر نہ آ رہا تھا۔ اسے تو سامنے کی دکانوں کے کنگوروں پر کھلتے ہوئے بادلوں کے رنگ میں امی چند کی وہی دور افتادہ مسکراہٹ منقوش دکھائی دیتی تھی۔ اس کا دل احساس کمتری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ "یہ سالا سردرائی۔ ایسے ہی ہو جائیگا!" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "اور میں تو دراصل کچھ نہیں پایا۔ میرے تصورات کی تو نیو بھی نہیں بن پائی" اس نے ایک گہرا سا سانس لیا۔ اور وہیں ریلنگ پر جھکے کھڑے اس کے سامنے اس کے تصورات کے محل ایک ایک کر کے ڈھنے لگے۔ اپنے اخبار میں انگریزی خبروں کا ترجمہ کرتے کرتے جب وہ تھک جاتا تھا۔ لگاتار گھنٹوں تک قلم چلانے کی وجہ سے اس کے انگوٹھے کا پوٹا سخت ہو کر درد کرنے لگتا تھا۔ اور اس کی آنکھیں جلنے لگتی تھیں تو وہ ذرا سستانے کے خیال سے آنکھیں بند کر کے، کرسی سے پیٹھ لگا کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیتا تھا۔ اور تصور ہی تصور میں مستقبل کے محل تعمیر کیا کرتا تھا۔ جونہی بھائی صاحب کی دکان جمی اور کچھ سرمایہ ہوا تو وہ انھیں مال روڈ پر دکان کھلوا دے گا۔ اس دکان میں مکتبہ بھی آ جائیگا۔ بھائی صاحب کی امداد سے وہ ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کریگا۔ پریس لگا لیں گے۔ اچھی اچھی کتابیں شائع کریں گے۔ بھیا دکان کا حساب کتاب دیکھے گا اور وہ خود باہر دورے کر کے کتابوں کی فروخت کا انتظام کرے گا۔ باقی چھوٹے بھائی بھی اسی دکان میں کھپ جائینگے۔ ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس مکتبہ کی شاخیں کھولی جائیں گی۔ اور دوسرے بھائی بڑے ہو کر ان کے کام کی دیکھ بھال کرینگے۔ رہی چندا تو وہ اس دوران میں پڑھ کر امتحان دیکر بی۔ اے کر لے گی۔ اور ان کے کام میں ہاتھ بٹائے گی۔ خوب روپیہ آئے گا۔ کسی طرح کی کمی نہ رہے گی۔ اور سب بھائی مل کر ماڈل ٹاؤن میں کوٹھی بنوائیں گے۔ ایک موٹر رکھ لیں گے اور.... اور.. "

ایک پتلا سا قہقہہ نے چیتن کی محویت کو توڑ دیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اسی فاصلہ پر مہاشے دھرم چند کھڑے ہیں۔ چیچک رو گول منہ کالی آنکھیں، سر پر پگڑی۔ گلے میں لمبا کوٹ اور ٹانگوں میں تنگ پاجامہ۔ یہ مہاشہ لاہور کے ایک ہفتہ وار کے ایڈیٹر اور پروپرائٹر تھے۔ کسی زمانہ میں ہفتہ وار اخبار کی بجائے ایک ہوٹل نما تنور کے مالک تھے۔ تنور پر کھانا کھانے آنے والوں میں لاہور کے دو چار ہونہار شاعر اور ادیب بھی تھے۔ ان کی صحبت اور ان کے اصرار سے ہوٹل کو تالا لگا کر انھوں نے ہفتہ وار اخبار جاری کر دیا۔ پنجاب میں ان دنوں ہفتہ وار اخباروں کی کمی تھی اور مہاشہ دھرم چند کے ہوٹل میں آنے والے ادیب زندگی کے اس دور میں سے گذر رہے تھے جب انسان کو دنیا میں اپنی جگہ بنانی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے اخبار کو انھوں نے اپنا آرگن بنا لیا۔ اور انہی اسباب کی وجہ سے مہاشے دھرم چند نہ صرف ہوٹل پروپرائٹر کی جگہ ایک ہفتہ وار کے پروپرائٹر اور ایڈیٹر بن گئے بلکہ ان کا اخبار بھی خوب چلا۔ لیکن جلد ہی ان کے دوستوں نے زندگی میں اپنی جگہ بنا لی۔ اور مصروف ہو گئے۔ اور اپنی ترقی اور پروپیگنڈہ کے دوسرے ذریعے انھوں نے سوچ نکالے اور ادبی رسالوں کی جگہ دفتری رسالوں میں الجھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی شاندار کامیابی کو دیکھ کر دوسرے ہفتہ وار نکل آئے۔ اخباروں نے بھی اپنے ہفتہ وار ایڈیشن شائع کرنے شروع کر دئیے۔ اور اس مقابلہ میں مہاشہ دھرم چند کے اخبار کا حال پتلا ہو گیا۔ خود وہ قریب قریب ناخواندہ تھے۔ اتنی قابلیت کہاں سے لاتے جس سے اخبار کا معیار قائم رہتا۔ اور اتنی شہرت پانے کے بعد پھر ہوٹل کا دھندا چلانا انھیں منظور نہ تھا۔ اس لئے اب وہ مشہور بلیک میلر (Black Mailer) تھے۔ ریاستوں کے حق میں یا خلاف لکھ کر، فلموں کی تعریف یا برائی کر کے بڑے بڑے سیٹھوں کو ان کی قلعی کھول دینے کی دھمکی دیکر وہ کسی نہ کسی طرح اپنے اخبار کے چھکڑے کو ٹھیلے جا رہے تھے۔ ان کا اخبار چار پانچ سو ہی چھپتا تھا لیکن اس کے پہلے صفحہ پر اب بھی "شمالی ہندستان کا سب سے کثیر الاشاعت ہفتہ وار" کے الفاظ شائع کئے جا رہے تھے۔

ان کے برابر ہی ایک صاحب اپنے پتلے دبلے جسم پر پتلون کے ساتھ شیروانی پہنے اپنے آہستہ آہستہ گنجے ہوتے ہوئے سر پر رومی ٹوپی سجائے کھڑے تھے۔ ان کے اجداد (ان کے

قول کے مطابق) ایک مشہور اور متمول گھرانے سے متعلق تھے لیکن انھیں باپ سے غریبی اور عزلت ہی ورثہ میں ملی۔ ان کے بھائی اس وقت بھی جالندھر میں ٹوپیاں سنا کر گذر اوقات کرتے تھے۔ لیکن ان کے گلے میں جادو تھا اور دماغ میں جوہر۔ اور انہی کی مدولت آج وہ مشہور شاعر تھے۔ کئی ریاستوں سے انھیں ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اور بڑی خوش اسلوبی سے انھوں نے زندگی اور آرٹ میں سمجھوتہ کر لیا تھا۔ سرکار نے خطاب سے بھی سرفراز کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اب وہ روز بروز آرٹ کی الجھنوں کی بجائے زندگی کی پیچیدگیوں میں الجھتے جاتے تھے۔ ان دنوں وہ اسلام کی تاریخ کو آرٹ کا خوبصورت لباس پہنا رہے تھے۔ اور مسلمان عقیدت مندوں نے ان کے نام کے ساتھ مولانا کا لقب بھی لگا دیا تھا۔ شملہ میں وہ بڑے بڑے نوابوں اور راجاؤں کے ہاں ٹھہرتے، ان کو اپنی تصانیف گا کر سناتے۔ داد پاتے اور شملہ کی سیر کے مزے لوٹتے۔

ان دونوں کے نزدیک ایک لنگڑا نوجوان سوٹ اور ہیٹ میں ملبوس کھڑا تھا اور شاعر موصوف کا رُخ دیکھ کر بات کر رہا تھا۔ وہ ہر سال شملہ میں آتا تھا اور ایک بڑے مشاعرہ کا اہتمام کرتا تھا۔ اور حقیقت میں اب تک تو اِس کمانے کے ساتھ آٹھ دس مہینوں کے پیسے کما کر گھر چلا جاتا تھا۔

یہ تینوں حضرات ... وہاں محض تماشہ دیکھنے کیلئے آ کھڑے ہوئے تھے یا اپنے دوستوں کا انتظار کر رہے تھے۔ یا نیچے کی بھیڑ کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ کر رہے تھے کہ ان کے شکاروں میں اس سال کون کون شملہ آیا ہے۔

بادل ذرا اور اوپر اُٹھ گئے تھے۔ جاکو کی متانت بڑھ گئی تھی۔ دکانوں کے کنگورے سرمئی آسمان کے پس منظر میں تصویروں کی طرح کھنچے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ دُکانوں کی روشنیاں لمبے لمبے سائے بنا رہی تھیں۔ ننھی ننھی بوندیاں گرنے لگی تھیں۔ اور یہ سائے ناچتے تھرکتے غائب ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ ہندوستان کے ہر صوبہ کے لباس گویا نمائش کے طور [illegible] تماشہ دیکھنے والا تھا

۔ جنگلہ پر بدستور کہنی ٹکائے جیسے کسی کھوئے کھوئے سے شخص کی طرح یہ سب شان و شوکت، چہل پہل، زندگی کی دلکشی اور ثروت کے پردوں پر اڑتی ہوئی کامیابی دیکھ رہا تھا۔ وہ خود ان سب سے دور تھا۔ وہ نہ تماشہ تھا نہ تماشائی۔ احساس کمتری جو کو یراج جی کی کامیابی اور رامی چند کی بے اعتنائی نے اس کے دل میں پیدا کر دیا تھا آہستہ آہستہ وہاں سے پھیل کر اس کے تمام اعصاب پر چھایا جا رہا تھا۔ اس کے پاس گرم سوٹ تک نہیں۔ گرم سوٹ تو الگ رہا ایک پُل اوور تک نہیں۔ قمیص اور پاجامہ کے اوپر اس نے برسوں کا پُرانا میلا، کھردرا اوور کوٹ پہن رکھا ہے۔

۔۔ اور وہ ان کامیاب و کامراں لوگوں کے درمیان کھڑا ہے۔ کون جانے امی چند ہی کی طرح خوبصورت سوٹ میں ملبوس اس کا کوئی ہم جماعت اس کے پاس آ کھڑا ہو اور اُسے پھر خفت اٹھانی پڑے۔ یہ سوچ کر اور ایک خوفزدہ سی نظر اپنے دونوں طرف کھڑے ہوئے لوگوں پر ڈال کر اوور کوٹ کے کالروں کو اپنے سینے پر کستا ہوا وہ سکنڈل پوائنٹ سے ہٹا۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ چُپ چاپ گھر چلا جائے اور جا کر سو جائے لیکن اس نے ابھی تک کھانا نہ کھایا تھا۔ اس کے رنج و غم کی گہرائیوں سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی ہوئی بھوک اس کے دل سے کامیابی، خوشحالی، فارغ البالی، مسرت اور شہرت کے تمام جذبات کو بھگا کر وہاں اپنا تسلط جما رہی تھی۔ وہ دُکھی تھا۔ غمگین تھا، ایک قدم بھی آگے نہ چلنا چاہتا تھا۔ لوٹ کر اپنے کمرے میں جا کر اپنے بستر میں منہ چھپا کر اپنی ناکامی کے مارکو اپنی آنکھوں کے راستے نکال دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بے طرح بھوکا تھا۔ اور اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اسی طرح واپس چلا گیا تو ساری رات اسے نیند نہ آئیگی۔

بھوک ... اگر کہیں یہ بھوک نہ ہوتی، پیٹ بھرنے کی یہ لاچاری نہ ہوتی اسے ہرگز اخباروں اور کویراج ایسے سرمایہ داروں کی غلامی نہ کرنی پڑتی۔ دُنیا کی لامتناہی وسعتوں میں وہ آزاد اور بے فکر گھومتا۔ بلا سے اس کے تن پر کپڑے نہ ہوتے، بلا سے اس کے پیروں میں جوتے نہ ہوتے وہ ان سب سے بے نیاز [illegible] سفر کرتا۔ پہاڑوں پر جا کر [illegible] کی سیر

وسعتوں کا نظارہ کرتا۔ صبح اور شام کے خوبصورت رنگوں میں ان کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی چھب کو دیکھتا۔ گنگناتے ہوئے جھرنوں کے پاس بیٹھ کر گھنٹوں ان کا مدھر اسنگیت سنتا۔ افق اور شفق کی رنگینیوں کا مشاہدہ کرتا۔ اس محبوب کا پتہ لگاتا جس کی تلاش میں یہ بے تکان بہنے والی ندیاں دن رات سرگرداں ہیں۔ لگاتار کروٹیں لیتے مضطرب بیدار سمندر کی بے کلی کا راز ڈھونڈتا سورج اور چاند کی اٹکھ کھیلیاں، اڈھم کر چلتے، گرجتے، برستے، اڑتے ہوئے بادلوں کا جنون، آسمان کی بلندی میں اڑنے والے پرندوں کا تجسس ـــ سب کی تھاہ پالیتا اور اس حسن سنگیت، انقلاب، اضطراب سب میں ڈوب کر انکی دھڑکن کے ساتھ اپنے دل کی دھڑکن کو ہم آہنگ کر کے زندہ جاوید نظموں کی تخلیق کرتا۔ . . . . لیکن یہ بھوک ـــ انسان کے پاؤں میں سب سے پہلی اور سب سے کڑی بیڑی ـــ یہ نہ ہوتی تو شاید انسان کھلونے کی بجائے کھلاڑی بن جاتا اس عظیم کاریگر کے برابر جا بیٹھتا۔

اور جگتیا ان ننھی ننھی بوندوں میں بھیگتا سڑک کے کنارے کنارے چلتا مڈل اور لوئر بازار پار کر کے چور بازار کے ایک گھٹیا سے تنور پر جا پہنچا ـــ جہاں سے وہ روز اپنے پیٹ کے تنور کو ایندھن بہم پہنچایا کرتا تھا۔

آخری کش!

سگریٹ؟
— تو جیسا میں نے ابھی آپ سے کہا،
میرے تخیلات میں پابندگی نہیں۔
ہر نظم —
کیپسٹن کا کوئی سرمئی مرغولہ ہے۔
اس وقت بھی ببول کی شاخوں کی آڑ میں
دوشیزۂ خیال کے تھکنے لگے ہیں پاؤں،
— میں اور زندگی سے پرے، یہ خموش گاؤں!!
آئے ہیں میری نظموں کا ماحول دیکھنے —
لیکن یہاں تو جیبی تصاویر بھی نہیں۔
"پیتل کا سانپ" اور نہ ٹیگور کے نقوش
بجلی کی [illegible] ح۔ زرد۔ ہری چھاؤں میں یہاں
زندہ مجسموں کی کمی [illegible] نہیں!!
— بیشک، فریب آرٹ کے حق میں ہے ایک جرم
یہ جرم جان بوجھ کے کرتا رہا ہوں [illegible]
ڈر ڈر کے آئینے میں سنوارتا رہا [illegible] کر رہا۔
تھوڑا سا اک سکون کہ ہے [illegible] بیں
میں کیوں نہ اس میں اپنے تئیں شادماں رہوں!
کچھ اور بھی ہے میرے تخیل کی چھاؤں میں۔
یہ آپ جانئے!

— اس وقت بھی ببول کی شاخوں کی آڑ میں
کوڑھی نظارے نقش و نگار افق میں مست
سہمے لگے ہیں جیسے کہ بیمار ہی نہیں —!
××× پنگھٹ کی اک حسینہ نے پائل کے شور میں
کیا جانے اک کسان سے چپکے سے کیا کہا،
پھر خود ہی اسکے چہرے پہ اک رنگ آ گیا۔
××× کچھ دور لڑیں اور چلے چپکے —
چلی گئی ———
"صاحب" نے رائفل کو اٹھا کر بطرز خاص
تالاب کے حسین پرندوں پہ داغ دی
— افسوس میرے ہاتھ کی سگریٹ لرز گئی!!
××× کھدّرے سیاہ پاؤں پہ کانٹوں کا کیا اثر
لیکن گلا تو گھونٹ ہی سکتے ہیں یہ ببول۔
اک نوجوان کسان کے رنگین خواب کا!!

سگریٹ؟
— تو جیسا میں نے ابھی آپ سے کہا
میرے تخیلات میں پابندگی نہیں!
— ممنون ہوں کہ آپ کے دھوکہ میں اتنی دیر
میں اپنے آرٹ ہی کا گلا گھونٹتا رہا —!
اتنی اُداس — اتنی پریشان شام
اچھا —
سگریٹ کے یہ حسین دھوئیں
اور ان سے دور —!
ہاں دور — اس ببول کی شاخوں سے تھوڑی دور!!

سلام
مچھلی شہری

"قصّہ پانچویں درویش کا"

ابو سعید قریشی

(میر امّن کی روح سے معذرت کے ساتھ)

صاحبو! اب یہ قلندر اپنی مرضی سے اپنی سرگذشت بیان کرتا ہے۔ اس میں آپ کو اُن پری جمالوں کا تذکرہ نہیں ملے گا جن کے بالوں کی لٹیں ناگنوں کی طرح ڈستی ہیں اور جن کی گھنی پلکوں کے سائے میں ساون کی سیاہ گھٹائیں سوتی ہیں۔ جن کے پسینے کو گلاب سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ جن کی پاپوش کی تعریف میں ساحروں کی زبانیں گھسی جاتی ہیں۔ ہاں، اس سرگذشت میں آپ کو اُن مہ وشوں کا ذکر نہیں ملے گا جن کے بیچ اکھیاں کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے لوگ میانی کھونے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اور جن کے ابروئے پرخم کے اشاروں پر راہ چلتوں کے لاشے تڑپتے نظر آتے ہیں۔ ان نوجوان، بوڑھوں اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کے لاشے جنہیں عام اصطلاح میں عاشق کہا جاتا ہے۔ جن کی زندگی آنسو بہانے، ٹھنڈی سانسیں بھرنے، مِنتیں کرنے اور قسموں کی جوتیاں کھانے ختم ہو جاتی ہے۔ اور بعد میں شاعری اور داستان گوئی کی میراث بنتی ہے۔ تو اے یاران اس قصّہ میں آپ کو کوئی ایسی بات نظر نہ آئے گی جو باعث انسانی عقل کی حیرانی کا ہو سکے۔ اس لئے استدعا آپ سے یہ ہے کہ اگر آپ میری کہانی کے بارے میں اس قسم کا کوئی داستانوی، تصور لئے بیٹھے ہوں تو اُسے ابھی بلکہ فوراً اپنے ذہن سے نکال دیجئے تاکہ پشیمانی کا کوئی امکان نہ رہے اور تکرار کی تمام راہیں سد ہو جائیں۔

یہ کہانی میری کہانی ہے ایک معمولی انسان کی کہانی اور معمولی انسانوں کی کہانیوں میں نگاہوں کو خیرہ اور عقل کو دنگ کرنے والی چیزیں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں اس لئے یہ ایک سیدھی سادی کہانی ہے جس کا ایک ایک حرف سچّا ہے۔ افسانوں کی چاشنی اور شاعری کا مبالغہ آپ اس میں نہ پائیں گے۔ صرف کہیں کہیں بقدر ضرورت جھوٹ کی آمیزش کی گئی ہے لیکن یاد رہے کہ یہ جھوٹ عام جھوٹ سے مختلف ہے۔ اس جھوٹ کو زرتشت کے ملک کے رہنے والے دروغِ مصلحت آمیز کہتے ہیں اور کسی بڑے سے بڑے محتسب اور اخلاق عامہ کے ٹھیکہ دار کو بھی اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

تو دوستو اب میں آغاز اس قصہ کا کرتا ہوں۔ اور اُن واقعات میں سے چند آپ کو سُناتا ہوں جو اس فقیر کو اپنی تیس سالہ زندگی میں پیش آئے۔ گو کہ میرے بال مثل بگلے کے سفید ہو رہے ہیں اور میرے گالوں کی ہڈیاں کسی پیر صد سالہ کی طرح اُبھری ہوئی ہیں مگر میری عمر صرف تیس سال کی ہے۔ لیکن میری یہ حالت جو آپ دیکھ رہے ہیں کسی عورت کے عشق میں نہیں ہوئی نہ میں حاتم کی طرح اپنی جان جوکھم میں ڈال کر دوسروں کی بگڑی بنانے کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں میں بھٹکتا پھرا ہوں اور نہ میرے سر میں فلسفے کا جنون سمایا ہے جس نے مجھے اس حالت کو پہنچایا ہو۔ میری اس بدحالی کی ذمہ داری نہ کسی سوتیلی ماں پر عائد ہوتی ہے نہ کسی حاسد بھائی پر۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی تباہی کا ذمہ دار کسی دوسرے کو ٹھہرانا میری نظر میں انتہائی درجے کی بزدلی اور کمینہ پن ہے۔ اس کے علاوہ تباہی اور بربادی کے اسباب اس قدر گوناگوں اور مختلف النوع ہوتے ہیں کہ ایک ہی سانس میں بیان ان کا ناممکن ہوتا ہے۔ اس لئے میں سب باتیں بتدریج عرض کرتا ہوں سُنو اور سوچو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔

بھائیو، نہ میں کسی بادشاہ کا بیٹا ہوں نہ وزیر زادہ نہ سوداگر بچہ۔ نہ میں چشتی ہوں نہ صابری، نہ قریشی ہوں نہ ہاشمی، نہ شیخ ہوں نہ سیّد نہ مُلّا ہوں نہ پنڈت، نہ بغدادی ہوں نہ کاشغری نہ غزنوی ہوں نہ بخاری۔ میں ایک انسان ہوں اور بس۔ ایک اچھے بھلے نام کو کسی شہر یا فرقے کے نام کے ساتھ منسوب کر کے میراثی کر ڈالتا ہے۔ انسان کو ملک و ملت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ اُس کی بدقسمتی ہے۔ بدقسمتی کا لفظ میں نے یہاں رسمی طور پر استعمال کیا ورنہ میں قسمت اور تقدیر کا قائل نہیں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ انسان اپنی قسمت خود

بتاتا ہے ـــــ لیکن شاید میں اپنے موضوع سے بھٹک رہا ہوں۔ ہاں تو میں یہ کہنے کو تھا کہ میں نہ کوئی نواب زادہ ہوں، نہ رائے زادہ، نہ خان زادہ۔ میرا باپ ایک معمولی برق انداز تھا۔ برق اندازوں کا سالار۔ اس کی ساری عمر چوری چکاری کی روک تھام میں کٹی تھی ـــ اپنے علاقے کو چوروں ڈاکوؤں اور بردہ فروشوں سے پاک کرنا یہ تھا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد۔ اپنے روزمرہ کام کے لئے تازہ دم ہونے کے لئے وہ بلاناغہ اپنی بیوی یعنی میری ماں کی طرف متوجہ ہوتا۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ ہر دسویں مہینے بچاری ایک نیا بوجھ اٹھانے کی تیاری میں ہوتی۔ وہ بارہ برس کی عمر میں بیاہ دی گئی تھی اور اتنا ہی عرصہ وہ میرے باپ کے گھر میں رہی اور اس مدت میں اُس نے ایک درجن بچوں کو جنم دیا۔ لیکن کرنا خدا کا یوں ہوتا کہ بچہ پیدا ہوتا اور چند ہی روز میں مرجاتا۔ آخرکار بارہویں بچے کی باری آئی اب کے بچہ تو بچ رہا لیکن ماں چلتی ہوئی ـــــ یہ بچہ یہی درویش تھا

جب میں بڑا ہوا تو مجھے مکتب بھیجا گیا۔ یہاں مجھے ایک مولوی صاحب کے سپرد کر دیا گیا کہ ڈاڑھی جن کی مثل جھاڑ کے تھی پیشانی پر ایک سیاہ نشان اُن کی عبادت کا اعلان کر رہا تھا اور عمامہ مبارک اُن کا اتنا بڑا تھا کہ کپڑے کے بےجا صرف کا قانون اُن پر آسانی سے عائد ہو سکتا تھا۔ لیکن کیونکہ قاضی جی کا صاحبزادہ بھی اُن کے شاگردوں میں سے تھا اس لئے اُن کے جرم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔

اِن مولوی صاحب کی خاص بات یہ تھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم گویا اُن کا تکیہ کلام تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ کسی بچے کے کان اینٹھنے لگتے تو بھی یہی کلمہ اُن کے وردِ زبان ہوتا۔ اور ان الفاظ کو وہ کچھ اس حساب سے ادا کرتے کہ الرحیم کے لفظ کے ساتھ شاگرد کی چیخ نکلنا لازمی تھی۔ اگر وہ کسی شاگرد سے بہت ہی برہم ہوتے تو گالی گلوچ پر بھی اتر آتے۔ لیکن اِن گالیوں میں عام طور پر عربی الفاظ کی بھرمار ہوتی اس لئے ہم انہیں سمجھ نہ سکتے۔ مولوی صاحب کی ایک اور خصوصیت جو مجھے اب تک یاد ہے وہ یہ تھی کہ اپنے کسی بھی شاگرد کو وہ اس کے اصلی نام سے نہیں پکارتے تھے۔ اگر انہیں کسی کو بلانا ہوتا تو اپنے عصائے مبارک سے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے: "ابے او مرغی کے بچے ـــــ ہاں ہاں میں تجھی سے مخاطب ہوں۔ اتنی دیر ہوگئی رٹاتے رٹاتے اور اب تک تجھے ک اور ق کا فرق بھی معلوم نہیں (کتے) مرغی کے بچے"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب کو مرغیوں سے خاصی دلچسپی ہے۔ جب کبھی محلے کی کوئی مرغی غائب ہوتی تو مولوی صاحب سے ضرور استفسار کیا جاتا۔ اس پر مولوی صاحب کی آنکھیں جیسے غصے سے سُرخ ہو جاتیں، وہ جلال کے عالم میں کھڑے ہو جاتے اور کہتے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ ابے او ملعون (یا ملعونہ) مرغی کے بچے مجھے کیا معلوم کہ کہاں ہے تیری مرغی۔ کوئی بلی ولی لے گئی ہوگی"

مولوی صاحب کے بعد جس دوسرے اُستاد سے میرا سابقہ پڑا وہ خان صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ انہیں کچھ ایسے بدصورت اور دُبلے پتلے لڑکوں سے نفرت تھی۔ اُن کے منظورِ نظر ہمیشہ وہی شاگرد ہوتے جن کے جسم میں چربی ہوتی، گال جن کے سرخ و سفید ہوتے اور جلد جن کی چکنی اور ملائم ہوتی۔ انہیں وہ بہت پیار سے پڑھاتے۔ سبق یاد کرنے کے عوض انہیں میوہ، آلوچے، خوبانیاں اور اسی قسم کے دوسرے پھل وغیرہ دیتے۔ اور اس کے برعکس باقی طلبا کے حصے میں بے رُخی تھی اور گالیاں اور اسی پر بس نہ تھا۔ ہمارے ہاتھوں پر قمچیوں کی بارش ہوتی۔ ہمیں پہروں مرغا بنا پڑتا ہمیں پیشاب تک کے لئے چھٹی نہ ملتی۔ نتیجہ ان تمام باتوں کا یہ ہوا کہ تعلیم سے مجھے نفرت ہوگئی، اور ایک روز میں نے مکتب جانے سے انکار کر دیا۔ باپ میرا اس پر بہت برہم ہوا اور مجھے فوراً گھر سے نکل جانے کو کہا۔ لیکن جب میں نے اس پر عمل نہ کیا تو اُس نے مجھے ایک کمرے میں بند کر کے اتنا پیٹا اتنا پیٹا کہ میں بیہوش ہو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو ہمارا ایک معمر خادم میری تیمارداری کر رہا تھا اُسے میری بےبسی پر بہت رحم آیا اور اُس نے میرے والد سے میری سفارش کی اور اپنی وفاداری کا واسطہ دیتے ہوئے مجھ پر رحم کرنے کو کہا۔ اس پر میرے باپ کا غصہ قدرے فرو ہوا اور جب میری طبیعت کچھ بحال ہوئی تو ایک دوسرے مکتب میں مجھے بھیجا گیا تاکہ اپنی تعلیم پوری کر سکوں لیکن اُس زمانے میں شاید تعلیم گاہوں کی فضا ہی کچھ ایسی تھی کہ معلموں کی شکل میں ایک سے ایک بڑا قصائی وہاں بھرا پڑا تھا۔ اور اس بار رسمی تعلیم کا جو تجربہ مجھے ہوا وہ پہلے سے کم تلخ نہ تھا۔ اس مکتب میں یہ اصول تھا کہ ہر طالب علم کا سر اُسترے سے مُنڈا ہوا ہونا چاہیے تاکہ سر کو ہوا لگتی رہے، مسام کھلے رہیں اور دماغ کو تازگی حاصل ہو۔ اور اس کام کے لئے مُلا جی نے ایک نائی سے

ٹھیک کر رکھا تھا۔ چنانچہ مکتب میں پہلے ہی دن میرے احتجاج کی پروا نہ
کرتے ہوئے حجام نے میرا سر اپنے گھٹنوں میں جکڑ لیا اور ایک کند
اُسترے سے میرے سر کے سارے بال مونڈ ڈالے اور بعد میں زخموں
کو ٹھیک کرنے کے لئے سر پر راکھ ملی اور میری گردن میں ہاتھ دیکر
مجھے مولوی صاحب کے سامنے دھکیل دیا گیا۔ اپنی زندگی کا یہ
واقعہ مجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا
تو وہ بال غائب جن کے گھنگروں میں انگلیاں ڈالے میں اکثر
اپنی زبوں حالی پر غور کیا کرتا تھا۔ ہاں تو اُن گھنے گھنگریالے
بالوں کی جگہ اب ایک چٹیل میدان تھا اور آپ اپنے سفر کے دوران
میں چٹیل میدانوں سے گذر چکے ہیں خوب جانتے ہیں کہ چٹیل
میدان کیا ہوتے ہیں۔ خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ سر میرا مانند
ایک انڈے کے نظر آنے لگا۔ اور صاحبو کیا عرض کروں معشوقوں
کے دھول دھپے تو آپ نے سہے ہونگے اور آپکو اُن کا تجربہ بھی
ہوگا۔ لیکن ایک مولوی صاحب کا ہاتھ جن کا مثل پہاڑ کے تھا۔
کے دھول دھپے سے آپ واقف نہیں ہونگے لیکن مجھے اس کا
تجربہ ہے۔ ہاں تو دوستو وہ قینچی کا سا ہاتھ ہوتا اور طلب
کے سر یا تو یوں سمجھئے کہ ہم کچھ ایسے سخت جان ہی تھے جو سب
کچھ جھیل گئے اور جیتے رہے۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ وقت کی
آغوش میں ہمارے لئے ابھی کیا کچھ رکھا ہے۔ تعلیم ابھی اپنی ابتدائی
منزل سے بھی نہیں گذری تھی کہ ایک اور خون کو کھولا دینے والا
دور شروع ہوا ۔۔۔ بے چینی، لذت اور افسردگی

ہوا یہ کہ جس محلے میں تھا ہمارا گھر، وہیں رہتا تھا ایک
سوداگر۔ اور جیسا کہ آپ نے اکثر پڑھا ہوگا [illegible] سوداگروں
کی طرح اس کی بھی ایک بیٹی تھی۔ [illegible] اتنا تھا کہ وہ خوبصورت
تھی اور باپ اس کا کسی امیر کبیر اور حسین بر کی تلاش میں تھا۔
لیکن وہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس لئے بیس برس کی ہونے کو آئی تھی
لیکن کنواری تھی۔ باپ اس کا اپنے کاروبار کے سلسلے میں اکثر
سفر پر رہتا۔ ماں اُس کی مر چکی تھی اور گھر پر صرف وہ تھی اور
ایک معمر خادمہ۔ ایک روز کا ذکر ہے سردیوں کے دن تھے
میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا دھوپ لے رہا تھا اتنے میں
نگاہ جو اُٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ سوداگر بچی اپنے کوٹھے پر بیٹھی
اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ گریبان اُس کا کھلا ہوا ہے
اور اُس کے نیچے اُس کا گدرایا جسم یوں جھانک رہا ہے جیسے
ٹ گھٹ۔ الک چلمنوں کی اوٹ میں کھڑے آنکھ مچولی کھیلیں۔ مجھے دیکھا
تو مسکرا پڑی۔ سہانے موسم کا اثر تھا، عمر کا تقاضا یا کچھ اور کہ میرے
جسم میں ایک لہر سی اُٹھی اور کان میرے سرخ ہوگئے۔ اور مجھے یوں
محسوس ہوا جیسے میں کوئی جرم کر رہا ہوں۔ میں نے گھبرا کر اسکی
طرف دیکھا۔ وہ پھر مسکرائی اس بار میں بھی مسکرا دیا لیکن اسکے
ساتھ ہی اس ہونی کے خوف سے میرے دانت میرے ہونٹوں کے
پیچھے چھپ گئے۔ اسی احساس گناہ سے چھپنے کے لئے میں دو دو
سیڑھیاں پھلانگتا نیچے اُترا اور اپنے جسم کے اندر جلتی ہوئی ایک
عجیب غریب قسم کی آگ کو بجھانے کے لئے پانی کی پوری صراحی
خالی کر گیا اور ہانپتا کانپتا زمین پر رکھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گیا۔
ابھی میرا سانس بھی ٹھیک نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر دستک
ہوئی۔ کنڈی کھولی تو دیکھا کہ سوداگر کی معمر خادمہ میرے سامنے
کھڑی ہے دیکھتے ہی بلائیں لینے لگی اور بولی کہ بیٹا تمہیں اک
ذری تکلیف دینے آئی ہوں۔ تمہارے چچا سوداگر کا خط آیا ہے۔
بچی نے تمہیں بلوا بھیجا ہے کہ ذری خط پڑھ جاؤ۔ یہ سب کچھ اس
سرعت سے ہوا کہ مجھے سوچنے تک کی فرصت نہ ملی اور میں جس
حال میں تھا اسی میں بڑھیا کے ساتھ ہولیا۔ جب ہم سوداگر کے
مکان پر پہونچے تو بڑھیا نہ جانے کس چیز کا بہانہ کرکے باہر چلی
گئی اب میں تھا اور سوداگر بچی۔ ایک عالم نوجوان اور ایک
تندرست عورت۔ اس کے قرب میں ایک عجیب اضطراری کیفیت
اپنے انگ انگ میں محسوس کر رہا تھا۔ وہ میری پریشانی کو تاڑ
گئی اور خود ہی میری مدد کو پہونچی۔ اس روز زندگی میں پہلی
مرتبہ مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ دُنیا میں دُکھ کے علاوہ
اور بھی کوئی چیز ہے۔ لذت! اب میرا اس کا ایک طرح کا سمجھوتہ
سا ہوگیا کہ جب بھی ممکن ہو میں اُس سے ضرور ملوں۔ لیکن ان
تعلقات میں محبت کو کوئی دخل نہیں۔ یہ صرف جسموں کی پکار تھی۔
اور ایسے موقعے ہمیں روز ملنے لگے اور یہ سلسلہ بہت دنوں چلا۔
حتیٰ کہ میری آنکھوں میں زردی چھاگئی اور ایک دن میرے باپ
کو پتہ چل گیا کہ میری آنکھیں زرد کیوں رہنے لگی ہیں اور میرے
گال کیوں پچک رہے ہیں۔ اُس نے اب یہی بہتر سمجھا کہ میری
شادی کردی جائے میں نے اس فیصلے کے خلاف صدائے احتجاج
بلند کرنی چاہی، اس لئے کہ شادی کو ایک حسین چیز بنا کر پیش
کرنے والے جذبات مجھ میں ختم ہو چکے تھے۔ اور میں انہیں چاہتا تھا

کر ... دیہاتی اُس کو طوق کے ساتھ جوت دیا جاتا ہے جسے گرہستی کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن بجائے میری ایک نہ چلی اور ایک روز مجھے کسی مداری کے بندر کی طرح رنگارنگ کے کپڑے پہنا کر ایک مانگے تانگے کے اسپ پر سوار کیا گیا اور باجوں گاجوں کے شور و غوغا کے درمیان مجھے اُس عورت کے مکان پر لے گئے جسے میری بیوی بننا تھا اور چند ... جبر حرکتوں کے بعد اسے ایک ڈولی میں ڈال میرے ساتھ کر دیا گیا۔ گھر پہنچ کر میرے رشتے کی خالاؤں اور ممانیوں اور پھوپھیوں اور چچیوں نے ہمیں ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اُن کی اِس بے حیائی پر میں اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا لیکن اپنے باپ کے غضب کے خوف سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا اور باہر وہ چہلیں کر رہی تھیں۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ جس بات کے تصور پر اُنہیں ہنسی آ رہی ہے اُنہیں گدگدی ہو رہی ہے وہ ظہور پذیر نہیں ہو رہی۔ نہیں ہوگی۔ نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ قصّہ مختصر ہوی میری جسے صبر کی تعلیم ملی تھی ایک آتشِ خاموش سے شادی کے دو ہی مہینے بعد بھسم ہو گئی۔ دِق کی آگ میں جل بجھی اور اس کے چند ہی روز بعد میرا باپ بھی دل کی حرکت بند ہونے ... باعث راہی ملکِ بقا ہوا۔

میں ابھی اپنے باپ کو دفن کر کے لوٹا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شیخ عمامہ و جبہ پہنے حضرت اسلام وعلیکم کہتے ہوئے میرے یہاں وارد ہوئے اور رسمی سی فاتحہ کے بعد مجھے علیحدگی میں لے جا کر فرمانے لگے کہ بیٹا اب اُس رقم کا کیا بنے گا جو تمہارے ابا مرحوم نے تمہاری شادی خانہ آبادی کے سلسلے میں مجھ سے قرض لی تھی؟ بیس فی صدی اُس کا سود ہے۔ ہاں۔ اگر کسی وجہ سے ادا نہ ہو سکے تو میں اس مکان پر ہی اکتفا کرونگا۔ ہاں تم اپنے بچے ہو اور میں تمہیں ناحق پریشان نہیں کرنا چاہتا ــــ یہ سُن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور بچاؤ کا مجھے صرف وہی راستہ نظر آیا جو شیخ نے تجویز کیا تھا۔ چنانچہ میں نے دو چار روز ٹھیر کر تمام دستاویزات وغیرہ مکمل کر دیں۔

اے یاران اِن تمام واقعات کے بعد خودکشی کر لینے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن مرنا شاید اتنا ہی مشکل ہے جتنا جینا۔ ہر درد ... کے لئے ہمت درکار ہوتی ہے اور اسی چیز کا مجھ میں فقدان تھا ... سے خودکشی کے ارادے کو میں عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ ... کس شہر میں جینا بھی تو میرے لئے دوبھر ہو رہا تھا۔ سر چھپانے کو جگہ نہ تھی۔ اس لئے میں نے بعد از حد غور و فکر یہ فیصلہ کیا کہ سفر پر جانا چاہیئے۔ جو ہو سو ہو ــــ اِس سفر کے دوران میں مجھ پر کیا کچھ بیتی یہ کبھی اگلی صحبت میں عرض کروں گا۔

آفتاب طلوع ہوا چاہتا ہے۔ لوگ باگ اپنے کام کاج پر جا رہے ہیں اور کہتے ہیں دن کو کہا سنا کہنے سے راہی راستہ بھول جاتے ہیں۔ اِس لئے باقی پھر یار زندہ صحبت باقی۔

شرابی کی ڈائری

ایم۔ اے۔ لطیف

تانگے والے سے ہم نے پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وقت سے ریلوے اسٹیشن پہنچا دے گا تو منہ مانگے دام ملیں گے، ورنہ جو ہماری مرضی۔ شاید اس نے پی رکھی تھی، فوراً حامی بھر لی، اور ہم چل کھڑے ہوئے۔

"رُخ رُخ رُخ چلا چل بیٹے۔ ساون کے نظارے ہیں، ہا ہا ہا ہا کھپ کھپ کھپ کھپ شاباش، بیٹے"

تانگے والے کی لے سُری تان، اور پکی سڑک پر ٹاپوں کی موزوں بے موقع تال، بڑا لطف آ رہا تھا ہم چاروں، وسیک وقت ریڈیو، سرمایہ داری، جنگ، اور ترقی پسند ادب پر بے تکان تقریریں کئے چلے جا رہے تھے۔

"رُخ، رُخ، کلموں کی آنکھوں میں ہا، ہا، بس بیٹے بس ــــ اے! بس!"

یکایک تانگہ رُک گیا۔

"کیوں بھئی، کیا بات ہے؟" میں نے مڑکر دریافت کیا۔

سامنے بیٹھے ہوئے ہمارے ساتھی نے کہا۔

"کوئی وردی والے صاحب ہیں۔ ہاتھ دیکھ کر روک لیا ہے۔"

تانگہ والا زیرِ لب بڑبڑایا۔

"اجی کوئی نہیں وہی ہیں، سالے"

خاکی وردی پہنے ہوئے، ایک ادھیڑ عمر کا ہندوستانی آگے بڑھا۔ ہم لوگوں پر ایک فاتحانہ نظر ڈالی، اور قبل اس کے کہ ہم میں سے کوئی کچھ پوچھ گچھ کر سکے۔ اس نے تانگے والے کو ڈانٹ بتائی

"کیوں بے؟ ہمیں سے یہ چالاکی؟"

"ارے صاحب، بھلا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟" تانگے والے نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔

وردی والے نے ڈپٹ کر کہا۔

"چلو سیدھے، بدمعاش کہیں کے!"

میرے شاعر دوست کو غصہ آ گیا:

"یہ کیا بات ہے، جی؟ کہاں لئے جاتے ہو اسے؟ کون ہو، تم؟"

ان تینوں سوالوں کے جواب میں جو بیان سننے میں آیا، اس سے ہم سب پر واضح ہو گیا کہ وردی والا ایک ہمدرد، خادمِ قوم تھا، اور اس کا تعلق اس انجمن سے تھا۔ جس کا پہلا اور آخری مقصد ہے، بے زبان جانوروں سے بے رحمی کا برتاؤ کرنے والوں کا چالان کر کے انہیں اپنے کئے کی سزا دلوانا!

"دیکھئے، اب دیکھئے!"

وردی والے نے گھوڑے کی دُم اُٹھا کر اس کی جڑ میں ایک سرخ سے بدنما نشان کی طرف ہماری توجہ دلائی۔

"یہ گھوڑا زخمی ہے، بیمار ہے، بیچارہ بے زبان جانور نہ کچھ کہہ سکتا ہے، نہ کر سکتا ہے، اور یہ تانگہ والا۔ اجی یہ سب بڑے حرامزادے ہوتے ہیں، یہ تانگے والے۔ آپ لوگوں کو تکلیف تو ضرور ہوگی، لیکن میں تو اسے سزا دلوائے بغیر نہیں مانوں گا!"

ہم چاروں پر اس تقریر کا بڑا اثر ہوا۔ طبیعت بے اختیار چاہی کہ "انسانیت زندہ باد" کا نعرہ بلند کریں، اور فوراً چندہ کر کے ایک جلوس نکالنے کا انتظام کریں لیکن وقت کم تھا، اسی پر اکتفا کی کہ فوراً تانگہ سے اُتر پڑے۔ وردی والے کو سر تا پا اس مؤدبانہ انداز سے دیکھا جیسے کوئی کسی بڑے محسنِ قوم کے مرمریں مجسمہ کو دیکھتا ہے اور تانگے والے کو اس طرح جیسے لبوں پر سُرخی لگانے سے انکار کرنے پر بیوی کو۔ پھر ایک ایک تازہ سگریٹ سلگا کر ہم نے دفتر کا رُخ کیا۔

سامنے موڑ پر نیم کے نیچے، ایک ننگی دھڑنگی بڑھیا، سر جھکائے، ہاتھ پھیلائے، پیٹ کو روتی، اور تن کو کپڑا مانگ رہی تھی۔ اُسکے بازو پر رِستے ہوتے زخم کا ایک سوخ بدنما داغ، منہ کھولے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پیچھے سے ایک تیز رفتار تانگہ کھپ کھپ کرتا چلا آ رہا تھا مڑ کر دیکھا، تو وہی خاکی وردی والا ہمدردِ قوم، تانگہ میں بیٹھا تھانے کی طرف جا رہا تھا۔

بڑھیا نحیف آواز میں گنگنا رہی تھی:-

"یا وہ مولا۔ پیٹ کو روٹی، تن کو کپڑا"
تانگے میں بیٹھا ہوا، فرسٹی مولا سے تان تان کر تانگہ
والے سے کہہ رہا تھا:
"بے زبان جانوروں پر ظلم کرتے ہو، شرم نہیں آتی؟"

. . . .

. . . گھنٹے گزرتے گئے، ہم دونوں میں فضول خرچی اور کفایت شعاری پر بات چیت ہوتی رہی۔ کچھ دور چلے تھے، کچھ اور چلنے کا ارادہ تھا۔ میرے دوست کہنے لگے:
"کفایت شعاری ہر حال میں لازم ہے۔ لیکن یہ لفظ جو ہے یعنی کفایت شعاری، تو یہ لفظ بھی ایک نسبتی لفظ ہے۔ سمجھے؟ یعنی موقع محل کی مناسبت سے۔ مثلاً اس وقت جو ہم نے پی رکھی ہے، تو درحقیقت یہ بھی ایک طرح کی کفایت شعاری ہے۔ فضول خرچی اس لئے نہیں کہ "
فٹ پاتھ کے قریب اونچے ستون پر ایک لاؤڈ سپیکر لگا ہوا تھا۔ ایک پاٹ دار قسم کی کرخت آواز کہہ رہی تھی:
"جب آپ اپنے گھر سے کوئی چیز خریدنے کے لئے بازار جائیں . . "
میں نے دو قدم چل کر اپنے دوست سے کہا:
"بھئی ٹھیک کہتے ہو تم۔ کفایت شعاری ہر حال میں لازم ہے۔ روپیہ پیسے ہی کے معاملہ میں نہیں، بلکہ الفاظ کے استعمال میں بھی۔"
میرے دوست نے کچھ عجیب سوالیہ سے انداز سے میری طرف دیکھا۔ میں نے تشریح کرتے ہوئے کہا:
"لاؤڈ سپیکر کے الفاظ سنے تم نے؟ 'جب آپ اپنے گھر سے کوئی چیز خریدنے بازار جائیں۔' سنا تم نے؟ یعنی اپنے گھر سے کوئی چیز خریدنے جائیں، تب، کسی دوست یا رشتہ دار کے گھر سے جائیں تو نہیں۔ اور گھر ہی سے جائیں، دفتر سے یا کارخانے سے نہیں، اور جائیں تو بازار ہی جائیں، جنگل یا قبرستان نہ جائیں۔ . . ."
میرے دوست کو کچھ ہنسی آ گئی۔
"مطلب کیا ہے، تمہارا؟"
"مطلب یہ کہ اسی مفہوم کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا تھا: جب آپ کوئی چیز خریدیں۔ آیا سمجھ میں؟"
"سمجھا، یہ وہ کفایت شعاری والا معاملہ ہے۔ کفایت شعاری؟ خوب، خوب ـــ"
اس وقت ہم ریسٹورنٹ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔
میرے دوست نے کہا:
"آؤ اسی بات پر ایک ایک اور"
میں نے کچھ تامل کرتے ہوئے جواب دیا:
"بھئی ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ کفایت شعاری کا مفہوم . . " جملہ پورا ہونے سے قبل میرے دوست ریسٹورنٹ میں داخل ہو چکے تھے۔
میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔

. . . .

آج کچھ وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ ریسٹورنٹ کے وقت سے پہلے نہیں، ملاقات کے مقررہ وقت سے پہلے۔ دو ایک قابلِ ذکر واقعات مشاہدے میں آئے تھے، سوچا وہیں چل کر، اپنے دوست کے آنے سے پہلے ہی انہیں قلمبند کر لوں۔
بیئر کا ایک جگ منگوا لیا، اور اس میں کوئی پاؤ بھر برف۔ گلاس بھرا ایک ہی سانس میں آدھا کر کے میز پر رکھ دیا۔ اور کاغذ پنسل نکال کر لکھنے لگا۔ لکھنے میں کچھ ایسا محو ہوا کہ گلاس آدھا کا آدھا ہی رکھا رہا۔ اور ادھر میرے دوست آ پہنچے، اپنے ایک اور دوست کے ساتھ۔ تعارف ہونے پر معلوم ہوا کہ میرے دوست کے دوست ایک بڑے ادیب ہیں۔ مشہور تو نہیں، لیکن بڑے ضرور ہیں۔ سرمایہ داری کے خلاف، اور مزدوروں کے حق میں بہت کچھ لکھتے رہتے ہیں، اور لکھتے رہیں گے۔
میرے دوست نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:
"شہرت اور دولت تو ان کے قدموں پر لوٹتی ہوتی، اب تک۔ لیکن "
قریب سے بوائے گزر رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ بوائے کو میں 'بوائے' کہہ کر کبھی نہیں بلاتا۔ ذہن میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ 'بوائے' معنی 'لڑکا'، اور یہ منگانے والے ساقی ہر عمر اور وضع قطع کے ہوتے ہیں، زیادہ تر داڑھی مونچھ والے کریہ المنظر۔
میں نے کہا: "بھئی بڑے میاں! ذرا دو گلاس اور لیتے آنا۔"
دو گلاس، پر میرے دوست کے ادیب ساتھی کچھ چونکے، میز

[illegible] ایک گرفت آواز میں بولے:

"معاف کیجئے گا میں نہیں پیتا۔"

میں دل ہی دل میں سوچنے لگا:

"یہ حضرت ادیب کہاں کے ہیں؟ "معاف کیجئے گا" کیا معنی ہے؟ "گا" قطعی زائد ہے "کیجئے" کافی تھا۔" باآواز میں نے کہا:

"کوئی بات نہیں۔ معاف کیجئے۔"

"کیجئے" پر خاص طور سے زور دیا اور فوراً سانس روک لی، تاکہ "کیجئے" کے بعد "گا" کا گمان تک نہ ہو۔ پھر اپنے گلاس کو گرفت میں لے کر اپنے دوست سے مخاطب ہوا۔

"بھئی، تم تو پیو گے نا؟ یہاں "پیو" کے بعد "گے" کا استعمال بالکل درست ہے۔"

میرے دوست نے تعجب سے مجھے دیکھا

"کیا؟ "گے" کا استعمال کیا؟"

میں فوراً چونکا۔

"نہیں، کوئی بات نہیں۔ وہ دراصل ریڈیو بج رہا ہے نا تو اس گانے کا راگ یعنی سرگرم سا، رے، گا، گا اور گے ایک ہی بات ہے، سمجھے؟ خیر... اچھا تو گلاس آگے کیجئے۔"

پینے کے تصور نے میرے دوست کے استعجاب کو بالکل نابید کر دیا۔ میں نے اپنے بچاؤ کی خاطر اُن سے سوال کیا۔

"ہاں، وہ کیا کہہ رہے تھے، تم؟ شہرت اور دولت اپنے گھر کی لونڈی ہوتی لیکن...؟"

"ہاں، لیکن" میرے دوست نے [illegible] کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن دراصل بات یہ ہے کہ..."

میرے دوست نے اپنے دوست پر ایک اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی جو چھت میں لگے ہوئے بجلی کے پنکھے کو تکنے لگے۔ اُن کی ہمت افزائی کی خاطر، میں نے اُن کا گلاس بھر دیا۔ اُنہوں نے جھٹ پٹ دو چار گھونٹ لگائے اور لب چاٹتے ہوئے بولے:

"بلکہ اصل یہ ہے کہ آپ اپنے نام سے نہیں لکھتے یعنی لکھ کر دے دیتے ہیں ایڈیٹر کو۔ اور وہ یعنی تیس روپے ماہانہ پر معاہدہ ہو چکا ہے۔ مہینے میں یہ جو کچھ لکھتے ہیں انہیں دے دیتے ہیں۔ اور وہ انہیں معاوضہ دے دیتے ہیں۔"

میں خاموشی سے اثبات میں سر ہلا رہا تھا، اور حضرت ادیب اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے مجھے گھور رہے تھے۔

میرے دوست نے ایک بار اُن کی طرف دیکھا، ایک بار میری طرف، اور پھر جرأت رندانہ کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے گلاس ختم کیا۔ اور سگریٹ سلگا کر شگفتہ آواز میں بولے:

"آپ ماشاء اللہ لکھتے خوب ہیں، بہت خوب۔ زیادہ تر سرمایہ داری کے خلاف، اور مزدوروں کے حق میں۔"

میں اپنے گلاس کی سطح پر پنکھے کے متحرک عکس کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔

میرے دوست نے سگریٹ کا لمبا کش لیا، اور گلا صاف کر کے بولے "آپ کے نزدیک مزدوروں میں سبھی شامل ہیں مٹی کھودنے والے، ہل چلانے والے، بھیک مانگنے والے... اور... اور بازار میں بیٹھنے والی عورتیں۔"

میں نے پھر خاموشی سے سر ہلایا۔ میری اس مسلسل خاموشی پر حضرت ادیب کچھ تنک سے گئے، اور جھنجھلا کر بولے۔

"جی، بازار کی رنڈیاں۔ خدا کی وہ مجبور مفلس مخلوق جو بھوک سے تنگ آکر پیٹ بھرنے کی خاطر مجبوراً اپنا جسم بیچتی ہے روپیہ روپیہ، اور آٹھ آٹھ آنے میں!"

میں نے گلاس میں سر اُنڈیلتے ہوئے کہا۔

"جی، میں سمجھ گیا۔ بالکل درست فرمایا آپ نے۔"

میرے دوست نے میری طرف دیکھا، اور میں نے اُن کے دوست کی طرف۔

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔ بھوک انسان کو مجبور کر دیتی ہے۔ عورت کو اپنا جسم بیچنے کے لئے، اور... اور..."

جملہ پورا کرنے سے قبل میں نے دانستہ اُنکے چہرے سے نظر ہٹا لی۔

"... اور مرد کو اپنا دماغ بیچنے پر۔"

—— "پی لے، پی لے، موہے راجا" ریڈیو پیٹ متواتر منت اور تاکید کئے جا رہا تھا —— "موہے راجا، پی لے، پی لے ——"

میرے دوست اور اُنکے ادیب دوست جا چکے تھے۔ غالباً وہ میرے آخری جملے کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔

—— "پی لے، پی لے ——"

سوچا لاؤ ایک گلاس ریڈیو کے کہنے پر بھی پی ہی لوں [illegible]

بیئر کا ایک گلاس منگوایا ــــ

ــــ "مورے راجا" ــــ

راجہ، سرمایہ داری، مزدور، بھوک، مجبوری ـــ جسم، دماغ......

دماغی الجھن بڑھنے لگی فوراً گلاس ختم کیا اور بل ادا کر کے باہر نکل گیا......

نیم تاریک گلی میں، نکڑ پر ایک مریل فقیر بیٹھا تھا۔ اُس میں اتنی بھی سکت باقی نہ تھی کہ صدا تک لگا سکے۔ اُسکے قریب فٹ پاتھ پر ایک موٹا تازہ کتا اگلے پنجوں پر تھوتھنی رکھے ہانپ رہا تھا ریسٹورنٹ کا ریڈیو سیٹ برابر مست کئے جا رہا تھا۔

ـــ "مورے راجا۔ پی لے" ـــ

اچانک گلی کے نکڑ والی عمارت کی بالائی کھڑکی کھلی، بجلی کی روشنی نے پل بھر کے لئے تاریک گلی کو منور کر دیا، اور گرم تازہ کھانوں کی بھوک تیز کر دینے والی مہک فضا میں پھیل گئی۔

فقیر کی نظر یکبارگی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی، اور کتے کی بھی۔ اُوپر سے کسی نے کاغذ کا ایک بڑا سا پڑا گلی میں پھینکا۔ زمین تک پہنچتے پہنچتے ... پڑا کھل گیا، اور اس میں سے روٹی کے کچھ ٹکڑے، دو چار آلو، اور بوٹیاں ... سو سافٹ پاتھ پر آ رہے۔

ایک طرف سے فقیر نے اپنا سوکھا ہاتھ بڑھایا، اور دوسری طرف سے کتے نے اپنا پنجہ!

میں ٹھٹھک کر دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

آن واحد میں کتے نے ادھ مرے فقیر کو گردن سے دبوچ لیا، اور کھانے پر قابض ہو گیا! کھڑکی بند ہو گئی، اور گلی میں پہلے سے زیادہ تاریکی چھا گئی۔

ریڈیو سیٹ کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔

ـــ "پی لے، پی لے۔ دوزخ سے نہ ڈر" ـــ

دوزخ سے نہ ڈر؟ دوزخ سے؟ اگر دوزخ ہے تو اس سے نہ ڈرنا کیا معنی؟ میری نظروں کے سامنے بھی دوزخ ہی تھی خوفناک اور بھیانک!

میرے پاؤں لڑکھڑائے۔ جی گھبرانے لگا ـــ میں سانس لینے کے لئے گلی سے باہر سڑک پر آ گیا۔

ماشاءاللہ، قدم قدم پر ایک کتاب کھلی رکھی ہے۔

"برگِ درختانِ سبز" تو رہے الگ، پولیس والوں کی للکار، فقیروں کی آہ و زاری، خوانچہ والوں کی آپس میں گالی گلوچ، بچوں کی چیخ پکار، گھوڑوں اور بیلوں کی ننگی پیٹھ پر چمڑے کے چابک کی بھدی آواز ـــ ان میں بھی تو "معرفتِ کردگار" نظر آتی ہے!

پی لو، تو دماغ کے تاریک اُفق پر آفتاب نمودار ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے پردے اُٹھ جاتے ہیں، اور قدم قدم پر ایک کتاب نظر آتی ہے، کھلی ہوئی ـــ

اگر میں ہر قدم پر ایک ایک کتاب دیکھتا اور پڑھتا رہا تو پاگل ہو جاؤں گا ـــ

تو کیا شراب چھوڑ دوں؟ ـــ

کیا اسی لئے شراب حرام کی گئی ہے؟

مطبوعاتِ ساقی بکڈپو دہلی

تصانیف مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم

کولتار۔ اس کتاب میں پندرہ نہایت زیادہ دلچسپ اور مزاحیہ افسانے ہیں اور یہ سب افسانے مل کر کتاب کو پورا مزاحیہ ناول بنا دیتے ہیں۔ مزاحیہ نگاری اور افسانہ نویسی کا اگر کمال دیکھنا ہو تو یہ کتاب ضرور دیکھیے اسی طرز کا پہلا ناول ہے شاہدہ کی زبردستی کی شادی کے لطیفے سے قصے میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ خانم والی کی داستانِ محبت بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ قیمت دو روپے!

روحِ ظرافت۔ چغتائی صاحب کے آٹھ دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے اس کتاب کا دیباچہ اس قدر پُرلطف لکھا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا پہلا افسانہ "انگوٹھی کی مصیبت" وہ مشہور و معروف افسانہ ہے جو چغتائی صاحب کی شہرت کا باعث ہوا۔ اسی طرح بکۂ الشذری اور شاطر کی بیوی وغیرہ بھی ہر وعیت سے تفریحِ دماغ کا سامان ہم پہنچاتے ہیں قیمت دو روپے!

روحِ لطافت۔ چغتائی صاحب کے آٹھ چیدہ چیدہ افسانوں کا مجموعہ۔ پہلا افسانہ "بہارانی کا خواب" ایک بہت ہی عجیب و غریب رومانی افسانہ ہے جس میں راجپوت مہاراجاؤں کی خوش [illegible] کی زندگی، محلات کی جگمگاتی تصویریں، عشق و محبت کے دلدوز مناظر وغیرہ پڑھنے کی چیزیں ہیں۔ اس چھوٹی سی داستان نے رہنے والوں کو تڑپا کر رُلا دیا ہے باقی سات افسانے اسقدر ہنسانے والے ہیں کہ ہنستے ہنستے آپ بے حال ہو جائیں گے قیمت دو روپے!

شریر بیوی۔ چغتائی صاحب کا سب سے پہلا اور سب سے مقبول مزاحیہ ناول۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

کمزوری۔ "اے عورت تیرا نام کمزوری ہے" اس مقولے پر ایک بڑی حیرتناک داستان چغتائی صاحب نے لکھی ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے!

سنڈیکیٹ۔ کالج کے لڑکوں کی شرارتیں اور رنگیلیوں کی داستان

زندگی کی تصویر۔ ناول ایک عبرتناک داستانِ محبت ہے جس کا جواب شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کی کہانی بھی نہیں دے سکتی۔ قیمت [illegible]!

آدم خور۔ سنا ہے کل بھی آدم خوری ہوتی ہے۔ اور آدمی کو آدمی مار کر کھا جاتا ہے؟ اس کا جواب کہاں، کیسے، کس طرح آدمی آدمی کا شکار کرتا ہے۔ لاش کو کس شوق سے تندور میں بھونتے ہیں۔ کس طرح گوشت تقسیم کر کے کھاتے ہیں۔ کس طرح عورت اپنے پیارے بچے کو بھون کر کھا جاتی ہے۔ اور اس کے گوشت کا حصہ اپنی بہنوں اور ملنے والیوں میں تقسیم کرتی ہے عجیب و غریب خوفناک رسمیں اور رواج کس طرح دولہا انسانی گوشت اور کلیجی کے ثابت ٹکڑے نگلتا ہے اور منہ سے ٹکڑا گرا نہیں کہ خود دولہا ذبح ہو کر باراتیوں [illegible] جاتا ہے ایک شوہر بیوی کو بطور سزا یا [illegible] بھون کر کھا سکتا ہے۔ کس طرح انسان کا انسان [illegible] سے پہلے خون چوس کر پی جاتا ہے والدین اپنی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو مار کر خود اپنے ہاتھوں سے [illegible] اور جب چربی پگھل پگھل کر نکلتی ہے تو کمزور لڑکے کے بدن پر اس کی مالش کرتے ہیں۔ اور [illegible] گوشت بھائی کو کھلاتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے!

جنّت کا بھوت۔ اس دلکش قصے کے تین باب ہیں۔ نہایت ہی پُرمذاق پلاٹ ہے اور قصہ اس قدر ہنسانے والا عجیب اور دلآویز ہے کہ شروع کر کے ختم کئے بغیر ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ قیمت آٹھ آنے۔

مرزا جنگی۔ ایک نہایت ہی مضحکہ خیز اور حد سے زیادہ دلچسپ اور ہنسانے والا مزاحیہ ڈرامہ ہے۔ پلاٹ اس قدر عجیب و غریب، تمسخر آمیز اور مذاق میں ڈوبا ہوا کہ ہر سین دو دو بار پڑھنا پڑیگا قدیم لکھنؤ کی مضحکہ خیز تہذیب کا عبرتناک مرقع اس ڈرامے سے بہتر آپکو کہیں نہیں مل سکتا۔ قیمت آٹھ آنے!

سوانہ کی روحیں۔ سرزمین مارواڑ کے [illegible]

جنگی بانجپن اور اجپوت کماریوں کی حیرت انگیز کارنامے اُن کے حُسن و جمال کی رعنائیاں اور فسونِ محبت کی دلکش سحر کاریاں، رزم و بزم کی ہوشربا داستان، محیّر العقول اور جانگسل واقعات۔ قیمت آٹھ آنے۔

جینی کی انگوٹھی :- ایک نوجوان اور خوبصورت بیوہ کی انتہا سے زیادہ دلچسپ اور خوبصورت داستان ہے۔ ایک ونٹر نے اس قصہ میں کس دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ قیمت ۸ر

ملفوظاتِ ٹامی :- ایک کتے کی خودنوشت سوانح عمری ایسے مزاحیہ رنگ میں لکھی گئی ہے کہ کتوں اور دوسرے افرادوں کی ذہنیت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے جو کہ ہمسائے والے درِتمسخر آمیز افعال سے متعلق ہے۔ ہر فعل اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ گویا افسانہ ہے۔ اور ہر افسانہ کا پلاٹ اس قدر سہانا ہوا لا در لطیف طریق سے پُر ہے کہ بہترین افسانوں کا لطف آئیگا۔ قیمت ۱۲ر

مضامین چغتائی :- مرزا عظیم بیگ چغتائی کے مضامین اور افسانوں کا مجموعہ۔ اس میں ۲۲ مضمون اور افسانے شامل ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔

کتب مصنفہ مولانا عنایت اللہ دہلوی :

ملامبو :- فلابیر کا شہپارہ، قرطاجنہ کی حسین ترین دوشیزہ نے [illegible] کے دیوہیکل سردار ماتو کو اپنے حسن کے دام میں گرفتار کیا۔ اور اپنے ملک کو بچانے کے لئے اپنی زندگی برباد کر دی۔ [illegible] کا حسین مُرقع جس میں کئی ہزار سال پہلے کی تہذیب پیش کی گئی ہے۔ قیمت چار روپے :

نجم السحر :- پانچہزار سال پہلے جب مصر کی تہذیب اپنے معراج کمال پر تھی تو رب آمون کی بیٹی ملکہ نجم السحر نے سرِ محلوں میں آنکھیں کھولیں پروان چڑھی ساحرہ آسی کا جادو، بلورا کے مظالم، کیفرکی پُراسرار ہستی، آشمون نجومی کی سحر آفرینی، غرض اس زمانہ کے تمدن و معاشرت کا کوئی پہلو مصنف کی نظر سے نہیں بچا ہے۔ اس کے دوران مطالعہ میں معلوم ہوگا کہ ماضی کا دلکش فلم آپ حال کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ قیمت تین روپے :

تائیس :- اناطول فرانس کا شہپارہ۔ تائیس، جسے راہب پفنوتیوس نے گناہ کی زندگی سے نکال کر فرشتوں میں شامل کر دیا۔ مگر خود ملعون و مردود ہوگیا اور اسکا چہرہ مسخ ہوگیا۔ حیرت انگیز داستان۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے :

ہیروڈیاس :- فلابیر کا نایاب کارنامہ۔ سلومی کا رقص ہو سکا رقص تھا۔

یوحنّاں پیغمبر سے اسے دیوانہ وار عشق تھا جب وہ اسے رضامند حاصل نہ کر سکی تو اس نے اپنے ناچ کے انعام میں پیغمبر کا سر مانگا اس مُردہ سر کے خون آلود لبوں کو اس نے پاگلوں کی طرح چوما۔ اور خود بھی دیکھنے والوں کے غیظ و غضب کی بھینٹ چڑھ گئی۔ قیمت ایک روپیہ :

انطونی اور کلا اپطرہ :- شکسپیر کا شہرہ آفاق ڈرامہ کلا اپطرہ کے سانس میں زہر اور آغوش میں موت تھی۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے :

کتب مصنفہ ایم اسلم

نرگس :- ایک ناول ہے جس میں ایک طوائف کی درد ناک عبرت انگیز زندگی کے حالات پیش کئے گئے ہیں نہایت غمناک کہانی ہے جسکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گناہ آلود زندگی گذارنے والی کے پہلو میں ایک حساس اور محبت کرنے والا دل دھڑکتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کو نرگس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ قیمت دو روپے :

گنہگار :- ادیبِ شہیر حضرت ایم اسلم کے سات جدید افسانوں کا مجموعہ۔ انسانی معصیت، عدم ناترسی، سنگدلی، حسن و عشق کی نیرنگی، بےبسی، بیچارگی اور بےثباتی کے افسانے صرف گنہگار ہی میں آپ کو مل سکتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ :

کتب مُصنفہ عصمت چغتائی

کلیاں :- عصمت چغتائی نے طنز نگاری میں ایک نئی شاہراہ خیال اختیار کی ہے جو نہایت دلکش اور حد درجہ موثر ہے۔ "کلیاں" عصمت چغتائی کے سولہ مضامین کا مجموعہ ہے قیمت تین روپے۔

ضدی :- عصمت چغتائی کا مختصر ناول جس کا ہر کردار زندگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے ضدی پورن کی داستانِ عشق پڑھ کر آپ سابق شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کے رومان کو بھول جائیں گے۔

قیمت ایک روپیہ چار آنے :

اوپندر ناتھ اشک کی تصانیف

ستاروں کے کھیل :- اشک نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ جس معاشرت میں پیدا ہوئے اور پلے ہیں اس کے مسائل کو انھوں نے ایک محقق کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اور ایسی ایسی تصویریں کھینچی ہیں جنھیں ایک محرمِ راز ہی کھینچ سکتا ہے۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے :

قفس :- اشک کے بارہ منتخب افسانوں کا مجموعہ۔ اشک نے سینکڑوں

افسانے لکھے ہیں لیکن یہ افسانے ان کے بہترین اور پسندیدہ ہیں۔ کتاب مجلد اور دلکش سرورق سے آراستہ۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

ناسور:۔ اشک کے پندرہ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ۔ دیباچہ پروفیسر وقار عظیم نے لکھا ہے قیمت دو روپے۔

ظفر قریشی دہلوی کی تصانیف

نذرگاہِ خیال - ظفر قریشی دہلوی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ۔ ان کہانیوں کے پلاٹ دلچسپ اور طرزِ بیان دلکش ہے۔ قیمت دو روپے۔

دریچے - ظفر قریشی کے بارہ نئے افسانوں کا مجموعہ۔ ظفر قریشی نے افسانہ نگاری میں ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو نہایت دلکش ہے۔ قیمت دو روپے۔

فضل حق قریشی دہلوی کی تصانیف

تعلیم زدہ بیوی:۔ ایک قابل قدر اصلاحی ناول ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ تعلیم کا غلط اثر لینے کے بعد عورتیں کس قدر خود رائی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ تعلیم یافتہ بیوی ہی تعلیم زدہ بیوی ہے جو اپنے شوہر کو طرح طرح کی جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچاتی رہتی ہے۔ لیکن بالآخر خفیف اور شرمندہ ہوتی ہے۔ قیمت آٹھ آنے۔

فرعون - یہ جلیل القدر شہنشاہ جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا مصر کی ایک حسینہ پر عاشق تھا اس کی داستان ایک عجیب دلی کہانی ہے جس کا لطف بیان کرنے سے نہیں صرف پڑھنے سے آتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ریڈیو ڈرامے - ریڈیو کے لئے جس نے سب سے پہلے ڈرامے لکھے وہ فضل حق قریشی ہے بارہ منتخب ریڈیائی ڈرامے اس میں شامل ہیں ہر ڈرامہ کئی کئی بار نشر ہو چکا ہے۔ آپ بھی اس مجموعہ کو پڑھ کر ریڈیو کیلئے ڈرامے لکھ سکتے ہیں۔ قیمت عہ

لیڈر - فضل حق قریشی کی لکھی ہوئی ایک دردناک ناول جس میں ایک نہایت لیڈر کا کچا چٹھا پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۶ر

پروین و ثریا - دو عورتیں ایک ہی مرد سے محبت کرتی ہیں پروین چاہتی ہے کہ وہ ثریا کے راستے میں سے ہٹ جائے اور ثریا چاہتی ہے کہ وہ پروین کی راہ میں حائل نہ ہو دونوں انتہائی ایثار و قربانی کرنا چاہتی ہیں۔ مصنف نے جس عمدگی سے اس نفسیاتی مسئلے کو حل کیا ہے اور جس خوبی سے اس ڈرامائی

کشمکش کو سلجھایا ہے وہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ اس کا ترجمہ شاہد احمد دہلوی اور فضل حق قریشی نے کیا ہے۔ قیمت ا[illegible]

انصار ناصری کی تصانیف

چندرا موہنی - حسن و عشق کی داستان اعصاب گداز انجام۔ سچی محبت میں چندرا موہنی نے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں یہاں تک کہ موت کی آغوش میں جا سوئی۔ قیمت ایک روپیہ۔

وحشی:۔ ایک مختصر ناول۔ حسن و عشق کی ایک داستان عجیب کتاب مجلد۔ قیمت ایک روپیہ۔

میراجی کی تصانیف

میراجی کی نظمیں - اردو کے سب سے مشہور شاعر میراجی نے اب تک ہزاروں نظمیں لکھی ہیں۔ یہ ساٹھ نظمیں ان کا نچوڑ ہیں۔ یہ بالکل جدید طرز کی نظمیں ہیں اس شاعر کی جو جدید شاعری کا امام سمجھا جاتا ہے۔ مجلد قیمت دو روپے آٹھ آنہ

گیت ہی گیت - میراجی کے گیت دلآویزی میں اپنا جواب نہیں رکھتے ایسے مدھر گیت آپ نے کبھی نہ پڑھے ہونگے۔ اس میں ہر قسم کے گیت ہیں۔ قیمت دو روپے۔

کرشن چندر کی تصانیف

شکست - ملک کے مشہور افسانہ نگار مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے نے یہ ناول لکھا ہے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ شکست کو ہندوستان کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ناول کا پس منظر بہت [illegible] کشمیر ہے۔ کرشن چندر نے اس سرزمین حسن میں زندگی کے رومانی پھول کھلائے ہیں۔ قیمت تین روپے۔

نئے فسانے - یہ مجموعہ مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کے جدید افسانوی ادب کی تصویر ہے اردو، ہندی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تلگو، بنگالی، بہاری وغیرہ افسانہ نگاروں کے تیس بہترین نقوش اس میں شامل ہیں جہاں [illegible] کہتا ہے "انگریزی افسانہ زوال کی انتہائی پستیوں کی طرف جا رہا ہے" برعکس اس کے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی افسانے پروان [illegible] آ رہی ہے یہ کتاب دو سال کی کاوش کے بعد مرتب ہوئی ہے ضخامت ۴۲۵ صفحے مجلد قیمت چار روپے۔

گھونگھٹ میں گوری جلے:۔ کرشن چندر کے چودہ طنزیہ مضامین، افسانوں اور ڈراموں کا منتخب مجموعہ انہیں مرتب کرنے میں مصنف نے پورے دو سال صرف کئے ہیں۔ [illegible]

سے آراستہ۔ مجلد۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

متفرق مصنفین کی تصانیف

محبت اور نفرت ۔ مصنفہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بی۔اے ڈی لٹ، ساہتیہ النکار ڈی لٹ۔ انسانی فطرت کے دو زبردست رُخ محبت اور نفرت۔ سولہ افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت دو روپے۔

لال قلعہ کی ایک جھلک :۔ سید ناصر نذیر فراق کی تصنیف ہے۔ جسمیں دکھایا گیا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں لال قلعہ کی کیا حالت تھی۔ اور اس انتہائی انحطاط کے زمانہ میں بھی دہلی کی رنگینیوں کا کیا عالم تھا۔ فراق مرحوم دہلی کے مشہور انشا پرداز تھے۔
قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

چار چاند :۔ ناصر نذیر فراق کے مضامین کا مجموعہ۔ دلی کی ٹکسالی زبان اور قلعہ معلیٰ کی ستھری ستھری بول چال اس مجموعہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت آٹھ آنے۔

[illegible]ترک ۔ وہ مشہور اور معرکۃ الآرا کتاب ہے جس سے بہتر کتاب غازی مصطفےٰ کمال اتاترک بانیٔ جمہوریہ ترکیہ کے حالات پر آج تک ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ رسالہ [illegible] جولائی [illegible] کی اشاعت میں اس کتاب کے متعلق لکھا ہے: اس کتاب میں محمد عمر راز دہلوی نے اتاترک کے حالات زندگی بڑی محنت اور غائر مطالعہ کے بعد لکھے ہیں اور یہ غازی اعظم کی تمام سوانح عمری ہے اور ان کی زندگی کے ہر پہلو پر کامیابی سے بحث کی ہے۔ قیمت دو روپے۔

[illegible] قدرت :۔ علامہ مشرقی دہلوی کا لکھا ہوا ایک طلسماتی سائنٹفک افسانہ۔ سائنس کی حیرت انگیز کرشمہ سازیاں اور محیر العقول نیرنگیاں افسانہ کے پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں۔
قیمت بارہ آنے۔

دھنک :۔ صادق الخیری ایم۔اے کے سات دلکش رومانوں کا مجموعہ۔ آخری افسانہ "نکہتیں" اردو ادب میں ایک بالکل نئی چیز ہے۔ صادق الخیری کی زبان دانی کی خوبیاں محتاج تعریف نہیں۔ قیمت دو روپے۔

کہکشاں :۔ رفیقی اجمیری کے ۲۴ افسانوں کا مجموعہ۔ رفیقی اجمیری کی تحریر کا البیلا بانکپن کہیں اور دیکھا کی تحریر میں آپ کو نہیں مل سکتا۔ قیمت تین روپے۔

افسانے شبیر محمد اختر کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ۔ اختر کے افسانے زندگی کی تصویر ہوتے ہیں۔ طرز بیان نہایت دلکش اور کہانی بہت مؤثر ہوتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

جزیرے ۔ مشہور افسانہ نگار محمد حسن عسکری ایم۔اے کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ۔ عسکری صاحب نے اردو افسانہ نگاری میں ایک جدید و بلند طرز بیان کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا تخیل بلند ہے اور ان کا طریقۂ اظہار بے لاگ۔ اس میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں: کلوج سے گھر تک، پھسلن، حرام جادی، میلاد شریف، چائے کی پیالی، اندھیرے کے پیچھے، ایک معمولی خط۔ وہ تمیں کتاب مجلد اور گرد پوش سے آراستہ۔ قیمت دو روپے۔

جالے :۔ سنتیر سنگھ سرولا کے بارہ افسانوں کا مجموعہ۔ سرولا جرسات نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ ایک ماہر سائنٹسٹ کی طرح باریک سے باریک اور خفیف سے خفیف جزئیات کا تجزیہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ مجلد قیمت ۱۲/۔

مضراب :۔ زندگی ایک تلخ حقیقت ہے اور کبھی کبھی ایک خوابناک رومان۔ مضراب راجہ مہدی علی خاں کی سائٹھ طنزیہ اور رومانی نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس طرز کی نظمیں آج تک اردو ادب میں نہیں لکھی گئیں۔ اگر آپ شاعری سے ذوق رکھتے ہیں تو ایک جلد آج ہی منگا لیجئے۔ اردو شاعری میں ان نظموں سے جدید اضافہ ہوا ہے۔ دیباچہ میراجی نے لکھا ہے۔
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

آئینۂ حیرت :۔ سید عابد حسین مرحوم نے وحشی اور گھریلو جانوروں کے خصائل و شمائل افسانے کے پیرایہ میں پیش کر کے ایک انوکھی طرز کی کہانیاں لکھی ہیں۔ یہ مجموعہ ایسی ہی آٹھ کہانیوں کا قابل قدر مجموعہ ہے۔ [illegible] قیمت دو روپے۔

کتب مصنفہ حضرت بہزاد لکھنوی

نغمۂ نور کیفِ سرور موجِ طہور چراغِ طور	ہر مجموعہ میں حمد، نعت، غزلیں، گیت، نظمیں اور سبھی شامل ہیں۔ ہر کتاب مجلد اور دلکش سرورق سے آراستہ ہے۔ قیمت ہر مجموعہ کی ایک روپیہ۔

بیانِ حضور ۔ حضور سرور کائنات صلعم سے بہزاد لکھنوی کے والہانہ عشق کا پاکیزہ مظہر۔ بیان حضور کی صورت میں [illegible] قیمت [illegible]

ادارہ
شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی ساڑھے تین روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جرعات

جلد ۳۲ | ساقی دہلی، بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۵ء | نمبر ۳

باتیں

میراجی

باتیں کرتے کرتے انسان تنگ آجائے تو خاموش ہوجاتا ہے۔ شاید کفارے کے طور پر، لیکن کفارہ تو گفتگو کا تقاضا کرتا ہو کیونکہ کفارے کے احساس کا مطلب ہی یہ ہے کہ کوئی بات انسان کو یاد آرہی ہے کوئی ایسی بات جو صرف اُسی کو معلوم ہے، اور جسے کہ دوسروں کو بتا دینے ہی سے اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی بات تو دل کی بات ہوگی، اور یہ باتیں جو ہر ماہ گذشتہ سے پیوستہ ہوتی رہتی ہیں ان کا تعلق کبھی دل سے ہوتا ہے کبھی دماغ سے، اس لئے ان پر عام قانون عاید نہیں ہوسکتا، ان باتوں سے پڑھنے (یا سُننے) والے تنگ آجائیں تو آجائیں لکھنے (یا کہنے) والے کا یہی کام ہے کہ وہ انہیں لکھتا (یا کہتا) جائے عام طور پر کسی بات کے ختم ہونے پر خاموشی اُس بات کی تکمیل کی دلیل ہوتی ہے لیکن ان باتوں کی تکمیل کا نشان خاموشی نہیں بلکہ گاہے گاہے خاموشی کے ایک آدھ لمحے کے بعد تسلسل ہے۔

خدمت اپنی ہستی کا ثبوت دینے کا دوسرا نام ہے، ثبوت بھی اور جواز بھی۔ اس کے ساتھ ہی خدمت چاہے کسی قسم کی ہو بہرحال خدمت ہے۔ البتہ خادموں کی جو قسمیں ہیں، وہ ایک دوسری سے الگ ہیں، مثلاً ایک یہ کہ خادم نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا یا اب خادم کیا عرض کرے یا خادم حاضرِ خدمت ہوجاتا لیکن۔ ۔ ۔ ۔ اور، خادم الملک مولانا مولوی یہ اور وہ اور ادھر کہ خدمت کرد او مخدوم شد۔ مگر اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ وہ خادم ہی نہ رہا۔ ان کے علاوہ کچھ اور قسمیں بھی ہیں۔ ایک تو ملازمت پیشہ، چار پیسے دیجئے چار پیسے کی خدمت لیجئے، دس پیسے دیجئے دس پیسے کی خدمت لیجئے۔ ایک وہ جو خادم ہیں سیٹھ کے اور خدمت کرتے ہیں شمالی ایک وہ جو نام کے خادم ہیں کوئی بات ڈھب کی نہیں، بات میں حرام خوری پلے باندھ رکھی ہے۔ ایک وہ جو خادم وادم کچھ نہیں تجارت پیشہ ہیں لیکن نام ہے خادم علی یا خادم حسین۔ مگر ان میں سے کسی کو خدمت سے دُور کا بھی تعلق نہیں، سب غرض کے بندے ہیں۔ کسی کو چار پیسے چاہئیں، کسی کو محض خوشامد مقصود ہے، کوئی محض تکلف میں مرا جاتا ہے، کوئی ملک اور قوم کو دھوکا دئے جا رہا ہے۔ خدمت کا اصول کسی کو بھی معلوم نہیں اور نہ معلوم کرنے کی خواہش، کیونکہ جب تک اُن کے اغراض پورے ہوتے رہیں اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ آپ شاید یہ اعتراض کریں کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق خدمت اپنی ہستی کے ثبوت اور جواز کا نام ہے تو اس میں بھی تو غرض پنہاں ہے کہ اپنی ہستی کے ثبوت کے لئے انسان خدمت کرتا ہے گویا اگر وہ یہ ثبوت نہ پیش کرے تو اُسے جسم کے ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو نیست تصوّر کرنا پڑے گا، نفی، ایک صفر، اور یہ بات اُس کی خود اور خود کامی و خود پرستی کو ٹھیس پہنچائے گی؛ اس لئے وہ اپنے نفس کی ایک غرض کے پورا کرنے کو خدمت کرتا ہے۔ لیکن غرض ہے کہ صرف اپنی ہستی کا ثبوت دینے کا دوسرا نام خدمت نہیں ہے بلکہ جواز کا بھی نام ہے۔ خدمت کے بغیر کسی فرد کی زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی یہ چاہے کہ وہ اپنے آپ کو زندہ محسوس کرے تو اُسے چاہیے کہ وہ خدمت کرے پہلے اپنی اور پھر دوسروں کی، کیونکہ جب تک وہ اپنی خدمت نہ کرے گا اس وقت تک دوسروں کی خدمت کا اہل نہ بن سکے گا۔

شیکسپیئر نے کہا ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے، لیکن شاید وہ یہ کہتے ہوئے صرف ایک شاعرانہ بات کہہ رہا تھا یا اس نے ناموں کی رنگا رنگ دلچسپیوں سے قطع نظر یہ بات کہی تھی۔ ذرا سوچئے تو سہی آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ، ایک کالا بھجنگ نام رنگی کا نور یا بابا تیرے تین نام پرسا پرسو پرسرام۔

باجبرے کشتی لے فلاں غنیمت شمار عمر از ان بیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند
——— اِس میں صرف فلاں جو ابھی پوری طرح نام بھی نہیں ہے
سب زندگی کے ایک سے زیادہ پہلوؤں کی کیسی ترجمانی
کرتے ہیں جب سے انسان نے بولنا سیکھا ہے اشاروں کے
نعم البدل کے طور پر اُس نے ہر چیز کا ایک سے ایک الگ نام
رکھنا شروع کیا ہے تاکہ ہر چیز انسانی زندگی میں اپنے اپنے
مقام پر قائم رہے، زندگی میں ایک ترتیب کا وجود باقی رہے
زندگی گڈمڈ نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہو کہ گلاب کو پتھر اور
پتھر کو گلاب کہتے نہیں اور نہ سمجھ میں آتے کہ پتھر کہا ہے
اور نہ سمجھ میں آتے کہ گلاب ... یہ تو ٹھیک ہے کہ اگر ہم گلاب
کو پتھر بھی کہیں گے تو وہ ویسی ہی میٹھی خوشبو سے ہمارے
... دماغ کو تر و تازہ کرے گا مگر اُسے ہاتھ میں تھامے
ہوئے نرمی کے ساتھ سختی کا خیال بھی آئے گا۔ لیکن اگر ہم
آغاز ہی سے گلاب کو پتھر اور پتھر کو گلاب کہہ دیتے ہیں تو آج
بھی گلاب سنگین اور پتھر نرم اور خوشبودار ہوتا لیکن
کچھ لوگ اس سے بھی اختلاف کر سکتے ہیں، وہ کہہ سکتے ہیں
کہ جس طرح سا رے گا ما پا دھا نی کے مختلف سُر سماعت پر
مختلف اثر پیدا کرتے ہیں اُسی طرح مختلف لفظ بھی مختلف
آوازوں کا مجموعہ ہیں اور اپنے مفہوم کے علاوہ بھی سنتے ہی
کان پر مختلف اثر کرتے ہیں۔ اگر ہم کہیں سا ما گا پانی پا دھا یا
ما پا رے سا تو اس سے آواز کا ایسا ہی زیر و بم پیدا ہوگا جیسے
ہم کہیں کہ گلاب، اور یہ لفظ کے مختلف ٹکڑوں یا حروف کا
ایک ایسا امتزاج ہوگا جس کی اونچ نیچ اور روانی میں ایک لوچ
... کا ایک گھلاوٹ ہوگی، اسی طرح اگر ہم دھا ما سُر دھا ما سر
گا رے کو گا ما سُر گا رے کو سا کہیں اور اس کے مقابلے میں پتھر کہیں
تو ان دونوں میں ایک جھٹکے کی کیفیت یکساں طور پر محسوس
ہوگی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حقیقت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر چیز
کا مختلف اور معین نام ہو، یہ تسلیم کہ گلاب کو پتھر یا کردم
دھرم یا مولو لولو اور ٹمبکٹو کہنے کے باوجود وہ اپنی میٹھی خوشبو
اُسی طرح پھیلائے گا لیکن اُس صورت میں کہنے اور محسوس
کرنے میں ایک تضاد ہوگا، اُس صورت میں ہماری قوتِ شامہ
اور قوتِ سامعہ ہمیں مختلف راہوں کی طرف لے جائے گی
ہم انسان اور فطرت کے اصول و قوانین کی اُلجھن میں کھو
جائیں گے۔ اگر آج شیکسپیئر زندہ ہوتا تو اُس سے دریافت کیا
جا سکتا تھا کہ حضرت آپ کا کہا سر آنکھوں پر لیکن ایک شرط ہے
وہ یہ کہ اپنا نام آج سے الزبتھ رکھ لیجئے تو یقین ہے کہ وہ یہی
جواب دیتا کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے، میرا تعلق الزبتھ کے زمانے
سے ضرور ہے لیکن میں الزبتھ نہیں ہوں۔ الزبتھ تو اب تک
ایک ڈراما بھی نہیں لکھ پائی اور میں اپنی زندگی کے ڈرامے
کے ساتھ ساتھ بے شمار ڈرامے لکھ چکا ہوں، اور ہم بھی کہتے
کہ بجا ارشاد ہوا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کر لیجئے کہ اُس
نام اور گلاب اور خوشبو والی بات کے کذب و حقیقت کا تعلق
بھی صرف آپ کے ڈرامے ہی سے ہے، آپ کے ڈرامے بہت
سی حقیقتوں کے ترجمان سہی لیکن اُن میں کی ہر بات حقیقت
نہیں ہے۔

نام کا ذکر چھڑا تو ایک اور بات کا خیال آگیا۔ گئے مہینے
کے آغاز میں تیرہ سال بعد دوسری بار کلکتہ کا سفر نصیب ہوا،
تفصیل کے ساتھ و پھر کبھی بات ہوگی لیکن ایک بات کا تذکرہ کئے
بغیر ... رہا جاتا۔ راستے میں ریلوے کے مختلف اسٹیشنوں کے نام
بعض جگہ عجیب قسم کے محسوس ہوئے مثلاً کلکتہ کے قریب بردوان
کے بعد ایک اسٹیشن کا نام ہے "برُاکر" پڑھ کر تعجب ہوا، لیکن
دو ایک اسٹیشن آگے بڑھے پلیٹ فارم کے بورڈ نے بتایا "مان کر"
اب کھلا کہ کلکتہ سے باقی ہندوستان کے مختلف علاقوں کی
طرف جانے والوں کے لئے یہ ہدایت ہے کہ "مان کر برُاکر" شاید
یہ ہدایت اُن لوگوں کے لئے ہو جنہوں نے کلکتے میں مان کر برائی
کی طرف رغبت کی ہو یا شاید نہیں نہ ماننے کا موقع ملا ہو نہ
برائی کا۔ خیر، اِن دو مقامات کی تفصیل میں اُلجھنے کی کیا
ضرورت ہے، خدا کی وسیع دُنیا میں ایک سے ایک عجیب جگہ
موجود ہے جسے خدا کے بنائے ہوئے انسان نے ایک سے ایک
عجیب نام دے رکھا ہے۔ مثلاً ایک فقرہ سُنئے :- بائی جی |
پرس ناتھ | رسونیا | باجرہ | اکٹھوا | بندھوا | مطلب پورا گیا |
تھانہ ؟ | ——— اس فقرے کے تمام الفاظ ریلوے کے مختلف
اسٹیشنوں کے نام ہیں، یہاں تک کہ "تھانہ" کی طرح "بائی جی"
بھی ایک اسٹیشن ہے، اب اِن دونوں میں تعلق صرف اِتنا نظر
آتا ہے کہ اگر آپ کسی بائی جی کو کہیں شامتِ اعمال سے چھیڑ

جائیں گے تو مجبوراً تھانہ جانا پڑے گا۔

اگر ابھی اِن ناموں سے آپ حیران نہ ہوئے ہوں تو ایک لمحہ انتظار کیجئے ذرا سوچ لوں ــــ ہاں، کون کہتا ہے ہندو اور مسلم یکجا نہیں ہو سکتے ــــ معظم پور نارائن ــــ ایک جگہ کا نام ہے اور سُنیئے حضرت حفیظ جالندھری نے ایک دفعہ شکایت کی تھی کہ فرصت ہی نہیں ملتی، فرصت کو کہاں ڈھونڈوں ــــ تو عرض ہے کہ یہ نظم لکھتے وقت انہیں "فرصت گنج" کا نام معلوم تھا نہ وہاں کا کرایہ۔ اگر وہ جانتے ہوتے تو اس مقام پہنچ کر کافی سے زیادہ فرصت حاصل کر لیتے۔ ایک اور ــــ ہر چند آپ کہیں کہ یہ تو بات ٹالنے کے لئے ہے لیکن "ہر چند پور" بھی ہندوستان جنت نشان کا ایک مقام ہے، اور ــــ لو جی! ــــ یہ بھی ریلوے کا ایک اسٹیشن ہے ــــ عبدالحکیم، عارف اللہ، اسد راجا، پرمانند، بخشن خاں، ارسلا خان، منڈھا پانڈے، نظام الدین اور چکیچ مل ــــ انسان نہیں انسانوں کے مسکن ہیں۔

اگر کبھی آپ "تخت محل" سے چل کر جنگمائی موندھا لوہٹا اور چوکھنڈی سے ہوتے ہوئے سختی کا تالاب پار کر کے السفید آباد سے کچھ دُور "جہادپور" تک جا پہنچیں تو وہاں آپ فوجی سے دریافت کر سکتے ہیں کہ یہ سب کیا لفظوں کا جال بچھا ہوا ہے، اور اگر فوجی وہاں موجود نہ ہوں (کیونکہ بیراگی ہیں، سیلانی) تو "بھاپور" سے ہوتے ہوئے "جلیبلا" جائیے اور زور سے پکاریئے "اے یہاں کے رہنے والو! ہمیں ان ناموں کے چکر سے بچاؤ!" ــــ اور وہ کہیں گے ہم کیونکر بچائیں کہ "بچاؤ" فعل امر نہیں اسم ظرف مکان ہے!

متوازی خطوط وہ خطوط ہیں جو بڑھتے جاتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے قریب نہیں آ سکتے ــــ آپ اور ہم بھی متوازی خطوط ہیں، ایک لکھے جاتے ہیں اور دوسرے پڑھے جاتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے قریب نہیں آتے، یا شاید یہ لکھنے والے منطقی ہیں اور متوازی خطوط کی بجائے مثلث کی مثال ہے، ایک خط لکھنے والا، ایک خط بائیں اور ایک خط پڑھنے والے۔

م۔

ممکنات ــ ریل کا سگنل گرتا ہے جب ریل کی سیٹی بجتی ہے
ریل کی سیٹی بجنے سے پہلے ریل کا سگنل گرتا ہے
ناممکنات ــ صبح سے پہلے رات ہوتی ہے
رات سے پہلے صبح ہو کیونکر
ممکنات ناممکنات ــ ہم کوئی بات کر نہیں سکتے
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

روشن خیال کہتا ہے "دنیا سب سے اچھی دنیا ہے اور اس میں بُری سے بُری چیز بھی ضروری ہے" ــــ تاریک خیال کہتا ہے "جب ہر طرف شامتِ اعمال ہی دکھائی دے تو بُری سے بُری بات کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے" ــــ روشن خیال کہتا ہے "تاریک خیال غلط کہتا ہے"۔ تاریک خیال کہتا ہے "روشن خیال غلط کہتا ہے" لیکن کبھی دونوں مل کر یا الگ الگ نہیں سوچتے ایک دوسرے کے بغیر دونوں کا عدم وجود برابر ہے، ایک کی غلط خیالی دوسرے کی راستی کا باعث ہے دن رات کی طرح اِن دونوں کا بھی ساتھ ہے، اب دونوں میں سے کون رات ہے اور دن کون، اس کا فیصلہ کچھ آسان نہیں کیونکہ چاند ستاروں کے بل پر رات بھی دن ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے اور ہم اگر آنکھوں پر پٹی باندھ کر بیٹھ رہیں تو دن بھی رات بن جائے۔

ڈی، ایچ، لارنس کی ایک نظم کا عکس۔

وحشی لہریں کیا کہتی ہیں۔ لہریں جو ہر دم بہتی ہیں۔ بہتے بہتے یہ کہتی ہیں
انساں کی کیسی شامت ہے۔ اپنے لئے وجۂ زحمت ہے
ہر لمحہ گند جہاں بھر کا ؛ لہروں سے ملتا جاتا ہے
اندر کا ہو یا باہر کا ؛ ہر عیب مٹاتا جاتا ہے
میں اپنے دل میں سوچتا ہوں
لہریں کیوں اس کو سہتی ہیں ؛ کیوں چُپکی بہتی رہتی ہیں

ایک تصویر۔ وہ ہر روز شام ہی سے دریا کے کنارے پر جا بیٹھتا، کنارے کے ساتھ ساتھ ایک پارک بنا ہوا تھا اور پارک کے ساتھ ساتھ ایک سڑک تھی، دریا شہر سے دُور نہ تھا بلکہ جس طرح

حسن عسکری

جھلکیاں

"نئے زاویے" کی دوسری جلد ابھی ابھی شائع ہوئی ہے۔ اس وقت مجھے اس کتاب پر تبصرہ منظور نہیں، بلکہ مرتب صاحب کے "معروضات" سے آپ کو دو ایک جملے پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ مرتب صاحب انگریزی، فرانسیسی ادیبوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "موجودہ جنگ نے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ان کی تخلیقی قوتوں کو سلب کر لیا ہے اور وہ اس وقت تک ایک سطر، ایک ایسا مصرع بھی نہیں کہہ سکے جسے ادبِ عالیہ میں شمار کیا جا سکے۔" خیر، منفی اس بیان میں بھی کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ اپنا اپنا معیار ہی تو ہے۔ صاحب بعضوں نے تو شیکسپیئر تک کو جانگلو کہا ہے۔ تو پھر شیکسپیئر کے سامنے ان بیچارے زمانۂ جنگ کے انگریزی شاعروں کا کیا ذکر۔ کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ۔ اس لئے ہم بھی آمنّا و صدقنا کہے دیتے ہیں۔ لیکن ہمارا ایمان اس وقت ڈانواں ڈول ہونا شروع ہوتا ہے جب ہم دو صفحے بعد بنگال کے قحط کے سلسلے میں یہ جملہ پڑھتے ہیں: "ہر صوبے کے ادیبوں نے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے، اور اکثر بہت اچھا لکھا ہے۔" معیار کی یہ لچک بیس پچیس صفحے کا دیباچہ لکھنے میں تو ضرور معاون ثابت ہوتی ہے لیکن آنکھیں کھول کر پڑھنے والوں کی ہمدردی حاصل نہیں کر سکتی۔ اس سارے دیباچے میں غور و فکر کی ضرورت اور حقیقت کی تلاش سے زیادہ اپنی آسانی ملحوظ رہی ہے۔ بہرحال اور چیزوں سے تو مجھے اس وقت مطلب نہیں، لیکن مرتب صاحب کا یہ تنقیدی اُتار چڑھاؤ میری حب الوطنی تک کو جوش میں نہیں لاتا۔ اگر بنگال کے قحط پر نظمیں اور افسانے لکھنے والوں نے واقعی یہ حرکت انسانی اور قومی ہمدردی کے جذبے سے متاثر ہو کر کی تھی، تو وہ تحسین و آفرین کے طالب کیوں ہوتے ہیں؟ اگر واقعی یہ لوگ قوم کو جگانا اور مصیبت زدوں کی مدد کرنا چاہتے تھے تو اس کے بجائے اپنی ادبی عظمت منوانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ ہندوستان کی اس سے زیادہ بدنصیبی اور ہندوستان پر اس سے زیادہ ہولناک طنز اور کیا ہوگا کہ یہاں کے ادیب اپنی شہرت کی تعمیر لاکھوں انسانوں کی لاشوں پر کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ایسے شاعر اور ادیب منافع خوروں اور چور بازار والوں سے کسی طرح کم ہیں؟ اگر آپ نے واقعی خلوص کے ساتھ بنگال کے سانحے پر رنج کا اظہار کیا ہے تو اُس کا محنتانہ کیوں مانگتے ہیں؟

ہاں تو مرتب صاحب ایک طرف تو بے تابانہ یہ سنگین فیصلہ دے بیٹھے ہیں کہ انگریزی اور فرانسیسی کے اچھے سے اچھے شاعر ان کے حضور میں بار نہیں پا سکتے، دوسری طرف انہوں نے اپنے دل کا پھاٹک ایسا چوپٹ کھولا ہے کہ خاص و عام کے سب امتیازات ہی اُٹھ گئے، جو آیا چلا اندر۔

مرتب صاحب کا ایک جملہ اور سن لیجئے، اس کے بعد ہم آگے بڑھیں گے۔ انگریزی ادیبوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "بعض لوگ اچھے ادب کی تخلیق بھی کر رہے ہیں، لیکن ایسا ادب مفقود ہے جو جنگ کے تلخ ماحول کی عکاسی کرتا ہوا جو فسطائیت کے خلاف اُس شدتِ احساس، جذباتی ترنم اور حسنِ تخلیق سے متصف ہو ..." اس بیان پر تو ہم غور کریں گے ہی، لیکن ممکن ہے آخر میں آپ مجھے الزام لگائیں کہ میں نے مرتب صاحب کا مطلب سمجھنے کی کوشش نہیں کی، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ انگلستان میں اچھا ادب تو پیدا ہو رہا ہے لیکن بہت بڑا ادب یا ادبِ عالیہ مفقود ہے۔ لیکن غلط فہمی کی زیادہ گنجائش نہیں ہے، کیونکہ انھوں نے خود ادبِ عالیہ کی چند مثالیں پیش کر دی ہیں۔ فرماتے ہیں: "'گاڈن'، 'دی معاہدہ'، 'سبسطاپول'، 'سقوطِ پیرس'، 'الغزت'، ایسی روسی تخلیقات ہیں کہ جن پر انسانی ادب ہمیشہ کے لئے ناز کر سکتا ہے۔" حالانکہ یہاں ادبِ عالیہ کا لفظ استعمال نہیں ہوا، لیکن جس شدّ و مد سے ان کتابوں کا ذکر ہوا ہے اُس سے تو یہی گمان ہوتا ہے کہ موصوف انھیں ادبِ عالیہ میں شمار کرتے ہیں۔ اگر سقوطِ پیرس واقعی ادبِ عالیہ ہے تو میں یہاں تک دعویٰ کروں گا کہ زمانۂ جنگ کی انگریزی شاعری کی ہر سطر ادبِ عالیہ ہے۔

حقیقت کا ہوش ہی نہیں۔ جی نہیں، انھیں حقیقت کا پورا احساس ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کا ماحول انھیں کیا دے سکتا ہے۔ انھیں یہ بھی خوش فہمی نہیں کہ محض خوابوں کی مدد سے وہ حقیقت کو معطل کر سکتے ہیں۔ خود ان میں سے ایک شاعر نے کہا ہے کہ "محبت میں اتنی قوت نہیں کہ تاریخ سے لڑ سکے"۔ لیکن اس ناتوانی کے باوجود اگر کوئی طاقت تاریخ کے مقابلے میں کھڑی ہو سکتی ہے اور جس کی فتح سے انسانیت کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ یہی محبت ہے۔ یہی خواب۔ صرف خواب ہی حقیقت کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اور حقیقت پر قابو پا سکتے ہیں ــــ مصالحتیں نہیں۔ ہمارے موصوف مرتب صاحب نے جس ذہنی اور جذباتی تضاد کا ذکر کیا ہے وہ صرف ایک مخصوص سمت میں اور ایک مخصوص سیاسی سطح پر پایا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں جو شاعر ہیں ــــ یعنی ــــ Apocalyptics مثلاً ہنری ٹریس، نکولس مُور، ورنن واٹکنس وغیرہ ــــ اُن کے یہاں معاملہ اس سے بہت آگے جا پہنچا ہے۔ یہ ذہنی تضاد تو صرف انھیں شاعروں میں پیدا ہوگا جو حالات کو صرف سیاسی یا معاشیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ جن شاعروں کا میں ذکر کر رہا ہوں، یہ لوگ اس چیز سے بحث نہیں کرتے کہ یہ لڑائی جمہوریت کی لڑائی ہے بھی یا نہیں۔ اُن کے لئے سب سے بڑی قدر جمہوریت نہیں بلکہ فرد کے لئے مکمل اور بھرپور زندگی کا امکان ہے۔ ہر چیز کو وہ اسی معیار سے جانچتے ہیں ــــ ممکن ہے کہ آپ اس معیار کو کافی نہ سمجھتے ہوں۔ اُن کی شاعری کے یزداں و اہرمن جمہوریت اور آمریت نہیں ہیں، بلکہ مکمل زندگی اور غیر مکمل زندگی۔ اگر وہ مکمل زندگی کا خواب دیکھتے ہیں، تو یہ خواب بذاتِ خود ہر اُس طاقت کے خلاف احتجاج ہے جو زندگی کو مکمل نہیں ہونے دیتی ــــ خواہ یہ طاقت جنگ ہو یا فسطائیت، جمہوریت یا اشتراکیت۔ یہ شاعری جمہوریت اور اشتراکیت کی حمایت میں ہو یا نہ ہو، مجھے اس کی کوئی فکر نہیں۔ میرے لئے یہی بہت کافی ہے کہ یہ شاعری زندگی کی حمایت میں ہے، اور یہ حمایت محض جانب داری سے بہت بلند ہے۔ (جانب داری سے مطلب ہے اُس قسم کا سستا تجزیہ جو روسیوں کے یہاں ملے گا۔) مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس شاعری میں قوت کی کمی ہے، اکثر جگہ ایسی پلپلی جذباتیت ہے جو برداشت نہیں ہوتی، بعض جگہ ایسی سادگی ہے جو تفکر سے عاری ہے، دوسری جگہوں پر ایسی شدتِ بیان ہے جو کھوکھلی خطابت بن جاتی ہے، لیکن ان سب خامیوں کے باوجود یہ شاعری صرف فسطائیت ہی نہیں بلکہ نامکمل زندگی اور موت کے خلاف احتجاج ہے۔ یہ شاعری چینی قومیت یا روسی اشتراکیت کا ڈھول نہیں پیٹتی، بلکہ انسانی زندگی کے تقاضوں کا اعلان کرتی ہے۔ یہ شاعری چینیوں، روسیوں، انگریزوں کی لکھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ انسانوں کی۔ ان شاعروں کا مقصد صرف اتنا نہیں کہ فسطائی بھیڑیوں کو وطن کی پاک سرزمین سے مار بھگانے میں مدد دیں، بلکہ ان کی شاعری میں انسانی زندگی کو دافعی زندگی بنانے کا تقاضا ہے۔

انگریزی شاعروں کے سامنے مسئلہ صرف اتنا نہیں ہے کہ فسطائیت کے مقابلے میں جمہوریت کو جیتنا چاہیئے۔ اُن کے لئے مسئلہ اس سے کہیں وسیع ہے۔ اُن کے سامنے جو تضاد رئیس ہے وہ فرد اور جماعت کا تضاد ہے۔ اس شاعری میں فرد جماعت سے بدگمان ہے اور اپنے حقوق لینے پر مُصر نظر آتا ہے۔ اس فرد کو کسی قسم کی جماعت پر اعتماد نہیں رہا، خواہ وہ جماعت اپنے آپ کو فسطائیت کہتی ہو، یا جمہوریت یا اشتراکیت۔ یہ نقطۂ نظر صرف ــــ Apocalyptic تک ہی محدود نہیں، بلکہ اُن شاعروں میں بھی پھیل گیا ہے جو پہلے کسی نہ کسی حد تک مارکسیت سے متاثر تھے۔ اس ضمن میں اوسبرٹ سٹ ویل کی نظم Demos the Emperor ــــ دیکھنے کے قابل ہے۔ اگر یہ نظم روس میں لکھی گئی ہوتی تو بغیر مقدمہ چلائے شاعر کو گولی سے اُڑا دیا جاتا۔ یہ نظم بڑی عظیم الشان نہ سہی، لیکن غنائیت اور طنز کی تلخی کی وجہ سے قابلِ لحاظ ہے۔ افسوس ہے کہ میں اِس نظم سے طویل اقتباسات نہیں دے سکتا

ورنہ آپ خود دیکھ لیجئے کہ ہم ماحول کی عکاسی کیسے کرتے ہیں۔ خاص طور پر شہنشاہ جمہور کی تقریر تو اس قابل ہے کہ سارے ترقی پسندوں کو زبردستی ایک جگہ جمع کر کے سنائی جائے۔ کم سے کم شہنشاہ جمہور کی بیٹیوں کے گانے میں سے دو تین لائنیں تو سن ہی لیجئے۔

Give me the sun, give me the moon.
Give me the love that I need in the
nights of June.
But I'll build you a shelter
Deep in my heart,
A helter - skelter
Refuge from Art."

اس آخری فقرے سے یہ بات بھی یاد آئی کہ جنگ نے آرٹ کی اصلی حقیقت اور اہمیت بھی اچھی طرح واضح کر دی ہے۔ لوگوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ آرٹ سیاست کا ضمیمہ نہیں ہے، بلکہ اس کی ہستی الگ ہے، اس کی زندگی کے اصول الگ ہیں، اور اس کا رکے ذہن کی آزادی بہت بڑی چیز ہے۔ چنانچہ ان شاعروں کو اپنا نقطۂ نظر وراثت میں جنگ سے نہیں ملا، بلکہ انھوں نے شعوری کوشش کی ہے کہ سستی حب الوطنی کی رو میں نہ بہہ جائیں۔ البتہ ترقی پسندوں کے نزدیک شاعری یہ ہے کہ اسٹالن کے اعلانوں کو کسی نہ کسی بحر میں ڈھال دیا جائے۔

جنگ سے شاعروں میں ایک تبدیلی یہ بھی پیدا کی ہے کہ اب ان میں روایت کا احساس بہت بڑھ گیا ہے۔ اُردو ادیبوں کی طرح وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم خود پیدا ہو گئے تھے، بلکہ وہ ادب کو ایک ترکہ خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ نئی انگریزی شاعری کے اسالیب بیان اور اوزان پرانی شاعری سے بہت قریب آگئے ہیں۔ بلکہ اب تو آزاد نظم کے خلاف ردِّ عمل شروع ہو گیا ہے۔ (اُردو کی جدید شاعری کے مخالف نوٹ کر لیں) دوسری بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ اب نئی انگریزی نظمیں سمجھ میں آنے لگی ہیں۔

زیادہ دن کی بات نہیں، ابھی ۱۹۳۸ء میں ہنری ٹریس کی ایک لائن کا مطلب سمجھنا بھی محال تھا، لیکن اب تو وہ قدامت پرستوں تک میں مقبول ہو رہے ہیں۔ شاعروں کی ناآسودگی کی وہ وحشت باقی نہیں رہی جو چند سال پہلے تھی۔ اگر SURREALISTIC عناصر نظم میں آتے بھی ہیں تو پہلے سے سلجھی ہوئی شکل میں۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا والی بات نہیں رہی۔

بہرحال یہ ہے انگریزی شاعروں کا موجودہ ماحول۔ ممکن ہے کہ جنگ کے زمانے میں کوئی ایسی نظم نہ پیدا ہوئی ہو جسے ایلیٹ یا ییٹس کی نظموں کے مقابلے میں رکھا جا سکے، لیکن اب شاعروں کی نظر میں اپنے فن کی قدر بڑھ گئی ہے، وہ خالص فنی تجربوں پر پہلے سے زیادہ توجہ صرف کرنے لگے ہیں، سیاسی پروگراموں کے بجائے اپنے ذاتی تجربے کو شاعری کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انگریز شاعروں کے سر میں خودستائی کی ہوا بھی نہیں بھری ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو نئے اور اجنبی تاثرات سے محفوظ نہیں کر لیا، بلکہ ہر نئے تاثر کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ چیزیں شاعری کے لئے سدِّ راہ نہیں ہیں، اور نہ انگلستان میں شاعری کے امکانات کسی اور ملک سے کسی طرح کم ہیں —— روس اور چین، بلکہ ہندوستان ادب نشان سے بھی نہیں۔

موم بتّی ختم ہوگئی

افسانہ

حجاب امتیاز علی

(۲)

اُس عجیب رات کے بعد میں موقع کی تلاش میں رہی مگر کچھ تو فرصت کی عدم فرصتی کے باعث اور کچھ اپنی نئی خدمت کی ذمہ داریوں کے سبب اُس سے ملاقات میسر نہ آ سکی۔

گذشتہ مہینے کے جس دن سے ملکہ ثمر نے مجھے از راہ شفقت اپنی مخصوص مشاطہ کی اعلیٰ خدمات تفویض فرمائی تھیں۔ میری مصروفیت حد سے بڑھ گئی تھی۔ اب اکثر مجھے ملکہ کی خدمت میں حاضر رہنا پڑتا اور بعض اوقات اُن کی ہمراہی میں باہر بھی جانا پڑ جاتا۔ ایسے موقعوں پر مجھے اکثر اپنی نااہلیت کا احساس ستاتا اور اپنی کم سنی اور ناتجربہ کاری پر جھنجھلاہٹ ہوتی۔

اک صبح قصر الماسین کے آسمانوں پر ابھی ستارہ سحر جگمگا رہا تھا اور میں اپنی خواب گاہ میں لیٹی موذن کی اذان کا انتظار کر رہی تھی کہ کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔

میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ اک بُوڑھا حبشی خادم ہاتھ میں شمع لئے کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے ناگواری کے لہجہ میں پوچھا۔

"رات موم بتی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آج ساڑھے نو بجے اُس کا جنازہ اُٹھے گا۔"

"موم بتی کا انتقال ہو گیا ———!" میرے سوچ کی ساری قوت جیسے سلب ہو گئی اور میں سُن سی رہ گئی۔ اگرچہ اس کے جانبر ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ مگر موت کا اندیشہ ہونا اور بات ہے، اور موت کا آ پہونچنا اور بات۔!

مجھ سے پہلے موم بتی ملکہ ثمر کی منظورِ نظر مشاطہ رہ چکی تھی، اور اپنے اوصافِ حمیدہ کے باعث تمام محل میں "موم بتی" کے نام سے مشہور تھی۔ یہ خطاب اسے خود علیہ حضرت نے عطا فرمایا تھا۔ کیونکہ اس میں موم بتی کی طرح پگھلنے کی وہ پوری صلاحیت موجود تھی جو ہمارے تمدن و معاشرت کی اک "شریف عورت" میں ہونی چاہیئے۔ وہ اپنے تحمل و انکسار کے باعث نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ مگر چونکہ گذشتہ ڈیڑھ دو سال سے آلامِ حیات میں گرفتار ہو کر اک نامعلوم تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے رُخصت پر تھی۔ خود ملکہ موم بتی کی فرشتہ خصلتی کی معترف و مداح تھیں۔ اور کئی دفعہ مجھے اس کی عیادت کے لئے بھیج چکی تھیں۔

بُوڑھے حبشی کی زبانی اُس کی خبرِ مرگ سُن کر میری آنکھوں کے آگے مرحومہ کا زرد چہرہ پھر گیا۔ جس پر ہمیشہ اک کھلی ہوئی اور مرجھائی ہوئی مسکراہٹ نمودار رہنے کی کوشش کیا کرتی تھی جب بھی میں اُس کی عیادت کو جاتی اور مزاج پُرسی کرتی ہمیشہ اسکے سوکھے ہوئے ہونٹوں سے اک ہی جملہ سُنتی "خدا کا شکر ہے اب اچھی ہوں شہ رخ!"

میں کہتی: "مگر تم تو گھلی جا رہی ہو۔"

وہ اک آہ بھرتی پھر کہتی "یہ بیماری ہزار تندرستی سے بہتر ہے۔ دُنیا میں اک عورت کے لئے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ خاموشی میں گھلے اور اُف نہ کرے۔ اُس وقت تک حرفِ شکایت لب پر نہ آئے جب فرشتۂ موت اُس کی روح قبض کرنے سرہانے آ کھڑا ہو۔" اور دو بڑے بڑے چمکیلے آنسو اُس کی آنکھ کے آخری کونوں میں لرز جاتے جنہیں وہ پی لیتی اور دیوار کی طرف کروٹ بدل کر خاموش ہو جاتی۔

میں حیران ہو کر پوچھتی: "مگر موم بتّی! تم نے آج تک بتایا تمہاری تکلیف اور تمہارے گھلنے کی وجہ کیا ہے؟"

"نہ پوچھو شہ رخ" اور پھر مُسکرانے کی کوشش کرتے ہو۔ کہتی: "یاد رکھو عورت کا کام ہی گھُلنا ہے۔ شریف عورت کبھی اپنی تکالیف کا اظہار نہیں کرتی۔ میں اعلیٰ معاشرت میں پلی اور بڑھی ہوں، مجھے یہی سکھایا گیا ہے۔ میرے درد و الم کی داستان نہ سُنو۔ مجھے دیکھ دیکھ کر کیوں اپنی خوشیوں کو غارت کرتی ہو شہ رخ! ابھی تم تو شگفتہ کلی ہو۔ اور خدا نہ کرے جو بادِ خزاں تمہاری زندگی کی کسی پنکھڑی سے بھی مس کر جائے۔ مگر میری صرف ایک بات گرہ میں باندھ رکھو کہ عورت یعنی شریف عورت

وہی ہے جو مردوں کے ظلم کا مقابلہ خاموشی سے کرے۔ دشمنی کا
جواب دوستی سے اور بدخواہی کا جواب بے زبانی سے دے۔ عورت
سدا ہی اس لئے ہوئی ہے کہ ـــــ"
میں نے جملہ ختم کیا "کہ وہ تکلیف سہتی رہے؟"
وہ کہتی "ہاں میری ساری اک شریف و باحیا عورت
کی زندگی کی معراج ہی یہ ہے کہ وہ دُنیا کے ظلم و ستم کا مقابلہ
بے زبانی اور اپنے صبر اور بے خاموش آنسوؤں سے کرے
مگر اُف نہ کرے۔"

جب بھی میں اس کے کمرے سے باہر نکلتی اس کی شرافت
پاکیزگی کا گہرا اثر لے کر نکلتی۔ رفتہ رفتہ عورت کے اخلاق اور
زندگی کے متعلق میرا نظریہ بھی بنتا گیا کہ عورت دنیا میں اُف
نہ کرنے اور مظالم سہنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔
موم بتی کی وہ باتیں اور اس کے کمرے کے وہ مناظر
لمحوں میں میری نظروں کے آگے پھر گئے اور میں اسی خیال
سے اس وقت چونکی جب بوڑھا حبشی دربان یہ اطلاع
پہنچا کر واپس ہونے کا قصد کر رہا تھا۔
میں نے مخاطب ہو کر پوچھا "کچھ پتہ لگا کہ اسے
مرض کیا تھا؟"

"مرض؟" بوڑھے نے میری طرف دوبارہ مڑتے ہوئے
کہا "خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ایسا مرض
ہر شریف عورت کو عطا کرے۔ اس کے مرض کا نام آج تک
کسی طبیب کے کانوں تک نہ پہنچ سکا۔ اسے کہتے ہیں شریف
حیا عورت کا حجاب! اس کا مرض وفاداری تھا۔ خدمت گذاری
اور صبر و ضبط تھا۔ ایسی عورتیں اب رہیں کہاں؟ مرحومہ
قدیم تہذیب و اخلاق کا مکمل نمونہ تھی۔ جنازہ پائیں باغ کے
ایوان میں لایا جا رہا ہے۔ تمہیں وہیں پہنچنا ہے۔ خدا حافظ۔"
اس کے جانے کے بعد میں نے [illegible] ایک گلوگیر احساس
کے ساتھ جلد جلد غسل کیا۔ نماز فجر ادا کی۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے
اور دل میں اضطراب۔ [illegible] سفید رنگ کا لباس پہنا جس کے
[illegible] سبز رنگ کے تھے۔ اسی وقت بوڑھی مسترن جو ملکہ
مسترکی آستانگاہ کی نگراں تھی جلد جلد باغ کے زینے طے
کر کے اندر آ گئی۔

"پیاری بیٹی شیریں! تمہیں اطلاع مل چکی ہوگی رات
موم بتی کا انتقال ہوگیا۔ پائیں باغ کے ایوان کی طرف بھاگی جا[illegible]
وہیں رکھا گیا ہے۔ ملکہ بہیں وہاں دیکھنا پسند کریں گی [illegible]
عورتیں وہیں موجود ہیں۔"
یہ سُن کر میں بلا سوچے سمجھے فوراً مڑ گئی پھر اچانک
مسترن کی طرف دیکھ کر کہا "ایسے یکلخت اس کا انتقال کیسے
ہو گیا؟ میں پرسوں ہی تو اسے دیکھ آئی تھی!"
مسترن کہنے لگی "یکلخت کہاں ہوا؟ وہ بیچاری دو
سال سے گھل رہی تھی۔ اس کا انجام یہی ہونا تھا اک دن!"
میں نے پوچھا "مرتے وقت بھی کوئی معالج نہ بلایا گیا؟"
مسترن نے اپنا بڑا سا سر ہلا کر اک آہ بھری پھر سر
ہلا کر بولی "اسے کسی نامحرم مرد سے بات کرنا یا اسے اپنی نبض
دکھانا منظور نہ تھا ورنہ ایک کیا سینکڑوں معالج آ سکتے تھے۔ مگر وہ
پرانی تہذیب اور رسوم کی تصویر تھی۔ اسی لئے تو ملکہ نے
اسے موم بتی کا خطاب عطا کیا تھا۔ اچھا پیاری جا[illegible]
ہو رہی ہے دیکھو تمہارے سر کی چادر شانوں پر اُتر [illegible]
کنواری لڑکی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔ احتیاط سے [illegible]
بیٹی۔ مرحومہ کی مثال تم لڑکیوں کے لئے شمع ہدایت ہونی
چاہیے کہ وہ مرنے کو مر گئی مگر محض حیا کے مارے علاج تک
نہ کرایا!"

یہ سُن کر میں نے اپنا سر ڈھانک لیا۔ اور دل ہی دل
میں اپنے آپ کو کمتر اور مجرم سی محسوس کرنے لگی۔ واقعی
کہاں پاکباز موم بتی! اور کہاں میں گناہ گار!
جب میں ملکہ کے ایوان کے قریب پہنچی تو میرا سانس
پھولا ہوا تھا۔ میں نے شہ نشین والے کمرے میں قدم رکھا
تو وہاں مجھے چند افسروں کے سائے متحرک نظر آئے۔ یہ
سائے مجھے اکثر نظر آتے تھے۔ مگر میں نے آج تک کبھی اُن کی
طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کی تھی۔ کیونکہ عہد طفولیت
ہی میں میری نانی مرحومہ نے یہ بات میرے ذہن نشین کرا دی
تھی کہ شریف لڑکی کے لئے نظریں نیچی رکھنا ایسا ہی ضروری
ہے جیسا سانس لینا۔ اسی سے اس کی شرافت و حیا کے
متعلق رائے قائم کی جاتی ہے۔ چنانچہ میں ہمیشہ اس پر عمل
پیرا رہی۔ اور کئی دفعہ اپنے لمبے لمبے دامنوں میں خود ہی
اُلجھ کر گرتے گرتے بچی۔ یہی وجہ تھی میں نے ان بڑے بڑے

نظروں سے کبھی مرد سا تو متحرک دیکھے شکلیں نہ دیکھیں۔ یہ اور بات ہے کہ تمام وقت مجھے یہیں محسوس ہوتا رہا کہ یہ افسر مجھے اژدہے کی طرح گھور رہے ہیں۔ مگر وہ مرد تھے جن کا کام ہماری معاشرت میں عورت کی شرافت وحیا کے معیار بنانا اور انہیں جانچنا ہوتا ہے۔ اور میں عورت تھی جس کا فرض ہماری اعلیٰ تہذیب میں بنے ہوئے معیار پر پورا اترنا اور جانچی جانا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں گرتی پڑتی اور مارے شرم وحیا کے گٹھڑی بنی ہوئی ان نقادوں کے کمرے میں سے گذر گئی اور پائیں باغ کے ایوان میں قدم رکھا۔ اس کی دیواریں ہلکے سبز رنگ کی تھیں، جن پر فرشتوں کی ابھری ہوئی شکلیں منقش تھیں۔ اور ان فرشتوں کے پر اکسیر کے پتوں سے مشابہ تھے۔ ایوان کی زمین سنگ سبز کی تھی۔ اس کے پتھر میں کٹی ہوئی ننھی ننھی نہروں کا شفاف پانی یوں بہہ رہا تھا جیسے سبز گھاس میں پارے کی اک لکیر کھنچی ہوئی ہو۔ جابجا ننھی ننھی چینی قندیلیں آویزاں تھیں، جن پر سیاہ ریشم کے فانوس چڑھائے گئے تھے۔ اس ایوان کے درمیان صندل کی اک لمبی چوکی پر موم بتی کا تابوت رکھا ہوا تھا جس پر دھانی رنگ کی اک سادہ سی چادر پڑی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے فردوس کے کسی علیحدہ سبز گوشے میں کسی راہبہ کا جنازہ رکھا ہوا ہو۔

جب میں نے اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ ایوان محل کی تمام نوجوان اور بوڑھی کنیزوں اور عورتوں سے پٹا پڑا ہے۔ مزید براں علیہ حضرت کی کئی قریبی رشتہ دار اور ملاقاتی خواتین بھی موجود تھیں۔ اور سب مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت کر رہی تھیں۔ البتہ اس مجمع میں مجھے خاتون رقیہ کہیں نظر نہ آئیں۔ نہ انہیں ڈھونڈنے کا مجھے موقع ہی ملا۔ کیونکہ جب میں اندر داخل ہوئی تو ملکہ قمر اک سرمئی رنگ کے نہایت اعلیٰ ریشم میں ملبوس تابوت کے سرہانے کھڑی اپنی نہایت باریک سُریلی آواز میں فرما رہی تھیں:۔

"اس جنازے میں اُس پاک عورت کا نحیف جسم رکھا ہے جسے سورج کی کرنوں نے بھی کبھی بے حجاب نہیں دیکھا۔ جس کے گھر کے در و دیوار نے بھی کبھی اس کی اُف نہیں سُنی۔ جس کا دل اک رستا ہوا ناسور تھا۔ مگر باوجود اس کے ضبط و تحمل کا یہ حال تھا کہ اُسکے آنسو اُسکے قریب ترین قریبی رشتہ دار نے بھی کبھی نہیں دیکھے۔ اس کی عمر بمشکل چودہ سال کی ہو گی جب وہ اپنی مرضی کے خلاف اک ایسے مرد سے جبراً بیاہ دی گئی جو حد درجہ اوباش اور عادی شرابی تھا۔ نہ صرف یہی خرابیاں اس میں تھیں بلکہ اس پر طرہ یہ کہ وہ بے حد کریہ المنظر اور قابل نفرت شخص بھی تھا۔ اگر چاہتی تو موم بتی مذہبی احکام کی رو سے اس شخص سے آسانی سے طلاق لے سکتی تھی مگر وہ اک شریف خاندان کی باحیا اور بے زبان عورت تھی اور تم سب جانتی ہو کہ اک باحیا شریف عورت کے اس دنیا میں فرائض کیا ہیں! موم بتی ان فرائض کو پوری طرح ادا کر گئی۔ اُسنے اپنے قابل نفرت شیطان سیرت شوہر کو خدائے مجازی سمجھ کر اُس کی پرستش کی۔ وہ اُس کی بدصورتی میں حسن، اور اس کی بدخصلتی میں نیکی دیکھتی تھی۔ وہ پرانی تہذیب و ثقافت کے آغوش میں پروان چڑھی تھی، اس لئے اُس نے تمام عمر اپنے بدصورت اور بدمزاج شوہر کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کیں۔ بڑے سے بڑا دکھ اُٹھایا، زندگی کو جہنم بنا لیا مگر اسی شوہر کی خدمت گذاری میں عمر عزیز کاٹ دی۔ موم بتی کی زندگی تمہارے لئے مشعل ہدایت ہونی چاہیئے، جس نے ہمیشہ اپنے حقوق کی حق تلفی کر کے دوسروں کو حقوق دلوائے۔ جس نے ہمیشہ اپنے آپ کو قربان کر کے دوسروں کو جلایا۔ جس نے اپنے اوباش شرابی شوہر کو ہمیشہ اس حسین فریب میں یوں مبتلا رکھا کہ اس بات کا علم خود اسے بھی نہ ہونے پایا کہ اُس کے گناہوں کا بوجھ روز بروز کس قدر وزنی ہوتا جا رہا ہے اور وہ کس قعر مذلت کے قریب تر ہے۔ یہ اُس نیک عورت کا جنازہ ہے جس کی نسوانی شرافت وحیا کی انتہا یہ ہے کہ اس نے کسی مرد معالج سے مشورہ لینا بھی گوارا

نہ کیا۔ حالانکہ مرض کی انتہا میں مذہب نے اس کی اجازت دے رکھی ہے کہ معالج کے سامنے مریضہ بے پردہ ہو سکتی ہے۔ مگر اس باحیا عورت کو یہ بھی گوارا نہ ہوا اور اُس نے کسی معالج سے علاج نہ کرایا اور آخر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔"

ملکہ کی تقریر سُن کر میری پلکیں آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں نے انہیں دستی سے خشک کر لیا اور کن انکھیوں سے دہنے دائیں بائیں دیکھا تو سب کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ان میں کنیزیں بھی تھیں اور ملکہ معظمہ کی رفیق خواتین بھی تھیں مگر مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ اس یادگار مجمع میں خاتون رُوحی موجود نہ تھیں! ایسے موقع پر ان کی عدم موجودگی پر مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ وہ اتنی سنگدل تو نہیں ہو سکتیں کہ ایسی پاکباز عورت کے جنازے میں شریک ہونے کی بجائے کسی افسانے کو مکمل کرنے کی فکر میں لگی رہتیں۔ ان کی عدم موجودگی میرے لئے اک معمہ تھی!

خواب اور خواب

(۱)

میں ہوں سردار اپنی قوم کا
اور ہو ممتاز میری قوم سب اقوام میں
میرے دشمن اصل میں دشمن ہیں میری قوم کے
سب سے پہلے میں کروں ان کو سپردِ نیستی
یوں کروں ہموار اپنی راہ کو
خوف و ہیبت سے دلوں کو جیت لوں
دیوتاؤں کی طرح پوجیں مجھے افرادِ قوم
ہوں زمین و آسماں میں چرچے عظمت کے مری
پھر اٹھوں میں ساری دنیا پر حکومت کے لئے
چھوٹے چھوٹے پتھروں کو روندتا
بڑھتا جاؤں بلندی کی طرف
اور ٹکراؤں پہاڑی آہنی دیوار سے
قوم کے ہر فرد کو کر دوں نثار
خون کے ساگر میں لاش انسانیت کی ڈوب جائے

(۲)

میں ہوں اک فرد اپنی قوم کا
اور ہو ممتاز میری قوم سب اقوام میں
دوست دشمن کو میں اپناؤں سلوک و جذب سے
دوں محبت کا سبق ہر قلب کو
زندگی کا راز ہے آزادیِ فکر و عمل
شکست کے توڑ دوں تنہائے ہیبت آفریں
جذبۂ انسانیت انگڑائی لے کر جاگ اُٹھے
تذکرے عظمت کے میری قوم کے
پھیلے جائیں جہاں تک آدمی کا ہے گذر
ظلمتیں کھو جائیں، پیدا نور ہو
منزلِ مقصود کی ہموار راہ
ہو نظر کے سامنے
دوسری اقوامِ عالم خود بخود مجبور ہوں
میرے نقشِ پا پہ چلنے کے لئے

ضیا فتح آبادی

امین حزیں

ذوقِ تکمیل

دانے میں شجر نظر جب آئے قطرے میں گہر نظر جب آئی ظلمت میں سحر نظر جب آئی

انڈے ہی میں پر نظر جب آئے جب جا کے نظر سمجھ نظر کو

سانچے میں گری ہے آ کے جو شے کیا آپ سے آپ ڈھل رہی ہے؟ منزل نہیں ہو رہی یونہی طے

تکمیل کی آرزو ہے در پے تھمتی ہی نہیں جو لمحہ بھر کو

ایسا ہی یہی خضر ہے آباد اسی سے بحر و بر ہے معمول اسی کا خشک و تر ہے

تکمیل کا ذوق ہی نظر ہے معلوم ہو کاش یہ بشر کو!

اے جادۂ ارتقا کے راہی! اے رزمِ حیات کے سپاہی! ذلت ہی سزا ہے کم نگاہی

ملتی ہے یہاں اُسی کو شاہی رکھتا ہے عزیز جو نظر کو

غلام یزدانی کا

حیدرآباد کے چند شاعر

دورِ حاضر

[illegible]س لے دو سال ہوئے ایک مضمون انگریزی زبان میں [illegible] حاضر کے بعض اُردو شعرا پر حیدرآباد ہسٹری سوسائٹی [illegible] ایک مجلس میں پڑھا تھا۔ یہ مضمون رائل انڈیا سوسائٹی کے [illegible] میں لندن سے شائع ہو گیا ہے[1]۔ مضمون کے آخر میں یہ [illegible] کیا گیا تھا کہ حیدرآباد کے شعرا پر کبھی ایک تنقیدی مضمون [illegible] تاکہ باہر والوں کو یہاں کی [illegible] اور ادبی ترقی اور شعر و سخن کے ذوق کا حال معلوم ہو سکے۔ موجودہ مضمون اسی وعدہ [illegible] ہے۔

دکن کی سرزمین ابتدا سے شاعری کا گہوارہ رہی ہے۔ [illegible] صدی عیسوی کے آخر اور سترھویں صدی کے شروع میں قطب شاہی خاندان کے دو فرمانروا محمد قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ باکمال شاعر تھے۔ اور انھوں نے دکھنی زبان کو جسے اُردو کی ماں یا کم از کم دایہ کہنا لازمی ہے بے حد فروغ [illegible] آصفیہ خاندان کے بادشاہوں نے بھی شاعری کی نہایت شوق سے سرپرستی فرمائی۔ چنانچہ حضور مرحوم (نور اللہ مرقدہٗ وجعل مقامہٗ فی اعلیٰ علیین) کا کلام تمام ہندوستان میں شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اور موجودہ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی (خلد اللہ ملکہٗ وسلطانہٗ) کے کلام کی نسبت ہر تنقیدی نقطۂ خیال سے کلام الملوک ملوک الکلام کہنا زیبا ہوگا۔ ان دو عظیم الشان شاہوں کے خاص شغف کی وجہ سے نہ صرف دکن کے اُمرا اور عام پبلک کو شاعری کی طرف میلان پیدا ہو گیا بلکہ ہندوستان کے چوٹی کے شاعر سمٹ کر دربارِ آصفیہ میں حاضر ہو گئے جن کو ان کی قابلیت اور جوہرِ ذاتی کے اعتبار سے نوازا گیا۔ نواب مرزا خان داغ [illegible] فصیح الملک بہادر کے خطاب سے مشرف ہوئے۔ اور دربار کا ملک الشعرا بھی ان کو مقرر کیا گیا۔ داغ کا بہترین کلام حیدرآباد میں ہی نظم ہوا۔ منشی امیر احمد مینائی بھی اپنی عمر کے آخری حصہ میں رامپور سے حیدرآباد پہنچے۔ اور یہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے ممتاز اور قابل تلمیذ حافظ جلیل حسن جلیل کو موجودہ اعلیٰ حضرت (خلد اللہ ملکہٗ وسلطانہٗ) نے نواب فصاحت جنگ بہادر کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اور اُستادی کا جو امتیاز اعلیٰ حضرت مرحوم کے عہد میں داغ کو حاصل تھا وہ نواب فصاحت جنگ بہادر کو عنایت فرمایا گیا۔ حضرت جلیل کا بھی بہترین کلام حیدرآباد ہی میں ختم ہوا۔

دولتِ آصفیہ کی علمی سرپرستی اور شعر و سخن کی قدردانی ہندوستان کے اور شعرا کو بھی یہاں آنے پر وقتاً فوقتاً مائل کرتی رہی چنانچہ پچھلے زمانہ میں حالی اور پنڈت رتن ناتھ سرشار اور اس زمانہ میں، فانی، ماہر، جوش، حفیظ، جگر، ساغر حیدرآباد آئے۔ بعض یہاں ملازمت میں داخل ہو گئے بعض کی وظائف سے ہمت افزائی فرمائی گئی۔ ان باکمالوں کے مشاعروں اور اُمرا اور اہلِ فن کی مجالس میں شریک ہونے کی وجہ سے یہاں کے نوعمر طبقے پر گہرا اثر ہوا۔

ذہنی تربیت اور شاعرانہ قابلیت کو پروان چڑھانے میں جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور بعض فاضل عہدہ داروں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ان بزرگ ہستیوں میں مولوی علی حیدر طباطبائی، مولوی وحید الدین سلیم اور مولانا ڈاکٹر عبدالحق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان ماہرین کی صحیح تنقید نے نوعمر شعرا کو پرانی طرز کی بھول بھلیوں اور مبتذل سے بنی ہوئی پیچدار راہوں سے بچا لیا۔ اور ایسے روشن اور واضح طریقے بتائے جن سے وہ شاعری کے اصلی مقصد تک آسانی سے پہنچ جائیں۔ مولوی وحید الدین سلیم کی وفات اور مولانا ڈاکٹر عبدالحق کے جامعہ سے علیحدہ ہونے کے بعد ان کے لائق جانشینوں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر

---

[1] Journal of Indian arts and Letters صفحات [illegible] جلد سیزدہم حصہ اوّل بابت ۱۹۴۴ء

حیدرآبادی نے بھی شعر و سخن کا اعلیٰ ذوق پیدا کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

یہ سب بیرونی اثرات ہیں۔ شاعر کے کمال میں بہت کچھ اس کی انفرادی طبیعت کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں نوجوان شعرا کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ اس مضمون میں سب کے کلام پر بحث کرنی مقصود نہیں۔ باورچی دیگ کا حال معلوم کرنے کیلئے تھوڑا سا کھانا نکالتا ہے۔ اور اسی سے اپنی رائے قائم کرتا ہے میں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اور حیدرآباد کے شعرا میں سے صرف چار کو لے لیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ان چار کے علاوہ باقی ادنیٰ درجے کے ہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ بعض تو ان میں سے ایسے کہنہ مشق ہیں کہ اپنے کمال اور علم سے تمام ہندستان میں شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً حضرت علی احمد صاحب اختر یا مولانا امجد مدظلہم۔

مغربی تعلیم اور یوروپین رسالوں کی شاعری بھی حیدرآباد کے شاعر کے دماغ کو وسعت دینے میں ایک حد تک ممد و معاون رہی ہیں۔ اور موجودہ عالمگیر اقتصادی کش مکش اور خونریز لڑائیوں اور قوموں کی وحشیانہ نفسا نفسی کا بھی اثر اس کے ذہن پر پڑا ہے میں نے حیدرآباد کے چار شعرا کو اگرچہ مختلف طبقوں سے چنا ہے مثلاً ایک سرکاری عہدیدار ہیں تو دوسرے پکے اشتمالی۔ تیسرے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تو چوتھے ٹھیٹھ دیہاتی۔ تاہم سامراج اور ملکی حالات سے ان کے دل یکساں ملول ہیں۔ اور انسانی مساوات اور حقیقی امن و سکون کے طالب۔ میں اب ان چاروں شاعروں کے حالات زندگی بیان کرتا ہوں تاکہ ان کی خصوصیات کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اور جو کیفیات اور احساسات پیش کئے ہیں ان کا پس منظر معلوم ہو سکے۔

مولوی فضل الرحمن صاحب

اوّل میں مولوی فضل الرحمن صاحب کا ذکر کروں گا۔ محکمہ نشریات لاسلکی کے ناظم ہیں۔ تینتالیس برس کی عمر ہے۔ پہلے نظام کالج میں اور بعد میں پونہ کالج میں تعلیم پائی۔ اور وہیں کی بی۔ اے کی ڈگری اعزازات کے ساتھ حاصل کی۔ پونہ کے در و دیوار اور فضا میں تلک اور گوکھلے کا جذبۂ وطنیت بسا ہوا ہے فضل الرحمن صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ ان کے اس

قومی جوش کو ان بندوں میں ملاحظہ فرمائیے :۔

(۱)

جب آگے بڑھیں گے دست و قدم
چالیس کروڑ انسانوں کے
ہل جائینگے گنبد مشرق سے
مغرب تک سب ایوانوں کے
لاچاروں کی قسمت چمکے گی
پھر جائینگے دن ناداروں کے
پھر یہ ساری دکھیا راتیں
گویا سطر افسانوں کے

(۲)

شاعر کے مجسم خوابوں میں
جس روح رواں کی تنویریں
وہ زندہ نقوشِ آزادی
وہ جیتی جاگتی تصویریں
پابندِ غلامی خلقت کی
کٹ جائینگی شاید زنجیریں
یا جان سی پڑ جائیگی پھر
ان ڈھانچوں بیجانوں کے

(۳)

جو لطف عدم میں پنہاں ہیں
ہستی کی فضا میں آئیں گے
مایوس دلوں کی تسکیں کو
پیغام تمنا لائیں گے
اس عہد کی بے نور آنکھیں اب
کیا جانے وہ کیا دکھلائیں گے
دریاؤں کے نایاب گہر
یا غنچے گلستانوں کے

(۴)

آ وقت کی ٹوٹی کشتی کو
افلاک کے پار لگائیں پھر
ہے سیلِ حوادث زوروں پر
ہمت کا اثر دکھلائیں پھر

یہ چمکنے نظارے یہ پیاری دنیا
یہ فضا میں فلک کی وہ چرخ بریں
یہ ہے برق کے ذرّوں کا ناچ پیا
وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن

(۴)

یہ بشر جو ہے خلق کا محشر
ہے جو ساری خدائی کا اور نظر
ہے یہ کونسے ذرّوں کا ناچ پیا
ہے یہ کونسی لہروں کا کھیل سجن
یہ عقل و فکر یہ ذہن رسا
یہ تکلم نطق یہ ذوق لوا
ہے یہ کونسے ذرّوں کا ناچ پیا
ہے یہ کونسی لہروں کا کھیل سجن

الیکٹرون (Electron) کے متعلق سائنس کے جدید نظریے کا جس خوبی سے اظہار کیا گیا ہے وہ شاعر کے کمال کو دکھانے کیلئے کافی ہے۔ تیسرے بند میں

یہ پردیہ پیت کے مارے ہوئے
نہیں بجھتی پریم کی جن کے اگن

اہل ذوق کو تڑپا دیتے ہیں۔ آخری بند میں اس کی حقیقت پر شاعر کا استعجاب اس کے مذہبی رنگ کو بڑے انوکھے اور دلکش انداز میں پیش کرتا ہے۔

لارڈ ٹینی سن نے اپنی مشہور نظم پرنسس (Princess) میں کہر کے نظریے کو بڑے سلیقے سے بیان کیا ہے۔ اب آپ اسی موضوع پر فضل الرحمن صاحب کی نظم "کرشمہ وجود" کا بھی کچھ حصہ سُن لیجئے:۔

نہ زمیں ہی تھی نہ آسماں نہ ستارے تھے چراغ پاں
فقط ایک دھندلی سی کہر تھی فقط اک سیاہ سا کچھ دھواں

نہ یہ مہر و ماہ کی گردشیں نہ یہ ابر و باد نہ بارشیں
نہ یہ روز و شب نہ یہ بحر و بر نہ یہ دشت تھے نہ یہ گلستاں

ابھی ماہ و سال گذرنے تھے ابھی لاکھوں نقش ابھرنے تھے
ابھی وقت کو یاکھولنے تھے ابھی زندگی کی یہ داستاں

اٹھا شور چار سو یک بیک مچی دھوم فرش سے عرش تک
وہ کھلے وجود کے راستے وہ چلا حیات کا کارواں

غم زندگی کی یہ ابتدا تھی ہوس کی اصل میں انتہا
کہیں دور میں قدح زمیں کہیں رقص محفل آسماں

کبھی آفتاب کی روشنی کبھی جادر ابر بہار کی
کبھی ماہتاب کے نور سے لگا جگمگانے یہ خاکداں

رہ ارتقا کا وہ سلسلہ کہ نہ جس کی حد نہ کچھ انتہا
جو حقیر ذرے تھے کل کے دن بنے آج انجم ضوفشاں

کہیں جلوے حسن و جمال کے کہیں شعلے شمع خیال کے
غرض اک نگہ کے اشارے میں ہوئی سرفرازی دو جہاں

شاعر اس نظم میں بھی اپنے مذہبی اعتقادات سے نہیں ڈگمگایا ہے۔

ہنگامۂ ہستی کی قدامت پر ایک نظم فضل الرحمن صاحب نے دائمی منظر کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ بھی نہایت پسندیدہ ہے اور بہت مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اس کے بھی چند بند نقل کرتا ہوں:۔

یہی دُنیا تھی یہی گرمئ بزم عالم
یہی گیتی تھی یہی ہنگامۂ نسل آدم
رنج و راحت تھے اسی طرح جہاں میں توام
دل شاداں بھی یہی تھا یہی چشم پُرنم

وادئ نیل میں ماسامری گلزاروں میں
مالستان کے آراستہ بازاروں میں
ہند کے مندروں میں چین کے درباروں میں
نقش الفت تھا ہر رنگ دلوں پہ قائم

ساعت موت یہی زیست کے دن رات یہی
حسن اور عشق کی دزدیدہ ملاقات یہی
عہد و اقرار یہی حسرت و حکایات یہی

گرچہ موجود نہ تھے روئے زمیں پر ہم تم

راہ گیروں کی سراسر منزل فانی ہی سہی
ہواؤں میں ڈھلتی ہوئی بہتا ہوا پانی ہی سہی
سر بسر اردو ہوا سیل و روانی ہی سہی
اس روانی پہ بھی ہے سطوت ہستی دائم

حسن الرحمٰن صاحب کا ذوق بہت نفیس ہے۔ اور وہ اعلیٰ پایہ کے نقاد بھی ہیں۔ میں ان صفات کی بنا پر ان کو دکن کی اردو شاعری کا مستقبل آفریں سمجھتا ہوں۔ ان کا کلام ایک استادانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اور حیدرآباد کے نوجوان شعرا کے لئے ان کی پاکیزگی، بحور کی موزونیت، تخیل کی لطافت اور [illegible] کے حامل تقلید کو سے ان کی نظموں میں موجود ہیں۔ زبان کی سادگی اور [illegible] کے رقت عشقیہ رنگ کو دکھانے کے لئے میں ایک نظم موسومہ "جگت دیوی" کو پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

جگت دیوی

کبھی دھوپ کے روپ میں مسکرانا
کبھی چھپ کے بدلی میں آنسو بہانا
شعاعوں سے سورج کی ماتھے پہ افشاں
شفق سے ہتھیلی پہ مہندی لگانا
ستاروں سے مکھڑا چھپانے کی خاطر
پھر اودی گھٹاؤں کو آنچل بنانا
عیاں کبھی شہر والوں کی آکر
لجائی نگاہوں سے بجلی گرانا
کبھی حسن کرنا چلا ما کبھی [illegible]
کبھی یونہی شور قیامت مچانا
ادھر دور رہنے کی آنکھوں سے کوشش
ادھر دل میں رس بس کے شوخی دکھانا
مرا ڈھونڈھنا چلے امتحان بن کر
ادھر پریت کی ریت من کو سکھانا
ستا کر کبھی بے رخی زندگی بھر
دل و جان کو سو سو طرح آزمانا
کبھی بن کے آرام جاں بن بلائے
دکھی دل کی ہر دم تسلی کو آنا
غرض اس کی چاہت کا کوئی بھرم [illegible]
نہ کچھ بیر اور دشمنی کا ٹھکانا

حیدرآباد کے ایک شاعر کا کلام آپ ملاحظہ فرما چکے۔ اب دوسرے کا ملاحظہ فرمائیے:۔

سکندر علی وجد

سکندر علی صاحب وجد ضلع اورنگ آباد کے مردم خیز خطے میں پیدا ہوئے۔ مقام پیدائش ویجاپور ہے۔ جو اپنے خوشگوار اور لذیذ میووں کیلئے اب بھی مشہور ہے۔ ٹھیک سن ولادت ۱۹۱۴ عیسوی ہے۔ تعلیم کیلئے اورنگ آباد آئے۔ جس کے تاریخی حالات اور قدرتی مناظر نے ان کے ذہن اور دماغ پر گہرا اثر کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

تری پائندگی یوں ہنس رہی ہے انقلابوں پر
سمندر جیسے ہنستا ہے حقارت سے حبابوں پر
زمانہ میں ترے آثار کی توقیر ہوتی ہے
تری آغوش میں تہذیب اہل ہند سوتی ہے
رہی چشم مذاہب پیر سے ... پرچم کشاں برسوں
رہیں گے دامن کہسار میں جھکے نشاں برسوں
ہے تیری وادیوں میں عزم خلجی مہو اراست تک
فضا میں ہمت تغلق کا اڑتا ہے غبار اب تک
دکن کے نغمہ ہائے سرود گونجے تیری محفل میں
سراج بزم عرفاں سے اجالا ہے ترے دل میں
ترے ہی سازِ رنگیں سے شگفتے نغمے جوانی کے
ترے ماحول میں سیکھے ہیں گر جادو بیانی کے
تحمل پر مرے معذوف ہے تیری بہار اب تک
مرے آنسو رہی الفت کے ہیں آئینہ دار اب تک

سکندر علی صاحب جب اورنگ آباد پہنچے اس وقت مولانا عبدالحق وہاں کے مدرسے کے صدر تھے۔ ان کے علمی شوق، اعلیٰ کردار اور پرجوش محبت نے اورنگ آباد میں ایک خاص فضا پیدا کر دی تھی۔ جس سے ہر طالب علم کے دل میں استاد کی تقلید کا ایک والہانہ جذبہ امنڈ آتا تھا۔ سکندر علی صاحب کی خداداد ذہانت اور سادہ دیہاتی زندگی مولوی صاحب کو پسند

اور وہ سکندر علی صاحب پر خاص عنایت فرمانے لگے ۔
ان میں موجودہ زندگی میں جو اعلیٰ خصائل نظر آتے ہیں، وہ
اورنگ آباد کالج کی تربیت کا نتیجہ ہیں مثلاً عادات
میں انتہا سادگی ۔ لیکن طبیعت ایسی ہے کہ بادشاہوں کے
سامنے بےجا سر نہ جھکائیں ۔ پاکیزہ اخلاق، حق پسند،
علم و فن کے شیدائی، ظرافت کی طرف مائل، مستقل مزاج
ریا و کبر سے ہزاروں کوس دور ۔

اورنگ آباد سے فارغ التحصیل ہو کر جب سکندر علی
صاحب اعلیٰ تعلیم کیلئے حیدرآباد آئے ۔ اس وقت جامعہ عثمانیہ
میں شعر و سخن کا اچھا ذوق پیدا ہو گیا تھا ۔ ان کے ہم عصروں میں
مخدوم، میکش، باقی جیسے خوش فکر طالب علم تھے ۔

مولوی عبدالحق صاحب بھی شعبہ اردو کی صدارت پر آ
گئے تھے جن کا فیضان سکندر علی صاحب پر جاری رہا ۔ اسی طالب
علمی کے زمانہ میں انھوں نے مجلہ عثمانیہ کی ادارت بھی کی ۔ اس
طرح ان کی ادبی اور شاعرانہ قابلیت بڑھتی رہی ۔ ۱۹۳۵ء عیسوی
میں سکندر علی صاحب نے بی ۔ اے کی ڈگری حاصل کی ۔ اور
۱۹۳۶ء میں حیدرآباد سول سروس کے مسابقتی امتحان میں کامیاب
ہو گئے ۔ چند سال تک اضلاع میں مجسٹریٹ رہے ۔ اور اب ہائی
کورٹ میں اسسٹنٹ رجسٹراری کے عہدہ پر فائز ہیں ۔

سکندر علی صاحب کا چھوٹا قد، چھریرا بدن، گورا رنگ،
روشن آنکھیں خاصی جاذبیت رکھتی ہیں ۔ یہ جاذبیت اُن کی
پاٹ دار رسیلی آواز سے اور بڑھ جاتی ہے ۔ نظم جب پڑھتے
ہیں تو چہرے اور آنکھوں پر کیف کی حالت پیدا ہو جاتی ہے ۔
جو سننے والوں کو بھی تھوڑا بہت مدہوش کر دیتی ہے ۔ شعر کیلئے
یہ نغمہ کو بہت ضروری سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ درگاہ رب العزت میں
بطور دعا عرض کیا ہے ۔

طرز کہن سے سرد ہوئی محفل ادب
ساز سخن کو نغمۂ جدت طراز دے

موسیقیت سکندر علی صاحب کے کلام کی نمایاں خصوصیت
ہے لفظی شاعری سے ان کو رغبت نہیں ۔ شعر کے مقصد کو یوں اس
طرح بیان فرماتے ہیں ۔

شعر کے پردے میں راز زندگانی فاش ہو
صرف لفظی شاعری کا دعویٰ میں قائل نہیں

اقبالؔ کے کلام کا اثر ان کے اشعار میں کثرت سے پایا جاتا ہے
جو ان کی آئندہ ترقی کیلئے نیک فال ہے ۔ سکندر صاحب کی عمر ابھی
صرف اکتیس سال ہے ۔ تاہم جدت، بلند خیالی، فطرت کا مطالعہ
اور عشقیہ سوز و گداز ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے ۔ غزلیات
میں غالبؔ اور جگرؔ دونوں سے خوشہ چینی کی ہے ۔ پھر بھی ہر چیز
کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ان کی صنعت کے کمال کو ظاہر
کرتا ہے ۔ سکندر علی صاحب انسان کے دکھ درد اور سماجی حیثیتوں
کیلئے ایک محبت بھرا دل رکھتے ہیں ۔ ہندستان میں تیمارداری کا جو
اہتمام ہے اس کے اظہار سے شرم آتی ہے ۔ مہذب ملکوں
میں نرسیں بیمار کی صحت اور ذہنیت دونوں کا حسن ایثار اور محبت سے خیال
رکھتی ہیں ۔ اس کی مدح سرائی مغربی شعراء نے بڑے جوش سے کی
ہے ۔ ہندستان میں بھی صنف لطیف خصوصاً سر بلند خاندان اور
نیک کردار خواتین کی توجہ اس نیک خدمت کی طرف زیادہ ہونی
چاہیئے ۔ سکندر علی صاحب نے نرس کی تصویر بہت خوبی سے
کھینچی ہے جو ہماری تربیت یافتہ صنف لڑکیوں کو مقصد حیات کے اس
پہلو پر ضرور مائل کریگی ۔ انسانی دکھ درد کم کرنا اور راحت اور سکون
میں تبدیل کرنا صرف مسرت بخش فریضہ ہی نہیں ہے بلکہ عین عبادت
ہے ۔ سکندر صاحب اعلیٰ درجہ کے آرٹسٹ ہیں ۔ ان کی جدت طبع
اور فن کاری کو اس نظم میں ملاحظہ فرمائیے ۔

نسیم آتی ہے سستے بستر سے جگانے کو
گلوں سے چھن کے اوس آتی ہے تیرا منہ دھلانے کو
سحر ملبوس نورانی قمر سے مانگ لائی ہے
تجھے پہنا کے جوڑا کل جہاں پر پھیل جاتی ہے
ہوائیں مست و عنبر بار تیرے ساتھ آتی ہیں
ترے آنے سے گل ہنستے ہیں کلیاں مسکراتی ہیں
دل پژمردہ پانے میں رہائی بیقراری سے
تری آمد نہیں کم آمد باد بہاری سے
بلا کی دلکشی ہے تری گفتار نے پائی
تری رفتار میں ہے موجزن طوفان رعنائی
نہاں خدمات میں ہر لطف ہیں خدمتگزاری میں
اثر اکسیر کا پنہاں ہے تیری غمگساری میں
نظام دہر کو سمجھا ہے اپنی بے مثالی پر
عمل تیرا مگر ہے خندہ زن اس کج خیالی پر

وحد صاحب کی شاعری کے مختلف پہلو آپ دیکھ چکے۔
تیسرے شاعر کی کیفیت مختصر طور سے سناتا ہوں:۔

صاحبزادہ محمد علی خان صاحب میکش

آپ کا تعلق شاہی خاندان سے ہے اس لئے شعر و سخن کا ذوق میراث میں ملا ہے۔ طبیعت میں ملا کی آمد ہے۔ ظاہر میں خاموش نظر آتے ہیں۔ قد ذرا چھوٹا ہے۔ جسم بھرا ہوا۔ سانولا رنگ، آنکھیں بڑی، رسیلی۔ لیکن نظر میں وقار اور حیا کے احساسات عیاں۔ عمر تیس یا چونتیس برس کی ہوگی۔ کلام کا ایک مجموعہ "گریہ و تبسم" ۱۹۳۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک اور مجموعہ "نوید" اب چھپ رہا ہے۔ اور بہت سا کلام غیر مطبوعہ باقی ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں تعلیم پائی جس سے ان کو عشق ہے۔ ابتدائی کلام کے مجموعہ میں بہت سی نظمیں کالج کی زندگی سے متعلق ہیں۔ اساتذہ کا انھوں نے کمال احترام سے ذکر کیا ہے۔ طلبا کے دل میں وطنیت اور قومیت کے جذبات پیدا کرنے میں ان کا کلام بہت موثر ثابت ہوا ہے۔ فی الحال نشریات کے محکمہ میں موسیقی کے شعبہ کا انتظام ان کے سپرد ہے۔ ان کی خداداد صلاحیت انہماک اور فرض شناسی کا ہر شخص مداح ہے۔

میکش صاحب کا کلام حیدرآباد اور شمالی ہند کے رسالوں میں اکثر چھپتا رہتا ہے۔ اور کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ یہ کسی خاص رنگ کے متبع نہیں۔ اکثر نظمیں موجودہ زمانہ کے مشہور شعراء کے طرز پر لکھی ہیں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

میری آنکھوں پر نہیں پردہ فریب رنگ کا
جس میں جو پایا وہی میری زباں پر آگیا

زبان صاف ستھری، طرز ادا واضح، احساسات گہرے اور حقیقی۔ ایک نظم ملاحظہ فرمائیے جس سے اس تنقید کا اندازہ ہو سکے گا نظم کا عنوان ہے:۔

تم کیا بدلے دُنیا بدلی

آنکھ میں آنسو لب پر آہیں — لے ڈوبیں ہیں خلوت گاہیں
بند پڑی ہیں پیت کی راہیں — بھٹکی ہوئی پھرتی ہیں نگاہیں

سکھ چین کو راس نہیں ہے — دل کی کلی میں باس نہیں ہے
دُنیا کا کچھ پاس نہیں ہے — اپنا تک احساس نہیں ہے

اپنا سر کس در پہ جھکاؤں — اپنی حالت کس کو دکھاؤں
راز محبت کس کو بتاؤں — اپنی بپتا کس کو سناؤں

اسی مضمون پر ایک اور نظم سن لیجئے جو جذبات کے لحاظ سے زیادہ موثر ہے۔

کسی کی یاد

آتش شررستوں کی بھڑکاتا ہے کوئی
سینے میں دل زار کو گرماتا ہے کوئی
طوفاں ملا میرے لئے لاتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی

جلوؤں سے نظر آتی ہیں معمور فضائیں
مستانہ کئے دیتی ہیں مستانہ ادائیں
آنکھوں میں نظر بنکے سماجاتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی

جب جوش محبت میں نکل جاتی ہیں آہیں
گڑ جاتی ہیں رُخ پر مری پُرشوق نگاہیں
دُنیائے تصور میں بھی شرماتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی

پھر جوش میں آتی ہے مرے درد کی دُنیا
پھر حشر بپا کرتی ہے بیتاب تمنا
سوتے ہوئے فتنوں کو جگاجاتا ہے کوئی
یاد آتا ہے کوئی

تیسرے بند میں یہ مصرع
دُنیائے تصور میں بھی شرماتا ہے کوئی
نہایت لطیف ہے اور میکش صاحب کے کمال کو ظاہر کرتا ہے۔

میکش صاحب نے شاید طالب علمی کے زمانہ میں ایک نظم "جوانی کے گیت" کے عنوان سے لکھی تھی۔ وہ بھی نہایت دلکش ہے۔ اس میں تخیل کی نفاست کے علاوہ عمل اور کوشش کے فلسفہ کو جس کا سبق اقبال نے مختلف انداز میں دیا ہے میکش صاحب نے بھی نہایت دلپذیر طریقے سے پیش کیا ہے۔ اور استقلال، صبر اور جستجو کو تکمیل حیات کیلئے لازمی قرار دیا ہے

ملاحظہ ہو :-

جوانی کا گیت

...بپے ذوقِ آرزو سے زندگی بناؤں گا
غبارِ طوق کی تڑپ میں شمعِ دل جلاؤں گا
...ں کو ستیور کو کھیلتے ہوئے اٹھاؤں گا
...یوں کی شاہراہ پہ قدم بڑھاؤں گا
عمل کے گیت گاؤں گا
جہاں کو بساؤں گا
ابھی تو میں جوان ہوں

...ہے نغمہ ... زندگی
رگوں میں بہہ رہی ہے ایک جوئے شاد ... زندگی
قفس کی مقتدر ... ہے قرار زندگی
ہر قدم پہ لاکھ مشکلیں ہوں مسکراؤں گا
عمل کے گیت گاؤں گا
جہاں کو بساؤں گا
ابھی تو میں جوان ہوں

ہیں جستجو کی بیقراریاں نظر کے نور میں
ہے انکسار کی جھلک شباب کے غرور میں
چھپی ہوئی ہے اک تڑپ سکوں کے وفور میں
میں زندگی کی وسعتوں پہ کیف بن کے چھاؤں گا
عمل کے گیت گاؤں گا
جہاں کو بساؤں گا
ابھی تو میں جوان ہوں

جوانی کی غیر محدود امنگ اور مدہوشانہ رویہ کے مدنظر یہ شعر

میں زندگی کی وسعتوں پہ کیف بن کے چھاؤں گا

مکیش صاحب کے زورِ تخیل کا اچھا نمونہ ہے۔ اس بند کا یہ مصرعہ بھی

ہے انکسار کی جھلک شباب کے غرور میں

نہایت لطیف ہے۔

مکیش صاحب نے اردو شاعری کو وسعت دینے کیلئے مغربی طرز میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ چنانچہ ایک نظم جو انگریزی سانیٹ (Sonnet) کے انداز میں لکھی گئی ہے پیش کی جاتی ہے۔ عنوان ہے :-

چاند اور شاعر

دہقان کھیتوں کی جانب دیکھتا ہے بار بار
یرقان کے مارے ہوؤں کی طرح چہرہ زرد ہے
اسکی بےتابی بتاتی ہے کہ دل میں درد ہے
چاند بھی شاید ہے لذتِ آشنائے انتظار

قلب کی گہرائیوں میں آرزو مستور ہے
بس گیا ہے جیسے ہندوستان بستی میں کوئی
آگ سی سلگا رہا ہے دل کی بستی میں کوئی
قلب ... احساسات سے مجبور ہے

اور سے حسین ... کہ کرتی ہیں شعاعیں ماہ کی
حسنِ منظر پر حجابِ نور ہے چھایا ہوا
پڑ گیا ہے چہرۂ گیتی پہ اک رنگیں نقاب
ہے سکوتِ شام میں آتش نوائی آہ کی
روح تڑپاتی ہوئی قلب گرمایا ہوا
ساغرِ محفل میں گویا چھلکتی ہے شراب

غزل گوئی میں مکیش صاحب کا اندازِ سخن قدما اور موجودہ دور کے شاعروں سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن ان کی مشاق حسن کاری نے پرانے الفاظ اور مضامین کو بھی تازگی بخشدی ہے اور ایسے پیرایہ میں پیش کیا ہے کہ وہ خود انہی کے طبعزاد معلوم ہوتے ہیں۔ قدرتی مناظر اور تاریخی مقامات پر بھی مکیش صاحب نے نہایت اچھی نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں "نظام ساگر اور چاندنی رات" والی نظم سب میں زیادہ پسند کی گئی ہے۔ عام طور سے یہ نظم "ساگر کے کنارے" کے عنوان سے مشہور ہے۔

مجھے مکیش صاحب کا تازہ غیر مطبوعہ کلام بھی پڑھنے کا

[...] کے لحاظ سے ان کو قدامت پسند ہونا چاہئے [...] ذہن کو انقلاب کی طرف بہلے جانا چاہتی ہے۔ [...] کی دھندلیاں نفسا نفسی، انصاف اور امن کے فریب [...] جباروں کا ظلم اور تغلب، کمزوروں کی بیکسی اور زار حالت یہاں سب کا حل سوائے ذاتی کوشش، عزم اور قربانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس خیال کی ایک جھلک دکھانے کیلئے میں مخدوم صاحب کی نظم "پس پردہ" پیش کرتا ہوں۔ ساز و سامان شاعرانہ ہے لیکن دل سے وہی صدا آرہی ہے۔

رنگ و بو کے متوالے اے حسن و ناز کے دیوانے
ان پردوں کے پیچھے کیسے محشر ہیں تو کیا جانے
کتنے دلوں کے داغ چھپے ہیں جھل مل جھل مل تاروں میں
ماضی کے کتنے لمحے گم ہیں رنگین نظاروں میں
کتنے گناہوں کی تاریکی ہے ان کالی راتوں میں
کتنے آنسو سہمے ہوئے ہیں رومانی برساتوں میں
کتنی بہاریں توڑ رہی ہیں دم ان ہنس مکھ پھولوں میں
کتنے طوفاں جھول رہے ہیں شاخ گل کے جھولوں میں
شبنم جو آسودہ نظر آتی ہے کنول کے سینے میں
کتنے طوفاں انگڑائی لیتے ہیں اس کے سینے میں
کتنے بے بس پیاسوں کے ٹوٹے ارماں ہیں گلابی میں
کتنے بھوکوں کی آہیں ہیں کھیتوں کی شادابی میں
ڈوبے ہیں گل پاش شفق کی رنگینی میں شام و سحر
لیکن اس میں کتنی غمگیں روحوں کا ہے خون جگر
ٹوٹتے تاروں کو لے لے کر کتنی نگاہیں گرتی ہیں
انسانوں کے روپ میں کتنی زندہ لعنتیں پھرتی ہیں
بھوکاری ماتم کرتی پھرتی ہے اب ویرانوں میں
چاندنی راتیں آتی ہیں کھو جاتی ہیں قبرستانوں میں

حسن رنگیں نظارو بس اب وہ گھڑیاں آئیں گی
اپنے ہاتھوں اپنی بہاریں واپس لائی جائیں گی

اس شاعر کا حسن بیان، تخیل اور جذبات آپ ملاحظہ فرما چکے اب چوتھے شاعر کا حال سنئے۔

مخدوم محی الدین صاحب مخدوم

جامعہ عثمانیہ کے سپوت ہیں۔ عربی ادب میں دلیر اور جانباز سورماؤں کیلئے "السیف المسلول" کا لقب استعمال ہوا ہے مخدوم صاحب کی جرأت اور بیباکی کے لحاظ سے ان کو "شمشیر برہنہ" کا خطاب دینا بیجا ہوگا۔ تیس سال کا سن ہے لیکن زمانہ کی ٹھوکریں خوب اٹھا چکے ہیں۔ اور گرم و سرد سے واقف ہیں غریبوں کے مصائب و آلام نے ان کا دل بے چین رکھا ہے۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کی سند حاصل کرنے کے بعد کئی برس تک سٹی کالج (حیدرآباد) میں اردو کے لکچرار رہے۔ لیکن ان کی حمیت اور قومی جوش نے یہ گوارا نہ کیا کہ ان کا ملک تنگدستی، جہالت، اوہام اور طرح طرح کی بیماریوں اور وباؤں کا شکار رہے۔ اور اس کو اسی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور دستگیری نہ کی جائے۔ چنانچہ دو سال ہوئے سرکاری خدمت سے مستعفی ہو گئے۔ اور اس وقت کپڑا بُننے والوں کی جماعت (Textile Worker's Union) کے صدر اور حیدرآباد کے محکمہ ریلوے کے عمال کی جماعت (Hyderabad Railway Employees Union) کے نائب صدر ہیں۔ مگر زیادہ وقت مزدوروں کی تحریک کی حمایت اور تائید میں گزرتا ہے۔ عزم اور ایثار کا کیا کہنا۔ بڑی مشکل سے بسر ہوتی ہے لیکن ماتھے پر بل نہیں۔ بات کرو تو مردہ دلوں کو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ جسم نحیف ہے، رنگ سانولا لیکن اپنے جوش اور باطنی قوت سے مجمعوں پر چھا جاتے ہیں۔ نیلگوں وردی جو ان کی جماعت کا خاص ملبوس ہے ان کے بدن پر بھلی معلوم ہوتی ہے۔ تھوڑی مدت تک قید کی سختی بھی جھیل چکے ہیں۔ لیکن ان کے رویے اور استقلال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بلکہ اور پختگی آگئی ہے۔

طالب علمی کے زمانہ میں مخدوم صاحب کا کردار فنکاروں (Artist) کی عادات اور خصائل سے ملتا جلتا تھا۔ سر کے پیچھے کے بال بھی اپنے استاد پروفیسر زور کے تتبع میں فرانسیسی حسن کاروں کے بالوں کی طرح بڑھا لئے تھے۔ لیکن اس زمانے میں بھی اپنی صداقت، بے ریائی اور جرأت کی قابل تقلید مثال جامعہ میں آئندہ طلبہ کیلئے چھوڑ گئے ہیں۔ مجلۂ عثمانیہ کی ادارت میں بھی مخدوم صاحب نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس وقت

[illegible] ہے۔ ایک جلالی اور دوسری جمالی جمالی [illegible] کی دو نظمیں "مسافر" اور "مستقبل" خاص طور سے [illegible] ان میں مخدوم صاحب کی موسیقیت ڈوبے ہوئے [illegible] باندھتی ہے۔ اور اہلِ قافلہ کی منزلِ مقصود کی جانب رہبری کرتی ہے۔ الفاظ کی سادگی اور موزونیت نے بھی خاص اثر پیدا کر دیا ہے "مسافر" کو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ترے ہمراہی کھو گئے رے مسافر   مسافر چلے چل
نہ جانے وہ کیا ہو گئے رے مسافر   مسافر چلے چل
تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

مسافر

چلے چل چلے چل چلے چل چلے چل

اندھیرے میں اب ساتھ کیا دیکھتا ہے   دیا بجھ گیا ہے
بہر حال چل رات کیا دیکھتا ہے   دیا بجھ گیا ہے
تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

مسافر

چلے چل چلے چل چلے چل چلے چل

سحر موت کی وادیوں سے گزرتا   چلا جا رہا ہے
سحر کے تعاقب میں گرتا ابھرتا   چلا جا رہا ہے
تری منزلیں تیری نظروں سے اوجھل

مسافر

چلے چل چلے چل چلے چل چلے چل

شاعر کا جلالی رنگ دیکھنا ہو تو "باغی"، "جنگ"، "مشرق"، "موت کا گیت"، "حویلی"، "گھر" اور "زلفِ چلیپا" پڑھیئے۔ جن میں ملک کی حالت کی المناک اور درد انگیز تصویریں اور طیش اور غضب کی آتش فشاں اور زلزلہ خیز قوتیں نظر آتی ہیں۔ مخدوم صاحب نے مذہب، سماج، حکومت سب کے گہری طرح لتے لئے ہیں۔ "مشرق" کی حالت بیان کرنے میں شاعر لکھتا ہے۔

ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں
ایک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

"حویلی" کے عنوان کے تحت فرمایا ہے۔

کوٹھو کے دھبے چھپا سکتا نہیں ملبوسِ دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں

اور زیادہ جوش دیکھنا ہو تو "موت کے گیت" کا یہ بند ملاحظہ ہو:۔

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاوو آؤ
بجلیوں آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

ایک نظم میں نوجوان کو اس لطیف، ہمت افزا انداز میں مخاطب کیا ہے:۔

اے جوانِ سالِ جہاں جانِ جہانِ زندگی
ساربانِ زندگی روحِ روانِ زندگی
جس کے خونِ گرم سے بزم چراغاں زندگی
جس کے فردوسی تنفس سے گلستاں زندگی
بجلیاں جس کی کنیزیں زلزلے جس کے غلام
جس کا دل خیبر شکن جس کی نظر ارجن کا تیر
ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی
تو بجائے سازِ الفت اور گائے زندگی

مخدوم صاحب کا مطالعہ وسیع ہے۔ اور انھوں نے روس کے انقلابی ادب کو خوب پڑھا ہے۔ لیکن شاعر کے کلام میں ان کی اخلاقی صفات کے علاوہ ان کی فن کاری نے بھی سحر کا کام کیا ہے۔ مخدوم صاحب نے جابر نامی ایک تاتاری شاعر کی نظم کا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ آزاد ہے لیکن مخدوم صاحب نے اپنی قادر الکلامی سے اصل نظم کے جوش و خروش کو قائم رکھا ہے۔ یہ منظوم ترجمہ بہت مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ آپ کے ملاحظہ کیلئے بھی پیش کرتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے "استالین"

صفِ اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر
استالین*
مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں

---

* شاعر نے غالباً انگریزی لفظ لاوا (Lava) کی جمع لاوو استعمال کیا ہے۔

وہ میں اور وہ وطن
جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو
جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرق
ان کی محنت کا اخوت کا محبت کا خمیر

وہ، میں
اس کا ہلال
اس کا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی ہوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا مجاہد نہ ہوں ؟!
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
میرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر
ایسے ہنگامِ قیامت میں مرا نغمۂ شوق
کیا مرے ہم وطنوں کے دل میں
زندگی اور مسرت بن کر
رہ سما جائیگا
قرۃ العین! مری جانِ عزیز
او مرے [illegible]
برق بادہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
میرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا واندس لارجہاں استائین

حیدرآباد کے چار شاعروں کا کلام آپ ملاحظہ فرما چکے
[illegible] کیفیات اور شاعرانہ خد و خال ہندستانی شعرا کر دہی
[illegible] نقشے سے ملتے جلتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ حیدرآباد
ہندستان سے باہر نہیں ہے۔ نوجوانوں کے کلام میں تازگی
کے علاوہ ایک بے لوث پن بھی ہوتا ہے جو دل پر بہت اثر کرتا ہے
نظمیں جو آجکل لکھی جارہی ہیں ان سے طبیعت کو فقط سرور ہی
حاصل نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تکمیل میں مدد بھی
مل رہی ہے۔ شاعر کا رتبہ مصلح اعظم کا سا ہے۔ آذرستان کے شعرا
نے اس خطہ کی آزادی اور آئینی ترقی میں نمایاں خدمات انجام
دی ہیں۔ ہمکو ہندستان کے نوجوان شعرا سے بھی بڑی امیدیں ہیں خصوصاً [illegible]

غنچہ و گل

پھولوں پہ جما ہوا یہ پالا
شرح غم عندلیب نالاں
سرمایہ چشم گریہ ساماں
ہے شعلہ بجاں جبھی تو لالا
ہاں، آگ یہاں دبک رہی ہے
آتشکدہ بن گیا چمن سب
آتش زدہ برگ و بار ہیں اب
نادان کلی چٹک رہی ہے

یونہی نہیں اشکبار شبنم
خنداں گل نومیدہ کب تک
گلسوز خزاں نہ آئے جبتک
جھونکا ہے خزاں کا موجہ غم
آئی نہیں آہ اس کے لب تک
آنکھیں بھی کھلی ہوئی ہیں اب تک

علی منظور

روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر!

ایک فیچر پروگرام

(بازار کا شور۔ بچوں کی آوازیں ۔)

تماشہ والا:۔ (گھنٹی بجاتا ہے) ایک پیسے میں ایک پیسے میں۔ بارہ من کی دھوبن دیکھو۔ سدر کا ناچ دیکھو۔ قطب صاحب کی لاٹھ دیکھو۔ لاٹ صاحب کا دفتر دیکھو۔ مالوہ کی ناگن دیکھو۔ ریل گاڑی چلتی دیکھو۔ کوئلہ کی کان دیکھو۔ بمبئی کا بازار دیکھو۔ چوپاٹی کا نظارہ دیکھو۔ ساگر کی لہر دیکھو۔ دُنیا کی موج دیکھو۔ ایک پیسے میں ایک پیسے میں۔ دُنیا کی سیر ایک پیسے میں۔ رنگارنگ کی تصویریں۔ بچوں کا تماشہ ایک پیسے میں۔ ایک پیسے میں۔

فقیر:۔ ایک پیسے کا سوال ہے بابا۔ ایک روٹی کا ایک پیسہ۔ پیٹ کی آگ بجھانے کو ایک پیسہ۔ محل نہیں مانگتا۔ ماڑی نہیں مانگتا، گھوڑا نہیں مانگتا۔ گاڑی نہیں مانگتا۔ سونا نہیں مانگتا۔ چاندی نہیں مانگتا۔ صرف ایک پیسے کا سوال ہے۔ ہے کوئی مائی کا لال۔ ہے کوئی سخی داتا جو سورداس کو بھوجن کرائے۔ ہے کوئی دھنی داتا۔ پرماتما کا پیارا جو گریب پر رحم کھائے۔

نوکری کا متلاشی:۔ رحم کرو مالک رحم۔ رحم۔ مجھ گریب کے بچے بھوکوں مر رہے ہیں۔ میں حضور کے بال بچوں کو دعائیں دوں گا۔

سیٹھ:۔ کیا کچھ کر سکتے ہو تم ؟

متلاشی:۔ حضور میں کھانا پکا سکتا ہوں۔

سیٹھ:۔ نہیں نہیں کھانا نہیں۔ تمھارے ہاتھ بہت گندے ہیں۔ اور ہم اونچی جاتی کے لوگ ہیں۔

نوکر:۔ . . . . . تو مالک ـــــ

سیٹھ:۔ ٹھیرو۔ ہمیں اپنی بات پوری کرنے دو۔ دیکھو ہمیں اپنے بچوں کی دیکھ بھال کیلئے ایک آدمی چاہیے ہے۔ بیس روپیہ مہینہ تنخواہ اور کوارٹر رہنے کو ملے گا۔ منظور ہے ؟

نوکر:۔ منظور ہے مالک۔ بچوں کا پیٹ بھی تو پالنا ہے۔

سیٹھ:۔ تمھارے بال بچے بھی ہیں ؟

نوکر:۔ ہاں حضور۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ لڑکی بیاہنے یوگیہ ہو رہی ہے۔

سیٹھ:۔ اوہ (ہنستا ہے) تو۔ تو تیس روپیہ مہینہ ملیں گے تمھیں۔ میرا مطلب ہے تم دونوں کو۔ وہ کمروں کی جھاڑ پونچھ کریگی۔ ٹھیک ہے نا ؟

دوافروش:۔ دو دو قدم پیچھے ہٹ جائیے بابو صاحبان۔ جی قابو میں ہے تو کیا ہوا سانپ آخر سانپ ہے۔ اور پھر یہ کوئی معمولی سانپ نہیں۔ آپ نے اژدہے دیکھے ہوں گے۔ آپ نے بڑے بڑے پھنوں والے ناگ دیکھے ہوں گے۔ آپ نے کوڑیالے دیکھے ہوں گے۔ لیکن ایسا سانپ جو میں اس وقت آپ کو دکھا رہا ہوں وہ آپ نے پہلے نہیں دیکھا ہوگا۔ اگر کسی نے دیکھا ہو تو بتا دے۔ (تین سکنڈ کا وقفہ) نہیں دیکھا۔ اور دیکھتے بھی کیسے۔ اس لئے کہ یہ سانپ جسے ہم لوگ پدم ناگ بولتے ہیں صرف برما کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک کالے ناگ کے سر پر یہ سوار ہوتا ہے اس کے پیچھے پیچھے سانپوں کا ایک جلوس ہوتا ہے۔

ایک آواز:۔ جلوس ؟

دوافروش:۔ جی ہاں جلوس۔ آپ کے شہر میں کوئی لیڈر ہے ؟

آوازیں:۔ جی ہاں۔ ایک کیا سینکڑوں ہیں۔

دوافروش:۔ ٹھیک۔ جس طرح آپ کے لیڈروں کے جلوس نکلتے ہیں اسی طرح پدم ناگ کا بھی جلوس نکلتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں آپ کے اَن گنت لیڈر ہوتے ہیں سانپوں کی

دنیا میں صرف ایک لیڈر ہوتا ہے۔ اور اس کا نام ہے پدم ناگ۔ پدم ناگ تھوڑا سا پانی نہیں مانگتا۔ لیکن ایک دن پدم ناگ کو بھی مرنا ہوتا ہے۔ لیکن صاحب جب وہ مرتا ہے تو ہم اسے پھینک نہیں دیتے۔ ہم اسے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر پکڑتے ہیں۔

نوجوان: ۔ ایسے زہریلے سانپ کو آپ کیسے پکڑ لیتے ہیں۔

دوا فروش: ۔ یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ پوچھئے کیوں؟

دوسرا: ۔ کیوں؟

دوا فروش: ۔ گرو کی اجازت نہیں۔ ویسے کہنے کو چاہے کہہ دوں۔ لیکن دو دن کی زندگی میں جھوٹ بول کر میں ابھی عاقبت خراب نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسی کو سچ جانئے۔ عاقل کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ مجھے اس بارے میں یہی کہنا ہے کہ سانپوں سے وہی کھیلتا ہے جو اپنے من میں ٹھان چکا ہو کہ اُسے ایک روز سانپ ہی سے مرنا ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ ہم ایسا کام کیوں کرتے ہیں جس میں ہر پل موت کا ڈر رہتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدمت خلق بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ لیکن بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ہمارے ساتھ بھی پیٹ ہے۔ ہمارا پیٹ بھی دو روٹیاں مانگتا ہے۔ جان جوکھوں ہے اس لئے ڈینگ نہیں ماروں گا۔ یہ سانپ ہمارے لئے روٹیوں کا سہارا بنتا ہے۔ جب یہ مر جاتا ہے تو ہم اس سے دوائیں بناتے ہیں۔ اس کا پھن کاٹ کر تانبے کے پرانے پیسے جڑی بوٹیوں کے ساتھ اُسے زمین میں دبا دیتے ہیں۔ اور پھر اس کا سرمہ بناتے ہیں۔ یہ دیکھئے اس سرمہ کی صرف چند پڑیاں میرے پاس ہیں۔ نام ہے اس کا "چشم بینا"۔ نئی تہذیب ہماری آنکھوں کو کمزور کر دیا ہے۔ سینما، تھیٹر، تماشے، سرور دستیاں، اب کیا کیا کچھ گناؤں۔ قصہ مختصر آنکھوں کے ہوتے ہوئے ہم اندھے ہو جاتے ہیں۔ دفتروں کے بابو، سکولوں کے طالب علم بجلی کی چندھیا دینے والی بھٹیوں کے سامنے کام کرنے والے مزدور اور اسی طرح کے بے شمار لوگ اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ اس وقت میرے پاس صرف چند پڑیاں ہیں۔ انھیں مفت بانٹتا ہوں جن بھائیوں کو ضرورت ہو لے سکتے ہیں۔ ہاتھ بڑھائیے۔ ابھی ایک ایک ملے گا۔ یہ تو سب نے ہاتھ بڑھا دیئے۔ ٹھہریئے۔ میں خود سب کو بانٹوں گا۔ آپ کو ضرورت نہیں اس کی۔ آپ بھی ہاتھ پیچھے ہٹا لیجے۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی ہیں۔ دیکھئے لاپرواہی کیجئے گا تو پچھتایئے گا۔ ہاں تو یہ سرمہ کا نمونہ ہے۔ ایک ہفتہ کے بعد آپکو معلوم ہو جائیگا کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس کی پوری شیشی دو دو روپئے میں ملے گی۔ ایک تین پیسے کا کارڈ میرے نام بھیج دیجئے۔ میرا پتہ اُردو، ہندی، گورمکھی، گجراتی، انگریزی اور مدراسی میں اس لفافہ پر لکھا ہوا ہے۔ لیکن ٹھہریئے اس لفافہ کے اندر بھی کوئی چیز ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ کیا۔ یہ ہے دانتوں کا منجن۔ داناؤں کا کہنا ہے کہ آنکھ میں انجن اور دانت میں منجن نت کر، نت کر، نت کر۔ انجن کا نمونہ میں آپ کو دے چکا ہوں صاحب، اور اب منجن کا نمونہ دیکھئے۔ دام ہیں صرف چار آنے صرف چار آنے۔

جوتشی: ۔ چار آنے لگیں گے بابو صاحب۔ اس سے کم نہیں ہونے کا۔

نوجوان: ۔ ارے نہیں جوتشی جی۔ ایک سوال کا جواب بتانے کے چار آنے تو زیادہ ہیں۔ کچھ تو کم کیجئے۔ وہ جو سڑک پر سردار جی بیٹھے ہیں وہ تو دو آنے مانگتے ہیں۔

جوتشی: ۔ ہاں ہاں ممکن ہے بہت ممکن ہے۔ دیکھنے والے ایک آنہ میں بھی ہاتھ دیکھ لیتے ہیں لیکن بھیا کام کام میں فرق ہوتا ہے بس اتنا سوچ لو۔

جوان: ۔ یہی سوچ کر تو آپ کے پاس آیا ہوں۔ چلئے نہ دو آنہ نہ چار آنے تین آنے لے لیجئے۔ منظور ہو تو بیٹھوں نہیں تو۔۔

جوتشی: ۔ اچھا چلیے تمہاری مرضی، بڑے ضدی آدمی ہو بھئی۔ اور میں تو پہلے ہی تاڑ گیا تھا کہ یہ شخص اپنی منوا کے رہے گا۔

جوان: ۔ وہ کیونکر . . ؟

جوتشی: ۔ اب یہ باتیں بتانے کی تو نہیں پر تم نے پوچھا ہے تو بتائے دیتا ہوں۔ تمہارے جبڑوں کی بناوٹ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ تم اپنی ہٹ کے پکے ہو . . . . . ہاتھ دکھاؤ . . . ہوں۔ یہ ریکھا اس کی تائید کرتی ہے۔ بھئی تم کو یہاں کا

...چیزوں کیلئے ہوئی تو بہت بڑے آدمی بنو گے۔
...دہ ہیں؟
...ادھوں۔
جوتشی:۔ ہاتھ بھی یہی کہتا ہے۔
جوان:۔ خیر اب یہ بتائیے کہ دھن دولت کا بھی کچھ پتہ ہے کہ نہیں۔
جوتشی:۔ چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج تمہارے پاس کل کسی دوسرے کے پاس۔ ویسے تمہارے ہاتھ میں دولت ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔
جوان:۔ کیا مطلب!
جوتشی:۔ مطلب یہ کہ تمہیں دولت ملے گی تو ایک ساتھ۔ اچانک۔ نہ ملی تو جیسے اب ہو ویسے ہی رہو گے۔ تمہارا ہاتھ بتا رہا ہے کہ دھن دولت کی دھن میں تم بہت دھندے کرو گے۔ اور کون جانے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔
جوان:۔ نہ جوتشی جی یوں بات نہیں بنتی۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیے جس سے میں امیر ہو جاؤں۔ میں بھی رئیسوں کی طرح ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر کروں۔ میرا بھی جی یہی چاہتا ہے کہ اونچے اونچے محلوں میں رہوں۔ موٹروں کی سیر کروں۔ اچھے سے اچھا کھاؤں اور اچھے سے اچھا پہنوں۔ ہاں کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی۔
جوتشی:۔ ترکیب پوچھتے ہو۔ کتنے بھولے ہو تم بھی۔ ایسی ترکیب اگر مجھے معلوم ہوتی تو میں یہاں راستے میں کیوں بیٹھتا۔ ایک ایک آنہ کی خاطر تم لوگوں سے جھگڑتا پھروں۔ میں تو صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ ہاتھ کی لکیریں کیا کہتی ہیں۔
جوان:۔ (ٹھنڈا سانس لیتا ہے۔)
جوتشی:۔ لیکن تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ لکیریں مٹتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ اپنے اپنے کرموں کے مطابق ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو آج امیر ہے وہ کل غریب ہے۔ جو آج زمین پر گھسٹ رہا ہے کل موٹروں کی سیر کرتا ہے۔ تم بھی کوشش کئے جاؤ۔ کسی کو دکھ نہ دو۔ سب کا بھلا چاہو اور کوشش کئے جاؤ۔ کون جانے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔

غزل

نہ فروغِ بام کی جستجو نہ ضیائے در کی تلاش ہے
جو کسی کی راہ میں کھو گئی مجھے اس نظر کی تلاش ہے

تجھے پا سکے کہ نہ پا سکے یہ نظر نظر کی تلاش ہے
کہیں ایک لمحہ کی جستجو کہیں عمر بھر کی تلاش ہے

غمِ تیرگی سے اجڑ گئیں وہ تصوّرات کی محفلیں
کبھی شامِ غم ہی عزیز تھی مگر اب سحر کی تلاش ہے

مری زندگی پہ کرم کریں غمِ روزگار کی تلخیاں
میں خراب کوچہ و دشت ہوں مجھے اپنے گھر کی تلاش ہے

میں امینِ منزلِ منفرد رَوِشِ عوام سے کیا مجھے
جو نقوش خوردۂ پا نہ ہو اسی رہگذر کی تلاش ہے

ہیں سرورِ عزم سے بے خبر مرے پائے شوق کی جرأتیں
ابھی کاروانِ حیات کو کسی راہبر کی تلاش ہے

مجھے ایک لحظہ سکوں نہیں یہ تضادِ ہوش تو دیکھئے
کبھی دردِ دل سے ہوں مطمئن کبھی چارہ گر کی تلاش ہے

جسے پوچھئے جسے دیکھئے اُسے خام دعویٰ علمیت
مجھے اے شکیلؔ جہاں میں اب کسی بے ہنر کی تلاش ہے

شکیل بدایونی بی۔ اے

کمل کا گاؤں بہت چھوٹا تھا، اتنا چھوٹا کہ وہ کھپریل اور چھپر
چھتوں والے تنگ تنگ مکانوں کو انگلیوں پر گن سکتا تھا، گاؤں
کے سب بڑے آدمیوں کے نام ایک سانس میں گنا سکتا تھا،
صرف آدھے گھنٹے میں سارے گاؤں کا چکر لگانے کے بعد
واپس اپنے گھر پہنچ سکتا تھا، گاؤں کی ہر چیز اس کو اچھی طرح
یاد تھی، بلکہ اس کو محسوس ہوتا تھا کہ گاؤں کے درختوں،
بیلوں، مندر، جوہڑ یا شہتوت کے درخت کی طرح اس جھنڈ
کی طرح وہ بھی گاؤں کی اپنی ہی کوئی چیز تھا۔ ان سب کو وہ
سمجھ سکتا تھا، اور وہ سب چیزیں اس [illegible] ۔۔۔
لیکن اپنے گاؤں کی جو [illegible] ڈراؤنی
بھی یاد آ جاتی تھیں، وہ بہت خطرناک تھیں [illegible] چھوٹے
[illegible]
ہوئی [illegible] اور کالی پتیوں [illegible] کی طرح وہ
دلچسپ [illegible]
سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سوئیوں سے کچوکے دے رہا ہے
وہ یاد ان دنوں کی تھی [illegible] سارے گاؤں پر ستیلا [illegible] نے
قبضہ کر لیا تھا!

وہ اس وقت بہت ہی چھوٹا تھا، اتنا کہ رات [illegible]
سوتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا، اور [illegible] اٹھتا تو اپنی
ماں کی ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر اس کے ماں کے جسم [illegible]
چاہتا تھا ۔۔۔ اور وہ سارے دن [illegible] رام رام
ست ہے کی آواز سنتا رہتا تھا، لوگ ہر دوسرے تیسرے
کی ارتھی کو اچھالتے لئے جاتے، اور وہ اپنے گھر کی کچی دیواروں
سے چمٹ جاتا تھا، ان وحشت زدہ چہروں سے اس کی روح
فنا ہوتی تھی، اور پھر اس کی ماں نے بھی تو اس کو ستیلا ماتا سے
اس قدر ڈرا رکھا تھا، ستیلا ماتا بھینٹ لینے کے لئے ہر سال
آتی تھی اور اس سال تو معلوم ہوتا تھا کہ ستیلا ماتا کے لئے
کوئی بھینٹ کافی نہ تھی، ہر گھاٹ پر سارے وقت دھڑا دھڑ
ارتھیاں جلتی رہتیں، اُپلوں اور گیلی لکڑیوں کی بو ہڈیوں
اور گوشت کے جلنے کی بو کے ساتھ مل کر سارے گاؤں پر چھائی
رہتی، اور چاروں طرف سے کراہنے یا رونے پیٹنے کی آوازیں
آتی رہتیں، مندر کا کریہہ آواز والا گھنٹہ سارے وقت
جھنجھناتا رہتا، اس کی اپنی ماں بھی دن میں کئی بار مندر کا چکر
لگاتی، پنڈتوں کے لئے پرشاد لے جاتی، مورتیوں کے لئے پھول اور
موتیے کے ہار بنا کے لے جاتی ۔۔۔ لیکن پھر بھی ستیلا ماتا اس
کے گھر بھی گھس آئی اور سب سے پہلا حملہ کمل ہی پر ہوا!

"کملو!" اس کی ماں اس کو پیار سے کملو ہی کہا کرتی تھی،
"کملو بیٹا، خاموش لیٹا رہ، رو نہیں! ستیلا ماتا تو بھگوان کی
مرضی سے آتی ہے!" ۔۔۔ لیکن کملو کو تو محسوس ہوتا کہ ٹوٹی
ہوئی کھاٹ کا بان اس کے رونگٹوں پر چپکا جا رہا ہے،
اور ساری کھاٹ اس کے جسم میں گڑی سی جاتی ہے، اس
کے سارے جسم پر سرخ سرخ دانے نکل آئے تھے جن میں جلد
ہی پیپ بھی پڑ گئی تھی، ان دانوں میں اس قدر سخت تکلیف ہوتی
کہ وہ لوٹ پوٹ جاتا، اور اُس کی ماں جو سارے وقت ستیلا ماتا
کی جو [illegible] کرتی رہتی تھی، اس کو اپنی گود میں لٹا لیتی، آہستہ
آہستہ تھپتھپاتی، اور تھوڑی سی دیر کے لئے واقعی اس کو اپنی
تکلیف میں کمی محسوس ہونے لگتی، اور وہ خاموش ہو کے اپنی
ماں کی میلی آنکھوں میں بھرے ہوئے آنسوؤں کو تکنے لگتا،
اور ان آنسوؤں کو تکتے تکتے ہی سو جاتا، ماں اس کو آہستہ
سے کھاٹ پر لٹا دیتی، اور مندر کی طرف بھاگ جاتی! ۔۔۔۔
اور پھر جب اس کی آنکھ کھلتی تو پھر وہی تکلیف، لاکھوں
[illegible] اور سوئیاں اس کے پک پڑے ہوئے دانوں کو
چھیدتی ہوتیں! "اوہ ماں! ماں!" وہ چلا اٹھتا۔

کمل کے ذہن میں یہ بات پوری طرح جمی ہوئی تھی، دراصل
ستیلا ماتا کے اس حملے کی وجہ سے ہی اس کے جسم اور چہرے
پر یہ بدنما داغ پیدا ہو گئے تھے، اور اسی وجہ سے اس کی ایک
آنکھ بڑی اور ایک چھوٹی ہو گئی تھی! ۔۔۔ اب بھی گویا بعض
دفعہ اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے وہ تکلیف پھر سے
شروع ہو جائے گی، اور وہ تکلیف کے مارے چلا اٹھے گا! لیکن
اب بیکار ہے، بے فائدہ! ماں تو کالج سے میلوں پرے گاؤں
کے شمشان گھاٹ پر کبھی کی جل چکی تھی، اور اب تو اس کی راکھ بھی
مرگھٹ پر سلائی ہوئی اور ارتھیوں کی راکھ کے ساتھ مل کر
غائب ہو چکی ہے۔ اور اس کا جی چاہتا کہ وہ کالج کے برآمدے
میں کھڑے کھڑے اپنے گاؤں کے متعلق سوچنا بند کر دے
اور پھر اپنے کام میں لگ جائے! اور تھوڑی سی دیر کے لئے
لڑکوں کے مبارک چبھتے ہوئے فقرے ایک ہلکی سی خاموشی میں

ڈر جاتے، اور وہ اپنے کام میں مشغول ہو جاتا۔

دراصل اپنے سنگ تراشی کے شوق میں لگے ہوئے اور مٹی سے شکلیں بناتے بناتے وہ یہ بھول جاتا کہ وہ کہاں ہے اور چاروں طرف کی اس کو مطلق خبر نہ رہتی، لیکن یکایک اس کے کمرے سے دور برآمدے کے کسی موڑ پر وہ ہی کر بیٹھ ... گرتی

"اجی بھیگے!"

"ارے ہاتھی"

ہوئے ـــ لنگ ـــ پڑے رہتے اور اس کو محسوس ہوتا کہ اس کے ہاتھ میں آدھی بنی ہوئی کوئی مورتی ذرہ ذرہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہے، اور اس کے قریب رکھی ہوئی زرد مٹی کسی نے اس کے منہ میں گھسا دی ہے جس کی وجہ سے ایک کرکراہٹ اس کے دماغ تک پہنچ رہی ہے، اور قریب رکھے ہوئے مختلف قسم کے رنگ اس کی آنکھوں میں تھوپ دیئے گئے ہیں، جن کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلوں میں بے انتہا مرچیں لگ رہی ہیں ـــ اور اپنے سارے جسم میں اس کو کسی پرانی تکلیف کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا!

چکنے پتھروں اور مٹی سے عجیب عجیب شکلیں بنانے کا شوق اس کو بچپن سے ہی ہو گیا تھا، گاؤں کے قریب بہتے ہوئے چھوٹے سے دریا کے کنارے گھنٹوں بیٹھا وہ الٹی سیدھی شکلیں بنایا کرتا۔ کبھی مہادیو جی کی مورتی، کبھی ہنومان جی، اور کبھی مٹی میں ڈھیر سارا کالا رنگ ملا کے وہ کوئی ... بنا ڈالتا۔ لیکن اس کی ماں اس کے اس شوق کو ... کرتی تھی، دراصل ان کے گھر کے قریب ہی ایک پرانی ... عورت کا گھر تھا، ان کی گاؤں بھر میں کافی عزت تھی ... میاں کچہری کے پیشکار کے ساتھ رہا کرتے تھے، گاؤں والوں کی عرضیاں وغیرہ لکھ دیا کرتے تھے اور پیشکار کے ساتھ رہنے کی وجہ سے گاؤں والے ان کی عزت بھی کافی کرتے تھے، ایک دن ان مسلمان ہمسائی کو یہ پتہ چل گیا کہ کمّو کو پتھروں اور رنگوں سے انسانوں، جانوروں، دیویوں دیوتاؤں کی مورتیاں بنانے کا شوق ہے، وہ بہت پریشان ہوئے، انہوں نے کمّو کی ماں کو اپنے پاس بلایا تھا، اور بہت دیر تک اس کو بہت ہی عجیب عجیب باتیں بتائی تھیں ـــ قیامت کے دن جب سب مرے ہوئے لوگوں کو پھر سے زندہ کیا جائے گا تو جس کسی نے جانور یا انسان یا دیوتا کی شکل بنائی ہوگی اس سے کہا جائے گا کہ وہ اس شکل میں جان ڈالے، اس کے ہاتھ بھی اس کی مخالفت میں گواہی دیں گے، اور چونکہ کوئی بھی خدا کے علاوہ مردہ جسموں میں جان نہ ڈال سکے گا، اس لئے اس کے ہاتھوں کو کاٹ ڈالا جائے گا، انگلیوں کو دہکتی ہوئی آگ میں جلایا جائیگا اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جائیں گی، اور گو کہ کمّو کی ماں ان ساری باتوں کو پوری طرح سمجھ بھی نہ پائی تھی لیکن وہ اپنے کمّو کے ہاتھوں کو کٹتا ہوا دیکھنے اور انگلیوں کو جلتا ہوا دیکھنے کے تصور ہی سے کانپ اٹھی، اور اس نے کمّو کو بہت سختی سے منع کر دیا کہ وہ مٹی اور پتھر سے دیویوں انسانوں وغیرہ کی الٹی سیدھی شکلیں نہ بنایا کرے۔

لیکن پھر بھی جب کمّو کی ماں رات کو تھک کے بالکل بے جان سی پڑ کے سو جاتی تو وہ چپکے سے صحن کی کچی اینٹوں سے ڈھکی ہوئی دیوار پھاند کے باہر کود جاتا، اس کے قدم آپ ہی آپ تیز اٹھ رہے ہوتے، اور وہ گھسٹتا ہوا دریا کے کنارے پہنچ جاتا، اگر چاندنی رات ہوتی تو چندرماں کی زرد سفید چمکدار سی کرنیں سارے میں ایک چادر سی تنے ہوتیں، اور دریا میں بھی چاندی کی لہریں سی آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہوتیں اور دریا کے کنارے اگی ہوئی جھاڑیاں خاموش کھڑی ہوتیں، بعض دفعہ کمّو کو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا یہ جھاڑیاں کسی بڑی اور عظیم انسان کے جنازے سے مرعوب ہو کے یوں خاموش کھڑی ہیں، لیکن اگر چاندنی رات نہ ہوتی تو اس کو اندھیرے میں ڈرا ڈرا لگتا، اور وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دریا کے کنارے کی مٹی کھودنے لگتا، تھوڑا سا کھودنے کے بعد اس کو اپنے مطلب کی زرد چکنی مٹی مل جاتی، اور وہ اپنے رنگوں کو مٹی میں ملا کے اور پتھروں کو اپنے ہاتھ سے اور اوزاروں سے کاٹ کاٹ کر کوئی الٹی سیدھی شکل بنانے میں مصروف ہو جاتا۔

پھر تھوڑی دیر بعد ہی اندھیرے میں خواہ مخواہ ڈر اور بھی زیادہ لگنے لگتا، پانی کی لہروں سے بھی وہ خوفزدہ ہو جاتا اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں میں اس کو کالے کالے بڑے بڑے سانپ رینگتے ہوئے نظر آنے لگتے، اور وہ اپنے گھر کی طرف سرپٹ بھاگتا۔

شروع شروع میں وہ جو چیز بھی بناتا وہ بہت ہی زیادہ بھدی معلوم ہوتی تھیں۔ اپنی لاکھ کوششوں کے بعد بھی وہ فصل کے پیڑ بہت ہی چھوٹے اور پھیلے ہوئے بنا دیتا، مورتیوں کے ہاتھ بنانے تو اس کو بہت ہی مشکل معلوم ہوتے تھے۔ بھی رات رات بھر کی محنت کا نتیجہ اس کو صرف بھدی بھدی ی ہاتھوں والی عورتیں اور موٹی موٹی ناکوں والے بیل ہی نظر آتے ——— اور اپنے کام سے غیر مطمئن ہو کے وہ ان کو زمین پر پٹخ دیتا، اپنے پاؤں کی ایڑی کے نیچے مسل دیتا، اور یوں اس کو تھوڑا سا اطمینان ہو جاتا! گو اپنی تمام محنتوں کو یوں آسانی سے برباد کر ڈالنے پر اس کو تھوڑا سا افسوس ضرور ہوتا، لیکن پھر بھی جیسے ایک اُمید سی اس کو باقی رہتی! ——— شاید وہ اگلی دفعہ کوئی بہتر مورتی تیار کر سکے! شاید مورتیوں کے کپڑوں کی جھلکیں اور بتیں بھی ویسی بنا دے جیسی اس کو خود نظر آتی ہیں، اور شاید اگلی دفعہ دیوتاؤں کی شکلیں ہو بہو ویسی ہو جائیں گی جیسے کہ گاؤں کے مندر میں رکھی ہوتی مورتیوں کی! ——— اور اس کا رنج اور غصہ کم ہو جاتا، وہ زیادہ اطمینان کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو دیکھتا، پھر اپنے مختلف سادہ اوزاروں کو دیکھتا گندھی ہوئی زرد چکنی مٹی کو دیکھتا، اُن رنگوں کو دیکھتا جو اُس نے بہت کوششوں کے بعد مختلف رنگوں کی آمیزش سے تیار کئے تھے ——— اور اُس کی اُمید اور بھی زیادہ ہو جاتی، اُس کے جسم میں ذرا قوت سی آجاتی، اور اس کے ناک کے نتھنے اور بھی زور زور سے پھڑکنے لگتے!

پھر بھی جتنے عرصے وہ گاؤں میں رہا، کبھی بھی اپنے کام سے پوری طرح مطمئن نہ ہوا۔ گو کہ کچھ عرصے بعد وہ پہلے سے بہتر شکلیں گھڑنے لگا تھا، لیکن پھر بھی ہر دفعہ اس کو ان مورتیوں میں کوئی نہ کوئی بدصورتی نظر آنے لگتی، اپنے ہاتھوں میں کپکپی محسوس ہونے لگتی، اور صرف اس کی پرانی اُمید ہی اس کو اپنے شوق کو بالکل ختم کر دینے سے روک دیتی۔

لیکن ضلع کے سکول میں جہاں پر اس کو اپنی مسلمان ہمسائی کے میاں کے اصرار پر ہی داخل ہونا پڑا تھا، اس کو بعض دفعہ پڑھائی میں خاصی کامیابی حاصل ہو جاتی۔ گو کہ اسکا دل پڑھائی میں بالکل نہ لگتا تھا، اور پڑھتے پڑھتے بھی وہ اپنے گاؤں کے پاس بہتے ہوئے دریا کے متعلق سوچنے لگتا، ——— اور اُس کو خیال ہوتا کہ دریا کے کنارے خوبصورت مورتیاں ہی لگی ہیں! اُن مورتیوں کی ہر چیز میں بالکل صحیح تناسب موجود ہے، وہ تناسب جو وہ آج تک اپنے جیتے جاگتے ہاتھوں سے پیدا نہ کر پایا تھا، دیوتاؤں کی شکلیں بھی مندر میں رکھی ہوئی مورتیوں کی سی ہیں، عورتوں کے جسم بہت بھدے نہیں ہیں اور مٹی کی کھوری کھوری بھینسیں بالکل ان بھینسوں کے بچوں کی طرح ہیں جو سارے وقت جوہڑ کی کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں اور اپنے جسموں کو گندا کر ڈالتے ہیں! ——— اور اس کا جی چاہتا کہ وہ سکول کا کمرہ چھوڑ کے بھاگ جائے، اور بھاگا بھاگا اُن خوبصورت مورتیوں کے پاس پہونچ جائے جو اُسکا انتظار کر رہی ہوں گی! اس کو اپنی بے بسی پر غصہ سا آنے لگتا اور اس کے ساتھ ہی اس کو اپنے سکول کے ساتھیوں کے آوازے یاد آجاتے،

اس کے سکول کے ساتھی اس کی بدصورتی کو ہر وقت جتاتے رہتے تھے، بعض چھوٹے بچے تو اس کو دیکھ کے تھوڑا بہت ڈر بھی جاتے اور جب تک کوئی بڑی عمر کا لڑکا قریب نہ ہوتا اس پر کوئی فقرہ نہ کستے، لیکن اپنے برابر والوں کے آوازے تو اس کو ہمیشہ ہی سننے پڑتے تھے، ذرا ماسٹر جی کی توجہ کسی اور طرف ہوتی، اور کوئی چلاتا

"ابے بھینگے! بڑا پڑھتا ہے تو!"

"اولے ——— ہا"

اس کو محسوس ہوتا کہ ماسٹر جی کے ہونٹوں پر بھی ویسی ہی مسکراہٹ اُبھر آنا چاہتی ہے، جیسی کہ باقی لڑکوں کے چہروں پر ہر وقت موجود رہتی ہے، ماسٹر جی بھی اپنی ہنسی بمشکل روک رہے ہیں، اور یونہی بناوٹی طور پر لڑکوں کو ڈانٹ رہے ہیں! ——— اور اس کا دل ٹوٹ جاتا، وہ سب مورتیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو کے اس کے دماغ سے نکل جاتیں، اور وہ سوچتا کہ اگر وہ اپنے ساتھیوں سے کسی چیز میں بھی بڑھ جائے تو شاید اُن کے طنز میں کمی آجائے اور شاید وہ بھی اس کو اپنی طرح کا جاندار سمجھنے لگیں۔

لیکن پھر بھی جبکہ وہ اپنے ضلع میں دسویں کے امتحان میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہو گیا اور کالج میں داخل ہونے پر اس کو وظیفہ بھی ملنے لگا تب بھی اُس نے محسوس کیا کہ لوگ

اس کے چہرے اور جسم کی بدصورتی کو اسی طرح پر یاد رکھتے ہیں، اور اب بھی وہ اس کے احساسات کے متعلق سوچے بغیر اس کی بدصورتی علی الاعلان بیان کرنے لگتے ہیں! ــــ اس کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں وہ تو سمجھتا تھا کہ اب اس کے ساتھیوں کے فقروں میں کمی واقع ہوجائے گی بلکہ شاید ان میں ایک طرح کا احساس کمتری پیدا ہوجائے کا جس کے ماتحت وہ اس کی بدصورتی کو نظر انداز کرنے لگیں گے۔ پر اس کے ساتھیوں میں تو اب بھی وہی بے باکی تھی، اب بھی کسی وقت اس کو وہی آوازیں سنائی دینے لگیں گی، کسی وقت بھی کوئی بے پرواہی سے چلا اٹھے گا اور اس کے دماغ میں ایک گڑگڑاہٹ پیپنے لگے گی۔ اور اس کے لاتعداد سوتے ان میں بیہودی جاگیں گی۔ اور شاید وہ تکلیف کے مارے پاگل ہوجاتے گا!

کالج کے بڑے لان پر سومنگ ٹینک کے چاروں طرف بڑا موٹی سیڑھیوں والا ئبریری میں، کالج کے برآمدوں میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ــــ ہر چیز اس کو غیر معلوم ہوتی! ہر چیز اسکو ایک دشمن سی نظر آتی! اگر اس نے ذرا بھی حرکت کی تو وہ تمام چیزیں احتجاج پر آمادہ ہوجائیں گی، اور ستون مچا مچا کر اس کے جسم کا بھدا پن اس پر واضح کرنے لگیں گی، اس پر آوازے کسیں گی، اور ہر وقت ایک اجنبیت کا احساس اس کو گھیرے رکھتا! کسی چیز پر بھی مکمل اعتبار نہ کرسکتا تھا، گویا وہ سب بے جاندار تھیں اور اس کے تمام اعضار کی بدنمائی کو لمحہ بھر کے لئے بھی برداشت نہ کرسکتی تھیں، اور جیسے وہ خود تو بے جان تھا!

کالج کے کلاس روموں، لائبریری، اور اپنے تمام ساتھیوں سے اکتا جانے کے بعد وہ اپنے کمرے کا رُخ کرتا، جہاں پہونچ کے اس کے ذہنی ہیجان میں بھی تھوڑی سی کمی آجاتی، وہ اپنے کمرے کے کونے میں لگے ہوئے مٹی کے ڈھیر کو دیکھتا، بکھرے بکھرے بڑے بھدوں پر نظر ڈالتا، اپنے مختلف عجیب و غریب بتوں کو دیکھتا ــــ اور جیسے سارا ماحول اس کے ذہن سے بالکل ہی نکل جاتا، وہ سب کو بھول کے اپنی توجہ صرف اپنے پرانے شوق پر مرکوز کردیتا! اور اس کا دماغ اس قدر مطمئن ہوجاتا کہ اگر اس وقت اس کا کوئی ساتھی آن کے اس سے کوئی کتاب مانگ لیتا یا مشکل سوال سمجھنا چاہتا تو وہ

اُس سے بھی بہت خاموشی سے پیش آتا! اس کو کوئی سخت جواب دیا یا سرزنش نہ کرتا حالانکہ وہ اپنے ساتھی کی آنکھوں میں شرارت آمیز چمک تک بھی دیکھ لیتا تھا! وہ ساتھی اس کے مٹی کے ڈھیر کو، اور آدھی بنی ہوئی مورتوں کو ایسے دیکھتا جیسے کوئی مضحکہ خیز چیز ہوں! ــــ پھر بھی کمل کا جی نہ چاہتا کہ وہ کوئی سخت سی بات کہے اور اپنے ساتھی کے چلے جانے کے بعد وہ سوچنے لگتا کہ اگر وہ اپنے ساتھیوں سے ایسا ہی بے غرضانہ سلوک رکھے تو شاید وہ لوگ اس کے احساسات کا پاس کرنے لگیں گے، اور بجائے اس کے احساس کمتری کو اکسانے کے اس کے ساتھ ہمدردی جتانا شروع کردیں گے، اور کمل کی ہمت بڑھ جاتی، وہ سوچتا کہ وہ تو خواہ مخواہ اپنے ساتھیوں سے ڈرتا ہے! وہ لوگ تو اس سے ہمدردی کے ساتھ پیش آسکتے ہیں ــــ لیکن دوسرے ہی لمحے جب وہ اپنے کمرے سے نکلتا تو کوئی چیختا

"سکلپٹر ہیں آپ ہے ــــ اوبے ڈھنگ ...!" کان بند کرلینے کے باوجود بھی وہ آواز آن آن کے اس کے دماغ میں گھس جانا چاہتی! اس کا احساس کمتری پہلے سے بھی زیادہ ہوجاتا اور وہ خود کو مُردہ سمجھنے لگتا! ــــ اور رفتہ رفتہ اُس کی اُمیدیں ایک ایک کرکے ختم ہوتی چلی گئیں، اور تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے سمجھ لیا کہ اس کے ساتھی اس کے ساتھ ہمدردی جتانے سے واقعی معذور ہیں وہ کبھی بھی اس کی بدصورتیوں کو فراموش نہ کرسکیں گے، اور اس کی اپنی تمام کوششیں اور اس کا بے غرضانہ سلوک واقعی بیکار ہیں!

اس کا احساس کمتری اس خیال سے اور بھی زیادہ ہو جاتا، کہ آج تک بھی وہ اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی کسی مورتی سے مطمئن نہ ہوا تھا، وہ جو چیز بھی بناتا اس میں کوئی نہ کوئی کمی ضرور رہ جاتی، اور یہ کمی اس ساری مورتی کو بھدا بنا ڈالتی، عورتوں کے تمام اعضاء میں صحیح تناسب قائم رکھنا اس کو اپنے بس کی بات نہ معلوم ہوتی اور وہ مورتیاں ہمیشہ اس کو منہ چڑاتی رہتیں! ــــ اور وہ سوچتا کہ شاید اپنے بدنما ہاتھوں سے وہ جو چیز بھی گھڑے گا وہ بدنما ہی رہے گی، اس میں اتنی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ کسی چیز کی خوبصورتی کو پوری طرح محسوس کرسکے، وہ حسن کو سمجھنے سے نا

اور اس کو اپنی ذاتی بدصورتی اور بھی زیادہ محسوس
ہوتی!
اس کو اپنے ساتھیوں کی آنکھوں میں ہر وقت شرارت
اور ان کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹیں موجود رہتیں،
اس کے چیچک کے داغوں میں کوئی سوئیاں سی چبھو ما
رہتا، اور ایک ایک داغ کو کرید کے دکھ دیتا، وہی تکلیف
جو اس کو تین برس پہلے محسوس ہوئی تھی پھر اس کو ستانے
لگنے لگتی ـــــ اور اس کو محسوس ہوتا کہ وہ چیچک کے
سارے جسم کو دیمک کی طرح چاٹ چاٹ کے کھوکھلا سا
بنا دے گی! ـــــ اور اس کو پھر اپنا گاؤں یاد آنے لگتا
گو کہ ضلع کے سکول میں داخل ہونے سے بہت
پہلے لوگ اس پر اس کی بدصورتی کو پوری طرح پر واضح کر
چکے تھے، لیکن جب بھی وہاں اس کو اس قدر تکلیف کبھی
محسوس ہوتی تھی اور پھر اس کے اپنے گاؤں کے پاس ہی
وہ دریا بھی تو تھا جس کے کنارے بیٹھا وہ مٹی اور پتھر کی
رنگ برنگی مورتیاں بناتا رہتا تھا اور کوئی بھی آن کے
اس کے کاموں میں دخل نہ دیتا تھا کوئی بھی طنزیہ طور پر
اس سے کچھ مانگتا تھا، اور نہ ہی اس کے پتھر اور مٹی
سے مورتیاں بنانے کے شوق کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھتا
تھا اور اس کی آدھی تراشی ہوئی شکلیں کسی کو مضحکہ خیز
معلوم ہوتیں۔

وہ تو دیر دیر تک خاموشی سے بیٹھا کام کرتا رہتا تھا،
دریا کے کنارے اُگی ہوئی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بھی سہمی
کھڑی رہتیں جیسے کسی بڑی اور عظیم انسان سے مرعوب
ہو گئی ہوں ـــــ دریا کے کنارے پہنچتے ہی اس کا دل
زور زور سے چلنے لگتا، اور وہ کسی نہ کسی مورتی کے بنانے کے
خیال میں کھو جاتا، وہ کبھی کسی خوبصورت عورت کی کوئی
مورتی بنانا چاہتا، یا پھر پتھر کاٹ کاٹ کے کسی دیوتا کی؛ یا
پھر اس کا جی چاہتا کہ زرد مٹی میں کالا رنگ ملا کے وہ ایک
زہریلا ناگ بنا ڈالے ـــــ اور جلد ہی مکمل طور سے مگن ہو گیا۔

وہ کالج چھوڑ کے واپس اپنے گاؤں چلا آیا، گاؤں
کی طرف جاتے وقت وہ سوچنے لگا کہ شاید گاؤں میں اب
بھی اس کے کچھ پرانے ساتھی ہوں گے جو شاید اس کو "لولے لنگڑے
جیسے" "کبڑا" آوازیں دیں گے، لیکن پھر بھی اُس نے سوچا کہ کالج
میں جو عبرت اتنی شدت کے ساتھ اس کو محسوس ہوتی تھی، وہ تو
اب گاؤں میں اس کو محسوس نہ ہوگی، گاؤں کی تو ایک ایک چیز
اس سے بخوبی واقف ہے! ـــــ اور اس کو اپنی ماں کا خیال
آگیا جو اس کے بچپن میں مر چکی تھی، اور اب کوئی بھی اس کو مٹی سے
مورتیاں بنانے سے نہ روکے گا ـــــ یہ سوچتے سوچتے اس کی
آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے، اور اس کو اپنی باچھوں میں سے
ایک نمکین سا مزہ سارے منہ میں سرایت کرتا ہوا معلوم
ہونے لگا!

گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے شروع شروع میں اس سے
ڈرتے تھے، اور اس کی بدصورتی کے خلاف احتجاج کرتے تھے،
لیکن جلد ہی ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ بالکل خاموش سا انسان
ہے کسی کو تنگ نہیں کر سکتا، وہ بھی گایوں یا بھینسوں کی طرح
معصوم اور خاموش ہے اور اس کے ساتھ بھی وہ سارے وقت
کھیل سکتے ہیں!

جب کلّو دریا کے کنارے ریت پر بیٹھ کے پتھر اور مٹی اور
اُلٹے سیدھے رنگوں سے مورتیاں بناتا تو گاؤں بھر کے چھوٹے
چھوٹے بچے آن کے اس کے گرد جمع ہو جاتے، اور اس سے ذرا
فاصلے پر ایک مکمل سا حلقہ بنا کے بیٹھ جاتے، اس کے ہاتھوں
کو غور سے دیکھتے رہتے جو اس قدر سرعت کے ساتھ پتھروں
اور مٹی سے کھیلتے رہتے تھے، اور دیکھتے ہی دیکھتے عجیب عجیب
چیزیں بنا ڈالتے تھے۔ کلّو کتنا خاموشی سے کسی مورتی کو
بنانے میں مشغول رہتا، گرمی سے اس کے چیچک کے داغوں
میں پسینے کے قطرے اُبل آتے، اُس کے بال جو سخت اور لمبے
تھے اس کے ماتھے پر ڈھلک آتے، اُس کی چھوٹی آنکھ کے
نیچے جو گوشت کی اُبھری ہوئی لکیر تھی وہ سُرخ سی ہو جاتی؛ اس
کی چھوٹی اور بڑی دونوں آنکھوں پر پانی سا ڈھلک آتا،
اُس کے نتھنے زور زور سے پھڑکنے لگتے اور اُس کے اُودے
رنگ کے ہونٹوں میں سے اس کے دانت دکھائی دینے لگتے!
اور وہ اپنے کام میں جُتا رہتا اور بچے اس کے ہاتھوں میں بنتی
ہوئی مورتیوں کو دیکھنے میں محو رہتے!

پھر بھی جب کلّو اکیلا ہوتا تو اُس کو محسوس ہوتا کہ اس کے
ہاتھ کے بنائے ہوئے رنگ برنگے دیوتا اور انسان یا جانور کوئی

بھی تو پورے طور پر خوبصورت نہ تھے۔ ان میں کوئی نہ کوئی بھدا پن ہمیشہ جھلک آتا تھا ـــــ اور کلّو سوچتا کہ وہ ان بدنما چیزوں سے صرف بچّوں کو خوش کر سکتا ہے، بچّوں کو سب ہی چیزیں کھلونا معلوم ہوتی ہیں! اور دراصل وہ خوبصورتی جو وہ اپنی مورتیوں میں ہمیشہ پیدا کرنا چاہتا تھا کبھی بھی پوری طرح پیدا نہ ہوتی ہے ـــــ شاید وہ اپنے بھدّے ہاتھوں سے کوئی بھی خوبصورت چیز گھڑنے سے قاصر ہے!

ایک رات وہ سوتے سے چونک اُٹھا اس نے کوئی خواب دیکھا تھا،

اس نے دیکھا کہ وہ ایک عورت کی مورتی بنا رہا ہے سُرخ کنکریاں کوٹ کے اس نے زرد چکنی مٹی میں ملا دی ہے اور یوں وہ اس مورتی کے کپڑوں کے لئے ایک ہلکا سا سُرخ رنگ بنا سکا تھا، اس نے تھوڑی سی مٹی میں گہرا کالا رنگ ملا کے ناگ کا سا سیاہ رنگ بھی تیار کر لیا تھا جو وہ اس عورت کی کالی آنکھوں کے لئے استعمال کرتا! ـــــ اور وہ چونک کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

جب وہ ہانپتا کانپتا دریا کے کنارے پر پہونچا تو اس نے دیکھا کہ چاند کی چادر سی دریا کی سطح پر بچھی ہوئی ہے اور اس چادر میں آہستہ آہستہ لہریں اُٹھ رہی ہیں جیسے ہوا کے جھونکوں سے وہ چادر کانپ رہی ہو، دریا کے کنارے لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بھی خاموش کھڑی تھیں، اور دُور کافی فاصلے پر شہتوت کے درختوں کا چھوٹا سا جھُنڈ بھی خاموش کھڑا تھا ـــــ اور وہ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے دریا کے کنارے پر بچھی ہوئی بھوری بھوری ریت کو کھودنے لگا!

تھوڑی دیر بعد زرد رنگ کی چکنی مٹی اس گڑھے میں سے جھانکنے لگی ـــــ اس نے جلدی سے ایک بڑے سے پتھر پر سُرخ کنکریاں کوٹ کے گیلی مٹی میں ملا دیں اور یوں ایک ہلکا سا سُرخ رنگ بھی بنا لیا جیسا کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا پھر اُس نے ناگ کا سا سیاہ رنگ بھی تیار کر لیا، اس نے ایک بڑا سا پتھر بھی اپنے پتھروں کے ڈھیر سے ڈھونڈھ نکالا، اور اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے سادہ اوزار بھی جمع کر لئے۔

ـــــ کئی گھنٹے تک وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہا، اُس کے ہاتھ ایک پھرتی سے پتھر اور مٹی اور رنگوں سے کھیلتے رہے اُس کے چہرے پر بکھرے ہوئے لاتعداد چیچک کے داغوں میں پسینے کے قطرے چمکنے لگے، اُس کے نتھنے تیزی سے پھڑکنے لگے، اور اُس کی آنکھوں کے ڈھیلوں پر ایک نمی سی آ گئی۔

جب اُس نے کئی گھنٹے کی محنت کے بعد اپنی نگاہ اس نئی مورتی پر سے ہٹائی تو اس نے دیکھا کہ چاند کھسکتا کھسکتا آسمان کے عین وسط تک پہونچ گیا ہے، اور دریا کی سطح پر بچھی ہوئی روپہلی اور سُنہری چادر اور بھی چمک اُٹھی ہے جھاڑیاں بھی اور زیادہ خاموش نظر آ رہی ہیں، ان بچّوں کی طرح جو دن میں اس کے ہاتھوں میں بنتی ہوئی مورتیوں کو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے! ـــــ اور اُس نے اپنی نئی مورتی کی طرف دیکھا جو وہ چند گھنٹے پہلے خواب میں بنا رہا تھا اور جس کو اب اس کے جیتے جاگتے ہاتھوں نے مکمل کر لیا تھا ـــــ اور جیسے دریا کے کنارے اُگی ہوئی جھاڑیاں بچّوں کی طرح زور سے قہقہے لگانے لگیں، چاند کی کرنیں مُسکرا مُسکرا کے کہنے لگیں "خوبصورت مورتیاں بنائیں گے آپ؟ ـــــ او بے بھینگے! ـ ابے او لنگڑے! ـ او بے ہا" اور اُس نے چاہا کہ وہ اپنے کان بند کر لے لیکن پھر بھی جھاڑیوں کا بچّوں کا سا شور اس کو سُنائی دیتا رہا، کرنوں کی تلخ مُسکراہٹ بھی اس کو دکھائی دیتی رہی ـــــ اور جھاڑیوں میں لاتعداد کالے کالے سانپ رینگنے لگے اور پھر جیسے لاکھوں سوئیاں اور کانٹے اس کے جسم پر پھیلے ہوئے چیچک کے داغوں کو کُرید نے لگے!

ـــــ اور صبح جب گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچّے دریا کے کنارے پہونچے تو اُنھوں نے دیکھا کہ دریا کی لہریں بڑھ بڑھ کے ایک ٹوٹی ہوئی سی مورتی کو اپنے ساتھ بہا لے جانا چاہتی ہیں ـــــ اور کلّو بھیّا کو وہ سارا گاؤں چھان ڈالنے کے بعد بھی نہیں ڈھونڈھ نہ پائے!

اب اوشا جوان ہوگئی تھی اور اس کے والد کا تبادلہ شہر میں ہوگیا تھا، شہر میں لڑکیوں کو اسکول اور کالج جاتے دیکھ کر اس کے اندر ایک زبردست خواہش اگر تعلیم حاصل کرنے کی نہیں تو آزاد اور زندگی گذارنے کی ضرور پیدا ہوئی۔ یہ کوئی بری بات نہ تھی۔ دنیا میں ہر کام کرنے کی خواہش پیدا ہونے کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کی "رشوت" ضرور درکار ہوتی ہے (اشارہ شکر میں لپٹی ہوئی کونین کی طرف ہے) اس لئے اپنی تعلیم جاری کرنے کے لئے ضد کرنی شروع کی: "مجھے اسکول میں داخل کرا دیا میرے لئے گھر پر کوئی ماسٹر مقرر کردو۔ مجھے آگے تعلیم ضرور حاصل کرنی ہے" مگر اس کی ماں ۔ خدا بچائے اس کی شعلہ بداماں زبان اور انگارہ سی آنکھوں سے۔

"ارے تو بچی ہے جو اسکول جائے گی؟ ذرا اپنی طرف تو دیکھ ارے ذرا دھوتی تو ٹھیک کر۔ ہائے رام ہماری ناک وہاں سے مار ڈالتی .. کیا کہا ماسٹر؟ تو ماسٹر کے پاس کرسی سے کرسی ملا کر پڑھے گی . ارے کیا زمانہ آگیا۔ تجھے کب نوکری کرنی ہے۔ اری یہ کام تو کرستانوں کے ہیں ہم تو برہمن ہیں۔" اور اوشا خاموش ہو جاتی۔

منہ پھلا لیا خاموش ہوگئی "ارے ذرا دوڑ کر جانا رسوئی میں دودھ ابال کھا رہا ہے، جلدی۔" اور اوشا رسوئی گھر میں جا گرتی۔ دودھ ابال کھاتا رہا ۔۔۔ گھٹے ہوئے ۔۔۔ کی طرح اور دھواں چولھے سے اٹھتا رہتا، چاند کو ڈھک لینے والے سیاہ بادلوں کی طرح۔

دن انسان کے سانسوں کی طرح گذرتے گئے اور پھر ایک رات جب آسمان پر تارے چمک رہے تھے اسکے والد کی آنکھوں کے تارے غائب ہوگئے۔ اب محض اس کی ماں رہ گئی کیونکہ اسکے بھائی تو پہلے ہی لاہور میں رہتے تھے۔ اب نوکر چاکر بھی بھاگ گئے اور اس کی ماں اسے لے کر شہر سے دور اپنی ایک پرانی کوٹھی میں جا کر رہنے لگی۔ یہاں کا ماحول اوشا کے لئے ناقابل برداشت تھا تنہائی۔ اداسی اور بوسیدگی ۔۔۔ ان احساسات کے بارے وہ چیخ اٹھی۔ تعلیم کے لئے اس نے پھر ضد کی اور بہت منتوں کے بعد وہ اسکول میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئی۔ مگر اس کی ماں خود اسے اسکول چھوڑنے اور لانے کے لئے اسکے ساتھ جاتی۔ یہ بات اوشا کو بہت ناگوار گذرتی۔ مگر اس کی ماں کہتی۔ "دیکھ بیٹی زمانہ بہت خراب ہے۔ جس کی بیٹی اس کی بیٹی کون کسی دوسرے کی عزت کا خیال کرتا ہے، برابر کی کوٹھی والی لڑکیوں کی طرح مردوں سے چیٹر چیٹر باتیں بنانا مجھے پسند نہیں۔ دیکھ ذرا دھوتی تو ٹھیک کرلے ..... اوشا لاکھ دفعہ مجھے کہہ یا مگر . . " اور اوشا جھلا اٹھتی مگر ۔۔۔۔!

اسکول کی لڑکیوں میں اس نے بہت سی وہ باتیں سنیں جو اس نے آج تک نہ سنی تھیں۔ یہ باتیں درحقیقت اس کیلئے نئی تھیں مگر حقیقت اور صداقت سے انحراف بھی ناممکن ہے کہ اسکول کی لڑکیاں عشق کرنے میں ضرب المثل ہیں حالانکہ کالج سے نکلتے ہی یہ جوش اور اٹھان فوراً سرد ہو جاتا۔ اکثر لڑکیاں اوشا کو مجبور کرتیں: "اری تو بھی تو اپنی پریم کہانی سنا۔" مگر وہ کیا سناتی، اسے کبھی اتنا موقع ہی نہ ملا کہ وہ ۔۔۔ کیونکہ اگر اسے موقع ملتا تو وہ بھی کسی لڑکے سے محبت کا ڈرامہ کھیلتی جو اکثر بھک منگوں کی طرح سڑک کے کنارے کھڑا اسے دیکھتا۔ وہ اسے خط لکھتی۔ آگ اور شعلے بھڑک اٹھتے۔ چنگاریاں پھوٹ نکلتیں۔ پھر بدنامی کی نوبت آجاتی۔ زہر کی شیشیاں قلم اور زبان تک بار بار جاتیں اور پھر یکایک لڑکا کہیں چلا جاتا۔ اوشا معلق رہ جاتی اوں اوں۔ں۔ مگر اوشا اس راستے سے دور بھی تھی۔

کچھ دنوں بعد اوشا نے سنا۔ اس کی شادی ہونے والی ہے وہ خاموش رہی ۔۔۔ جیسا ہندوستان کی ہر لڑکی کو اپنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کیونکہ شادی کے معاملوں میں لڑکیوں کے منہ کھولنے سے ہندوستان میں زلزلہ اور تباہی پھیل جانے کا خطرہ ہے۔

اور ایک رات جب دو بجے تو پنڈتوں نے شنکھ بجا کر چندن کے چھینٹوں سے اوشا کی زندگی کو ایک اجنبی کے دامن سے باندھ دیا۔ اس کی ماں نے دودھ کا کٹورا پیا: "جا بیٹی سکھی رہ، ہم نے تو تیرے لئے سب کچھ تلاش کر دیا ہے۔" اور اوشا نے سوچا ۔۔۔ "ماں نے سب کچھ تلاش کر دیا ہے۔ میرے لئے ہاں ضرورت کسے اور تلاش کون کرے۔" غصے سے اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

"ارے روت جلدی ہی تو لوٹ آئے گی۔ ... دیکھا میا کی ماں میری بٹیا مجھے کتنا چاہتی ہے۔ رو رو کر آنکھیں لال کرلی ہیں۔" اور مسی آنسوؤں کا ایک ریلا پنڈتوں کے ...

[illegible]وں کی طرح اُمڈ پڑا۔

رات کے تارے جیسے تھک سے گئے تھے اُن کی دھڑکن مدھم
اوشا کھڑکی پر کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ رُوح کی سوزش
آنکھوں سے اُمڈ کر آنسو بن جاتی ہے تو پلکوں پر اٹکا ہے
تھی ہے۔ تاروں کی طرح جگ مگ جگ مگ اوشا
خیالات میں کھوگئی اُس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا اوشا کا تمام
جسم جھنجھنا اُٹھا گویا اُس کی تمام ہستی میں لعاب گونجنے لگے
جگ مگ۔ جگ مگ

مگر اس کا شوہر ملنگ پر آکر بیٹھ گیا سگریٹ سلگایا
اور دھواں اُٹھنے لگا —— گویا دھوئیں کے ان بادلوں میں وہ
اپنا مستقبل تلاش کر رہا تھا اِس غیر معمولی اور غیر رسمی خاموشی
سے اوشا کا دم گھٹنے لگا یکایک ایک بھاری آواز کمرے میں
گونجی۔ "تم سو جاؤ۔ مجھے بھی سونا ہے۔ صبح مجھے جلد اُٹھنے کی
کوشش مت کرنا!" اور اس کا شوہر چادر اوڑھ کر سوگیا اوشا
مبہوت رہ گئی۔ اس کے جسم کی تمام سنسناہٹ تمام دھڑکنیں
خاموش ہوگئیں، وہ بیٹھی رہی۔ اپاہج کے بیکار عضو کی طرح
بہت دیر تک کمرے میں اسکے شوہر کا ادھ جلا سگریٹ سرخ خون
کے قطرے کی طرح جلتا رہا اور دھواں اُٹھتا رہا —— خاموش
جذبہ انتقام کی طرح

. . . .

"اوشا کبھی انسان سے کوئی عزیز ترین چیز چھین لی جاتی
ہے اور کبھی ایک بدترین چیز زبردستی اس کی گود میں پھینک دی
جاتی ہے۔ ہماری تمہاری ملاقات سماج کے اسی نظام کی بیہودہ
کرتوت ہے" اس کا شوہر گویا کسی الہام کے ماتحت ایک رات
کی تاریکی میں بہک رہا تھا۔ "مجھے ایک لڑکی سے محبت تھی وہ بیوفا
نکل گئی مجھے اس کا کوئی شکوہ نہیں کیونکہ کبھی لڑکے بیوفا نکلتے
ہیں کبھی لڑکیاں اور کبھی والدین جیسا تمہارے ہمارے والدین
ثابت ہوئے ہیں بغیر میری صلاح کے انہوں نے تم سے میری شادی
کر دی۔ میں منع نہ کر سکا یہ میری کمزوری تھی۔ مجھ میں ہمت نہ
تھی کہ میں بغاوت کرتا۔ مجھے تمہاری خواہش نہ تھی میں
کبھی محبت نہ کر سکوں گا۔ اور پھر یکایک وہ پوچھ بیٹھا" تم نے کسی
سے [illegible]... کی تھی؟"

"محبت،" اوشا چونک اُٹھی۔ میں پریم کروں گی؟ اس سماج میں
جہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی ایک مرد تکمیلِ خواہش کو گناہ خیال
کرتا ہے۔ مگر وہ خاموش رہی۔ اُس کے ذہن میں شعلے کھیلنے لگے۔
اس کی خواہش ہوتی وہ اپنا گھونگھٹ اُتار کر دور پھینک دے
اور دیوانہ وار یہاں سے بھاگ کر دور چلی جائے بہت دُور۔
مگر کہاں۔ ماں باپ کے دروازے تو اس کے لئے اب بند ہوچکے
پھر کہاں؟ —— اوشا نے اپنی وحشت پر قابو پانے کی کوشش
کی ایک بھیانک خاموشی —— سانے لگی۔ روتے ہوئے دیپک
دور کے مکانوں میں کبھی کے سوگئے۔ صرف کبھی کبھی کتے خاموشی سے
چڑ کر بھونکنے لگتے اور پھر تھک کر خاموش ہوجاتے یکایک اُسکے
شوہر کا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر پڑا اوشا کے جسم میں سنسناہٹ پیدا ہوئی
تار جھنجھنا اُٹھے مگر۔۔

"اوہ تمہارے ہاتھ کس قدر سخت ہیں تمہاری ماں نے کیا
تم سے پتھر تڑوائے ہیں ——" ایک لمحہ کے لئے وہ خاموش ہوگیا
مگر فوراً ہی گویا بات کے ماتحت کہہ رہا ہو۔ "وہ اندرا کے ہاتھ
کس قدر ملائم تھے گویا سمندر کے جھاگوں نے اپنی تمام ملائمت
ان میں جمع کر کے رکھ دی تھی۔ اُس کی آنکھیں کس قدر دلکش
تھیں۔ وہ محویت کے عالم میں خاموش ہوگیا۔ اوشا کے تمام جسم میں
چنگاریاں سی چھٹنے لگیں اُف اس قدر ذلت! اُس نے اپنا ہاتھ اُسکے
ہاتھوں تلے سے ہٹا لینا چاہا مگر پھر رُک گئی آخر وہ اس ہاتھ کو اُٹھا کر
لے جائے گی کہاں؟ اور اس ہاتھ کو اُٹھانے کا اُسے حق ہی کہاں ہے۔
وہ تو اس اجنبی کے ہاتھوں سونپ دی گئی ہے —— ایک بے قیمت
بیکار چیز کی طرح، ایک ناگن کی طرح، خیالات اس کے ذہن میں
پھنکارنے لگے۔ یہ ہندوستانی بھی عجیب ہیں۔ لڑکی دیتے ہیں،
جہیز دیتے ہیں اور پھر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں"۔ قبول کیجیے"۔
وہ بستر پر پڑی تمام رات تڑپتی رہی اور پھر جب اُسکی
نگاہیں کھڑکی کے باہر پڑیں تو وہ چونک پڑی۔ ارے وہ تڑپتے
تارے کہاں چلے گئے؟ وہ سسکتا سا چاند کدھر کھسک گیا ——
ٹھنڈی ہوا کے کئی جھونکے کمرے میں داخل ہوکر اس کی جلتی پیشانی
کو چھو گئے۔ گھر گھر چکیاں چل رہی تھیں اور برابر والے مکان میں
کھڑاؤں کو ساتی ایک بوڑھی عورت رام نام کا جاپ کر رہی تھی۔
صبح ہونے والی تھی۔

دن گذرنے لگے۔ راتیں آنکھوں میں کٹنے لگیں اور وقت

...کہیں؟" اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ ہاں ہر آدمی مکار ہوتا ہے... ارون مکار نہیں۔ وہ حسین ہے ہنس مکھ ہے... اور ارون سے کہہ رہی تھی۔ ارون مجھے تم سے محبت ہے کیونکہ مجھے نفرت ہے۔ تم کتنے اچھے ہو۔ تمہارے ہونٹ... اور پھر وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی "تم ... جاؤ نکل جاؤ۔ مجھے ارون یاد آ رہا ہے" اور وہ ... اوشا خیالوں میں جکڑ کر رہ گئی۔

اور جب وہ اُرملا کے گھر پہنچی تو ارون کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اُوشا کرسی کے پیچھے ایک لمحہ کھڑی رہی اس کے پریشان گھنگھرالے بال سیاہ ساون کی گھٹاؤں کی طرح اُمڈ رہے تھے "کتاب پڑھنے میں اس قدر محو ہو گئے" ارون چونک کر مُڑا۔ اُوشا ... مگر آج اس کی آنکھوں میں ایک عجیب بیقراری سی چمک تھی۔ اسکے لہجہ میں غیر معمولی ارتعاش اور شیرینی تھی۔ آج اس نے ارون بھیا بھی نہیں کہا تھا۔

"کہو اوشا۔ اچھی طرح ہو۔ ارے ارملا ..."

"ارے یہ کیا کرتے ہو" یکایک اوشا خوفزدہ انداز میں بول پڑی اُس نے اپنا ہاتھ ارون کے منہ پر رکھ دیا ارون نے اُس کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کی نگاہیں جھک گئیں اس کے کان سُرخ ہو گئے۔ اس کے گال تمتما اُٹھے سانس تیز ہو گئی اُسکی ہاتھوں میں سینکڑوں ناچوں کی لرزش بھر گئی اُس کی نگاہوں میں گرم گرم بخارات بھر گئے اس کی رگیں ناچنے لگیں شکستہ نیند نیند نشہ نشہ۔ نیند نیند۔ اور شرابیوں کی طرح اس کے ہونٹوں سے الفاظ لڑکھڑا لڑکھڑا کر نکلنے لگے۔

"میرا ہاتھ تو دیکھو ... اس میں کیا لکھا ہے تم بڑے ہوشیار بنتے ہونا" اور اُوشا پھر خاموش ہو گئی۔ اُس کے رُخساروں میں خون اُچھلنے لگا۔ لبوں میں ایک پیاس سی بھڑکنے لگی۔ نگاہوں سے وحشی گیت چھلکنے لگے اور سینے کی دھڑکنیں زور زور سے چلانے لگیں ... طوفان طوفان ...!

"اُوشا" ارون کا لہجہ کراہت اور نفرت سے کانپ رہا تھا۔ "اپنا ہاتھ اپنے شوہر کو جا کر دکھاؤ۔ میں تمہارا شوہر نہیں ہوں" اور ... اور جلتا ہوا طیارہ جیسا تیز رفتار سے آسمان کی بلندیوں سے گرا اور ... "جا اپنے شوہر کے پاس جا ... میں تیرا شوہر نہیں ہوں ... کیا تیری ایک آدمی سے تسلی نہیں ہوتی ... ذلیل عورت۔ بے حیا۔ طوائف فاحشہ ... آخ تھو۔"

اور ارون کے گھر سے لوٹ کر وہ اپنے مکان کی کھڑکی پر کھڑی ہوئی ا سے نہیں معلوم وہ وہاں کتنی دیر کھڑی رہی مگر جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا آسمان پر ایک آنسو سا چھلک آیا ... دو آنسو اور یہ آسمان پر ہزاروں آنسو بکھر گئے۔ روح کی سوزش جب آنکھوں سے اُمڈ کر آنسو بن جاتی ہے تو پلکوں پر آ کر کانپنے لگتی ہے۔ تاروں کی طرح ... جگ مگ۔ جگ مگ اوشا کا کلیجہ ہلکا ہونے لگا۔ منظر سے ہم آہنگ ہو کر اس کا غم ڈھلنے لگا۔ ایک آنسو دو آنسو ... اور ... "پگلی" ... تارے بھی کہیں آنسو ہوتے ہیں" "بیوقوف" اُسکے شوہر کے الفاظ جیسے ذہن کے کون سے کونے سے جاگ اُٹھے۔

بات میں بات

سید علی منظور

ناسخ اپنے زمانے کے محبوب ترین شاعر تھے۔ آتش جو لعز پر ناسخ کو نگاہِ رشک سے دیکھتے اور جلتے رہے۔ ناسخ نظر آتے اُن کی تیوری میں بل پڑا۔ بگڑ کر بولے:

یُوں تو سبھی جہان میں ہے تیرا فسانہ کیا

ناسخ سے متعلق کوئی کیفیت سُننی تاب نہ رہی بے ساختہ پکار اٹھے ؏ ہمارے سمجھ میں ناری علام نہیں

ایسے طنز آتش کے دیوان میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ ان طنزوں سے صاف ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں آتش کی قدر ناسخ کی طرح نہیں کی گئی۔

دکن کے دربر مختار مہاراجہ چندو لعل شاداں نے بادشاہِ دہلی کے اُستاد شیخ محمد ابراہیم ذوق کے نام دعوت نامہ ارسال کیا، دعوت نامے کے ساتھ رقم کتنی بھیجی؟ پانسو روپئے۔ یہی مہاراجہ ناسخ کو بھی یاد فرماتے ہیں ایک دفعہ نہیں دو دو دفعہ زادِ راہ کے لئے پہلے اول بارہ ہزار اور پہلے دوم پندرہ ہزار روپے بھیجے۔ ناسخ کا دیوان مومن و غالب نے دیکھا اور تتبع کرنا چاہا۔ ناسخ کے رنگ میں کہنے لگے۔ غور کرنے کا مقام ہے! ناسخ کے کلام میں ایسی کیا بات ہوگی کہ دہلی کے بزرگ ترین نمائندے اس قسم کا تتبع کرنے پر مجبور ہوگئے۔ طولِ کلام سے کیا فائدہ، یہاں ناسخ کا ایک شعر لکھ دیتا ہوں ؎

جنازہ کو مرے کاندھا دیا ہے اُس پریرو نے
گماں ہے تختۂ تابوت پر تختِ سلیماں کا

ناسخ کے پریرو کو میں نے دیکھا نہیں البتہ شعر اب بھی جاذبِ نگاہ ہے۔ شاید مرحوم کا پریرو بھی اتنا بصارت نواز نہ ہوگا جیسے حسین اور نظر نواز نمونے ناسخ اور متبعینِ ناسخ ہی کے کلام میں ملتے ہیں اور بکثرت ملتے ہیں۔ شعر کا ظاہر اس سے زیادہ جمیل اور کہاں نظر آسکتا ہے؟ لیکن معنویت پرکھی جائے تو ؟! وہی ،- چاندی کی انگوٹھی پر سونے کا جھول! بد مذاقی کی انتہا ہو چکی۔ تختۂ تابوت کو تختِ سلیمان بنانے کے لئے پریرو کو جنازہ برداروں میں گھسیٹ لیا گیا! شعر کی روح فنا ہو جائے تو لکھنؤ کے فنکار[1] اس کی پروا نہیں کرتے۔ وہ فقط یہ دیکھتے ہیں کہ شعر کے الفاظ خوبصورت ہیں یا نہیں؟ دہلی اسکول تختِ سلیماں کی خاطر پریرویوں کی مٹی اس طرح برباد نہیں کرتا، یہاں تصنع کہاں؟ میر سوز کا یہ قطعہ لائقِ دید ہے ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے ؛ سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفلِ پریرو ؛ ارے رے رے رے ارے رے رے رے رے رے

شوخ چشم پریرویوں کا شیوہ تڑپانا اور دل والے نظر بازوں کا کام تڑپنا ہے نہ کہ دل والے نظر باز مرتے جائیں تو شوخ چشم پریرو اُن کے جنازے کو کاندھا دیتے پھریں۔ ناسخ اور ان کے محترم پیشرو میر سوز کا موازنہ صاحبانِ ذوق کی حد تک پر کیف ثابت ہوگا۔ اگلے زمانے والے بہرحال رحمت اللہ علیہم اجمعین کے مستحق ہیں، حیرت ہوتی ہے آج تعلیم یافتہ لکھنؤ بیسویں صدی عیسوی میں بھی تصنع پیار ہے! لکھنؤ اسکول کی خصوصیت اُسی کے ایک روشن خیال نمائندے نے اس طرح بیان کی ہے:-

---

[1] سمت بھی بھیجا تھا (آبِ حیات) [2] تاریخ ادبِ اُردو۔

[3] کہیں یہ اثر کچھ دنوں بعد پورا زائل ہو گیا۔ مرزا غالب ناسخ کے مقابلے میں آتش کو بڑھانے لگے چنانچہ چودھری عبدالغفور کے خط میں چند شعرا اساتذۂ قدیم کے لکھ کر تحریر کیا ہے کہ ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ تیزتر نشتر نہیں (آبِ حیات)

[1] لکھنؤ میں کئی حقیقی شاعر تھے، ہیں، آئندہ زمانے میں بھی پیدا ہوں گے —— خاص کر میر انیس نے تو دُنیائے اُردو پر ایسا اثر جما رکھا ہے جیسے گردوں دہلی اسکول کے زعیم نامور کی نہ پائی؟

اُردو! گو رواج چار سو تیرا ہے ؛ شہروں میں رواج کو بہ کو تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن باقی ہے ؛ تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

(خواجہ حالی)

اعلیٰ درجہ کے شعرا نے . . . اپنے لطیف خیالات
کے دریائے موجزن کو استعارہ یا تشبیہ کے کوزہ
میں بند کرکے معجزہ دکھایا ہے۔[2]
آتش لکھنوی اور داغ دہلوی سے متعلق یہ تبصرہ بھی غور
طلب ہے۔

دونوں کی زبان میں پاکیزگی اور معانی کے جوہر
موجود ہیں مگر ایک میں قدرتی سادگی کے علاوہ
شاعر کے جادو نگار قلم نے عالمِ تصویر پیدا کر دیا
ہے دوسرے میں محض وہی سادگی اور روانی
ہے جو پانی میں ہوتی ہے۔[3]

آتش، ناسخ وغیرہ کے مقابلہ میں جذبات نگار اور سادگی پسند مانے جاتے ہیں لکھنؤ کے سادگی پسند شاعر بھی قدرتی سادگی پر اکتفا نہ کرکے اپنے جادو نگار قلم سے عالمِ تصویر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو شوخ نگارانِ لکھنؤ کی ضرورت سے زیادہ رنگینی کا کیا عالم ہوگا ــــ آجکل لکھنویت اپنے پورے "اساسِ حُسن" کی نمائش کا اعلان کر رہی ہے دو چار شاعروں کے سوا تمام سخنورانِ ہند محوِ آرائش نظر آتے ہیں، ایسی نظمیں بکثرت نظر آ رہی ہیں جن کو بلا خوفِ تردید "حسین لفظوں کا مجموعہ" کہا جا سکتا ہے، اعلیٰ درجے کے سخنگو اپنے لطیف خیالات کے دریائے موجزن کو استعارہ یا تشبیہ کے کوزہ میں بند کرکے برابر معجزہ دکھا رہے ہیں استعارات کی اسقدر بہتات ہے کہ ایک ایک شعر میں دو دو پائے جاتے ہیں تشبیہات کی فراوانی بھی علیٰ ہذا القیاس، غرض جس بزرگوار کو دیکھئے اپنے جادو نگار قلم سے عالمِ تصویر پیدا کرنے پر تُلا ہوا ہے ــــ پانی میں جو روانی اور سادگی ہے اس زمانے کے اکثر "خوش مذاقوں" کو پسند نہیں لیکن میرے لئے یہ خوشی کی بات ہے کہ میں ان خوش مذاقوں کو پسند نہیں کرتا، پانی کی روانی اور سادگی کا تو کیا کہنا مجھے وہ نظم بھی مست کر دیتی ہے جو پانی کی طرح رواں اور سادہ ہو ؎

سنو مدحِ آبِ رواں برملا — اِدھر آؤ دیکھو یہ پانی چلا
روانی میں اک شور کرتا ہوا — رُکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
وہ اونچے سروں میں تموّج کا راگ — وہ خود جوش میں آکے لانا یہ جھاگ
بلندی سے گرتا گراتا ہوا — نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہوا
(اکبر الہ آبادی)

واہ رے آبِ رواں ؎
ملاوٹ بھی اک فن ہے جو جانتا ہو — تری سادگی کچھ نہیں جانتے ہیں

قدرتی سادگی میں عالمِ تصویر پیدا کرنا لکھنؤ اسکول ہی کا فریضہ ہے ــــ یہ صاحب کا ذوق یونہی ترقی کرتا رہا تو "لاجوردی سائبان" پر بھی نگاہِ حک و اصلاح ڈالنا پڑے گی، فقط یہی کیا اور بہت سی چیزیں اسی قسم کی نکل آئیں گی۔ عزیز لکھنوی کا جادو نگار قلم آخر کہاں کہاں سحر کا ہاتھ ڈال کر اس کی سادگیوں کو رنگینیوں سے بدلتا پھرے گا؟ اپنے خیالات کے دریائے موجزن کو استعارہ یا تشبیہ کے کوزہ میں بند کر دینا معجزہ نمائی یا مداری جو کچھ بھی ہے ہے لیکن شاعری ہرگز نہیں ہو سکتی۔ شعری کائنات کا انحصار تشبیہ و استعارہ پر ہے نہ شعلہ و شبنم اور قوسِ قزح کہکشاں جیسے خوشنما لفظوں پر۔ دیکھئے! چند مثالیں عام بول چال میں قدرتی شاعر اپنے فطری ذوق کی بدولت کتنی شعریت پیدا کر دیتا ہے ؎

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

ایک حقیقی شاعر کی نظر سے زندگی کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہ جاتا ہے اس کا تعلق معاملہ سے ہو خواہ معاشرہ سے۔ شاعر حسن کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ بے نقاب کرکے ان دیکھنے والوں کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہتے اسی عمومی تاثر کا نام شعریت ہے، یہ دونوں مصرعے غور سے ملاحظہ فرمائیے "عشق اور ناجائز عشق" کو قلم بند کرنے کی سعی مشکور کیسی اثر آفریں ہے۔ یہ اثر آفرینی سادگی نہ تشبیہ کی محتاج ہے نہ استعارہ کی، میری نگاہ میں صداقتِ بیان ہی شعریت کو اجاگر کرنے کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ ہے، تصنع اور خلوصِ جذبات ہم آہنگ ہو ہی نہیں سکتے۔ اجتماعِ ضدین عقلاً بھی محال نقلاً بھی محال، میں یہ نہیں کہتا کہ ہر شاعر اسی طرح

---

[2] مضامین چکبست [3] مضامین چکبست۔

[1] علی سردار جعفری بھی یلدرم صاحب کے ہمنوا ہیں ملاحظہ ہو "نیا ادب" بابت اگست ۱۹۴۲ء
ایک علی سردار ہی کیا، اُردو کی حد تک پوری ادبی دنیا کا ان دنوں یہی خیال ہے ۱۲

سہل ممتنع شعر کہا کرتے بعض مواقع پر ؎

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

میں اسلئے ایسے معاملات، کنایہ، استعارہ اور تشبیہہ وغیرہ کے ذریعہ ہوتے ہیں اور ان کا استعمال بے محل بھی نہیں معلوم ہوتا۔ مثلاً

کہ جوہر صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا ۔ ایسے باعلم لوگ جن کے دل و دماغ میں قابلیت صلاحیت ہوتی ہے ان میں رموز و استعارات کو خوب سمجھتے ہیں، ایسے شعر کی رنگینی ان کو محظوظ ہی نہیں کرتی، مستفید بھی کرتی ہے ــــ ہندوستان کے جاہل اور ان پڑھ عوام اس شعر کو خاک سمجھیں گے؟ ان سے وقت پر کچھ کام لینا ہو تو کھلے کھلے لفظوں میں صاف صاف کہہ دینا چاہیئے ؎ کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو۔

اقبال مرحوم اپنے آخر زمانے میں سہل ممتنع شعر زیادہ کہنے لگے تو ظاہر بیں افراد نے کانا پھوسی شروع کر دی، بعض ضمیر شاعر نے ان کے سرچشمے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ؎

کم نظر بیتابیٔ جانم ندید ؎ آشکارا دید و پنہاں ہم ندید

"بیتابیٔ جاں کلام جوش میں کہاں؟ کچھ ہے بھی تو مصنوعی تصنع کا پردہ اُس کو روشناس اہلِ نظر ہونے نہیں دیتا" اوپر والی دو سطریں میرے ضمیر کو ملزم کر رہی ہیں، غلط کہا میں نے۔ جوش، دربیتابیٔ جاں سے معرّیٰ؟ قوم و وطن کی محبت میں جوش، اقبال سے کم بیتاب نہیں لیکن اقبال دہلی سکول سے وابستہ تھے۔ اکثر نیچرل خیالات کو نیچرل زبان میں ادا کر گئے ــــ سو رنگین نظمیں پیدا کی جا سکتی ہیں مگر اس ڈھب کے ایک شعر کا سرانجام پانا مشکل ہے ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا ؎ تماشہ دکھا کر مداری گیا

جوش کے بھی اکثر خیالات نیچر کے موافق ہیں لیکن لکھنؤ سکول سے تعلق نے ان کو نیچرل زبان سے کام لینے نہیں دیا۔ جوش کے حقیقی شاعر ہونے کی یہ دلیل روشن ہے کہ ان کی مصنوعی زبان بھی بسا اوقات مزا دے جاتی ہے، جوش کی محبوبیت آئے دن ترقیوں پر ہے، محبوبیت کی حد ہو چکی کہ موصوف کا تصنع جس کو لکھنؤ کی اصطلاح میں "نوٹ" کہتے ہیں اہلِ نظر احباب تک کو محسوس نہیں ہوتا، جوش کے مقلد اُتر، دکھن، پورب پچھم ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں لیکن اس محبوبیت کا عشرِ عشیر بھی کسی کو نصیب نہیں ــــ کاش جوش کے کلام میں "نوٹ" نہ ہوتی، ہوتی بھی تو اتنی نہ ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا میں جوش کو سب سے بڑا شاعر سمجھتا۔ جوش کی بعض خصوصیات مجھے آج کسی دوسرے شاعر میں اچھی طرح دکھائی نہیں دیتیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت زندہ ضمیری ہے۔ ان کو کسی بڑے سے بڑے نقاد نے بھی متاثر نہیں کیا۔ جوش مانی الضمیر بیان کرتے ہیں تو کاغذ پر ان کا دل مصور کتا ہوا نظر آتا ہے۔ ناسخ کی لفاظی میں اور جوش کی مصنوعی زبان میں نمایاں فرق ہے اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ ناسخ کی محبوبیت کی طرح جوش کی محبوبیت ناپائدار ثابت نہ ہوگی۔

لہ۔ فقرہ جوش صاحب ہی کا ہے! ملاحظہ ہو خمکدۂ سرور۔

جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

"میرا دل گھبراتا ہے ماں۔"
"میں تمہارے پاس ہوں بیٹا۔ سونے کی کوشش کرو۔"
سکو تو اس کے ارد گرد چیل کے اونچے اونچے درخت تُند
ہواؤں میں سنسا رہے تھے۔ بادلوں کی موٹی موٹی تہوں نے فضا کو
بہت اُداس اور زیادہ بھیانک کر دیا تھا۔ کبھی کبھی بجلی چمک کر سڑکوں
کو خاموش اور سنسان اُونچ نیچ کو روشن کر دیتی تھی۔ دُور ماں
روڈ کی طرف سے فوکس ٹروٹ کے میوزک کے دھیمے دھیمے سُر سنائی
دے رہے تھے۔

"مری میں میرا دل نہیں لگتا، ماں"
"بیمار کا دل کہیں بھی نہیں لگا کرتا بیٹے۔"
"راولپنڈی میں بھی کوئی گرمی بھی زیادہ نہیں ہوئی تھی اور
وہاں سے تو دن کے وقت چھانگلا گلی کی سڑکیں صاف دکھائی دے
رہی ہیں۔"
"سوگتا کا حال تھا ——"
"سوگتا ——"
"سوگتا کہتی تھی اگر ہم جلدی مری میں نہ گئے تو اچھے اچھے
بنگلے سب رُک جائیں گے۔ اور ——"
"ماں، مدن آیا تھا؟"
"آیا تھا بیٹا تم آرام کر رہے تھے۔ وہ اور سوگتا سینما دیکھنے
گئے ہیں۔ ابھی تک نہیں آئے۔ کہتے تھے شاید سینما کے بعد ناچنے
کے لئے جائیں گے۔"
"اب کیا وقت ہے، ماں؟"
"دو بجے ہیں"
بادل گرجنے لگے، بجلی زور سے کڑکڑا اٹھی۔ کڑک کے بعد
چھانے والی خاموشی میں فوکس ٹروٹ کا میوزک زیادہ بلند ہو گیا۔
مریض کو کھانسی شروع ہو گئی۔ وقت کی نبض زور زور سے دھڑکنے
لگی۔
اور جب ایک عرصے کے بعد مریض کا تنفس بحال ہو گیا ——
"موہن! بیٹے!"

"جی ماں!"
"ایک دفعہ پھر کہتی ہوں اس مدن کا یہاں آنا جانا بند کر دو۔"
"اب کیا فائدہ ہے ماں۔"
"تمہاری صحت پر بُرا اثر ہو رہا ہے۔ موہن۔"
"اب تو میں تپدق کی تیسری سٹیج سے بھی کہیں آگے ہوں ماں۔"
"اور یہ بے غیرتی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی سوگتا تمہاری
بیوی ہے تمہاری خدمت کرنا اُس کا فرض ہے۔ اور وہ ہے کہ
بس مدن کے بازو میں بازو ڈال کر سڑکوں پر گھومتی پھرتی ہے
جیسے —— جیسے کہ ——"
"ماں سوگتا جوان ہے اور خوبصورت ہے۔ اتنی چھوٹی سی
عمر میں اُس کو ذمہ داریوں سے بچنا چاہیئے۔"
"اب میں تمہاری ایک بات نہیں سنوں گی، موہن، میں مدن
سے کہنے والی ہوں وہ آئندہ یہاں کبھی نہ آئے"
"اگر مدن یہاں کبھی نہ آئے گا تو سوگتا اس کے ہاں جایا کرے گی
ماں اُس کو تکلیف ہو گی۔"
"تم کیا فضول باتیں کرتے ہو، موہن۔"
"ماں، مجھے سوگتا سے بے حد بے اندازہ محبت ہے۔"
"مجھ سے بھی زیادہ؟"
ہاں ماں، مجھے سوگتا سے تم سے بھی زیادہ محبت ہے۔"
موہن کی ماں کو غصہ نہیں آیا۔ صدمہ محسوس ہوا۔ اُسے یہ بھی
یاد نہ رہا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے ایک
کونے کو دیکھنے لگی۔ غیر ارادی طور پر اُس کی نظر کلوک پر چلی گئیں
دو بج کر بیس منٹ ہو گئے تھے۔ وہ اُٹھی، دوائیوں کے میز کے پاس
گئی، اور دوائی کی ایک خوراک گلاس میں ڈال کر مریض کے پلنگ
کے پاس واپس آ گئی۔
"موہن، دوائی پی لو۔"
موہن نے دوائی پی لی
"ماں، اب تم سو جاؤ۔ تم بیمار ہو جاؤ گی۔"
"میری قسمت میں نیند کہاں ہے بیٹا، پچھلے سال تمہارے

پتا کی چارپائی کے پاس بیٹھ بیٹھ کر راتیں گزار دیں۔ اب ۔۔۔"

موہن نے اپنی مضمحل نگاہوں سے اپنی ماں کے مغموم چہرے کی طرف دیکھا۔ شاید اُس کی تھکی ہوئی آنکھیں اپنی ماں کے چہرے پر غم نہ دیکھ سکیں۔ اُس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہو گئیں۔ اُس کا مرجھایا ہوا زرد چہرہ تکیے پر ایک طرف کو جھک گیا۔ اُس کی ماں اس کے پلنگ کے پاس کھڑی ہوئی ایک عرصے تک موت کی اس ڈراؤنی تصویر کو دیکھتی رہی۔ اُس نے اپنے آنسوؤں کے طوفان کو پیچھے دھکیلنے کے لئے اپنے نچلے ہونٹ کو کاٹ کاٹ لیا۔ اور پھر اُس کو یقین ہو گیا کہ موہن سو گیا ہے۔ اُس نے بتی کو بجھا دیا کمرے میں دو آمیز اندھیرا چھا گیا۔ آنسوؤں کے دیدہ لگے کے گالوں کی جھرّیوں میں بہتے ہوئے موہن کے تکیے پر گر پڑے۔ وہ پلنگ کے پاس آرام کرسی پر بیٹھ گئی اور اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیا۔

بجلیاں اور بھی زیادہ زور زور سے کڑکنے لگیں ٹین کی چھتوں پر اولے گرنے لگے کچھ دیر کے بعد یہ طوفان تھم گیا۔ بارش ہونے لگی۔ کبھی کبھی بجلی چمکتی تھی دروازوں اور دریچوں کے شیشوں پر بارش کے قطرے آنسوؤں کی طرح بہتے نظر آتے تھے۔ دور مال روڈ پر ڈانسنگ ہال میں سورگ خاموش ہو چکا تھا۔

موہن بڑبڑا اُٹھا۔

"ماں، وہ بھاگ گئے ہیں وہ بھاگ گئے ہیں وہ کشمیر پوائنٹ کی طرف جا رہے تھے ۔۔۔ مجھے دیکھ کر وہ ۔ مجھے دیکھ کر۔"

ماں جلدی سے اُٹھی "کون، بیٹا؟ کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟"

"اوہ ۔۔۔" وہ لیٹ گیا۔ "مجھے دیکھ کر اُنھوں نے حقارت سے اپنے مُنہ پھیر لئے۔ میں نے پکار پکار کر کہا۔ سنجوگتا، تم بھیگ گئی ہو۔ تمہیں زکام ہو جائے گا۔ لو ۔ میری چھتری لے لو۔ اُس نے میری بات کا جواب تک نہیں دیا، ماں۔ پھر وہ دونوں چیل کے درختوں کے ایک جھنڈ میں غائب ہو گئے ۔۔۔"

"تم نے خواب دیکھا ہے، موہن۔ خواب سچے نہیں ہوتے۔"

"مجھے ان سے بے حد نفرت ہے ماں۔ تم اُس کو یہاں کیوں آنے دیتی ہو؟"

"میں اُس کا یہاں آنا بند کر دوں گی بیٹا۔"

"اور سنجوگتا تو ایسی نہ تھی، ماں وہ تو میرے بغیر ایک پل بھی نہ رہتی تھی۔ کالج میں وہ مجھ سے مدن کے اخلاق کی ہمیشہ شکایت کیا کرتی تھی۔ میں اسے شام کو ہر روز ایک گھنٹہ فلسفہ پڑھایا کرتا تھا۔ اور اگر کبھی مجھ سے ناغہ ہو جاتا تو دوسرے دن وہ مجھے کہتی۔ آپ نہ آئے تو میرا دل نہیں لگا۔ پھر مدن آرمی میں لفٹنٹ ہو کر کہیں چلا گیا۔ اُس نے وہاں سے سنجوگتا کو محبت نامے لکھے۔ سنجوگتا نے وہ مجھے دکھائے اور پھر اُن کو پھاڑ ڈالا۔ اور اب ۔۔۔ اب ۔۔۔"

وہ تھک گیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

"اب کچھ نہیں موہن یہ سب تمہارا وہم ہے۔"

اُس نے کوشش سے اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنی ماں کو گڑی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب ۔۔۔ اب ۔۔۔ ماں، کیا تم جانتی ہو سنجوگتا ہم کو مری میں کیوں اتنی جلدی لے آئی ہے؟ ۔۔۔ نہیں، ماں، گلے رُک جانے کے ڈر سے نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ مدن کو صرف اس ماہ میں چھٹی مل سکتی تھی اور وہ ہم سے پہلے راولپنڈی چھوڑ کر مری آ گیا تھا ۔۔۔ تم نہیں جانتیں ماں، تم نہیں جانتیں ۔۔۔"

اُس کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ اُس کے چہرے پر کرب کے آثار گہرے ہو گئے۔ اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی خشک زبان پھیری وہ خاموش ہو گیا۔ دیر تک خاموش سے بے حرکت پڑا رہا۔

باہر بارش تھم گئی۔ لیکن تند اور طوفانی ہوائیں زیادہ تند اور طوفانی ہو گئیں۔ بجلی کی کڑک اور چمک سے منظر اب بھی بھیانک تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا۔

"صرف بلندی اور پستی ہے ۔۔۔ بلندی اور پستی ۔۔۔ اس لئے جب دولت کی سنہری اور روپہلی تہذیب گرمی کی شدت میں پگھلنے لگے گی، تو وہ مری کے صحت افزا مقام میں آ جایا کرے گی۔ صحت افزا مقام؟ ۔۔۔ کیا مدن یہاں صحت حاصل کرنے کے لئے آیا ہے؟ ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ صحت اور مسرت ۔۔۔ اللہ جب صحت اور مسرت حاصل کرنے والوں کے جوانی سے تمتماتے ہوئے چہرے مال روڈ سے ہوتے ہوئے کشمیر پوائنٹ کو جاتے ہیں تو اُن کو کبھی کبھی راستے میں کوئی تپ دق کا مریض ملتا ہے اُس کے چہرے پر موت کی زردی ہوتی ہے۔ اُس کی آنکھوں میں مایوسی کا گدلہ پن ہوتا ہے ۔۔۔ وہ اُس کو دیکھ کر حقارت سے مُنہ پھیر لیتے ہیں ۔۔۔ پھر سرما کی طوفانی ہوائیں

کھڑکیوں سے اور آسمانوں سے پہاڑی جیسے گرنا شروع ہو جاتی ہیں۔ جوان جسم سانس لیتے ہوئے چہرے فنا ہو جاتے ہیں ـــــ تپدق کا مریض کہیں یہیں کہیں نیچے دب جاتا ہے ـــــ مری سنسان ہو جاتی ہے"

"زیادہ باتیں نہ کرو، موہن، تم تھک جاؤ گے۔ سونے کی کوشش کرو ـــــ اور دیکھو اگر اندھیرے میں دل گھبراتا ہو تو بتی جلا دوں؟"

ہوا کا ایک تند جھونکا آیا۔ دروازے اور کھڑکیاں کھڑکھڑائے کمرے کے اندھیرے میں خنکی بڑھ گئی۔

"نہیں، ماں، مجھے اندھیرا اچھا لگتا ہے جب زور سے ہوا چلتی ہے اور دروازے کھڑکھڑاتے ہیں ـــــ اور جب بجلی چمکتی ہے تو ایک پل کے لئے اندھیرا غائب ہو جاتا ہے ـــــ ماں، اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شمشان میں جلتی ہوئی لکڑیاں تڑخ رہی ہیں اور شعلے بلند ہو رہے ہیں ـــــ'

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے بیٹے ـــــ"

'اور اس اندھیرے میں مجھے دروازوں اور دریچوں کے شیشوں میں سے کہیں کہیں جگنوؤں کی بتیاں نظر آتی ہیں اکیلی اکیلی، چپ چاپ ـــــ اور ماں، اُس وقت میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے امیدوں کے کمزور اور مدھم چراغ جھلملا رہے ہیں۔ کمزور اور مدھم چراغ جن کو تند ہوا ہمیشہ کے لئے بجھا کر ہی چھوڑے گی۔"

موہن کی ماں کی آنکھوں میں آنسو امڈتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ ضبط کو قائم رکھنے کی بے حد کوشش کر رہی ہے

ایک مدت تک مایوس خاموشی چھائی رہی مریض کی تھکی ہوئی آنکھیں بند ہو گئیں اُس کی ماں نے سمجھا وہ اب سو جائے گا وہ پھر آرام کرسی پر بیٹھ گئی لیکن اس کا خیال غلط نکلا اس دفعہ موہن کی آواز میں بے بسی کے علاوہ بے چینی اور پریشانی تھی

"ماں ـــــ میں نے کیا کہا؟ میں نے کیا کہا تھا ـــــ اُف! میں اتنا انسانیت سے گر گیا ـــــ خود غرضی ـــــ ایک مرنے والے کی خود غرضی ـــــ ایک مرنے والے کو خود غرض ہونے کا کیا حق ہے؟ ـــــ ماں، میں سنجوگتا اور مدن کا شکر گزار ہوں۔ وہ دونوں میری موت کو کھینچ کر میرے نزدیک لا رہے ہیں ـــــ وہ مجھے زندگی کے سنگین پنجے سے چھڑا رہے ہیں ـــــ مجھے ان کا شکر گزار ہونا چاہیئے ـــــ ماں، میں کل اپنے وکیل سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک وصیت نامہ لکھنا ہے۔ اُس میں آدھی جائداد تمہارے نام اور آدھی جائداد سنجوگتا کے نام ہو گی ـــــ

حیران ہونے کی کوئی بات نہیں، ماں۔ اس کا ایک سبب ہے مدن سنجوگتا سے اپنے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا ہے، لیکن ایک آزاد خیال نوجوان ہونے کے باوجود شاید وہ ایک بیوہ سے شادی نہ کرے یا پھر سماج کے قانونوں کا سہارا لے کر اپنی ذمہ داریوں سے بھاگنے کی کوشش کرے ممکن ہے سنجوگتا کی دولت اُس کو سماج کے قانونوں سے بے پروا کر دے ـــــ اور ـــــ اور اگر کچھ نہ ہوا تو میرے بعد سنجوگتا تنہا ہو گی مفلس نہ ہو گی ـــــ"

اس دفعہ جب بجلی نے کمرے کو عارضی طور پر روشن کیا تو موہن کو دروازے کے پاس کوئی نسوانی مجسمہ نظر آیا۔

"ـــــ کون ہے ـــــ سنجوگتا؟ ـــــ سنجوگتا تم ہو؟ ـــــ تم آ گئیں سنجوگتا؟ ـــــ ماں، ذرا بتی جلانا!"

ـــــ موہن کی ماں نے بتی جلا دی ـــــ "اوہ ـــــ تم رو رہی ہو، سنجوگتا؟ ـــــ تم کب سے وہاں کھڑی رو رہی ہو؟ ـــــ آؤ ـــــ میرے پاس آؤ ـــــ ذرا میری طرف دیکھو" ـــــ اُس نے اپنے چہرے پر زرد رنگ کی ڈراؤنی ہنسی پیدا کر لی ـــــ "اور پکچر کیسی تھی؟ ـــــ ڈانس میں حصہ لیا؟ ـــــ تمہیں میرے کمرے میں زیادہ ہنسی آنا چاہیئے، سنجوگتا۔ یہ متعدی مرض ہے ـــــ خوش رہنا خوبصورتی کا راز ہے ـــــ تمہارے چہرے پر ہر وقت تبسم ہونا چاہیئے ـــــ کم عمر لڑکیوں کے لئے سنجیدگی بدصورتی ہے ـــــ ہنسو ـــــ ہنسو سنجوگتا!"

سنجوگتا پلنگ کے پاس اپنے گھٹنوں پر گر پڑی اور موہن کے تکیے میں اپنا چہرہ دفن کر کے زار زار رونے لگی!

علامہ مضحک دہلوی

لاڈو

ماں باپ، اور ایک ہفت سالہ لڑکی ڈھائی آدمیوں کا کنبہ جس کا ہر ایک فرد ماروں کی چھاؤں میں اٹھنے والا دن بھر پیچھے والا ایسنہ بہا بہا کر محنت کرنے والا ہو اس خاندان کو خوش حال اور مالدار ہونا چاہیئے مگر کیا وہ مالدار تھے۔ ان کے پاس کچھ اندوختہ سرمایہ تھا — سرمایہ — سرمایہ اور محنت کرنے والوں کو سرمایہ سے کیا سروکار۔ سرمایہ تو اُن لوگوں کے لئے ہے جو محنت سے اتنے ہی دور رہیں جتنا خود مزدور سے دور رہتا ہے۔ سرمایہ تو اُن کے لئے ہے کہ جب راستہ چلیں تو پیر نہیں رستے جب اُن کو ہلایا جائے تو حیران رہ جائیں کہ اُن میں سے سرمایہ کی بیت جھڑ ہو۔ جب بیٹھے رہیں تو سونے چاندی میں تُلتے رہیں۔ جب استراحت فرمائیں تو کروٹ کروٹ پر دولت کا انبار ہو۔ بدھو کی بیوی بسنتی گھر میں سب سے بعد سوتی تھی اور سب سے پہلے اُٹھتی تھی۔ بدھو اس کے بعد اور سب کے بعد لاڈو۔ تینوں اپنے اپنے معمولات کے اس طرح پابند تھے جیسے گھڑی۔ بسنتی نے گھر کی جھاڑو بہارو سے سنبھال شروع کی ادھر بدھو نے اپنا مچھلی پکڑنے کا جال سنبھالا اور سیدھا ندی کا رُخ کیا۔ لاڈو نے گوبر اُٹھانے کی ٹوکری اور اپلے ڈالیا اور گاؤں کے مویشیوں کے ساتھ ہولی۔ سات برس کی جان دس بجے سے پہلے دس سیر گوبر گھر میں لا کر ڈال دیا باسی کوسی کھا پی سیر ٹوکرا لے شام لکڑیاں چننے کے لئے جنگل میں پہونچ گئی۔ بارہ بجتے بجتے وہ شام کے لئے ایندھن کا سامان لے آئی اور باپ گھر کا دھندا کرنے کے لئے مچھلیاں لے کر واپس آ گیا سب نے مل کر روکھی سوکھی کھا لی باپ مچھلیاں لے کر شہر پہنچ گیا۔ ابھی شہر میں نہیں پہنچا تھا جیسی پہ دو ایک مچھلیاں چنگی جی کی نذر ہوئیں محصول اسپر شہر میں داخلہ کا حکم ملا۔ ابھی منڈی میں نہیں پہنچا راستہ میں دیوان جی نے بھانپا اور دو ایک مچھلیوں کا انتخاب فرمایا۔ منڈی میں پہنچا تو ٹھیکہ دار نے "بازاری کا پیسہ الگ لیا اور دو ایک مچھلیاں الگ اینٹھی — چلچلاتی بھادوں کی دھوپ میں جرک کے غلبہ کے ساتھ بدھو نے جو محنت کر کے اپنا اور اپنے

کنبے کا پیٹ پالنے کے لئے سامان جمع کیا تھا اس میں سے نصف کے قریب اس امداد قانون کے کارندوں کی بھینٹ چڑھا۔ بدھو کا استدلال تھا کہ اس کے ماتھے پر شکن نہ آتی تھی اور وہ مذہبی سنگ بہ اقمہ دو دختہ بہ فرح دل سے یوں ہی بانٹتا رہتا تھا۔ اور یہ اس کی "مزدوری زندگی" کا زرّیں کارنامہ ہے کہ وہ اپنی خون پسینہ سے کمائی ہوئی دھڑی میں سے نصف یوں فراخ دلی سے لٹا دیا کرتا تھا دس برس تک لاڈو ایسے ہی کنبہ میں بسر کرتی رہی جس نے ہمیشہ ہر عسرت کو اپنے لئے تونگری اور ہر تکلیف کو آرام سمجھا۔ اُن سب کے چہرے قناعت اور استغنا سے بشاش اور شاداب۔ اُن کے جسم لاغر مگر ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے مضبوط اور تندرست۔ خوشحال پور کی فضا میں یہ مزدور کنبہ گرم و سرد جھیل کر عمر گذارتا رہا۔ اور اگر دنیا میں تقدیریں مٹ نہ کھاتیں، انقلاب نہ آتے تو یہ کنبہ اسی طرح عمر بسر کر دیتا۔ انقلاب آیا۔ یہاں کے عشق پسند زمیندار کو ایک سرمایہ دار کا قرضہ لگا اور ایسا کاری لگا کہ خوشحال پور رہن سے رہن بادبسہ ہوتے ہوتے ساہوکار کی ملکیت ہو گیا۔ اور یہ مزدور کنبہ ایک عیش پسند زمیندار کی غلامی سے نکل کر ایک ساہوکار کی غلامی میں آ گیا بدھو کاشتکار نہیں تھا مگر رہتا تھا ساہوکار کے گاؤں میں اس لئے خود ساختہ زمینداری قانون کے ماتحت ہر قسم کی "بیگار" کا مستحق تھا۔ گاؤں کو منتقل ہوئے ابھی تھوڑا ہی زمانہ گذرا ہو گا کہ ساہوکار کی طرف سے حکم نامہ پہنچا کہ بدھو معہ اپنے اہل و عیال کے کوٹھی پر حاضر ہو۔ زمینداری قانون نے بدھو کو پانچو لال ساہوکار کے ہاں بھیج دیا — اس انقلاب کا سب سے زیادہ گہرا اثر لاڈو کے معصوم دل پر ہوا اس خیال سے نہیں کہ یہاں کام زیادہ تھا یا وہ کمسن اور کام چور تھی بلکہ اس وجہ سے کہ پہلے وہ اپنی مرضی کے موافق کام کرتی تھی اور اب اُس کو دوسروں کی مرضی کے موافق کام کرنا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ اس پہ جبر تھا کہ اپنی عادات کو چھوڑ کر مخدوم کی مرضی کے موافق بنائے۔ جب صبح کے اُٹھنے کا معمول تھا یہاں اس وقت رات ہوتی تھی۔ جب رات کو سونے

سونے کا وقت ہوتا تھا اُس وقت یہاں دن نکلتا تھا۔ وہ اکثر دیکھتی لالہ جی دس بجے نیچے کوٹھی میں جا کر بیٹھتے ہیں جہاں ان کی طرح دس پانچ اور موٹے موٹے آدمی گاؤ تکیہ لگائے موٹی موٹی بہی لئے بیٹھے اُس میں نہ معلوم کیا لکھتے رہتے ہیں۔ کبھی لالہ جی کہتے ہیں "منیم جی یہ دس ہزار کی ہنڈی آ گئی ہے اس کا روپیہ کوٹھی سے آج ہی لا کر جمع کرنا ہے۔" کبھی "منیم جی یہ بنک کے چیک آ گئے ہیں ان کو آج سنبھالو۔" کبھی آواز آتی "ارے منیم جی تجوری میں روپیہ زیادہ ہو رہا ہے بنک میں رکھ آؤ۔" پھر دیکھتی کہ ایک کونے میں ایک آدمی بیٹھا ہے اُس کے آگے روپوں کا ڈھیر لگا ہے دن بھر گنتا رہتا ہے۔ گھر میں وہ رات کو سوتے میں اکثر لالہ جی کی کچھ آوازیں سنا کرتی۔ اکثر چیک بھی پڑتی مگر ہنڈی۔ ملک روپیہ۔ دس ہزار بیس ہزار چھنا چھن چھنا چھن روپیہ گننے کی آوازیں کانوں میں آتی رہیں۔ گھر میں اس سے زیادہ بات سیٹھانی جی کا ہوتا عجب عورتوں کے غول آتے رہتے کوئی ایسا دس روپے کا زیور دے کر پانچ پاتی۔ کبھی سیٹھانی جی خفا ہوتیں "نیوتی میں سود کا دھیلا بھی چھوڑنے کی" کبھی پر عتاب ہوتا "نکموں جان ہار اب آئی ہے تو پورا روپیہ بھی نہیں لائی وعدہ کل کا تھا تیری چھیرا آئی گئی ہو گئی" وہ اکثر سوچا کرتی کہ لالہ جی اور سیٹھانی جی دن بھر روپوں سے کھیلتے ہیں ہر وقت دھن دولت کی ریل پیل ہے پرماتما اتنا دھن دولت تم جیونوں کے لئے ___ کیا ہوگا یہ سب کچھ ___ گھر بھر کے لئے سیر بھر آٹا بہت ہے ___ یہ کون کھائے گا اتنا روپیہ۔ کبھی دیکھتی کہ لالہ جی کے دروازے پر فقیر اور بھکاری لین لگائے بیٹھے ہیں سدا برت بٹ رہا ہے۔ ایک ایک مٹھی چنے ہر ایک فقیر کو پرماتما کی دین۔ لالہ جی خود کھائیں پراٹھے دال ترکاری، اچار چٹنی، مٹھائی اور بھوکوں کو ایک ایک مٹھی چنے ___ پرماتما کی لیلا ___ لاڈو معصوم کو کیا معلوم کہ اپنی بھوک اور پرائی بھوک میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ اپنی بھوک کا احساس خود کو ہوتا ہے دوسروں کی بھوک کا احساس اپنے کو نہیں ہوتا۔ اور جس چیز کا احساس خود کو ہوتا ہے وہی عمل میں آتی ہے خود غرضی جب غیروں کی غرض کو کچل کر فنا کر دیتی ہے تو آدمی سیٹھ بنتا ہے۔ لاڈو جب کبھی ماں سے اظہار کرتی تو جواب پاتی "تجھے اس سے کیا، اپنے کام سے کام" باپ سے تبادلہ خیالات کرتی تو سنتی "اری باؤلی تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو" لاڈو کو سیٹھ جی کی بیگار میں آئے ہوئے چار برس ہو چکے۔ اس کا معمول تھا کہ ماں کے ساتھ گھر کے کام دھندوں میں اس کا ہاتھ بٹاتی اس کے علاوہ اُسکے سپرد یہ کام تھا کہ سیٹھ جی کے اکلوتے بیٹے للّو جی کے کمرے کی صفائی اور ان کی چیزوں کی سنبھال بھی کرنی پڑتی تھی۔ للّو جی اکلوتے باپ کے بیٹے چاہتے تو دنیا کے علوم حاصل کر لیتے، اخلاق اور کردار میں اپنے سماج کے لئے مشعل ہدایت ہوتے مگر بیٹا باپ کا مقلد ہوتا ہے انہوں نے علم حاصل کیا تو صرف اس قدر کہ مہاجنی کا کام اچھی طرح چلا سکیں۔ اُن کا عمل دولت کے چار دانگ اُن کا مشاہدہ اور تجربہ ماں باپ کو دیکھ کر بنا۔ ماں گھر میں بیٹھے بیٹھے روپیہ پیدا کرتی ہیں سود کا لین دین جاری ہے غریبوں کی زندگیاں اونے پونے خریدی جا رہی ہیں ___ دکھ بیماری شادی غمی معاشرت کے مطالبات اُن کو کھینچ کھینچ کر سیٹھانی جی کے پاس لا رہے ہیں جہاں سود اور سود در سود کی جونکیں لگا لگا کر اُن کا خون چوسا جا رہا ہے۔ وہ خون جس کی چند بوندیں فاقہ کشی سے دست و گریباں ہونے کے بعد۔ تنازعۃ البقا کی کڑی منزلیں جھیلنے کے بعد پیدا ہو گئی ہیں۔ باپ گھر سے باہر روپیہ سمیٹ رہے ہیں ہنڈی پرچہ سٹہ۔ لین دین جاری ہے۔ اُن کا دفتر چھما چھم کے نغموں سے معمور ہے آٹھ پہر لکشمی کا رقص ہو رہا ہے ایسی فضا میں پیدا ہونے اور پلنے والا بچہ معاشرے کا مصلح کس طرح بنتا۔ للّو جی نے گھر سے باہر کا کام سنبھالا۔ بمبئی کلکتہ اور بڑے بڑے شہروں میں دولت کھینچنے کے گماشتے قائم کئے۔ دن رات اس تگ و دو میں پھرتے کہ ایک کا سوا کیسے بناؤں۔ باپ سے سبقت لے جاؤں۔ لاڈو وقتاً فوقتاً ان کے بھی کارنامے سنتی رہتی۔ اور ان تینوں آقاؤں کے جیون پر مختلف پہلوؤں سے غور کرتی رہتی جب فرصت کے لمحات میں خیال آرائی کا موقع ملتا تو کانوں میں صدا گونجتی ___ تو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کیا کام۔ ایک طرف لاڈو اپنی خیال آرائیوں میں مصروف۔ ادھر قدرت کی ستم ظریفی "شباب" نے اس کو تاکا اور خاموشی کے ساتھ اسیر بنانا شروع کیا ___ ایسی شدت کے ساتھ کہ محنت اور فاقہ کشی سے لڑتے ہوئے اعصاب اور اعضا میں اُبھار پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

جیسے پرتاب ناکیاں اور صیاد یاشیاں مسلط ہونے لگیں۔
مستانہ روش نے ہاتھ پاؤں اور جسم پر قبضہ جما یا۔ سنگلاخ
زمینوں پر جم کر پڑنے والے پاؤں صاف شفاف فرش پر بھی
لڑ کھڑانے سے پڑنے لگے جسم میں کثرت کا۔ اور تھکن کا تشنج۔
انی کی انگڑائی۔۔۔ بن گیا۔۔۔ سانس عجیب رفتار سے چلنے
لگا۔ گاؤں میں اپنی ہم جولیوں میں چہل اور کھیل کود میں جس
لڈو کے آج تک جسم میں گدگدی نہ ہوئی اسی لاڈو کا اب دل
خود بخود گدگدانے لگا۔ چیتھڑوں گدڑوں میں لپٹی ہوئی لاڈو
"سیٹھانی" بن گئی۔ کوٹھی میں ادھر جاتی جوانی کی مست
خوشبو پھیلاتی پھرتی۔ ہاٹ بازار میں نگاہیں اٹھنے لگی۔ کہیں
سے لپکاریں اور آہوں کی آوازیں آتی کہیں سے "گوری دھیرے
میرے" لاڈو کے معصوم دل نے کبھی محسوس ہی۔ کیا یہ انقلاب
اس کی جوانی ہے۔ جوانی بھی برف یا تپش۔ اکثر اپنی سادہ لوحی اور
بھولے پن سے ماں سے تذکرہ بھی کرتی تو ماں ہنس کر جواب دیتی۔
"پاگلی اب تو سیانی ہوگئی ہے"۔ لاڈو اب سیانی ہوگئی
ہے۔ سیانا ہونا ابھی لاڈو کے نزدیک پاپ تھا جس نے اس کی
فطرت کے خلاف اس کے ماحول میں تلاطم پیدا کر دیا تھا۔ لاڈو
اس کی ذمہ دار نہیں تھی۔ سیٹھ جی کی توپ نے اس کو جو تجال پور
سے کھینچ کر یہاں قید کر دیا۔ اب ایک دوسری قوت نے اسکو
۔۔۔ یا اور جوانی بنا دیا جہاں قید بھگت رہی ہے وہاں
جوانی بھی بھگتے گی۔ لاڈو کو کیا معلوم کہ سماج کے قانون میں
جوانی بیٹی "کو بیری کا درخت کہا جاتا ہے اور جب بیری
پھلتی ہے تو پتھر آتے ہیں۔ بدھو کی بیری پر بھی پتھر آئے۔
بدھو در شتی نے بھی سیٹھانی جی سے کئی دفعہ التجا کی کہ "سیٹھانی
جی لڑکی سیانی ہوگئی" اس کی بات چیت پہلے سے ہو چکی اگر
کچھ روپے کی مدد کر دو تو بیڑا پار ہو" اکثر تو سیٹھانی نے دیکھا
ان سنی کا کہہ دیا پھر بدھو کے اصرار پر تڑخ کر بولیں۔
"ارے کیوں میری جان کھالی۔ روپیہ کیا سہج مل جاتا ہے؟"
سیٹھانی جی نے کہا۔
"سیٹھانی جی جو حکم کرو ہم لوگ تو تمہارے داس ہیں"۔
بدھو نے کہا۔
"اچھا تو پھر لا تیرے پاس گروی رکھنے کو کیا ہے"؟
سیٹھانی بولیں۔

"گروی رکھنے کو" بدھو نے کہا "سیٹھانی جی ہم تو تمہارے مزدور
ہیں ہمارے پلے کیا رکھا ہے"؟
"ہاں تو پھر میں مزدوروں کو روپیہ بانٹتی پھرتی ہوں نا
بیوپار کا دستور ہے" سیٹھانی نے کہا۔
صاف جواب پا کر ایک آدھ دفعہ سیٹھ جی سے کہا وہاں
بھی جواب ملا کہ "سیٹھانی جانے" انہوں نے گروی کے لئے ٹھیک کہا
بیوپار تو بیوپار ہے۔ غریب و نادار بدھو کون سی چیز لاتے
گروی رکھنے۔ کیا اس کی ناداری اور غربت کا حال سیٹھ جی کو
نہیں معلوم تھا۔ کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ بدھو ان کے زینہ
جنگل میں پھنسی ہوئی چڑیا ہے جو اپنا جوبن پالنے کے لئے بھی
ہاتھ کی طرف دیکھتی ہے مگر "بیوپار تو بیوپار ہے" کیا سیٹھانی
نہیں معلوم تھا کہ بدھو کا کنبہ کا کنبہ قیدی کی طرح دن رات
ان کی خدمت کے لئے ہڈیاں پیلتا ہے اور اس کے عوض جو
اٹھایا معاوضہ ملتا ہے وہ پیٹ بھرنے اور تن ڈھکنے کو بھی کافی
نہیں ہے مگر۔۔۔ "بیوپار تو بیوپار ہے"۔۔۔ کیا سیٹھ جی اور
سیٹھانی جی کو نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے بدھو اور اس کے کنبہ
کو بے داموں خرید رکھا ہے۔ مگر "بیوپار تو بیوپار ہے" کیا
نہیں معلوم تھا کہ چند سکے جو ان کے ہاتھ کا میل ہے دینا
سے بدھو کا اور اس کے کنبے کا سماج بنتا ہے مگر "بیوپار تو بیوپار
ہے"۔ بدھو بیچارا دونوں طرف سے مایوس ہو کر بے آسرا ہو گیا
اب اس کے پاس صرف یہ ہی ایک طریقہ تھا کہ جس جگہ لاڈو کی
بات ٹھہری تھی ان کو بلا کر لاڈو کا ہاتھ پکڑا دے اور کہہ دے
کہ بھائی تم جانو تمہاری لڑکی لیجانا ہو لیجاؤ۔ پھر بدھو کو خیال
آیا کہ لاؤ ایک دفعہ تقدیر آزمائی اور سہی للو جی سے بھی ایک
دفعہ سوال کر کے دیکھوں وہ بددیانت نہ تھا۔ پست ہمت نہ تھا
سماج کی آن نبھانے کو زیادہ سے زیادہ سود پر روپے لینے کو تیار
تھا اپنی اور اپنی بیوی کی ہڈیوں پر بھروسہ تھا۔ جان پیلیں
کمائیں گے اور دینگے۔ ادھر وہ اسی منصوبے میں تھا اس کو کیا
خبر کہ تقدیر اس پر ہنس رہی ہے، انقلاب قہقہہ لگا رہا ہے۔ للو جی
سے بات چیت کرنے کا خیال آتے ہی لاڈو کا ہاتھ پکڑ کر سیدھا
للو جی کے کمرے میں پہنچا۔ للو جی اپنے کمرے میں بیٹھے اپنے حساب
کتاب میں مشغول تھے۔ دولت کے نشے میں چور کا ند للول بجے
تھے اور اسی فکر میں تھے کہ کسی طرح ساٹھ کے ستر بنالوں ان کو

انقلاب کا دیو نیزہ تانے اُن کے سر پر مسلط ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ دولت کا چشتارہ سب دھرا رہ جائے گا۔ دم میں انسانیت سے خارج دولت کا پجاری انسان بنے گا۔ آہٹ پاتے ہی انہوں نے سر اُٹھا کر دیکھا ان کے گھر آئے ہوئے پورے چھ سات سال ہو چکے تھے۔ بہت دفعہ لاڈو کو دیکھا تھا مگر آج . چیتھڑوں گدڑی والی لاڈو۔ ناتواں لاڈو دولت کے قلعہ کو مسمار کرکے تلوجی کے دل میں اُتر گئی۔ دولت کے پجاری کو اپنا پجاری بنا لیا۔ بدھو اپنی رام کہانی سُناتا رہا۔ تلوجی اپنی خود فراموشی میں اس کی داستان کے مطالب و معنی کو ڈھونڈتے رہے، لاڈو اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتی رہی منتوں کے تیوں جلدی جلدی سانس لے کر اپنے دل کی حرکت کو متوازن کرتے رہے ـــــ اور پھر ـــــ بدھو کامیاب ہوا تلوجی کو روپیہ کے واسطے رضامند کرنے میں ـــــ تلوجی کامیاب ہوئے لاڈو کے دل میں دھڑکنیں پیدا کرنے میں ـــــ لاڈو کامیاب ہوئی تلوجی کی دل کی گہرائیوں میں پہنچ جانے میں عشق و محبت کے فلسفے میں کیا کیا بحث دیر نہیں ہو چکی ایک صاحب تو یہاں تک کہہ دیا ہے

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں لذت از گفتار خیزد

یہاں لاڈو اور تلوجی کے فلسفے محبت میں دو دلوں کی ٹکر تھی خوفناک۔ دل بھی وہ دل جو جوان تھے اور ایسی ٹکر کا نتیجہ معلوم ـــــ شُد شُد عقل و ہوش سب ایک شعلہ میں جل کر خاک ہو گئے۔ دونوں بہ یک وقت پریم ساگر میں کود ے اور ایک تھپیڑے میں کہیں سے کہیں بہہ گئے۔ تلوجی تو سرمایہ دار تھے سرمایہ دار ہی بنے رہے۔ دھن دولت بڑی سے بڑی بدکرداری پر پردہ کر دیتی ہے۔ شعر: اے زر تو خدا نہ ای ولیکن بہ خدا۔ معصوم اور بھولی بھالی لاڈو دنیا و ما فیہا سے بے خبر اپنی ساری پونجی کھو بیٹھی۔ سماج کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک عضو معطل ہو گئی۔ وہ دُنیا کے لئے پاپن اور ہتھیارن بن گئی ـــــ بھولے بھالے ماں باپ کو کیا معلوم کہ اُن کو لاڈو کے جیون کے عوض روپیہ ملا ہے۔ اُنہوں نے گاؤں بھر کی برادری کو بُلا دیا۔ لاڈو کی شادی ہونے لگی۔

اُن کو کیا معلوم کہ لاڈو اب شادی کے قابل نہیں رہی۔ وہ دلھن بنائی گئی اور ایک کونے میں اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ جھکا کر بٹھا دی گئی۔ برات کھانے پینے سے فارغ ہو چکی ہے اور آواز پڑ رہی ہے کہ لاڈو کو منڈپ میں بھیجو۔ اب پھیروں کی ساعت آ گئی۔ کسی نے آواز اچھی طرح کسی ہو یا نہیں لاڈو کے دل میں تیر کی طرح لگی وہ دوسرے دروازے سے سیدھی پنگھٹ کی طرف بھاگی ـــــ اسکے بعد ـــــ ایک ہولناک چیخ ـــــ دھماکے کی آواز پانی کا تموّج۔ چند بُلبُلے ـــــ لاڈو اپنے گناہوں کے بوجھ کو آغوش میں لئے ہوئے نظروں سے نہاں ہو گئی ـــــ

کھلاڑی

ناہید عالم

میں جتنا بھی اُس سے بھاگتی تھی، وہ مجھ سے اتنا ہی نزدیک ہوتا جا رہا تھا ــــ میں اُس سے دُور رہنا چاہتی تھی، کچھ اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس قابل ہی نہ تھا، بلکہ اس لئے کہ اُس کی متلوّن مزاجی میرے لئے کچھ ڈھکی چھپی بات نہ تھی ــــ خاندان بھر میں کوئی لڑکی ایسی نہ تھی، جس نے ایک مرتبہ تو اپنی تمام اُمیدیں اُس سے وابستہ نہ کرلی ہوں، مگر وہ ہر مرتبہ ان کے دُکھوں پہ ہنستا، اُن کی آہوں پہ کھلکھلاتا، اور اُن کی اُمیدوں کو روندتا ہوا، کسی نئے کھیل کا ہیرو بننے کے لئے بیتاب نظر آتا۔

"اوہ! تم اِس کی پرواہ مت کرو۔" وہ کہتا، "وہاں میرے لئے سینکڑوں دلچسپیاں چشم براہ ہوں گی۔ امجدی ــــ وہ جسیم تتلی، تم کیا جانو کہ وہ مجھ سے کیسا خیال رکھتی ہے۔ بے چاری سمجھتی ہے کہ میں اُس کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہوں، وہ تو ــــ"

"للہ!" میں بات کاٹ دیتی، "آخر کب تک تم اُن کے جذبات سے یوں کھیلتے رہو گے؟ اتنا اس مکروہ کھیل کو ختم کردو، دیکھ لینا، اِسی کھیل میں ایک دن تم اتنی بڑی شکست کھاؤ گے، کہ پاؤں سنبھلنا مشکل ہو جائیں گے۔"

"اونہہ!" وہ لاپرواہی سے کہتا، "تم اسے مکروہ کھیل کہتی ہو، میں کہتا ہوں، زندگی کی حسین ترین حقیقت ہے یہ، اور میں اُن کی خوشامد کب کرتا ہوں کہ آؤ میرے ساتھ کھیلو، خود ہی چلی آتی ہیں۔ اور جب ہار جاتی ہیں تو ظاہر کرتی ہیں خود کو مظلوم، ہمت ہے تو ایک دن کوئی دیدے نا شکست!" اور وہ ایک مغرورانہ شان سے آرام کرسی پہ دراز ہو جاتا۔

"بکو مت!" مجھے غصّہ آنے لگتا، "آخر خود کو سمجھتے کیا ہو؟ اتنے اچھے تو نہیں ہو تم!"

"ارے!" وہ اُچک کر کہتا۔ "یہ تو کچھ تم اپنے دل ہی سے پوچھو!" اور کمبخت کی وہی دلفریب مُسکراہٹ!

"ہونہہ ــــ ہنہ!" میں حقارت سے کہتی، "میری دُنیا اتنی محدود نہیں ہے!"

اُس کے چہرے پہ ایک رنگ سا گذرا چلا جاتا۔ ایک پرچھائیں سی! در اصل وہ کسی لڑکی سے اتنی ہمت شکن بات سُننے کا عادی نہ تھا۔ اگر میں کہہ دیتی کہ "ہاں میری بے آسرا امنگ کا ایک تم ہی سہارا ہو!" تو وہ یقیناً کھل اُٹھتا، مگر مجھے تو اُس کے پندار کو کچلنا تھا ــــ میں یہ کیونکر کہہ دیتی، وہ اور مغرور نہ ہو جاتا!

"خیر اسے جانے دو!" کھسیانی ہوتی سی مُسکراہٹ اُس کے لبوں پہ بکھر جاتی۔ "دیکھو کہ امجدی ــــ سلمیٰ اور عذرا کے دل کی دھڑکنوں کی کیا رفتار ہے؟" ہار ماننا تو اُس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

"دیکھو مجاہد!" میں اُسے نرمی سے سمجھانا چاہتی، "یہ بہت بُری بات ہے بھلا شریف آدمی یوں کب کیا کرتے ہیں؟"

"ہائے!" ــــ وہ بے زاری کہتا۔ "تمہاری نصیحتوں نے مار ڈالا، شرافت، شرافت، گویا شرافت کا ٹھیکیدار دُنیا میں میں ہی تو رہ گیا ہوں! مگر میں نہیں ہوں شریف، چلو یہی نا؟ اونہہ، میں تو یہاں آ کر ہمیشہ ہی بدمزہ ہوتا ہوں ــــ" اور وہ بڑبڑاتا اور بے زاری سے ہاتھ جھٹکتا ہوا چلا جاتا ــــ

مجاہد میرا پھوپھی زاد بھائی تھا۔ بے حد شاندار، بہت خوبصورت، اور بے انتہا دلچسپ انسان! اُسے چھ مہینے کا چھوڑ کر جب پھوپھی اماں کا انتقال ہو گیا تھا، تو امی ہی نے اُسے پالا، اور اُس کا ہر جائز اور ناجائز لاڈ اٹھایا ــــ مجھے یاد ہے کہ اکثر اُس کی شرارت پہ بھی، بچپن میں مجھی کو ڈانٹ دیا جاتا تھا، امی کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اُسے یہ احساس نہ ہونے پائے کہ وہ بے ماں کا بچّہ ہے۔ اُس زمانے میں مجھ میں صرف چند روز کی جُھنجھلاہٹ بڑائی تھی ــــ اور اسی سلسلے میں، اب تو وہ میری ڈانٹ پھٹکار بڑی سعادتمندی سے سہہ لیتا تھا ــــ یعنی بچپن کی بات دوسری ہے!

یوں میں کہنے کو جو چاہوں کہدوں، مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے اُس میں اپنے لئے ایک کشش کا احساس تھا اور شدید احساس! لیکن اُس کی بہتری کے خیال سے میں نے اپنے جذبے کو اور اوّلین جذبے کو دبا دیا، وہ جب اس قسم کی گہری چوٹی باتیں

سکتا، تو مجھے بڑا دکھ ہوتا۔ میں یہ تو نہ چاہتی تھی کہ وہ کسی کو نہ چاہے، مگر یہ ضرور چاہتی تھی کہ وہ کسی کے ساتھ کھیلتا۔ بس یہ۔ واقعی میں اسے بلندی پہ دیکھنا چاہتی تھی، مگر وہ تو ہر بار اتنا ہی پستی کی طرف گرتا جا رہا تھا۔

"یہ تو بھی پھسل چکا ہے" میں سوچتے سوچتے اکتا کر ایک ٹھنڈی سانس لیتی "اب شاید سنبھل سکے!" اور جیسے ڈھیلی چولوں والے پلنگ پر بیٹھنے سے چرچراہٹ سی ہوتی ہے، بالکل ویسی ہی مجھے اپنے دماغ میں محسوس ہونے لگتی ——

گرمیوں کی ایک دوپہر میں، میں بالکل تنہا تھی —— تمام گھر پہ ایک اداس سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور —— قبرستان میں شیشم کے ایک پرانے درخت پہ بیٹھی ہوئی فاختہ، اپنی مخصوص اور دکھ بھری لے میں بولے جا رہی تھی —— اللہ! دل میں کتنی دکھن سی ہونے لگتی ہے ایسے میں!

بلا وجہ! کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا، گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔ اوہ! کسی کے آنے کا بھی تو امکان نہیں! اس چلچلاتی دھوپ میں، اور نہ کہیں جانے کا ٹھکانا! ——

تنہائی کچھ عجیب رومانٹک سی ہونے کے باوجود، بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی ہو —— کبھی چاہے وہ محسن ہی ہو، اور اس کی اول جلول باتیں ——!

"ممی —— سی، ہم!" میں نے اپنے سرہانے پردوں میں سرسراہٹ سی محسوس کرتے ہوئے سوچا کہ ہوگی وہی کمبخت بلی! جب دیکھو چلی آتی ہے لاڈ کرنے، کبھی سکون ہی نہیں ملتا، مگر —— ایں! ایں —— ! یہ تو محسن تھا ——

اونہہ! اس نے خود کو آرام کرسی پہ گرا دیا، اور میں سوچنے لگی کہ اس وقت کیوں نہ میں نے کوئی اچھی سی دعا مانگ لی، محسن تو پھر کبھی فراغت میں بھی مل سکتا تھا، خیر ——

"کب آئے؟" میں نے پوچھا، "اور کیسے؟"

"ابھی آ رہا ہوں، اور یونہی ——" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"اور تمہارا کھیل —— جاری ہے کیا؟" گویا یہ بھی خیریت پوچھنے کا ایک ضروری جزو تھا۔

"خدا کے لئے کبھی تو کوئی اور بات بھی کیا کرو۔ میں یہاں اس سے بھی بھاگا" اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگی، کیا یہی وہ محسن ہے ——

—— وہی —— ہر گھڑی لڑکیوں سے کھیلتے رہنے کا شوقین!

"پھر کیسے آئے ہو؟" میں نے ڈھیل دیکر پوچھا،

"یونہی —— بس میں اس سب سے تھک چکا ہوں، اور پناہ ڈھونڈنے کو یہاں بھاگ آیا ہوں!" اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی، اور وہ بکے جا رہا تھا ——

"مگر تمہیں یہاں کوئی پناہ نہ دے سکے گا!" میں نے سفید جھوٹ بولا۔

وہ پریشان ہو اٹھا، اس کی خالی خالی نظریں، میرے چہرے پہ گڑ گئیں، اور —— "اف! وہ!" وہ بڑبڑانے لگا "کتنی تھکن ہے، جیسے بند بند ٹوٹ رہا ہے۔ جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے، دماغ میں انگارے ہی انگارے بھر گئے ہیں —— جسم پر دہکتی ہوئی سلائیاں سی پھر رہی ہیں —— ہائے! دم الجھنے لگا ہے، میں گر پڑوں گا۔ کوئی سہارا نہیں دیتا ——!"

"آخر تم چاہتے کیا ہو محسن؟" میں نے پگھلتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"محبت ——!" ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ بولا۔

"پگلے ——" میں نے کہا "تم جتنی محبت تو کسی قسمت والے کو نصیب ہوئی ہوگی"

"ہاں —— مگر اب میں خود کسی سے محبت کرنا چاہتا ہوں!"

"اور وہ سب کیا تھا؟"

"ایک مکروہ کھیل —— وقتی محبت اور محدود سکون!"

"تعجب ہے ——!"

"تعجب نہ کرو صغرا، میں واقعی اس سب سے تھک چکا ہوں اور اب ایک مستقل محبت اور لامتناہی سکون چاہتا ہوں" وہ ایک سسکی سی بھر کے کہنے لگا، اور مجھے بے چارے پہ بڑا ترس آیا۔ مگر بھلا میں کر ہی کیا سکتی تھی۔

اس کی دلچسپی رفتہ رفتہ ہر چیز سے ہٹتی جا رہی تھی۔ وہی سرخ رنگ کی ٹائیاں، جنہیں وہ پہلے بے حد عزیز رکھتا تھا، اب یونہی، ادھر ادھر بکھری رہتیں۔ وہی بڑھیا بڑھیا سوٹ جن پر کبھی محض ایک شکن دیکھ کر وہ چیں بجبیں ہو جاتا تھا، اب مسلے مسلائے سوٹ کیس کے اوپر تلے پڑے رہتے، وہی ہر گھڑی احتیاط سے تکیئے کے نیچے رکھی ہوئی پتلونیں، جن کی کریز

...ست کرنے میں وہ کتنی ہی دیر لگا دیتا تھا، اب کھونٹی پر بے ترتیبی
سے ٹنگی رہتیں، وہی ۔۔ تصویروں کا البم جس میں اس کے
جمع ہوئے کھیلوں کی بہترین یادگاریں جمع تھیں، اب کمرے
کے ایک کونے میں پڑی ہوئی میز پر ادھ کھلا سا پڑا رہتا، اس کی
... جلد پر گرد کی تہیں جمتی جا رہی تھیں، اور وہ سیاہی
اختیار کرنے لگی تھی ۔۔

وہ خود ۔۔۔ پلنگ پر تکیئے کے سہارے لیٹا لیٹا اپنی
بڑی بڑی خمار آلود اور سہمی ہوئی سی آنکھوں سے لیمپ پر
... کو جلتے جھلستے دیکھا کرتا گھنٹوں ۔۔۔ یا پھر دن بھر
... میں الجھا رہتا، ان موٹی موٹی کتابوں میں، جنہیں جیب
... سے وہ بیکار رکھ کر الماری میں بند کر گیا تھا۔

ہاں اب ہماری ایک دوسرے سے بہت کم باتیں ہوتی
... میں کچھ بولنا بھی چاہتی، تو وہ کترا کر نکل جاتا۔ ...
... سے دیکھ کر دانتوں تلے انگلی دبا لیتی، وہ ہونٹوں ہی
... بڑبڑایا کرتا، ہر وقت جانے کیا بڑبڑاتا رہتا تھا۔ امی کا
... تھا کہ یہ ضرور کوئی عمل پڑھتے رہتے ہیں، کیونکہ جب
... تویں جماعت کا امتحان دینے والا تھا، تو وہ اس
سے بس زیادہ جوش و خروش سے، مولوی صاحب کے بتائے
ہوئے وظیفے "الہم زدنی علماً" کا ورد کیا کرتا تھا، اور یہ امی
... کہتی ہیں کہ اب وہ آٹھویں جماعت میں ہو گا ہی
... نے۔ ہاں اس کا کمرہ، وہی اس کا بے انتہا سجا ہوا کمرہ
... اس قدر بے ترتیب ہو گیا تھا کہ وہاں جا کر تو میرا دم بہت
... طرح الجھنے لگتا، ہر چیز جیسے کسی گہرے دکھ میں ڈوبی ہوئی
... اور میں تو کہتی ہوں کہ میرا دل مجھے بے انتہا کھینچتا
... ہونے لگتا، جیسے میں ... کھول کر کسی ویرانے میں
... ہوں، ہر چیز سے ایک عجیب بیکسی سی ٹپکتی دکھائی
... لگتی، اور میں انہیں صاف کرنے کی بجائے
... چیزوں کا توں چھوڑ کر واپس لوٹ آتی ۔۔

"آں ۔۔ آں، یہ کیا کر رہے ہو مجن ؟" میں اس کے پیچھے
... کی پشت کا سہارا لے کر دیکھنے لگی۔ وہ اپنا البم کھولے
... میں سے تصویریں نکال نکال کر پھاڑ رہا تھا۔ "یہ سلمیٰ۔ یہ
... یہ امجدی اور یہ بلقیس!" اس نے تمام تصویریں پھاڑ ڈالیں۔

"پاگل ہو" میں نے کہا، "یونہی پھاڑ ڈالیں سب تصویریں!
اب دیکھو یہ خالی جگہ کتنی بدنما لگ رہی ہے ۔۔ ؟"
"میں انہیں پُر کروں گا۔" وہ مستور صفحے الٹتا گیا اور
تصویریں پھٹتی رہیں۔
"مگر کس کی ہے ؟"
"تصویروں ہی سے ۔"
"کس کی ۔۔۔ ؟" میں نے سوچا، تصویریں کہاں سے
لائے گا، بے چارہ تائب جو ہو چکا ہے۔
وہ لمحہ بھر کے لئے رکا، میز پہ جھک کر گردن ذرا سی موڑی
اور مجھے دیکھ کر دھیرے سے کہنے لگا۔
"تمہاری ۔۔"
اس کا چہرہ نسبتاً زیادہ پُرسکون تھا، اور آنکھوں
میں ایک قسم کی چمک تھی، بالکل ویسی ہی جیسی چاندی کے
پرانے برتن کو نکھارنے سے اس پر آ جاتی ہے۔
"حمد ۔۔۔" میں نے بن کر ڈھیلے ہوتے کہا، "تم تو کہہ
رہے تھے کہ میں اس سے تھک چکا ہوں ؟"
"اور تمہارا سہارا لینا چاہتا ہوں۔"
"کوئی نہیں ۔۔۔ یہ جال کہیں اور پھیلانا ۔۔۔ میں
تمہاری ان رنگین باتوں سے بے خبر نہیں ہوں ۔۔ آئے
تھے ۔۔۔ اونہہ!" اور میں غصے سے راستے میں آتی ہوئی ہر
چیز کو ڈھکیلتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی ۔۔۔

دو روز بعد ۔۔
"صغرا ۔۔"
"کیا کہتے ہو ؟" میرا لہجہ روکھا تھا۔
"کچھ نہیں ۔۔۔ کل میں واپس جا رہا ہوں، ذرا میری
چیزیں تو درست کر دینا ۔۔ تکلیف تو تمہیں ہو گی ہی ۔۔"
"اچھا ۔۔" میں نے بلاوجہ چڑتے ہوئے کہا۔
اس نے مجھ سے اور کوئی بات نہیں کی، جیسا خاموش
سا آیا تھا، ویسا ہی کھویا ہوا سا چلا گیا ۔۔
"وہ کل چلا جائے گا۔" میں نے سوچا، "اور میں یونہی اکیلی
رہ جاؤں گی، حالانکہ اب وہ صرف مجھ کو چاہتا ہے۔ مگر نہیں
یہی سب کچھ تو وہ ان سب لڑکیوں سے کہا کرتا تھا ...

کھلونا بنانا چاہتا ہے، معلوم کے بارے — مگر — شاید —
شاید یہ میں کچھ کہہ گئی، اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی پہ ایک ٹھنڈا سا رینگتا معلوم دیا، اور جیسے اُس نے اب تک مارا ہوا اب —

ایک روز جب میں اُس کی چیزیں درست کرنے اُس کے کمرے میں گئی، تو وہ پلنگ پہ پڑا اونگھ رہا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور اس سے پہلے کہ وہ اچھی طرح بیدار ہو، اُس کی تمام چیزیں درست کرتے رکھدیں، لیکن یہ جاتے کے باوجود بھی میں وہیں بیٹھی رہی، اور جب وہ اُٹھ کر کتابوں کی الماری کی طرف بڑھا، تو میں نے پوچھ ہی لیا،

"کب جاؤ گے؟"

"تین بجے کی گاڑی سے،" اُس نے کہا اور کتاب پڑھنے لگا! ایک دو منٹ اُلٹ کر اُس نے کتاب کو بیزاری سے فرش پر ڈال دیا، اور میرے چہرے پہ نظر جما کر کہنے لگا۔

"تم مجھے بیاہ نہیں دو گی؟"

"نہیں — میں نے اپنے مچلتے ہوئے دل کو منا کر فیصلہ سنا دیا۔

"مگر — میں — سنو تو، ذرا —" اُسکے لب یوں پھڑپھڑائے گویا وہ سب کچھ کہہ دینا چاہتا ہے۔ مگر وہ اس سے زیادہ ایک حرف بھی نہ کہہ سکا، اور اُس کی آنکھیں — وہی، ہر گھڑی موٹی موٹی گرد آلود کتابوں میں زندگی تلاش کرتی رہنے والی، ... سی آنکھیں، میرے چہرے پہ کچھ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہیں گم ہو کر رہ گئیں

اور پھر — شکست خوردہ کھلاڑی ہاتھوں میں سر تھامے کسی گہری سوچ میں غرق تھا —!

ثمرات

کرم آمادہ جو ساقی کفِ رندان میں جام آیا
جہانِ میکدہ کو زندگی کا پھر پیام آیا

حلول ہو گیا لبریزیِ ساغر زندگانی کا
مئے رنگیں نہ آئی کام خونِ دل تو کام آیا

کوئی تاریک سی تاریک ہے دنیا غلاموں کی
نگاہوں کو بمشکل اعتبارِ صبح و شام آیا

ترانے گاؤ اے رندو گھٹا میں جھوم کر آئیں
خوشی سے رقص فرماؤ کہ وقت دورِ جام آیا

حسیں ہو تم مگر یہ کیا کہیں کتنے حسیں ہو تم
تصور ہی تمہارا صورتِ ماہِ تمام آیا

رہے تھے مرتکب برسوں جو توہینِ محبت کے
انہیں ہونٹوں پہ بالآخر محبت کا کلام آیا

ترے شیشوں میں آبِ زندگانی تو نہیں ساقی
تجھی کو پوچھتا ہر طالبِ عمرِ دوام آیا

قیام اک امرِ ناممکن فنا آبادِ ہستی میں
یہ کیا سادہ دل ہے آرزو مندِ قیام آیا

ف

نگاہوں سے گرایا تھا جسے کل تک زمانے نے
زمانے بھر کو لازم آج اُس کا احترام آیا

تمنا رفعتوں کی لے اُڑی ناچیز ذرے کو
پیامِ سربلندی فاقہ کشِ دہقاں کے نام آیا

اندھیری رات ہے یہ عصرِ حاضر خیریت گذری
فروغِ بادہ اے ساقی ترے رندوں کے نام آیا

نہال سیوہاروی

صدیقہ بیگم

"اَن دیکھی راہیں"

"ہائے اللہ ـــــ کبھی اچھی خاصی مصیبت ہے۔" سلطانہ جلی بھنی کمرے میں داخل ہوئی اور دھڑام سے مسہری پر جا گری۔ میرا بھی ملنے کا حوصلہ رہ گیا۔ آخر اس کو ہو کیا گیا۔ مجھے غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی ـــــ سلطانہ نے دوپٹہ اتار کر ایک طرف پھینکا ـــــ "بڑی سی گرمی ہے دم گھٹا جا رہا ہے" اور اس نے آہستہ آہستہ عادی طور پر پھونکا جیسے اس کی یہ پھونکیں اس گرمی کا خاتمہ ہی تو کر دیں گی چہرہ معلوم نہیں تمازت آفتاب سے یا کسی اور وجہ سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا میں نے پھر ایک چمچماتی ہوئی نظر سلطانہ پر ڈالی ماشاءاللہ ـــــ کہاں یہ پردہ کی بو بو اور کہاں یہ حال ـــــ اونہہ ہو گا مجھے کیا پڑی جو جی میں آئے کرے۔ میں نے زبردستی دوسری طرف منہ پھیر کر غلاف کاڑھنے لگی اور ذہن دوسری طرح کاڑھتی رہی۔ ایک دفعہ جو غور سے دیکھا تو دو ایک پھول غلط رنگوں سے کاڑھے گئے تھے ـــــ ایک تو یہ ویسے ہی کپڑا جعلی ہے اور اب ادھیڑے سے اور بھی تار تار ہو جائے گا۔ میرا دماغ پردہ کی چہار دیواری سے نکل کر گرد و غبار ـــــ سڑکوں، میدانوں، تپتے ہوئے کھیتوں ـــــ تنگ و تاریک گلیوں میں بھٹکنے لگا ـــــ بچے جوان، بوڑھے ـــــ دنیا میں ایک مخلوق جن کے جسم کپڑوں سے بے نیاز ـــــ بے حیا ـــــ کیسی بے حیائی کی تصویریں ـــــ پر کیا کریں بیچارے لاچار ہیں۔ وہ معصوم دوشیزائیں جن کے چہرے بھی دیکھے نہ دیکھے تھے، آج اُن کے پاس ایک گز کپڑا بھی نہیں کہ اپنا جسم ڈھانپ سکیں اس لئے کہ وہ تنگ دستی کی ٹھوکروں کی زیب سا ہوا ہے ـــــ میرا جی اُلجھنے لگا ـــــ دماغ پھر کمرے کی دیواروں سے ٹکرا کر غلاف کے پھولوں میں اُلجھنے لگا کتنی دیر محنت کی اور پھر اُدھیڑ بن کر دیا ہے جیسے ایسے غلاف، پھر ایک ہو تو کوئی بات بھی ہے ـــــ محنت سے کاڑھو وہ تو ہر چوتھے دن ایک نیا چلا آ رہا ہے معلوم نہیں امی کو یہ کیا نیا مرض لاحق ہو گیا ہے ـــــ

"کیوں آپا ـــــ یہ اظہر بھائی تو ہمارے بھائی ہوئے نا!"

"ہوں ـــــ" میں نے آہستہ سے کہا، اور اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

"تو پھر ان سے ایسا پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ امی بھی بس سٹھیا گئی ہیں!"

میں خاموش ہو رہی ـــــ آخر کہتی بھی کیا۔ میری نظر پھر ریشم کے دھاگوں پر پڑی۔ اُن کو بغیر اُدھیڑے کام نہ چلے گا۔ بھلا کہیں پتیاں بھی گلابی ہوتی ہیں؟ اور میں ان گلابی پتیوں کو ادھیڑنے لگی ایک بار یونہی پھر نظر سلطانہ پر جا پڑی وہ تو لال انگارہ سی ہو رہی تھیں ـــــ میں نے پھر پھول پر نظریں گاڑ دیں۔ اور کچھ دن پہلے کے واقعات ریشم کے دھاگوں کی طرح آپ ہی آپ اُدھڑنے لگے، یہی کمرہ تو تھا ـــــ اور آج ہی کی طرح ـــــ جب اظہر بھائی آتے ہوئے تھے اُنھوں نے آتے ہی دروازہ پر آواز دی۔ اور امی نے مجھے دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہوں ـــــ دڑبے ـــــ دڑبے ـــــ دڑبے ـــــ جہاں ذرا سلیپر پہننے میں دیر ہوئی اور اُنھوں نے للکارا "بعیر جوتے کے تو بیگم صاحب سے ہلا ہی نہیں جاتا۔ خصم کے یہاں ارے جوتے ہی تو کھڑائیں گے ـــــ"

"جوتے ـــــ جوتوں کی کیا کمی ـــــ اعمال چاہئیں۔" سلطانہ پٹاخ سے باورچی خانہ سے بولی ـــــ میں جھنجھلا گئی ـــــ اور یہ امی تو بس ادھر اظہر بھائی کی آواز آئی اور اُن کے تو جیسے ڈول کا پانی نکلا ـــــ میرا دل آپ کباب ہو رہا تھا اور پھر دیکھوں، تو پیچھے سے سلطانہ چلی آ رہی ہیں ـــــ گرتی پڑتی ـــــ اس ہرن کی طرح جس کا شکاری کتے پیچھا کر رہے ہوں۔

"آپا ـــــ وہ ـــــ اظہر بھائی آتے ہیں!"

"تو میں کیا کر دوں ـــــ بس آگئیں کان کھانے!" مگر میرے اس تُرش جملے پر بھلا سلطانہ چُپ رہنے والی تھی!

"میں باورچی خانہ میں تھی ـــــ کسی نے بتایا بھی تو نہیں۔ کتنی دیر دھوئیں میں گھٹتی رہی امی تھی تو ادھر نہ آئیں جہاں

ری پوچھ لیتی کنکھیوں سے میں، آخر خود ہی جھانک کر دیکھا، وہ
پڑھی مولوی دیکھ رہے تھے بس میں جھپٹ کر کمرے میں
گھس آئی۔

سلطانہ تھوڑی دیر خاموش رہی اور متوقع نظروں سے
دیکھتی رہی کہ میں بھی کچھ اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں مگر
مجھے چپ دیکھ کر سلطانہ سے چپ نہ رہا گیا۔

"اور آپا —— یہ امی کو دیکھو فرماتی ہیں —— سلطانہ
بی تو کہاں جا رہی ہے۔ یہ دیکھو بھیا آیا ہے۔ بس ایسی باتیں
کرتی ہیں کہ غصہ ہی آتا ہے۔"

پھر وہ اطمینان سے بیٹھ گئی۔ اس کی سانس کی تیزی
بھی کم ہو گئی تھی۔

"مگر تجھے کیا پڑی ہے پردہ کرنے کی۔" بغیر بولے
مجھ سے رہا بھی نہ گیا۔

"نہیں تو کیا سب کے سامنے پھروں" وہ جھنجھلا گئی۔

"ہاں اب تو جوان ہو گئی ہے نا۔" میں نے بھی جل کر کہا۔
پھر وہ چپ ہو گئی شاید یہ سوچ کر کہ کون ان کے منہ لگے مگر
جوانی بھی عجیب چیز ہے جہاں جاؤ سایہ کی طرح ساتھ ساتھ
—— اندھیرے میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے مگر کیا
مجال جو ایک لمحہ کے لئے بھی پیچھا چھوڑ دے۔

پھر اطہر بھائی کے بولنے کی آواز سنائی دی —— —
باتیں تو جب تو جب بھائی جان ہوں۔ بھلا ان امی سے
کیا باتیں کریں جن کے منہ میں دانت تک تو ہیں نہیں۔
بک بک تو بولتی ہیں —— کیا اچھا ہوتا جو میں
پردہ نہ کرتی ہوتی —— مگر یہ امی ایسی بھولی کہاں سچ مچ
کتنی باتیں کیا کرتی ہیں اطہر بھائی سے۔ اور پھر تو وہ بھی
امی سے بات نہ کرتے کیا مزا آتا ہوگا بچاروں کو مجھے تو سوچ کر
ہنسی آتی ہے۔ ان بڑھیوں کی باتیں بھی کیا جیسے بگڑی ہوئی
چکی —— پھکر —— پھکر —— کر رہی ہو۔

اطہر بھائی نہ جانے اب بھی مجھے یاد کرتے ہیں ——
کرتے کیوں نہ ہوں گے پر کس سے کہیں —— وہ کیا جانیں میں
کتنا یاد کرتی ہوں —— ہزار بھی چاہتا ہے کہ اٹھ کر کواڑ
کی درز سے جھانکوں۔ پر یہ بیگم جو بیٹھی ہیں پردہ کی بو بو۔
کمبخت جوانی تو ابھی سے پیچھا پڑ رہی ہے۔ یہ نہیں کہ بچوں کی

طرح کھیلتی پھرے۔ یہی تو کھیلنے کے دن ہیں پھر تو آپ ہی گھٹ گھٹ
کے مرنا پڑیگا۔ تب پتہ چلے گا دال آٹے کا بھاؤ، ابھی تو شوق
میں مری جا رہی ہیں —— مجھے اس کی ان حرکتوں پر غصہ بھی
آتا اور بعض وقت ہنسی بھی۔ چار انگل کی تو ہیں آپ ابھی سے
پردہ، مرا بس چلے تو اس کا منہ ہی کچل دوں۔ بڑے اطمینان
سے پڑی ہوئی ہیں جیسے اس لڑائی کی فتح کا سہرا انہیں کے
سر تو بندھا ہے۔

"کیوں آپا —— یہ برقعہ کے گز میں بنتا ہے؟"

میں نے چپ سادھ لی —— پر اسے کہاں چین۔ کتنے دن
سے امی سے کہہ رہی ہوں کہ برقعہ بنوا دو مگر ان کے کان پر
جوں تک نہیں رینگتی، ان کے حساب جا ہے ننگی پھروں۔"

مجھے پھر غصہ آیا جیسے آپ بڑی ننگی ہی تو پھر رہی ہیں
اچھی ہے بی بی جب تک یہ مصیبت نہیں آتی —— صبح شام بس
یہی رٹ لگی رہتی ہے۔ برقعہ نہ ہوا کھیل تماشہ ہو گیا جہاں
امی بیٹھیں وہیں برقعہ کا ذکر —— ان کے موڈ کا بھی تو لحاظ
نہیں کرتی کہ وہ جلی بھنی چولھے کے سامنے سے آ رہی ہیں اور
یہاں —— بس امی پانچ گز کپڑے میں ہو جائے گا۔ حد سے
حد پندرہ روپے لگیں گے پندرہ کچھ ہوتے ہی نہیں اور وہ
بھی نگوڑے برقعہ کے لئے، کوئی اچھی چیز ہو تو ایک بات بھی۔
پہننے کو تو ٹھکانے سے کپڑا ملتا نہیں اور ان کے برقعہ کے لئے
کہاں سے آئے۔ پانچ گز کپڑا۔ اطہر بھائی بتلاتے تھے کہ جس
طرح بنگال سے چاول اڑ گیا تھا اسی طرح اب کپڑا ناپید ہو گیا۔
میرے اللہ یہ چیزیں کہاں چلی جا رہی ہیں۔

"آہا —— آپا!" میں چونک پڑی

"کیا ہے —— اور اس روز رضیہ نے کتنی مرتبہ آدمی بھیجا۔
چلی کیوں نہیں گئی!"

"تو تم ہی چلی جاؤ نا —— میں تو اس طرح کھلے بدن نہیں
جاتی —— میں تو اللہ قسم دروازے کے باہر قدم نہ رکھوں۔"

دیکھو تو اس لڑکی کو کیسی بڑھ بڑھ کر باتیں بناتی ہے جیسے
میں دن بھر پھرتی ہی تو رہتی ہوں ادھر امی کی یہ حالت ہے کہ
دروازے تک تو جانے نہیں دیتیں ذرا نظر سے ہٹی اور الھوتی
چلی پکار لگائی۔

"نعیمہ —— کہاں چلی گئی جب دیکھو جب دروازہ میں ٹنگی

رہتی ہے بہو بیٹیوں کے یہ طور طریقے بھی کہیں دیکھے ہیں!" ایک منٹ کے لئے جا کھڑی ہوتی تو جیسے دن بھر ہی تو دروازے میں ٹنگی رہتی ہوں جیسے مجھے اور کوئی کام ہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہیں گئی تھی تو رضیہ کے گھر تک ——— وہ بھی بڑی مشکل سے۔ امی گھر سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتیں۔ مجھے بھی غصہ آگیا چاہے کچھ بھی ہو آج تو میں رضیہ کے یہاں اکیلی جاؤں گی۔ جھٹ میں نے برقعہ اٹھایا اور چل پڑی مگر وہ تو میرے دم کے ساتھ ہے۔ ایک سکنڈ کو پیچھا چھوڑ دے۔ دیکھوں تو پیچھے پیچھے چلی آرہی ہیں گھسٹ ——— گھسٹ کرتی ہوئی

"اب کیوں چلی آئیں ———؟" میں نے جل کر کہا

"تو کوئی بے پردہ تھوڑا ہی آرہی ہوں۔ امی کا برقعہ لے کر آئی ہوں۔ دیکھتی نہیں ہو ٹانگوں میں اٹکا ہوا ہے"

"ہاں ——— میری رفتار میں جیسے سستی آنی جاتی تھی اور وہ سستی سے دوڑنے لگتی اور میرے برابر آجاتی غصہ میں میں نے بات تک نہیں کی میں آپ تھکی جا رہی تھی ——— میں نے نقاب الٹ دیا ———

"میں بھی نقاب الٹے دیتی ہوں کوئی اکھوڑا ہی رہا ہے" اس نے نقاب الٹتے ہوئے کہا۔ جیسے ساری دنیا کی جوانی انہیں پر ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو ہوئی ہیں اور ابھی سے یہ حال ہے گھر میں اچھی خاصی آفت مچا رکھی ہے جب تک یہ بڑی بی اندر نہ چلی جائیں کیا مجال جو کوئی گھر میں پر تو مار لے جیسے کوئی آئے گا بھی تو انہیں کو دیکھنے کے لئے اور جب سے پردے کا ڈنکا بجا ہے ایک نئی مصیبت کھڑی ہوگئی ہے ——— اطہر بھائی آئے اور آپ جھٹ اندر۔ کبھی جی چاہے تو بھاگ کر بھی تو نہیں سکتی، مزاج اکھڑنے لگا۔ یہ نہ ہوتی تو دیکھتی ان کی آنکھیں تو سچ مچ جب وہ اپنا کہا ہوا کوئی شعر گنگناتے ہیں تو جیسے ادھ کھلی سیپیاں وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے کتنے سپنے چھلک جاتے ہیں۔ بہت جی چاہتا کہ دیکھوں پر سلطانہ کو دیکھ کر ہمت نہ پڑتی اور میں پھر سر جھکا کر اپنے کام میں لگ جاتی۔

"کیا بات ہے سلطانہ ——— آج تو بڑا غصہ آرہا ہے" مجھے اس پر کچھ رحم سا آیا۔

"تمہیں کیا ——— تم اپنا کام کرو ———" یہ کہہ کر سلطانہ نے پھر دوپٹہ سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

آج تو یہ حال ہے ——— اور اس روز ——— میری آنکھوں کے سامنے پھر وہی تصویر پھر گئی جب ہم دونوں جتنے ہی ایکدم سے نزدیک تھے اتنے ہی دور بھی۔ میں غصہ میں چلی جارہی تھی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اسے تیز کہ اکثر ڈگمگا جاتے ... آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی جیسے وہ بھی غصے سے لرز رہا ...

"آپا ——— دیکھو کوئی آرہا ہے۔ نقاب ڈال لو"

"آنے دے ——— تو نے تو ڈال لیا بس کافی ہے" میرا غصہ در چڑھ گیا ہوئے دو کوئی ہوگا تو کیا کریگا۔ دیکھ ہی تو لیگا بس ——— ویسے تو میں ہمیشہ نقاب ڈال لیتی تھی کم از کم اس پر تو فائدہ ہے ہی کہ ہم سب کو دیکھیں اور ہمیں کوئی نہ دیکھے مگر کبھی تو برا ہے مگر مجھے بھی ضد ہوگئی تھی کچھ ہو پر آج ایسے ہی جاؤں گی چاہے طالب علموں کا پورا قافلہ ہی سر پہ کیوں نہ آجائے۔

"آپا ——— اب تو مکان بہت ہی قریب آگیا ہمیں کیا ہوگیا؟ امی سنیں گی تو کیا کہیں گی" میں چونک پڑی خیالات کو دھچکا لگا۔ جیسے ریل گاڑی چلتے چلتے یک بارگی رک جائے سچ مچ یہ لڑکی بڑی وہ ہے، کہیں امی سے نہ ٹانک دے جیسے پھر آپ ہی آپ نقاب سرک جائے۔ چاند میں تھا پر بادل اس پر خود ہی سرک آیا۔ آگ پر پانی پڑ چکا تھا، آنچ ختم ہو گئی تھی۔ صرف دھواں ہی دھواں نظر آرہا تھا۔ میرا غصہ شرمندگی سے بدل چکا تھا۔ میں خاموش چلی جارہی تھی، دماغ میں سکون تو نہ تھا پر ایسا خلا جس کو پر کرنے کے لئے کوئی خیال قریب آنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا ——— میں اسی طرح چلتی رہی۔

"آپا ——— آج تمہیں کیا ہوگیا۔ کتنی دور نکل آئیں، اب یہاں کون دھرا ہے جو آپ نقاب ڈالے ہی چلی جا رہی ہیں"۔ سلطانہ نے بات کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ سامنے رضیہ کا مکان تھا۔ میری عجب حالت تھی ——— "لڑکی ———" میں نے گھور کر سلطانہ کی طرف دیکھا، وہ تیزی سے مکان میں گھستی ہوئی رضیہ کے کمرے میں چلی گئی۔

"آپا ——— ہائے ہائے بھئی تم آگئیں۔ کتنی دیر سے تم دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ انجم اور نسیمہ آئی ہوئی ہیں سب ہی تو

...چھپ رہی تھیں" یہ کہتے ہوئے رضیہ سلطانہ کو لپٹ گئی۔
آمد تو ایسی تھی نخرے کرنے کی لونڈیا سا دھو — برقعہ ہلاتی ہوئی
آئی ہیں بڑی بی" مجھے ہنسی آ گئی سلطانہ کی نظر مجھ پر پڑی،
اس کا [illegible] خوش ہو گیا۔ میرا جی چاہا کہ خوب زور سے قہقہہ
لگاؤں۔

پھر اس نے برقعہ ایک طرف کو ڈال دیا اور کرسی پر جم کر
بیٹھ گئی۔ دوپٹہ نیچے کو سرک گیا تھا، وہ جھینپ گئی اور اٹھا کر
آہستہ سے سر پر ڈال لیا۔ اس وقت نہ جانے کیوں وہ جھینپی
جھینپی سی ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے جسم کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔
سنوارتے سنوارتے بھی بالوں کی ایک لٹ چہرہ پر بکھر گئی۔ ایسا
معلوم ہوا جیسے وہ پسینے میں تر بتر ہو گئی۔ اس نے کنکھیوں
سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، پھر
سر پر جما لیا۔

"آپا — آخر کب تک گھٹتے پڑے رہیں۔ کوئی حد بھی ہے
اس پردے کی!"

جیسے ایک دم مجھے کسی نے غار میں دھکیل دیا۔ ماضی کے
[illegible] لوٹ چکے تھے۔ میرے سامنے سلطانہ مسہری پر لیٹی تھی۔
دوپٹہ ایک طرف کو پڑا ہوا تھا اور وہ اپنے شانوں کی مچھلیوں
کو گھور رہی تھی۔ میری نظر پڑتے ہی وہ جھینپ سی گئی اور پہلی
مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ اب سلطانہ وہ سلطانہ نہیں ہے
اتنے میں امی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"لے سلطانہ یہ تیرا برقعہ سل کر آ گیا!"

سلطانہ نے [illegible] کر برقعہ لے لیا۔ امی جس تیزی سے داخل
ہوئی تھیں اسی تیزی سے نکل گئیں۔ میں نے برقعہ دیکھنے کے لیے ہاتھ
بڑھایا ہی تھا کہ سلطانہ نے اُسے دور پھینکا۔

"یہ پردہ — پردہ — ناک میں دم آ گیا اس پردے
سے تو!" اور سلطانہ چارپائی پر اُلٹ گئی۔ میں آہستہ سے دروازہ
کے پاس گئی۔ جھانک کر دیکھا، اطہر بھائی سامنے لیٹے ہوئے
کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔

"کیوں آپا — اطہر بھائی گئے۔" یہ کہتے ہوئے سلطانہ جھٹ اٹھی
اور [illegible] سے جھٹکنے لگی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے برسوں کے پڑے ہوئے
[illegible] اٹھ گئے ہوں سامنے سے بادل کا ٹکڑا ہٹ گیا تھا اور نیر صاف
[illegible] جیسے سورج کی گرم گرم کرنوں نے زمین اور آسمان کو [illegible]

عمرِ گریزاں

زمیں کے سینۂ پُرشور کا مہیب اُبھار
کدھر سے توسنِ گیتی پہ چڑھ کے آئے سوار
یہ سربریدہ پہاڑ!!
جلے جھکے سے، ابھی جلنے والے، جلتے ہوئے —

جواں خرامئ ایامِ شب کو بیں سہی
مگر — یہ بوجھ کے نیچے دبی دبی گردن
ابھی سے منزلِ آسودگی کو ڈھونڈتی ہے

کبھی یہ سینہ تھا شفاف آنسوؤں کی طرح
حدِ نگاہ تک اک سیلِ آب — آب ہی آب
نہ سلوٹیں، نہ شکن، اک چادرِ مہتاب
مگر — یہ عالمِ طفلی کے خواب تھے شاید
شباب آیا تو رنگِ مزاج ہی بدلا
بدلنے والی ہر اک سے بدل ہی جاتی ہے
تغیرات کی قسمت میں ہے دوام، تو ہو
نظر فریبئ غم کا علاج کوئی نہیں
فریبِ ہست کی جھوٹی نیرنگیوں کی قسم
نشانِ منزلِ آسودگی نہیں ملتا
پہاڑ مُہر بلب اور ندیاں خاموش!!
کدھر ہے خسروِ تاریخ سامنے آئے
عبارتیں کہ پھر آج اپنا آپ دُہرائے
مہیب آندھیاں پُرشور زلزلے، طوفاں
عجب نہیں کہ زمیں آسماں سے ٹکرائے

ہر ایک شے یونہی تاریخ کے دھندلکوں میں
نشانِ منزلِ آسودگی کو ڈھونڈتی ہے

سید فیضی

شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

جرعات

ششماہی چندہ [illegible]
قیمت فی پرچہ [illegible]

جلد ۳۲ | ساقی دہلی کے بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۵ء | نمبر ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہد احمد دہلوی

نگاہِ اولیں

ساقی کی گذشتہ اشاعت میں ہم نے بتایا تھا کہ نئے مضمون نگاروں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی ساقی کی ایک خصوصیت ہے۔ چنانچہ ایک کثیر تعداد آج کل کے عمدہ لکھنے والوں کی پیش کرنے کا فخر ساقی کو حاصل ہے۔ ادب کی زندگی اور ترقی کا ضامن یہی نیا خون ہے۔ ساقی کی ہر اشاعت میں آپ کو دو ایک نئے نام نظر آئیں گے۔ ان میں بعض بہت پرانے لکھنے والے ہیں مثلاً پرنسپل مشتاق احمد زاہدی جو کم و بیش چالیس سال سے علم و ادب کی خاموش خدمت کر رہے ہیں۔ زاہدی صاحب دلی کے معتقد اہلِ کمال میں سے ہیں اور ہر مہینے ساقی میں ان کی شمولیت ہمارے لئے باعثِ افتخار رہے۔ "فضل" نے اپنا مضمون محاذِ جنگ سے بھیجا ہے۔ اِن کا مضمون پڑھ کر رفیق حسین مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی۔ واقعات کی ایسی تفصیل جو افسانے سے زیادہ دلچسپ ہو کم دیکھنے میں آتی ہے۔ مفتون احمد کا افسانہ "لا متناہی" جدید رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر نصیر الدین نے "محبوبہ" کے گذشتہ اور موجودہ حالات کا دلچسپ جائزہ لیا ہے موصوف ساقی کے پرانے معاون ہیں اور دو سال کے سکوت کے بعد رجوع ہوئے ہیں۔ ناصر شمسی بھی ساقی میں پہلی دفعہ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ڈرامہ سے انہیں خاص دلچسپی ہے۔ اُردو میں ڈرامہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمارے ادیبوں کو بطورِ خاص اس صنفِ ادب کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ تفضلی صاحب نے کئی سال کے بعد افسانہ لکھا ہے جس طرح اُن کی غزلوں میں ایک ندرت ہوتی ہے افسانوں میں بھی ایک جدت ہوتی ہے۔ حکیم حبیب اشعر کے عربی سے اور محمد یونس احمر کے بنگالی سے ترجمے ہمارے ادب میں قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سالنامہ ساقی:۔ جنوری کے پہلے ہفتے میں شائع ہوگا۔ اس کے لئے مضامین فراہم کئے جا رہے ہیں اُردو کے بہترین انشا پردازوں اور شاعروں سے قلمی اعانت کی درخواست کی گئی ہے، اور چند مضامین موصول ہو چکے ہیں جن کا اعلان اسی پرچے میں کہیں اور کر دیا گیا ہے۔ شائقین منتظر رہیں اور نومبر اور دسمبر کے پرچوں میں مزید مضامین کا اعلان ملاحظہ فرمائیں۔ حکومت نے کاغذ کا کوٹہ بڑھا دیا ہے، اس لئے اُمید ہے کہ ۱۹۶۶ء کا سالنامہ گذشتہ پانچ سال کے سب سالناموں سے بھاری ہو جائے گا۔

نواب سراج الدین احمد خاں سائل

ستمبر کے وسط میں وضعدار دلی کی بساط کا آخری مہرہ بھی ہم سے چھن گیا سائل دلی میں رہتے تھے، نواب لوہارو کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ لوہارو سے وثیقہ پاتے تھے۔ نواب مرزا داغ کے داماد تھے۔ بڑے خوبصورت اور وجیہہ آدمی تھے۔ اگلے دلی والوں کی ساری خوبیاں ان میں تھیں۔ شعر و شاعری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ قدیم رنگِ سخن کے رسیا تھے، دلی کی زبان اور بیان ان کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، اور حق یہ ہے کہ اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوا کے چھوڑا ہندوستان بھر میں انکی اُستادی اور بزرگی مسلم سمجھی جاتی تھی۔ سات دیوان انکی یادگار ہیں جن میں ہزاروں غزلیں ہیں مگر افسوس کہ انہیں چھپوانے کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔ کئی سال سے ایک مثنوی "جہانگیر اور نور جہاں" کے تاریخی رومان پر لکھ رہے تھے جو مکمل ہو جاتی تو نظم اُردو میں ایک شہ پارہ قرار دی جاتی۔ افسوس کہ وہ ناتمام رہی اور اسکی تکمیل کسی اور سے بھی ناممکن ہے۔ سائل نے ترنم کا ایک نیا ڈھنگ ایجاد کیا تھا جس کی نقل جیتے جی کسی سے نہ اُتر سکی تو اب بھلا کیا اُترے گی۔ ع وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو عنبریں کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔ آمین!

نہال سیوہاروی؛

ماتمِ سائل

نوٹ:- نواب سراج الدین احمد خاں سائل ابن نواب شہاب الدین خاں ثاقب برادر نواب ضیاء الدین خاں نیّر درخشاں۔

ہے جوشِ غم ہمہ تن بے قرار ہے دہلی
کسی دکھے ہوئے دل کی پکار ہے دہلی

فغاں کا عالمِ شعر و سخن سے شور اٹھا
گری چمن پہ وہ بجلی، چمن سے شور اٹھا

رہینِ نوحہ گری ہر ادب شناس ہوا
دیارِ غالب و مومن اُداس اُداس ہوا

ظہورِ ظلمتِ غم بزم بے چراغ سے ہے
بلند شورِ بکا سرزمینِ داغ سے ہے

دلِ جہاں پہ قیامت گذر گئی یارب
ضیائے نیّرِ رخشاں کدھر گئی یارب

جفائے خنجرِ دوراں سے دل فگار ہوں میں
ندیم! جام اٹھا لے کہ سوگوار ہوں میں

نکاتِ فن کئے اک عمر جس نے حل، نہ رہا
دریغ! ساقیِ میخانۂ غزل نہ رہا

زدیدہ موجۂ خونناب حاصل است مرا!
چہ دشنہ در جگر از مرگِ سائل است مرا

بلند رتبہ و عالی مقام تھا سائل
جہانِ شعر و ادب کا امام تھا سائل

سخنوری میں مسلّم وقار تھا اُس کا
ہر ایک شخص عقیدت گذار تھا اُس کا

وہ کیف بار و حیات آفریں غزل اُس کی
بہارِ تازہ کی صورت حسیں غزل اُس کی

وہ مثنوی میں طبیعت کا رنگِ جولانی
فرازِ کوہ سے بہتا ہو جس طرح پانی

جُدا زمانے سے اسلوب شعر خوانی کا
ہر اک زباں پہ وہ ذکر اُس کی خوش بیانی کا

اسیرِ خوابِ اجل نغمہ خواں ہوا صد حیف
خموش طوطیِ ہندوستاں ہوا صد حیف

بیاں نہ ہو وہ مصیبت ہے رحلتِ سائل
وداعِ خلق و مروت ہے رحلتِ سائل

ترے فراق میں خوں گشتہ ہر جگر ہے آج
شبیہِ غالبِ مرحوم تو کدھر ہے آج

گذر جہاں تھا وہ راہیں تلاش کرتی ہیں
ترے وطن کی نگاہیں تلاش کرتی ہیں

جھلکیاں

عسکری

میں شاید پہلی دوسری یا تیسری جماعت میں پڑھتا تھا ہمارے ایک ساتھی تھے جو بعد میں حیرت سے حکیم ہوئے۔ لیکن انھوں نے اُسی زمانے میں ایک نسخہ تصنیف فرما دیا تھا، اور نسخہ بھی کیا، اسے تو معجزہ کہنا چاہیئے، کوئی مرض اس کی زد سے باہر ہی نہیں تھا۔ اُس وقت تو اُنھیں اپنی جدت طبع کی داد ملتی ہی کی چھڑی سے خوب ملی، لیکن شاید یہ نسخہ ایسا طبع زاد بھی نہیں، بلکہ مدرسوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ بہرحال چونکہ اس کے فوائد ایسے گوناگوں ہیں اس لئے آپ کے کان میں بھی پڑ جائے تو اچھا ہی ہے۔ نسخہ حرف بحرف نقل ہے۔

گاڑی کی چوں چوں دو سو من، چرخے کی گھوں گھوں پانچ سو من، مچھر کا کلیجہ، سات سو من، مکھی کا بھیجا نو سو من، ان سب اجزا کو اچھی طرح کوٹ کر کنجڑے کے لنگوٹے میں چھانا جائے اور پھر استعمال میں لایا جائے، انشاء اللہ ہر مرض کے لئے تیر بہدف ثابت ہوگا۔

ایک ایسا ہی مجرب اور خاندانی نسخہ ترقی پسندوں کے پاس بھی ہے۔ یہ نسخہ "ہُوَ المارکس" سے شروع ہوتا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:۔ طبقاتی کشمکش، مادی جدلیات، ذرائع پیداوار اور اسی قسم کی دوسری کھادیں۔ رہا سوال نیچر کے لنگوٹے کا، تو وہ کسر کاڈویل کی کتاب "Illusion And Reality" سے پوری ہو جاتی ہے۔ بس یہ دو چار چیزیں آپ کو ازبر ہو جائیں تو پھر تو یہ سمجھیے کہ آپ کو اسم اعظم آ گیا، عقل کا حملہ ہو یا احساس کا شبخون، سب سے مکمل محافظت ہو گئی۔ سیاست، معاشیات، فلسفہ، مذہب یہاں تک کہ ادب، جس سرزمین میں جی چاہے دندناتے پھریئے، سب راستے آپ پر کھلے ہوئے ہیں، یہ نقشہ ہر جگہ آپکی رہنمائی کرے گا۔ بلکہ اصلی ترقی پسند تو وہ ہے جو جان جان کر اینڈی بینڈی بھول بھلیوں میں اپنے آپ کو پھنسائے، اور پھر ذرا میں ہنستا کھیلتا باہر نکل آئے اور اس کا سانس تک نہ بگڑا ہو۔ بس یوں سمجھیے کہ ترقی پسند لفظ بہ لفظ سیموئیل بٹلر کے ایروہون کے عالم دین کی طرح ہیں:

"آپ جناب بڑے بڑے نازک اور گہرے شکوک پیدا کر سکتے تھے اور پھر انھیں یوں چٹکی بجاتے میں حل کر کے رکھ دیتے تھے، گویا علم الٰہیات نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو یہ کھجلی کا روگ لگایا تھا تاکہ کچھ کھجوانے ہی میں لطف آئے، یا پھر سڑک کے حکیموں کی طرح اپنے ہاتھ سے اپنے جسم میں ان زبردست شکوک و شبہات کے خنجر بھونک لئے تھے یہ دکھانے کے لئے کہ عقیدے کے زخم کتنی آسانی سے اچھے ہو جاتے ہیں!"

خیر، جہاں تک سائنس، معاشیات، سیاست، فلسفہ مذہب وغیرہ کا تعلق ہے وہاں تک تو مجھے دم مارنے کی مجال نہیں ان چیزوں میں تو میں ترقی پسندوں کو بالکل مولوی محمد اسمٰعیل کی چیونٹی سمجھتا ہوں —— بڑی عاقلہ ہو بڑی دوربیں ہے۔" یہاں ترقی پسند جو کچھ کہہ دیں مجھے سب تسلیم ہے ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر ہود ز راہ و رسم منزلہا

ممکن تھا کہ ادب اور آرٹ کے سلسلے میں بھی میرا یہی رویہ ہوتا، لیکن مشکل یہ آ پڑتی ہے کہ یہ معاملہ سرے سے "منزل" کا ہے ہی نہیں، یہاں تو "بے خبری" سے زیادہ کام چلتا ہے سیاست یا معاشیات کی طرح یہ سمجھنے اور سمجھانے کا قصہ ہی نہیں۔ نہ آرٹ کوئی دلیل یا اُقلیدس کا مسئلہ ہے (جسے ساتویں کلاس کے لڑکے تک سمجھ سکتے ہیں) آرٹ تو ایک تجربہ ہے، یہ ایسی چیز نہیں جسے محض تحلیل و تجزیہ، محض دلیل، محض معلومات، یا محض "علم" کے ذریعے سے طے کیا جا سکے، بلکہ شاید "عالم" ہی وہ لوگ ہیں جو دروازہ کھٹکھٹاتے کھٹکھٹاتے ڈھیر ہو جائیں، لیکن اندر بار نہیں پا سکتے۔ مگر اطمینان کی بات یہ ہے کہ عالم کبھی دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ آرٹ کے معاملے میں علم سے زیادہ وہ جہل کا آمد ہوگا جو آرٹ کی ایک الگ ہستی

ایک مستقل انفرادیت تسلیم کرتا ہو، وہ جہل جس میں اتنی صلاحیت ہو کہ آرٹ کی عزت آرٹ کی حیثیت سے کر سکے۔ چونکہ بے پایاں جہل کے ساتھ ساتھ مجھ میں آرٹ پر اس قسم کا اندھا اعتماد بھی موجود ہے اس لئے میں بھی ادب کی بحث میں ٹانگ اڑا بیٹھتا ہوں۔ میں یہ قطعاً دعویٰ نہیں کرتا کہ میں وہاں باریاب ہو چکا ہوں جہاں سے عالموں کو بھی مایوس لوٹنا پڑتا ہے۔ آپ نے غالباً اناطول فرانس کا وہ مشہور افسانہ تو پڑھا ہی ہوگا — جس رومی حاکم کے حکم سے حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا، اس کے بڑھاپے میں ایک دوست اس سے حضرت عیسیٰ کے بارے میں پوچھتا ہے، وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے یاد نہیں یہ کون آدمی تھا! بالکل یہی حال میرے پڑھنے کا ہے، میں نے بھی ہر صفحے پر حسن کا اسی بے دردی سے خون کیا ہے، لیکن مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ پھر بھی میں کچھ نہ کچھ کہنے کی جرأت کر لیتا ہوں کیونکہ اس نالحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ کے زمانے میں نہ ہی جھجکنے کی کون بڑی ضرورت ہے۔

ادب میں حقیقت کے تصور کا مسئلہ ایسی چیز نہیں تھی جس پر قلم اٹھانے کی میں پچاس سال کی عمر سے پہلے ہمت کرتا۔ لیکن ترقی پسندوں نے مجبور ہی کر دیا۔ اب تک تو یہ حضرات ذرا صاف صاف لفظوں میں باتیں کرتے تھے، لیکن چونکہ لوگ ایک ہی بات کی رٹ لگاتے چلے گئے، اس لئے گھما پھرا کر بات کہنا اور مابعد الطبیعاتی قسم کا خلفشار پیدا کرنا لازم آیا۔ لیکن مرغے کی ٹانگیں اب بھی ایک سے دو نہ ہوئیں۔ سیاست ہو یا فلسفہ یا ادب، حقیقت کے معنی ہر جگہ ایک ہی رہتے ہیں — جدلیاتی مادیت اور طبقاتی کشمکش۔ میرا دماغ خود ایک خلفشار ہے جس کی تربیت و تہذیب میں نے کبھی نہیں کی، اس لئے میں حقیقت کے مفہوم پر کوئی فلسفیانہ یا منطقی بحث کرنے سے قاصر ہوں، لیکن کم سے کم اتنا تو مجھے بھی محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت کا مفہوم زندگی کے ہر شعبے میں ایک نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعین تو حقیقت کے شاہد کی شخصیت، اس کا نقطۂ نظر اور اس کی ضرورتیں کرتی ہیں — ضرورتوں سے مطلب مادی ضرورتیں نہیں، لیکن جدلیاتی مادیت کے ماننے والوں کے سلسلے میں مادی ضرورتیں، مثلاً قوم کا رہنما بننے کی خواہش۔ سیاسیات، معاشیات، فلسفے یا زندگی کے اور شعبوں میں حقیقت کا کیا تصور ہوتا ہے یا کیا تصور ہونا چاہیے، اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں، میں نے ان چیزوں کا کبھی سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہی نہیں۔ البتہ ادب میں حقیقت کے تصور کے متعلق میں کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں بھی میں حقیقت کا کوئی بندھا ٹکا یا نپا تلا معیار پیش نہیں کر سکتا۔ میں پہلے ہی کہہ آیا ہوں کہ ادب کا آپ اس طرح تجزیہ نہیں کر سکتے جس طرح کمیونسٹوں کی سیاست کا کر سکتے ہیں۔ یہاں تو آدمی مبہم اور پراسرار الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ بلکہ میں تو کوشش کروں گا کہ ادب میں حقیقت کے مفہوم کو جتنا سیال اور غیر مرئی بنا سکوں اتنا ہی اچھا ہے۔ ادب میں حقیقت کا اور چاہے سو کچھ مفہوم ہو، لیکن کم سے کم یہ نہیں ہو سکتا:

چھ رہنے کہیں چار دن کے یہ سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے

اس میں شک نہیں کہ ایک زمانے میں فرانسیسی فطرت نگار اسی کو حقیقت سمجھتے تھے، اور ترقی پسند اس پر صرف ذرا سا اضافہ اور کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ شاعر اس کے آگے ایک جملہ اور بڑھا دے — ایک دن ایسا آئے گا جب یہی جھونپڑے محل بن جائیں گے۔ بس جس شاعر نے یہ جملہ بڑھا دیا، اس نے حقیقت کو پوری طرح سمجھ لیا، اور اس کی ترجمانی بھی کر دی۔ اگر یہ شاعر کمیونسٹ پارٹی کو چندے میں پچیس روپیہ اور بھیج دے تو وہ ملک کا سب سے بڑا شاعر ہو جائے گا۔

سر صاحب، یہ تو رموزِ مملکت خسرواں ہیں، فی الحال آپ ایک گدائے گوشہ نشیں کی بات سنیئے۔ کم سے کم میں تو یہ سمجھا ہوں کہ آرٹسٹ کے لئے حقیقت نہ تو جھونپڑے ہیں نہ محل، نہ کمیونسٹ اعلان نامہ۔ اس کے لئے تو حقیقت ایک احساس ہے، ایک سنسنی، ایک سرمستی، ایک ہسٹریا کا دورہ، یا جسے شیکسپیئر نے [illegible] کہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ آرٹسٹ کے لئے شعور اور حقیقت ایک چیز ہے۔ یہاں میں لفظ "شعور" کو نفسیات کے معنوں میں استعمال نہیں کر رہا ہوں بلکہ بہت مبہم طور پر۔ فن کار اپنی حقیقت کا ادراک صرف عقل یا تحلیلی صلاحیت کے ذریعے سے ہی نہیں کرتا

ترقی پسند کہتے ہیں۔ اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے وہ اپنے پورے اعصابی نظام سے کام لیتا ہے۔ ترقی پسند فن کار سے تفہیم کے تجزیے اور جس قسم کی محدود سیاسی اور معاشیاتی حقیقت کے ادراک کا مطالبہ کرتے ہیں وہ تو صرف دماغ کا کام ہے اور دماغ فن کار کا کل شعور نہیں ہے، بلکہ اُس کے شعور کا چھوٹا سا حصہ ہے۔ جو حقیقت ہم احساسات اور مدرکات جسم کی رگ رگ سے ہوتے ہوئے آتے ہیں انھیں آپ کس کھتے میں پھونکیں گے؟ فن کار کی حقیقت سیاسی یا معاشی حقیقت سے بالکل مختلف چیز ہے، اُس کے لئے تو حسیاتی حقیقت سب سے بڑی حقیقت ہے، اور اِس سے الگ ہوکر وہ فن کار بھی نہیں رہتا۔ یہاں یہ نہ بھولئے گا کہ فن کار کے لئے خیالات بھی حسیاتی حقیقت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ فن کار کے لئے اپنے زمانے کے مروجہ سیاسی نظریوں اور اس قبیل کی دوسری نظریاتی چیزوں کو اس طرح سمجھنا" بالکل ضروری نہیں جس طرح سیاسی لیڈر یا اسمبلی کے لئے ووٹ دینے والے کو یہ باتیں سمجھنی چاہئیں۔ بلکہ اگر غور کیجئے تو ان سیاسی یا فلسفیانہ نظریوں کے اولیں نشانات کسی فن کار ہی کے یہاں ملیں گے اور ایسے زمانے میں جب ان کا سمجھنا سمجھانا تو الگ رہا، لوگوں کو ان باتوں کا احساس تک نہیں ہوا تھا اگر فن کار ان چیزوں تک جا پہنچا تو اس وجہ سے نہیں کہ اُس نے اپنے معاشی ماحول کا یا اپنے دماغ کا تجزیہ کیا تھا، بلکہ صرف اس وجہ سے کہ یہ چیزیں اُس کے حسیاتی شعور اور حسیاتی حقیقت کا ایک حصہ تھیں۔ گولڈسمتھ نے مارکس سے تقریباً ایک صدی پہلے کہہ دیا تھا:

Ill fares the land, to
hastening ills a prey,
Where wealth accumulates,
and men decay.

"گہرے تجزیے اور نظریے اور عمل کا اشتراک" ایک کردار فقرہ ضرور ہے، لیکن فن کار سے اسکا کوئی لازمی تعلق نہیں، یہ اور بات ہے کہ اتفاقیہ کسی ایک فن کار کے لئے یہ چیز معبد ثابت ہو جائے۔ اسی طرح ایک صاحب نے افسانہ نگار کو رائے دی ہے کہ وہ اگر کچھ نہ ہو تو اُسے انسانیت پرست اور انسان دوست تو ضرور ہونا ہی چاہیئے...... وہ صفات جن سے انسان انسان بنتا ہے، اُسے عزیز ہوں گی اور وہ اُنھیں عام ہوتا دیکھنا چاہے گا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فن کار کو مردم آزار یا آدم بیزار یا انسانوں سے بالکل بے تعلق ہونا چاہیئے، لیکن ادب محض شرافت یا محض رحمدلی بھی تو نہیں ہے ــــ شرافت ان معنوں میں نہ جھوٹ نہ بولو، کسی کی چیز نہ چراؤ، زنا مت کرو۔ کیا اصلی فن کار دوسروں سے یا اپنے آپ سے اپنی نیک دلی منوانے کے لئے تخلیق کرتا ہے؟ کیا فن کار کی دنیا، اُسکی حقیقت ایسی ہی سُہانی ہوتی ہے؟ مارسل پروست نے کہا ہے کہ کائنات ایک مرتبہ بن کر ختم نہیں ہوگئی، بلکہ جب کوئی بڑا فن کار پیدا ہوتا ہے تو کائنات نئے سرے سے بنتی ہے۔ تو جو آدمی حقیقت کے نئے سرے سے تخلیق کر رہا ہے وہ یہ سوچنے کے لئے کیسے رُک سکتا ہے کہ لوگ مجھ سے خوش بھی ہوں گے یا نہیں، مجھے انسانیت کا بہی خواہ سمجھا بھی جائے گا یا نہیں، "قومی جنگ" میں میری تصویر چھپے گی یا نہیں؟ بلکہ مادی جدلیات یا کسی اور غیر حسیاتی نظریے کے کمر بند سے چپکے رہ کر وہ اِس نئی حقیقت کا جلوہ کیسے دیکھ سکتا ہے؟ صرف ترقی پسند ہی اس کا تصور کر سکتے ہیں، اور لاریب وہ بڑی قدرت والے ہیں۔

سیاسی مفکر یا سماجی مصلح اور فن کار دونوں حقیقت کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ سیاسی مفکر بغیر کسی سہارے، بغیر کسی طفل تسلی، کے اس نظارے کی تاب نہیں لا سکتا یہ صرف فن کار ہی کا دل گردہ ہے کہ وہ بغیر کسی چیز کی آڑ لئے حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے۔ پرولتاریہ کی آمریت اور جدلیاتی مادیت جیسے تصورات کے بغیر کارل مارکس ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا تھا، لیکن بودلیئر نے ایسی سستی تسکین قبول نہیں کی۔ اگر حقیقت کی دیواروں میں دراڑیں نظر آتی ہیں تو سیاسی مفکر کو یہ فکر پڑتی ہے کہ کسی طرح جلدی سے جلدی ان میں چونا بھرا جائے، لیکن فن کار انھیں اُلٹا اور توڑتا ہے، کیونکہ اُسے تو ایک نئی عمارت بنانی ہے سائنس دانوں نے تو اب آکر ایٹم کو توڑنے کا طریقہ دریافت کیا ہے لیکن فن کار پہلے ہی دن سے یہی کر رہا ہے۔ وہ حقیقت کے

جوہروں کو درہم برہم کر دیتا ہے تاکہ ایک نئی حقیقت کی تشکیل کر سکے۔ فن کار اس تخریب سے ڈرتا بھی نہیں، اور نہ ان ٹوٹے ہوئے جوہروں کو جوڑنے کے لئے گوند ڈھونڈتا پھرتا ہے، وہ صرف اُس قوت کو کام میں لاتا ہے جو جوہر کے ٹوٹنے سے پیدا ہوتی ہے، اور اس کی مدد سے ایک نئی شکل تخلیق کر لیتا ہے۔ سب سے بڑا فرق فن کار کا یہی ہے کہ جب حقیقت درہم برہم ہو رہی ہو تو وہ اُس کا اعتراف کرتے ہوئے نہیں گھبراتا، اور کسی قسم کی سستی تسلی کا جویا بھی نہیں ہوتا۔

آپ یہاں مجھے یاد دلا سکتے ہیں کہ آج مارکس کا نظریہ بھی تو اسی تخریب اور تعمیر سے مل کر بنا ہے۔ لیکن فن کار کی حقیقت مارکس یا کسی اور سیاسی مفکر کی حقیقت سے زیادہ بنیادی اور اہم ہوتی ہے، کیونکہ لوہے کے کارخانوں کی ... انسان کا شعور انسان سے کہیں زیادہ قریب ہے۔ اگر فن کار شعور اور لاشعور کے تعلق کو، محسوسات اور خیالات کی پیدائش کو، خیال پر مادی زندگی کے اثر اور پھر مادی زندگی پر خیال کے اثر کو "سمجھ" بھی لے تب بھی اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ یقیناً زیادہ بہتر فن کار بن جائے گا، یا جس قسم کی تخلیق اور تشکیل کا مطالبہ ہم ایک فن کار سے کرتے ہیں وہ اُس میں زیادہ کامیاب ہوگا۔ فن کار کا تعلق، جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں، اس قسم کی "سمجھ" سے بہت تھوڑا سا ہے۔ مثال کے طور پر مارول کا یہ شعر لیجے جس میں اُس نے اپنی محبوبہ کو مخاطب کیا ہے

"اب تو تم اپنی عصمت کو بڑے سینت سینت کے رکھ رہی ہو، قبر میں دیکھنا کیڑے اس کی کیسی خبر لیتے ہیں۔" یہاں اگر آپ شاعر سے کہیں کہ میاں، تم اپنے دماغ اور ماحول کا تجزیہ نہیں کر سکے ہو، ایسا خوفناک خیال تمہارے دماغ میں صرف اس وجہ سے آیا ہے کہ ذرائع پیداوار بدل رہے ہیں، اور شاعر اس بات کو سمجھ بھی لے، تب بھی جو حقیقت شاعر محسوس کر رہا ہے اُس پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ کیونکہ یہ حقیقت ذرائع پیداوار سے زیادہ بنیادی ہے۔

فسطائیت اور نازیت کو ذہن میں رکھ کر ورلین کا یہ شعر پڑھیے: "جب ٹھنڈی ہوائیں چلیں گی تو بھوکے بھیڑیے اور فاقوں کے مارے ہوئے کوّے کا کیا بنے گا؟" یہ پھر ایک ایسی ... ہے جہاں جمہوریت اور غیر جمہوریت کی بحث ہی نہیں ہو سکتی۔ اور چلیے شیکسپیئر کی ڈیسڈیمونا کے یہ دو جملے ہیں:

"I understand a fury in your words,
But not your words."

"Am I that name, Iago?"

یہاں حقیقت صرف درہم برہم ہی نہیں ہو رہی، اتنی دُھندلی بھی ہو گئی ہے کہ اُسے دیکھنے کی کوشش میں ڈیسڈیمونا کی آنکھیں پتھرائی جا رہی ہیں۔ یہاں آپ اُسے معاشی مفاد کا فلسفہ سمجھائیے، کیا یہ ممکن ہے کہ اُس کے لئے حقیقت پھر سے روشن ہونے لگے گی؟ شاید آپ کی تفسیر اُس کی اتنی مدد نہیں کر سکتی جتنی وہ تھیلو کی دو گالیاں۔ ... در حقیقت یہ دوسرا جملہ تو وہ ہے جسے ادب ہر ترقی پسند سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے:

"Am I that name, Iago?"

کیا آج تک کسی انسان نے حقیقت کو اس بیدردی سے درہم برہم کرنے اور پھر اُسے اِس شان سے بنانے کی جرأت کی ہے جیسی بودلیئر نے اپنی ایک لائن میں؟

"میرے ریاکار پڑھنے والے، میرے ہم شکل، میرے بھائی!"

انسانی زندگی کے لئے جیسے جیسے انقلاب اِس ایک لائن کے دامن میں چھپے ہوئے ہیں اُن کا نشان تک آپ کو مارکس کی کتابوں میں نہیں ملے گا۔ اس لائن کی عظمت کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ ہماری صدی کے سب سے بڑے آدمیوں میں سے دو نے اپنی تصنیف میں شامل کر لیا ہے، ایلیٹ نے اپنی نظم میں، جوئس نے اپنے ناول میں۔

اب اُردو کا بھی ایک ہتھیار شعر سن لیجئے۔

منزل منزل دل بھٹکے گا، آج تمہیں نے روکا ہوتا (فراق گورکھپوری)

اب ہم فراق کو صلاح دیں گے کہ جب دو معاشی اصولوں میں کشمکش ہو رہی ہو تو اُس زمانے میں تنہائی کا ایسا احساس پیدا ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں، آپ اپنے اندر صرف گہرے تجزیے اور نظریے اور عمل کا "اشتراک" پیدا کیجئے۔

اتنی مثالیں پیش کرنے سے میرا مطلب یہ تھا کہ ایسے شعر لکھنے اور پڑھنے والوں میں خالی خولی "سمجھ" کام نہیں دیتی۔ یہ تو وہ شعر ہیں جو آدمی کے جسم کے خلیے تک بدل کے رکھ دیتے ہیں۔

چونکہ میں کبھی رائے نہیں دیتا بلکہ صرف اپنے تاثرات بیان

رہتا ہوں، اِس لئے اپنی دلیل کی حفاظت کی خاطر کسی حقیقت سے آنکھیں بند کر لینا میرا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ اگر میری دلیل کے خلاف کوئی شہادت مل سکتی ہے تو میری دلیل کو جہنم میں جانے دیجئے، مجھے کوئی پروا نہیں ہوگی۔ میں خود ہی ایک بات کا ذکر کرتا ہوں جو بظاہر میری ساری بحث کی تردید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے زمانے کے سب سے بڑے مصوّر پکاسو نے پانچ چھ مہینے ہوئے کمیونسٹ ہو جانے کا اعلان کیا تھا، اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ صرف کمیونزم ہی میری تصویروں میں کوئی معنی پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن ترقی پسند اس پر بغلیں بجانے سے پہلے یہ بات یاد کریں کہ یہ ساری تصویریں پکاسو نے کمیونسٹ ہونے سے پہلے بنائی تھیں۔ واقعی کمیونزم اُس کی تصویروں میں معنی پیدا کرتی ہے، مگر خود اُس کے لئے نہیں، بلکہ اوروں کے لئے۔ گویا اُس کی تصویریں اصل میں ہیں، اور کمیونزم محض حاشیہ بالفسر۔ آپ نے آرٹ کے متعلق "شکر لگی ہوئی گولی" والے نظریے کا نام سنا ہی ہوگا۔ یعنی اصل گولی تو افادیت ہے، اور آرٹ محض شکر تاکہ لوگ ذرا آسانی سے گولی حلق کے نیچے اُتار لیں۔ یہ نظریہ بہت مقبول ہے، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اصل گولی تو آرٹ ہے، اور افادیت محض اُوپر سے لگی ہوئی شکر ہے۔ افادیت میں سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ نظریوں کو بھی شامل کر لیجئے۔ ایسے لوگ بس گنے چُنے ہی ہوتے ہیں جو براہ راست آرٹ سے مانوس ہو سکتے ہوں یا اسے پہچان سکتے ہوں، عام طور پر لوگوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ آرٹ کسی نہ کسی جانے بوجھے نظریے میں ملبوس سامنے آئے، تب تو وہ اِس کی قدر کر سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ ہربرٹ ریڈ تو اس سے بھی آگے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عام طور پر تو لوگ آرٹ کے عنصر تک بالکل پہنچتے ہی نہیں۔ اگر وہ کسی نظم کی تعریف کرتے ہیں تو یہ تعریف آرٹ کی نہیں ہوتی، بلکہ صرف افادیت کی۔ تو جناب، اس طرح معنی ڈالتی ہے کمیونزم پکاسو کی تصویروں میں۔ فن کار کا کام مسائل کا حل تلاش کرنا نہیں ہے، بلکہ ہیئت کی جستجو، اور چاہے آپ اسے "انا الحق" کی صدائے بے ہنگام ہی کیوں نہ سمجھیں میں تو یہ کہوں گا کہ ہیئت ہی کُل آرٹ ہے، اور ہیئت ہی فن کار کی حقیقت ہے۔ ہیئت کی تلاش ایک اخلاقی جدوجہد ہے ـــــــ خود زندگی کی تلاش ہے۔ مثلاً اگر آپ نے "Bouvard and Pecuchet" کی ہیئت اور طریقۂ کار کو نہیں سمجھا تو آپ اُس دُنیا کو ہی نہیں دیکھ سکتے جو فلوبیر نے یہاں تخلیق کی ہے، بلکہ اِس چھوٹی سی کتاب کو پڑھ تک نہیں سکتے، اکتا کر دُور پھینک دیجئے۔

لیکن ان تمام کاوشوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے، اگر آپ مُصنّف بننا ہی چاہتے ہیں تو آسان سا ٹُٹکا موجود ہے "حکیمانہ حقیقت نگاری" کیجئے۔ فن کار نہ سہی "نیم حکیم" تو بن ہی جائیں گے۔

اعترافِ شکست

یہ حال ہے کہ حقیقت ذرا نہیں معلوم
پر ادّعا ہے یہی۔ ہم کو کیا نہیں معلوم؟
یہ کائنات یہ نیرنگ دلفریبِ وجود
وہ گنجلک ہے کہ جس کا سرا نہیں معلوم!
طبیبِ فکر نے مانا مرض تو تاڑ لیا
مگر جناب کو اس کی دوا نہیں معلوم
کسی نے ڈال دیا جیسے لا کے صحرا میں
پتا ہی منزلِ مقصود کا نہیں معلوم
ہزار رنگ کے جلووں سے ہی نظر الجھی
مگر یہ سحر یہ جادو ہے کیا؟ نہیں معلوم!
جھلک دکھائی ہی کیوں گلستاں میں غنچہ نے
کھلا تو کس لئے مرجھا گیا نہیں معلوم
جہاں ہے نور میں ظلمت تو درد راحت میں
ہے راز کیا! یہ ہے کیا ماجرا! نہیں معلوم
ہے وقت ایک مگر مختلف اثرات سے
کہاں سے آئی یہ "بے ڈھب بلا" نہیں معلوم
ہی جوان یہی پیر کرتا جاتا ہے
مگر کسی کو بھی اسکی دغا نہیں معلوم!
مئے حیات فزا خانہ ساز تھی لیکن
اسی میں زہر کہاں سے ملا؟ نہیں معلوم
ہماری سعی کا انجام تک خلاف امید
کوتی کہاں ہوئی سرزد خطا؟ نہیں معلوم
امیں قصور ہے اپنی ہی کم نگاہی کا
گدا کو چاہیئے دیکھے نہ خواب شاہی کا

امین حزیں!

بازِ دست آموز!

فریب خوردۂ صیاد بازِ دست آموز!
ہزار حیف کہ فطرت کا تجھکو پاس نہیں!
تجھے ذرا نہیں احساسِ تسمہ بر پائی
بربِّ کعبہ! اسیری خود شناس نہیں

(۲)

چڑھا ہے ہتھے مگر دستِ راست بنا ہے
خدا کو تیری سمجھ کب سے ہو گئی پیاری؟
پہن کے نقرئی گھنگرو مغالطہ میں نہ پڑ
فریب کار شکاری کی ہے یہ عیاری!

(۳)

ترے شکار کا ممنون سفرۂ صیاد
کمائی تیری مگر عیش کوئی اور کرے!
ستم ظریفیٔ صیاد کا سبب کیا ہے؟
ترا یہ فرض نہیں کیا کہ تو بھی غور کرے؟

(۴)

فضائے دشت جبل کی کہاں وہ آزادی
کہاں وہ عیش شب و روز آشیانے کے؟
وہ جد و جہد کا جذبہ تری جھپٹ میں کہاں؟
کہ تیرے طور طریقے ہیں مانگ کھانے کے

امین حزیں (سیالکوٹی)

ذہنی اُلجھن

حجاب امتیاز علی

(۳)

نمازِ ظہر کے بعد موم بتی کا جنازہ بنہایت تزک و احتشام سے قبرستان کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس سے کچھ ہی دیر پہلے فیروز کا ایک خط مجھے ملا جس میں لکھا تھا کہ محلے کی کئی ایک لڑکیاں اور خادمائیں اور دوسری رفیق عورتیں جنازے کا نظارہ دیکھنے کو سرخ سیبوں کے اُس باغ میں جا رہی ہیں جو قبرستان کے رخ واقع ہے میں بھی ضرور وہاں پہونچوں اور تجہیز و تکفین کے بعد باغ کے عقبی دروازے پر اس کی منتظر رہوں۔

یہ خط پڑھکر میں عجیب کشمکش میں گرفتار ہوگئی کہ مجھے فیروز سے وہاں ملنا چاہیئے یا نہ ملنا چاہیئے! موم بتی کی پاکیزہ زندگی اور موت کا میرے دل پر اتنا گہرا اثر تھا اور اس کی شرافت و حیا کا مجھ پر ایسا سکہ بیٹھ چکا تھا کہ لیے اس انسانی جذبے پر سخت اعتراض تھا کہ میں کیوں فیروز سے ملنا چاہتی ہوں۔ ارادہ ہوا کہ خط لکھکر دردِ سر کا بہانہ کردوں۔ مگر دل یہ بھی نہ مانتا تھا۔ کئی ہفتوں کے بعد فیروز سے ملنے کا اک موقع نصیب ہوا ہے۔ بہانہ بنا کر اسے بھی ٹال دوں؟ اس سے ملوں یا نہ ملوں ——— ؟ اس قسم کا سوال آج تک میرے دل میں پیدا نہ ہوا تھا۔ مگر آج میں فیصلہ نہ کرسکتی تھی کہ کیا کروں۔ اک عجیب قسم کی ذہنی اُلجھن تھی جو منٹوں میں مجھے دیوانہ سا بنائے دے رہی تھی۔ میں اپنے آپ سے جھنجلائی ہوئی تھی۔ واقعی ذہنی کشمکش ذہنی ارتقا کی دشمن ہے!

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اور رفیق خواتین کے ساتھ جنازے کا نظارہ دیکھنے سرخ سیبوں کے اُس باغ میں چلی گئی جو قبرستان کے رخ تھا۔

میت سپردِ خاک کردی گئی۔ اور بظاہر اسکی کتاب زندگی بند کردی گئی ——— مگر اندرونی طور پر میں محسوس کر رہی تھی کہ اس کی حکایتِ حیات کی اک اک سطر میرے صفحہ ذہن پہ ابھرنے کی کوشش کر رہی ہے میرے ساتھ کی عورتیں آہ و بکا کرتی ہوا واپس جا رہی تھیں ادھر میں اپنی کشمکش و اُلجھن سے نڈھال سی ہو رہی تھی۔ اور اب تک فیصلہ نہ کرسکی تھی کہ مجھے اپنے عاشق سے ملنا چاہیئے یا نہ ملنا چاہیئے۔ موم بتی مرحومہ کے وہ الفاظ "حیا عورت کا زیور ہے" میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اُدھر فیروز کے وہ دلربا فقرے "شاہ رخ! دُنیا میں محبت سے سُہانا اور پاکیزہ جذبہ اور کوئی نہیں" رہ رہ کر میرے جذبات کو اُبھار رہے تھے۔ فطرت انسانی کا تقاضا یہی تھا کہ میں فیروز سے ملتی۔ مگر شرافت و حیا کا جو معیار تمدن و تہذیب نے بنا رکھا ہے، وہ مجھے اپنے اس خالص انسانی جذبے پر نفریں کرنا سکھا رہا تھا میں سخت ذہنی تکان محسوس کرنے لگی۔

اُس دن سورج بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ اور زمین سے اک عجیب قسم کی گرم بھاپ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں تجہیز و تکفین سے فارغ ہوکر لوگ منتشر ہوچکے تھے۔ میں تھکی ماندی زنانہ باغ کے عقبی دروازے میں جا بیٹھی کہ اپنے مضمحل اعصاب کو روح پرور سمندری ہوا کے جھونکوں سے تر و تازہ کرسکوں۔ باغ کی دیوار سے تھوڑے ہی فاصلے پر نیلا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ اور اس کی مسلسل ہوائیں میرے گرم رخسار سے مس ہو ہو کر گذر رہی تھیں، فضا میں سرخ سیبوں کے نو شگفتہ پھولوں کی لپٹیں ملفوف تھیں۔ وہاں میں بے ارادہ جا بیٹھی تھی مگر نہ معلوم کیوں اپنے آپ کو بلا وجہ سخت گناہ گار اور مجرم محسوس کر رہی تھی۔ میں نے کونسا گناہ کیا ——— اور میرا جرم کیا تھا ——— ؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پھر بھی میں اپنے کو نہ معلوم کیوں کمتر اور ناچیز نظر آرہی تھی۔

موم بتی کا یا اسکی موت کا ویسے مجھ سے کوئی ذاتی تعلق نہ تھا مگر قدیم معاشرت کی اس ہیروئن کے اخلاق اور اسکی غمناک زندگی نے مجھے اس درجہ متاثر کردیا تھا کہ میں اپنے دل کے تقاضوں اور جبلت انسانی کو نفرت کی نگاہ

سے دیکھنے لگی تھی۔ اُس باحیا بے زبان عورت نے محض تہذیب و ثقافت
کے زیر اثر رہ کر مرد معالج سے علاج کرانے پر موت کو ترجیح دی تھی
اور میں؟ محض انسانی جذبات سے مجبور ہو کر فیروز سے ملوں
یا نہ ملوں، کی اُلجھن میں گرفتار ہونے آ گئی تھی۔ مرحومہ نے
فطرتِ انسانی کو کچل کر تہذیب کی لاج رکھ لی۔ اور میں دل
کے تقاضوں سے مجبور ہوئی جا رہی ہوں۔ میں خیال ہی
خیال میں اپنا اور مرحومہ کا موازنہ کرنے لگی۔

میں انہیں اُلجھنوں میں مبتلا تھی کہ یک لخت قدموں کی
چاپ سُن کے میرا خون تیزی سے دوڑنے لگا۔

"فیروز!" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور میں دو قدم
پیچھے ہٹ کر خاموش کھڑی ہو گئی۔

"تم آ گئیں!" وہ اشتیاق سے میری طرف بڑھا۔

میں دو قدم اور پیچھے ہٹ گئی۔ "میں آنا نہ چاہتی تھی
مگر پھر۔ ۔ ۔"

"آنا نہ چاہتی تھیں ——؟ کیوں ——؟"

"کیونکہ — کیونکہ" میں کوئی صاف جواب نہ دے سکی
اور نظریں نیچی کئے چپ چاپ زمین کو تکتی رہی۔

"تھکی ہوئی ہو میری شہرزاد؟"

"ہاں — نہیں —" میری کشمکش جاری تھی۔

وہ حیران سا رہ گیا۔ "صاف صاف بتاؤ کیا بات
ہے تم ایسی کیوں ہو؟ خفا ہو؟ کوئی بات ہوئی؟ قریب تو
آؤ۔ تمہارے دل کی دھڑکن سُن لوں۔ پھر خود سمجھ جاؤں گا کہ
تم ایسی کیوں ہو۔" یہ کہہ کر وہ قریب آ گیا۔

میں نے گھبرا کر کہا۔ "نہیں ٹھہرو۔ وہیں ٹھہرو۔"
فیروز دل شکستہ سا ہو گیا۔ "تمہاری حرکتیں بہت دل شکن
ہیں۔"

یہ سُن کر میں نے سوچا اسے اپنی اُلجھن بتا دینی
چاہیئے۔ چنانچہ میں نے کہا "تم سے کئی باتیں کرنی ہیں۔"

یہ سُن کر اُسے ڈھارس سی بندھی بولا۔ "تو چلو سمندر
کی طرف چلو۔ آسمانوں سے ایک شفاف نور برس رہا ہے۔
اور زمین پر گھاس کے شگوفوں کی مہک آوارہ ہے۔ ایسی
چمکیلی حسین دوپہریں زندگی میں کتنی آتی ہوں گی؟ وقت
کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے میری شہرزاد۔ تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔
ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ تم آؤ میرے پہلو کا سہارا لے کر سمندر
کی طرف چلو۔"

دو لمحوں کے لئے تہذیب و شائستگی کی زنجیریں میں نے
بھی ڈھیلی کر دیں اور ایک ننھی چڑیا کی سی آزادی محسوس
کرنے لگی۔ ہم دونوں سمندر کی لہروں کے قدموں میں ایک
چھوٹی چٹان کے زیر سایہ ایک دوسرے کے سہارے سے
بیٹھ گئے۔

میرے انداز میں اجتناب محسوس کر کے فیروز کچھ قدرے
شرما سا گیا "تم کچھ خوش نظر نہیں آتیں۔ کہیں اپنے
عہدے سے بیر تو پیدا نہیں ہو گیا؟"

"میں تم سے ملنے کو بیتاب تھی" میں نے کہا۔

"خوب بتانا ہے کہ دو ہفتوں میں ایک ملاقات بھی نہ
ہو سکی۔ ہوتی بھی کیونکر؟ اب تو تم ملکہ کی خاص الخاص
رفیقہ کی اعلیٰ خدمات پر مامور ہو چکی ہو۔ شاہی مشغلے
اور دلچسپیاں۔ اور —— اور" اور فیروز نے ایک آہ بھری۔

"میں تم کو کئی ایک نئی خبریں سُنانا چاہتی تھی مگر
تم روٹھے بیٹھے ہو۔" میں اس کی ناراضی کو رفع کرنے
کے لئے اس سے باتیں کرنے لگی۔

"ہمہ تن گوش ہوں۔ سُناؤ۔"

میں کہنے لگی۔ "تمہیں معلوم ہے جب سے میں ملکہ کی
قربت میں رہنے لگی ہوں مجھے شاہی محفلوں میں بھی
شریک ہونا پڑتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اُس نے کہا

"تو گذشتہ ہفتے کی بات ہے کہ نواب محبوب نے
مجھے ایک جشن رقص سے واپسی پر اپنے ساتھ اپنی گاڑی
میں بٹھا لیا اور ملکہ کے محل تک پہونچایا۔ میں تمہیں یہ
خوشخبری سنانے کا موقع ڈھونڈتی رہی کہ اب میرا
ملنا جلنا کس قدر اعلیٰ مرتبت لوگوں کے ساتھ ہے۔ یہ
میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے نا فیروز؟"

"ہو گا۔ مگر میرے لئے خوشخبری نہیں ہے۔" فیروز
نے خشکی سے کہا۔

"اور میں تمہیں سُنانے کو بے چین تھی۔"

"میں سُن کر بے چین ہو رہا ہوں۔"

[illegible] کا تخیل کرو" میں نے کہا۔

"[illegible] ان سنہری زلفوں کو دیکھو جو آفتاب [illegible] باریک اور چمکیلی ہیں۔ ان ہونٹوں کو [illegible] گلاب کی پنکھڑیوں سے مشابہ ہیں۔ آغوش [illegible] گرم کیا تو اپنے آپ پر کیا۔ تمہارے ساتھ چند لمحے بسر کر لینا ہر مرد کے لئے اک نئی فردوس میسر آجانے کے مترادف ہے۔ شہناز۔ آہ! تم بے حد بھولی ہو۔ اسکا کیا علاج کروں؟"

"مگر نواب محبوب —"

فیروز نے بات کاٹ دی "اب خدا کے لئے بوڑھے نواب کا ذکر جانے دو جوان دلوں کی بات کرو۔ نواب کے کرم کے قصوں اور نوازش کی داستانوں کو تہہ کر ڈالو۔ مجھے باتیں سناؤ۔ اپنی صرف اپنی۔! اس درخشاں بہاریں دو پہر میں تم اس سرو کی طرح معلوم ہو رہی ہو جس کی شبک ٹہنیاں جنوب کی ہواؤں سے مست ہو کر جھوم رہی ہوں۔ دو ہفتوں کے اندر اندر تم کسقدر حسین نکل آئی ہو!"

یہ کہہ کر فیروز نے میری ٹھوڑی اوپر کو اٹھائی اور جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو لرز گئی۔ سورج کی تیز اور سنہری روشنی میں اور سمندری چٹان کے دلفریب سایہ تلے اسکا چہرہ یونانی اپالو کے زہد شکن بُت کی طرح دلکش نظر آرہا تھا۔ اگر اس کی بے پناہ کشش نے مجھے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیا تو —؟ میں یک لخت ڈر سی گئی۔ اس لئے کہ موم بتی کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے آئندہ میرا ارادہ اسی کے نقش قدم پر چلنے کا ہو رہا تھا۔ لیکن اب فیروز کی ہوشربا باتیں سُنکر اور اس کی زاہد فریب صورت دیکھکر میں بے ضبط سی ہو رہی تھی۔ میں اک بے چینی محسوس کرنے لگی۔ یہ بے چینی کیسی نامعلوم اندرونی کشمکش اور شدید احساس جرم کا نتیجہ تھی۔ مجھے رہ رہ کر موم بتی اور شریف عورت کے کردار کا خیال آنے لگا۔ آہ! میں تو اپنی معاشرت اور ثقافت کی شیدائی اور موم بتی کی سی خصلتیں اپنے آپ میں دیکھنے کی متمنی! اب مجھے یک لخت یہ کیا ہو رہا ہے!

"میں کس قدر گناہ گار ہوں" بے ساختگی اور بے بسی یہ میرے منہ سے نکلا اور میں ذرا پرے ہٹ گئی۔ ضمیر کے زہریلے سانپ نے مجھے ڈسنا شروع کر دیا۔

"تم یک لخت گھبرا کیوں گئیں؟" فیروز کہنے لگا۔

"کچھ نہیں فیروز۔ مجھے موم بتی کا خیال آگیا"

"تو گھبرا کیوں گئیں؟ پہلے کبھی موت نہیں دیکھی؟"

"یہ بات نہیں" میں نے رکتے رکتے کہا "دیکھو اب ہمیں واپس جانا چاہیئے"

"بس اکتا گئیں؟"

"اکتائی کیسے! مگر ہمیں واپس جانا چاہیئے"

"تمہاری یہ حرکتیں کسقدر حوصلہ شکن ہیں۔ سنجانے سر میں ان دنوں کیا سمائی ہوئی ہے! اتنے دنوں بعد اب ملیں تو یہ تامل اور اجتناب؟"

مگر میرا احساس جرم بڑھتا ہی گیا۔ فیروز سے تنہائی میں باتیں کرتے ہوئے مجھے جہنم کے شعلے نظر آنے لگے میں نے بے صبر ہو کر کہا۔ "اب مجھے جانے دو"

"نہیں ابھی نہیں! پہلے یہ بتاؤ میری طرف سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے یا واقعی نئے تقرر اور نئی اعلیٰ فلسفیانہ نے تمہیں بدل ڈالا ہے۔ اور نئی محبت کی تلاش ہے؟" فیروز بے حد دل شکستہ نظر آرہا تھا۔

"ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے صرف اپنی پاکبازی پر غرور کرنے کی تمنا ہے۔ تم نے موم بتی کی زندگی کی تفصیل نہیں سنی؟ تم نے اس کی موت کے حالات نہیں سُنے؟ وہ کتنی پاکباز تھی؟"

فیروز چڑ سا گیا۔ کیا مطلب؟۔ مجھ سے علیحدہ رہ کر تم پاکباز کہلاؤ گی؟ موم بتی بیچاری پرانے زمانے کی قبدی عورت تھی۔ اس کا اور تمہارا کیا مقابلہ؟"

بے اختیار میں بول پڑی "تم اس کی شان میں ایسے کلمات نہ کہو۔ وہ بے حد پاکباز تھی!"

"اور تم کیا ہو؟"

"میں!" میں نے رکتے ہوئے کہا "اس کے مقابلے میں گناہ گار"

فیروز چڑ سا گیا بولا "بہار کی اس جمیل دوپہر میں ایسی احمقانہ باتیں نہ کرو۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہو۔ اپنے عقل و ہوش میں آؤ۔ اب تم ملکہ شہر سے بہت قریب ہو گئی ہو مجھے تمہارے نئے تقرر سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ اب تم

موقع محل دیکھ کر علیا حضرت پر ہماری محبت کو ظاہر کروگی اور ان سے شادی کی اجازت جلد حاصل کر سکو گی؟"

"ابھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ ملکہ سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ کنواری لڑکیوں کی زبان سے شادی کا نام سننا ناپسند کرتی ہیں۔"

وہ جل گیا۔ "تو کیا بیاہی ہوئی عورتوں کی زبانی انہیں شادی کا لفظ بھاتا ہے؟ جو پہلے بُرے شوہروں سے بیزار ہو چکی ہوں؟ اور نئی شادی کی فکر میں ہوں؟"

"توبہ توبہ! تم کیسی باتیں کرتے ہو! ملکہ اور ایسی باتیں سنیں! میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کنواری کی زبان سے محبت و عاشقی کا نام سننا گوارا نہیں کرتیں۔"

فیروز حقارت سے بولا۔ "کریں بھی کیونکر؟ جو خود بھوکا ہو وہ دوسرے کو روٹی کھاتا کیسے دیکھ سکتا ہے؟ وہ خود جو بیچاری تمام عمر محبت سے محروم رہیں! مگر اس سے ہمیں کیا، تم جلد سے جلد یہ مطلب ادا کر دو۔"

"مگر تم جانتے ہو وہ عورت میں کس قسم کے اوصاف دیکھنا پسند کرتی ہیں؟"

"ستم رُخ! تم کیسی دل جلانے کی باتیں کرتی ہو! ملکہ خود عورت ہیں، پھر آخر کیوں وہ عورت کی دشمن بنی ہوئی ہیں؟ سب جانتے ہیں کہ عورتیں انسان ہیں، موم کی پتلیاں نہیں۔ عورتیں انسانی جذبات اور انسانی ولولے رکھتی ہیں۔ ملکہ چاہتی ہیں کہ عورتیں فطرت کے خلاف بغاوت کریں؟ ہے اُن فطری خیالات و جذبات کو تہذیب و ثقافت کے مصنوعی پردوں کے پیچھے ذبح کر دیں جو قدرت نے انہیں عطا کر رکھے ہیں؟ بتاؤ۔ ملکہ چاہتی کیا ہیں؟"

اسی وقت دُور سمندر کی سبز موجوں پر کسی تنہا تواصل کی چیخ سنائی دینے لگی۔ اور گہرا نیلا سمندر کسی وحشی درندے کی طرح گرم دوپہر کی ویرانی میں گرجنے لگا۔

"تمہیں ملکہ کے متعلق ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔ "شادی کے سلسلے میں میں خاتون ندوی سے امداد لوں گی۔"

"تم براہِ راست ملکہ سے اجازت کیوں نہیں لیتی ہو؟"

"مجھے شرم اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔" میں نے گردن نیچی کر کے کہا۔

"شرم اُس وقت آتی ہے جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے۔ تم شادی کو گناہ سمجھتی ہو؟"

"کہہ جو دیا۔ میں خاتون ندوی سے مشورہ کروں گی۔"

"تو جواب کب دو گی؟"

"اتنے بے صبر کیوں ہوتے ہو؟"

"تم نے محبت کی بے صبریاں نہیں دیکھیں۔ اگر تم نے اس میں دیر لگائی تو میں خود علیا حضرت سے اجازت حاصل کر لوں گا۔ سُن رہی ہو؟"

"نہیں نہیں ـــــ کہیں ایسا نہ کرنا۔ اور پھر اس موقع پر جبکہ ملکہ موم بتی جیسی پاکباز عورت کی موت سے متاثر ہیں یہ سلسلہ جنبانی بہت ہی نامناسب ہے۔"

فیروز خشکی سے بولا۔ "اونہہ نامناسب!!! ایک مُردہ عورت کو زندگی کے ولولوں سے لبریز ایک زندہ جوڑے کی زندگی میں مخل ہونے کا کوئی حق نہیں۔"

میں التجا کے پیرائے میں بولی۔ "خدا کے لئے میری بات مانو۔ آجکل ملکہ بے حد متاثر ہوں گی۔"

فیروز کہنے لگا۔ "ان کے متاثر رہنے کی مدت کتنی ہوتی ہے؟ کچھ تمہیں اندازہ ہے؟"

میں بولی۔ "یہ تو واقعات پر منحصر ہوگا اتنی جلدی نہ کرو۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔"

وہ کہنے لگا۔ "یہی تو مجھے خدشہ ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ خدا نہ کرے جو کچھ نہ کچھ ہو کے رہے۔ خدا کرے وہ ہو جس کی تمنا میرے جسم میں ایک علیحدہ روح بنائے ہوئے ہے۔ نہ وہ جس کے خیال سے میں لرز جاتا ہوں۔"

"بھلا وہ کونسا خیال ہے جو تمہیں لرزاتا ہے؟"

"کیوں زخم کو کُریدتی ہو ستم رُخ؟ کیوں مرغ بسمل سے کھیلتی ہو؟ کیوں سُننا چاہتی ہو کہ مجھے کونسا خیال لرزہ بر اندام کر دیتا ہے! ـــــ تمہاری نئی خدمت کا خیال! تمہاری بے وفائی کا اندیشہ۔ تمہاری معصومیت اور محل کی زندگی کا کھٹکا! ایک بات ہو تو کہوں۔ ہزاروں کھٹکے ہیں۔"

"تم بھاگے ہو"
"اللہ کچھ عرصہ بعد تم مجھے اس لقب سے مخاطب کر سکو گی۔
مجھے اس وجہ پریشان کئے ہوتے ہیں"
میں بولی "بے بنیاد باتوں پر غور کر کے پریشان ہونا
۔۔۔۔؟"
وہ کہنے لگا "باتیں پہلے بے بنیاد ہی ہوتی ہیں بعد
میں ان کی بنیاد پڑتی ہے"
"فیروز! تمہیں اگر مجھ سے محبت ہے تو ضبط و صبر سے
کام لینا سیکھو"
وہ جل گیا "میں اس ضبط و صبر کا قائل نہیں جو رخ
جو انسان میں مجرمانہ خیالات کو ابھارے۔ ضبط و صبر تو اس
چیز کے لئے کیا جاتا ہے جو قبضۂ اختیار سے باہر ہوتی ہے
جیسے موت! مگر ان باتوں میں صبر اور ضبط کو میں حماقت
سمجھتا ہوں"
"تمہارا اداس چہرہ مجھ سے نہ دیکھا جائے گا فیروز ذرا
مسکراؤ خدا کے لئے مسکراؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ
میں خاتون زدگی سے کل ہی ملنے کی کوشش کروں گی اور پھر
بہت جلد تمہیں جواب دوں گی۔ وہ دیکھو بانس کی سربلند
ٹہنیاں کانپنے لگیں۔ اور کوئل کی چیخ بڑھتی ہی جاتی ہے۔
عصر کا وقت ختم ہو رہا ہے مجھے اس وقت ملہ کے لباس
خانے میں حاضر ہونا چاہیئے۔ اس لئے مسکرا دو اور مجھے
خدا حافظ کہو"

مختصر افسانے

کمسنی

کتنی ٹھنڈی ہے کمسنی کی رُت
دُور ابھی ہے شباب کی گرمی
ابھی تلخی نہیں ہے جلووں میں
ابھی ہلکی ہے مے نگاہوں کی

شفق کی دھاریاں

ڈوبتا جاتا ہے سورج دُور دریا سے پرے
چاند ابھر آنے کو ہے مشرق سے لیکر کروٹیں
یوں شفق کی دھاریاں آتی ہیں پانی میں نظر
جیسے سیمیں جسم پر ساری کی بھیگی سلوٹیں

کافرِ جمال

دلِ بیتاب تو نے بھی دیکھا
کتنا کافر جمال تھا اُس کا
یعنی اُسکی طرف بس ایک نظر
دیکھ لینا ہی عشق کرنا تھا

یاد کی گونج

گونجتی ہے یوں کسی کی یاد میرے ذہن میں
جیسے کنج گل میں بھونروں کی نوائے دلنشیں
جیسے ریتیلی زمیں پر سُست رو ندی کا گیت
جیسے پنگھٹ پر سُنہرے کنگنوں کی بھیرویں

علی احمد

سلام مچھلی شہری

"میں تمہارے علاوہ بھی کچھ سوچ سکتا ہوں ——!"

۱۲ اگست ۴۵ء

سرد ہواؤں کے دامن پر ___ اے پرچم! لہراتا جا
رابطِ آوِ گنگ و جمن پر ___ اے پرچم! لہراتا جا
مردہ انسانوں کے کفن پر ___ اے پرچم! لہراتا جا
میرا پرچم چھوٹ گیا ہے ہاتھوں میں زنجیریں ہیں
تیری زد میں میرے وطن کے افسردہ نظارے ہیں
دورِ ہمالہ پر لرزیدہ ٹھنڈے چاند ستارے ہیں
میرا پرچم چیخ رہا ہے "یہ ایوان ہمارے ہیں"
لیکن میرے ہاتھ بندھے ہیں اور سر پر شمشیریں ہیں
تو بھی اس غمگین فضا سے شاید کچھ مانوس نہیں
میری زمیں امریکہ نہیں ہے چین نہیں ہے روس نہیں
لیکن تیرا لہرانا بھی میرے لئے منحوس نہیں
میری اسیری، تیری بلندی، خواب کی سب تعبیریں ہیں

---

۱۵ اگست ۴۵ء

ہیلو کامریڈ! چائے حاضر کردوں
یہ کافی؟
مگر ایسے میں جبکہ موسم بھی ہے آج توبہ شکن
"وھسکی" بہتر رہے گی خدا کی قسم
پڑ رہی ہے پھوار
اور فضا نغمہ بار
اشتراکی نظریوں کا کیا بھرم
یہ تو ہے اپنے اوپر سراسر ستم
جبکہ فطرت بھی کرتی ہے ہم پر کرم ——!
—— پاسِ ناموسِ گنگ و جمن، خوب ہے
واقعی یہ خیالِ وطن، خوب ہے
خیر —— دیکھو وہ نازک بدن خوب ہے
—— ہاں تو ہندوستاں
جس کو کہتے ہیں کچھ لوگ جنّت نشاں
کچھ نہیں، سڑتی نعشوں سے آباد ہے ——
نعش —— طاعون زدہ نعش
سوکھی ہوئی نعش
بکھری ہوئی نعش
اور اُن میں شیطانوں، بھوتوں کے یہ قہقہے
جنکو ہم اور تم اپنے الفاظ میں ڈھالتے ہیں یہاں
اور "وھسکی" کا اک گھونٹ لیکر سمجھتے ہیں اپنا ہی "ہندوستاں"
انقلاب اور تخیل میں کچھ فرق ہے
جیل بھرتا رہے تم کو کیا
اور "بنگال" مرتا رہے تم کو کیا
چند تحریریں کافی ہیں
تقریریں کافی ہیں
کرتے رہو
اور مضامین پرچوں میں لکھتے رہو
اس سے بھی اور زیادہ کروگے کیا ——؟!
موت افروز لمحات گھٹنے لگے
جنگ کے سُرخ بادل بھی چھٹنے لگے
اور "قیصرِ بکنگھم" بھی سجنے لگا!
ہم بھی لے جا رہے ہیں خوشی کے چراغ

"تاریخ خاموش ہے۔ منتظر ہے تو ہو
امن اور جنگ کے بُت ہنس رہے ہیں تو کیا ــــــ
جنگ جیتی ہے ہم نے
ہمارے وطن نے
ہمارے سپاہی نے ــــــ!
یہ ٹھیک ہے!!
ہاں مناؤ خوشی۔ رقص میں آؤ۔ گاؤ
کہ یہ ٹھیک ہے ــــــ
بربریت پہ انسانیت چھا گئی!
لیکن ایسے میں اک بات یاد آ گئی
جنگ نے ایک تحفہ دیا ہے ہمیں
یعنی "ذرّاتی بم"
جس کے آگے ہے تہذیب اب سر بہ خم
پھر بھی تہذیبِ نو کی کرن کی قسم
ایک تحفہ ہے یہ
جنگ کے دیوتاؤں نے بخشا ہے یہ
اور یہ دیوتا میرے اپنے خدا ہیں۔ خدا کی قسم
میرا اپنا وطن اس سے مسرور ہے۔
پھر بھی مجبور ہے
ورنہ طوق و سلاسل کی جھنکار میں
ناچتا۔ گیت گاتا
کچھ اس طرح کے گیت گاتا
کہ دُنیا سمجھتی زمیں جل گئی
آسماں جل گیا
اور تہذیبِ نو کا خدا جل گیا
"معاف کرنا مجھے کامریڈ!
میں بہکنے لگا ہوں۔ بہکنے لگا ہوں
مجھے تھام لو ــــــ!!!

۲۶۔ اگست ۱۹۴۵ء

"مسجد" کے مینار پکارے
"آؤ بہرِ نماز!"
"مندر" کی دیوار پکارے
"لو پوجا کا ساز!"
"اللہ اکبر ــــ اللہ اکبر!!"
"نارائن۔ نارائن"
"خالق اکبر" شاداں شاداں ــــــ!
"مندر کے بُت" رقصاں رقصاں ــــــ!!
ایسے میں شیطان پکارے
دُور سے گورستان پکارے ــــــ
"جنگ اور موت اور خُون!"
"دُنیا ایک جنون ــــــ!"
مسجد کے اشجار پکارے
مندر کے شہکار پکارے
"اللہ اکبر۔ اللہ اکبر!"
"نارائن۔ نارائن"
"ہندوستان" کی نم آنکھوں سے
دھیرے دھیرے آنسو ٹپکے ــــــ!!
مسجد کے مینار پکارے۔
"آؤ بہرِ نماز!"
مندر کی دیوار پکارے ــــ
"لو پوجا کا ساز ــــ!!"

مشتاق احمد [illegible]

گیت اور تہذیب و تمدن

کسی قوم کے گیت پہ اگر غور کیا جائے تو اُس قوم کے مذہبی معتقدات اور تہذیب اور تمدن کا آسانی سے پتہ لگایا جا سکتا ہے بعض گیتوں سے سیاسی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ گیت کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کو عوام اور گھریلو عورتیں گاتی ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنکو گوئیے گاتے ہیں۔ پہلی قسم کے گیتوں میں فن موسیقی کا بہت کم حصہ ہوتا ہے دوسری قسم کے گیتوں کا تعلق زیادہ فن موسیقی سے ہوتا ہے عوام کے گیت زیادہ تر سیدھی سادی گھریلو زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں جس میں سیاں یعنی خاوند اور ساس و نند کا ذکر ہوتا ہے ماں بہنوں سے بات چیت اور چہل ہوتی ہے یا موسم کا ذکر ہوتا ہے اور اس موسم کا جو اثر گانے والی کے جذبات پر پڑتا ہے اس کا اظہار ہوتا ہے جیسے بارہ ماسہ کے گیت ہیں۔ خاوند کے ہجر و وصل کے سوا ان گیتوں میں عشق یا پریم کی داستان سرائی نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے موسیقی کے گیتوں میں ہر طرح کے گیت ہوتے ہیں۔ ایسے بھی جن میں خاوند یا کرشن جی کی بے اعتنائی کی شکایت اور اُن کے ساتھ عشق اور پریم کا اظہار ہے اور ایسے بھی جن میں غیر سے آنکھ لگائی جاتی ہے ہندی گیتوں میں جذبات کا اظہار ہمیشہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ عورت طالب ہوتی ہے اور مرد مطلوب۔ علم موسیقی کے قواعد کے مطابق صبح شام دوپہر کے راگ جُدا جُدا ہیں اسی طرح خاص موسموں کے بھی راگ ہیں جیسے ملہار، بسنت اور ہولی وغیرہ۔ صبح کے راگ از قسم بھیرویں وغیرہ میں اکثر فراق کے مضمون ہوتے ہیں کیونکہ صبح ہوتے ہی محبوب سے جدائی ہو جاتی ہے۔ شام کے گیت وصل یا انتظار کے ہوتے ہیں۔ علم موسیقی کے ماہران کا خیال ہے کہ یہ علم چونکہ حکماء نے ایجاد کیا ہے اس لئے انھوں نے مختلف امراض کا علاج مختلف راگ راگنیوں کے ذریعہ کرنا تجویز کیا تھا۔ کبھی زمانے میں اس پر عمل بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح بعض راگ ایسے تھے جن سے بن میں آگ لگ جاتی تھی جیسے دیپک راگ اور بعض گانوں سے مینہ برسنے لگتا تھا۔ دھرپد میں تان سین خیال میں شاہ سدا رنگ۔ ٹھمریوں میں واجد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے۔ بھجن میں سورداس اور میرا بائی مشہور ہیں اور دوہے گسائیں تلسی داس اور کبیر کے زبان زد خلائق ہیں۔ اس زمانہ کے بعد مظہر۔ تراب۔ خادم۔ مشتری۔ نظامی۔ اشرف علی۔ سلطان۔ فرحت۔ ثابت وغیرہ بہت سے گانے بنانے والے حضرات پیدا ہو گئے اور لطف یہ ہے کہ یہ سب مسلمان ہیں اور گیت سب ٹھیٹ ہندی میں ہیں۔ اس دو غلی ہندی میں نہیں جس میں سینما اور ریڈیو کے گیت بنانے والے حضرات طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ اور مضمون بھی زیادہ تر ٹھیٹ ہنود کے اعتقادات و رسم و رواج کے مطابق ہیں۔ ان حضرات کے گیت تقریباً ایک صدی سے ہر گوئیے کے منہ پر ہیں۔ اور مقبول خاص و عام ہیں۔ اور ان کو ہندو مسلمان عیسائی سب خوش ہو کر گاتے ہیں اور قومی یک آہنگی کا ثبوت صاحب بصرت کے لئے پیش کرتے ہیں اور اسلامی بے تعصبی کی لاجواب مثال قائم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندی راگ کو نہ صرف اپنایا بلکہ بے حد کمال اور ترقی پہ پہنچایا۔ نئے نئے راگ ایجاد کئے اور ہر قسم کے خوشگوار اختراع کئے۔

یوں تو بعض قوموں میں گھر والی عورتیں بیاہ شادی اور ہر خوشی کے موقع پر خود ہی آپس میں مل جل کر ڈھولک پہ گا لیتی ہیں چنانچہ ریڈیو پر ڈھولک کے گیت جو عام طور پر پنجابی میں ہوتے ہیں بہت مقبول ہیں مگر گھریلو جھولے کے گیت بہت مشہور ہیں خاصکر دلی اور نواح دہلی میں مثلاً سب سے زیادہ عام گیت تو یہ ہے۔

"جھولا کن نے ڈارو رے امریاں (ا نترہ) دو سکھی جھولیں دو ہی جھلادیں۔ چار مل گیاں جھول جھلیاں"

اِس گیت کے معنے صاف ہیں کہ کسی محبت کرنے والے نے باپ بھائی یا سیّاں نے امریوں میں جھولا ڈلوا دیا ہے۔ امریاں آم کے پیڑ کے جھنڈ کو کہتے ہیں اور دلی میں قطب صاحب

چھولی میں جھرنے کے پاس ایک جگہ امریاں کہلاتی ہے جہاں
ایک دو پرانے آم کے درخت نظر آتے ہیں۔ کسی زمانے میں
یہاں آم کا گھنا باغ ہوگا۔ لوگ میلوں کے موقعہ پر اب بھی ان امریوں
میں جھولا ڈالتے ہیں اور اپنی عورتوں کو جھولا جھلاتے ہیں۔ شاہی زمانے
میں اس جگہ شہزادیاں جب سیر کرنے آتی تھیں تو جھولے جھولتی
تھیں اور پاس ہی ایک پھسلن بنی ہوئی تھی اس پر سے پھسلتی
تھیں۔ اس گیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی عورتوں
میں جھولا جھولنے کا یہ دستور ہے کہ دو عورتیں تو پاؤں جوڑ کر جھولے
پر بیٹھ جاتی ہیں اور دو پاس کھڑے ہوکر جھونٹے دیتی ہیں اور
سب مل کر گاتی ہیں۔

دوسرا گیت عام طور پر یہ گایا جاتا ہے کیونکہ جھولے کی
رت برسات ہی میں ہے اور ان جھولے کی گیتوں کو ملہار میں گایا جاتا ہے۔
سکھی آئے بدروا جھوم کے راتوں رم سنگ کی سہیلیاں
سہیلیاں۔ مولا میں بھی پنچوں لاج سے۔ اس گیت کو حقانی
معنوں میں بھی لیا جاتا ہے کہ سب ساتھی تو خدا رسیدہ ہو
گئے کاش کہ ہمیں بھی یہ درجہ حاصل ہو جاوے۔ قوالی میں اس
گیت پر رقیق القلب حضرات کو بہت حال آتا ہے۔

اسی قسم کا ایک اور گیت ہے۔

دھیرے بہو ندیا دھیر بہو سیاں اتریںگے پار
گہری ہے ندیا ناؤ پرانی۔ مولا لگا دے بیڑا پار۔ ندیا
دھیرے بہو۔ معنے صاف ہیں کہ محبوب یعنی شوہر سفر سے واپس
آرہا ہے۔ اُسے پہاڑ اور دریا پار کرنے ہونگے اس لئے دعا ہے کہ
ندی اتر جائے کہ سیاں سہولت سے پار ہو جاوے پر گانے
والی ڈرتی ہے کہ ندی تو گہری ہے اور کشتی پرانی ہے اس لئے
خدا سے التجا کرتی ہے کہ تو ہی بیڑا پار کرے گا۔ اس گیت میں
بیوی کی اپنے شوہر سے دلی محبت معلوم ہوتی ہے۔ اس گیت
کو اس معنے میں بھی لیا جاتا ہے کہ ہم کو دنیا میں مشکلات کا سامنا
ہے خدا ہی ان کو رفع کرنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے
ہندوستانی ہر موقعہ پر خدا کی طرف رجوع ہوتے تھے۔

ایک اور گیت جھولے پر گایا جاتا ہے۔

شنو سکھی سیاں جوگیا ہوگئے۔ میں بھی جوگن ان کے ساتھ
پہنے لال لال کپڑے۔ جوگن کے لمبے لمبے کیس۔ شنو سکھی الخ
بیانے جنگل جھونپڑی جوگن نے دیا ہے ساتھ۔ سنو سکھی سیاں الخ۔
جوگیا بجائے بین۔ وہ بانسری۔ جوگن گائے ملہار۔ شنو سکھی سیاں الخ

اس گیت میں ہنود کی اُس رسم کی طرف اشارہ ہے کہ اکثر
لوگ دُنیا سے بیزار ہوکر جوگ اختیار کر لیتے تھے اور جنگل میں
جا بستے تھے۔ مگر ہندو عورت کی وفاداری کا بھی اس میں ذکر
ہے کہ اگر پتی جوگی ہوگئے تو کیا ہوا میں ہر حال میں اس کی
شریک ہے وہ بانسری بجائیگا تو میں ملہار گاؤنگی وہ گیروا
کپڑے پہنے گا تو میں اپنے بال کھول دونگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

دو ایک اور جھولے کے گانے ہیں جو چھوٹی بچیاں گاتی
ہیں۔ ایک ہے۔

"نیم کی نبولی پکی ساون کب آویگا
جئے میرا ماں کا جایا ڈولی بھیج بلائیگا
ڈولی کا ڈنڈا ٹوٹا گاڑی بھیج بلائیگا
گاڑی کا پہیہ ٹوٹا چادر بھیج بلائیگا"

مطلب یہ ہے کہ سسرال میں لڑکی گئی ہوئی ہے ساون
آنے کا انتظار کر رہی ہے کہ تیجوں پر جو گھر میں رسم ادا ہوگی
تو اُس کی شرکت ضروری ہے اُسے بلا یا جائے گا۔ نیم کی نبولی
ساون میں پکا کرتی ہے وہ بھی پک گئی اب دیر کیا ہے۔ پھر
اُمید بندھتی کہ بھیا مجھے جس طرح بھی ہوگا ضرور بلائے گا۔
ڈولی نہ ہوی تو گاڑی سہی اور گاڑی نہیں تو نری چادر بھیجیگے
جسے اوڑھ کر میں پیدل ہی چلی جاؤنگی۔ اس گیت میں بہن بھائی
کی محبت پر روشنی پڑتی ہے کہ بہن کو کس قدر اپنے بھائی پر اعتماد
ہے اور کس محبت سے وہ اس کا ذکر کرتی ہے۔ اور یہ کہ تیجوں
میں لڑکی کی شرکت ضروری ہے ایک اور گیت بچیوں کا ہے

کوئی نیا چاول لائیو رے دال ہے مسور کی
میرا بھیا چاول لائیو رے دال ہے مسور کی

اس گیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسور کی دال کے ساتھ
چاول کا جوڑ ہے۔

سیاسی گیت ۱۸۵۷ء سے قبل اور اس کے بعد انگریزوں
کے متعلق گائے جاتے تھے جو اب تلاش سے بھی دستیاب نہیں
ہوتے چند بول یاد ہیں اُن سے فرنگیوں کی طرز زندگی کے
متعلق جو عوام کا اس وقت خیال تھا وہ ظاہر ہوتا ہے یورپین
اُس زمانے میں اوّل تو بہت کم تھے دوسرے عوام ان کی اندرونی
زندگی اور خوبیوں سے واقف نہ تھے ظاہرا جو دیکھتے اور سنتے تھے

اس پر پردے قائم کر لیتے تھے۔ شراب خواری اور ناچ یہ دو ایسی چیزیں تھیں جس کے طریق استعمال کو ہندوستانی تحقیر سے دیکھتے تھے، چنانچہ ایک گیت کے بول ہیں:-

ہوٹل ناچے بوتل ناچے ناچے بوتل خانہ
بلبلی صاحب کی ٹوپی ناچے میم صاحب کا جامہ

اس گیت سے اس زمانے کے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے روحانی تعلقات پر روشنی پڑتی اور عوام کی بے باکی پر کہ اس واقعہ پر گیت جوڑ لئے۔ مندرجہ بالا تینوں گیتوں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس وقت تک انگریز کا وہ رعب نہ تھا جو اب ہے، اور ہندوستانی میں غلامانہ ذہنیت کا نہیں بلکہ کچھ اپنی برتری کا احساس تھا

گوتے اور رقاصہ و مغنیہ کے گیت کے بول راگ راگنیوں اور تال و سُر کے مطابق لگائے جاتے تھے۔ مطلب مضمون سے ۔۔۔ تھا جتنا کمال موسیقی کے اظہار سے تھا اس لئے بول بہت خفیف ہوتے ہیں البتہ موسموں کے گیت میں چونکہ موسم کی تصویر کھینچی جاتی ہے جس کے لئے تفصیل کی ضرورت ہے اس لئے ان میں بول زیادہ ہوتے ہیں۔ پہلے عام راگ راگنیوں کے گیتوں پر غور کیجیے۔ کافی راگ کی ٹھمری لیجئے:-

کاہے شام موری چولی مسکائی۔ کرو نہ ڈھٹائی موری چھوڑو کلائی
استرہ۔ اپنی گرج پر پیاں پڑت ہو
دیکھی شام توری سب چترائی۔ کاہے شام الخ
انترہ۔ شاد ہیا کرو کوئی جتن اب
ایک نہ مانوں میں تو رام دہائی۔ کاہے شام موری الخ

شام سے مراد کنہیا جی سے ہے سانوریا بھی وہی ہیں۔ اس ٹھمری میں ایک گوپی کنہیا جی کے چہل معشوقانہ انداز میں شکایت کر رہی ہے اور اپنی عصمت بچانے کے لئے رام دہائی دے رہی ہے۔

محبوب خفا ہو گئے ہیں عورت اپنی لاچاری کا اظہار جھنجھوٹی میں اس طرح کرتی ہے:-

مورا سیاں نہ مانے منائے ہاری۔ مورا سیاں الخ
(انترہ) بنتی کرت ہوں کر جوڑت ہوں سیس ہو چرنن جھکائے ہاری رے۔ مورا سیاں۔ بنتی یعنی منتی کر یعنی ہاتھ سیس سر اور چرنن پاؤں مطلب صاف ہے کہ عورت پیر

پڑ رہی ہے مگر مرد صاحب اکڑے ہوئے ہیں کسی طرح مانتے نہیں

اسی طرح ایک اور گیت کے چند لفظ یاد ہیں یہ گیت ۔۔۔ کنجریاں گایا کرتی تھیں۔

اپنی میم کو نچائے گورا نیم کے تلے۔ گورا نیم کے تلے گورا نیم کے تلے۔ اپنی میم کو نچائے۔ الخ

پہلے گیت میں شراب پینے سے جو چکر آتا ہے اور ساری دنیا چکر کھاتی نظر آتی ہے اس کی حقارت آمیز تصویر کھینچی ہے دوسرے میں کھڑے ہو کر منظر عام میں بے شرمی سے ناچنے پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ ایک اور گیت ہے جو تاریخی نقطہ نظر سے زیادہ اہم ہے، وہ بھی نا تمام ملا ہے مگر اس سے مطلب کھل جاتا ہے۔ گیت کے چند بول یہ ہیں:-

"دُھر بھگتے سے چلا فرچین پانچوں پیر منائے
رب مرا جانے رے پانچوں پیر منائے
دو مقام دلّی کے کئے تیجی گنگینہ گام
سارے گام میں جا کر ڈھونڈا سروّن ملتی نائیں
بھیدی نے بھید دیا دا کو۔ باجرہ کاٹتی سروّن پکڑی۔ دواتی ڈھونگے میں۔ رب مرا جانے رے الخ
ہاتھ پکڑ دا کو ہاتھی پہ بٹھایا سروّن روتی جائے
مرا رب جانے رے سروّن روتی جائے"

(اب جب سروّن کی شادی فرچین سے ہو جاتی ہے اور آپس میں ملنا جلنا ہوتا ہے تو بھیا بھتیجے سب مل لئے آدمی چند ملتا نائیں۔
(جب سروّن یورپین گھر میں پہنچتی ہے تو اس کو طرز رہائش بدلنے کی نصیحت ہوتی ہے)
پیڑھی کا بیٹھنا چھوڑ مری سروّن کرسی کا بیٹھنا سیکھ۔ رب جانے رے کرسی کا بیٹھنا سیکھ۔ چوکے کا کھانا چھوڑ مری سروّن میز پہ کھانا سیکھ . وغیرہ وغیرہ۔

اس گیت میں تین نام ہیں جن میں سے ایک تاریخی ہے اور اس کے ساتھ دوسرا نام بھی اب تاریخی ہو گیا۔ فرچین صاحب اصل میں فریزر صاحب تھے شاید یہ دلّی میں ریزیڈنٹ بھی رہ چکے۔ یہ معلوم ہوتا ہے یہ کسی جاٹنی پر جس کا نام سروّن تھا اور جو گنگینہ گاؤں کی رہنے والی تھی عاشق ہو گئے اور اسے کھیت کاٹتے ہوئے پکڑ بلوایا۔ پہلے اس کو صدمہ ہوا مگر جب وہ راضی ہو گئی اور چند عزیز بھی اس سے مل لئے تب ۔۔۔

بہت اس کی اصل دیکھی۔ اب نہ معلوم یہ اُمی چند اس کا باپ تھا یا چچا۔ بہر حال یہ سر تن کا گیت اب سے پچاس برس پہلے بہت مشہور تھا۔ اور عام طور پر گایا جاتا تھا، اور عام خیال یہ تھا کہ اس میں اصلیت ضرور ہے۔

ویسے گت بھی ہیں جن میں مرد بھی چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں کماچ کی ایک ٹھمری ہے:-

"گوری دھیرے چلو گگری چھلک نہ جائے۔

(انترہ) سر پر گگر پیر کروا۔ پتلی کمر کہیں لچک نہ جائے۔ گوری دھیرے چلو"

حلقے کے گیت سننے والوں کو خوش کرنے کے لئے اکثر عشق بازی اور دل لگی کے ہیں۔ جیسے

"دیکھو چھیلا لگائے چلا جائے نرموا کی چھیاں چھیاں (انترہ) نینن کجرا سالے دار ٹوپی۔ کوئی زلفیں بنائے چلا جائے۔ تھار نند و بنسی نہ دے۔ مرا جا چرائے لئے جائے"۔ ایک اور دادرا بہت مشہور ہے:-

"اُٹھ رے سپاہیا رے لشکر تیرو کوچ (انترہ) تجھکو تو پیاری ندیا مجھکو پیاری تری جان (انترہ) ایک تو میں راجہ کی بیٹی دوجے بھئی بدنام۔ اُٹھ رے سپیا پیارے ا ٹھ"

ایک اور ہے:-

"پیا پاپی۔ جاگے جگائے ہاری۔ اُت سے گدگا ات سے کاشی کہیں ہوئے جڑیا برہماسی۔ پیا پاپی ادات سنگ پیا پو سا ہست ہیں ہم سے نہ بولے بلائے ہاری۔"

پچھلے دونوں گیت ذو معنی ہیں۔ ظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ راجہ کی بیٹی کسی سپاہی پر عاشق ہو گئی۔ کوچ کا نقارہ بج رہا ہے اور سپاہی جی سو رہے ہیں، راجہ کی بیٹی اٹھا رہی ہے کہ جا ورنہ تیری جان پر بن جائے گی مگر اصل معنے یہ ہیں کہ غافل دنیا کے دھندوں میں ایسا پھنس گیا ہے کہ اپنی موت کو بھول گیا۔ دوسرے گیت کا مطلب بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔

بھجن کے گیت مذہبی رنگ میں ہوتے ہیں۔ کماچ میں ذیل کا بھجن قابل غور ہے:-

دیکھو ری اک بالا جوگی دوار موے آیا ہے رے
کانن کنڈل گلے مرگ چھالا سیس ناگ لپٹایا ہے رے
ماتھے واکے تلک چندرماں جوگی جٹا بڑھایا رے

لے بھکشا نکسی نند رانی موتی تھار بھرایا ہے رے
لو بھکشا جاؤ مرے جوگی آس کو مرے لال ڈرایا رے
نا چاہیئے مجھے دنیا دولت نہ چاہیئے مجھے مایا رے
اپنے گوپال کا درس دکھا دے جوگی درشن کو آیا رے
دیکھو ری بے بالک نکسیں نند رانی جوگی درشن پایا رے
سات بار پیکما ہے کر کے سنکھ ملائے سجا مارے
تین لوک کے استر جامی بالک روپ کھایا رے

یہ گیت قصہ طلب معلوم ہوتا ہے مگر بھید اتنا ہی ہے کہ جوگی کون تھا اور قصہ صاف ہے کہ جوگی لے بھکشا میں کنہیا جی کے درشن کی استدعا کی۔ اس میں ہنود کے جوگیوں کی تصویر نظر آتی ہے۔ پھر جیرات کی فیاضی اور جوگی کا دنیا و دولت سے بالاتر ہونا اور نند لال کے درشن کا اعتقاد ان سب امور پر روشنی پڑتی ہے۔

اسی طرح ہولی۔ بسنت۔ جھولے اور ہنڈولے کے گیتوں میں کنہیا جی کا کچھ۔ کچھ ذکر ضرور ہے اور غور سے دیکھا جائے تو کوئی گیت ایسا نہیں ہے جس میں کنہیا جی نہ براج رہے ہوں۔ مثلاً ہولی کے پہلے بول لے لیجئے:-

(۱) برج میں ہر کھیلت ہوری (۲) مری کا ہیکو بھاری کنہیا، رنگ ڈاری رے چونر (۳) ہولی کھیلت اب ہر گلی جا کو چاہت وا کو لیت پکڑ (۴) پنیا بھرن کیسے جاؤں سکھی ری پنگھٹ پر نند لال کھڑے ہیں۔ ایسی ہی مثالیں دیگر گیتوں کی مل سکتی ہیں مطلب یہ ہے کہ کنہیا جی عورتوں کو عشق الٰہی کے راستے پر ڈالنے کے لئے طرح طرح کے انسانی عشق کے بہروپ میں دکھائے جاتے ہیں یعنی عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں۔ اس موقعہ پر یہ بیان کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ مسلمان بھی اپنے بزرگوں پر ہولیاں لکھتے اور گاتے تھے۔ ایک ہولی یوں ہے۔

کیا رے گمان زندگی کا۔ ہندو ہووے برہمن پجارے پیڑ پوجے تلسی کا۔ پاک پکھنڈ دور کر دے دیو دھرم کا ٹیکا۔ مسلمان ہو ایمان سنوارے رکھے یاد نبی کا۔ روزہ نماز بندگی کیا رو وہ ہی مسلمان ٹھیکا۔ کلمہ پڑھے اسی نبی کا۔ وغیرہ

ایک اور گیت ہولی کے رنگ میں مسلمانوں کے اعتقاد کا اظہار کرتا ہے۔

[illegible] کے دیا بسیرا ہوئے
وہ پٹ بھیتر آن کے ثابت بچا نہ کوئے
[illegible] تن میں لگی جلن گو سب گات
ناری چھوتے سیر کے پڑے پھپھولے ہاتھ
[illegible] سودا لیا بیٹھ کہے سو بیر
جس گھر آؤ نا جات ہے وہ کا فرلے بیر
ہم پردیسی پاہونا آن کیا بسرام
بھور بھئے اٹھ جائینگے بسے تمہارا گام
سوا نہ کا ہو کے ہے پیتم کے گلے بانہہ
ڈھلتے ڈھلتے ڈوں گئی جیوں تر ور کی چھاں
[illegible] سنسار میں بھات بھات کا لوگ
سب ہل مل بیٹھے ندی ناؤ سنجوگ
[illegible] اندر بستا گی دھواں پرگھٹ ہوئے
وہ جانے جا تن لگے اور نہ جانے کوئے
سونا لینے پی گئے سونا کر گئے دیس
سونا ملے نہ پی ملے روپا ہو گئے کیس
[illegible] دو دعوی دور کر بن دعوے لوکاٹ
کتنے سودا کر گئے پنساری کی ہاٹ
[illegible] رہنا نہیں چلنا بسوے بیس
ایسی سیج سہاگ پر کون گزارو دیس
[illegible] پردیسی کی پریت کو سب کا من للچائے
اتنی وا میں کھوٹ ہے رہے نہ سنگ لگائے
[illegible] پا مری نہ من مرو مر مر جات سریر
آسا ترشنا نا مرے کہہ گئے داس کبیر
[illegible] بھونرا لوبھی پھول کا کلی کلی رس لے
کا نشا لاگا پریم کا سیر پھیرن نہ دے
[illegible] من تھا سب روپ تھا اک تھا سب کوئی
جوبن رتن گنوائیکے بات نہ پوچھے کوئی
[illegible] ہو لے گھر کو گھر کہیں سلپچے گھر کو گور
میں چلی گھر آپنے لوگ مچا دیں شور
[illegible] موتی اور دودھ رس ان کے یہی سبھاؤ
[illegible] پھاٹے سے پھر نا ملیں لاکھوں کرو اپاو
[illegible] دیکھت جگ چلا جگ دیکھت ہم جات
آپ تو بیٹھے رہیں اور کو پچھتات

موسم کے گیتوں میں بارہ ماسہ کا ذکر ضروری ہے جس میں بارہ مہینے کی کیفیت درج ہے سُنئے:-

(۱) پہلا ماس جب کاتک آن برہا ستانے لاگے ہیں بان (۲) اگھن ماس پیا گئے چھوڑ۔ جیسے چندا کو چکوی چکور (۳) پوس ماس پالا پڑے او ہکار بن پیا جیوئے نہ ہرا جاڑ۔ لپٹ کیسے سوؤں بنا گمبھیر۔ رہ رہ اٹھت کرجوا میں پیڑ۔ (۴) ماگھ ماس ات لاگے بسنت۔ آ بھو نہ آئے گھر کنت (۵) پھاگن میں سب کھولیں عبیر۔ کاپر چھڑکوں بنا گمبھیر (۶) جیت ماس بن پھولے ہیں پھول۔ ہم سے پیا ہمکا گئے ہیں بھول (۷) بیساکھ ماس سکھی کرنے کی بات۔ پیا ہی سوچ رہی ہوں دن رات (۸) جیٹھ ماس برکھا دت ہوتے۔ بر بردا پوچھے سب کو تلا (۹) اساڑھ ماس گھن گرجن لاگی۔ سورت سیج اٹھی میں جاگ (۱۰) ساون میں سکھی گرے ہنڈول۔ سب سکھی جھولیں کرت کلول۔ پر ہم کیسے جھولیں ہنڈول۔ جیرا اداکھت منہ سے نکسے نہ بول (۱۱) بھادوں ماس گرد ھتیر۔ بھر آئی ندیا اسڈ چلے سیر (۱۲) کنوار ماس بن کولت مور۔ ہمرے پیا ہمکا گئے چھوڑ (۱۳) لوند ماس سکھی پوری آس۔ گوری یوحن چلیں ملماس۔ گلے لپٹائے آپن سیام۔ پھیرے ملائے موسے رام۔

سال شروع ہوا تو محبت شروع ہوئی، دوسرے مہینے پیا چھوڑ گئے تیسرے مہینے جاڑا آیا اکیلا سویا نہ جائے غرضیکہ بارہ مہینے اسی طرح ہر موسم کے لحاظ سے ہجر میں تڑپتے تڑپتے گزر گئے کہیں جا کر لوند کے تیرہویں مہینے میں آس پوری ہوئی۔ اور شرم کا یہ عالم ہے کہ جیرا اداکھت منہ سے نکسے نہ بول۔ واہ رے ہندی عورت یہ ایسا چاند ہے تو تو چکور ہے۔ آس میں سارا سال گزار دیتی ہے اور دوسرے سے آنکھ لڑانے کے لئے چودھویں صدی کی عورت کی طرح بے شرمی سے یہ نہیں اچھل اچھل کر گاتی کہ کیوں نہ کروں پیار میں کیوں نہ کروں پیار تیری مجھے غیر سے محبت کرنے سے کون روک سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہندی گیتوں کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ انہیں بے شرمی اور بے حیائی بہت ہی کم ہے محبت ہمیشہ خاوند سے یا کرشن کنہیا سے۔ ہر موقع پر جذبات کو چھپانے کی کوشش ہے شوہر سے بھی ساس نند اور جٹھانی کی چوری سے محبت کا اظہار کرتی ہے اس سے مشرقی ممالک کی شرم و حیا پر روشنی پڑتی ہے کہ شوہر سے بزرگوں کے سامنے بات تک کرنے کی اجازت نہ تھی۔ دوسری خصوصیت [illegible] تیسری موسم و مقصدی مناظر کا اثر جذبات پر [illegible]

محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

فضل احمد کریم فضلی

"میرے پیارے! تم بڑے شریر ہو! لکھتے ہو اب میرا خط تمہیں ملا کرے گا! میرا دل دھک سے ہو گیا آگے پڑھتی ہوں تو (.....) لکھنے والا خود تمہاری آغوش میں ہوگا؟" مارے خوشی کے میرے ہاتھ سے خط گر پڑا، اُف، خوشی برداشت کرنی بھی کتنی مشکل چیز ہے۔ میں چیختی ہوئی کمرے سے باہر دوڑ گئی اور ڈالی (ہماری گڑیا) کی انگلیاں پکڑ کے ملنے لگی، ذرا سی بچی گھبرا گھبرا کے مجھے دیکھنے لگی، میں نے اُسے اُچک کے گود میں اُٹھا لیا اور زور سے پیار کر کے دھڑام سے زمین پر گرا دیا "تمہارے ڈیڈی آ رہے ہیں، تمہارے ڈیڈی آ رہے ہیں!" یہ سنتے ہی وہ جھٹ سے اُٹھ بیٹھی اور ہی مُنی مُنی تالیاں بجانے لگی جیسے اسے چوٹ ہی نہیں لگی، "ڈیڈی آ رہے ہیں، ڈیڈی آ رہے ہیں، ہم اور وہ ہوائی جہاز میں اُڑیں گے، ممی! تمہیں نہ لے جائیں گے" اچھا تمہیں بھی لے جائیں گے "اوہو ہو، ڈیڈی، ڈیڈی" اُف، اُف میں کتنی خوش ہوں، دو برس تو انتظار کے گذار دیئے مگر اب یہ چند دن کیسے گذریں گے، مجھے اپنی خوش قسمتی کا یقین نہیں آتا، جی چاہتا ہے چیخوں، بھاگوں، دوڑوں۔ جس دن تمہارا ہوائی جہاز آئے گا اس دن میرا کیا حال ہوگا، خیال آتے ہی بدن میں تھرتھری پیدا ہونے لگتی ہے"

حروف دُھندلے ہونے لگے اور میں مبہم خیالوں میں کھو سا گیا، پیارا اور شریر شوہر میرے قدموں کے پاس میری ہوئی چار لاشیں پڑی ہوئی تھیں، تھوڑی دیر ہوئی دریا میں ڈوبے ہوئے ہوائی جہاز سے نکالی گئی تھیں، ان میں سے ایک "پیارے اور شریر شوہر" کی بھی تھی، مگر یہاں ان بگڑی ہوئی شکلوں کو پہچاننے والا تھا ہی کون؟ کسے معلوم تھا کہ ان میں لکھنے والی کا پیارا اور شریر شوہر کون تھا اور کون وہ تھے جن میں کوئی پیارا اور شریر کہنے والا نہ تھا، شاید نہ پیارے اور شریر ہی نہ رہے ہوں یا رہے ہوں، کون جانے

بہرحال اب تو سبھی برابر تھے، ایک لاش کی انگلی میں انگوٹھی پہنے کا نشان نظر آیا، لاشیں نکالنے میں کچھ لوگوں نے بڑی مستعدی دکھائی تھی دیسیوں کی لاشیں نہیں بلکہ صاحب لوگوں کی، دیسی جیسے زندگی میں گھٹیا تھے ویسے ہی مرنے کے بعد بھی، ہاتھ خالی، جیب خالی، ٹینٹ خالی، صاحب لوگ جس طرح زندگی میں صاحبِ مال و متاع تھے اسی طرح ان کی لاشیں بھی تھیں، نوٹ سے بھرے منی بیگ، فاؤنٹین پن، سگریٹ کیس، انگوٹھی، قیمتی گھڑیاں وغیرہ برآمد ہو رہی تھیں، پہلے تو "صاحب" کی لاش چھونے میں بہادر جھجکے مگر بالآخر ایک منچلا ہمت کے محیط کا تیراک اور دست درازی کر ہی بیٹھا، ایک ٹانگ جو نظر آ رہی تھی پانی سے پکڑ کے کھینچی، لیکن اس بے ادبی پر صاحب نے ٹھوکر نہ ماری، لاش بھی جھنجھناتے اس سے نہ لپٹی بلکہ کچھ مال غنیمت ہی ہاتھ لگا، پھر تو دوسرے بہادر بھی چھم چھم پانی میں کودنے لگے، نوچ کھسوٹ شروع ہو گئی، ایک ایک لاش سے دو دو تین تین زندہ بھتنے لپٹ گئے، قسمت آزمائی کا اچھا موقعہ تھا، ایک جھپٹتا تھا دوسرا چھینتا تھا کچھ پلے پڑ گیا تو خیر ورنہ بعد میں جب پولیس آئی تو اطلاع کر دی، انگوٹھی کے نشان والی لاش کا معائنہ جاری تھا کہ ایک شخص نے آ کے انگوٹھی کے چور کا پتہ نشان بتایا، اُس نے اپنی آنکھوں سے انگوٹھی اُتارتے دیکھا تھا، چور منع کرنے سے بھی نہ مانا، پولیس نے چور کو گرفتار کیا، انگوٹھی برآمد ہوئی، شادی کی انگوٹھی، اس کے ایک حصے میں ای، ایچ (E.H) کھدا تھا، خط کے لفافے پر فلائٹ لفٹننٹ ایڈمنڈ ہارڈی —— Edmond Hardy لکھا تھا، E.H بظاہر Edmond Hardy کا مخفف تھا، یہ خط ایک چمڑے کے بیگ سے نکلا تھا، اسی کی وہ عبارت تھی جسے ابھی پڑھ رہا تھا، اس خط کے علاوہ بیگ میں اور بہت سے خطوط تھے اور خط لکھنے کا سامان وغیرہ، خط ہاتھ میں تھا اور خیال کہاں سے

گیا، وہی سب باتیں ذہن میں آنے لگیں جو ایسے موقعوں پر
آیا کرتی ہیں، مرنے والے کے دل میں کیا کیا ارمان رہے
ہوں گے، اسے کیا خبر رہی ہوگی کہ موت سر پر کھڑی ہنس رہی ہے،
اس کی بیوی کا کیا حال ہوگا وغیرہ وغیرہ۔" بیگ میں نمایاں طور
پر ایک بڑے سائز کی تصویر لگی ہوئی تھی، تصویر ایک خوبصورت
لڑکی کی تھی، چہرے پر دلکش مسکراہٹ تھی، ایک کونے میں
... ... (خاص تمہاری) لکھا تھا، دستخط تصویر
کے سیاہ حصہ پر تھے اور صاف پڑھے نہ جا سکے، اس تصویر
سے کچھ خیالی باتیں بھی ہوئیں، موجودہ مسکراہٹ اور آئندہ
آنسوؤں کے متعلق فرسودہ خیال آرائیاں۔

فرائض منصبی کی مشین جوان خیالات کے ریلے میں پڑ کے
تھوڑی دیر کے لئے رک گئی تھی پھر چلنے لگی مگر اسی قسم کے
خیالات آتے رہے کا دماغ میں ایسا ہی کرتے رہتے، ایک خفیف
سی ذہنی جنگ چھڑ گئی، دل میں خود بخود ان خیالات کی
تردید میں دوسرے قسم کے خیالات آنے لگے۔ ایسا ہوا ہی
کرتا ہے، لوگ مرا ہی کرتے ہیں، کوئی کسی طرح، کوئی کسی طرح
اکثر موت بے سان وگمان ہی آتی ہے، معلوم نہیں اس حادثہ
سے بڑے بڑے اور کتنے حادثے اسی وقت رونما ہو رہے
ہوں گے، آدمی اگر یہی سب سوچا کرے تو کوئی کام ہی نہ کر سکے
آخر اس تضیع اوقات سے فائدہ؟ فائدہ کی تھی ایک ہی رہی
کیا آدمی سب باتیں فائدے ہی کے لئے کرتا ہے!

خط کے حرف پھر صاف نظر آنے لگے "تمہاری پہنی ہوئی
قمیض اب تک میرے پاس ویسی ہی رکھی ہے میں نے اسے
دھلوایا تک نہیں، کیوں دھلواتی، اس میں تمہاری خوشبو
بسی ہے، خاص تمہاری، میں روز سوتے وقت اسے سونگھتی
ہوں، رات بھر میرا دماغ اس سے معطر رہتا ہے اور میں
اچھے اچھے خواب دیکھا کرتی ہوں۔ اُف تمہارے بدن کی خوشبو!
اب میں بجائے قمیض کے تمہارے تمام جسم سے یہ خوشبو
سونگھوں گی۔" میں رومال سے نتھنے بند کئے کھڑا تھا،
تماشائیوں میں کوئی ناک سکوڑ رہا تھا، کوئی ناک کپڑے سے
ڈھانکے تھا، قریب قریب سبھی چک چک تھوک رہے تھے!
اب چاہنے والی بیوی صاحبہ جسم کی خوشبو سونگھیں، لاش
اٹھانے پر کوئی راضی نہ ہوتا تھا، بڑی مشکل سے انہیں ملبے کے
نیچے دبا دیا گیا، حسن ... کے ڈھیر کے نیچے انگوٹھی والی لاش دبی
تھی اس پر لکڑی کا ایک نشان لگا کے "ایڈمنڈ ہارڈی" لکھ
دیا گیا، یہ نشان کب تک رہے گا! اسے کون دیکھنے آئے گا
آخر یہ حماقت کیوں؟ مگر اس کا کیا علاج کہ دل بعض وقت
اسی قسم کی حماقتیں بلا وجہ کیا کرتا ہے اور انہیں بلا وجہ
حماقتوں سے تسکین پاتا ہے۔ وہ زمین جہاں لاشیں پڑی
تھیں فنائل سے خوب دھو کے پاک کی گئی، مرنے والوں کی
چیزوں کا تفصیلی جائزہ لیا جانے لگا۔ انکی باضابطہ فہرست
تیار ہونے لگی، داروغہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا جاتا
تھا اور رکھتا جاتا تھا جیسے چوری کے مال کی فہرست تیار کر رہا
ہو، خطوط کے بیگ کو میں نے اپنے قبضے میں عارضی طور پر
لیا، کیوں نہ اس خیالی تصویر میں جو دماغ برابر بنائے جا رہا
تھا خط پڑھ پڑھ کے حقیقت کی رنگ آمیزی کر دوں، خط
پڑھنے کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔

"۱۵ رجنوری" میرے پڑوس میں تین چار دن ہوئے
ایک مسز براؤن آ کے رہنے لگی ہے، محلہ کی عورتوں سے اسکی
بڑی نوک جھونک رہتی ہے، طعنے دینے میں ماہر ہے۔ بڑا
اتراتی ہے بیچاری! اس کا میاں ہوائی بیڑے میں سارجنٹ
ہے، جب اسے معلوم ہوا کہ تم ہوائی بیڑے میں لفٹننٹ
ہو تو جھینپ گئی، اب مجھ سے کم ملتی ہے۔"

قبر پر نام لکھنے والے سے میں نے پوچھا کہ اس نے کیا نام
لکھا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ "ایڈمنڈ ہارڈی!"
میں "نہیں لفٹننٹ ایڈمنڈ ہارڈی لکھو!"

"۲ راپریل" مسز براؤن کو اس کے شوہر کا خط مہینوں
نہیں ملتا، تین مہینے سے کوئی خط نہیں آیا اور تمہارا خط
ہوائی ڈاک سے ہر ہفتے آتا ہے، تم میں اور دوسروں میں
کتنا فرق ہے! مجھے سب رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور
میں فخر سے مسکرا دیتی ہوں ....!"

"۱۰ راپریل" .. مسز براؤن کی سب ہیکڑی ختم ہو چکی
ہے، میرے سامنے تو یوں بھی ہیکڑی نہ کرتی تھی آج ڈاک
کا دن تھا، اس کے شوہر کا پھر کوئی خط نہیں آیا، مسز براؤن
ڈاکیے کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی، میں نے بڑی شان سے
تمہارا خط لیا، لیکن ویسے ہی وہ آ گئی، عجب بے تُک عورت ہے

اب میں اُس کے سامنے تمہارا خط کیسے پڑھوں، اس کا دل دُکھے گا
پڑھوں تو چین کیسے آئے، خوں تو اسے ٹالا، اس نے بھی دو
پوچھا کہ تمہارا خط آیا ہے یا نہیں، شاید یہ سوال پوچھتے ڈرتی
تھی، جواب جانتی ہی ہوگی، اس کے جانے کے بعد مجھے بڑا افسوس
ہوا، اب جا کے شام کو اسکی تسلی تشفی کروں گی . . . "

۳۰ راپریل" . آج قریب چار مہینے کے بعد مسز براؤن
کو اس کے شوہر کا خط آیا، بس چند سطریں ٹیڑھی میڑھی گھسی ہوئی
تھیں "اچھا ہوں کام میں مصروف، اُمید کہ تم بھی اچھی ہوگی" معلوم
ہی نہیں ہوتا کہ بچھڑی ہوئی بیوی کے نام اس کے دور
افتادہ شوہر کا خط ہے، اور تمہارے خطوط! ہر لفظ
محبت کا دہکتا ہوا انگارہ معلوم ہوتا ہے، پڑھتی ہوں اللہ
اس کی گرمی دل وجان میں سرایت کرتی محسوس کرتی ہوں،
جب دوسروں سے تمہارا مقابلہ کرتی ہوں تو مجھے اپنی خوش
قسمتی پہ پہلے سے بھی زیادہ ناز ہونے لگتا ہے . . . "

۷ر مئی" . . . . . کل ہماری ڈالی [illegible] کی سالگرہ
تھی، میں نے اسے جیتی جاگتی گڑیا لا دیا تھا، تمہارا تحفہ پا کے بہت
خوش ہوئی، اس کے قد کے برابر کی گڑیا، اُٹھانے میں مشکل ہوتی
ہے مگر شوق اتنا ہے کہ لئے لئے پھرتی ہے "ڈیڈی، ڈیڈی" کی
رٹ ہے، تم نے اسے دو برس کا دیکھا تھا، اب دیکھنا تو کہنا
کیسی بانکی نکل رہی ہے کہ کچھ نہ پوچھو، کیوں نہ ہو کس کی بیٹی
ہے! تم اتنا یاد آئے کہ میری آنکھیں خود بخود بھیگ گئیں. "

۱۴ر مئی" . . . . . میری پرانی سہیلی فلی [illegible]
آج مجھ سے ملنے آئی تھی، اپنے شوہر کی بیوفائی کا رونا رو رہی تھی
دراصل سہم گئی تھی، غصے کی بات ہی ہے، اُس کو اطلاع ملی ہے کہ
اس کا شوہر ہندوستان میں خوب رنگ رلیاں کر رہا ہے، وہاں
کی عورتوں کے متعلق مشہور ہے کہ بڑی جادوگر ہوتی ہیں، فلی
کا خیال ہے کہ اس کے شوہر پہ جادو کر دیا گیا ہے، ورنہ وہ ایسا
نہ تھا، مجھے اس کے جادو کے قصے پر بڑی ہنسی آئی، کتنی بھولی
بھالی ہے، میں نے تمہارا ذکر کیا، آخر تم بھی تو ہندوستان
میں ہو، تم پر تو کوئی عورت جادو نہ کر سکی، فلی کی سمجھ میں بات
کچھ آئی اور وہ بہت روئی، مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ناحق
اس کے شوہر کا تم سے مقابلہ کیا مگر کیا کرتی، مجھ سے نہ رہا گیا،
جب دوسروں پر تمہارے تفوق کا ذکر کرتی ہوں تو مجھے ایک
عجیب خوشی محسوس ہوتی ہے، مجھے کیا معلوم تھا کہ میری [illegible]
فلی کا صدمہ بڑھ جائے گا اور وہ اپنے شوہر کو نفرت کی
نظر سے دیکھنے لگے گی. . . . . "

۲۱ر مئی" . . . . . فلی مجھ سے برابر ملنے آتی ہے [illegible]
تمہارا اور ہندوستان کا ذکر کرتی ہے، شاید اس ذکر سے
کچھ تسکین ہوتی ہے، اپنا غم چھپائے رہتی ہے مگر [illegible]
پڑتا ہے، تمہاری تو اس کے شوہر سے ملاقات ہوتی ہوگی [illegible]
سمجھاؤ نا کہ یہ کیا کمینی حرکت ہے . . . "

۷ر جون" . . . یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ فلی کا
شوہر تمہارے سمجھانے سے راہ راست پر آ رہا ہے، تمہارے
کہنے کے مطابق میں فلی سے کہہ دوں گی کہ اس کے شوہر پہ کچھ
جادو ہو گیا تھا، مگر تمہیں اس جادو کا رد معلوم ہے اور تم
اُتار رہے ہو، بچاری کی کچھ نہ کچھ تسکین ہو جائے گی، ہندوستانی
جادوگر ہوں یا نہ ہوں مگر تم خود کس جادوگر سے کم ہو، تم نے
مجھی پر جادو کر رکھا ہے، نہیں، مجھے جادو کا قائل ہونا ہی پڑیگا."

۱۵ر جون" . آج غضب ہو گیا. فلی بچاری اپنے شوہر
کے خط کے انتظار میں بے چین تھی، خط کی جگہ تار آیا، شوہر کا
نہیں بلکہ شوہر کی موت کا، ہائے غضب خوفناک سیاہ [illegible]
کا تار لکھا تھا "آپ کا پیارا شوہر اپنے ملک کے کام آ گیا، ملک
آپ کو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھیگا" بچاری قریب قریب
بیہوش ہو گئی، میں نے بہت دلجوئی کی مگر کہیں پھونکوں سے
آگ بجھتی ہے، میں تسلی تشفی کی باتیں کر تو رہی تھی مگر خود میرا
دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا، ایک نامعلوم ڈر کا غلبہ تو یہ رات بھر
تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی، صبح [illegible] گئی
تھی . . . . . "

۲۲ر جون" . . . . . آج مسز براؤن بہت خوش ہے، اسکا
شوہر آنے والا ہے جس قدر بھی خوش ہو کم ہے، جس دن تم
واپس آؤ گے اس دن میرا کیا حال ہوگا، اُف، اُف . . . . "

۲۶ر جون" . . . . آج مسز براؤن کا شوہر آ گیا، مجھے
تو ذرا اچھا نہ لگا، گنوار سا آدمی ہے گنوارے قسم کا، آنے کے چند ہی
گھنٹے بعد بیوی پر بگڑنے لگا، اس طرح بات کرتا ہے جیسے معلوم
ہو ڈانٹ رہا ہے، اس کے زور سے بولنے کی آواز اس وقت
بھی آ رہی ہے . . . مگر مسز براؤن خوش ہے، خوب [illegible]

...یہ فلی کی حالت دیکھ کے مجھے مسز براؤن پر غصہ آ رہا ہے...؟

۱۴ جولائی کو ڈاک کا دن تھا، مسز ہارڈی کچھ بے چین سی تھی، ایک مبہم سا اضطراب، ابھی ڈاک کا وقت نہ ہوا تھا، اسکے دل میں کھٹکے سے ڈاکیہ جلد تو نہ آجائیگا، کبھی وہ کھسیانی، کبھی اسکے اوپر ہنستی مگر ہر پانچ دس منٹ کے بعد باہر جھانک ضرور آتی، اب تو ڈاک کا وقت بھی ہو گیا، وہ ڈاک خانے ہی چلی جائے بند دیکھ آتے جانے کے لئے اٹھی ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی، چشم زدن میں وہ دروازے پر تھی، نار والا سامنے کھڑا تھا، اس نے منہ لٹکائے کہا: — [illegible] اور ڈاک کا حاشیہ کا لفافہ نکال کر دیا، ویسا ہی لفافہ جیسا فلی کو ملا تھا......

کئی روز تک مسز ہارڈی کے لئے زمین آسمان میں اندھیرا ہی اندھیرا رہا، پھر ایک خفیف سی روشنی نظر آنے لگی، اسے اطلاع ملی کہ اس کے شوہر کا بہت کچھ سامان مل گیا ہے اور اس کے پاس بطور یادگار کے بھیجا جا رہا ہے، مسز ہارڈی کو یہ انتظار رہنے لگا کہ کب وہ سامان آئے اور کب وہ اسے آنکھوں سے لگا لگا کے اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نکالے!

وہ دن بھی آ گیا، مسز ہارڈی پاگلوں کی طرح ایک ایک چیز کو دیکھتی، سینے سے ملتی، آنکھوں سے لگاتی اور پیار کر کے رکھ دیتی، ڈالی بھی اپنی ماں کا ساتھ دیتی جاتی تھی بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ رو رہی تھی، اس نے چمڑے کا بیگ کھولا، اوپر ہی تصویر نظر آئی، اس نے انگلیوں سے آنکھیں دبا کے آنسو گرا دئے تاکہ تصویر صاف نظر آئے، ماں کی طرف اس نے معصومیت سے دیکھ کے پوچھا "ممی، یہ تصویر کس کی ہے؟"

مسز ہارڈی نے مستفسر نگاہوں سے دیکھا، پھر تصویر پر بالکل جھک گئی اور منجمد سی ہو گئی جیسے اس نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں جیسے کچھ دیکھنا چاہتی ہو صاف دیکھ نہ سکتی ہو، اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے چاروں طرف خلا ہے اور اس خلا میں دور سے آتی

ہوئی قہقہوں کی مہمتے بازگشت یہ قہقہے کبھی مسز براؤن کے معلوم ہوتے کبھی فلی کے کبھی خود اس کے پیارے اور شریر شوہر کے اور کبھی ان سب کے ملے جلے، یہ قہقہے بھی نوت ہو گئے، اب نہ اس کے کان کچھ سنتے تھے نہ آنکھیں دیکھتی تھیں، آنکھوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا خالی ڈھیلے رہ گئے ہیں، نگاہیں کافور ہو چکی ہیں، وہ اس عالم میں معلوم نہیں کتنی دیر رہتی مگر مسز براؤن کی کرخت آواز نے اسے چونکا دیا اور وہ ایک خوفناک چیخ مار کے کمرے سے باہر بھاگ گئی. ....

تھوڑی دیر بعد وہ ایک حالت جذب میں آئی وہ تمام سامان ادھر ادھر پھینکنے لگی، کبھی ہاتھ سے لگاتی کبھی پاؤں سے ٹھکراتی، مسز براؤن ہکا بکا رہ گئی، ایک آدھ دفعہ اس نے سمیٹنے کو کہا، مگر کون سنتا ہے، اتنے میں فلی آ گئی، اس نے بڑی محبت سے مسز ہارڈی کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا "نہیں، ڈارلنگ، نہیں، ایسا نہیں کرتے، اس کی روح کو تکلیف ہوگی، مجھے دیکھو .. "

مسز ہارڈی سسکیاں لے کے صوفے پر گر پڑی، اس نے اپنا منہ گدی میں چھپا لیا اور اس زور شور سے سسکیاں لینا شروع کیا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے صوفہ بھی سسکیاں لے رہا ہے، فلی اپنی سہیلی کے سر پر تسلی و تشفی کا ہاتھ پھیرتی رہی جیسے اپنا غم بھول گئی ہو، مسز براؤن نے آہستہ آہستہ سامان کا معائنہ شروع کیا، بڑبڑاتی جاتی تھی "اچھی محبت ہے کوئی اس طرح بھی اپنے پیارے شوہر کی چیزوں کو ٹھکراتا ہے، میں ایسا کروں تو میرا میاں مجھے قتل کر ڈالے"!

فلی کو اپنی سہیلی پر اعتراض برا لگا اور اس نے بگڑ کے کہا "تم جانو نہ تمہارا شوہر کہ محبت کیا چیز ہے اور کیا کیا صورتیں اختیار کر سکتی ہے"!

مسز براؤن ایک طنزیہ "ہونہہ" کہہ کے چپ ہو گئی، اسکی نظر کھلی ہوئی تصویر پر پڑی جسے ڈالی اب تک گھورے جا رہی تھی جیسے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو کہ آخر اس تصویر میں کون سی ایسی بات تھی جس نے اس کی ماں کی حالت دگرگوں کر دی، مسز براؤن نے تصویر اٹھا کے غور سے دیکھا اور عجیب انداز میں بولی۔ "[illegible]" اس [illegible] نے فلی کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور وہ اٹھ کے مسز براؤن

کے پاس گئی، تصویر کو اس نے بھی غور سے دیکھا اور پھر مسز ہارڈی کے پاس تصویر لے جا کے پوچھنے لگی تم نے یہ دیکھی ڈارلنگ؟ کون ہے یہ؟"

مسز ہارڈی چیخی۔ "اوہ! چلی جاؤ یہاں سے خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

مسز براؤن نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور للی سے مخاطب ہو کے کہا "تمہارے شوہر کے کاغذات میں بھی کسی غیر عورت کی تصویر نکلی تھی جس پر اس طرح "خاص تمہاری لکھا ہو؟"

للی "نہیں تو اس کے پاس تو صرف میری تصویر تھی۔"

مسز براؤن نے بڑی شان کی کھکھاری جیسے کمان کھینچ چکی ہے اور اپنے تمام طنز کے تیر چھوڑنے والی ہے، ابھی اس نے "اوہ یا" ہی کہا تھا کہ مسز ہارڈی شیرنی کی طرح بپھر گئی، تصویر اس نے جھپٹ کے چھین لی، آنکھیں زہر آلود، چہرہ غضبناک، آواز میں روحانی کرب اور گھٹی ہوئی چیخ، دہ گرجی "تم لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے۔ . یہ تصویر . یہ تصویر میری ایک . سہیلی . کی ہے ... میں نے ہی ... ایڈمنڈ کو دی تھی . خاص میرا ایڈمنڈ ... نہیں، نہیں اس کی بہن کی ہے ..... نہیں، نہیں، میری ہے خود میری ہے .. میری ہے خاص میرا، ایڈمنڈ . میرا اپنا ایڈمنڈ . . نہیں . . نہیں . . . . ."

غزل

جو دل پہ گزرتی ہے وہ سمجھا نہیں سکتے
ہم دیکھنے والوں کو نظر آ نہیں سکتے

بے قیدِ رسوم آئی ہیں گلشن میں بہاریں
اب ہاتھ گریباں کی طرف جا نہیں سکتے

رنگینیٔ مستقبلِ روشن ہے نظر میں
ہم تلخیٔ ماحول سے گھبرا نہیں سکتے

مغرور نہ ہو فصلِ خزاں آ کے چمن میں
ایسے بھی ہیں کچھ پھول جو مرجھا نہیں سکتے

مانا وہ مجھے اپنی نگاہوں سے گرا دیں
لیکن مرے احساس کو ٹھکرا نہیں سکتے

اربابِ خرد لاکھ سبک گام ہوں لیکن
بے فیضِ جنوں راہِ طلب پا نہیں سکتے

تعمیر کا اقدام ہے تخریبِ مکمل
کچھ کھو نہیں سکتے ہیں تو کچھ پا نہیں سکتے

مانا کہ ترے لطف و کرم خواب ہیں لیکن
ہر شخص کو یہ خواب نظر آ نہیں سکتے

اللہ رے مجبوریٔ آدابِ محبت
ہم اپنے کئے پر بھی تو پچھتا نہیں سکتے

کیا کہیے شکیل اُن کے مقدر کی حکایت
جو اہلِ وفا دادِ وفا پا نہیں سکتے

شکیل بدایونی

ایک دہقانی کُنبہ

نیند کے آئے جو بجے سرِ شام پھر — چشم بے خواب تھی خواب کی منتظر
اِتنے میں آ کے پِسّو نے آواز دی — نیند آتی ہوئی خوف سے اُڑ گئی
گھِر گئے نرغۂ فوجِ موذی میں ہم — مچھروں کی جفا! کھٹملوں کا ستم
کروٹیں ہم بدلتے رہیں دمبدم — یہ ستمگر لہو پی کے ہوں تازہ دم
خون پیتے ہیں ٹلتے نہیں بے پئے — جسم کے سارے حصّوں پہ دوڑا کئے
سر پہ چڑھ کے جو اُترے جھکے پاؤں پر — ہے ہمارے سراپا پہ ان کا اثر
صُبح ہونے کو ہی ہم ہیں مُضطر ابھی — مُنہ کھجایا کبھی، سر تلاسا کبھی
سُوئے گردن بڑھا ہاتھ بیساختہ — کر دیا ظالموں نے خرد باختہ

اُٹھ کے بیٹھے رہے یا ٹہلتے رہے
ہاتھ دونوں بہرحال چلتے رہے

یہ رطوبت یہ ماحول یہ گندگی — موریوں کی یہ افراط یہ خستگی
یاں کبھی ہلت آفیسر آتا نہیں — ہم غریبوں کی اسکو بھی پروا نہیں
جھونپڑی یہ ہماری یہ ناچاریاں — طُرفہ ٹھنڈی ہوا کی دل آزاریاں
خوابِ راحت کے ساماں کی اتنی کمی — ایک بوسیدہ کمل میں سات آدمی
دل میں اسدرجہ سونے کا ارماں تپاں — نیند شرمائے یوں لے کے انگڑائیاں!
نیند کل آئی تھی کیا جو آج آئے گی — نیند کی آرزو یونہی ترپائے گی
کیوں نہ دیکھیں ہمیں انجم دیدہ ور — قایم اللیل ایسے کب آئے نظر؟
قایم اللیل ہوتے تھے دیندار ہی — بن گئے قایم اللیل نادار بھی

تلملاتے ہوئے رات بھر جاگنا!
صُبحدم کھیتیوں کی طرف بھاگنا!

علی منظور

حبیب اشعر دہلوی

غلامی

انسان، زندگی کا غلام ہے اور یہ غلامی اس کے دنوں کو ... دخواری کے پردہ میں لپیٹ دیتی اور اس کی راتوں کو ... کے سیلاب میں غرق کر دیتی ہے۔

میری پیدائش اولیں کو سات ہزار برس ہوئے، لیکن ... تک میں نے تسلیم پیشہ غلاموں اور طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے قیدیوں کے سوا، کسی کو نہیں دیکھا۔

میں نے دُنیا کے مشرق و مغرب کا سفر کیا، زندگی کی تاریکی اور روشنی کے گرد چکر لگائے قوموں اور نسلوں کو ... غاروں سے نکل کر، محلوں میں جاتے دیکھا، لیکن ... ہوئی گردنوں، زنجیروں میں جکڑی ہوئی کلائیوں اور بتوں ... سے جھکے ہوئے گھٹنوں کے سوا اور کچھ مجھے نظر نہ آیا۔

... سے پیرس اور نینوا سے ... تک میں انسان ... ساتھ ساتھ رہا، میں نے اس کے نقوش قدم کے برابر اس کی ... کے نشانات، ریگ زار پر مرتسم دیکھے اور وادیوں اور ... کو زمانہ اور قوموں کے نالہ و ماتم کی صدائیں دہراتے سنا۔

... میں شاہی محلوں، عام گزرگاہوں اور عبادت کدوں میں ... قربان گاہوں اور منبروں کے سامنے کھڑا ہوا، اور ... دیکھا ... مزدور، تاجر کا غلام ہے اور تاجر، سپاہی کا ... سپہ سالار کا غلام ہے اور سپہ سالار بادشاہ کا، بادشاہ، پادری ... غلام ہے اور پادری، صنم کا۔ اور صنم، مٹی ہے، جسے گوندھ کر شیطانوں ... کھوپڑیوں کے ڈھیر پر نصب کر دیا ہے۔

میں امیروں اور طاقت وروں کی حویلیوں میں داخل ہوا، ... اور کمزوروں کی جھونپڑیوں میں گیا ہاتھی دانت کی تصویروں ... طلائی ساز و سامان سے سجے ہوئے کمروں میں بیٹھا یاس و نومیدی ... بھوتوں اور موت کے سانسوں سے مکدر کوٹھڑیوں میں ٹھہرا ... دیکھا بچے دودھ کے ساتھ غلامی کا زہر پی رہے ہیں، لڑکے ... کے ساتھ انکسار و خاکساری کا سبق سیکھ رہے ہیں، ... عاجزی اور وفا بازی کے استر لگے ہوئے لباس پہن ... رہی ہیں، اور عورتیں اطاعت و فرماں برداری کے بستروں میں سو رہی ہیں۔

میں قوموں کے ساتھ ساتھ، گنگ کے کناروں سے، فرات کے ساحل، نیل کے دہانہ، سینا کے پہاڑ، ایتھنز کے میدانوں، روم کے کلیساؤں، قسطنطنیہ کی گلیوں، پیرس کی سیرگاہوں اور لندن کی عالی شان عمارتوں تک گیا اور دیکھا، ہر جگہ غلامی عظمت و جلال کے جلوس کے ساتھ ہے لوگ اس کی قربان گاہ پر نوجوان لڑکوں اور کنواری لڑکیوں کو بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اسے "دیوتا" کے نام سے پکارتے ہیں، اس کے قدموں میں عطر شراب بہاتے ہیں اور اسے "بادشاہ" کا لقب دیتے ہیں، اس کی مورتیوں کے سامنے عود و لوبان سلگاتے ہیں اور اسے "پیغمبر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہوئے، اس کے سامنے ... کرتے ہیں اور اسے "قانون" سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے لئے لڑتے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور اس کا نام "وطنیت" رکھتے ہیں، خود کو اس کی مرضی کے سپرد کر دیتے ہیں اور اسے "زمین پر خدا کا سایہ" سمجھتے ہیں، اس کی ارادت و عقیدت کے جوش میں اپنے مکانوں کو آگ لگانے اور عمارتوں کو ڈھانے ہیں اور اسے "بھائی بندی" اور "مساوات" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس کی راہ میں جان توڑ کوششیں کرتے ہیں اور اسے "مال و تجارت" کہتے ہیں۔

بالفاظ دگر، وہ ایک حقیقت ہے اور ایک جوہر جس کے متعدد نام ہیں اور مختلف مظاہر، بلکہ وہ ایک ازلی اور ابدی روگ ہے، جس کے جلو میں مختلف قسم کی بیماریاں اور جراحتیں ہوتی ہیں جنہیں اولاد، روح حیات کی طرح، اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پاتی ہے اور جن کے بیج ایک زمانہ، دوسرے زمانہ کی مٹی میں ڈالتا ہے، جس طرح ایک فصل کے بیج، دوسری فصل میں بوتے جاتے ہیں۔

غلامی کی جتنی قسمیں اور صورتیں میں نے دیکھیں ہیں، بہت عجیب ہیں۔

اندھی غلامی ——— جو انسان کے "حال" کو اس کے اسلاف

بخش دیتی ہے اور اس کے نفس کو ان کی رواجی پابندیوں کا اسیر کر کے اسے پہلی روحوں کے لئے ایک نیا جسم اور بوسیدہ ہڈیوں کے لئے ایک قفل شدہ قبر بنا دیتی ہے۔

اندھی غلامی ———— جو مرد کی زندگی کو اس عورت کے ساتھ پابند کر دیتی ہے جس سے وہ نفرت کرتا ہے اور عورت کے جسم کو اس شوہر کے بستر سے وابستہ کر دیتی ہے جس سے وہ بیزار ہوتی ہے اور اس طرح ان دونوں کو زندگی کے ایک ایسے رشتہ میں پرو دیتی ہے جو پاؤں اور جوتی کے رشتہ سے مشابہ ہوتا ہے۔

بہری غلامی ———— جو افراد کو گرد و پیش کے رجحانات کی تقلید ان کے رنگ میں رنگ جانے اور انہیں کا لباس پہننے پر مجبور کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ عالم اصوات میں صدائے بازگشت اور عالم اجسام میں پرچھائیوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔

لنگڑی غلامی ———— جو استقلال و استقامت کے پٹھوں کی گردنوں پر حیلہ کاروں کی سیادت کا جوا رکھ دیتی اور اہل ہمت کے ارادوں کو عظمت و شہرت کے لالچیوں کی خواہشوں کے حوالے کر دیتی ہے جس کی بناء پر وہ آلات کی مثال ہو جاتے ہیں جنہیں انگلیاں پہلے حرکت دیتی ہیں، پھر ٹھہرا کر توڑ ڈالتی ہیں۔

ادھیڑ غلامی ———— جو بچوں کی روحوں کو وسیع فضا سے سیاہ بختی کے ان مسکنوں میں پھینک دیتی ہے جہاں ضرورت، جہالت کے ہم پہلو مقیم ہوتی ہے اور ذلت، مایوسی کے جوار میں اور یہ بچے بدنصیبی کے سائے میں جوان ہوتے، مجرموں کی طرح زندگی بسر کرتے اور ذلت کے ساتھ مر جاتے ہیں۔

رنگ برنگی غلامی ———— جو اشیاء کو ان کی واقعی قیمت ادا کئے بغیر خرید لیتی اور انہیں ان ناموں سے پکارتی ہے جو ان کے اصلی ناموں سے مختلف ———— بلکہ ان کی ضد ———— ہیں، چنانچہ وہ مکاری کو عقلمندی، بکواس کو معرفت، کمزوری کو نرم دلی اور بزدلی کو انکار و بے نیازی سے تعبیر کرتی ہے۔

خمیدہ غلامی ———— جو کمزوروں کی زبان کو خوف و دہشت کے زیر اثر جنبش دیتی ہے چنانچہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں، جنہیں وہ نہیں سمجھتے، ان چیزوں کا اظہار کرتے ہیں، جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور بیچارگی کے ہاتھوں میں کپڑے کے اس تھان کی مثال ہو جاتے ہیں، جسے جب چاہو، لپیٹ لو اور جب چاہو کھول دو۔

کبڑی غلامی ———— جو ایک قوم کو دوسری قوم کے قوانین کی طرف لے جاتی ہے۔

متعدی غلامی ———— جو شہزادوں کے سر پر حکومت کا تاج رکھتی ہے۔

سیاہ غلامی ———— جو بے خطا مجرموں کی اولاد کو ذلت و حقارت کے ناموں سے پکارتی ہے۔

اور خود غلامی جیتی ہے اس غلامی کا جسے "قوت استمرار" کہتے ہیں۔

جب میں قوموں کی ہمراہی سے تھک گیا اور میری نگاہ نسلوں اور قبیلوں کو دیکھتے دیکھتے اکتا گئی تو پرچھائیوں کی وادی میں تنہا جا بیٹھا، جہاں گزرے ہوئے زمانے کے سائے روپوش اور آنے والے زمانے کی روحیں گھات میں بیٹھی تھیں ———— وہاں، میں نے دیکھا ایک نازک سایہ، سورج پر نگاہیں جمائے، تنہا چلا جا رہا ہے میں نے اس سے پوچھا

"تو کون ہے اور تیرا نام کیا ہے؟"

جواب دیا

"آزادی۔"

میں نے پھر سوال کیا

"اور تیرے بیٹے کہاں ہیں؟"

"ایک سولی پر چڑھا دیا گیا، دوسرا دیوانہ ہو کر مر گیا اور تیسرا ابھی پیدا نہیں ہوا۔"

یہ کہا اور لہر کے پیچھے میری نگاہوں سے روپوش ہو گیا

(جبران خلیل جبران)

محمد نصیر الدین

مہوبہ

بندیلکھنڈ کے مشہور راجہ دھنگ نے سلطان سبکتگین سے ۹۹۱ء میں شکست کھانے کے بعد پہاڑی علاقوں کے ناقابل عبور حصّوں میں قصبہ مہوبہ کی بنیاد ڈالی۔ جو اب جھانسی مانکپور لائن پر ایک سر سبز و شاداب خطہ بن گیا جہاں بندیلکھنڈ کے اجڑے ہوئے دیکھنے کے بعد تھکی ہوئی آنکھوں میں خنکی اور سرور محسوس ہونے لگتا ہے۔

مہوبہ کا آخری خودمختار راجہ، راجہ پرمل تھا جو فطرتاً بزدل اور ڈرپوک تھا مگر اس کی رانی اس کے بالکل برعکس بہادر اور جفاکش تھی۔ راجہ پرمل کا زمانہ وہی تھا جو دہلی میں پرتھوی راج چوہان سے چند کا تھا۔ پرتھوی راج بھارت ورش کا راشٹر بنانا چاہتا تھا اس لئے اس نے راجہ پرمل پر حملہ کیا اور مہوبہ کا سجرا اور مہوبہ فتح کر کے ان علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کیا۔ چند دنوں کے بعد شہاب الدین غوری نے اپنے دوسرے حملے میں پرتھوی راج کا خاتمہ کر دیا اور ایک بار پھر بندیلکھنڈ کا ملک راجہ پرمل کے زیرنگیں آگیا۔

راجہ پرمل کی لافانی شہرت کا باعث خود اس کی اپنی شکست تھی جو اسے پرتھوی راج کے ہاتھوں ہوئی اور دوسری وجہ اس کے سب سے بڑے بہادر اور مشہور عالم بانکے سپاہی الہا، اودل اور [illegible] تھی جو علی الترتیب اس کے سپہ سالار جسراج اور بچھراج کے بیٹے تھے۔

ان تینوں بھائیوں نے وسطی ہندوستان میں اپنی بہادری اور جنگجوئی کی وجہ سے اتنی شہرت پائی ہے کہ آج ان کا نام بندیلکھنڈ کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔ شام کے وقت جب دیہات کے لوگ چوپال کے نیچے جمع ہوتے ہیں تو الہا اودل کے قصے گا کر پڑھے جاتے ہیں۔ یہ قصے بندیلکھنڈ کی ٹھیٹ زبان کی نظم میں ہیں اور ان میں شروع سے آخر تک ان بھائیوں کے محیر العقول کارناموں کا پرجوش ذکر ہے۔ کہیں یہ بھائی جے چند راجہ قنوج کو شکست دیتے ہیں اور کہیں پرتھوی راج سے دشمن راجہ پرمل کے بدلے لینے کے لئے اٹھالاتے ہیں۔ ان قصوں میں زیادہ تر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور جہاں کہیں ہمارے ہیرو بُری طرح گھر جاتے ہیں تو کوئی غیبی قوت آ کر ان کو اپنی پناہ میں لے لیتی ہے۔ قصے کے واقعات کو سن کر عقل سلیم طنز سے مسکراتی ہے مگر یہی واقعات کسانوں کے گنوار خیالات میں آگ لگا دیتے ہیں اور ان کی بھدی اور جاہل تخیلات کی دنیا میں بھوت پریت جادو اور ٹونے سے کچھ عجیب قسم کا تہلکہ مچ جاتا ہے۔ قصہ جوں جوں آگے بڑھ کر سنسنی خیز ہوتا ہے یہ دہقان ڈھولک پر پڑتی ہوئی تھاپوں کے ساتھ ساتھ خود بھی جھومنے لگتے ہیں اور ان کے سانس زور زور سے چلنے لگتے ہیں۔ اس وقت ان کی چلموں کی دبی ہوئی چنگاریاں دہکنے لگتی ہیں اور رات کی تاریکی میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے عفریت سانس لے رہے ہیں۔

الہا اودل کے قصوں کے ۵۲ باب ہیں اور ہر باب میں ان بھائیوں کی بہادری کی ایک نئی داستان ہے۔ یہ داستانیں زیادہ تر رزمیہ ہیں مگر ان میں حسن و عشق کی چاشنی بھی ہے، راج دربار کی گہما گہمی اور رونق بھی ہے، خوفناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے بھوت پریت اور جادو کے کرشمے بھی ہیں۔ الغرض یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ الہا اودل کو بندیلکھنڈ میں وہی ہر دلعزیزی اور اہمیت حاصل ہے جو صوبہ پنجاب میں ہیر رانجھا یا سوہنی ماہیوال کو۔ الہا اودل وسطی ہندوستان کے باشندوں کے لئے لیجنڈری ہیرو ہو کر رہ گئے ہیں اور چونکہ یہ مہوبہ کے رہنے والے تھے اس لئے اب تک مہوبہ کے ہر فرد و بشر کی خیالی دنیا میں الہا اودل کی حکومت ہے۔ الہا اودل کے ان قصوں کو سننے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان بھائیوں نے دہلی، اجمیر اور قنوج کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی مگر تاریخی روشنی میں حقیقت ان کے بالکل برعکس ہے۔ جب پرتھوی راج نے راجہ پرمل سے قلعہ کالنجر چھین کر مہوبہ کو اپنی سلطنت میں ملا لیا تھا تو بندیلکھنڈ میں چندیلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

چندیلوں کی یہ شکست اور وہ بھی اپنے ہم چشموں کے ہاتھوں ایک شرمناک قومی سانحہ تھا جس کے خلاف ان کی روح نے بغاوت کی اور

[illegible] کی یاد کو مٹانے کے لئے اپنے بانکے سپاہیوں (الہا اودل)
[illegible] کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ یہی وہ زخمی
[illegible] ہے جسے ہم الہا اودل کی کہانیوں میں سنتے
[illegible] بیان کیا ہے چوہان راجپوتوں کے خلاف نہ پہلے
[illegible] کی بوچھار جگنک کے نذر سے پرتھوی راج کی عفیفہ بہن تک نہ
پہنچ سکی ہے۔ ان کہانیوں میں چوہان راجپوتوں کی جس جس
طرح درگت بن سکتی ہے وہ بنائی گئی ہے اور چندیلوں نے اپنے
ہیروں سے خوب خوب کام لئے ہیں۔ ایسے نادر اور بعید از خیال
کام جو صرف اکاش پر دیوتا یا مہابھارت میں پانڈو لے سکتے تھے۔
الہا اودل کے قصے شکست خوردہ چندیلوں کے جلے بھنے اور
حسد کے ستائے ہوئے دلوں کی پکار ہیں جنکو سنکر ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ یہ دہکتی ہوئی چنگاریاں الہا اودل کی تلواروں میں
بھر گئی ہیں اور یہ تلواریں اپنی بے پناہ کاٹ سے ساری دنیا
کا دل چھلنی کر دیں گی۔ چندیلوں کی یہ کوشش کہ چوہانوں سے
شکست کی یاد مٹ جائے کامیاب ہوئی۔ اور آج ایک ہزار
برس سے الہا اودل کے قصے پڑھنے یا سننے والا کبھی بھولے سے
بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ معاملہ اسکے بالکل برعکس تھا۔

قطب الدین ایبک، ہندوستان کا پہلا سلطان جب
شمالی ہند کی فتوحات سے فارغ ہو چکا تو اس کی نگاہ بندیلکھنڈ
کی طرف اٹھی جہاں راجہ پرمل کی حکومت تھی اور چندیلے اپنی گردن
میں اکڑ پیدا کئے تنے کھڑے تھے۔ انکی موجودگی میں دہلی کی نئی
قائم شدہ حکومت مستقل خطرہ میں تھی اس لئے سلطان
قطب الدین نے اپنی پہلی فرصت میں بندیلکھنڈ پر دھاوا بول
دیا۔ چندیلے جہاں اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے تھے وہاں وہ
اپنے ملک کے ناقابل عبور دریا، پہاڑ اور وادی کی پاسبانی
پر بھی اعتماد رکھتے تھے مگر سلطان قطب الدین ایک نئے جوش
اور ولولے کے ساتھ بڑھ رہا تھا، وہ بڑھتا ہی گیا حتی کہ کالنجر
کی فلک بوس فصیلیں اس کی نگاہوں کے سامنے تھرتھرا گئیں۔
راجہ پرمل کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے فوراً صلح کر لینی
چاہی مگر اس کی شیر دل رانی مالن دیوی نے اپنے بزدل شوہر کو
للکار کر لڑنے پر آمادہ کیا۔ راجہ پرمل نے زور آزمائی کی، اس کی
رانی نے اس کا ہاتھ بٹایا اور خوب خوب داد شجاعت دی مگر
قطب الدین جیسے سپہ سالار کے سامنے ایک تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔
آخر تنگ آکر راجہ پرمل نے ہتھیار ڈال کر صلح کرنا چاہی مگر عین اسی وقت
اس کا انتقال ہو گیا اور راجہ کے وزیر آج دیو نے اپنے مرحوم راجہ
کی منظور کی ہوئی شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ تلواریں ایک
بار پھر میانوں سے نکلیں، قلعہ کالنجر کے نیچے کشتوں کے پشتے
لگ گئے، خوب گھمسان کا رن پڑا مگر چندیلوں کا ستارہ غروب
ہو چکا تھا خورشید اسلام مطلع ہند پر طلوع ہو چکا تھا چندیلے
شکست کھا کر پچاس ہزار کی تعداد میں قید ہوئے اور قلعہ کالنجر
قطب الدین کے زیر حکومت آ گیا۔

الہا اودل کے زمانہ میں مہوبہ اپنے عروج پر ہوگا ان بانکے
سپاہیوں کے کارنامے سنکر دشمن کے راج خوف کھاتے
ہونگے اور بندیلکھنڈ کی اس راجدھانی کو نزدیک و دور سے دیکھنے کے
لئے آتے ہونگے اس کی سڑکیں اور دھرم شالے سات سمندر
پار کے لوگوں سے بھرے پڑے ہونگے اور شہر کا قلعہ، راجہ کا
محل، مدن ساگر، وشنو کا مندر ہر وقت طرح طرح کے آدمیوں
سے گھرا رہتا ہوگا۔ آج جبکہ اس کے عروج و عظمت کو مٹے ساڑھے
سات سو سال ہو گئے ہیں اور اس کے سر پر ہزاروں طرح کی بلاؤں
کا نزول ہو چکا ہے اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جس کو دیکھ کر ہم
اس کے شاندار ماضی کا مبہم سا خاکہ بھی کھینچ سکیں۔ البتہ مہوبہ کی
سرزمین بندیلکھنڈ کے بنجر علاقہ میں نخلستان کی حیثیت ضرور
رکھتی ہے۔ اس کے آس پاس اور شہر سے ملحق کئی بند تالاب اور جھیلیں
ہیں جن سے پانی رستا رہتا ہے اور ملحقہ علاقوں کو شاداب
بنائے رکھتا ہے۔ ان جھیلوں کے کنارے ہر طرف چھوٹی بڑی
پہاڑیاں اونچے پاسبانوں کی طرح کھڑی ہیں اور ان کا سرخ و
سبز عکس جھیل کے پانی پر رنگوں کی آگ لگاتا رہتا ہے۔

انہیں پہاڑیوں میں سے ایک پر طاہن چپا کا مزار ہے۔ یہ
طاہن چپا (یا سید طالحہ) بھی الہا اودل کی طرح زمانہ ماضی کے
ہیرو تھے جو ان کے فن سپہ گری کے استاد تھے۔ ہم ان کا تذکرہ الہا اودل
کے قصوں میں ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ کہیں یہ اپنی استادی کا واسطہ
دلا کر اپنے بہادر شاگردوں کو اپنی جگہ پر ڈٹے رہنے کے لئے
کہتے ہیں تو کہیں بزرگ کی حیثیت سے ان کو فلسفیانہ نکتے سمجھاتے
ہیں۔ میں اس پہاڑی پر یہ امید لئے گیا کہ مزار پر کوئی کتبہ ہوگا
مگر افسوس کہ یہاں کچھ نہ ملا۔ مزار پتھر اور چونے کا چبوترہ ہے
جس پر یہاں کے ہندو مسلمانوں نے قلعی کرائی ہے اور سال میں

بار یہاں میلہ لگتا ہے جس میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو آتے
ہیں اور نہایت محبت سے اس مزار کو چھو کر کہتے ہیں "کہو تالن چچا،
اچھے تو ہو؟" کوئی منچلا بندیلا اس مزار کو مخاطب کر کے کہتا ہے
"چچا، ہمیں بھی کوئی لاکھا یا تر (الہا اودل کے قصے کی ایک
محبوب عورت) دلواؤ تو جانیں!" طالن چچا کا مزار ہندو مسلم
اتحاد اور پیار کا ایک ایسا نمونہ ہے جب اس علاقہ میں
مسلمانوں کی حکومت آئی بھی نہ تھی۔

طالن چچا کی ذات میرے لئے ایک معمہ تھی۔ یہ الہا اودل
کے ساتھی تھے اور ان کا زمانہ کم از کم بندیلکھنڈ میں طلوعِ
اسلام سے پہلے یا اس کے ساتھ ساتھ گذرا ہے۔ سمجھ میں نہیں
آتا کہ یہ اسلامی ممالک سے اس قدر دور دراز تجارت پیشہ
... میں ہو سکتا ہے اور یہاں آ کر مہوبہ کے امرا کے لڑکوں
... میں مقرر ہو گئے۔ میں نے مہوبہ کے کم از کم دس ایسے
... سے پوچھا جو پڑھے لکھے تھے کہ یہ تالن چچا کہاں
کے رہنے والے تھے۔ سبھوں نے یہی کہا کہ وہ مہوبہ کے تھے
اور ان کا مکان قلعہ کے اس مزار کے احاطہ میں تھا جہاں
... دروازہ پہ ایک بڑا سا انڈا لٹکتا رہتا ہے۔ انہوں نے
کہا کہ چاچا جی بڑے بہادر تھے اور ان کے گھر سے ایک
... میں ہزار تلواریں نکلی تھیں

میں نے مہوبہ شہر جانے کا ارادہ کیا جو ریلوے اسٹیشن
سے ... میل کے فاصلے پر ہے۔ راستے میں وہ پہاڑیاں ملیں
... کا دلہا و یرا دیکھا ہے اور ایک جگہ ایک جھیل ملی جس کے کنارے
... پرانی عمارت کے کھنڈرات پڑے ہیں۔ میں نے ایک شخص
سے پوچھا یہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگا الہا اودل کی بیٹھک۔ آگے
... ایک پہاڑی ملی جس پر کسی پرانی عمارت کے پسماندہ
... دکھائی دئے جن پر پتھر کی چھت پڑی تھی۔ میں نے ایک
... آدمی سے پوچھا یہ کیا ہے، وہ کہنے لگا الہا اودل کی
بیٹھک۔ بعرض اہل مہوبہ کی نظر میں ہر پرانی عمارت کا کھنڈر
... اودل کی بیٹھک ہے اور یہاں کی ہر چٹان میں ان کے
... کی ... کے نشان ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے کیا
... پائی ہے کہ آج ۸ سو سال بعد بھی اس سرزمین
... کی ہر پرانی ... مقدس شے کو انہیں کے نام
سے منسوب کر دیا گیا۔

موجودہ شہر میں غلاظت، گندگی، اور افلاس کے سوا
کچھ نہیں۔ یہاں ایک مکان یا رہائشی عمارت بھی ایسی نہیں جس کا
ذکر کیا جائے۔ البتہ چند مسجدیں ہیں جو سب آٹھ سو
سال پرانی ہیں اور ان کا طرزِ تعمیر اس زمانہ کی یاد تازہ کرتا
جب ہندوستان میں اسلام کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔

اب قلعہ کے اندر آئیے۔ یہ قلعہ قدرتی ہے یعنی اس کی
فصیل پہاڑیوں کا وہ سلسلہ ہے جو اپنے حلقہ میں عظیم الشان
جھیل مدن ساگر کو لئے ہے۔ اس پہاڑی کا سلسلہ جہاں پست
ہو گیا ہے یا ٹوٹ گیا ہے وہاں مصنوعی فصیلیں چونے اور پتھر
سے تیار کی گئی ہیں۔

قلعہ کے اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا مزار ملتا ہے
جس کو شاہ مغل کا مزار کہتے ہیں۔ اس مزار سے بائیں طرف
چلئے ایک پتھر کی چوکور لاٹ ملتی ہے جو ایک مندر کے سامنے
زمین میں گڑی ہوئی ہے۔ اس لاٹ کی بلندی کوئی بارہ فٹ
ہو گی اور عوام اس کو مہا دیو کا دیوٹ کہتے ہیں۔ غالباً جو
اسی مندر میں رہتا تھا ہر روز شام کو اس لاٹ پہ چراغ
روشن کرتا تھا جس کی روشنی سارے مہوبہ میں پھیلتی تھی۔
اس لاٹ کو محکمہ آثارِ قدیمہ نے اپنی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔

اس مندر اور لاٹ سے آگے چل کر چھوٹی سی فصیل سے گھرا
ہوا ایک احاطہ آتا ہے جس کے اندر متعدد مزارات ہیں اور اس کے
وسط میں ٹھوس، بھدے اور ابتدائی دور کے گنبد کے نیچے ایک
مزار ہے۔ اس احاطہ میں داخل ہونے کے لئے داخل ہونے کے لئے
ایک مستحکم صدر دروازے کے اندر جانا ہوتا ہے جس کی چھت
سے کبھی شترمرغ کا انڈا آویزاں تھا۔ یہ مزار مہوبہ کے
سب سے بڑے بزرگ حضرت شاہ مبارک کا ہے۔ اس مزار کی
جاگیر میں اب تک سات سو بیگھے زمین کی آمدنی چلی آ رہی ہے
جو افسوس ہے کہ عام پبلک کی قومی ضرورتوں میں صرف ہونے کی
بجائے سجادہ نشینوں کے ایک خاندان کی شکم پُری کر رہی ہے۔

اب اس راستے سے پلٹ کر مغل شاہ کے مزار تک آئیے
اور سیدھا مدن ساگر تک چلے چلیئے۔ یہ قدرتی جھیل پہاڑیوں
کے سلسلے سے گھری ہوئی ہے جس کا رقبہ ۴ مربع میل سے کم نہیں۔
اس جھیل کا ایک کنارہ پرانے گھاٹوں سے پٹا پڑا ہے جس کی
لمبائی جھیل کی لمبائی کے برابر ہے۔ جھیل کے اُتری پوربی حصے میں

...ملند ٹیلے نظر آتے ہیں۔ ان ٹیلوں میں سے ایک پر پتھر کے ...کھنڈرات ہیں۔ اس مندر کا کافی حصّہ اب تک کھڑا ہے ...کی چوٹی کم از کم پچاس فٹ بلند ہے پتھر کی سلوں سے یہ مندر بنایا گیا ہے اور یہ سلیں بغیر کسی مسالے کے اب تک ہزاروں سال سے اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ اس مندر کی مجموعی صورت دیکھکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس پر بُدھا دیوڈیں طرز تعمیر کا زیادہ اثر ہے۔ غالباً یہ مندر چندیلہ راجپوتوں کے دورِ حکومت سے پہلے کا ہے جب یہاں گونڈ ونشا قبضہ تھا۔

اس مندر کے پاس ہی جو دوسرا ٹیلا ہے وہ صرف چٹانوں کا ڈھیر ہے۔ ان چٹانوں میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کی کوئی شکل نہیں۔ مگر بعض بعض چٹان کسی کھمبے یا شہتیر یا چھت وغیرہ کا ٹوٹا ہوا حصّہ معلوم ہوتی ہے۔ غالباً اس ٹیلے پر کوئی عظیم الشان مندر تھا اس ٹیلے کے چاروں طرف لڑھکی ہوئی چٹانوں کے درمیان پانچ پتھر کے ہاتھیوں کے مجسمے پڑے ہیں جن کی ٹوٹی ہوئی ٹانگوں اور سونڈ کے نشانات باقی ہیں۔ ان ہاتھیوں کی پیٹھ پر مرصع جھول کے نقوش اور زنجیروں اور رسیوں کے نشانات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دونوں طرف گھنٹوں کے نشانات بھی ابھرے ہوئے ہیں۔ ہاتھیوں کا جو کچھ حصّہ محفوظ ہے وہ نہایت صاف چکنا اور ہاتھی کے اصلی قد کے برابر ہے۔ یہ ہاتھی فن سنگ تراشی کے نہایت اعلیٰ نمونے ہیں۔ یہ ہلکے سُرخ پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور ان پر نہایت اعلیٰ پالش کیا گیا ہے۔ یہ ہاتھی کے مجسمے غالباً اس لاپتہ مندر کے چاروں طرف معہ پاسر ھیو کے پاس کھڑے تھے۔

مہوبہ ہندوستان میں فتح اسلام کی سب سے پہلے فتح ہوا اور ایک مٹی ہوئی تہذیب کا واحد نمونہ ہے۔ میں مہوبہ میں رہا مجھے یہ افسوس رہتا رہا کہ چندیلے راجپوت ابھی ابھی کالنجر سے شکست کھا کر لوٹے ہیں اور جب تک یہاں قطب الدین ایبک، ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ تھوڑی دیر تک داخل ہوا ہے۔ مہوبہ کی تاریخ، اگر سچ پوچھئے تو بس اتنی سی داستان ہے۔ اسکے آگے کیا تھا نہیں معلوم اور اسکے بعد کیا آیا اسکا کوئی نشان نہیں۔ سارے مہوبہ میں الہا اودل کے وقت کے مندر اور قطب الدین ایبک کے زمانہ کی مسجدوں کے سوا اور کچھ نہیں ...میں اسی دور کا آفتاب روشن ہے جو تیرہویں صدی عیسوی ...اور اسکے بعد صرف ایک طویل خاموشی ہے اور اندھیرا گھپ۔

دریچے سے

میں نے دیکھا ہے دریچے سے کئی بار تجھے
شیشۂ دل میں اُنڈیلی ہے ترے حُسن کی مے
تیری نو خیز جوانی کے حسیں جلووں سے
میری آوارہ نگاہوں نے خیالوں میں مرے
جال موہوم سے خوابوں کے بُنے ہیں اکثر،

یہ شب و روز کا اک سلسلۂ لا متناہی!
زندگی رینگتی رہتی ہے ازل سے یونہی
کیا کوئی منزلِ مقصود نہیں ہے اس کی ——
اُڑتی پھرتی کبھی آزاد فضا میں روحیں
جسم کی قید کو کرتی ہیں گوارا کیونکر!
ٹوٹ جاتا ہے وہ معصوم اُمنگوں کا فسوں
کشمکش زیست کی بن جاتی ہے بغض اور حسد
مکر کا نام رکھا جاتا ہے انسانیت۔

اینٹ پتھر کی جو آتی ہیں نظر دیواریں
اوٹ میں ان کی گناہوں کے ہیں انبار لگے
وہ گنہ جن کے تصوّر سے ہے لرزاں ابلیس
خود کو دھوکا یونہی انسان دیئے جاتا ہے
خود غرض ذی نفسوں کا وہ عجیب ایک گروہ
جس کو کہتے ہیں سماج
رہنمائی کی جگہ راہزنی میں ہے محو
اس کے قانون و اصول
ابنِ آدم کے لئے ایک فریبِ اعظم

مجھ میں اور تجھ میں جو حائل ہے خلیج
جسمِ خاکی کو ہم آغوش نہ ہونے دے گی!
سوچتا ہوں کہ یہ لمحاتِ حسینِ ہستی
کیا یونہی فکر و تردد میں گذر جائیں گے؟
کیا تجھے دیکھ سکوں گا میں دریچے سے مدام؟
اینٹ چونے کی یہ دیوار، یہ مکروہ سماج!

ضیا فتح آبادی

لگن

ناصر شمسی

افراد

مہاراج	سروپ
مان جی	چندا
شاسا	

وقت: شام۔ منگلوار ۲۸ جیٹھ۔ بکرمی سمبت ۲۰۰۰

(مہاراج کا کمرہ۔ کمرے کے وسط میں دیوار کے ساتھ ایک بہت اونچا تخت بچھا ہے جس پر سوزنی بچھی ہوئی ہے تخت سے ملا ہوا دائیں پہلو میں ایک موڑھا سا کسٹ رکھا ہے۔ اس کے پیچھے ایک دیپک لیمپ۔ پشت کی دیوار کے ساتھ تخت کے پیچھے ایک بڑا سا کنگ سیلف رکھا ہے جس پر ایک جانب ایک بُرہ کا خوبصورت مجسمہ رکھا ہے پشت کی دیوار میں بائیں جانب ایک دروازہ ہے جس پر پردہ پڑا ہے۔ یہ دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔ دروازہ اور شیلف کے درمیان دیوار پر بارہ برج کی بڑی سی تختی لگی ہوئی ہے جس پر بارہ برج کی تصویریں بنی ہیں۔ دائیں جانب کھڑکی کے نیچے ایک صوفہ رکھا ہے جس کے آگے گول میز ہے بائیں جانب برآمدے کی چار کرسیاں ہیں اور ایک دروازہ ہے جو برآمدے میں کھلتا ہے جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو مہاراج تخت پر بیٹھے ہیں۔ عمر پچاس کی منزل سے گزر چکی ہے۔ ایک بہت سفید دھوتی باندھے ہیں اور سلک کا ڈھیلا کرتا بدن پر ہے مہاراج کا مسلسل لئے کچھ جاپ کر رہے ہیں کہ دو کتابیں جن میں زائچے ہیں کھلی پاس پڑی ہیں۔ آنکھیں بار بار اوپر کی طرف اٹھتی ہیں جس میں ستارے چمکتے نظر آتے ہیں۔)

مہاراج: (ایکدم بے صبری سے پکارتے ہوئے) چندا۔ چندا۔ چندا!!!

چندا: (دور سے) آیا مہاراج!

مہاراج: (بلند آواز میں) دو ملماس!

(چندا جلدی سے داخل ہوتا ہے ایک عمر رسیدہ دبلا پتلا آدمی۔ گلے میں جنیو اور ٹانگوں میں ملگجی سی دھوتی ہاتھ میں اس سے بھی زیادہ میلا جھاڑن)

چندا: جی مہاراج

مہاراج: چندا۔ دو ملماس! ایک سمبت میں دو ملماس!!

چندا: اچھا مہاراج! اور میری دشا کیسی ہے اس سمبت میں؟

مہاراج: تیری دشا؟ ہیں ہیں تیری دشا اچھی ہے۔ ۔ اچھا بتا تو کتنے زور سے پکار سکتا ہے؟

چندا: بہت زور سے! اتنے زور سے کہ آسمان کے ستارے بھی سُن لیں۔ کیوں کیا میرا ستارہ بہت دور ہے مہاراج؟

مہاراج: تیرا ستارہ زوال میں ہے۔ لیکن تو جتنی بلند آواز رکھتا ہے اس کا۔ کھڑکی پر کھڑکی میں سے اپنی لمبی سی گردن نکال اور پکار تاکہ سب لوگ سُن لیں۔ اس سمبت میں دو ملماس ہیں۔ اور دوسرا ملماس آج شام کو ساڑھے چھ بجے ہوگا۔ ۔ آج شام کو ساڑھے چھ بجے! سمجھا؟

چندا: ملماس کوئی تماشا ہے جو مفت دکھایا جائے گا؟

مہاراج: (تنگ آکر) میں تماشے نہیں دکھاتا میں ستاروں کی گردش دیکھتا ہوں۔ اور ہر برج میں ان کا شرف اور زوال دیکھ کر اور گھڑیوں کا حساب لگا کر بتا دیتا ہوں کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے کوئی ایک شخص کیا کرنے والا ہے اور اس کا کرنا سعد ہے یا نحس!

چندا: مہاراج! تو آپ روز نہی کرتے ہیں۔

[مہاراج]: ہاں۔ لیکن آج وہ ہونے والا ہے جو روز نہیں ہوتا۔ جو نوّے سال سے نہیں ہوا۔

[چندا]: چار بیسی اور دس سال!

[مہاراج]: میں نے اس کتاب میں دیکھا ہے ابھی۔ بکرمی سمبت ایک ہزار نو سو دس میں کنوار اور چیت کے مہینوں میں دو ملماس ہوئے تھے۔

چندا۔ یہ ملماس کیا ہوتا ہے؟

مہاراج۔ تجھے معلوم نہیں سورج کی سنکرات ۔ ہونے سے ملماس ہوتا ہے۔

چندا۔ سورج مہاراج؟

مہاراج:۔ ہاں ہاں۔ سورج لیکن تیری سمجھ میں نہیں آئے گا تیری قسمت کا ستارہ تو زحل ہے جو سورج کا مخالف ہے اور سیاہ رنگ کا ہے۔

[چ]ندا۔ تو کیا مہاراج میرے ستارے کا رنگ بھی کالا ہے لیکن میرا نام تو چندا ہے۔ چاند سا!

[مہ]اراج:۔ نوے سال سے ایک سمبت میں دو ملماس نہیں ہوئے اور آج نوے سال بعد پھر دو ملماس ہونگے۔

[چ]ندا:۔ اوہو!

[مہ]اراج:۔ سورج ایک برج میں ایک مہینہ رہتا ہے لیکن ڈھائی سال اور سولہ دن بعد ایسا ہوتا ہے کہ مہینہ ختم ہونے پر بھی سورج اپنا برج نہیں بدلتا بلکہ اُسی برج ایک مہینے اور رہتا ہے۔

[چ]ندا:۔ سورج کی مرضی ایک مہینہ نہیں دو مہینہ رہے

[مہ]اراج:۔ اور یہ دوسرا مہینہ لوندھ کا ہوا جسے ملماس کہتے ہیں۔ سمجھی اور نوے سال بعد سورج ایک سال میں دو مرتبہ اپنا برج نہیں بدلتا اور دو ملماس ہوتے ہیں اس سال کنوار کے مہینے میں سورج نے اپنا برج نہیں بدلا تھا اور آج اماوس کے وقت جب سورج اور چاند ایک سمتھ ایک درجے اور ایک دقیقہ پر ہونگے تو سورج دوبارہ اپنا برج نہیں بدلے گا اور یہ دوسرا ملماس ہوگا۔ ایک سمبت میں دو ملماس!

[چن]دا:۔ (مرعوب) دو ملماس!

[مہا]راج:۔ (پُر ملال) جس ملماس کا جوتش نوے سال سے انتظار کر رہی تھی وہ یونہی بیت جائے گا۔

چندا۔ اور پھر؟

مہاراج ۔ اور پھر۔ سورج کا وہی لگا بندھا چکر ۳۶۵ دن میں ہوتا رہے گا۔ سورج ہر مہینہ اپنا برج بدلتا رہے گا۔ برج حمل، جوزا اور اسد میں مقررہ چرنوں پر شرف ہوتا رہے گا اور برج دلو میں زوال!

چندا ۔ ہوں۔

(بائیں جانب دروازہ پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے)

مہاراج:۔ دیکھو باہر کون ہے؟

چندا ۔ اچھا مہاراج۔

(چندا چلا جاتا ہے کچھ لمحے بعد ماں جی اور شانتا داخل ہوتی ہیں ماں جی کی عمر چالیس کے اوپر ہے کنپٹیوں پر سفید بال چمک رہے ہیں شکل اچھی ہے لیکن چہرے کے خطوط بہت سخت ہو چکے ہیں جیسے مرمر کی سرد نیلی لکیریں پتھر میں گہری اُتر گئی ہوں۔ شانتا کی عمر پندرہ ہوگی ایک خاصی عام لڑکی ہے)

ماں جی:۔ نمستے۔ مہاراج!

مہاراج:۔ نمستے،

ماں جی:۔ یہ میری لڑکی ہے شانتا!

مہاراج ۔ جی! مجھے دھیان پڑتا ہے جیسے کبھی آپ کو دیکھا ہو بہت ورش پہلے۔

ماں جی:۔ ہاں۔ میں اپنی کنڈلی دکھانے آئی تھی بائیس سال ہوئے آئے۔ آپ کو بہت دھیان رہا مہاراج!

مہاراج:۔ (مطمئن ہوکر) تو وہ آپ ہی تھیں جو ..

ماں جی:۔ (بات پوری کرتے ہوئے) میرے بیاہ کی لگن ٹھیک نہیں تھی!

مہاراج:۔ ہاں ہاں۔ مجھے آپ کی کنڈلی اب بھی یاد ہے۔ ویسے بھاگ تو اچھے تھے لیکن بیاہ کا سہاگ نہیں تھا کتنی عجیب کنڈلی تھی۔

شانتا:۔ ماں جی۔ یہ کنڈلی کیا ہوتی ہے؟

ماں جی:۔ تجھے یہ بھی نہیں معلوم، میں کتنی دفعہ بتا چکی ہوں۔

مہاراج:۔ کنڈلی جنم کے سمے ستاروں کی جگہوں کا چتر ہوتا ہے،

جسے دیکھکر ہم لوگ زندگی کے سارے حالات بتا دیتے ہیں۔
شانتا:۔ (دلچسپی کے ساتھ) اچھا!
مہاراج:۔ (ماں جی سے) آپ نے کہا تھا کہ یہ آپکی لڑکی ہے؟
ماں جی:۔ جی ہاں۔
مہاراج:۔ (متعجب) تو کیا آپ کا بیاہ ہوا تھا؟
ماں جی:۔ ہاں!
مہاراج:۔ (ششدر) بغیر لگن کے؟
ماں جی:۔ جی!
مہاراج:۔ (چند لمحے سکوت کے بعد) یہ بیاہ نحس تھا!
ماں جی:۔ (مغموم) ہاں مہاراج۔
مہاراج:۔ (جھڑک کر) تو پھر کیوں بیاہ کیا تھا؟
ماں جی:۔ (آہستہ سے جیسے بہت کچھ کہدیا ہو) میں عورت تھی!
شانتا:۔ (فخر سے) میرے پتا جی بہت خوبصورت تھے۔ ان کی تصویر پوجا کے کمرے میں لگی ہوئی ہے
ماں جی:۔ (مہاراج سے پُرمعنی لہجہ میں) میں ایک کھیل کھیلا کرتی تھی کھیلتے کھیلتے میں ستاروں سے بھی کھیلنے لگی۔
مہاراج:۔ کیا مطلب؟
ماں جی:۔ (ہنس کر) میں نے ستاروں سے آنکھ مچولی کھیلی۔ یہی دوسری کنڈلی بنوائی اور اُسکی جھوٹی لگن سے بیاہ کر لیا۔
مہاراج:۔ (تنبیہ کے طور پر) ستاروں سے کھیلنا مذاق نہیں۔
ماں جی:۔ میں جانتی تھی لیکن سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔
مہاراج:۔ لیکن آپکے بھاگ میں بیاہ کا سہاگ نہیں تھا؟
ماں جی:۔ (مغموم) ہاں نہیں تھا!
مہاراج:۔ تو پھر بیاہ بعد کیا ہوا؟
ماں جی:۔ بیاہ کے بعد ہی اُن کی طبیعت نڈھال ہوگئی۔ ایک ہفتہ بعد سخت بیمار ہوئے اور دفعتاً مر گئے۔
مہاراج:۔ (مطمئن) یہ تو ہونا ہی تھا۔ ستاروں سے آنکھ مچولی کھیلنے کا نتیجہ
شانتا:۔ میرے پتا جی کے مرنے کا آپ کو دُکھ نہیں؟
مہاراج:۔ جوتشی نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ ہوگا۔ ان کی نادانی تھی جو بیاہ کیا!
ماں جی:۔ میری تو اتنی عمر روتے بیت گئی میں نے اپنا سہاگ نہیں دیکھا۔ میں چاہتی ہوں اپنی لڑکی کی ہی مانگ

بھری دیکھ لوں۔ میں اس کی کنڈلی آپ کو دکھانے لائی (بٹوہ میں سے کنڈلی نکال کر) میں کنڈلی چھوڑے جاتی ہوں۔ آپ دیکھکر اچھی سی لگن بتا دیجئے گا۔
مہاراج:۔ ہاں ہاں، میری بتائی لگن بہت شبھ ہے گی۔
ماں جی:۔ مجھے آپ پر وشواش ہے۔
مہاراج:۔ (جو کنڈلی دیکھ رہے تھے حیرت سے) ایں۔۔ ۔۔۔۔ آپ کی لڑکی کی کنڈلی ہے؟
ماں جی:۔ جی ہاں مہاراج۔
مہاراج:۔ بس (خاموش ہوجاتا ہے چند لمحے خاموشی)
ماں جی:۔ (پریشان) کیوں؟ کیا بات ہے؟
مہاراج:۔ اس میں ستاروں کی چال تو آپکی کنڈلی جیسی ہے
ماں جی:۔ (گھبرا کر) نہیں!
مہاراج:۔ ٹھہریئے میں ابھی دیکھکر بتاتا ہوں۔ لگن کے بارہویں خانہ برج حوت میں مشتری زوال میں ہے اور ستارہ قسمت زیر میں آتا ہے۔
ماں جی:۔ (بے اختیار) اور لگن مہاراج؟
مہاراج:۔ (آہستہ سے) اس کنڈلی میں بیاہ کی راس نہیں۔
ماں جی:۔ (مشکل سے آواز نکلتی ہے) مہاراج!
شانتا:۔ (چیخ) ماں جی! (لپٹ جاتی ہے)
ماں جی:۔ (چمٹا کر) شانتا!
(چند لمحے خاموشی)
مہاراج:۔ بڑی کڑی گرہ پڑی ہے۔ سارے مذکر ستارے ایسے زوال میں پڑے ہیں کہ برج بھی زنانہ کا منکر ہے اور مالک بھی اور مونث ستارے کیندا میں پڑے ہیں اور لگن میں بھی مونث کا نوانسہ ہے۔ ایسی صورت میں بیاہ کی راس کیسے نکل سکتی ہے۔
(ماں جی اور شانتا رو رہی ہیں)
مہاراج:۔ میں جانتا ہوں آپ دونوں کو بہت دکھ ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ اس میں جوتش کا کیا دوش؟
شانتا:۔ (چڑ کر) نہیں آپ کی جوتش نہیں چاہیئے!
مہاراج:۔ میں کیا کر سکتا ہوں میں ستاروں کی چال نہیں بدل سکتا!
شانتا:۔ (تلخی سے) ستارے!

ماں جی:۔ ستارے بہت سخت ہیں شانتا. بہت سخت. یہ میرے
کی کنی کی طرح سخت ہیں۔ انہوں نے میرا کلیجہ کاٹ ڈالا ہے
(چندا آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں
آتا ہے اور ایک نظر سب کو دیکھتا ہے)

چندا:۔ (آہستہ سے) مہاراج.

مہاراج:۔ (چونک کر) کون؟ چندا!

چندا:۔ کیا مہاراج لماس ہو گیا؟

مہاراج:۔ (بے اختیار بلند آواز میں) لماس! اوہ!

ماں جی } شانتا :۔ } (گھبرا کر) کیا ہوا مہاراج؟

مہاراج:۔ ٹھہرئیے میں کنڈلی پھر دیکھتا ہوں. لماس سے
ستاروں کی طرف اور رب بدل جاتے ہیں شاید
اس لماس سے بیاہ کی راس نکل آئے۔

ماں جی:۔ سچ۔ مہاراج؟

مہاراج:۔ میں دیکھتا ہوں۔
(چند لمحے خاموشی۔ مہاراج غور سے کنڈلی
دیکھ رہے ہیں اور کچھ حساب لگاتے ہیں)

ماں جی:۔ مہاراج۔ گرہ کیسی پڑ رہی ہے؟

مہاراج:۔ (مسرور) دیکھا. ہے دیکھا! میں یہ کہتا تھا
لماس بہت بڑی چیز ہے. نوے سال بعد لماس
ہونا ہے کتنی بڑی بات!

ماں جی:۔ مہاراج بتائیے تو

مہاراج:۔ مشتری لگن کے خانہ میں زوال کے سوائے شرف پر
آرہا ہے اور شانتا کا ستارہ قسمت رنب کی بجائے
راس میں ہو رہا ہے۔

ماں جی:۔ اور لگن مہاراج؟

مہاراج:۔ ہاں ہاں. ٹھیک اماوس کے وقت جب سورج اور
چاند ایک درجے اور ایک دقیقہ پر ہونگے اور سورج
اپنا برج نہیں بدلے گا اور دوسرا لماس ہوگا.
اس وقت بیاہ کی راس ہوتی ہے۔

ماں جی:۔ (خوشی سے) یعنی شانتا کا بیاہ ہو سکتا ہے۔

شانتا:۔ (خوشی سے ماں جی سے چمٹ کر) ماں جی!

مہاراج:۔ اور وہی وقت لگن کا ہے۔ چندرماں اور ست کر
دو سمبادر اس نہیں ہونگے اور دونوں آپس میں دیکھتے ہونگے
..(بے خود) بڑی شبھ لگن ہوگی۔ بہت ہی شبھ لگن!

ماں جی:۔ آپ کی جے ہو مہاراج!

مہاراج:۔ (بلند آواز میں) لماس دوسرا لماس بیاہ
کر کے گرہ سبھک ہو گئی۔

ماں جی:۔ مہاراج یہ اماوس کب ہے جس کی لگن نکلی ہے۔

مہاراج:۔ اماوس؟ اماوس آج ساڑھے چھ بجے ہے،

ماں جی:۔ (حیران) آج؟

مہاراج:۔ ہاں! ہاں! اوہ صرف دس منٹ رہ گئے ہیں!

ماں جی:۔ (پریشان) لیکن اتنی سی دیر میں بیاہ کیسے ہو؟ میں
کیا کروں؟

مہاراج:۔ بیاہ کا سامان کرو نہیں تو لگن کی گھڑی نکل جائیگی

ماں جی:۔ (گھبراہٹ) دولہا بغیر کیسے بیاہ ہو؟

مہاراج:۔ اس کا تو مجھے خیال ہی نہ آیا! میں جوتش جانتا
ہوں دولہا کیا جانوں؟
(دروازہ (بائیں جانب) پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے)

چندا:۔ مہاراج میں بھول گیا آپ کو بتانا ایک صاحب آئے
ہیں کسی کو پوچھ رہے ہیں۔

مہاراج:۔ صاحب؟ تو کہتا ہے صاحب میں کہتا ہوں کوئی ہو
بلا جلدی بلا. جلدی!

چندا:۔ ابھی ابھی لیجئے! (جلدی سے کمرے سے جاتا ہے
(چند لمحے بعد سروپ داخل ہوتا ہے کوئی پچیس
سال عمر ہوگی. شکل سے معقول آدمی معلوم
ہوتا ہے. سروپ ایک نظر دیکھتا ہے مہاراج
کو نہیں پہچانتا. شانتا کو منہ بنائے دیکھ کر گھبراتا
ہے. اور ماں جی کو پھٹی آنکھوں سے گھورتے
دیکھ کر سٹ پٹاتا ہے)

مہاراج:۔ (خوشی سے) آہا!

سروپ:۔ شما کیجئے۔ مجھ سے بھول ہوئی۔

مہاراج:۔ آئیے آئیے (ماں جی سے) لیجئے۔ اب تو سب ٹھیک
ہو گیا!

ماں جی:۔ آپ کا مطلب ہے کہ

مہاراج:۔ ہاں اور کیا. وقت بالکل نہیں ہے۔

سروپ :- مجھ سے بھول ہوئی میں تو ایک اور صاحب سے ملنے آیا تھا۔
مہاراج :- آپ خود نہیں آئے آپ کو ستارے کھینچ لائے ہیں۔
(ہنس کر) میں جانتا ہوں!
ماں جی :- ستارے بڑے دیالو ہیں
سروپ :- مجھے آگیا دیجئے۔ مجھے بہت ضروری کام جانا ہے۔
مہاراج :- ایں! ضروری کام؟ اس سے زیادہ ضروری کام کیا ہو سکتا ہے۔ نہیں نہیں!
ماں جی :- نہیں نہیں آپ جا سکتے ہیں۔
سروپ :- میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
مہاراج :- اوہو جوتش تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی تم تو بس یہ سمجھ لو کہ
ماں جی :- میں بتاتی ہوں۔ یہ میری لڑکی شانتا ہے!
سروپ :- جی ہاں!
ماں جی :- اس کے پتا جی کا نام ہری رام داس تھا۔ وہ سورگ باش ہوگئے، ذات کے برہمن تھے بھوج!
سروپ :- جی لیکن مجھے ذرا جلدی ہے۔ مجھے آگیا دیں۔
مہاراج :- اوہو بات تو ختم ہو لینے دو!
ماں جی :- مہاراج نے شانتا کی جنم پتری دیکھ کر بتایا ہے کہ اسی سمے شانتا کا بیاہ ہو جانا چاہیئے۔ اگر یہ سمے گذر گیا تو پھر بیاہ نہیں ہو سکتا۔
سروپ :- (کچھ نہ سمجھ کر) تو پھر بیاہ کر دیجئے۔ اچھا میں جاتا ہوں۔
مہاراج :- اوہو۔ اگر آپ چلے گئے تو پھر بیاہ کس کے ساتھ ہوگا۔
سروپ :- (حیران) ایں؟
ماں جی :- ہاں ہاں بیاہ اسی سمے ہونا ہے۔ ابھی
سروپ :- آپ کا مطلب ہے کہ ۔
مہاراج :- بڑی شبھ لگن نکلی ہے چندرماں اور شکر دو سھاؤ اس میں ہونگے اور دونوں آپس میں دیکھتے ہوں گے میں کہتا ہوں آپ بیاہ کر لیجئے۔ بڑی اچھی لگن ہے ایسی لگن بھلا کس کو ملتی ہے۔
سروپ :- معلوم ہوتا ہے آپ مذاق کر رہے ہیں۔ ہنستے!
ماں جی :- نہیں مذاق نہیں۔ میری لڑکی کی ساری عمر کے سہاگ کا سوال ہے۔ میں آپ سے پرارتھنا کرتی ہوں۔
سروپ :- تو کیا یہ سب سچ ہے؟

ماں جی :- آپ کسی بات کی چنتا نہیں کیجئے، شانتا بڑی اچھی لڑکی ہے آپ اس کے ساتھ بہت سکھی رہیں گے۔ پرماتما نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ آپ کسی بات کا خیال نہیں کیجئے۔ آپ بس ہاں کر دیجئے۔
سروپ :- مجھے کچھ دیر سوچ لینے دیجئے۔
مہاراج :- صرف ایک منٹ۔
سروپ :- (سوچتے ہوئے) میں اتفاق سے ایک مکان میں داخل ہوا۔ اور اب چند منٹ بعد یکا یکی ہی بیاہ! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چوہے دان لگا ہوا تھا۔ اور جو بھی پہلا چوہا آیا اسے باندھ لیا گیا۔
ماں جی :- آپ یہ بھی تو خیال کیجئے کہ بیاہ کے لئے ضروری ہے کہ ابھی سمے ہو
سروپ :- یعنی آپ کو تو جو بھی پہلا آدمی ملتا اس سے بیاہ کر دیتیں۔
مہاراج :- آپ یہ سب کچھ سوچ کر کیا کیجئے گا۔ آپ یہ بتایئے کہ بیاہ کے لئے تیار ہیں!
ماں جی :- میرے لئے تو اب آپ ہی سب کچھ ہیں!
سروپ :- (ایک کرسی پر دھنس جاتا ہے) مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں کوئی ہوں ہی نہیں یہاں آنے سے پہلے کچھ تھا لیکن اب پتہ کیا ہوں اور خبر نہیں چند منٹ بعد کیا ہو جاؤں گا۔
مہاراج :- ابھی آپ بیاہ کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟ بیکار وقت خراب کر رہے ہیں۔
سروپ :- مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کیا سن رہا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں۔
ماں جی :- انہیں کچھ دیر آرام کر لینے دیجئے، اتنی دیر میں ہم بیاہ کا سامان کر لیں۔
مہاراج :- لگن میں سات منٹ رہ گئے ہیں اتنے سمے میں کچھ سامان نہیں ہو سکتا۔ ہون، منتر اور پھیرے ہو سکتے ہیں۔
ماں جی :- بس بیاہ ہو جائے اور کیا چاہیئے۔
مہاراج :- ہون کے لئے آگ جلنے میں تو دیر ہوگی میرے پاس موم بتی ہے۔ اسکے گرد پھیرے ہو سکتے ہیں۔ منتر میں پڑھ دونگا بس بیاہ ہو جائیگا۔
ماں جی :- ہاں ہاں۔ آپ موم بتی لایئے (مہاراج جاتے ہیں۔ ماں جی

سروپ کو دیکھتی ہیں کہ وہ سر جھکائے پریشان بیٹھا ہے۔
شانتا بھی بہت اُداس ہے) اور میں چندا سے کہتی ہوں کہ
کہیں دُھوپ پڑی ہو تو لائے۔ اس کی خوشبو سے شگون
اچھا ہوگا!
(ماں جی چلی جاتی ہیں۔ شانتا سروپ کی طرف
دیکھتی ہے اور ایک دم رونے لگتی ہے۔ سروپ
گھبرا کر سر اُٹھاتا ہے)
سروپ:- ایں۔ اب آپ کو کیا ہوا۔ (شانتا زور زور سے
روتی ہے۔ سروپ کھڑا ہو جاتا ہے)
سروپ:- آخر آپ بیٹھے بیٹھے رونے کیوں لگیں؟
(شانتا روئے جاتی ہے۔ سروپ شانتا کے پاس
جاتا ہے۔)
سروپ:- اوہو آپ تو روئے جاتی ہیں! کچھ بات بھی تو ہو!
شانتا:- مجھے نہیں معلوم کیوں رونا آ رہا ہے!
سروپ:- بس بس۔ اچھا اب چُپ ہو جائیے۔ ہاں ہاں۔
شانتا:- (چُپ ہو جاتی ہے) اب تو میں نہیں رو رہی۔
سروپ:- آپ تو ایسی روئیں کہ میں گھبرا گیا۔
شانتا:- لیکن میں آپکو پریشان کرنا تو نہیں چاہتی۔ آپ بیٹھ جائیے۔
سروپ:- ہاں ہاں (بیٹھ جاتا ہے)
شانتا:- مجھے پتاجی کا سایہ کبھی نہیں ملا۔ اب پتی کا سایہ بھی ملتا
نظر نہیں آتا (اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے)
آپ مجھے کیسی لڑکی سمجھ رہے ہونگے!
سروپ:- میں تمہارا دُکھ سمجھتا ہوں شانتا!
شانتا:- اوہ!
سروپ:- اب تم یہ دُکھ نہیں اُٹھاؤگی۔ تمہارا دُکھ میں اُٹھاؤنگا۔
شانتا:- (حیرت سے سروپ کی طرف دیکھتی ہے) آپ؟
سروپ:- ہاں۔ میں تمہارے ساتھ بیاہ کروں گا۔
شانتا:- آپ کتنے اچھے ہیں۔ کتنے اچھے ہیں!
سروپ:- میں تو تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں ایک
دُنیا دکھائی دیتی ہے۔ ہم بیاہ کرینگے ابھی چند منٹ بعد
بیاہ میں تو صرف چند منٹ ہی لگتے ہیں۔ اس سے کیا
فرق پڑتا ہے کہ بیاہ کی بات چند سال پہلے ہو یا صرف
چند منٹ پہلے!

شانتا:- ماں جی کتنی خوش ہوں گی!
(مہاراج ایک روشن موم بتی لئے داخل ہوتے ہیں)
مہاراج:- میں موم بتی لے آیا۔ اب بہت کم سمے رہ گیا ہے
شانتا:- (آواز دیتے ہوئے) ماں جی!
ماں جی:- (داخل ہوکر) لگن کی گھڑی نکل تو نہیں گئی مہاراج؟
مہاراج:- نہیں ابھی امادس نہیں ہوئی ہے لیکن بس اب سورج
اور چاند ایک بُرج اور ایک دقیقہ پر آیا ہی چاہتے ہیں۔
اور پھر اماوس ہوگا!
سروپ:- یہ اماوس کیا ہے؟
ماں جی:- (جلدی سے خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے) شی! یہ بات
اس وقت نہ پوچھئے ورنہ مہاراج کو اس کی ساری
جوتش بتانے میں لگن کا بھی خیال نہیں رہے گا
مہاراج:- لگن کی گھڑی ہوا ہی چاہتی ہے۔ سروپ اور شانتا
آپ دونوں موم بتی کے سامنے فرش پر بیٹھ جائیے۔
سروپ:- اچھا مہاراج!
(دونوں فرش پر بیٹھ جاتے ہیں مہاراج نے
موم بتی کمرے کے اگلے حصّہ میں وسط میں فرش
پر کھڑی کر دی ہے)
مہاراج:- میں منتر پڑھتا ہوں۔
ماں جی:- (خوشی سے) بیاہ۔۔ میری لڑکی کا بیاہ ہو رہا ہے۔
مہاراج:- اوہ! اگر آپ نے غل مچایا تو میں منتر بھول جاؤں گا
مجھے لگن کی گھڑی کا بھی خیال رکھنا ہے۔ مجھے یہ بھی دیکھنا
ہے کہ سورج اور چاند کب ایک درجے اور ایک دقیقہ پر
ہوتے ہیں۔ آپ اس کرسی پر بیٹھئے اور اپنے منہ میں رومال
ٹھونس لیجئے۔
ماں جی:- میں اب آواز بھی نہ نکالوں گی۔ آپ جلدی کیجئے۔
مہاراج:- میں جانچ کر لوں تاکہ ٹھیک لگن کے پھیرے ہو سکیں!
ماں جی:- آپ جانچ بعد میں کر لیجئے گا۔
مہاراج:- بس ابھی اتنی سی دیر میں! (گھنٹی بجاتا ہے)
(چند لمحے خاموشی)
مہاراج:- (گھبرا کر) ایں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر وہ اب بھی گرک
پڑ رہی ہے!
ماں جی:- (گھبرا کر) کیا کہا آپنے مہاراج؟

مہاراج :- میں کہتا ہوں یہ ہوا کیسے؟ مشتری کو اس سمے ترت پر
ہونا چاہیئے تھا۔ اور ستارہ قسمت کو راس میں اماوس
کے سمے چندرماں اور شکر دو سبھاؤ راس میں ہونے
چاہیئے تھے اور مونث راس نوانس میں۔

ماں جی :- (بے صبری سے) لگن کی گھڑی مہاراج؟

مہاراج :- (تنگ آکر) لگن لگن !! لگن !!! میں کہتا ہوں ستاروں
کی اس شمک میں بیاہ کی راس نہیں ہوتی!

ماں جی :- تو کیا اب میری شانتا کا بیاہ نہیں ہو سکتا؟

مہاراج :- تمہیں بیاہ کی پڑی ہے مجھے یہ دیکھنا ہے کہ ستاروں
کی چال پلٹی کیوں؟

ماں جی :- (روتے ہوئے) میری لڑکی!

سروپ :- مہاراج جب پہلے بیاہ ہو سکتا تھا تو اب کیوں نہیں
ہو سکتا؟

مہاراج :- (ان سنی کر کے) حساب صحیح۔ لعشم ٹھیک۔ ترجوں میں
ستاروں کی چال کا حساب بالکل ٹھیک! لیکن
ستاروں نے اپنی چال کیوں بدلی؟ یہ راس کیوں
بدلی؟ اب لگن کیوں نہیں بیٹھا؟ (ایک دم بلند
آواز میں) سمجھ گیا!

ماں جی :- (رونا بند کر کے) کیا مہاراج؟

مہاراج :- (بے خود) بتاؤں؟ میں بتاؤں؟ دوسر الماس
نہیں ہوا!

ماں جی :- نہیں ہوا؟

سروپ :- (تنگ آکر) میں نہیں جانتا الماس کیا ہوتا ہے۔ میں
یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بیاہ کیوں نہیں ہو سکتا؟

مہاراج :- اگر یہ دوسر الماس ہو جاتا تو تمہارا بیاہ کبھی ہو جاتا۔
پرنتو شبھ لگن نکلی تھی!

ماں جی :- شاید کوئی اور لگن ہو!

مہاراج :- اب تو اکیاون سال بعد دو الماس ہوں گے۔ اس سمے
اس کنڈلی سے بیاہ کی راس ہوگی۔

ماں جی :- اکیاون سال؟ اوہ! (سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں)

مہاراج :- (آواز دیتے ہوئے) چندا! چندا!

(چندا جلدی سے آتی ہے)

چندا :- جی مہاراج!

مہاراج :- انہیں دوسرے کمرے میں لے جاؤ!

چندا :- آئیے! ذرا انہیں سہارا دیجئے بی بی جی!

شانتا :- آئیے ماں جی!

(شانتا ماں جی کو سہارا دے کر دوسرے کمرے
میں لے جاتی ہے۔ چندا پیچھے پیچھے جاتی ہے)

(چند لمحے خاموشی! سروپ کچھ کھویا سا بیٹھا ہے)

مہاراج :- مجھے یاد پڑتا ہے آپ کو کوئی ضروری کام جانا تھا؟

سروپ :- (چونک کر) کیا کام؟

مہاراج :- جب آپ آئے تھے تو آپ نے کچھ کہا تھا!

سروپ :- مجھے کچھ یاد نہیں۔

مہاراج :- آپ کسی اور صاحب کے دھیان میں آئے تھے!

سروپ :- اوہ مجھے لالہ جمنا داس سے ملنا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا
کہ وہ اس سڑک کے نکڑ والے مکان میں رہتے ہیں۔

مہاراج :- لالہ جمنا داس ہاں ہاں۔ وہ سامنے والے مکان
میں رہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ ایسی چوک ہو جاتی ہے
ویسے یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔ اچھا اب آپ جا سکتے ہیں۔

سروپ :- (حسرت سے) یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میں چلا جاؤں!

مہاراج :- آپ کو بیاہ کے لئے روکا تھا اب بیاہ نہیں ہو سکتا
شانتا کی کنڈلی میں بیاہ کی راس نہیں تو دوسر الماس
اب اکیاون سال بعد ہوگا۔

سروپ :- یہ تو آپ پہلے ہی بتا چکے ہیں۔

مہاراج :- (گھبرا کر) تو کیا آپ یہاں اکیاون سال بیٹھے رہیں گے
۔ تو بڑی مصیبت ہے! معلوم نہیں یہ لوگ کیوں نہیں
سمجھتے کہ ستارے کوک کی ریل گاڑی نہیں کہ جب چاہا
چل موڑ دی۔

سروپ :- (غصے سے) اور آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟ کہ جب چاہا
موم بتی کے آگے بیاہ کے لئے بٹھا دیا اور جب چاہا کان
پکڑ کر کھڑا کر دیا کہ جاؤ نہیں ہوتا بیاہ!

مہاراج :- لیکن بیاہ نہ ہونے میں میرا کیا دوش؟

سروپ :- دوش! آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے یہ کہنے سے بات
ختم ہو جاتی ہے۔

مہاراج :- لیکن آپ اس قدر بے حال کیوں ہو رہے ہیں؟

سروپ :- مہاراج انسان ستارے نہیں ہیں۔ ستارے دھاگے میں

بندے کنکر کی طرح چٹک کاٹ رہے ہیں۔ ایک چٹک کے بعد دوسرا چٹک لیکن انسان ایک بے جان کنکر نہیں ہے۔ آپ انسان سے ستاروں کی طرح نہیں کھیل سکتے۔

مہاراج:۔ اس قدر خفا کیوں ہوتے ہیں آپ!

سروپ:۔ آپ بھی تو سمجھنے کی کوشش کیجئے مہاراج ستاروں کی ایک مسکراہٹ نے ہمیں ایک دوسرے کا کر دیا تھا۔ اب ستارے انھیں بیچ کر شانتا کو مجھ سے چھین نہیں سکتے۔

مہاراج:۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ کی یہ باتیں سن کر ستارے اپنی جگہ نہیں چھوڑیں گے۔

سروپ:۔ کسی کی نیلی چادر میں چھید پڑ گئے ہیں۔ کسی چھپانے گتر کتر کر چھلنی کر دیا ہے ان چھیدوں کو آپ لوگ خبر نہیں کیا سمجھ بیٹھے ہیں۔

مہاراج:۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

سروپ:۔ (چیخ کر) میں شانتا سے بیاہ کروں گا۔ میں ضرور بیاہ کروں گا۔ (آواز دیتے ہوئے) شانتا! شانتا! (دوسرے کمرے کی طرف جاتا ہے)

مہاراج:۔ ستارے تمہارے اس پاگل پن پر ہنس رہے ہوں گے۔ (ہنستا ہے) بیاہ کی راس کے بغیر بیاہ کریں گے (ہنستا ہے) میں بھی ہنس رہا ہوں۔

(خوب ہنستا ہے)

پردہ

ماضی کے سپ…

وہ پہلی دھندلکوں کے آنچل کی جنبش
یونہی رات دن وقت کی گود میں؛
مچلتی رہیگی —— تھرکتی رہیگی
تھرکتے ہوئے ہر قدم پر سمٹ کر سرکتی رہیگی

مسافر کو جیسے نظر آ رہا ہو کہیں دور سے ٹ…
وہ بڑھتا ہی جائے،
نظر کے فریبوں پہ چڑھتا ہی جائے
مگر پاس پہنچے تو دیکھے!
سمندر نہیں، کوئی دریا نہیں، ریت ہی ریت ہے…
فقط ایک جنبش ہے جو رات دن
تھرکتی رہے گی ——

مری خشک پلکوں پہ بھی چند آنسو
تھرکتے ہیں لیکن ٹپکتے نہیں ہیں ——
مرا دل دھڑکتا ہے بے نام جنبش سے یونہی د…
ہواؤں سے شعلہ بھڑکتا رہے گا
مچلتی ہوئی جنبشوں میں تھرک کر
ستاروں کی مانند سو جائے گا

فیضی

پرتھوی ناتھ شرما

بد سے بدتر

سوکھتے ہوئے درخت کی کسی ٹہنی میں کوئی گھنڈی پھوٹ
درخت کی ازسرنو شادابی کا دھوکہ ہونے لگتا ہے لیکن جس
ں میں تخریب کا بیج پڑ گیا ہو وہ دھرتی پر در سوکھتے ہوئے
کی مانند ایک نہ ایک روز ویرانی کا منظر بن جائیگی۔ اور
سوکھے افسردہ ننگے کھردرے درختوں نے کبھی اور
ایک سمجھ میں آنیوالا معمہ بن جائیگا۔ کبھی کبھی بیج پھوٹتے
ہو جاتے ہیں ننھے ننھے پودے پاؤں تلے کچل کر مر جاتے
نوجوان شتاب میں سمت نالے اجوال درخت پالے
اور دیگر قدرتی حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن
درخت جڑ پکڑ لے اور اتنا مضبوط ہو جائے کہ وہ آندھی
طوفان کے حملوں کو سہہ سکے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک
وہ سوکھنا شروع ہو اور سوکھ کر ویرانی اور تخریب کی علامت
تبدیل ہو کر دنیا والوں کو سبق دینا شروع کرے۔ کہ فنا تاتی
کا انجام افسردگی ہے۔ اور درخت کی مانند سوکھ جاتا ہے
تہذیب کے خیال کو کیسے رد کیا جائے جو انسانی دعووں
کئے ہوئے ہیں اور جو ہم کو وقت کے چکر کے نیری
تھپیڑے کے باوجود یہ امید دلاتا رہتا ہے کہ تہذیب کے
میں کسی بھی ٹہنی میں شگوفہ کا پھوٹنا امید کی علامت
دنیا کے نظام بدلنے کا اعلان ہے انسانی خوشیوں کی
ترین شگون ہے۔

زندگی ایک بہت بڑا سراب ہے اور یہ اُس بڑے سے بڑے
سہارے کے ستون ہی قائم ہے جسے ہم تہذیب کے
نام سے یاد کرتے ہیں۔ تہذیب وہ بیج ہے جو انسانیت
میں تب پڑا جبکہ جیون کے کھیل میں تلخی کا نام و نشان
تھا۔ اور نسل انسان کو اس بات کا خیال تک نہ تھا
کے کل پرزوں میں اس قسم کی خرابی پیدا ہو سکتی ہے
کا باعث ہو اور جس کے لئے بڑی بڑی کانفرنسیں
منعقد کئے جائیں اور قدرتی بہاؤ کو روک کر معاملات
زیادہ پیچیدہ اور تشویشناک بنایا جائے۔ ایسا معلوم
پڑتا تھا کہ زندگی نیلے آسمان کی طرح اٹل ہے کتنا ہی گرد و غبار
اڑے، کتنے ہی سیاہ بادل اس قنات کو دنیا کی نگاہ سے روپوش
کرنے کی کوشش کریں لیکن گرد و غبار چھٹ جانے کے بعد آسمان
آئینہ کی طرح صاف رہتا ہے تبدیلی کے ثبوت ہوتے بھی اس کی
دلکشی قائم رہتی ہے۔ دن میں مسافر کے سر پر چھا کر رات کو ستاروں
کی دکان سجا کر آسمان ہمیں بتاتا رہتا ہے کہ تبدیلی کا خیال
غلط ہے۔ ابدیت ملسانت وحدانیت میں اتنی لاکھوں کروڑوں
دلکشیاں چھپی ہوتی ہیں جن کا اندازہ لگانا حد عقل سے باہر
ہے۔ لہذا ناسمجھی کے باعث ابدی خوبصورتی کو مسخ کر کے عمل
کو تبدیلی کا نام دے کر ہم اشیاء کو بد سے بدتر بنا دیتے ہیں۔

بدی کی تاریخ کا آغاز اُس سرحد سے شروع ہوتا ہے جہاں
انسان نے بالآخر اپنی خوشیوں کو ایک ایک کر کے خیرباد کہنا
شروع کر دیا تھا۔ خیال تھا کہ جنازہ نکل جائے گا لیکن سانس
چلتے رہے۔ یہ سانس اب بھی چل رہے ہیں۔ نزع کی حالت کی
اتنی زبردست طوالت تعجب خیز ضرور ہے لیکن اچھا ہے موت
اور زیادہ درد ہو جائے۔ انسانیت سرابوں کا سہارا چھوڑ دے
اور اُس حقیقت کو منظور کرے جو وقت کی چوکھٹ پر بیٹھی
باآواز بلند پکار کر کہہ رہی ہے۔ اچھائی کا خیال چھوڑ دو
اچھائی ماضی کا خیال بن چکا ہے۔ اب ہم بدی کی سرحد میں داخل
ہو گئے ہیں اور صرف بد کو بدتر ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ ہمارے
لئے جو موجود ہے وہ ہی مقابلتاً اچھا ہے۔

مستقبل کی چھاؤنیوں میں سوائے تراش اور کسی چیز کا
ڈیرہ ممکن نہیں ہے۔ بد کو بدتر بننے سے روکنے کی کوشش ہی
تہذیب کو جلدی گھن نہ لگنے دیگی۔ اور کم از کم ہم اس الجھن کا
مزا تو لے سکیں گے جو ابھی تک زندگی کے پیالے میں موجود ہے

بدی کی تاریخ دنیا کی ہر ایک تاریخ کے مانند صدیوں
شروع ہوتی ہے یا اس کا آغاز مختلف انقلابوں کی مانند
سالوں میں پھیلا ہوا ہو سکتا ہے۔ اصل میں اس تاریخ کی
کا آغاز جب ہی ہوا ہو گا جب انسان نے کاہلی کا سبق سیکھا

ٹوٹ گیا۔ کاہلی سے مُراد ہے پُوری طرح سے انسانی لہو و لعب
میں مشغول نہ رہ سکنا۔ انسان کو جیون کا دان اس واسطے ہی ملا
ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں آنکھ ناک کان اور دوسرے اعضا کی
حرکت اور موجودگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکے۔
صبح سے شام تک وہ اس کھیل میں اتنا مصروف رہتا ہے کہ تاروں
کے نکلتے ہی اُسے نیند اپنی آغوش میں لیتی اور وہ پھر اگلی صبح
میدانوں میں دوڑنے بھاگنے، دریاؤں میں نہانے اور پانی پینے، ہم
جنسوں کے ساتھ لڑنے اور کھیل کھیلنے، چشموں کے کنارے صاف
مقابل سے چشمک زنی کرنے غرضیکہ اُن تمام باتوں میں حصہ لینے
کے لئے تیار ہوتا۔ اُسے جو کہ زندگی کے پیالے کو چھلکاتی رہتی
ہیں۔ اور اُسے پیدائش اور موت کے درمیان اُن بھاری پہاڑ
جیسے لمحوں سے دوچار نہ ہونا پڑے جو ہمارے کندھوں پر ایک
بارِ گراں کے مانند جھکے جاتے ہیں وہ گزرے ہوئے لمحے جو ہم
کو بے عمل بنا کر یاس کی تنگنائے میں گرا دیتے ہیں۔ اور ہم
لمحوں کی عارضی جھلک کو ایک مسلسل منظر میں تبدیل کر دیتے
ہیں۔ جو کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ سب کاہلی
کے آغاز کا نتیجہ ہے۔ زندگی کے لہو و لعب سے گریز نے کاہلی اور
ساتھ ہی ساتھ دماغ کو جنم دیا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا کاہلی
مصروفیت کہلائی جانے لگی اور زندگی کے لہو و لعب وقت ضائع
کرنے کا طریقہ اور آہستہ آہستہ اچھائی ختم۔

گذری صدیوں میں زندگی کو وسیع کرنے کے لئے جو کچھ کیا
گیا ہے وہ ترقی کے نام پر کیا گیا ہے۔ ترقی کاہلی اور دماغی غلامی
کا دوسرا نام ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم پڑتا ہے کہ ترقی
کے نام سے جتنا خون خرابہ، قتل و غارت اس دُنیا میں ہوا
شاید کسی اور وجہ سے نہ ہوا ہو۔ شروع شروع میں ہم انسان
تھے صرف محض۔ اس کے بعد انسان دو حصوں میں تقسیم ہوتا
گیا۔ انسانیت اور ترقی۔ جس کا سب سے پہلا روپ تھا، ذہنی برتری،
جسمانی برتری اور جسمانی غلامی۔ انسان کو دُنیا میں بچّہ کی مانند
دھکیل دیا گیا تھا۔ نڈر، بے خوف بچّہ کی مانند جسے کسی چیز سے
ڈر نہیں تھا۔ تمام دن لہو و لعب میں مصروف رہنا اور رات
کو پڑ کر سو رہنا۔ لیکن جوں جوں وقت بیتتا گیا پہلی سی تروتازگی
اور شادابی کم ہونے لگی۔ خاموش دھیان میں مگن بیٹھا ہوا
انسان دوڑتے بھاگتے اُچھلتے کودتے انسانوں کو اپنے سے کمتر
سوچنے لگا۔ اُسے بے وجہ یہ خیال ستانے لگا کہ زندگی محض کھیلنے
کے لئے نہیں بنی ہے اس کا مقصد زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔ یہ
ترقی کا دُھندلا دُھندلا سا خیال تھا۔ مُراد یہ کہ ترقی کا بیج نشوونما
پاتا گیا۔ ایک روز نہیں کتنے ہی سالوں تک یہ پھوٹنے کی کوشش
کرتا رہا۔ اور آج ترقی کا درخت بوڑھا ہو چکا ہے اس کی کمر
زمانے کے دُکھوں سے جُھک گئی ہے۔ اس کے سائے میں جو جو ظلم
روا رکھے گئے ہیں اُن کی داستان طویل ہے۔

پہلے انسان آزاد تھا۔ اکیلا اور آزاد۔ گھر بنا، گاؤں نے
جنم لیا۔ آزادی غلامی میں تبدیل ہو گئی۔ تاریخ صدیوں میں پھیلتی
گئی۔ وقت ترقی کا راگ الاپنے لگا اور انسان اپنے آپ کو
انسان سے کچھ بالا سمجھنے لگا۔ اپنے آپ کو کچھ سمجھنا ہی ترقی
کا پہلا زینہ ہے۔ تخریب کی پہلی سیڑھی ہے۔ روزِ ازل کی بازگشت
اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ روزِ ازل کا کھیل رچایا ہی
اس واسطے گیا تھا کہ انسان انفرادی طور سے زندہ رہے
آزادی میں سانس لے، اپنی اعضا کی قوت، فطری جذبات
اور رجحانات کا صحیح اور صحت مند استعمال سے زندگی کو
آرام کے ساتھ بسر کرنے کے بعد کسی روز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
آسمان تلے آنکھ میچ کر سو جائے۔ مگر ہم کو یہ پسند ہوتا تب۔
ہم کو دوسری قسم کی پرواز کے لئے بنایا تھا اور ہم نے اُڑنے
کی کوشش بھی اور طرح کی۔ ہم کسی حد تک اپنے جسموں اپنی
صحت مندانہ خوشیوں سے اپنے آپ کو وابستہ کرتے رہے اس
کے بعد ہم نے دماغ کی طرف رُجوع کیا۔ اشرف المخلوقات نے
سمجھا کہ اب انسان کا راستہ خدا کی منزل تک صاف ہو گیا ہے
دماغ کی ایجاد پر انسان بہت خوش ہوا۔ ہاں! اس نے اپنی
گردن کے گرد رسی ڈال کر پھندا لگانے کا پہلا سبق سیکھا
اور وہ اُن گذری ہوئی صدیوں میں اس پھندے کو اور زیادہ
مضبوط کرتا رہا ہے۔ یہ رسی کسی ایک قسم کے دھاگوں سے نہیں
بٹی گئی ہے بلکہ کتنے ہی قسم کے دھاگوں سے مل کر یہ مضبوط
سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ علم، فلسفہ، قدرت کی پوشیدہ
باتیں معلوم کرنے کا خبط، مذہب، سیاسی نظام یہ تمام کے
تمام وہ دھاگے ہیں جو رسی کو زیادہ مضبوط بناتے رہے ہیں
اور آئندہ زیادہ مضبوط بنائیں گے۔ زندگی میں نظام ترتیب
دینا انسان کا کام نہیں تھا۔ قدرت کے بھیدوں سے واقفیت

یہ طبیعت کی آغوش میں پلنے والے انسانوں کو عمل، اور تحریک کے جال
میں پھنسایا گیا ہے۔ گھنے پہاڑ، جنگلوں، ندی نالوں اور چشموں
کی نزدیکی میں رہنے والے زندگی سے بھرپور انسانوں کو غلام بنایا
گیا ہے اور بے قصور سخت سزائیں دی گئی ہیں۔ یہ ہے عمل کی
تاریخ کا اُس دَور کا افسانہ۔ جب کہ تہذیب کو غلط طریقے
سے استعمال کیا گیا ہے۔ حاکم کو مہذب اور محکوم کو غیر مہذب
کہا گیا ہے جب کارخانوں میں بچوں اور عورتوں کو بارہ بارہ
چودہ چودہ گھنٹے غیر صحت مند ماحول میں کام کرنے کے
لئے پیٹ بھرنے کی خاطر مجبور کیا ہے۔ سپاہی اور مزدور کو
جنگ جیتنے کے بعد فاقہ، گمنامی اور دوسرے ٹیڑھے راستوں
میں بھٹکنے کے لئے دُنیا کے پھیلاؤ میں پھینک دیا گیا ہے تہذیب
عمل کو اپنا کر ابدی فرعونوں کا مقبرہ بنتی جا رہی ہے جس کو مکمل
کرانے کے لئے نت نئے فرعون ابھرتے رہیں گے اور عوام الناس
کو تہذیب کے مقبرہ کو گذرتی اور آنیوالی صدیوں میں مکمل طور
سے تعمیر کرنے کے لئے پتھر ڈھوتے ڈھوتے گھساتے رہیں گے۔ عوام الناس
کی کمر پہلے ہی لہولہان ہے آنیوالے دنوں کے جبر کو یہ سہہ سکے گی
اس کے بارے میں یقین کوئی کرنا ممکن تو نہیں مبہم ضرور ہے
لیکن جب تک عمل کی سلطنت ہو جو ابدی صورت اختیار کرتی نظر
آتی ہے تب تک انسان تڑپتا رہے گا۔

انسانی جہالت کے اس دور میں کوششیں اب بھی جاری
ہیں۔ دو عظیم جنگوں کے بعد انسان اپنی غلطیوں سے آگاہ نہیں
ہو سکا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس قسم کی آوازیں اٹھی تھیں
کہ جنگ اب ختم ہو گئی ہے اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اس قسم کی
آواز اٹھانے تک کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جا رہی ہے کتنی زبردست
خوش فہمی ہے حقیقت کو قتل کیا جا رہا ہے۔ انسان اب تہذیب
کے اُس دَور میں داخل ہو رہا ہے جب وہ اپنے ہی بنائے ہوئے
کھلونوں، خیالوں، نظاموں کے جال میں پھنس گیا ہے۔ گو
انسان امن کی بحالی پر بظاہر خوش ہے لیکن تحت شعور کی پلیٹ
پر چھائی ہوئی سیاہی غلط فہمیاں اور انسان اور انسان
کے مابین خلیج اتنی بڑھ گئی ہیں کہ باہر کی مسکراہٹ اندر والی مایوسی
کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتی۔ اب خلیج کو امن کے تصوراتی پلوں
کی تعمیر کر کے پُر کرنا بیکار ہے۔ انسان نے قدرت سے بغاوت کا
نام تہذیب رکھا اور وہ ہمیشہ سے قدرت سے بغاوت کرتا رہا ہے

آج قدرت انتقام لینے پر تُلی ہوئی ہے صدیوں سے انسانی ذہانت کی
زبردست سِل کے نیچے دبی ہوئی بھولی بھالی پرکرتی (سرشٹی) ماں
قدرت آج اپنی قوتوں کو اکٹھا کر رہی ہے اور اپنے آپ کو ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے انسانی دماغ کے بیسٹائیل ——— (فرانس
کا مشہور قید خانہ) سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں مشغول
ہے۔ اس بغاوت کا اندازہ لگانا قیاس سے باہر ہے۔ ممکن ہے کہ
انسان نیست و نابود ہو جائے۔ اور نئے سرے سے اس دُنیا
کا آغاز ہو۔ نیا انسان قدرت سے ہم آہنگ ہو۔ اور فطرت کے
سازوں پر ٹھیک طور سے انگلیاں رکھ سکے۔ فرانسیسی انقلاب کی طرح
سارہ کا ٹوٹنا ہو سیلاب، عوام الناس کا مجتمع اوقات میں
زبردست کے خلاف احتجاج اس آنیوالی بغاوت کے سامنے معمولی
باتیں ہیں۔ لیکن صورتیں ہیں جن سے یہ بغاوت روکی جا سکتی
ہے۔ یہ ہے بد کو بدتر بننے نہ دینا آج قوموں کا فرض ہے کہ وہ
دماغ کے قید خانوں میں سڑنے کی کوشش نہ کریں بلکہ موجودہ
نظام مستقبل سے آزاد کر کے اس میں ایسی خوبیاں پیدا کر دیں
جس سے کم از کم جو میسر ہے ملتا ہے۔ دماغ ہمیشہ ہماری خوشیوں
کو کم کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ آئندہ کی اُمید محض ایک دھوکہ ہے۔
حال کو سُدھارنا ہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔ دو جنگوں کے دوران
میں ہم نے مستقبل کے خواب دیکھے۔ دُھندلے اور مبہم خواب
آج بھی ہم خواب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اب وقت گذر چکا ہے
جب انسان انسان پر حکومت کر سکے۔ آج قدرت عوام الناس
کی مدد کے لئے تیار نظر آتی ہے۔ وہ تب تک چین نہیں لے گی
جب تک عام انسان سے صحیح سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ تب تک
مشینی دَور کے حکمران سائنس کو سموئل بٹلر کی مشہور کتاب
ایری وھان ——— کے عجیب و غریب شہر کے باشندوں کی
نقل کرتے ہوئے محض ایک گذری ہوئی بات نہ بنا دیں۔ انسان
کی بہتری اس میں ہے کہ وہ بد کو بدتر بننے سے روکے۔ قدرت کی طرف
اپنا دوستی کا ہاتھ بڑھائے عوام الناس کی آواز سُنی جائے صدیوں
سے جو دھوکہ عام انسان کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے اسے دفن
کیا جائے۔ تب ہی تو کچھ بن سکتا ہے نہیں تو تصویر کا دوسرا رخ
ہمارے سامنے ہے۔ اشیاء کا نباتاتی عمل۔ بد کا بدترین بن جانے
کا بے روک ٹوک کھلا راستہ ——— کاش ہم ایکبار پھر قدرت سے
آشنائی پیدا کر لیں۔ ایک بار پھر انسان کا بچپن جاگ اُٹھے۔ ایک

پھر ہمارا دل آکاش پر سجے ہوئے تاروں، درختوں سے ڈھکے ہوئے
...شوں کے جھنڈوں، پہاڑوں کے نکیلے پتھروں پر دندناتے ہوئے
...ری نالوں، طاؤس کے رقص، اور سچی اور پاکیزہ استبار
...ی طرف مائل ہوجاتے۔ تب یہ اقتصادی، سیاسی، امتیازی
...قوموں سے بھری ہوئی دنیا رہنے کے لئے ایک پُرامن گھر بن
...جائے گی نہیں ہوا یہ کہ ہم گہرائیوں میں دوڑتے جاتے۔
... یہ نظام گھڑ رہے ہیں سب بڑی قوموں کو ہتھیار بندی کی
... اور پست قوموں کو ذلت اور گمنامی کا سبق دیتے رہیے
... وہ قوم جو کچل کر ذہنی اور جسمانی طور سے غلام بناتے
... یہی ہے تہذیب انسانیت کا عروج، یہی ہے ہماری
... یہی ہے ہمارا منتہائے مقصود ۔۔ ہاں! سوائے
... مایوسی کو پھر آماجگاہ بنا جائے کوئی چارہ نہیں۔ شاید
... تاریکی سے محبت ہو گئی ہے۔ ماضی کے ایک فلاسفر
... وقت کہا تھا۔ روشنی، روشنی، اور روشنی ۔ حال کا فلاسفر
... ریکی، تاریکی اور تاریکی ۔۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا
... طرف اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ مدتوں سے عدم کے دروازے
... جلسے کے پروگرام باندھے جا رہے تھے لیکن آج کوئی تیار
... آج جو رواستبداد سے دبی ہوئی عوام الناس کی چیخ
... سنے گا کوئی نہیں سنے گا۔ آج مایوسی کی سلطنت ہے اس
... ممکن ہے معدودے چند ہی انکار کریں۔ جنگیں ہمیشہ
... اس کی پیٹھ ٹھونک ٹھونک کر وعدۂ فردا دلا کر لڑی
... میں اور لڑی جائیں گی۔ انسان موقوف بنا رہے گا۔
... وہ اپنے دماغ سے محکومیت کے خیال کو یوں نہیں
... نکال سکتا۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اُٹھے پھر وہ
... برابری اور برادرانہ اتحاد کا علم بلند کرے لیکن
... سے کھنچی ہوئی بنیادوں پر نہیں۔ بلکہ مصالحتانہ
... ساتھ ۔ ورنہ تلخ حقیقت ہمارے سامنے ہے۔ انسان
... سے پہلے ہی نیست و نابود ہو جائیگا ۔ کیوں؟

ایٹم بم

کس نے پھونکا ہے سرافیل کا صور

پھٹ پڑے کوہ فضا تھرائی

کانپ اُٹھا ہے شبستانِ وجود

کوئی دیکھے تو خرد کا اعجاز

ایک ذرّے سے ہراساں ہے حیات

دیکھتے دیکھتے ڈوبی آواز

کسقدر سست تھی بُنیادِ ممات

اب نظر میں نہ کوئی ہست نہ بُود

اب نہ شمعیں نہ پتنگے باقی

میرے اللہ یہ انجامِ شعور

کس نے پھونکا ہے سرافیل کا صور

پھٹ پڑے کوہ فضا تھرائی

اک نئے دور کا آغاز ہوا

اب نئے ڈھنگ سے ہوگی تنظیم

نئی راہوں کے نشاں لائیگا

ایک اک گام پہ اب فکرِ سلیم

کسے معلوم کہ انساں پھر بھی

اپنی منزل کے قریب ہوگا کہ دُور

اختر ہوشیارپوری

کل، آج، کل

مخمور جالندھری

کل۔ (جو گذر چکا ہے)

پیڑ کے نیچے ایک الاؤ ۔۔۔ اُس کے گرد
اُونگھ رہے ہیں ننگے وحشی، بھوکے وحشی غم سے نڈھال
اتنے میں اک وحشی اُٹھا۔ جھاڑی گرد
روغن کالی آنکھیں جس کی۔ چہرہ زرد
بولا: "میں ہونے نہیں دوں گا اپنی قوم کا خستہ حال
اُٹھو پڑوسی کے گھر میں ہے دولت، روٹی، کپڑا، مال"
اُونگھتے بھوکے۔ اُٹھے، جاگے۔ کاٹے پیڑ
ہلکے بھاری بنے سفینے ۔۔۔ عالیشان
نیزے، بھالے، برچھے، چاقو، تیر کمان
ہوا فراہم قتل و غارت کا سامان
آندھی اُٹھی، اُمڈی، چھائی ۔۔۔ ہر سو گونجی چیخ پکار
بوڑھے بسمل، بچے گھائل، گودیں ویراں، عصمت چاک
سارے پڑوسی زنجیروں میں ۔۔۔ رقصاں اُن کے گھر میں خاک

(۲)

آج ۔۔ (جو گذر رہا ہے)

گرم انگیٹھی پاس ہی اُس کے ۔۔۔ میز کے گرد
سوچ رہے ہیں ریشم پہنے شائستہ برتر انسان
اُن میں سے ایک اُٹھا۔ ہاتھ میں لیکر جام
آنکھوں میں خنجر کی چمک، چہرہ گلفام
بولا: "پچھلی جنگ کا کرنا ہے پہلے پورا نقصان
اُٹھو پڑوسی کے گھر میں ہے سونے چاندی کا دالان"
ناداروں کی پل میں بنی ۔۔۔ اک بھاری فوج
حبِ وطن کا، ننگِ وطن کا لے کر نام
روٹی کپڑے کا لالچ دیگر انعام۔
لے ہی آتے انسانوں کو زیرِ دام
لوہے نے لوہے سے کھیلی ہولی۔ گونجی چیخ پکار
بوڑھے بسمل، بچے گھائل، گودیں ویراں، عصمت چاک
مسجد، مندر، قصر و کلیسا ریزہ ریزہ۔ جزوِ خاک

(۳)

کل۔ (جو گذرے گا)

سر رکھے اُبھرے سینوں پر ۔۔۔ حوض کے گرد
سوچ رہے ہیں "فردوسِ مستقبل" کے خالق۔ انسان
ریشمی زلفوں پر ایک اُٹھا۔ پھیرتا ہاتھ
اُس کی محبوبہ بھی اُٹھی ۔۔۔ اُس کے ساتھ
بولا "اپنے پڑوسی کی جنت ہے کتنی عالیشان
اُٹھو چھینو شہد کی نہریں، عیش و عشرت کا سامان"
"جوہر بم" ۔۔۔ پُرسوز شعاعیں، مہلک گیس
فاش ہوئے سب "ہنگامِ محشر" کے راز
ہوئے مصائب کے سنگیں دروازے باز
بوڑھی ڈائن موت نے چھیڑا اپنا ساز۔
شہر کھنڈر۔ خاموش فضائیں، بادِ نکہت زا سموم
گھر والا کوئی نہ کوئی گھر ۔۔۔ کوئی پیڑ نہ اُن پر بوم

بھوکے انسانوں سے توقع رحم و کرم کی ۔۔۔ خام خیال
کب آئے گا دورِ مسرت ۔۔۔ ذہن پہ کوئی بوجھ نہ ڈال

فضل

بلرام پور کا آدم خور

قصّہ شروع کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ بلرامپور کا
وقوع اور اس کے اطراف و اکناف آپکو اچھی طرح سے
معلوم ہوں۔ گو اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔
بلرام پور ۳۵ یا ۴۰ جھونپڑوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں
کل آبادی کوئی سو کے لگ بھگ ہوگی۔ کچھ جھونپڑوں
میں رہتے ہیں اور کچھ جانوروں کے ساتھ کھلے میدان میں پڑ
رہتے ہیں۔ اس میدان میں چونکہ گاؤں کے سارے مویشی
رہتے ہیں اس لئے چاہے سردی ہو یا گرمی ساری رات آگ
جلائی جاتی ہے تاکہ درندوں سے جانور بچے رہیں۔ درندے
بھی اس آگ کے عادی سے ہو گئے ہیں، جب جی چاہتا ہے حملہ
کرتے ہیں، اگر حملہ شور مچنے سے پہلے کامیاب ہو گیا تو جانور
لے بھاگے اور اگر دھم مچنے سے پہلے یا شروع ہوتے ہوتے
جنگل میں پہونچ گئے ورنہ جانور زخمی ہو کر بچ جاتا ہے۔ خیر
گاؤں جنگل کے ایک صاف شدہ گول پلاٹ کے بیچوں بیچ آباد
ہے اس دائرے کا قطر کوئی آدھ میل ہوگا۔ گاؤں کے جنوب
میں ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس کا بند گاؤں کی طرف ہے۔ اس
تالاب کا پانی گاؤں کے مرد اور عورتیں کپڑے دھونے اور
نہانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے دامن سے جنگل شروع
ہوتا ہے اور دو تین میل کے بعد نیچی نیچی پہاڑیوں کی
قطار شروع ہو جاتی ہیں۔ گاؤں کے مغرب میں P.W.D
کا ایک بنگلہ ہے تالاب کا پانی برسات میں ڈاک بنگلے کے
احاطے تک پہونچ جاتا ہے۔ گرمیوں میں پانی کی کمی کے باوجود
اتنا پانی رہ جاتا ہے جو ڈاک بنگلے کے سٹو گز پیچھے سے
ہوتا ہوا تالاب سے جا ملتا ہے۔ ڈاک بنگلے کا پچھلا احاطہ
جنگل سے متصل ہے۔ یہ جنگل گاؤں کو شمال اور مشرق
دونوں طرف سے ہی گھیرے ہوئے ہے۔ اردگرد میلوں
تک طرح طرح کے درختوں کا جنگل ہے زیادہ تر میدان اور بعض
بعض جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جگہ جگہ بے شمار چھوٹے چھوٹے
نالوں سے کٹے ہوئے ہیں۔ آس پاس کے گاؤں چھ چھ سات سات
میل پر آباد ہیں۔ یہ سب کے سب تقریباً بلرام پور کی قسم کے
ہی ہیں۔ بلرام پور سے تین راستے نکلتے ہیں۔ گاؤں کے مغرب
والا راستہ پرتاب پور جاتا ہے۔ پرتاب پور تحصیل کا مستقر ہے
اور تقریباً ۲۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ دوسرا راستہ مشرق کی
طرف ہے اور بہ نندی گاؤں جاتا ہے۔ یہ راستہ ایک بڑے
تالاب کے بند پر سے ہو کر گذرتا ہے جو گھن پور کے تالاب
کے نام سے مشہور ہے۔ اس تالاب کے بند کے نیچے تقریباً
دو ہزار ایکڑ میں چاول کی کاشت ہوتی ہے جو آس پاس کے
گاؤں کے کام آتا ہے۔ بلرام پور کے شمال کی طرف کریم آباد
چھ سات میل پر آباد ہے۔ اس کا راستہ ایک اونچی پہاڑی
کے دامن میں پیچ و خم کھاتا گذرتا ہے۔ ان سب راستوں
پر صرف بیل گاڑیوں سے سفر کیا جا سکتا ہے۔ برسات میں
تقریباً آمد و رفت بند ہو جاتی ہے۔

۱۹۳۸ء کی مارچ میں ایک دن پرتاب پور کے تحصیلدار
نے مجھے وقت گذاری کے طور پر اس آدم خور کے قصے سنانے
شروع کئے۔ قصّوں میں اور خاص کر شکار کے قصّوں میں
عموماً ستر فیصدی مبالغہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ تحصیلدار
صاحب کو شکار کا شوق تھا اس لئے انہوں نے چند بعید از
فہم واقعات بھی سنائے غالباً ان کو خود بھی ان پر سچے ہونے
کا یقین تھا۔ میں حسب معمول ان کے قصّوں میں سے ستر
فیصدی واقعات منہا کرتا رہا۔ مگر بقیہ ۳۰ فیصدی کچھ غیر
معمولی معلوم ہوئے۔ چنانچہ مستقر پر پہونچنے کے بعد میں نے
اس آدم خور کے کردہ نقصانات کی تحقیق کچھ پولیس کی رپورٹ
اور کچھ مال اور کچھ جنگلات کے دفتر سے مرتب کی تفصیل یہ ہے۔
پچھلے ۳ سال میں تقریباً ۱۲۷ آدمی ہلاک ہوئے۔ پہلے
سال ۲۵ دوسرے سال ۴۶ تیسرے سال ۵۶ یعنی یہ آدم خور
رفتہ رفتہ جانور ہلاک کرنے چھوڑتا چلا جا رہا تھا بلکہ یہ کہنا

[illegible] ڈائرکٹر سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلہ میں جو بھی واقعہ
ہو اس کی تفصیل سے مجھے مطلع کرتے رہیں۔

قصہ مختصر تقریباً مہینہ ڈیڑھ میں بہت مصروف رہا۔
[illegible]ئی کی ابتدا میں میں ایک ماہ کی چھٹی لے کر اور شکار کا پورا
انتظام کرکے بلرام پور جا پہونچا۔ اس ڈیڑھ مہینے کے عرصے میں
آدم خور نے غیر معمولی جانی نقصان کیا۔ یعنی دس آدمی مارے
اور پانچ سات زخمی ہو گئے۔ اپنے ساتھ میں اپنے شکاری
اکبر بہادر خاں کو لے گیا۔ یہ شخص غیر معمولی استقلال کا آدمی
ہے۔ نشانہ اچھا لگاتا ہے۔ کھوج لگانے میں کافی مہارت
رکھتا ہے۔ شکار سے متعلق سارا انتظام اس کے سپرد رہتا ہے۔

بلرام پور میں ۵ مئی کی شام کو پہونچا۔ یہاں لوگوں
کو میرے آنے کی خبر پہلے سے سرکاری طور پر مل چکی تھی اس
لئے تقریباً سارا انتظام ہو چکا تھا۔ اتنے ہی میں مجھے خبر ملی
کہ تین تاریخ کی شام کو تقریباً چھ بجے شیر ایک عورت کو
جو تالاب کے بند کی طرف پانی بھر رہی تھی اٹھا کر لے گیا ہے
میں نے دریافت کیا کہ نعش کی تلاش کی گئی یا نہیں لوگوں
نے صاف صاف تو نہیں بتایا مگر باتوں سے یہ پتہ چل گیا کہ کوئی
خاص کوشش نہیں کی گئی۔ غالباً کسی کی ہمت ہی نہ ہوئی
کہ اس کے پیچھے جنگل میں جاتا۔ اور ٹھیک بھی ہے کہ معرکے
کے وقت دس بیس تو کیا سو آدمی بھی جنگل میں قدم رکھنے کی
ہمت نہ کرتے اور پھر آدم خور کے پیچھے۔

اس شام کو کچھ نہ کیا جا سکتا تھا۔ تقریباً مغرب ہو
ہی چکی تھی۔ پھر میں بہت تھکا ہوا بھی تھا۔ کھانا کھا کر نماز
پڑھی اور سونے کے لئے لیٹا تو تقریباً دس بج رہے تھے۔
بنگلے میں سخت گرمی تھی۔ باہر سونے کی ہمت نہ ہوتی تھی جب
اندر نہ سو سکا تو برآمدے میں پلنگ نکلوایا اور احتیاطاً
پندرہ بیس فٹ دور آگ جلوائی۔ پاس ہی ایک درخت
کے ساتھ کتا بندھوا دیا۔ اس خیال سے کہ اگر کوئی جانور آیا
تو کتا ضرور شور مچائے گا۔ اس انتظام کے بعد میں لیٹ گیا
اور سوچنے لگا کہ کارروائی کیسے شروع کی جائے میں یہی
سوچ رہا تھا کہ شیر نے آواز دی معلوم ہوتا تھا کہ شیر
تالاب کے دامن میں ہے۔ غالباً پانی پینے آیا تھا۔ تقریباً
پانچ سو گز کے فاصلہ سے خاموش اور اندھیری رات میں
شیر کی گرج کافی دہشت انگیز ہوتی ہے۔ میں نے خیریت
اسی میں دیکھی کہ گرمی کو بھول جاؤں اور کمرے کے اندر سوؤں
نوکر سارے ملازموں کے کوارٹروں میں بند تھے اکیلا
میں ہی تھا خود چارپائی اٹھا کر اندر لے گیا۔ کواڑ بند کرکے
اور کھڑکیاں کھول کر لیٹ گیا۔ ان کھڑکیوں میں لوہے کی
سلاخیں لگی ہوئی تھیں اس لئے کوئی خطرہ نہ تھا۔ بڑی مشکل
سے آنکھ لگی۔ رات میں شیر نے پھر آواز دی اور میری آنکھ
کھل گئی۔ یہ آواز شیر نے تالاب سے دی تھی اور جیسا کہ میں
اوپر بیان کر چکا ہوں یہ تالاب بنگلے سے [illegible] اگر پیچھے کی طرف
واقع ہے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد نیم کے سوکھے پتوں پر کسی
نرم پیر کے جانور کے چلنے کی آواز آئی۔ مجھے شیر کا خیال
ہوا۔ میں نے آہستہ سے اٹھ کر ٹارچ رائفل پر لگائی۔ کارتوس
بھرے اور کھڑکی میں سے بندوق کی نال نکال کر ٹارچ جلائی
غالباً شیر نے بندوق کی نال کی لوہے کے سلاخوں سے
ٹکرانے کی آواز سن لی تھی۔ مجھے یہ خیال ہے کہ وہ بہت
ہی تیزی سے ایک چھوٹی جھاڑی کے پیچھے ہو گیا جو نیم کے
تقریباً پیچھے ہی تھی۔ میں نے قیاساً فائر کرنا مناسب نہ سمجھا
کچھ دیر اور انتظار کیا۔ پھر یہ سوچ کر کہ شیر یا جو کوئی
بھی جانور تھا وہ جھاڑی کی آڑ آڑ میں واپس جنگل چلا
گیا ہے۔ میں لیٹ گیا۔ نہ معلوم کب آنکھ لگ گئی۔ ہوا میں
ذرا خنکی آ گئی تھی اچھی طرح سویا۔ جاگا تو صبح کے آٹھ بجے
تھے۔ سب سے پہلا کام میں نے اٹھنے کے بعد یہ کیا کہ رائفل لے کر
پیر کے نشان دیکھنے کے لئے چل پڑا۔ نیم کے پیڑ کے نیچے
تو ان پتوں کی وجہ سے نہ بنے تھے مگر جھاڑی کے
نیچے ضرور تھے معلوم ہوا کہ شیر وہاں کچھ دیر کھڑا رہا
اور اس کے بعد بنگلے کا ایک چکر لگا کر نالہ کی طرف چلا گیا
ممکن تھا کہ اگر میں کچھ دیر اور انتظار کرتا تو مجھے فائر کرنے
کا موقعہ مل جاتا اور تقریباً پندرہ دن حیران نہ ہونا پڑتا۔
[illegible] نالے میں پہونچنے کے بعد مجھے گیلی مٹی میں چند بہت
اچھے پیروں کے نشان ملے۔ جن لوگوں نے شیر کا شکار
کھیلا ہے وہ ان نشانوں کی اہمیت سے خوب واقف
ہیں۔ چند باتوں کا تو ان کو دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے
مثلاً شیر کتنا بڑا ہے۔ کتنی مدت ہوئی نشان بنے ہوئے

سر سے یا مادہ وغیرہ وغیرہ۔
مجھے ان نشانوں سے یہ پتہ چلا کہ یہ مادہ ہے اور بائیں
جانب کا اگلا پنجہ اندر کی طرف مڑا ہوا ہے۔ غالباً کبھی یہ پیر
زخمی ہوا ہوگا۔ دائیں طرف کے پچھلے پنجے کی گدی پر زخم
کا نشان تھا۔ شیرنی ساڑھے آٹھ فٹ اور نو فٹ کے
درمیان ہے۔ شیرنی یہاں سے سیدھی جنگل کی طرف
مڑی تھی۔ اس کے تعاقب میں فی الحال کوئی فائدہ نہ تھا
اس لیے ڈاک بنگلے چلا آیا۔ واپس ہوتے ہوئے اور راستہ
بھر یہ سوچتا رہا کہ ابتدا کیسے کی جائے نعش کی تلاش بیکار
تھی۔ اس کو شیرنی کبھی کی کھا چکی تھی ورنہ وہ رات کو
چکر لگاتی۔ پھر تین اس کے علاوہ دو تین راتیں گذر چکی
تھیں۔ رہی سہی ہڈیاں گیدڑ اور لکڑ بگے ختم کر گئے ہونگے۔
آخر فیصلہ یہ کیا کہ ابتدا حسب معمول کی جائے۔ پٹواری سے
چار بھینس کے بچے جن کے بالشت بالشت بھر کے
سینگ تھے منگوائے۔ ان میں سے دو کو میں خود لے کر
سامنے چل پڑا۔ پہلا ٹوٹا ڈاک بنگلے کے پیچھے ہی نالے میں
باندھا جہاں پیر کے نشانوں سے ظاہر تھا کہ شیرنی
عموماً آتی رہتی ہے۔ دوسرا تین نالوں کے سنگم پر باندھا
جو اوپر کی پچھلی طرف کی پہاڑیوں سے نکلتے تھے اور اس
[illegible] سوکھے تھے۔ یہ جگہ تقریباً ڈاک بنگلہ سے چار میل
دور ہوگی۔ چونکہ ہم لوگ دوپہر کے کھانے کے بعد چلے تھے
اس لیے بچھڑوں کو باندھنے اور گھاس ڈالنے وغیرہ میں
تقریباً شام کے ساڑھے پانچ بج گئے تھے۔ ہم لوگ جلد
جلد واپس ہو رہے تھے تاکہ مغرب ہونے سے پہلے پہلے جنگل
سے باہر پہنچ جائیں۔ اس دوران میں ایک ایسا حادثہ پیش
آیا جس سے مجھے اس شیرنی کی چالاکی کا کافی ثبوت
مل گیا۔ عموماً گھنے جنگلوں میں زیادہ تر پگ ڈنڈیوں پر
ہی حرکت ہوتی ہے یہ پگ ڈنڈیاں یا تو آدمی اور
مویشیوں کے چلنے سے بنتی ہیں یا خود جنگلی جانوروں
کی آمد و رفت سے بن جاتی ہے۔ ہم لوگ ایسی ہی ایک ایک
پگڈنڈی پر چل رہے تھے اور ہماری پارٹی کی تعداد سات
آٹھ ہوگی۔ راستہ میں مجھے دفعتہً بائیں جانب ایک بہت
شاندار سینگوں والا چیتل نظر آیا۔ گو اسکو مارنا اصول کے
خلاف تھا مگر طبیعت دوڑ رہی تھی۔ اس لئے فیصلہ [illegible]
لاؤ مار ہی لیں مگر اس دوران میں چیتل چل پڑا میں [illegible]
تھا کہ میں اس کو پیچھا کر کے پانچ دس منٹ میں مار لوں [illegible]
میں نے ساتھیوں کو وہیں کھڑے رہنے کی تاکید کی اور
چیتل کا تعاقب شروع کیا۔ چیتل نے پہاڑیوں کا رخ کیا
یعنی اس طرف جا رہا تھا جس طرف سے ہم واپس ہو رہے
تھے۔ دس منٹ کے بعد جب میں نے یہ دیکھا کہ یہ جلدی جلدی
قابو میں آنے والا نہیں تو میں راستہ کاٹ کر واپس پگڈنڈی
پر آگیا۔ زیادہ سے زیادہ میں اپنی پارٹی سے پانچ سو
یا چھ سو گز پیچھے تھا۔ میں نے تیز تیز قدم اٹھا کر چلنا شروع
کیا۔ اتفاق سے میری نظر پگڈنڈی پر پیروں کے نشان پر
پڑی۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ شیرنی کے پیروں
کے نشان بھی اسی طرف جا رہے ہیں جس طرف کہ ہم
لوگ جا رہے تھے۔ اور پھر بالکل تازہ نشان تھے۔
دوسری بات قابل غور یہ تھی کہ شیرنی ہماری پارٹی
سے آگے نہیں بلکہ میرے اور پارٹی کے بیچ میں تھی کیونکہ
اس کے پیر کے نشان میرے آدمیوں کے پیر کے نشانوں
پر بنے ہوئے تھے۔ یعنی یہ کہ وہ پیچھا کر رہی تھی اور پارٹی
سے بہت ہی قریب تھی میں مشکل سے ان آدمیوں سے
۴۰ گز دور تھا اور مجھے ان کے اونچے اونچے بولنے کی آواز
صاف سنائی دے رہی تھی۔ موقع کافی نازک صورت
اختیار کئے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر شیرنی یہی
کھیل کھیلنا چاہتی تھی تو اس کو دو بھی کھیل سکتے ہیں۔
شیرنی پارٹی پر داؤ لگانے میں مصروف تھی اور میں
شیرنی کی تلاش میں تھا۔ مگر یہ کھیل تھا خطرناک کیونکہ
شیرنی جنگل میں اس کھیل کی ماہر ہوتی ہے اور شکاری
چاہے کتنا ہی تجربہ کار ہو اس کے مقابلے میں اناڑی ہوتا
ہے مگر چونکہ شیرنی کو اس کا علم نہ تھا کہ اسکا بھی کوئی
پیچھا کر رہا ہے اس لئے کامیابی کے امکانات میرے لئے
زیادہ تھے بشرطیکہ میرے شیرنی کو دیکھنے سے پہلے وہ
کسی کو اپنا شکار نہ بنا لے۔ میں بہت آہستہ آہستہ جھاڑیوں
کی آڑ لیتا آگے بڑھتا گیا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ میں
میں اپنی پارٹی سے ۵۰ گز پر پہنچ گیا مگر نہ تو آدمیوں نے

مجھے شیرنی نظر آئی۔ اس جگہ میں پانچ منٹ تک بالکل کھڑا یہ سوچتا رہا کہ آخر شیرنی گئی کہاں۔ اس پانچ منٹ کے وقفہ نے مجھے یقین دلا دیا کہ ہم لوگوں میں سے ایک کی جان بچائی میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اگر میں شیرنی ہوتا تو کیا کرتا۔ فوراً مجھے خیال آیا۔

جہاں یہ لوگ کھڑے تھے اس سے سو گز آگے چند پتھر ملی ہوئی چٹانیں تھیں جن کی بلندی غالباً ۵ فٹ ہوگی۔ اس کے اوپر چند چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی جو سوکھ کر زرد ہو گئی تھی۔ پگڈنڈی اس کے بالکل بازو سے گذرتی تھی۔ مجھے کامل یقین تھا کہ شیرنی ان چٹانوں پر بیٹھی آدمیوں کا پیچھے سے گذرنے کا انتظار کر رہی ہے۔ اگر میں بائیں طرف جنگل میں سے ہو کر چٹان کے پیچھے پہونچ جاؤں تو اس کا امکان تھا کہ مجھے شیرنی چٹان پر بیٹھی نظر آجائے۔ جب میں تقریباً چٹان کے پیچھے ۵۰ گز بائیں کو جا پہونچا تو مجھے چٹان کے اوپر گھاس میں خفیف سی حرکت نظر آئی۔ یہ حرکت ایسی نہ تھی جو ہوا کے چلنے سے گھاس میں پیدا ہوتی ہے اس سے مجھے جو کچھ بھی شبہ تھا وہ جاتا رہا۔ مگر چونکہ کوئی چیز نظر ہی نہ آتی تھی اس لئے کسی قسم کا فیصلہ ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ روشنی غائب ہوتی جا رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ اور پانچ یا دس منٹ میں رائفل سے نشانہ لینا مشکل ہو جائیگا۔ جو کچھ بھی کرنا تھا وہ اسی دوران میں کیا جانا چاہئیے۔ میں جھاڑی کی آڑ سے نکل آیا اور آواز دے کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ شیرنی چٹان پر بیٹھی ہے اور مناسب یہ ہے کہ وہ فی الحال درختوں پر چڑھ جائیں تاکہ میں اس پر فائر کروں۔ میرا آواز دینے سے یہ مطلب تھا کہ شیرنی کو پتہ چل جائے کہ وہ دو طرف سے گھری ہوئی ہے یا تو وہ بھاگنے کی کوشش کریگی یا یہ دیکھ کر کہ ان میں بھگ دوڑ مچ گئی ہے۔ یا دوڑ کر ان میں سے کسی کو پکڑنے کی کوشش کریگی۔ چونکہ چٹانوں اور آدمیوں میں سو گز کا فاصلہ تھا مجھے امید تھی کہ وہ حملہ نہ کریگی اور اگر کیا بھی تو مجھے تقریباً دو دفعہ فیر کرنے کا موقعہ مل جائیگا۔ میرا پہلا خیال ٹھیک نکلا۔ شیرنی نے حملہ کی کوشش نہیں کی۔ عموماً شیر ۴۰ گز سے زیادہ پر حملہ نہیں کرتے۔ گاؤں والوں کی حالت قابل رحم تھی ایک دو منٹ تک تو ان کی قوت فیصلہ نے کام ہی نہیں کیا۔ اور جب وہ اس قابل ہوئے تو ایسے بدحواس تھے کہ وہ درختوں پر چڑھتے چڑھتے کئی دفعہ گر پڑے۔ میری نظر چٹانوں پر تھی خیال یہ تھا کہ شیرنی ضرور بضرور کوئی نہ کوئی حرکت کریگی مجھے شیرنی قطعی نظر ہی نہ آئی۔ بہادر خاں نے آواز دے کر مجھے بتایا کہ شیرنی کود کر پگڈنڈی پر کھڑی ان لوگوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ چونکہ پگڈنڈی کا وہ حصہ چٹانوں کے پیچھے تھا مجھے شیرنی نظر نہ آسکتی تھی۔ میں نے بہادر خاں سے کہا کہ اگر وہ درخت پر بیٹھے بیٹھے گولی چلا سکتا ہے تو چلائے۔ بہادر خاں جیسے کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں نشانہ اچھا لگاتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ اگر شیرنی مر نہیں گئی تو اتنی زخمی ضرور ہو جائے گی کہ دوسرے دن تلاش کر کے اسکو مار لیا جائے۔ مگر قسمت ساتھ نہ دے رہی تھی بہادر خاں کی گولی خالی گئی اور جانی بھی چاہیے تھی۔ وہ بہت ہی بے ڈھنگے طریقہ سے درخت میں لٹکا ہوا تھا اور وقت واحد میں دونوں ہاتھ استعمال کرنے تقریباً اس کے لئے ناممکن تھے۔ بندوق کی آواز کے ساتھ ہی شیرنی اس قدر تیزی سے دوسری جانب بھاگی کہ جب مجھے دکھائی دی تو نشانہ دینا مشکل تھا۔ ساتھیوں کو درخت سے اتارنے میں کافی وقت پیش آئی اور واپسی اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ گاؤں والے نہ آگے چلنے کو تیار تھے اور نہ پیچھے۔ لہٰذا ان کو بیچ میں رکھا گیا۔ بہادر خاں آگے آگے اور میں پیچھے۔ تقریباً سارا راستہ کسی نہ کسی چیز سے یہ لوگ ڈرتے رہے۔

اس واقعہ کا گاؤں والوں پر اثر یہ ہوا کہ دوسرے دن سے بہت سوں نے جنگل میں داخل ہونے سے قطعی انکار کر دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کو کسی نہ کسی طریقہ سے مجبور کیا جا سکتا ہے میں نے مناسب یہی جانا کہ اُن کو مجبور نہ کیا جائے اپنی ضرورت کے لئے میرے پاس کافی آدمی تھے اور وہ ایک جن کی ضرورت محسوس ہوئی وہ بھی مل ہی جاتے تھے۔

اس دن دوسرے دو بچھڑے میں نے ایک کو گاؤں کے شکاریوں نے کریم آباد کے پہاڑی راستے کے دامن میں باندھا اور دوسرا آہن پور کے تالاب کے بند کے قریب باندھا تھا۔ مجھے رات کے واقعہ کے بعد یہ یقین تھا کہ شیرنی نے ان چاروں بچھڑوں میں سے کسی کو چھوا تک نہیں۔ ناشتہ

پیچھے ہی میں بہادر خاں اور دو گھسیاروں نے مل کر نلے اور
سنگھ ہوئے بچھڑوں کو دیکھ ڈالا۔ وہ مزے سے سو رہے
تھے۔ اُن کو گھانس ڈالنے اور پانی پلانے کے بعد ہم لوگ واپس
ہوئے۔ ناشتہ کیا اور گھن پور کے تالاب کی طرف چل پڑے۔
یہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ بچھڑے کو دو تیندوؤں نے مل کر
مار لیا ہے۔ یہ ایک نیا مسئلہ بیچ میں آن کھڑا ہوا۔ اگر ان کو
مار دو تو یہ تقریباً ہر روز بندھے ہوئے بچھڑے مار لیا کرینگے
ورنہ مارو تو شیرنی کے اور چوکنے ہو جانے کا امکان تھا۔ یہ کافی
سی امکان تھا کہ وہ یہاں بھی بندوقوں کی آواز سن کر گرد و
نواح چھوڑ بھاگے اور شاید کل رات کے واقعہ کے بعد چلی
ہی گئی ہو۔ بہرحال ہم نے فیصلہ یہ کیا کہ ان کو ختم ہی کر دیا
جائے۔ یہ تیندوے بچھڑے کو کھینچ کر ۲۰۰ گز دور لے گئے تھے
بچھڑے کا بہت سا حصہ اور دو پچھلی ٹانگیں کھا لی تھیں اور ان
کے واپس آنے میں کوئی شبہ ہی نہ تھا۔ میں نے بہادر خاں
اور ان دونوں گھسیاروں میں سے ایک کو سدی گاؤں روانہ
کیا کہ وہ مچان باندھنے کا سامان لے آئیں۔ مچان باندھنے
کی ہدایتیں میں دے چکا تھا۔ دوسرے گھسیارے کو میں لیکر
کریم آباد کی پہاڑی کی طرف چل پڑا اور وہاں پہونچ کر معلوم ہوا
کہ یہاں کا بچھڑا ابھی مار آگیا ہے مگر بہت چھوٹا اور نوجوان
معلوم ہوتا تھا۔ اس سے وہ رسی بھی نہ توڑ سکی تھی جس سے
یہ بچھڑا بندھا تھا یا اُس نے اس کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔
اب میری قطعی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں تقریباً دوپہر
کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔ میں نے تصفیہ یہ کیا کہ شیر نے بچھڑے
کا بہت کم حصہ کھایا اس لئے وہ آج تو واپس ضرور ہی آئیگا
اور شاید دوسرے دن بھی اگر نیا بچھڑا باندھ دیا جائے۔
میں واپس گھن پور کے تالاب چار بجے پہونچا آدمیوں
کو واپس کرتے اور کھانا کھاتے ساڑھے چار بج گئے۔ اور
اور چار پانچ منٹ بعد مچان پر میں اور بہادر خاں جا بیٹھے۔
اس کے بعد لوگوں کو رخصت کر دیا۔ ساڑھے چھ بجے تک
دونوں تیندوے آ گئے۔ بظاہر ان کو کوئی شبہ نہ ہوا تھا
دو منٹ کے اندر اندر ہم نے دونوں کو مار لیا۔ باقی رات مچان
پہ گذارنی بیکار تھی۔ ہم لوگ گھنٹے بھر میں ڈاک بنگلے
پہونچ گئے۔

دوسرے دن صبح ہی بہادر خاں کو چند آدمیوں کے ساتھ
گھن پور روانہ کیا ہدایت یہ دی کہ دونوں تیندوے ...
کے ہاتھ بلرام پور روانہ کر دے۔ گھن پور پر ایک نیا بچھڑا
باندھنے کے بعد وہ کریم آباد کی پہاڑی کے پاس دوسرے
بچھڑے کے ساتھ میرا انتظار کرے۔ ناشتے سے پہلے میں
ادھر کے دونوں بچھڑے دیکھ آیا۔ شیرنی دونوں بچھڑوں
کے ۲۰ یا ۳۰ گز قریب سے گذری تھی اور یہ ناممکن تھا کہ اس
نے ان کو نہ دیکھا ہو۔ اس سے یہ توقع بھی جاتی رہی کہ شاید
وہ بچھڑوں میں سے ایک کو ماریگی۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ
دونوں تیندوے آ گئے ہیں اور ان کی کھال کھینچنے اور سکھانے
کے متعلق ہدایات دینے کافی دیر ہو گئی، اس لئے دوپہر کے
کھانے کے بعد کریم آباد کی طرف روانہ ہوا۔ پہاڑی کو ہم پہنچے
پہونچے شام کے چار بج گئے۔ بہادر خاں نے مچان باندھ
رکھی تھی۔ بچھڑے کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا تھا اُس کو
بہادر خاں نے چھپا دیا تھا اور اُس کی جگہ نیا بچھڑا باندھ
دیا تھا۔ پانچ بجتے بجتے ہم لوگ مچان پر بیٹھ گئے۔ ۶½ بجے
کے قریب پہاڑی پر سے چھوٹے چھوٹے کنکریوں کے گرنے
کی آواز آنے لگی اور دس پندرہ منٹ کے بعد ہی شیر
کے غرانے کی آواز آئی۔ اس وقت تک شیر جھاڑیوں کی
وجہ سے ہماری نظروں سے چھپا ہوا تھا۔ غالباً شیر کو نیا
بچھڑا دیکھ کر کچھ تعجب ہوا اور کچھ غصہ آیا۔ غرض اس نے
نوجوانوں کی طرح بہت جلد فیصلہ کر لیا اور بجلی کی طرح
لپک کر حملہ کیا اور بچھڑے کی گردن پکڑ کر اُس کو زمین پہ
دبا کر بیٹھ گیا۔ شیر کے جانور مارنے کے کئی طریقے ہوتے
ہیں طوالت کی وجہ سے اس وقت مناسب نہیں سمجھتا اور
نہ اس وقت خون پینے اور نہ پینے کے جھگڑے کو اٹھایا جا سکتا
ہے۔ البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی گھڑی دیکھ کر جانور کے
گرنے اور مرنے کے وقفہ کو نہیں ناپا مگر قیاساً دو منٹ
سے زیادہ وقفہ نہیں لگتا۔ گو اس وقت گولی چلانے کا
بہت اچھا موقعہ تھا مگر چونکہ مجھے یقین تھا کہ شیر اب
نہیں جا سکتا اس لئے سوچا کہ لاؤ گھنٹہ آدھ گھنٹہ اس کے
کھانے کا تماشہ دیکھا جائے۔ مغرب میں ابھی کافی وقت تھا
اور شیر بچھڑے کو گھسیٹ کر لیجانا بھی نہ چاہتا تھا اس لئے

کی جلدی تھی جیسا کہ میرا خیال تھا یہ بہت ہی نوجوان شیر تھا جس کی عمر مشکل سے ساڑھے چار یا پانچ برس کا ہوگا جسامت بھی چھوٹی تھی۔ تقریباً مغرب تک میں بیٹھا یہ تماشہ دیکھتا رہا جب یہ خیال آیا کہ اب چند منٹوں میں نشانہ لینا مشکل ہو جائیگا تو گردن کی جڑ میں نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ شیر جیسے بیٹھا تھا ویسا ہی بیٹھا رہ گیا سوائے اس کے کہ اس کے جسم میں ذرا سا تشنج ہوا۔ اور ذرا سی دیر کے لئے دم ہلی۔

دوسرے دن علی الصبح میرے آدمی آ پہونچے یہاں نیا بچھڑا باندھا اور ہم شیر کو اٹھا کر ملرام پور کہن پور ہوتے ہوئے واپس پہونچے کہن پور کا بچھڑا زندہ تھا۔ انسپکشن بنگلہ پہونچ کر ناشتہ کیا اور دوسرے دونوں بچھڑوں کو دیکھ ڈالا۔ وہ بھی زندہ تھے۔ شیرنی کے کوئی تازہ نشان نہ تھے۔

اس کے بعد تقریباً ہفتہ بھر یہی معمول رہا کہ صبح ہوئی اور بچھڑوں کو دیکھنے چل دیئے ان کو پانی اور گھاس دیا اور واپس چلے آئے۔ شیرنی کا سرے سے کوئی پتہ ہی نہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ گرد و نواح چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ سچ پوچھئے تو ہونا بھی یونہی چاہیئے تھا آدمخور شیر کے شکار میں حتی الامکان کوشش اس بات کی کیجاتی ہے کہ کسی طرح سے اسکو خبردار ہونے کا موقع نہ دیا جائے مگر اس شکار میں تو اس وقت تک باقاعدہ چاند ماری ہوئی تھی اور ایک دفعہ خود مسٹر فائر بھی ہو چکا تھا۔ بس اپنی صفائی کے سلسلے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سارے فائر ضرورتاً کئے گئے تھے۔

مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً دس دن ہو گئے تھے اور چونکہ کہیں سے بھی کسی آدمی یا جانور مارنے کی اطلاع نہ آئی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ بہت جلد شیرنی کو ضرور کوئی نہ کوئی حرکت ایسی کرنی پڑیگی جس سے ہم کو اس کا پتہ چل سکے۔ چنانچہ دوسرے دن ہی دوپہر کو پتہ چلا کہ نندہال (کریم آباد سے ۵ میل دوسری طرف گاؤں ہے) شیر کے بولنے کی رات بھر آواز آتی رہی گو یہ ضروری نہ تھا کہ وہ شیر ہماری آدمخور شیرنی ہی ہو مگر پھر بھی تحقیقات ضروری تھی۔ بہادر خاں کو ہدایات دیں ہم نندہال کیمپ کا سامان لے کر پہونچے اور خود اسی وقت

چل پڑا۔ مجھے پہونچتے پہونچتے رات ہو گئی۔ سامان آدمی رات کو پہونچا۔ یہاں ہم لوگ جنگلات کے بنگلے میں ٹھہرے۔ گاؤں والوں سے آتے ہی پتہ چلا کہ تقریباً دوپہر کے قریب شیر ایک آدمی کو پکڑ کر لے گیا ہے۔ قصہ یوں بتایا گیا کہ گاؤں کے بالکل قریب ہی یہ بدقسمت شخص اپنی بکریاں لے گیا تھا درخت پر سے پتے کاٹ کاٹ کر اتر رہا تھا اور جب وہ آخری ڈالی کو پکڑ کر لٹک کر اترنے لگا تو شیرنی نے پیچھے سے اٹھ کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ اور کھینچ کر نیچے گرا لیا۔ اور پھر اس کو چھوڑ دیا۔ جب وہ اٹھ کر بھاگنے لگا تو دوڑ کر کمر سے پکڑ لیا اور اس کو کھینچتا چلا تا جنگل میں لے گئی۔ اس واقعہ کو دو آدمیوں نے دیکھا تھا خوب شور اور غل بھی مچایا مگر شیر نے کوئی پروا نہیں کی، تقریباً دو تین گھنٹے آدمی جمع کرتے لگ گئے اور اس کے بعد پھر مار بندوقیں اور لاٹھیاں وغیرہ لیکر لوگ جنگل میں داخل ہوئے۔ کوئی دو سو گز ہی اندر گئے ہونگے کہ شیر نے دھمکی دی انہوں نے سلامتی اسی میں سمجھی کہ واپس ہو جائیں اور مجھے اطلاع کروا دیں۔

بدقسمتی سے پھر ایک رات بیچ میں آ گئی تھی اور آج دوسری گذر رہی تھی اندھیری رات میں کچھ بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ مجبوراً صبح کا انتظار کیا۔ اس درخت کا معائنہ کیا یہ درخت گاؤں سے مشکل سے ڈیڑھ سو گز پر تھا۔ اس شاخ پر اس بدنصیب کے ہاتھ کی کھال کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے موجود تھے جس سے ظاہر تھا کہ غریب نے اپنی حتی الامکان کوشش کی کہ درخت سے لپٹا رہے جنگل میں داخل ہوتے ہی شیرنی نے غالباً آدمی کو مار اتھا اور کوئی ۰۰ گز اندر جانے کے بعد اس کو کھانا شروع کر دیا تھا۔ باقی جو کچھ تھا وہ چند ہڈیاں تھیں۔ نقش پا کا تھوڑی دور پیچھا کیا وہ بھی ترک کرنا پڑا۔ یہ پہاڑی علاقہ میں غائب ہو گئے مجبوراً واپس آ گیا۔ تین چار دن اچھی اچھی جگہ بچھڑے بندھوائے۔ ایک مچان پر خود دوسری پر بہادر خاں کو بٹھا راتیں عموماً خاموش گذریں۔ دن میں ان سب خاص خاص جگہوں کو دیکھتا رہا جہاں شیر رہ سکتا ہے مگر کوئی خبر نہ آئی۔ چار پانچ دن یونہی گذر گئے ایک دن صبح کے قریب نندی گاؤں سے یہ خبر آئی کہ شیرنی نے رات کے وقت ایک

سونپڑی میں گھسنے کی کوشش کی تھی۔ پہلے تو شور وغل کرنے پر
بھی وہاں سے نہ ٹلی مگر جب پٹواری نے اپنی بھرمار بندوق ہوا
میں چلائی تو وہ یہاں سے غراتے ہوئے چلدی۔ نندی گاؤں
بالسے کافی دور ہے یہ خبر بھی ایکدن پرانی تھی۔ میں نندیال
سے ڈبل مارچ کرتا نندی گاؤں پہونچا بہادر خاں اس دفعہ
ساتھ تھا۔ راستے میں ہم دونوں اسی بات پر غور کرتے آئے تھے
یہاں پہونچ کر کیا کیا جائے گا۔ بہادر خاں کا میری طرح یہی
خیال تھا۔ شیرنی غالبًا بندوق کی آواز سے ڈر کر نندی گاؤں
سے ہٹ گئی ہوگی اور غالبًا آج وہ بلرام پور کے علاقہ میں ہوگی۔
اس لئے نندی گاؤں میں ٹھیرنا مناسب نہ جانا اور بلرام پور کی
طرف چل دیے راستے میں کئی پورے بند پر شیرنی کے نقش پا
بلرام پور کی طرف جاتے نظر آئے۔ اور یہ بالکل تازہ تھے۔
ہم اسی دن صبح کے معلوم ہوتے تھے بلرام پور پہونچتے پہونچتے
مجھے ایک تجویز سوجھی وقت ذرا تنگ تھا مگر قسمت آزمائی
ضروری تھی بلرام پور پہونچے تو شام کے چار ساڑھے چار
بجے تھے۔ بہادر خاں کے کپڑے اتروا کر گاؤں والوں
کے کپڑے پہنوائے اور اس کو کلہاڑی دے کر تالاب کے
پاس کی طرف چل دیئے۔

یہاں بہادر خاں کو ایک پیپل کے درخت پر چڑھا دیا،
ہم نے دو ایک بکریاں چھوڑ دیں اور پاس ہی ایک درخت پر میں
بیٹھا بہادر خاں کو ہدایت کر دی کہ وہ خوب زور زور سے
گاتا رہے اور پتے کاٹتا جائے اور تھوڑے تھوڑے سے وقفہ
کے بعد وہ ایسا ظاہر کرے جیسے کہ درخت سے وہ اتر رہا ہو
اسی صورت میں وہ پندرہ فٹ کی اونچائی سے نیچے نہ
آئے جب یہ مذاق ساڑھے چھ بجے تک ہوتا رہا مجھے امید
ہو رہی تھی میرا تقریبًا آدھ گھنٹہ اور بیٹھنے کا ارادہ تھا۔
لیکن اندھیرے میں بالکل فضول تھا
نہ معلوم کیوں مگر دفعتًا مجھے اس بات کا احساس ہوا
شیرنی آگئی ہے بکریاں کوئی ۱۵ یا ۲۰ منٹ ہوئے گاؤں
کی طرف بھاگ گئی تھیں۔ یہ حرکت انہوں نے عادتًا کی تھی یہ
سب رات کے گاؤں کے جانور گاؤں کی طرف لوٹ جاتے
ہیں میں نے کوئی غیر معمولی حرکت نہ دیکھی تھی جس سے
میرے شبہ تقویت پکڑتا۔ بہادر خاں اپنی زبان میں گاتے

جا رہا تھا۔ میں بہت غور سے ہر جھاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ تقریبًا
دس پندرہ منٹ کے بعد ایک جھاڑی میں جو بہادر خاں کے
درخت سے تقریبًا ۳۰ گز اور میرے سے ۷ گز دور تھی ذرا سی
حرکت ہوئی مجھے یقین ہو گیا کہ شیرنی اس جھاڑی کی آڑ میں
ہے۔ میں مجسم انتظار بنا بیٹھا تھا اور خدا سے دعا مانگ رہا
تھا کہ یہ مجھے دس سکنڈ کے لئے نظر آجائے۔ بہادر خاں نے
اس وقت اپنا نیچے کی طرف اترنے کا عمل دوہرانا شروع
کیا، اور شیرنی نے غالبًا یہ سمجھ کر کہ وہ اترنے والا ہے دوسری
جھاڑی کا جو بہادر خاں سے اور نزدیک تھی رخ کیا۔ بہادر خاں
اترتے ہوئے ایک ۱۰ سکنڈ کے لئے رکا ہوگا۔ شیرنی بھی اپنی
جگہ ساکت ہو گئی۔ وہ بہادر خاں کے درخت کی طرف سے ایک
جھاڑی کی آڑ میں تھی مگر مجھے صاف نظر آرہی تھی ۷ گز پر
گولی مارنا مشکل کام نہیں مگر بجذا انتشار اور تذبذب
کے مارے ہاتھ بے قابو تھے۔ سوچ رہا تھا کہ اگر گولی خالی
گئی تو ؟

بسم اللہ کہکر میں نے بندوق اٹھائی اور 375 سے
فیر کیا۔ گاؤں میں اودھم مچ گیا۔ جس طریقے اور جیسے شور
کیا جا سکتا تھا۔ گاؤں والے شور مچا رہے تھے۔ سینکڑوں آدمی آس
پاس کے گاؤں اس خبر کے ساتھ روانہ کئے گئے کہ آئیں اور مردہ
شیرنی کو دیکھیں۔

جیسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں شیرنی کے اگلے پیر میں
کسی گاؤں والے نے اپنی بھرمار سے گولی ماری تھی۔ گولی ہڈی
کے پاس جا کر رک گئی تھی اور کچھ دنوں بعد زخم اچھا ہو گیا تھا
مگر ذرا پیر ٹیڑھا ہو گیا تھا پھر سب سے نیچے کے تین ناخون
غائب تھے اوپر کے جبڑے کے لمبے دانتوں میں سے ایک ٹوٹ
گیا تھا اور دوسرا بیچ سے گر کر آدھا رہ گیا تھا۔ عمر تقریبًا ۱۵ سال
ہوگی۔ غالبًا ان وجوہات کی بنا پر وہ آدم خور ہو گئی تھی۔
شیرنی کی لمبائی ساڑھے آٹھ فٹ تھی۔

غزل

فراقؔ گورکھپوری

ایک تری یاد ایسی ہے جس سے جلوۂ خُلد نظر آئے
ایک تری یاد ایسی ہے جس سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے

آج اس طرح ترے قدموں میں آیا عشقِ خانہ خراب
جیسے دیس بدیس کا کوئی بھولا بھٹکا گھر آئے

وصل کی رات کے کشف و کرامات آئینے میں صبح کو دیکھ
جیسے سہاگ دمک اُٹھے، کنوارا پن اور نکھر آئے

اب بھی وہی دوشیزگی و معصومیِ حُسنِ قاتل ہے
مقتلِ ناز میں جا کر کتنے مرنے والے مر آئے

غم خانوں میں اہلِ عشق کے تُجھ سا آئی یوں ہر روز
ہونٹوں پہ ایک موجِ تبسم اور چشمِ تر آئے

یوں بھی کہیں دُنیا بدلی ہے یوں ہی پلٹی ہیں تقدیریں
سُنتے تھے مرنا کام بڑا ہے لوگ یہ کام بھی کر آئے

چہرے روشن تھے محفل میں پھر بھی اُداسی چھائی تھی
ایک ہمیں وہ شمعِ وفا تھے بزم میں جو بجھ کر آئے

دھواں دھواں تھی شامِ محبت حُسن بھی تھا کچھ اُداس اُداس
یوں تھے چشم پُر آب ستارے عشق کی جیسے خبر آئے

لاکھوں دوزخ لاکھوں جنت لاکھوں سورج لاکھوں چاند
خاک کے ایک ایک ذرّے میں کیا کیا سنسار نظر آئے

خود کو سونپ دیا دُنیا نے اہلِ محبت کو یوں تو
اہلِ ہوس بھی اس دُنیا میں دنیا دنیا کر آئے

کھول دئے جس دم بال اُس نے خلوتِ راز ہوئی دُنیا
مثلِ فضائے نیم شبی وہ گیسو تا بہ کمر آئے

شرم و حیا کم ہوتے ہوتے حُسن پہ وہ جوبن آیا
جیسے گھٹا کے چھٹتے چھٹتے چاندنی رات نکھر آئے

محوِ تمنا کی موجیں ہیں جلوہ وہ گلزارِ جہاں
اور ذرا چھیڑیں جو ہوائیں بوئے مے کو تر آئے

سوئے اتفاق اس کو کہیں یا معجزۂ جذبِ پنہاں
آنے والے یوں تو ادھر تم خیر کہاں تھے مگر آئے

محو میں ڈوبی ہوئی آواز سے ہم نے نکھارا حسنِ حیات
دُھندلے نقش و نگارِ جہاں میں رنگ محبت بھر آئے

موت کی وادی ڈھونڈھ رہے تھے آنکلے لبِ آبِ حیات
عشق کی گمراہی مت پوچھو ہم بھی فراقؔ کدھر آئے

"لامتناہی ..."

مفتون احمد

پارتی کے سربلند پہاڑی مندروں کی پُرپیچ، پُراسرار سیڑھیاں چڑھتے ہوئے جب میں نے گھوم کر دیکھا، تو میرا دم رُکنے لگا، اور پھر میری محبوب سانس کے درمیان وہ خوبصورت شہر میرے سامنے آ گیا جو ڈوبتے ہوئے سورج کے جھٹپٹے میں حدِ نظر تک پھیلا پڑا تھا، اس کے باغ، اس کی عمارتیں، اس کی سڑکیں ——

اس کی اُجلی، ننگی، ابھرتی بکھرتی سڑکوں کو دیکھ کر مجھے اپنی مری ہوئی بیوی کا خیال آ گیا، اُس کے خوبصورت ہاتھ اور اُن پر بکھری ہوئی رگیں — اُس وقت جبکہ میں اس سے آخری بار جُدا ہو رہا تھا، اُس نے وہ ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دیے اور کھوئی نظروں سے خلا میں گھورتی رہی، اور یکایک چیخ کر مجھے لپٹ گئی "میں نہیں نہیں چھوڑوں گی، کبھی نہیں، کبھی نہیں، نہیں، نہیں، نہیں!"

میں نے اُسے دھیرے سے الگ کیا اور سوچنے لگا کاش یہ سب وقت کو نہ ہوتا، اس اٹھارہ برس کی جذباتی لڑکی کو اس کے بعد پردیس میں مجھے اُس کا آخری خط ملا تھا: "میں مر رہی ہوں، میرا جی چاہتا ہے کہ پَر لگا کر تمہارے پاس اُڑ جاؤں" بیوقوف لڑکی، بھلا کہیں کوئی نیک بیوی، چڑیا بن سکی ہے؟

یہی سوچ کر میں اُداس ہو گیا، اور دور اُفق کی ارغوانی لکیر پر زمین آسمان ایک دوسرے میں کھو گئے اور اُبابیل کے دلوں کے غول سے ہوا پر تیرتے رہے، اور ان دلوں مور کی ایک قطار مغرب کی پہاڑیوں کی سمت بڑھنے لگی جہاں جنگل تھا اور سبزیوں کے قطعے تھے اور نہر تھی اور پہاڑی سڑک پہاڑی ابھرتی چلی گئی تھی اور یہ شہر صدیوں کی گود میں اسی طرح بیٹھا ہوا تھا، ایک جزیرے کی طرح، ایک نومولود بچے کی معصوم حیرانی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ یہ اُفق نیا نہ تھا، بادل نئے نہ تھے، بگلوں کی قطار اور جنگل کے بیل بوٹے نئے نہ تھے، پھر میں کیوں اُداس تھا، انسان کی روح کیوں اُداس تھی، کیوں، کیوں، میرے خدا۔

وہیں ایک کوئل چیخ اٹھی، مدھم، مبہم، شام کے غم آگیں سُروں میں چیختی رہی اور کسی پیڑ کی گھنیری شاخوں میں ملتی بسنت کی مہک کو پیتی گئی، پیتی رہی۔ پھر جب نیچے اُتر کر میں شہر کی سڑکوں پر چلنے لگا تو اُس کا نغمہ میری روح کا بوجھ بن گیا۔ میں نے کئی قسم کے نغمے سُنے تھے، دیس دیس کے گیت، پردہ ... جو اس شہر کا نغمہ نہیں تھا، سنگِ خارا کی سیاہ تپتی سڑکوں کا نغمہ نہیں تھا، وہ نغمہ وہاں کیسے آ گیا تھا۔ بسنت کے ان مہکتے سانسوں کے ساتھ وہ وہاں کیسے آ سکتا تھا، اور میں نے ... اور اس ... نے کیوں نہیں سمجھا کہ وہ نغمہ ... ہے، ازلی ہے، ابدی ہے، اور اس کی طہارت، تازگی، ... کے ساتھ انسان کو ابھی اور جینا ہے اور ... محبت ... وہ نغمہ، وہ تریاقِ محبت باقی ہے، انسان نہیں مر سکتا، انسان نہیں مرے گا، ابھی نہیں، ابھی نہیں!

"... کلب" ... روم میں آرکسٹرا کی دُھن بلند ہونے لگی ... ہوئے ... کی گردشیں سمندر کی لہروں کی طرح ... ہو گئیں اور آرکسٹرا کی پہلی دُھن کو سُن کر لبِ سڑک بیٹھے ہوئے گداگروں کی ٹولی کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ وہ سب کوڑھی تھے اور گداگر تھے اور اپنی کوڑھی عورتوں سے بے تحاشا محبت کرتے تھے اور جب کوئی آوارہ، کھلنڈرا سا ... کلب کے دروازے پر اچانک اپنی مٹھیاں بند کر دیتا اور اپنے لبوں کی پیاس اور اکیلے بازوؤں کی اداسی دیکھ کر لوٹ جاتا تو وہ گداگر من ہی من میں اس سے بہت ہمدردی جتاتے اور اُن کی آنکھیں جھپک کر کہتیں، جاؤ چلے جاؤ، دیکھتے کیا ہو اس بال روم میں، اس چراغاں میں، بہاراں میں، جہاں ناچتے ہوئے بھونرے جوانی کی کلیاں سمیٹتے ہیں اور ہر کلی کبھی نہ کبھی اپنا پھول گم کر دیتی ہے کوئی سلمیٰ کوئی انجم کوئی صبوحی ضرور تمہارا انتظار کر رہی ہے یہاں اس سڑک پر

کیا سوچ رہے ہو۔ زندگی کا یہ کتنا سیدھا اصول ہے جسے ہم نے سمجھا اور تم نے کیوں نہ سمجھا، اور اگر تم بھی ہماری طرح کوڑھی ہوتے تب اور بات تھی، تب یہ سڑک تمہاری تھی۔ پر تم تو ایک کورے سپاہی ہو، اور آج تمہاری جیت کا دن ہے اور سارے مشرق پر صبح کا پھیکا سویرا مسکرا رہا ہے، اور آسمان کے مشرقی کناروں میں وہ آگ روشن ہو رہی ہے جسے اُوشا کے رُخساروں نے چمکا لیا ہے۔ اُوشا، اُوشا کو تم نہیں جانتے؟ صبح کی دیوی، صبح کی دیوی۔ . .

ایک امریکن پائلٹ نے اپنی ہندوستانی محبوبہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "ہیلو ڈارلنگ، تم نے یہ کیا پہن رکھا ہے۔ میرے دیس کی لڑکیاں ہلکے رنگوں کے لباس پسند کرتی ہیں، پھولوں کی گلابی یا آسمان کی نیلاہٹ اور اگر تم میرے دیس چلتیں تو میں تمہیں ایسا لباس ضرور پہناتا اور میری ماں تمہیں کافی پلاتی اور ہم تم ——— اور . .

ہندوستانی لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ "ہائے تم چلے جاؤ گے اور میں تمہاری یاد میں چپکے چپکے آنسو بہاؤں گی"۔

امپیریل ٹاکیز کے سامنے مجھے عبدل رکشا والا مل گیا۔

دُبلا پتلا، پیشانی پر ایک زخم کا نشان، اس نے مجھے سلام کیا۔ عبدل کبھی میرے دفتر کا چپراسی تھا، پھر ایک دن وہ فائلیں اُٹھاتے اُٹھاتے دفتر کی سیڑھیوں سے گر پڑا اور غائب ہو گیا پچھلے سیزن میں جب مجھے ریس کھیلنے کا شوق چرایا تھا تو میں نے اسے اکثر گھوڑوں کو مَلتے، یا نہلاتے ہوئے بھی دیکھا تھا، اور اب اُس کے پاس ایک سائکل رکشا تھی اور وہ مجھے جھک کر سلام کر رہا تھا۔ میں نے اُسکی رکشا کو بے تعلقی کے انداز سے دیکھا، عبدل نے کہا، "صاب، نسیم"۔

"نسیم؟"

"میرا مطلب ہے صاب، کہ اس سینما میں ہندوستانی فلم نہیں چلتے اور نسیم میری رکشا کا نام ہے"۔ اوہ، میں نے دوسری رکشاؤں کے نام پڑھے، خورشید، دینا، دنمالا، نرگس، نسیم، نسیم، عبدل مسکرایا، میں بھی مسکرایا، میں نے سوچا، یہ اچھا ہے بہت اچھا ہے کہ تم نے نسیم کے ساتھ اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ کیا ہوا جو تم ایک رکشا والے ہو اور تمہارے بدن پر رکھے میلے بنیان اور نیکر کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیا ہوا جو تم نے آج تک کسی اسٹوڈیو کی صورت نہیں دیکھی، خوشی کی بات تو یہ ہے کہ تمہیں اپنی رکشا، اپنی نسیم سے محبت ہے، نسیم کو اپنے ہیرو سے محبت ہے، کوئل کو اپنے نغمے سے محبت ہے، تمہیں اپنی رکشا سے محبت ہے، خوب، بہت خوب، زندگی ہے پیارے . .

میں رکشا میں بیٹھ گیا۔

میں چُپ ہوں۔ عبدل چُپ ہے، رینگتی ہوئی سڑک چُپ ہے۔ بجلی کے تاروں سے دو چمگادڑیں چمٹی ہوئی ہیں، خاموش بے جان، بدصورت، گل مہر کے درختوں پر چاند کا آدینہ لٹکا ہے، ——— اور مصنوعی، کیونکہ اندھیرا ابھی گہرا نہیں ہوا ——— کہیں کہیں دُکانوں پر فتح کی جھنڈیاں لہرا رہی ہیں، ایک درزی اپنے گاہک سے کہہ رہا ہے "تم نے سُنا، صلح کے بعد ہی سونے کا بھاؤ گر گیا۔ ابتدائے عشق ہے . . . قہ قہ قہ"

یکایک ایک پٹھان کسی دہی بیچنے والی عورت کو چلا چلا کر گالیاں دینے لگا اور اس کی مٹکی نالی میں اُلٹ کر اُسے اپنے قریب کھینچنے لگا، بہت سے لوگ جمع ہو گئے، لچے، بھوکے، ننگے، اُس عورت نے کسی سے کچھ نہیں کہا، پٹھان سے بھی نہیں، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گئی اُس غلیظ نالی کے قریب، گل مہر کے پیڑ تلے وہ روئے جا رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ کیوں رو رہی ہے ایک بے نام جذباتی رَو میں آ کے اپنے خاوند کو یاد کیا جو اُسے اُس کے باپ کے گاؤں سے بیاہ لایا تھا اور پٹھان کے روپے نہیں چُکا سکتا تھا حالانکہ اُس کے پاس تین بھینسیں تھیں اور . . اُسے اپنے خاوند پر بھی غصہ نہیں آیا اور گل مہر کے شگوفے چپکے چپکے بکھرتے رہے لمبے، پتلے، سُرخ اور وہ پاگلوں کی طرح روتی رہی حتیٰ کہ ان شگوفوں نے اُسے ڈھک لیا اور چتا کے شعلوں کی طرح اُس کے انگ انگ پر کانپنے لگے، کیونکہ اس کی عصمت چھین لی گئی تھی اور اُس کا سہاگ اور اُس کی ہنسی۔ یکایک وہ روتے روتے چُپ ہو گئی اور ہجوم منتشر ہو گیا اور سُرخ شگوفے اُس کے جسم پر سو گئے . . . . .

اُس رات کو میں نے ایک خواب دیکھا، ایک میٹھا، مختصر، سہاؤنا خواب، جس میں میں ایک ایسی جگہ پہونچ گیا جہاں کی ہر چیز مجھ سے مانوس تھی، جہاں سرسوں کی زرد کونپلیں اور ادھم

کے گئے کھیت تھے اور مہوے کے درختوں کی عجیب سی خوشبو میں گھلی
ہوتی تھی اور ایک ندی کے نشیب میں کلبلاتے ہوئے بچے سیپیاں
ڈھونڈ رہے تھے جمع کر رہے تھے۔ اس جگہ مجھے کبھی چیز کے کھو جانے
کا غم نہیں تھا اور وہ سب چیزیں مجھے واپس مل گئی تھیں جو کبھی
میری تھیں۔ یہ وہی جگہ تھی جس نے سالہا سال سے مجھے مانوس
تھا، جس کے خمیر سے میرا گوشت پوست اُٹھایا گیا تھا، اور
سے میرے تصور نے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا تھا۔ یہاں
پہنچ کر میرے اندر کوئی منفی جذبہ باقی نہیں رہا، اور جو کچھ
تھا وہ مثبت تھا، معصوم اور دلکش، میرے پاؤں گھٹنوں
گھٹنوں تک خاک میں اَٹے ہوئے تھے، میرے کندھے پر ایک
تھی جس کے پہلے سرے سے ایک گٹھڑی بندھی ہوئی تھی اور
سورج کی روشنی تیز تھی، اور وہ لیک جس کے ساتھ ساتھ
میں وہاں تک آیا تھا، ندی کے ڈھلوان میں کھو گئی تھی۔
چاروں طرف سناٹا تھا، لیک کی لکیروں پر کسی چھکڑے کا نشان
تھا اور ندی کے کنارے سر جھکائے ہوئے بگلے اونگھ رہے
تھے۔ یکایک کسی درخت کے کھوکھلے تنے سے دو نیلکنٹھیں چیختی
ہوئی نکلیں اور فضا میں پر تولنے لگیں۔ میں نے اپنی گٹھڑی
کھولی اور ستو اور گڑ نکال کر کھانے لگا، اور جب کھا چکا تو ندی
کی نرم گرم ریت پر نیلکنٹھوں کی چیخوں میں اپنے گیت کھول
دئے۔

امریکن پائلٹ کی ہندوستانی محبوبہ شہتوت کے درختوں
پر ریشم کے تار بننے لگی، ہلکے رنگوں کے تار دہی بیچنے والی عورت
کا رخ شگوفہ بنکر بکھر گئی اور میری بیوی نے آنکھیں کھولکر چہکنا
شروع کر دیا۔ چڑیا تھی نا وہ!

لیکن یہ سب کچھ خواب میں ہوا، اور جب میں جاگا تو میں
نے سوچا کہ زندگی نہ ماحول ہے نہ حقیقت، اور ایسا کیوں ہے کہ
میں ان غلیظ سڑکوں اور نالیوں اور ناپاک گھروں کے آس پاس
ہی خوابوں کے جال بنتا ہوں؟ اور تب کسی اَن دیکھی طاقت نے
مجھ سے کہا، وہ طاقت جو خود میرے اندر تھی اور جس نے مجھے
کی ... دیا تھا، اس طاقت نے مجھے آواز دی، سالہا سال کے
بعد سے وہ طاقت ایک انکھوے کی طرح پھوٹ نکلی ......
پھوٹتی رہی.......

کلیاں

اپنے بستر سے اُٹھا پھولوں کے انگاروں کو
کلسنتے ہاتھوں سے میرے لئے گجرے نہ پرو
دیدۂ یاس میں رہنے دے ابھی غم باقی
نشۂ مے سے تھرکتی ہوئی برساتوں میں
اپنی گلرنگ جوانی کی صباحت نہ لٹا۔
اتنی سستی کہ مجھے حسن سے نفرت ہو جائے
تجھ سے بھی پیار۔ ترے غم سے بھی ہے پیار مجھے

- - - - - -

تیری آغوش میں انبار یہ گلدستوں کے
ہار شعاف شگفتی ہوئی آہوں کے امیں
ایسی نازک سی حسیں کلیاں ترے پاس بھی ہیں
شہد سے ہونٹ، نگاہیں بھی گلاب آلودہ
بھیگے رخساروں پہ حسرت کی گہر خیز جلن۔
دستِ انساں کی رسائی سے کہیں دور و دراز
خون کے چھینٹے میں وہ صحنِ شفق کے نزدیک
سسکیاں بھرتی ہوئی درد سے تہذیبِ فرنگ
اپنے خونخوار الاؤوں سے کٹی جاتی ہے
تیغِ بُرّاں کی کھنک، تیر و سناں کی جھنکار
وقت کا ساز صدا دیتا ہے سنگینوں سے
تو مجھے حسن کی تخریب پہ مجبور نہ کر
ایسی خونخوار سی کلیاں تو ترے پاس بھی ہیں
زلفِ برہم کی جھپٹ، عشوۂ سوزاں کی لپک
توڑ لونگا میں انہیں تیرے شبستاں سے کبھی
تیرے گلدستوں سے میں گود سجا ہی لوں گا

منیر کمال (جالندھری)

"ہلال"

از شاعرِ انقلاب قاضی نذرالاسلام ۔ ترجمہ محمد یونس احمر

ہلال! ہلال!!

دیکھو دامنِ مغرب سے ہلال جھانک رہا ہے اور تم
کس ریگستانی قبر میں روپوش ہو ۔۔۔؟ بتاؤ تو سہی!
تمہیں سوگند ہے ربِّ لایزال کی ۔ ذرا دیکھو کس طرح
کسانوں کے شکستہ قدم عیدگاہ کی طرف بڑھے جا رہے ہیں جیسے
معصوم گائے کی قطاریں قصاب کے مقتل میں چلی جا رہی ہیں؟
ان فاقہ زدہ کسانوں نے ایک ماہ تک اپنے آنسوؤں سے روزہ
افطار کیا ہے ۔۔۔ اُف کتنا دردناک ہے یہ منظر!
بلالؓ! اگر تم اِن کے گرد آلود چہرے کو دیکھ لو تو تمہاری
اذاں تمہارے گلے میں گھُٹ جائیگی ۔۔۔۔ آج یہ مصیبت کے
مارے گھر کا سامان بیچ کر عیدگاہ کس خوشی سے جا رہے ہیں۔
انھیں خبر نہیں کہ اُن کے سینے چھلنی چھلنی ہیں، ان کے
سروں پہ قرض کا انبار ہے، وہ تو اللہ کی راہ میں بڑھے
جا رہے ہیں!

جنھیں زندگی میں ایک دن بھی بھوک اور روزہ سے
نجات نہیں ملی کیا آج انہیں کی شکستہ کٹیا میں عید کی ترنگیں
پھوٹی ہیں؟ کیا آج وہی بھوکا اور نڈھال بچہ چاند بن کر
دنیا کو پیغامِ مسرت سُنا رہا ہے جس نے ایک قطرہ دودھ
کے لئے تڑپ تڑپ کر جان دی تھی؟ سیاہ بادل میں یہ
باریک چاند تو ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی مردہ بچہ کفن
میں لپٹا پڑا ہوا اور یہ کسان عیدگاہ میں اسی کے جنازہ کی
نماز پڑھنے جا رہے ہیں ۔۔۔ اُداس اور ملول! ہر زبان سے
تکبیر کی آوازیں نکل رہی ہیں اور لاکھوں دلوں کو چھید جاتی
ہیں! یہ مُردہ بچہ، یہ گھُٹی گھُٹی چیخ پکار اور کربلا کی مسجد کے
اندر گرد یزید کی یہ فوجیں ۔۔۔۔!

بتاؤ وہ امام کہاں ہے؟
کہاں ہے وہ امام ۔۔۔؟ کون ساخطبہ پڑھنے کی آج اُس نے
تیاری کی ہے؟
دیکھو ہمدم! چاروں طرف مُردہ اور بیجان لاشیں بکھری
پڑی ہیں اور ان مردہ ہڈیوں کے بیچوں بیچ ایک کمخواب و اطلس
میں ملبوس انسان بڑی شان و تمکنت سے آنکھیں بند کئے
کھڑا ہے ۔۔۔ کون؟ کیا اس عیدگاہ کے تم ہی امام ہو؟ کیا تم ہی
ان کے قائدِ اعظم ہو؟ بتاؤ ۔۔۔ بتاؤ تو سہی کیا کبھی تم نے
ان کی سوکھی زبانوں میں قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ امرت
کی بوندیں ٹپکائی ہیں ۔۔۔۔؟
ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ!
مجھے معلوم ہے تم نماز پڑھتے ہو، تلاوتِ قرآن کرتے
ہو، روزہ رکھتے ہو ۔۔۔ لیکن اے مغرور انسان! کیا تم نے ان
کمزور دلوں کو اپنے میٹھے بول سے تقویت بھی پہونچائی ہے؟
تم نے پھل کاٹا لیکن رس نہیں ملا ۔۔۔۔ کتنے
بدنصیب ہو تم!
لاکھوں سال آبشار میں غرق رہے پھر بھی جسم تر نہ
ہوا ۔۔۔ ستم پرور، جفا شعار!!

ایمان! ایمان!!
تم انھیں شب و روز حفظ کرتے ہو، کیا یہ الفاظ اتنے
آسان ہیں؟ انہیں رٹ کر بھی تم نے راہِ مستقیم حاصل نہیں
کی، پھر تمہیں ایماندار کیسے کہوں؟
اے راہِ باطل پر گامزن انسانو! گوشِ ہوش سے
سُنو!! ۔۔۔ جس کا ایمان مستحکم ہے وہی اس آسمان کے
نیچے امرت برسا سکتا ہے!
تم نے صرف زبان پر اللہ کا نام لانا سیکھا ہے ۔۔۔۔

نقد و تبصرہ

جامِ شکستہ:- اُردو کے مشہور افسانہ نگار جناب ایم۔ اسلم کے دس نئے افسانوں کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ پہلا افسانہ "وادی کے اُس پار" اس سال کے بہترین افسانوں میں شمار ہوگا۔ ماڑ کا علاقہ نیم وحشی قبائل کا ماحگاہ ہے۔ یہ افسانہ اس دلفریب سرزمین کا ایک دلپذیر رومان ہے جو محبت و محبوب کے دلگداز گیتوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ ان گیتوں میں مادہ پرست عاروں اور اچھوتی تشبیہوں کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ یہ افسانہ ایک بھڑکتی ہوئی غزل ہے جس کا شعر سننے والے کو تڑپا دیتا ہے۔ آخری افسانہ "جامِ شکستہ" ایک طویل مختصر افسانہ ہے جسے آجکل کی بگڑی ہوئی معاشرت کا آئینہ دار کہنا چاہیئے۔ اس میں کئی معاشرتی خرابیوں اور بگڑی ہوئی اخلاقی قدروں کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اپنے مجموعی تاثر کے اعتبار سے یہ افسانہ حد درجہ عبرت آموز ہے۔ باقی آٹھ افسانوں کے متعلق کہنا کافی ہے کہ ایم۔ اسلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ آپ انہیں پڑھیں گے تو آپ خوش ہوں گے کہ آپ کے وقت کا بہترین مصرف ہوا۔ کتاب مجلّد اور جلد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت تین روپے!

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ دار البلاغ محمد نگر۔ میور روڈ۔ لاہور!

پنکھڑیاں:- "سترس" کا نام دنیائے ادب میں یا ہنس اُن کے افسانے ملک کے اکثر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ "پنکھڑیاں" اُن کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اُن کے افسانوں میں صنفی جذبات کی شدّت ہے نہ خیال و تصوّر کی موہوم فضائیں۔ وہ اسی دنیا میں رہتی ہیں اور اسی دنیا کے ٹھوس حقائق کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں۔ اُن کی زبان بھی سادہ و شگفتہ ہے اور بیان بھی سلیس اور رواں۔ صفحات ۱۹۲ صفحے، کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ، مجلّد مع گردپوش۔

قیمت دو روپے چار آنے! (عہ)

ملنے کا پتہ:- کتب خانہ علم و ادب اُردو بازار دہلی!

اُجالے سے پہلے:- ۲۱۲ صفحے لکھائی چھپائی اوسط درجے کی۔ کاغذ سفید۔ قیمت دو روپے دس آنے (عہ) ملنے کا پتہ:- اُردو محل معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد۔ دکن۔

مدھوسودن اُردو کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ان کے دس افسانوں کا مجموعہ ہے، جن میں زندگی کے بعض تلخ پہلوؤں کو "ترقی پسند ادیب" کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جو دلچسپ بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔

دُنیا ہماری:- پردیسی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ "دنیا ہماری" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کتاب راما نند ساگر کے نام معنون کی گئی ہے اور مقدمہ راجندر سنگھ بیدی نے لکھا ہے۔ مصنف پر روسی تصوّرات غالب نظر آتے ہیں۔ افسانوں میں سادگی کے ساتھ انتقادی شان بھی ہے۔ صفحات ۲۳۹۔ لکھائی چھپائی خاص۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ) ملنے کا پتہ:- راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔

پہلو:- لطف اللہ صاحب عدیل کے چند افسانے ہیں جنہیں دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) روشن (۲) تاریک۔ تین افسانے روشن پہلو کے تحت ہیں اور تین تاریک پہلو کے تحت۔ افسانوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف میں افسانہ نگاری کی صلاحیت موجود ہے اور اگر ان کی مشق جاری رہی تو ان کا شمار اچھے افسانہ نگاروں کی صف میں ہونے لگے گا۔ زیرِ نظر افسانے بھی دلچسپ اور مصنف کے ارتقائی تصوّرات کے آئینہ دار ہیں۔ صفحات ۱۶۴ کتابت و طباعت نہایت نفیس، کاغذ عمدہ۔ مجلّد مع گردپوش۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ:- محمد امان اللہ خاں مینیجر محمد علی بلڈنگ دھوبی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۳!

پریشان جلوے:- "حیات ترین" صاحب ملک کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کے منتخب مضامین نظم و نثر کو جدید ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہر افسانہ یا نظم سے پہلے افسانہ نگار اور شاعر کے خود نوشت حالات زندگی

آخر میں محمود قیصر صاحب نے "پس پردہ" کے عنوان سے ہر افسانہ نگار شاعر کی شخصیت پر مختصر نوٹس لکھے ہیں۔ ابتدا میں مرتب عبداللہ صاحب کا تعارف ہے۔ اس مجموعہ میں اکثریت غیر معروف حضرات کی ہے۔ انتخاب میں سلیقہ کارفرما نظر آتا ہے۔ صفحات ۲۳۹۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت دو روپے بارہ آنے (۲/۱۲)

ملنے کا پتہ:۔ عباسیہ اکادمی۔ بغداد الجدید ریاست بہاولپور۔

ضیاء الاسلام صاحب کی چند انتقادی

ادب پارے:۔ تقریریں، جو دلی اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے وقتاً فوقتاً نشر ہو چکی ہیں، ضروری ترمیم و اضافہ کے بعد "ادب پارے" کے نام سے شائع ہوئی ہیں جن میں مختلف شاعروں اور ادبی مباحث پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ انتقادی مضامین سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس مجموعہ میں اچھا خاصہ مواد ہے۔ ضخامت ۱۰۹ صفحے، مجلد مع گرد پوش۔

ملنے کا پتہ:۔ حلقہ ادب، ۱۲، اسٹینلے روڈ الہ آباد۔

آنسہ محمودہ رضویہ (ادیب فاضل)

دُنیائے شہرزاد:۔ نے عراق کی تاریخ ادبی انداز میں لکھی ہے۔ جس سے غالباً یہ مقصود ہے کہ تاریخ کی خشکی، پڑھنے والے کو بے کیف نہ ہونے دے۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ عراق کی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ ضخامت ۱۶۶ صفحے، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲ روپے

ملنے کا پتہ:۔ دفتر انجمن "فلاحِ حوا" ڈی۔ ڈی۔ جودھ پوری روڈ۔ کراچی نمبر ۲۔

مرتبہ سعد مسرور صاحب ساغر نظامی

عصرِ جدید سلور جوبلی نمبر۔ ضخامت ۱۶۴ صفحے قیمت ۲ روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ دفتر عصرِ جدید، کلکتہ۔

عصرِ جدید، کلکتہ کا ایک پرانا اُردو روزنامہ ہے جس نے اپنی عمر کے چھبیسویں سال میں قدم رکھتے ہوئے سلور جوبلی نمبر نکالا ہے۔ یہ نمبر نہایت محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں علمی، ادبی، تنقیدی اور سیاسی مضامین بھی ہیں، اور نظمیں اور غزلیں بھی، قصے کہانیاں بھی ہیں اور طنزیہ مزاحیہ مضامین بھی۔ آخر میں "کیا آپ کو معلوم ہے" کے عنوان سے سائنس کی ترقی کو تصاویر کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس نمبر کے اکثر مضامین اچھے اور مشہور ادیبوں کے لکھے ہوئے

ہیں۔ لکھائی چھپائی بھی نفیس ہے، غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی یہ نمبر کامیاب ہے۔

مرتبہ پرویز شاہدی صاحب۔

جدید اُردو بنگال نمبر:۔ ضخامت ۱۲۸ صفحے قیمت ۱/۴

ملنے کا پتہ۔ دفتر جدید اُردو نمبر ۳۶۔ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ۔

جدید اُردو کلکتہ کا علمی و ادبی ماہنامہ ہے، جس نے ستمبر ۱۹۶۳ء کی زیرِ نظر اشاعت کو "بنگال نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں بنگال سے متعلق چند مضامین کے علاوہ افسانے، ڈرامے، ادبی مضامین اور نظمیں و غزلیں بھی ہیں۔ مضامین نگاروں کی فہرست میں بعض مشہور ادیبوں اور شاعروں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ ترتیب میں بھی سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔

شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

جرعات

ششماہی ساڑھے تین
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۳۲ | ساقی دہلی - بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۵ء | نمبر ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہد احمد دہلوی

نگاہِ اوّلیں

ساقی میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں اُن میں سے بیشتر مشہور اہلِ قلم حضرات سے لکھوائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو مضامین موصول ہوتے ہیں اُن میں سے منتخب مضامین شامل کئے جاتے ہیں۔ جنگ کے زمانے میں مضمون نگاری کا شوق کافی ترقی کر گیا۔ اسکے ساتھ ساتھ لکھنے کا معیار بھی بڑھ گیا۔ اسکا اندازہ اُن نئے لکھنے والوں کے مضامین سے ہوتا ہے جو آجکل ساقی کے علاوہ دوسرے رسالوں میں بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ رزق کے دروازوں کی طرح ادب کا بھی اگر ایک در بند ہوتا ہے تو ستر کھلتے ہیں۔ جنگ کے زمانے ہی میں ادیبوں اور شاعروں کی ضرورت حکومت کو محسوس ہوئی چنانچہ پروپیگنڈا کے کاموں کے لئے حکومت نے انہیں لے لیا۔ ان میں بڑے کٹر انقلابی بھی تھے اور وہ بھی جن کے متعلق مشہور تھا کہ حکومت کو ان کا تعاون کبھی حاصل نہیں ہو سکیگا۔ مگر واقعات نے ثابت کر دیا کہ ہر شخص کی ایک قیمت تھی اور وہ جب اُسے مل گئی تو اُسکی اصول پرستی ربڑ کی دیوار کی طرح ڈھے گئی۔ خاکی وردیاں اِن پر سج گئیں اور نشانوں سے اِنکے شانے آراستہ ہو گئے۔ ادب کے ہتھیاروں سے کھیلنے والے حکومت کے وقار کی خیر منانے لگے۔ اِن کی دیکھا دیکھی اوروں نے بھی "ہمیں خرید لو" کے نعرے لگا لگا کر اپنے گلے خشک کر لئے مگر حکومت کو اس تیسرے درجے کی مخلوق کی ضرورت نہیں تھی اس لئے اِن کی شنوائی نہیں ہوئی۔ انہیں سپلائی اور اسی قسم کے دوسرے محکموں کی کلرکی پر اکتفا کرنی پڑی۔ جو ذرا سمجھدار تھے اور اپنی قیمت بہتر اُٹھانی چاہتے تھے اُنہوں نے آل انڈیا ریڈیو کا رُخ کیا مگر یہاں کی مربیانہ گردی نے انہیں جمنے نہیں دیا۔ ادھر فلموں کی قسمت جیت رہی تھی اور کچھ فیشن سا چل نکلا تھا کہ منشیوں کے بدلے مشہور شاعر اور افسانہ نگار ملازم رکھے جائیں۔ سب کے سب اُدھر ٹوٹ پڑے۔ اُمید تھی کہ فلموں میں ایک ادبی انقلاب آئیگا اور ملک کا بگڑا ہوا مذاق سُدھر جائیگا مگر جتنی مایوسی یہاں ان سے ہوئی اُن سے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ جملہ حقوق بحقِ سرکار محفوظ ہو گئے۔ ادب نے تو انکا ساتھ اُسی وقت چھوڑ دیا تھا جب حصولِ زر انکا مطمحِ زندگی بن گیا تھا مگر انہوں نے ستم اور ڈھایا کہ اپنے نام کی دُھویں کی چادر کی آڑ میں انتہا پست و ذلیل مکالموں اور گانوں سے رہا سہا مذاقِ عامہ بھی غارت کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ آرزو، امتیاز علی تاج، جوش، ساغر، عصمت، منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک وغیرہ جو بھی فلموں میں گیا پھر اُس نے پلٹ کر ادب کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس بے مُروتی بھی کیا کہ جسکی وجہ سے روپے کی لوٹ میں انہیں حصّہ ملا اُس سے نہ صرف آنکھیں پھیر لیں بلکہ اُسکے نقصان کے درپے بھی ہو گئے۔ گذشتہ دو سال کے عرصہ میں ان میں سے ایک نے بھی نہ تو کوئی اچھی نظم لکھی، نہ ڈرامہ اور نہ افسانہ۔ اگر ادب انہی پر تکیہ کرتا تو ختم ہو چکا ہوتا مگر جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے ادب کا بھی اگر ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو ستر کھلتے ہیں۔ خدا کے فضل سے ایک سے ایک اچھا ادیب اور شاعر منظرِ عام پر آ رہا ہے اور لٹریچر کا بول بالا کر رہا ہے۔ ساقی کو انہی وجوہ کی بنا پر نئے لکھنے والوں کی تلاش رہتی ہے اور یہ بھی بصد شکر ہے۔ ایک سیاسی رسالے نے ساقی کے افسانہ نمبر پر ریویو لکھتے ہوئے حرمت کا پہلو یہ تلاش کیا ہے کہ اس میں نئے لکھنے والے زیادہ شریک ہیں۔ ہم پرانے لکھنے والوں کا استخفاف نہیں کرتے لیکن انکا ذخیرہ اوپر سے کم ہو چکا ہے۔ اسکے علاوہ ممکن ہے کہ نام کی ایک تجارتی حیثیت ہو لیکن ادب میں نام کو نہیں کام کو پرکھا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ادبی رسائل کے ایڈیٹر اچھے مضمون کی قدر کرتے ہیں۔ اگر اچھے مضمون کے ساتھ لکھنے والے کا نام بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہوگا ورنہ سونا ہی کیا کم قابلِ قدر ہوتا ہے؟ اور یہاں معترضین کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ کوئی قلمکار شہرت لیکر پیدا نہیں ہوتا۔ آج کے اچھے لکھنے والے کل کے مشہور اہلِ قلم ہونگے۔

سالنامہ ساقی جنوری ۱۹۴۶ء کا پرچہ ہوگا۔ اسکے لئے بڑی جدوجہد سے مضامین لکھوائے اور انتخاب کئے جا رہے ہیں۔ مضامین کی ایک جھلک آخری صفحے پر ملاحظہ فرمائیے۔ سالنامہ ساقی کے معمولی پرچوں سے چوگنا ہوگا۔ مستقل خریداروں سے کوئی علیحدہ قیمت نہیں لی جائیگی۔ دفترِ ساقی سے حسبِ دستور یہ پرچہ بھی خریداروں کی خدمت میں پیش کیا جائیگا لیکن ڈاک میں کھو جانے کی ذمہ داری ہم نہیں لے سکتے۔ خود ڈاکخانہ بھی نہیں لیتا۔ اسلئے مناسب یہی ہے کہ آپ

میراجی

باتیں

انسان نے زندگی میں اپنی تنہائی کے احساس کو بھولنے کے لئے زندگی میں دلی اور آواز میں سب سے پہلے اُس کی توجہ تال کی طرف ہوئی کیونکہ شعر میں ہو یا گیت میں تال میں ہونا اس لئے ضروری ہے کہ زندگی وقت کے ایک خاص وقفے کا نام ہے اور تال وقت ہی کی ایک تقسیم کا نام ہے۔ اب مختلف راگ راگنیوں میں جو مختلف تال استعمال ہوتی ہے تو اس کی وجہ مختلف راگ راگنیوں کی مختلف عمریں ہیں۔ ایک صاحب یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ راگ راگنیوں کے لئے مختلف وقت کیوں مقرر ہیں، اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ اس کی وجہ اُن کی مختلف عمریں ہیں۔ اب ہمیں یہ خیال ستاتا ہے کہ تنہائی کے احساس سے بچنے کے لئے انسان کو آواز کا سہارا کیوں لینا پڑا۔ کہیں یہ اس لئے تو نہیں تھا کہ اپنی آواز بلند کی جاتی ہے سنی نہیں جاتی۔ اگر یہ صحیح ہے تو جب انسان نے پہلی بار اپنی آواز بلند کی ہو گی تو وہ اُس کے گلے سے نہیں نکلی ہو گی بلکہ اُس نے کسی نہ کسی طرح تالیاں پر ہاتھ سے تھاپ دی ہو گی اور بعد میں لکڑی سے کوئی ساز بنایا ہوگا۔ آج بھی طبلے کی تھاپ اُسی تھاپ کی صرف گونج ہے بلکہ موسیقی کی بنیاد بھی ہے لیکن اکثر دیکھا ہے کہ اندھیرے میں کسی اکیلی جگہ سے جاتے ہوئے بچے گنگناتے جاتے ہیں یا محض یونہی بے معنی سی آوازیں بلند کرتے جاتے ہیں۔ انسان نے بھی احساسِ تنہائی کو مٹانے کے لئے پہلے آواز کو اسی لئے ذریعہ بنایا کہ وہ ابھی تاریخ میں تنہا تھا۔

تاش کا کھیل اپنے رنگوں کے اختلاف اور برتری اور تعداد کے تفوق کے لحاظ سے زندگی کے کھیل کا عکس ہے۔ زندگی کے کھیل میں جو شخص یا قوم نسلی اور اقتصادی امتیاز کی بنا پر سبقت لے لیتی ہے اُسے تاش کے کھیل کی فرصت بھی مل جاتی ہے اور اس میں بھی وہ جیت حاصل کرتی ہے کیونکہ فرصت میں مشق ہی سے تاش کے کھیل میں چابکدستی کا حصول ممکن ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری کے علاوہ تاش کا کھیل بھی منحوس ہے۔ فنِ شاعری کی نحوست کی تردید میں کم سے کم اکبر الہ آبادی کا شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اب رہی تاش کی نحوست تو شاید یہ تاثر اس لئے تشکیل پا گیا کہ تاش کے کھیل کی دلچسپی میں کھیلنے والوں کو کسی اور کام کا نہ تو دھیان رہتا ہے نہ اِس سے غرض کہ اُن خاص لمحوں میں کہاں کیا کچھ ہو رہا ہے، اور اس طرح اُن کے عمل پر ایک ایسی یکسانی چھا جاتی ہے جو اُجاڑ عمارتوں اور ویرانوں کی خصوصیت ہے اور زندگی ایک متواتر بدلتی ہوئی حرکت کا نام ہے۔ تاش کے کھیل اور زندگی کے بارے میں کچھ اور بھی کہتا مگر زندگی جُوں تُوں گزر رہی ہے اور چند دوست ابھی ابھی وقت گزارنے کے لئے تاش کھیلنے کے لئے آ گئے ہیں۔

آج کی باتیں لکھتے لکھتے ایک عجیب خیال آیا۔ جس کاغذ پر میں لکھ رہا ہوں وہ تو ایک ہے اور قلم بھی ایک لیکن سامنے نیلی روشنائی کی دو دواتیں پڑی ہیں، بے دھیانی میں کبھی قلم ایک دوات کی طرف چلا جاتا ہے کبھی دوسری کی طرف۔ لیکن کاپی لکھتے وقت کاتب صاحب کو (اگر میں یہ ظاہر نہ کرتا تو) یہ بات کبھی معلوم ہی نہ ہو سکتی۔ خیر یہ تو عجیب ہوتے ہوئے بھی دلی سی بات ہے۔ خیال کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی مرد ہرجائی ہو تو اس کے کہیں یہ معنی تو نہیں کہ وہ بے دھیانی میں کبھی ایک عورت کی طرف رجوع ہوتا ہے کبھی دوسری کی طرف۔ اگر یہ صحیح ہو تو اُس صورت میں قصور مرد کا نہیں بلکہ "ہرجائیت" کا ہے۔ اور یہیں سے ایک نکتہ اور کہ اُس کی بے دھیانی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اصل میں وہ کسی خاص کام میں مصروف ہے اور بے دھیانی میں اُس کی توجہ اِدھر اُدھر چکر لگاتی ہے۔ اور یہ ایک طرح سے سچ بھی ہے۔ مصروف انسان کو دن بھر کے کام کاج

کے بعد اس بات کی وہی حاجت محسوس ہوتی ہے کہ کوئی نئی ایسی حرکت، ایسا عمل ہو جو اُس کے تھکے ہوئے اعصاب کو آسودگی بخشے اور پھر سے جوش میں لا دے۔

- - - - - - -

ہمارے ملنے والوں میں سے ایک صاحب ہیں اُنہیں کاغذوں سے ڈر لگتا ہے۔ شاید وہ کاغذی ناؤ کے بارے میں صحیح اطلاعات بہم رکھتے ہوں۔ اگر اُنہیں خالی کاغذ دکھائی دے تو اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اُس پر کچھ نہ کچھ لکھنا پڑے گا اور اگر لکھا ہوا دکھائی دے تو دُہری گھبراہٹ ہوتی ہے کہ پہلے اسے پڑھنا ہوگا اور پھر اُس کی تعمیل میں یا ردِ عمل کے طور پر کچھ نہ کچھ لکھنا ہوگا۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ کاغذ تو ایک ایسی بے معنی قسم کی چیز ہے جس پر جنگ کے زمانے میں کنٹرول کیا جاتا ہے اور امن کے زمانے میں اُسے نہایت بے دردی سے ردّی کی ٹوکری میں ڈالا جا سکتا ہے۔

میں جب کبھی خالی کاغذ کو دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ اس پر کوئی شاعر یا ادیب ایک ایسا شاہکار لکھ سکتا ہے جو رہتی دُنیا تک لوگوں کو یاد رہے، یہ خیال آتا ہے کہ ایسے شاہکار تو ہر زمانے میں کسی نہ کسی ملک کے کسی نہ کسی شاعر یا ادیب نے لکھے ہی ہیں اور آئندہ بھی یہ کام جاری رہے گا۔ ممکن ہے کہ اِس کاغذ پر کوئی اہم فیصلہ تحریر کیا جائے۔ کسی تجارتی فرم کا ایگریمینٹ، کسی مجرم کی سزائے موت کا حکم، کسی مرد اور عورت کا نکاح نامہ اور پھر مجھ ایسے مجرّد انسان کو یہ خیال آتا ہے کہ یہ تینوں باتیں ایک ہی بات ہیں نکاح نامہ انفرادی آزادی کے لئے سزائے موت کا حکم رکھتا ہے اور کاروباری معاہدہ بھی ہے اور پھر میرا خیال شادی کی طرف رجوع ہو کر سمجھاتا ہے کہ کئی شادیاں ایسی بھی تو ہوتی ہیں جن کے بعد طرفین میں سے ایک یا دونوں کبھی کبھی یہ سوچا کرتے ہیں کہ اِس سے تو سزائے موت بہتر ہے یا اِس سوچ میں تو گھٹتا ہی رہا۔

- - - - - - -

ایک فلمی دوگانا

عورت (ہیروئن) بول بول بول (جھاڑیوں کے پیچھے سے پلکیں جھپکاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے گاتے ہوئے آتی ہے)

مرد (ہیرو) بول بول بول (کاٹھ کے اُلّو کی طرح ایک پیڑ کے کھڑا ہے)

عورت (یعنی) میں بولی تو تو بھی بول (چکر کھاتے ہوئے میں بے معنی طریق سے ہاتھ ہلاتے ہوئے)

مرد (یعنی) میں بولا تو تو بھی بول (ارے مسخرے اگھ کھا گیا ہے کیا؟)

عورت (یعنی) بول رہی ہوں (ابھی زبان گُدّی سے کھینچ نہ لوں کہیں)

مرد (یعنی) بول رہا ہوں (بول کبوتر بول)

عورت (یعنی) آؤ مل کر بولیں ہم (یک نہ شُد دو شُد)

مرد (یعنی) آؤ مل کر بولیں ہم (یہ مکرر ارشاد کس ... کہا تھا یا دعوتی رقعے کا جواب)

عورت اور مرد (یعنی ضرب دو) مل کر بول رہے ہیں ہم (... کا شکریہ)

عورت اور مرد (یعنی ایضاً) مل کر بول رہے ہیں ہم (... صاحب شکریہ)

مرد (یعنی) بول، بول، بول (مرا انجام کبھی ... ہم پایہ ہے)

عورت (یعنی) بول، بول، بول (اب ہم خاموش ہیں) مگر۔

فلمی دوگانا یعنی بے معنی۔

- - - - - - -

میری ایک نظم کا عنوان ہے "ایک نئی عورت" لیکن ... وقت غور کرتا ہوں تو یہ مجھے ہر مرد کی زندگی کا عنوان ... ہوتا ہے۔ کیونکہ اِس کے ساتھ مجھے ایک مصنف کا یہ کہنا ... یاد آتا ہے کہ کوئی بھی اچھا فن کار ایسا نہیں جس ... کے اُس پار سے کسی نہ کسی عورت کا چہرہ جھانک نہ رہا ... (اور یہ کہنے کی تو شاید ضرورت نہیں کہ وہ عورت ... بہن، بیوی اور بیٹی چاروں میں سے کوئی بھی ہو سکتی ہے) لیکن جس طرح شاعر کی بیاض میں نظمیں بڑھتی رہتی ہیں ... طرح مرد کی زندگی میں عورتیں بھی بڑھتی رہتی ہیں اگر ... اور عورتوں میں یہ مماثلت نہ بھی ہوتی تو عورت کو آسانی ... ایک غزل بلکہ ایک نظم کہا جا سکتا ہے۔ غزل ایک کنواری عورت ...

اور نظم ایک میا ہی عورت۔ شاعر کی حیثیت سے تو میں نے بے شمار
نظمیں اور کچھ غزلیں کہی ہیں لیکن مرد کی حیثیت سے مجھے
اب تک زندگی میں ایک نظم اور دو غزلوں سے سابقہ پڑا ہے
جنہوں نے نہ صرف میری زندگی بلکہ میری شاعری پر اثر انداز کی
کی ہے لیکن بات کے آگے بڑھنے سے پہلے تھوڑی کے لئے
ادھر کی اجازت دیجئے۔

میری ایک عزیزہ ہیں انہیں میرے بارے میں بہت
سی باتیں معلوم ہیں، ایک روز باتوں باتوں میں انہوں نے
عورت کو ستون کہہ کر اس مفہوم ظاہر کیا۔ آج میں غور
کر رہا ہوں تو اُن کی یہ بات بھی مجھے صحیح معلوم ہوتی ہے جب کہ
زندگی میں شاعری کرتے ہوئے ہم عورت کو نظم ناؤ
جو بھی چاہیں کہہ لیں لیکن عملی زندگی میں تو عورت مرد کے
گھر میں ایک ستون ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے چھت
قائم ہے اور آرام کے لئے سر چھپانے کی جگہ مہیا رہتی ہے۔
اس کے ہونے سے بچے پیدا ہوتے ہیں اور اس کے نہ ہونے
سے نظمیں۔

مرتری ہری نے کہا ہے میرے پہلو میں سات کانٹے ہیں
وہ چاند جسے دن کی روشنی مٹا دیتی ہے، وہ عورت جو بوڑھی
ہو جاتی ہے، وہ تال جس میں کنول کے پھول نہیں ہوتے،
وہ جوان رعنا جو احمقانہ باتیں کرتا ہے، وہ راجکمار جو
دھن دولت پر جان چھڑکتا ہے، وہ مرد نیک جو
ہمیشہ کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار رہتا ہے اور وہ بدخو
انسان جس کی رسائی سرکار دربار تک ہوتی ہے

شیکسپیئر کا ایک بند۔

دو بار محبت کا مزہ میں نے لیا ہے
دو بار جنوں آ کے مرے دل میں بسا ہے
تھی پہلی لگن اُن میں سے آرام بداماں
اور دوسری اک یاس کی تاریک گھٹا ہے
وہ دونوں نگاہوں میں مری اب بھی ہیں موجود
اک روح کی مانند ہر اک جلوہ نما ہے
بہتر ہے جو ہمدم مرا اک مرد ہے رعنا،
محمود کا دل جس نے مرے دل کو کیا ہے
اور ہمدم بدبخت مری ایک ہے عورت
رغبت بدی جس کی محبت کا صلا ہے

راگ راگنیوں کے بول مفاعیلن فعولن پرست شاعروں کو
سادہ بے معنی موزوں معلوم ہوتے ہوں۔ لیکن اس بات کے باوجود کہ
گانے والے شعر کو بھی اپنے تان پلٹے، زمزمے اور مرکی وغیرہ کی
مدد سے موسیقی کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں، اگر غور سے
دیکھا جائے تو اچھی قسم کے بول جو موسیقی کے تقاضے بھی پورا کرتے
ہیں اور مفہوم کی شعریت کے لحاظ سے بھی جاذب ہوتے ہیں،
اپنے اندر ایک خاص قسم کی موزونیت رکھتے ہیں بلکہ اکثر
مفاعلن فعولن کے اصولوں پر بھی پورے اترتے ہیں۔ خیال
کے بول ہیں "اے ری مائی کیسے کیسے لوگ"۔ فعلن فعلن فعلن
فعلن فعل - تو ہوئی اس کی تقطیع۔ اب اس کی شعریت پر
غور کیجئے۔ اس کو سمجھو، گویا کہ دنیا میں ایک سے ایک
عجیب انسان بس رہا ہے لیکن نہیں شاید ان تین چار لفظوں
میں ایک جالی یا ایک چھوٹا سا واقعہ پوشیدہ ہے۔ ایک
نوجوان عورت کسی کام سے گھر سے باہر گئی۔ جاتے ہوئے یا گھر
لوٹتے ہوئے کسی دل پھینک نوجوان کی نظر اُس پر جا پڑی۔
چھیڑنے کی خاطر اُس نے کوئی بات کہہ دی، کوئی شعر یا مصرعہ پڑھ
دیا۔ یہ شعر کی سمجھ گنگناتے ہوئے سُنا دی۔ عورت
بھی گھر کے پردے میں رہنے والی بھولی بھالی، اُس کے
تصور میں بھی نہ آیا تھا کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں بستے ہیں اور اس
فقرے بازی سے شعور حاصل کر کے دیکھتی جاتی جو آگے بڑھی تو
معلوم ہوا کہ دو سامنے جا رہے ہیں اور آنکھوں آنکھوں میں
اشارے کرتے ہوئے آپس میں کہہ رہے ہیں۔ ضرور اسی کے بارے
میں کچھ کہہ رہے ہیں ایک سائیکل پر چلا جا رہا تھا اُس نے جو
مڑ کر دیر تک دیکھا تو گرتے گرتے بچا، ایک نوجوان نے دیکھتے
ہی سیٹی کا ایک کش لیکر تازہ ترین فلمی گیت الاپا اور گھوڑے
کو غیر ضروری طور پر چابک رسید کیا۔ ایک کار کے ڈرائیور نے
شیشے کے اُس پار سے دیکھتے ہوئے سٹیرنگ وہیل کو اور زور سے
تھام لیا، دو عورتیں چلی آ رہی تھیں انہوں نے اس خیال سے
نظر ڈالی کہ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ایک راہی نے

ہونے کا نعم البدل کرنے کی کوشش کی۔ اور جب گھر پہنچی تو ماں سے سامنا ہوا اور ایک خیال آیا۔ جال کے بول ہیں اے ری مائی کیسے کیسے لوگ۔ ہاں یہ تو سب خالی باتیں تھیں عملی بات یہ ہے کہ اگر ہمارے شاعر غزل نظم قطعہ رباعی اور گیت کے ساتھ ٹھمری خیال اور دادرے وغیرہ بھی لکھنے کی طرف توجہ دیں تو شاید اُن کی یہ توجہ مفید ثابت ہو۔ مثال جَےجے وئی بلمپت کے مشہور بول ہیں۔ موہے مندرا۔ توں ہیں آئے۔ اُن کے بول یوں سمجھئے اکھیاں ترس گئیں کیسے مورکھ۔ اور انترہ ہے۔ جیسے پہلے اب تک دیکھا اب بھی دیکھنے دیسے۔ اکھیاں ترس گئیں کیسے۔ اور درت کے مشہور بول ہیں:۔ پتیاں پروں گی بلنگا۔ جروں گی ـــــ اس سُنئے نئے بول۔ اور ان میں خصوصیت یہ بھی رکھی گئی ہے کہ بلمپت کے بولوں کے مفہوم سے تطابق رکھتے ہیں۔ بول ہیں اکھیاں ترسیں ناہیں اکھیاں نہ ترسیں۔ اور انترہ۔ آئے گھن گرجے بدراں برسیں۔ اکھیاں ترسیں ناہیں اکھیاں نہ ترسیں۔ اسی طرح دیس کے بول بھی میں نے لکھے ہیں۔ آپ گا کر دیکھئے ملاحظ ہوں۔ دیکھو دیکھو من تھکی میں کہیں دیکھ دیکھ۔ انترہ اب بھی رات ہے وہی اب بھی بات ہے وہی۔ آس کی تو باس نہیں سوکھے پھول ہیں سبھی، دیکھ دیکھ من تھکی میں کہیں دیکھ دیکھو۔

. . . .

اور اب آئندہ ماہ ملاقات ہوگی اِس دُعا کے بعد کہ اے خدا! چلتے پھرتے کھاتے پیتے ہنستے بولتے رکھنا (سب کو!)

جنگ کے بعد

حیوانی پیاس بجھانے کو
دُنیا کی مہذب قوموں نے مردانے شہری حوالوں میں
عصمت ہر امن کی دیوی کی ڈاکہ ڈالا اور لوٹ لیا
انسانیت کو دفن کیا زندہ لاشوں کے ڈھیروں میں
تعمیر کے موڑ پہ سائنس کو تخریب کی راہ پہ ڈال دیا
دُنیا کی مہذب قوموں نے

تہذیب کا یہ حاصل تو نہیں
سائنس کا یہ مصرف تو نہیں
انسان بھی حیوانوں کی طرح آپس میں لڑے
خاک اور خوں سے ہولی کھیلے
لیکن ایسا بھی ہوتا ہے
ایسا ہی ہوتا آیا ہے
کل کو بھی ایسا ہی ہوگا

جنگ اور جدل سے قوموں کی تقدیر بدل ہی جاتی ہے
بہتی ہوئی خون کی ندی میں تحریر بدل ہی جاتی ہے
ان لمحوں میں زندہ رہنے کی قوت خود کروٹ لیتی ہے
انسانیت، جواب اپنی قربانی دیتی ہے

جو ہار گیا
وہ ملزم ہے، مجرم ہے۔ سزا کے قابل ہے
آنے والی نسلوں کے لئے
اُس کا مٹ جانا دُنیا سے ہے امنِ دوامی کا ضامن
جیتی ہوئی قوموں کو ملتی ہے امن کی دیوی آزادی

وہ امن ہو یا ہو آزادی۔ طاقت سے حاصل ہوتی ہے
شاید اب بھی انسانیت اپنی قسمت کو روتی ہے۔

ضیا فتح آبادی

محمد حسن عسکری

جھلکیاں

پچھلی دفعہ میں نے کاڈویل کی کتاب [illegible] کا ذکر کیا تھا۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات کو اس کی اطلاع ہو لیکن پوری کتاب کا نہیں، اس کے اکثر حصّوں کا ترجمہ کئی بار ہو چکا ہے، بلکہ وہ ایک ترقی پسند تھا، دوسرے تو کئی دفعہ ترجمہ کیا ہے۔ ایک خاص قسم کی تنقید پر کاڈویل اتنی بری طرح مسلط ہو چکا ہے کہ اب تو اردو کے سر سے یہ بھوت اتارا جانا چاہیے۔ چنانچہ میں اس کتاب پر دو تبصروں کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ پہلا تبصرہ ہے ایچ اے میسن کا جو "اسکروٹنی" میں نکلا تھا:

جب مارکس کے پیرو ادب کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی باتوں میں کچھ عجیب مایوسی کا سا احساس ہوتا ہے، پختگی کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ لوگ بہت بڑے لمبے چوڑے اصول بیان کرتے ہیں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اور نہ ادبی تنقید کی حیثیت سے اُن میں کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ اُن کی تحریروں سے صرف زمانے کے رجحان کا اندازہ ہوتا ہے یعنی لوگوں کی نظروں میں ادب کی سماجی اہمیت گھٹتی جا رہی ہے۔ یہ کتاب بڑی الجھا دینے والی ہے، ہمیں مطمئن بھی نہیں کرتی۔ ہم جن باتوں کا ثبوت چاہتے ہیں انہیں یہاں حقائق سمجھا گیا ہے۔ مصنف صرف ایک نظریے سے چپک کے رہ جاتا ہے، اُسی چیز کے متعلق دوسرے نظریوں کو بالکل قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ کم سے کم اُس ایک نظریے کے حق میں دلیلیں تو دینی چاہئیں تھیں کہ ہم اُسے قبول تو کر سکتے، لیکن مصنف یہ بھی نہیں کرتا۔ جب وہ ان اصولوں کو آرٹ پر منطبق کرنا چاہتا ہے تو اس کا نتیجہ صرف ابہام ہوتا ہے۔ آرٹ کے متعلق اس کا نظریہ بالکل صاف نہیں ہوتا۔ عمرانیاتی اعتبار سے بھی یہ کتاب تسلی بخش نہیں ہے۔ مصنف بہت سے ایسے سوالوں کو گول کر گیا ہے جن کے متعلق آج کل ماہرینِ عمرانیات بحث کر رہے ہیں۔ شاعری پر بحث کرتے ہوئے بھی وہ اسی طرح کی بے تکی تعمیر کرتا ہے۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ جس طرح بیسویں صدی میں مشینوں نے ترقی کی ہے اسی طرح شعر کی ٹکنیک میں ترقی ہوئی ہے، اور مثال کے طور پر پیش کیا ہے ایلیٹ کو۔ جس آدمی میں ادبی تنقید کی ذرا سی بھی صلاحیت ہے وہ یہ کہنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتا کہ آرنلڈ سے لے کر ایلیٹ تک شعری ٹکنیک میں برابر ترقی ہوتی چلی آئی ہے۔ جہاں تک مجرّدات اور معلقات کا ذکر ہے وہاں تک تو خیریت ہے، لیکن جہاں کاڈویل نے انفرادی طور پر کسی شاعر کے متعلق کچھ کہا اور اس کا بھانڈا پھوٹا۔ بعض اوقات تو ادبی تنقید بالکل غائب ہو جاتی ہے، محض "معاشیاتی تفسیر" رہ جاتی ہے۔ وہ شاعری کو معاشیاتی دلیلوں کا غلام بنا دیتا ہے بلکہ بعض دفعہ تو وہ بڑی بے حسی کا ثبوت دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے پوپ کو وسعت کی آواز بنایا ہے، کیٹس کو محض پناہ ڈھونڈنے والا، اور انیسویں صدی سے پہلے شاعری کو تشائم پرست ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کاڈویل کو صرف معاشی ہیجان اور انتشار کا احساس ہے، باقی چیزوں کے بارے میں وہ بالکل بے حس ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتا ہے کہ ثقافتی اعتبار سے سماج کے متعلق بحث کرتے ہوئے "بورژوا" "پرولتاریہ" جیسی اصطلاحوں کو بالکل مختلف قسم کے معنی دینے چاہئیں۔ کاڈویل کا خیال ہے کہ جاسوسی ناول، سستی فلمیں اور [illegible] سب چیزیں پرولتاری آرٹ ہیں (کیونکہ کاڈویل خود ایسے ناول لکھتا تھا!) چنانچہ فرماتا ہے "یہ چیزیں زندگی کی مصیبتوں کا اظہار بھی ہیں اور اُن کے خلاف احتجاج بھی"۔ لیکن کاڈویل یہ بات بھول گیا کہ اس قسم کے "آرٹ" سے خوش حال طبقے زیادہ لطف لیتے ہیں۔

اس کتاب میں ایک اور خاص بات ہے: اسے پڑھا نہیں جا سکتا۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے زیادہ تر اس کا اصلی بحث سے کوئی تعلق نہیں۔ اُس نے صرف میکانیکی طور پر مارکسی فلسفے کو ادب پر عائد کرنے کی کوشش کی ہے، اور الٹی سیدھی مارکسی اصطلاحوں کی بھرمار کر دی ہے۔ یہ ساری باتیں پوری کتاب کے بجائے چھوٹے سے پمفلٹ میں کہی جا سکتی تھیں۔

دوسرا تبصرہ ہے مڈلٹن مری کا جو "کرائٹیرین" میں نکلا،

...نے کتاب کو بڑا دلکش بنایا ہے، اس دلکشی کی تشریح بھی ... آتی ہے۔

اس کتاب میں بڑا جوش ہے، بڑا جذبہ ہے، بڑی نیک دلی ... کاڈویل ایک قسم کا جدید شیلی ہے، اور مارکس اس کا گوڈون ... شیلی ہی کی طرح وہ کوئی اچھا لکھنے والا نہیں ہے وہ کچھ باتیں کہتا ہے، لیکن ان میں جذبے کی شدت ضرور شامل ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ اس کا نظریہ ہر طرح سے مکمل ہو، اور اس میں کوئی منطقی دراڑ باقی نہ رہے۔ لیکن تکمیل کا ایسا جذبہ آخر میں ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتا ہے، بلکہ ایسی تکمیل پر یقین رکھنا ایک شیطانی عقیدہ ہے۔ اصل بات دیکھنے کی یہ ہی کہ آدرش کی خاطر آدمی اپنے آپ کو قربان کرتا ہے یا دوسروں کو۔ ایک لحاظ سے یہ بڑی افسوسناک کتاب ہے یہ اس خوش یقینی اور اندھے اعتقاد کا اظہار ہے جو کمیونزم کی آخری شکل ہے۔ دراصل مارکسیوں کا "پرولتاریہ" محض ایک مجرد خیال ہے محض ایک مفروضہ۔ کاڈویل کے لفظوں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ "پرولتاریہ" کچھ اس قسم کی چیز ہے جیسے ... Church Militant کا رکن ہونا، اور یونٹ کچھ ایسی جیسے Church Triumphant ... کی رکنیت۔ کاڈویل نے پرولتاری آرٹ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ سرتاپا حماقت ہے۔ اس کتاب کی اصلی دلچسپی اس بات میں ہے کہ یہ ایک مخلص مارکسی کی ناکامیابی کی بڑی اچھی مثال ہے۔ اور وہ ناکامیابی یہ ہے کہ زمانۂ حال کے متعلق مارکسی اندازِ نظر کے مطابق نہ سوچ سکتا وہ تصویر یک رخی سہی لیکن بہرحال مارکسیت زمانۂ ماضی کی اچھی خاصی تصویر پیش کر سکتی ہے، لیکن جب اسے عمل کے مسئلے سے سابقہ پڑتا ہے —— یعنی مارکسی ہونے کے بعد آدمی کیسے سوچے اور کن باتوں پر یقین رکھے —— یہاں پہنچ کر مارکسیت بالکل بیکار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ چاہے مارکسیت اس سے انکار ہی کیوں نہ کرے، لیکن مارکسیت بھی ایک مذہب ہے جس نے سائنس کا نقاب اوڑھ رکھا ہے اس مذہب کا لب لباب یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح پرولتاریہ کو یقین لایا جائے کہ وہ مسیحا ہے۔ لیکن اس لحاظ سے یہ مذہب زیادہ خطرناک بھی نہیں کیونکہ پرولتاریہ کو حقیقت کا اچھی طرح علم ہے۔

یہ تھے وہ دونوں تبصرے، کاڈویل کیا، ہر آدمی جو نظریوں کی مدد سے شاعری کو سمجھنے کی کوشش کرے گا اس کا یہی انجام ہوگا۔ کیونکہ شاعری سمجھنے سمجھانے کی چیز ہی کب ہے البتہ ترقی پسندوں کو یہ دعویٰ بھی ہے۔ میرے خیال میں تو ادب اور آرٹ کے بارے میں آخری بات شیکسپیئر کا بوٹم کہہ گیا ہے:- Man is but an ass if he go about to expound this dream

ادب اور کیا ہے سوائے خواب کے —— مگر وہ خواب جس میں حقیقت کی نئے سرے سے تشکیل ہوتی ہے۔ اور ادب کا اثر اور اس کے پڑھنے کا فائدہ؟ یہ معاملہ بھی بوٹم ہی نے طے کر دیا ہے۔ پریوں کی دنیا سے لوٹ کر وہ لہسن اور پیاز نہیں کھاتا!

(یہاں ترقی پسند صاحبان ہنسیں)

بنام مستورات سے ”چند گذارشات“

اے جذبِ کشش کے آستانے — عنقائے سکوں کے آشیانے!
نقاشِ ازل کے نقشِ بے چوں — اے زمزمہ سازِ طبعِ موزوں!
اے عودِ سرودِ زندگانی! — اے دعوتِ جلوۂ شادمانی!
فطرت کے حسیں تریں کرشمے! — اے قلزمِ زندگی کے چشمے!
آغوش کشادہ صدف تو — نیساں کے خدنگ کا ہدف تو
بے تیر و کماں جو ہے وہ صیاد — ہے رشکِ حریر جو وہ فولاد
گو ناز و ادا میں ہے یگانہ — اور ختم ہے تجھ پہ دل بہانا
گو سحر ہے تیری نوجوانی — گو تو ہے حدیثِ لن ترانی
اے وادئ ایمنِ تمنا! — اے طورِ سرور زا تجلی!
مردوں کا فریب کھا گئی تو — پھانسے میں بُروں کے آ گئی تو
مغلوبِ ہوس غلامِ جذبات — ہے روزِ ازل سے مرد کی ذات
آہوئے حرم کے یہ شکاری — ظاہر میں تو رنگ کے ہیں پجاری
باطن میں مگر بھری ہے مستی — پستی، وحشت، دراز دستی
شیطان کے یارِ غار ہیں یہ — مکار و ستم شعار ہیں یہ
آوارہ منش مہار ٹوٹے — جھوٹے ہیں سرے ہی سے یہ جھوٹے
مستور کو بے نقاب کر کے — محجوب کو بے حجاب کر کے
خوش ہیں کہ ہوئی ہے عورت آزاد — اب داد ہے اس کی اور نہ فریاد
آخر کو طلسمِ ”حسن“ ٹوٹا — پروان چڑھا ہوس کا بوٹا
بے باک ہیں بوالہوس یہاں تک — دعوے سے یہ کہہ رہے ہیں بیشک
”جو باغ میں عبرت فشاں ہے — ہر بھونرے کا اس کلی پہ حق ہے“
”ناری“ تو ہوئی ہے سب سے ناداں — روتا ہے تجھے وقارِ نسواں
مردوں نے جو تجھ کو سر چڑھایا — دانستہ یہ گل گیا کھلایا
مغرب کا چھڑک کے رخ پہ غازہ — غیرت کا نکال کر جنازہ
اعلان یہ عام ہو گیا ہے — دو کوڑی میں جام ہو گیا ہے
”تو آلۂ کار“ بن گئی ہے — رنگین بہار بن گئی ہے
گویا ہے ترے لبوں کی لالی — ”مقبول کہاں نہیں یہ ڈالی؟“
”زینہ ہوں ترقیات کا میں — تحفہ ہوں تری برات کا میں“
برباد ہوئی نسائیت سب — تجھ میں نہ رہی امومیت جب
تو گل تھی امومیت تری بو — کس کام کی ہے امومیت تو؟
گل، گل ہے وہی کہ جس کی بو ہے! — موتی سے صدف کی آبرو ہے!

امینؔ حزیں

مجھے اس کا احساس ہے

یہ - ماں - بھائی - بہن !
راجہ ــــ اور مری ننھی نسرین !
مجھ سے مایوس نہ ہو !
یوں تو گم کردہ ہوں - گم راہ ہوں - لا پروا ہوں
پھر بھی جب اپنے فرائض کا خیال آتا ہے
کانپ جاتا ہوں خدا کی سوگند
اپنے معصوم خدا کی سوگند
میرے وہ گاؤں مناہے جہاں پر تم لوگ
بھوک سے چور، غریبی سے پریشاں ہو کر
مجھ کو آوارہ سمجھنے کے لئے راضی ہو ــــ !
ــــ کیا کروں، میں نے یہ دنیا نہ کبھی دیکھی تھی
ماہ پاروں کا ہجوم
چاند تاروں کا ہجوم۔
چوڑیوں کی کھنک بھی نہ سنی تھی میں نے۔
میری آنکھوں میں یہ آویزے نہ لہرائے۔
میرے کانوں میں بھی گونجے نہ تھے ایسے نغمے
پھر بھی یہ عہد ہے - پیمان ہے - وعدہ ہے مرا ــــ
میں اگر زندہ رہا۔
میں اگر نقرئی طوفان سے ہشیار رہا۔
نہ بھولوں گا - نہ بھولوں گا کہ اس دنیا میں
اپنی اجڑی ہوئی دنیا کا نمائندہ ہوں
ہر صورت میں یہ رنگین مسرت ہے حرام
میں کہ اک گاؤں کا پروردہ، غریب اور غلام
میں ابھی تک ہوں "سلام"
مجھ سے مایوس نہ ہو ــــ !!"

ــــــــ سلام مچھلی شہری؛

"غدّار"

خون سے لتھڑی ہوئی لاش غبار آلودہ
دندناتے ہوئے سینے پہ یہ پستول کے زخم
اس سیہ رُو کے ارادوں کے ہیں غمّاز ابھی
قبر میں دفن کے قابل نہیں ایسے عفریت
آنچ شمشان کی بھی اس کو جلائے نہ کبھی
رینگتے کیڑوں کی بدبو سے اٹے چہرے پر
کلبلاتا ہوا پھرتا ہے نجاست کا غبار
چیل اور کوّوں کو مرغوب یہ خوراک نہیں
ہڈّیاں اس کی بگولوں سے ابد تک ناچیں
گدھ بدک جائیں سمجھ کر اسے آفاتِ لعیں
اس کو کتے بھی گھسیٹیں نہ غبی راہوں میں
روح کو اس کی جہنّم میں گرا دیں قدسی
ملک کی پاک جبیں پر یہ سیاہی نہ رہے
قوم کو جس نے گروی رکھا تھا چاندی کے عوض

ــــــــ منیر کمال؛

حجاب امتیاز علی

”افنی“

تصاویر کی گیلری میں

(۴)

وہ تمام ہفتہ میں بے چین رہی۔

ایک طرف موم بتی کی زندگی دعوت اور ضبط و تحمل، صبر و حیا، شرافت و تہذیب مجھے دعوت عمل دے رہی تھی تو دوسری طرف فیروز کی بے صبری اور اس کی محبت اس کا حسن اور اس کی کشش مجھے زندگی کے جگمگاتے ہوئے کناروں کی طرف دھکیل رہی تھی۔ میں عجیب ذہنی الجھن اور کشمکش میں مبتلا تھی۔ رات کی تنہائیوں میں خیال آتا تھا کہ دنیا کی اس چند روزہ عشرت و رونق کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر کسی ویرانے میں جا نکلوں اور وہاں عبادت الٰہی میں زندگی کے دن کاٹ دوں۔ اور جب ظلمت شب کے دبیز پردے چاک ہو جاتے اور صبح کا نور کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیتا تو میرے خیالات پھر سے پلٹا کھاتے۔ اور فیروز کے ساتھ ایک حسین و جمیل زندگی بسر کرنے کا تصور مجھے رات کی تاریک دنیا سے دور بہت دور لے جاتا جہاں روشنیاں ہوتیں اور محبت ہوتی۔

ادھر مجھے خاتون روحی سے اپنی زندگی کے مرحلے پر گفتگو کرتے شرم آتی تھی۔ کیونکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا، میری امی مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ شریف لڑکی کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ شرم کی بات یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی شادی اور اپنی زندگی کے مرحلے پر غور کرے۔ ادھر فیروز سے میں ہفتہ بھر سے نہ ملی تھی اور وہ میرے جواب کا منتظر تھا۔ میری زندگی کے وہ دن عجب تذبذب میں کٹے۔ راتوں کی نیند اور دن کا اطمینان کافور ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری آنکھیں گلابی اور چہرہ زرد رہنے لگا۔ اور سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے کی وجہ سے طبیعت میں بے چینی بڑھ گئی۔

اُس تمام دوپہر میں اپنی اُداس خواب گاہ میں لیٹی بے چین ہوتی رہی اور دیکھتی رہی کہ باہر زرد لیمو کی ایک پتلی سی شاخ پر ناشاد بلبل تمام دوپہر مصروف بکا رہی۔ کیا وہ بھی اپنی زندگی کے مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی؟ مگر کیوں! وہ انسانی تہذیب و تمدن سے نا آشنا ایک آزاد چڑیا تھی۔ مجھ میں اور اس میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔

مغرب سے ذرا پہلے میں محلسرا کی مسجد کے پاس اذان انتظار کر رہی تھی کہ یکلخت تصویروں کی گیلری میں نواب محبوس اور خاتون روحی سے سامنا ہو گیا۔ میں نے دونوں کو جھک کر سلام کیا۔ خاتون روحی نے تو بے پروائی سے سلام کا جواب دے کر ایک تصویر کے دیکھنے میں محو ہو گئیں۔

مگر نواب محبوس اچانک رک گئے۔ میرے سلام کا جواب گرمجوشی سے دے کر فرمانے لگے ”شاہ رخ اچھی تو رہیں؟“

”جی ہاں“ میں نے نظریں حسب عادت زمین میں گاڑ دیں اور دروازے کا رخ کر لیا۔

”جاتی کہاں ہو؟“ انھوں نے فرمایا ”تمہیں تصویروں کا شوق ہو تو آؤ۔ میں تمہیں ایک نئی تصویر دکھاؤں۔“ یہ کہہ کر وہ مجھے ایک قد آدم تصویر کے آگے لے گئے: ”یہ دیکھو۔ یہ ایک نئے مصور کی کشیدہ ہے۔ تصویر کے نقش دیکھتی ہو؟“

میں نے حسب عادت مجرموں کی طرح نظریں زمیں میں گاڑ کر شرمیلے لہجہ میں کہا ”جی“۔

”اور تصویر کے پیچھے پس منظر کو دیکھو شاہ رخ!“

”جی!“ حالانکہ میں نے نظر تک نہ اٹھائی تھی۔ اسی وقت خاتون روحی نے جو ایک تصویر پر جھکی ہوئی تھیں یکلخت مڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر انہیں غصہ آ گیا ”تصویر تمہیں کھا تو نہیں جائے گی نہ اسے بغور دیکھنے سے تمہاری شرافت و حیا کا دامن چاک ہو گا۔ نظر اٹھا کر دیکھتی کیوں نہیں؟“

نواب محبوس ہنس پڑے ”شاہ رخ کو شاید اس پر غصہ آ رہا ہے کہ مصور نے تصویر کے نقش کیسے بھدے بنائے! وہ خود جو بہت خوبصورت لڑکی ہے۔“

نواب محبوس ہنسنے لگے۔ میرے ہونٹوں پر بھی ایک ہلکی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے میں نے فوراً چھپا لیا۔

یہ دیکھ کر خاتون روحی ذرا تیز لہجے میں بولیں: "تم آسانی سے کیوں ہنس نہیں پڑتیں شہرزاد؟ ہنس پڑنا بے حیائی نہیں ہے۔ بلکہ میری دانست میں نہ ہنسنا جرم ہے، یاد رکھو ہر رکے ہوئے قہقہے کے نیچے ایک بیماری پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہنس پڑو۔"

مگر میں تہذیب و ثقافت میں پلی ہوئی ایک شریف لڑکی تھی اور وہ بھی کنواری۔ دیدہ دلیروں کی طرح کیونکر کھلکھلا کر ہنس پڑتی؟ دانتوں میں زبان دبا لی۔ اور شرم سے عرق عرق ہو گئی۔

تبھی نواب مخدوس نے پوچھا۔ "شہرزاد! اس ہفتہ کی کسی شام تم میرے ساتھ جا سکو گی؟"

میں بت کی طرح خاموش تھی۔ ملکہ تمہیں کے مسرور علمی کے ساتھ جانے دیں؟ میرے لیے ایک اچھا موقع تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا: "بسر و چشم مگر ملکہ معظمہ ——"

"میں اجازت لے لوں گا۔"

میرا دل انجن کے پرزے کی طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ میں پھولا ہوا تھا۔ میں اس عزت کی مستحق نہ تھی۔ میں بہت ... تھی۔ اور نواب مخدوس بلند مرتبہ عالی۔ محل کے بڑے بڑے افسروں سے ... نواب مخدوس ہی کی تھی۔ وہ فرشتہ خصلت مشہور تھے۔ دور دور تک ان کے علم و فضل اور نیکی و شرافت کے گن گائے جاتے تھے۔ اور ان کے اخلاق کے تذکرے زبان زد خاص و عام تھے۔

میں نہ جانے کن خیالات کے طوفان میں ایک حیران کے بے بس تنکے کی طرح اڑی جا رہی تھی کہ یکلخت خاتون روحی نے کہا: "تمہیں ہوش نہیں آ رہا؟"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو نواب مخدوس جا چکے تھے اور خاتون روحی تصاویر کی گیلری کے لمبے دریچے میں ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں میں کھڑی مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ "جی نہیں خاتون روحی۔"

"یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟ مدتوں کی مریض معلوم ہو رہی ہو۔ چہرہ یرقان کے مریض کی طرح زرد ہے۔"

میں لاش کی طرح ساکت، ایک دیوار سے سہارا لیے کھڑی ہو گئی۔

"تمہاری زبان گنگ ہے۔ تمہاری حرکتیں مجرموں کی سی ہیں۔" وہ ذرا تلخی سے بولیں۔

میں ہفتہ بھر سے موقع ڈھونڈھ رہی تھی کہ ان سے اپنی زندگی کے مسئلہ پر بات کروں مگر عین وقت پر بے پناہ شرم و حیا نے مجھے گونگا بنا دیا تھا۔ کچھ دیر وہ منتظر رہیں۔ پھر میری خاموشی سے اکتا کر باغ کے دروازے کی طرف جانے لگیں۔

"خاتون روحی ——" میں نے گھٹی گھٹی لرزتی ہوئی آواز کے ساتھ انہیں روکا۔

"کیا بات ہے شہرزاد؟" وہ مڑ کر پوچھنے لگیں۔

"ذرا ٹھہریئے۔" میں نے ہمت کر کے کہا: "میں — میں — دنوں سے آپ سے کچھ کہنا —— کہنا چاہتی ہوں ——"

وہ قریب آ گئیں: "مجھ سے؟ —— تم نے کسی کا خون کیا ہے؟ کسی کا گلا گھونٹا ہے ——؟ اگر نہیں تو بلا وجہ خوفزدہ کیوں ہوتی ہو؟"

کچھ دیر کے لیے میں پھر چپ ہو گئی۔ پھر ہمت کر کے کہا: "ہفتہ بھر سے اس کشمکش میں مبتلا ہوں۔ خاتون روحی! آپ سے مشورہ لینا چاہتی ہوں۔ مگر آپ مصروف تھیں۔ شاید آپ کی مصروفیت ہی نے آپ کو موم بتی کے جنازے میں شریک ہونے کا موقع نہیں دیا۔"

خاتون روحی ذرا تلخی سے بولیں: "تمہارا خیال ہے کہ مجھے اس کے جنازے میں شامل ہونا چاہیے تھا؟"

میں حیران ہو کر بولی: "کیوں نہیں خاتون روحی؟"

وہ حقارت سے کہنے لگیں: "مجھے موم بتی جیسی نامعقول اور احمق عورتوں سے مطلق دلچسپی نہیں جو انسانیت کا گلا گھونٹ ڈالنا چاہتی ہیں۔"

میں انگشت بدنداں رہ گئی۔ موم بتی کے متعلق آج تک کسی نے ایسے کلمات استعمال نہ کیے تھے، مجھے سخت ناگوار گزرا۔ کیا یہ اتنی سنگدل ہیں کہ موم بتی جیسی عورت کو نامعقول اور احمق کہہ کر اس کے جنازے میں شریک ہونے پر ناز کرتی ہیں؟ یا دن دن بھر نیلے آسمانوں کی پرستش اور رات رات بھر سنہرے تاروں کی گنتی نے انہیں خلل دماغ میں مبتلا کر دیا ہے؟

میں نے کہا: "خود ملکہ جنازے پر تشریف لائی تھیں اور

شاہی خاندان کی کئی ایک خواتین شریک تھیں۔ وہ بڑی معصوم عورت تھی خاتون زدحی؟"

وہ سنجیدگی سے بولیں "تم ایک ایسی عورت کو معصوم کہتی ہو جس نے خودکشی کر کے قدرت کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف اپنی زندگی تمام کر لی؟ ہماری معاشرے کے ان معصوم لوگوں کی زندگی میں دوسروں کے لئے ایک زہر کا [illegible] پوشیدہ رہتا ہے۔ موم تی وہ عورت تھی جس نے دوسروں کی راہ میں تمام عمر کانٹے بوئے۔"

میں بے چین ہو گئی "خاتون زدحی آپ کیا فرماتی ہیں؟ اس کے متعلق تو مشہور ہے کہ اس نے تمام عمر شادی نہ کی۔ اپنے حقوق کھو کر دوسروں کو حقوق دلواتی رہی۔ ایک شرابی اور عیاش شوہر کو معلوم نہ ہونے دیا کہ وہ شخص کائنات کی [illegible] بنا کر پوجتی ہے وہ اس کی پرستش کرتی رہی۔"

وہ خاموش تھی۔ تب بولیں "خودکشی کرنا ہی دوسروں سے انتقام لینا ہوتا ہے اس سے زیادہ دشمنی اس بیچارے شخص کے ساتھ اور کیا ہو سکتی تھی سچ ہے، آخر ظالم عورت نے اسے معلوم نہیں ہونے دیا کہ وہ کس حد تک اس پستی کے درجے سے گر چکا ہے۔ یاد رکھو ہر گمراہ اور آوارہ انسان کو ایک محبت شعار ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بیچارے مرد کو بھی ایک ماں کی ضرورت لاحق تھی جو اسے انسانیت کی سطح پر لے آتی مگر موم تی نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہ جو ایک کمینہ دشمن اپنے دشمن سے کرتا ہے۔ اس نے تمام عمر اس قابل رحم راہ گم کردہ شخص کو، جو شیطان تھا، اس دھوکے میں رکھا کہ اس میں اعلیٰ صفتیں موجود ہیں۔ وہ بداعمال شخص تھا مگر موم تی کی جھوٹی اور دغاباز فطرت نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ دنیا کا بہترین آدمی ہے۔ موم تی کو اس سے ذرا بھی ہمدردی ہوتی تو اسے نیک راہ پر لگاتی مگر اس نے تمام عمر اُف نہ کی۔ اسے کھلے بندوں چھوڑ دیا۔ نہ صرف اتنا کیا بلکہ اسے مجازی خدا کا لقب دے کر غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔ اس سے بڑا انتقام وہ اپنے شوہر سے کیا لے سکتی تھی سچ کہو؟ وہ تمام عمر اپنے شوہر سے جھوٹ بولتی اور اسے دھوکا دیتی رہی اور نہ صرف ایک اپنے شوہر کو، بلکہ تم جیسے بیسیوں احمقوں کو دھوکا دیتی رہی اور یقین دلاتی رہی کہ وہ نیک اور معصوم ہے۔ کاش! کوئی اس مکار عورت کے قلب کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھ سکتا کہ اس کے اندر گناہ اور لوگوں سے انتقام لینے کی کتنی زبردست آگ بھڑک رہی تھی! اور وہ اپنے مقصد میں کس درجہ کامیاب ہوئی یہ ظاہر ہے۔ اس نے اپنے شوہر اور تم سب سے انتقام لے لیا۔"

خاتون زدحی کی یہ باتیں سن کر میں دم بخود رہ گئی صرف اتنا کہہ سکی۔ "مگر وہ یکتا تھی۔"

"نہیں نہیں" وہ کہنے لگیں "تم غلط کہتی ہو۔ ہمارے معاشرے میں ایسی بہت سی گناہ گار عورتیں موجود ہیں۔"

میں ابھی تک انگشت بدنداں تھی بولی "مگر آپ نے اس کی المناک موت نہیں دیکھی خاتون زدحی!"

وہ بے پروائی سے بولیں "وہ اپنی سزا کو پہونچی اور اسے اپنے انجام کی پہلے سے خبر تھی۔ ہر انسان کو اپنی غلطیوں اور اپنے گناہوں کا لاعلمی میں بھی کہیں پورا پورا علم ہوتا ہے سچ ہے۔ اور موم تی کو بھی اپنی خطاؤں اور گناہوں کا علم کہیں تھا اسی لئے اس نے اپنے آپ کو نامعلوم سزا دینی شروع کر دی۔ اور آخر خودکشی کر لی۔ خودکشی کو دنیا کے تمام مذاہب اور تمام انسانوں نے گناہ قرار دیا ہے۔ زندگی کے لئے جدوجہد فطرت کا تقاضہ ہے۔ اور زندگی کو قبل از وقت ختم کر ڈالنے کی کوشش قانون قدرت میں دخل در معقولات ہے۔ اور انسانیت کی ناقابل معافی حماقت۔ علاج سے انکار کرنا، گھٹ گھٹ کر مرنا شرافت ہے؟ تمہاری پرانی معاشرت اور پرانی تہذیب اس گناہ کو شرم و حیا کے لقب سے پکارتی ہے۔ مگر مذہب اور نفسیاتی جدید تہذیب اس پر لعنت کرے گی۔"

اور وہ یہ کہہ کر باہر جانے کو مڑ گئیں۔ میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ ششدر، دم بخود! اور پریشان!

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔ اور اپنا پورا پتہ خوش خط تحریر فرمائیے۔ اور جواب طلب امور کیلئے ٹکٹ بھیجئے۔ (مینیجر)

یہ راتیں.....!

مرادیں جو ثریا پہ کمندیں ڈالیں
صبح آئی تو مرے بخت نے پلٹا کھایا!
... کہتے ہیں کہ سورج سے اُجالے برسے
میں سمجھتا ہوں کہ دُنیا پہ اندھیرا چھایا

چاند ستاروں سے اُلجھتے رہنا
بن چکا ہے مری مایوس نظر کا معمول
وہ راتیں جو صدیوں پہ بھی بھاری کی دولت
اس میں آتا ہے نظر گیسوئے محبوب کا طول

صبح کی اُمید میں جی سکتا ہوں
لیکن اتنا تو یقیں ہو کہ تم آجاؤ گے
... راتیں کئی صبحیں گزریں
اس سے آگے جو کہوں کچھ تو بگڑ جاؤ گے

ایک ہی دُھن میں کئی نغمے گائے
لیکن افسوس کہ آواز کے زیر و بم سے
... رہی بیتابئی قلب مضطر
جیسے تپتا ہوا آنسو کسی جسم سے

کروٹیں لیتے ہیں تھک جاتا ہوں
جانے دردِ دل بیتاب کسے کہتے ہیں؟
... کسی کروٹ نہیں ملتا آرام
کیا کہیں ماہی بے آب کسے کہتے ہیں؟

... یہ دیکھا ہی تیرگی کا طواف
ایک ناکام سی ضد ایک غلط سی اُمید
... ہی جو تری عقیدت، لیکن
خودکشی کر کے بنا ہے کوئی دُنیا میں شہید

قتیل شفائی

ایک "باوفا" کے نام

کچھ تو مری وفا کا حق آج کوئی ادا کرے
زہر نہ دے سکے اگر ایسی ہی کچھ دُعا کرے

ایک سراب ہی وفا، ایک فریب ہے خلوص
ہائے وہ نامراد جو دل کو غم آشنا کرے

جس نے دغا سے لوٹ لی تیرے خلوص کی متاع
ایسے فریب کار کا رنج تری بلا کرے

یں تو فریب کھا گیا، تو نہ فریب کھائیو
اللہ کسی کی آنکھ سے دل کا لہو بہا کرے

حق ہیں گلے راہ کا بخت ستاروں کی جھڑکیاں
تجھ سے مجھے گلہ نہیں، تیرا خدا بھلا کرے

میری وفا فریب تھی، میری وفا پہ خاک ڈال
تجھ سا ہی کوئی باوفا تجھ کو ملے خدا کرے

نقشِ وفا کی جان تھیں جسکے لہو کی سرخیاں [1]
آج وہی خدا کی شان دُشمنِ وفا کرے

(ایک بے وفا)

---

[1] "لہو کی سرخیاں" بظاہر ایک استعارہ ہے اور شاعرانہ مبالغہ۔ حقیقت بہرحال یہیں اور یوں تو دُنیا میں ہر بات ممکن ہے۔

ایم اسلم

پیلو پک گئے

جس طرح آج کل کے ترقی پسند شعرا کے ہاں سلمہ کا نام ایک عجب بازاری ہوگیا ہے اسی طرح جانگلوں میں سستو ایک محبوبانہ نام متصور ہوتا ہے۔ یعنی سستو سے مراد محبوب ہوتا ہے۔ اور ایسے ڈھولے یعنی گیت جن میں عشق و الفت کی رنگینیاں جھلک رہی ہوں ان میں کبھی کبھی سستو کا پیارا نام بھی آجاتا ہے۔

پیلو بار کے علاقے کا ایک پسندیدہ میوہ ہوتا ہے۔ یہ ون کے درخت میں لگتا ہے۔ اور بار کے لوگ اسے بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ جب پیلو پکتے ہیں تو ویرانے آباد ہوجاتے ہیں۔ کہیں گڈریے کی بنسری جادو جگا رہی ہوتی ہے۔ کہیں گوالے کے الغوزوں کی آواز سے دل مچل مچل جاتا ہے۔ کہیں ڈھولے کشمکش حیات کے مختلف مناظر بار کی میٹھی زبان میں الفاظ کا جامہ پہن کر نظر آتے ہیں۔ رومان ان کی گھٹی میں ہے۔ اور آزاد قوموں میں یہ چیز ہوا کرتی ہے۔ ماحول رومان کا خالق ہے۔ اور جانگلیوں کا ماحول اتنا دلچسپ ہے کہ ہم شہروں میں بسنے والے اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ لیکن سماج کا تازیانہ وہاں بھی موجود ہے۔ اگر یہ بات طشت از بام ہوجائے کہ فلاں لڑکی کو فلاں لڑکے سے محبت ہے تو پھر دونوں کی شادی نہیں ہوسکتی۔ لڑکی والے اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں۔

لیکن اب یہ باتیں افسانہ ہوتی جارہی ہیں۔ وہی جانگلو جو پہلے بار کے مالک تھے اب ان کی حالت خانہ بدوشوں سے زیادہ نہیں۔ اب وہ کسی زمین کے مالک نہیں۔ جہاں چراگاہیں تھیں اب وہاں کسان کی لہلہاتی کھیتیاں نظر آتی ہیں حکومت نے ان وسیع آراضیات پر جو لائل پور۔ جھنگ۔ سرگودہ منٹگمری اور ملتان کے اضلاع میں تھیں قبضہ کرکے مختلف طریق سے انہیں دوسروں کو دیدیا ہے۔ اور حقیقی مالک چپہ بھر زمین کے مالک نہیں۔ کہیں کہیں حکومت نے اپنی تھوڑی تھوڑی زمین کاشت کے لئے عطا کر رکھی ہے۔ اب نہ وہ فارغ البالی ہے نہ آزادی اور نہ وہ رومان۔ اب پیٹ پالنے کا سوال ہے۔ وہی دمشق کے قحط والی بات ہے۔ جس نے عشق و الفت کی آگ بھی بجھادی ہے یعنی ؏ کہ یاراں فراموش کردند عشق !!

مردوں کو دیکھئے تو شیر معلوم ہوتے ہیں۔ اور عورتوں کا حسن قاف کی پریوں کے حسن کی یاد دلوں میں تازہ کرتا ہے۔ مال مویشی کی چوری ایک قومی فن سمجھا جاتا ہے۔ اور عام طور پر صوم و صلوٰۃ کے پابند اور عورتیں مردوں سے بھی زیادہ! لیکن اب موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؏: وہ باتیں ہوچکیں وہ زمانے گذر گئے۔ اب آپ چند ڈھولے سنیئے جس میں آپ کو زندگی کے کئی رومان انگیز مناظر نظر آئیں گے۔

پیلو پک گئے

(ا)

پیلو پک گئے، جس طرح سستو کے شباب کے رنگ سے رنگے ہو۔
رخسار۔
پیلو پک گئے۔
درختوں میں اس طرح لٹک رہے ہیں جیسے کسی کے خوبصورت کان
میں بدخشاں کے لعل کے آویزے۔
محبت کے بیچاری کا دل تیری کالی رات ایسی کالی زلفوں میں
اس طرح پھنسا ہوا ہے جیسے ناگ کے منہ میں من۔
عشق کی آگ چھپتی نہیں۔
محبوب کا گلہ بے جا ہے، جب آگ لگے گی دھواں بھی نکلے گا۔
مجنوں شہر چھوڑ کر بن میں جا بیٹھا۔
اس کی آہوں سے بگولے بن گئے نجد کے میدان شاہد ہیں۔
عاشق آتش پرست کی طرح دیوانہ ہے۔
عمر بھر آگ کو پوجتا رہا
جب ہاتھ بڑھایا جل گیا۔
جس کا خالق آگ ہو اس کی تقدیر میں خاک اور بربادی لکھا
گیا ہے۔
سستو! پیلو پک گئے!
دلوں پر جوبن آگیا جیسے حسن غسل کے بعد نکھر تا ہے۔

[illegible] بادل پھٹ جانے کے بعد تارے چمکتے ہیں۔
[illegible] جائے
[illegible] سوالی کی راہ پھر ڈالتی ہے بس ڈاچی کی طرح جس کی
چار پاؤں میں اٹک رہی ہو۔

(۲)

پیلو پک گئے!
زبان کی میٹھی دل کی کھوٹی سسّو کی طرح عشق کی آگ سے دل
جل کر بھا ہوتا ہے۔
وہ عاشق نہیں بانیا ہے جو عشق کا سودا کرے
دل دینے سے ہاتھ نہیں آتا لینے والا جو دے لیتا ہے۔
جو چاندی کی جھلک دکھا کر محبت کا سودا کرے اس پر چار[۱]
یاروں کی لعنت
جنہیں قرآن نے جنت کے گھر کی مبارک دی۔
نبی کریمؐ کے پیارے شہیدوں کے سردار[۲] پر ہزار درود ہزار سلام
ہزار درود ہزار سلام اس مبارک ماں[۳] پر جس کے لعل نے سر
کٹوا کر نانا کے دین کو زندہ کیا۔
دل میں عشق ہو تو موت زندگی بن جاتی ہے
جس زندگی کو موت نہیں
کانوں میں بندے نہیں آکاش کے تارے ہیں
بھٹکے راہی کو منزل کی راہ دکھاتے ہیں
سکندر دنیا کا بادشاہ چشمۂ حیواں سے خالی آیا۔
خضرؑ کا کیا قصور نصیب اچھے ہوں تو مٹی سونا بن جاتی ہے۔

(۳)

پیلو پک گئے!
جو ہمت کرے وہی پھل کھاتا ہے قسمت کا پھل ہو یا تقدیر کا۔
سچا عزم ہو تو تقدیر بھی باگ پکڑا دیتی ہے۔
پیاسا پانی خود تلاش کرتا ہے پاؤں میں چھالے پڑ جائیں
تو کنوئیں کا کیا قصور۔
ڈاچیوں کے پاؤں کے نقش ہوا نے مٹا دئے تو پھر کیا!

کھوجی سے کہو! دل کے نقش کبھی نہیں مٹتے۔
دل کی آنکھ کھلی ہو تو محبوب دور نہیں۔
دنوں کے ٹھنڈے سائے میں محبت سوتی ہے۔
بن کی مست ہوا بندوں والیوں کی پلکیں بند کر دیتی ہے۔
سینہ ارمانوں کی کشمکش سے اٹھتا بیٹھتا ہے۔
پیلو محبت کے پیغام لے کر آ گئے۔
الہڑ کنواریوں کی میٹھی آوازوں سے جنگل جاگ رہے ہیں۔
قدرت ہنس رہی ہے۔
بہن اور بھائی کا پیار فرشتوں کا پیار ہوتا ہے۔
جدائی قدرت کا قانون ہے
منزل دور ہے تو کیا، دل دل سے دور نہیں۔

(۴)

پیلو پک گئے!
ستو! تیری میٹھی جوانی کی طرح، تلوہر چمکتی چاندنی میں مست ہو۔
شکاری کا جال ٹھنڈی ریت کے نیچے چھپا ہوا ہے۔
جو قدم اٹھتا ہے اجل مسکراتی ہے۔
موت کی مستی ہرنی کی آنکھ میں ہے۔
جب زمین تپتی ہے دنوں کے سائے میں دلوں کی آگ بجھتی ہے۔
جب بد خواہ کی آنکھ سوتی ہے۔
عورت کی بات سن کر آدم کی عقل پر پردہ پڑ گیا۔ گندم کا
دانہ کھا لیا۔
جنت کے فراق میں گندم کا سینہ اس طرح شق ہے جیسے تیری
محبت میں میرا دل عشق کے گرداب میں پھنسا۔
موت نے لپک کر کہا۔
زندگی موت کی آغوش میں سوتی ہے۔ جس طرح محبوب!
محبوب کی آغوش میں۔

(۵)

پیلو پک گئے!
اس دلہن پر بجلی گرے جس کا سایۂ گناہ کی آلودگی سے ناپاک ہو۔
جس طرح کنوئیں کا پانی کافر کے ہاتھ سے۔
عصمت موتی ہے۔
آن والیاں آن کیلئے جان دیتی ہیں جیسے مرد زبان کے لئے۔
موسیٰؑ کا عصا برکت والا تھا، دریا پھٹ گیا۔ کفر کی زندگی

---

[۱] پیلو کا پھل میٹھا ہوتا ہے بیج کڑوا [۲] چار یار اسلام کے چار خلیفہ رضی اللہ عنہما [۳] شہیدوں کے سردار حضرت امام حسینؓ [۴] مبارک ماں، حضرت فاطمہؓ خاتون جنت۔

مٹ گئی، پتھر سے چشمے پھوٹ نکلے۔
موتی ٹوٹ جائے تو قیمت کون دیتا ہے۔
پیپل پر بہار آئے تو ہوا ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔
نرگس نے اڑنا تو سیکھ لیا باز کا حوصلہ نہ ملا۔
مرد گھات میں نہیں بیٹھتا سینہ آگے کرتا ہے۔
محبت کے میٹھے منتر فریب کے جال ہیں۔
تنکاری سے کہدو بکس چڑیا کا کیا مارنا جو گھر بنا کر رہتی ہے۔
جس نے نفس کو مارا دل کی مراد کو پہنچا۔

(۶)

بیلو پک گئے!
جس طرح عاشق کا سینہ، محبوب کی بے وفائی سے۔
مفشہ کے پھول پانی کے سینے پر کھلے ہوئے ہیں، جیسے سسّو کے سینے پر انار۔
کنول جب کھلتا ہے بھونرے چاروں کھونٹ سے آ جاتے ہیں۔
ہاروت ماروت کی تقدیر پلٹ گئی دنیا کے جنگل میں پھنس گئے۔
سامری جادوگر تھا جو عقل پر پردہ ڈال دیتا تھا۔
عقل اللہ کا نور ہے۔
جو خود اندھا بنے اس کا کیا علاج۔
جس نے حکیم کو بے بیوقوف جانا موت نے اس کے لئے رستہ صاف کر دیا۔
جب اللہ کا نور نظر آتا ہے کافر کا دل اس طرح ڈولتا ہے، جیسے دولھن کا ڈولی میں۔
عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔
دل کے راز آنکھیں کہہ دیتی ہیں۔
بادشاہوں کا دل دریا ہوتا ہے۔
سقّے نے آدھے دن میں اپنا سکہ چلایا جس طرح محبوب کے نام کا سکہ عاشق کے دل پر ضرب ہوتا ہے۔
محبت ماں کے سینے میں مستور ہے۔
جس کی کوکھ جلے حشر کا دن آ گیا۔
چار دن کی جوانی کا مان نادانی ہے۔
جوانی وہ ہے جو محبوب کی آغوش میں گذرے۔

(۷)

پیلو پک گئے!
بندوں والیاں گھروں سے نکل پڑیں جیسے کونجیں پہاڑ سے۔
انسان مطلب پرست ہے، ایک ساتھی سے بچھڑ جائے تو دوسرا ڈھونڈ لیتا ہے۔
کونج جب تک جیتی ہے، بچھڑے ہوئے ساتھی کو تلاش کرتی مرجاتی ہے۔
کوئی شاہ ہو یا گدا دو گز زمین کا مالک ہے۔
حاجیوں کے قافلے آ گئے، زمزم کا پانی زمزمیوں میں بھر لائے۔
کتنا خوش نصیب ہے وہ مسافر جسے عدم کی راہ میں زمزم کا پانی پینے کو ملے۔
بوڑھے کی حرص آگ کی طرح تیز ہوتی ہے، جب آخری منزل آئی حرص نے اور بھی پاؤں پسارے۔
جس بیہان[1] کی پیٹھ پر سوار نہ بیٹھے، قدم قدم پر ناچتی ہے۔
آزادی زندگی کی روح ہے، پابندی موت
محبوب کی ہو یا کسی کی جس نے یار کی چوکھٹ پر سر رکھا کوئی شمس تبریز بنا کوئی منصور
کسی نے کھال کھنچوا کر محبوب کا جمال پایا کسی نے اناالحق کا نعرہ مار کر یار کو سولی پر پایا۔
اجل زندگی کا نقش مٹا دیتی ہے، لیکن عاشق کا نام حشر تک زندہ رہے گا۔
جیسے قطب ستارہ!

(۸)

پیلو پک گئے!
بدلی کی طرح ہل رہے ہیں جیسے عاشق کا دل محبوب کے انتظار میں یا دولھن سہاگ کی رات شوہر کے گھر میں۔
سسّو! تیری جوانی تقدیر کا تیر ہے۔
نہ دین رہتا ہے نہ دنیا۔
زلیخا مصر کی شہزادی یوسفؑ کو دیکھ کر دیوانی ہو گئی۔
طعنے دینے والیاں بھڑوں کا چھتہ بن گئیں۔
سہیلیوں نے کنعان کا چاند دیکھا انگلیاں کاٹ ڈالیں۔
گھونگھا اپنی قبر پیٹھ پر اٹھائے پھرتا ہے۔
انسان دوسرے کا دستنگر ہے۔
نانک کا سچا قول سچا موتی ہے۔

---

[1] بیہان۔ بچھیری۔

اچھا کام وہ ہے جو یار پسند کرے۔
جو یار کی رضا کے لئے جان دے، جینا اسی کا ہے۔

(۹)

پیلو پک گئے!
ستو! دنیا مطلب کی ہے۔
انسان ہو یا حیوان دونوں پر جوبن آ گیا
پکڑی کی طرح چھوٹے بڑے چھوٹ گئے
سرسوں پھولی!
گلو بھی منزلیں طے کر کے آ پہنچے
دہٹ کی میٹھی سُریلی آواز صبح کے دھندلکے میں محبوب کی یاد
دل میں تازہ کر دیتی ہے
جوانی نے زندگی کے ساتھ چھوٹا سا قبر ہماں کا انتظار کرنے لگی
ڈاچی کو قطار سے پیچھے جگہ ملی
حُدی کی آواز میں جادو ہے
اونٹوں کے قدم تیز اُٹھتے ہیں۔
چوڑے چکلے والے سینے سے کہو خدا کی زمین پر اترا کر نہ چل۔
وندو اجل زندگی کی تاک میں ہے جسطرح بہری کسوں کی تاک میں۔
ستو! تیرے کالے بالوں کی مانگ مسافر کو منزل کا پتہ دیتی ہے۔
بندوں والی نے جب بندے اُتارے، نیا گھر آباد ہوا۔
آدم کا کنبہ اسی طرح بڑھتا ہے۔
حور کی آرزو میں نماز پڑھنے والے مُلّا سے بہتر ہزار نماز سچے
عاشق کے ایک سجدے سے ارزاں ہے۔
ریا کاری کی نماز کا گٹھا[1] کلنک کا ٹیکا ہے
ایسے ملّا کو سات سلام، جس کی نیت میٹھے چاول دیکھ کر بدل جائے۔
حسن اور دولت شیطان کا جال ہے۔
عورت کی جوانی موتی ہے، جو غیر محرم کا ہاتھ لگنے سے میلا ہوتا ہے۔
ستو! سچا موتی ہے، زمزم کے پانی کی طرح پاک۔

(۱۰)

پیلو پک گئے!
معدن کے مہمان۔
یا ہو! عشق کی مجلس ٹھنڈی ہو گئی۔

دجال[2] آ گیا دھوئیں کی گاڑی فرنگی نے بنائی۔
دن ہو یا رات، نتھنوں میں دھواں بھرتی ہے۔
مسافر کی منزل آسان ہو گئی، دُور دُور کے سفر نزدیک ہو گئے۔
ہری ہری گھاس والی چراگاہیں اُجڑ گئیں جسطرح عاشقوں کا دل۔
الغوزوں کی آواز میں مستی ہے نہ نور۔
ہری کھیتوں میں بھینسوں کا پھرنا حرام جسطرح مسجد کا فر کیلئے۔
نہ مسری کی آواز میں نور رانہ بندوں کی آنکھوں میں جادو نہ حیا۔
دجال آ گیا۔
میدانوں میں اس طرح چیختا پھرتا ہے جیسے ناپاک روحیں
مرگھٹ میں۔
ستو! زمانہ بدل گیا۔
بندوں والیوں کے گیت کہانیاں بن گئے۔
جنگلوں میں رہنے والوں کی آزادی سے زمانے کا دل
پھٹ گیا۔
پیلو پک گئے!
نہ نازک ہاتھوں والیاں نظر آتی ہیں، نہ ڈھولے سنائی
دیتے ہیں۔
جب آسمان کا رنگ میلا ہو گیا، خوشیاں غم کی بدلیوں
میں چھپ گئیں۔

[1] جوبن آ گیا۔ پیلو میں پھل لگا۔

[2] دجال۔ ریل گاڑی۔

مسعود شاہد

جرم

قہقہہ؟ کس نے کیا ہے یہ جرم
کوئی ہے؟ تبسم ردن میں عادت
کبھی گزرا نہ گماں کیا مطلب
ایسا کوئی بھی نہ تھا کون ہے یہ
کیا ہوا تجھ کو بتا کیوں خوش ہے
غم کی بستی میں ہمارا کوئی
اٹھتی رہتی ہیں مگر صبح و مسا
اشک آنکھوں میں جھلکتے ہیں سدا
قہقہے لے گیا یاں سے کوئی
غم کی تصویر ہیں انسان نہیں
قہقہہ غم کا اڑایا کیوں ہے
کچھ سزاوار طرب تو ہوگا
یوں جو اس میں مدہوش ہے کیوں
اب لگا قہقہہ میں بھی دیکھوں
ٹکٹکی کیسے لگائے ہے کھڑا
جیسے کچھ بات سمجھتا ہی نہیں
اس کی خاموشی کو اب میں سمجھا
گرچہ اس کا کوئی غماز نہیں
کھل گیا قہقہے کیوں مارتا ہے
ہوش کے حال میں شاید اس کو
قہقہے ہنسنے کے اپنے ہم نے
اپنا اب حصۂ غم ہے باقی
راستہ بھول کے آیا ہے کوئی
اب وہی ہم ہیں ہمارا غم ہے
دامِ صیاد سے طائر چھوٹا
پھر وہی قہقہہ دیوانے کا

قہقہہ؟ اس کی سزا ہے یہ جرم
جو کوئی ہے اُس کو پکڑ کر لائے
قہقہہ اور یہاں کیا مطلب
اسکو دیکھیں تو ذرا کون ہے یہ
ایسی کیا بات ہے جو یوں خوش ہے
اس طرح قہقہہ گونجا نہ کبھی
جب کہ سینوں کو آہیں اس جا
درد کے نالے چپکتے ہیں سدا
نطق بھی اب تو نہیں ہے باقی
متحرک ہیں مگر جان نہیں
قہقہہ بولے لگا یا کیوں ہے
آخرش کوئی سبب تو ہوگا
بولتا کیوں نہیں خاموش ہے کیوں؟
حلق سے تیری زباں کھینچ لوں
کس لیے سر کو جھکائے ہے کھڑا
ایسا بھڑکا یا کہ بجھتا ہی نہیں
عکس ہے یہ میری گویائی کا
بیخودی اسکی مگر راز نہیں
اب جو یہ قہقہے یوں مارتا ہے
میسر نہ خوشی آئی ہو
ہوش کے حال میں سب فدیے
ہو چکا عیش، الم ہے باقی
چھوڑ دو غم کا ستایا ہے کوئی
وہی آہیں، وہی چشم نم ہے
ٹھیرو، ٹھیرو تو مگر سنتا ذرا
چیخ اک پہلو میں لے کر گونجا

چھا گیا درد فضا پر کیسا
وقت گزرا ہوا پھر یاد آیا

مونا کی روح کو بہتی ہوئی ہوا کی وسعتوں میں اُڑائے پھرتا۔ وہ گاؤں سے باہر نکل پڑتی اور اُس آواز کی تلاش میں یونہی دربدر بھٹکتی۔ اس آواز کا منبع کہاں تھا، اسکے سوتے کن رستے؟ اور یکایک کسی کھیت کی مینڈ پر چلتے چلتے دونوں مل جاتے، اور ستاروں کے خواب ناک اُجالے میں، شبنم کے نزول میں، زمین کی پاکیزگی میں، حفیظو اُسے بھینچ کر کہتا "مونا تو میری ہے"

یونہی رات بھر وہ کھوئے رہتے۔ رات بھر کے لئے سارے گیدڑ اپنے بلوں میں دبک جاتے اور بھولی ہوئی ... والی لومڑیاں جو اُم پیشہ عورتوں کی طرح ٹل جاتیں۔ ... حفیظو سوچتا۔ ہم کب تک اسی طرح عشق کرتے رہیں گے؟ ...ہوں کی باڑ پر، ٹیلوں کی آڑ میں — جانوروں کا سا عشق۔ پھر وہ سوچتا کہ شاید عشق میں ہر آدمی جانور بن جاتا ہے۔ ایک اذیت رساں لذت کے ساتھ وہ مونا کو ان زمینداروں کی داستانیں سناتا جن کی لمبی چوڑی حویلیوں سے ہر رات ...ھوئی ہوئی لڑکیاں، نرمل، نورتن، نرم و نازک سی لڑکیاں ...ری نیندوں سے چونک اُٹھتیں اور اپنے سینوں کو ڈھانپتی ...خاک کے ذرّوں کی طرح گاؤں کی ان بوجھی راہوں ...بکھر جاتیں۔ یہ اندھکا، ہتیا، لعب نلی! مونا وہ ان سا ...ہو کر کہتا، اب یہ گاؤں میرے لئے نہیں!

مونا سوچتی وہ ہنس رہا ہے، داستانوں کا کوئی ...سنا رہا ہے "اب یہ گاؤں میرے لئے نہیں!" بھلا زمیندار ...ہنس گئے یہ دھرتی کیا کہیگی۔ یہ ہل، یہ بیل، یہ بیج، رُت۔ ...چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟ آج تک کون ان رشتوں ...توڑ سکا ہے؟ . . .

لیکن حفیظو کو اطمینان نہیں ہوا اور ساڑھے کی ایک ...تعف، گھٹا ٹوپ رات میں اُس نے فیصلہ کر لیا۔ اُس سے ...معلوم ہونے کے پرتو سے اُس کی نس نس تپک رہی تھی۔ ...کھیتوں میں رُکا ہوا پانی جھم جھم بہہ رہا تھا۔ سنسناتے ...جھنڈوں میں تاڑ کے لمبے پتلے درخت گھایل ناگوں کی طرح پھن اُٹھائے کھڑے تھے۔ دُور دُور تک تاریکی کے سوا کچھ ...نہ تھا تاریکی، خاموشی۔ خاموشی، تاریکی، اور پھر بھی کے ...گھپ اندھیرا۔ آنکھوں کی بینائی سلب ہونے لگی اور اُس نے ...یہ قدم تیز تر کر دئے، اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر رُکتا، پھسلتا، دھنستا، ٹٹولتا ہوا وہ آگے بڑھنے لگا۔ جیسے ابھی کوئی چیز اُس کے آڑے آجائیگی۔ جیسے ابھی وہ ٹھوکر کھا کر مُنہ کے بل گر پڑیگا جیسے روشنی ...ہو گئی ہے جیسے زندگی ختم ہو گی۔ جیسے تاریکی کا اُمنڈتا ہوا سیلاب اُس کی آنکھوں کو گلے، اور اُس کی سانس کو بیکار کر دے گا۔

بوندیوں کے لگاتار بوسوں میں نچڑتا ہوا وہ کیاری کی گیلی ریتی پر آن گرا۔ ریت کے ذرّوں میں ابریشمی ملائمت تھی اور بوندیوں کے بوسے اُسکے جسم کے روئیں روئیں کو جگا رہے تھے، اُسکے بالوں کی جڑوں میں در آئے تھے، اُسکے ماتھے سے، اس کی گردن سے، اُسکے رُخساروں سے ڈھلک ڈھلک کر اُسے کسی جاندار لمس کا احساس دلا رہے تھے۔ اور اُس کے پہلو میں ندی کا مضطرب متحرک ... کی طرح محوِ خرام تھا۔ لہریں آ رہی تھیں لہریں جا رہی تھیں ناچتے ہوئے بھنور اور ہوا کے ہکورے اور بوندیوں کا لمس ـــ کیا عجیب، خنک، جاندار! جیسے کنارا بہہ رہا ہو اور لہریں ساکن ہوں۔ جیسے لہریں بہہ رہی ہوں اور کنارا ساکن ہو۔ جیسے دونوں متحرک ہوں۔ جیسے دونوں ساکن ہوں۔ جیسے دونوں دو ہوں، جیسے دونوں ایک ہوں ـــ

اور وہ ندی دھرتی کے سینے میں ایک گہرا گھاؤ ڈالے بہہ رہی تھی۔ بھاگ رہی تھی۔ لوٹ رہی تھی! اس سے کچھ دُور پورب کی جانب ایک دوسرا شخص ندی کے گدلے پانیوں سے جنگ کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی دھوتی سمیٹ کر کولہوں تک اُڑس رکھی تھی اُس کے دائیں کاندھے پر ایک لاٹھی متوازن تھی جس میں گھنگروں کے گچھے بندھے ہوئے تھے اور دوسرے کاندھے سے ایک چرمی تھیلا لٹک رہا تھا جس میں چاندی کے سکے کھنک رہے تھے اُس کا نچلا دھڑ پانی کو اندر ہی اندر چیر رہا تھا کیونکہ بہت جلد وہ ندی کا پاٹ عبور کر کے کنارے تک پہونچ گیا۔ پانی میں جہاں اُس نے اپنا راستہ بنایا تھا، ایک مٹیالی لکیر اب بھی پھیل رہی تھی بس ـــ یہ گاؤں کا ڈاکیہ خوشی رام تھا۔

اُس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ اُس کے بالوں پر گھنے رونگٹے پانی سے ملکر چپک گئے تھے اور اُس کی ... کو مل، تیل اور قدرت نے کالی پیکٹ کر رکھا تھا۔ اُس کی لاٹھی سے بندھے ہوئے گھنگرو بجتے "چھن"۔ اور اس آواز کی گونج بازگشت

اُس کے چہرے تھیلے میں سُستا رہی تھی۔ اور پھر یہ دونوں آوازیں ایک دوسری کا جزو بن جاتیں۔ ردیف اور قافیہ۔ چھن چھن اور خوشی رام کے پاؤں اِن آوازوں کی گت پر تھرکنے لگتے۔ گاؤں سے شہر، شہر سے گاؤں ـــــ سات سال سے وہ اُس دیہاتی نے ایک شعر کا ٹکڑا کیا تھا۔

ردیف۔ قافیہ اور ایک شعر ـــــ چھن چھن۔ چھن۔

حفیظو نے ٹھٹک کر سنگیت کی اس لہر کو دیکھا اور دوسرے ہی پل میں اسے پہچان کر مسکرایا۔ آہ میری جان! دبے پاؤں چل کر اُس نے خوشی رام کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ "ایسے سے شہر سے کیسے پلٹے ہو؟"

خوشی رام نے مڑ کر اسے دیکھا "تو ایسا دھندا ہی ٹھیرا جب چھیرو" اُس نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا "اور تم؟"

حفیظو بولا "میں بھی شہر ہی جا رہا ہوں" پھر اس نے دیر سے اضافہ کیا "میں شہر جا رہا ہوں، خوشی رام۔ مجھے روپوں کی ضرورت ہے" یہ کہہ کر اُس نے ٹیڑھے پن سے تھیلے کو کن انکھیوں سے دیکھا

خوشی رام اُس کی بات ٹالنے کو ہنسا اور گاؤں کی سمت بڑھ گیا۔ لیکن اُس کے تھیلے کی جھنجھناہٹ نے حفیظو کو پریشان کر دیا۔ اُسے اپنے جسم کے مسام میں بھیگتے ہوئے پسینے کا احساس ہوا۔ اُس کے ذہن میں ایک خیال، ایک خواہش، ایک دیوانی بے کلی، بگولے کی طرح گھومنے لگی جسے اُس نے اپنے لب بھینچ کر رد دینا چاہا۔ اُس کے کان اس تھیلے کی چھنک میں ڈوب گئے، جنھیں اُس نے دو انگلیوں سے بند کر لینا چاہا۔

لیکن وہ بگولا اُس کے ذہن میں گھومتا رہا، چکراتا رہا، سر اٹھاتا رہا۔ اور وہیں گرتا اُتار کر اُس نے چشم زدن میں خوشی رام کو پانی میں گھسیٹ لیا۔ پانی کی اُچھالیں ڈاکیے کا جسم ڈبکیاں کھانے لگا۔ اُس کی آخری سانسوں کا شور آہستہ آہستہ مٹتا گیا۔ اور پانی کی سطح پر پھوٹتے ہوئے بلبلے ہموار ہو گئے۔

یہ دو انسانوں کا خون تھا ـــــ خون اور پھانسی!

اور اب موتا سوچ رہی تھی۔ کاش اس سے پہلے پھانسی کا پھندا اُس کی گردن میں جکڑ جاتے، وہ مر چکا ہوتا۔ اُس کا جسم تو بے داغ ہوتا۔ اُس کی روح لطیف اور خوبصورت۔ یہ کیسی موت ہے کہ آنکھوں کے ڈھیلے اپنے حلقوں سے باہر کھنچ آئے ہیں، لبوں پر ایک سیاہی جمی ہوئی ہے اور اب بھی چلاتی، گھگیاتی ہوئی عورت تیس سال کے بے کنار خلا میں کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی ہے، رو رہی ہے گھٹ رہی ہے، گا رہی ہے ـــــ جاتکی کے گیت مرتے ہوئے راج ہنس کے گیت!

کاش وہ مر جاتی ـــــ

ایک پرانی عادت کے طور پر اُس کے ہاتھ مانجھے ہوئے برتنوں کو سمیٹنے لگے۔ ایک پرانی عادت کے طور پر کسی مرغے نے گردن تان کر اذان دی۔ ایک پرانی عادت کے طور پر گاؤں کے بیل گھنٹیاں ٹنٹناتے ہوئے کھیتوں پر رخصت ہو گئے ہر چیز پرانی تھی۔ اٹل، پھیکی، عادی، بے رنگ۔ ہر چیز جیسے صدیوں کے گرد و غبار سے ڈھک گئی تھی۔ اور مشرق کی وسیع و عریض بلندیوں میں سحر کی حسینہ ایک نئی جنم لے رہی تھی۔ ایک ملائم، میٹھی، چھنتی ہوئی سی روشنی جو محبوب کی پیشانی میں ہوتی ہے اور نور خیز کرنوں کے لالہ زار موتا سو گئی۔ اُس کے رخساروں کی جھریوں میں کوئی آنسو صبح کے ستارے کی طرح لرزتا رہا۔

محمد نعیم الرحمٰن

پروہت

مولانا حالیؔ پانی پتی سے معلوم ہوا کہ جب
کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا ؟
تو بقراط نے

کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا
کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

ورنہ کہہ کے بات ختم کر دی۔ اہلِ اخلاق نے امراض کو جسمانی اور اخلاقی امراض میں تقسیم کیا ہے، اور اخلاقی امراض کو زیادہ خطرناک بتایا ہے۔ راہِ راست سے خلق کی ہر کجروی ایک مرض ہے، جو بڑھتے بڑھتے مہلک ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شرک سے (جسے وحی کی زبان نے ظلم عظیم کہا ہے) بدتر اور خطرناک تر مرض کوئی نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا بلفظ یوں کہنا چاہیئے کہ یہی واحد مرض ہے جو مہلک ہے۔ وضع الشیء فی غیر محلہ کا نام "ظلم" ہے غیر محل میں وضع شیء کا لازمی نتیجہ ناکامی، تباہی، ہلاکت، موت ہے۔ لہٰذا یہ ہے کہ ظلم عظیم لامحالہ مہلک ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ شرک مہلک مرض ہے، اور اس مرض کا مریض بدترین لعنت کا سزاوار ہے۔ مہلک امراض کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ ان کے جراثیم بہ درجہ خفی اور بظاہر بالکل بے ضرر معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل یہی حال شرک کا ہے، کہ اس کی کیفیت اور اس کے مظاہر اس درجہ خفی ہیں کہ آسانی سے نظر نہیں آتے، اور اسی لئے اس کا مریض —— یعنی مشرک —— آسانی سے پہچانا نہیں جاتا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جس طرح کائنات کا ہر ذرہ توحید باری تعالیٰ کا مظہر اور جلوہ نما ہے، مگر یہ ظاہری کثرت اس کے لئے پردہ بن گئی ہے، بالکل اسی طرح شرک اور اس کا خالق بھی ہر دم اور ہر جگہ عیاں ہے، مگر اہلِ نظر اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہوتے ہیں اور اس مغالطے میں ہیں کہ وہ توحید کے قائل ہیں، اور آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے شرک اور اس کے مظہرِ اعظم، جناب پروہت، کے وجود با وجود سے منکر ہیں یا کم از کم چشم پوشی ضرور کرتے ہیں۔

پروہت، بہ یک وقت، شرک کا خالق بھی ہے اور مخلوق بھی، اس کا عابد بھی ہے اور معبود بھی۔ جس طرح توحید سے دین پیدا ہوا، اسی طرح شرک سے وہ چیز پیدا ہوئی جسے عرفِ عام اور محاورۂ خاص میں "مذہب" کہا جاتا ہے۔ حضرت پروہت کی ذاتِ گرامی، آپ کا وجودِ نامی، اور آپ کی ہستی سامی، مذہب کے ہر شعبے میں جلوہ گر ہے، کیونکہ مذہب کا وجود ان بزرگوار ہی کی ذاتِ شریف سے وابستہ ہے۔ پروہت نے مذہب پیدا کیا، اور مذہب نے خدا بنائے۔ لہٰذا سب خدا پروہت صاحب کے ممنونِ احسان ہیں!

خود پروہت کب پیدا ہوا؟ یہ سوال طویل بحث کا محتاج ہے۔ مختصر یوں سمجھیئے کہ انسان کا سب سے پہلا معلم، سب سے پہلا طبیب، سب سے پہلا ہادی یہی پروہت تھا۔ یہ سب کے ساتھ تھا، مگر سب سے آگے رہتا تھا، اور اسی لئے سب سے بلند تھا، سب کا سردار تھا، علمِ کل تھا، عقلِ کل تھا۔ وہ خدا تو نہ تھا، مگر خدا کی طرف واحد ہادی اور راہبر وہی تھا۔ خدا سے صرف وہی واقف تھا، اور خوب واقف تھا۔ وہی جانتا تھا کہ خدا کہاں رہتا ہے، کہاں کہاں رہتا ہے، کیا کھاتا پیتا اور کرتا دھرتا ہے، اسے کب کب کس کس چیز کی ضرورت رہتی ہے، وہ کس شخص اور کس چیز سے خوش ہوتا ہے، وہ ناراض ہو تو اسے کیوں کر خوش کیا جا سکتا ہے، کیا کیا اشخاص اور اشیاء اس کے سامنے پیش کرنا چاہیئے اور کس کس طرح اور کب کب پیش کرنا چاہیئے، وغیرہ، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ایک بیان ہے جس کی حد و انتہا بہت دور ہے، اور جس کی کنہ، حقیقت اور راز سے صرف پروہت ہی واقف تھا اور ہو سکتا تھا۔ اور چونکہ ایسا تھا، لہٰذا صرف وہی ایک ایسی ہستی ہو سکتا تھا جو خدا کا "نائب" ہو، بلکہ

اس کی نیابت اس درجہ بلند، وسیع اور راسخ تھی کہ وہ خود خدا کا جانشین تھا، اور خلاصہ یہ کہ خود کسی طرح خدا سے کم نہ تھا۔

ہم نے اس باب میں شروع سے آخر تک ماضی کے صیغے میں — تھا اور تھی کے الفاظ میں — گفتگو کی ہے۔ مگر "لفظ گفتم" کے طور پر رجعت لازمی ہے۔ لہٰذا ہمارے تھا اور تھی کو بالکل ہے کے معنی میں سمجھنا چاہیئے، کیوں کہ پروہت کا وجود اس قدیم زمانے ہی میں نہ تھا بلکہ اب بھی جوں کا توں موجود ہے، اور ابھی نہ معلوم کب تک رہے گا۔ مختصراً یوں کہنا چاہیئے کہ جب "مذہب" پیدا ہوا تب ہی سے پروہت موجود ہے، اور جب تک "مذہب" رہے گا پروہت بھی اپنی پوری آن بان، اپنی تمام ومنعداری اور شان و شوکت کے ساتھ سلامت رہے گا۔ جہاں اور جب تک "دین"[1] تھا پروہت غائب اور ناپید تھا، اور جہاں اور جب دین ہوگا وہیں اور وہیں پروہت بھی فنا ہوگا۔

یوں تو پروہت اقبال لاہوری کے ماہی بچے کے سمندر کی طرح، ایسا ہے کہ:

میرون نتواں رفت رسیل ہمہ گیرش
بالائی سرماست، تہ یاست، ہمہ جاست

مگر اس کی حقیقی حالت، وسعتِ عظمت اور وسیع حکومت کا پتا ہمارے دھرم کے دیوتا بولنے والے ایک بہت بڑے مہاراج کے اس مشہور شعر سے معلوم ہوتا ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ کائنات خداؤں کی قدرت میں ہے، خدا منتروں کی قدرت میں ہیں، منتر برہمنوں کی قدرت میں ہیں۔ لہٰذا برہمن ہی قادرِ مطلق ہیں!"

اچھا تو یہ ہوتا کہ ہم آپ کو اس عالمگیر ہستی کی شخصیت سے یوں آشنا کرتے کہ آپ کی انگلی پکڑ کر تمام اقطارِ عالم میں آپ کو لے چلتے اور ہر جگہ خدا کے اس مظہرِ اعظم اور مذہب کے اس ہیبت ناک مجسمے سے آپ کی تقریب کراتے۔ مگر یہ کام اس قدر طویل عمل اور وسائل کا محتاج ہے کہ آپ چلتے چلتے تھک جائیں گے، اور انوار کے ہجوم اور کثرت سے آپ کی نگاہ بھی خیرہ ہو جائے گی، لہٰذا دو چار جھلکیاں ہی کافی ہوں گی۔ مثلاً

پہلے آپ مصرِ قدیم کے پروہت مہاراج اور پروہتہ رانی کے فقط القاب ہی سُن لیجیے:

پروہتہ: دایہ، پروہت: بچہ۔ یہ رشتہ ملاحظہ کیا آپ نے؟ یہی نہیں بلکہ:

پروہتہ: آرام جان، اور پروہت: پیارا بچہ۔
پروہتہ: حاکمہ، پروہت: غائب۔
پروہت: بڑا بیکول، طبیبِ اعظم، گوشت ساز، معمارِ اعظم، امیرِ جماعت، طوفانِ السامت، عظیم الشان، سپہ سالار، حافظِ اکبر، محافظ، عابد، خلعت پوش، قربان گر، زبانِ خدا، خدائے گویائی، عالم العجب، جنت کے دروازے کھولنے والا، حطا پوش، بندۂ گاؤ، محافظِ خنزیر، دانائے رازِ دو جہاں، سردارِ کاریگران، بندۂ خاصِ خداوند، خدائی باپ، مندروں کا مہتمم، دعاؤں اور منتروں کا جپنے والا، ساحرِ اعظم، محافظِ کل، خداؤں کا کاتب،

پروہتہ: عموں خدا کی بیٹی، خدائی حرم کی ملکہ، خداؤں کی بے نوا اور مطربہ۔

طول میں کیوں جایئے، ان دونوں بزرگوں کی حالت اور ان کے اعمال و افکار اور فرائض کی نوعیت کا ان القاب ہی سے اندازہ کر لیجیے اور ان ہی اعمال سے یہ بھی قیاس کر لیجیے کہ ان متفرق اور مختلف حیثیتوں میں ان دونوں خداماؤں کی لباس اور ان کی دھجیاں کیسی کیسی کچھ ہونگی۔

آیئے اب ذرا اس ملک کی سیر کریں جہاں شاہی کیا یک بار نہیں متعدد اور شہد کی ندیاں بہا کرتی تھیں۔ جہاں کا پہلا بابا باربار نکالا گیا اور باوجود اس کے کہ وہ ہمیشہ اس کی کوشش میں رہا کہ وہاں پہنچ کے، جوتا اتار کے، ہاتھ منہ دھو کے، اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھے اور شیر و شہد سے سیری حاصل کرے، مگر غریب آج تک نہ پہنچ سکا۔ گو ہماری سرکار شفقت مدار کے لطف و کرم سے اب جلدی ہی ایک روز پہنچ جائے گا۔ یہ یہودیوں کا ملک ہے۔ شام اور فلسطین یہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی زمین ہے، خدا کے دوستوں اور بچوں[2] کا گھر ہے۔ یہاں یہودی رہتے تھے، اور رہتے ہیں اور اب تو اور بھی زور شور سے رہیں گے۔ ان کے ہاں پروہت شاید ازل سے ہی زندہ ہے، اور ابد کے قریب تک زندہ رہے گا۔ ان کے

---

[1] ان الدین عند اللہ الاسلام۔

[2] نحن ابناء اللہ واحباءہ

ہاں کی سی شان و شوکت، لباس اور صورت کا طمطراق تو شاید ہمارے دیس کے پروہت مہاراج کو کبھی نصیب نہ ہوا ہو۔ وہ پروہت خواہ اسرائیل کا ہو، خواہ موسیٰ کا، خواہ لاوی کا، اس کے اپنے وہ اہم فرائض اور ایسی شان و شوکت کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جو اسے ان زمانوں سے بہت پہلے سے حاصل تھے اور جو سینکڑوں (بلکہ ہزاروں) برس سے خود خدا کی طرف سے انہیں ملے ہوئے تھے، اور جن میں انسانِ ضعیف البنیان مرکب من الخطاء والنسیان کو دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا۔ تفصیل میں یوں جانیئے، اس خدائے زمین و زماں کے صرف فرائض منصبی ہی سن لیجے۔ وہ قربان گاہ کی مقدس آگ جلاتا تھا اور ہمہ وقت اسے جلتا اور بھڑکتا رکھتا تھا، وہ پردے کے اندر کے سنہری قندیل میں تیل ڈالتا تھا کہ وہ چراغ کبھی بجھنے نہ پائے، وہ ہیکل کے دربر صبح شام دونوں وقت قربانی دیتا تھا، جس میں گوشت اور شراب کا جزو ضروری تھا، وہ ہر ملزم، مجرم، گناہگار اور تائب بندۂ خدا کی مدد کے لئے ہر وقت حاضر رہتا تھا، اور اس کے لیے خدائے قدوس کے حضور میں باریاب ہونے کا موقعہ فراہم کرتا تھا۔ دولتمند بندے گائے بیل لاتے تھے، اور پروہت کا مقدس فرض تھا کہ وہ بیل کو ذبح کرے، آگ پر ایندھن ڈال کر اسے بھڑکائے اور قربان گاہ پر بیل کا خون چھڑکے، اگر وہ بندہ مفلس ہوتا تو وہ ایک کبوتر چڑھاوے کے لئے لاتا، اور حضرت پروہت کمالِ شفقت سے اس کبوتر کی گردن مروڑ کر اسے مارتے تھے۔ ہر صورت میں پروہت صاحب کو یہ گوشت کی قربانی چڑھانا اور بندگانِ خدا کے لئے امن، سلامتی اور نجات کا سامان کرنا لازمی تھا۔ ہر بچے کی پیدائش کے وقت ہر ایک ماں فاختہ یا کبوتر لا کر نذر کرتی تھی اور یوں اپنی غلاظت اور نجاست کے گناہ سے خلاصی حاصل کرتی تھی۔ اگر کسی بدنصیب شوہر کو کبھی اپنی زوجہ کی عفت پر شبہ ہوتا تھا، تو وہ اسے لا کر پروہت کے حضور میں پیش کر دیتا تھا، اور وہ خوش نصیب یا بد نصیب اس رحیم پروہت کے قبضے میں پہنچ کر تمام گناہوں سے پاک ہو جاتی تھی، کیوں کہ حضور پروہت اس نامراد مرد کو بھی نجات دلانے کے لئے اس عورت کو برادری سے خارج کر کے صرف اپنے اور خدا کے لئے مخصوص کر دیتا تھا، جذامی ہر روز پروہت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ ان کے پاک یا ناپاک ہونے کا فیصلہ صادر فرماتا تھا، اور جب وہ چنگے ہو جاتے تھے تو ان پر پاکی کا منتر دم کر کے پھر بندگانِ خدا کی بستی کی طرف واپس کر دیتا تھا۔ ہر قسم کا سماجی جرم اور خدائی قانون کے توڑنے کا گناہ صرف پروہت کے حکم سے مٹ سکتا تھا، اور اس کی ترکیب یہ تھی کہ مجرم یا گناہ گار پروہت جی کے ہاتھوں قربانی پیش کرتا تھا اور پروہت جی خدا کے پاس اس بدنصیب کی سفارش کرتے تھے، تب کہیں جا کر اس بندۂ خدا کی زندگی درست ہوتی تھی اور وہ خدا و بندِ خدا کے نزدیک صحیح قسم کا بندہ شمار ہو سکتا تھا!

پروہت کا کام یہ بھی تھا کہ وہ بنو اسرائیل کو پڑھاتا تھا، خاص کر "مذہب" کے امور اور "شریعت" کے مسائل کی تعلیم صرف اسی کا حصہ تھا۔ "علمِ مذہب" صرف پروہت کی مبارک اور مقدس زبان اور ہونٹوں ہی سے حاصل ہو سکتا تھا۔ سال میں تین عیدیں ہوتی تھیں، اور ان تین مقدس موقعوں پر جناب پروہت بہت مصروف رہتے تھے۔ ان موسموں میں لاکھوں زائرین آتے تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی قربانی کے جانور اور اپنے اپنے نذرانے لاتا تھا، اور پروہت ان نذرانوں کو خدا کے حضور میں پیش کرتا تھا۔ ہر تقریب پر پروہت موجود تھا اور خاص خاص منتر پڑھ پڑھ کر اس تقریب اور اہلِ خانہ کے لئے خداوندی برکت اور خوشنودی حاصل کرتا تھا۔ چونکہ میدانِ تیہ میں بنو اسرائیل کو مختلف موقعوں پر جمع کرنے کے لئے قرنا پھونک کر بلایا جاتا تھا، اور یہ کام پروہتوں کے سپرد تھا، اس لئے ہر مذہبی اور اجتماعی موقع پر قرنا پھونکنے کا دستور قائم ہو گیا تھا، اور آج تک بدستور موجود ہے۔ ہیکل میں عبادت کے دوران میں آکیلن[۲] سے لے کر چوراسی قرنا فادر تک ہوتے تھے۔ دورانِ جنگ میں بھی بگل بجانے کا کام ایک خاص پروہت کے سپرد ہوتا تھا، اور جنگ آزما سپاہیوں کی

---

۵ ہمارے وطن کا اصلی پاستانی پروہت غریب تو اصلی اُمی حالت، لباس سے صاف عاری، رہنا پسند کرتا ہے گو اس کے بعض پروہت بڑی شان سے رہتے سہتے، کھاتے پیتے، پہنتے اوڑھتے ہیں، مگر نقل پھر نقل ہی ہے!

صفوں میں اس کے لئے ایک ممتاز مقام مقرر تھا۔ ان سب کاموں کے علاوہ، پروہت عمومی طور پر لوگوں کا معلم اور تہذیب آموز ہوتا تھا۔ اور تمام دیوانی اور فوجداری مقدمات میں آخر کار اسی کی سرکار میں مرافعہ کیا جاتا تھا! مختصر یہ کہ انسانی زندگی کا کوئی زمانہ، کوئی شعبہ، کوئی حصہ پروہت کی ذات خداوندی صفات کی ضرورت سے مستغنی اور خالی نہ تھا۔ اوپر خدا اور نیچے پروہت تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ ہر جگہ پروہت ہی پروہت تھا۔ جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے!

یہ صرف دو ملکوں کے پروہتوں کی جھلکیاں آپ نے دیکھیں۔ ابھی اقطار عالم کے اور بہت سے حصے ہیں، جہاں کے نظارے اور بھی زیادہ قابل دید ہیں۔ خود ہمارے وطن مالوف و مرحوم میں، جہاں اہل وطن پھر ہر جینا اور ہر خیال میں بوسیدہ ترین حد تک قدامت میں ہی جانا چاہتے ہیں، پروہت کا جو درجہ ہے اور اسے ہندی انسان کی حیات و ممات میں جس قدر دخل اور اہمیت حاصل ہے، اس کے ذکر سے نہ آپ کو تھکانا چاہتا ہوں اور نہ اس کی ضرورت ہے، کیوں کہ آپ اس سے خوب واقف ہیں اور یہ نظارے شبانہ روز آپ کے سامنے رہتے ہیں، خواہ وہ کسی مقدس ندی کے کنارے پر ہوں ——— اور ندیاں تو سب ہی پروہت مہاراج کے دم قدم اور فضل و کرم سے مقدس ہیں ——— خواہ کسی کے گھر کے صحن میں ہوں، آسمان تلے ہوں، مندر کے اندر ہوں، مہادیو جی کے چرنوں کے پاس ہوں، کہیں ہوں۔ ہمارے پروہتوں کی شان کی عظمت کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے اور ہر معنی میں خدا کے نمائندے ہیں، بلکہ خدا کے برابر ہیں، خود خدا ہیں۔ ہر "مذہبی" رسم کے موقعے پر خدا پروہت جی کے وجود اور شکل میں موجود ہوتا ہے۔ لہذا پروہت کی خوشی اور رضامندی خود خدا کی خوشنودی اور رضامندی ہوتی ہے۔

خدا آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا، اس لئے بہ نسبت روشنی کے خدا تاریکی میں بہتر جلوہ گر ہوتا ہے۔ عورت ذات گناہ اور آلودگی کا مجسمہ ہے۔ اس کی طہارت، پاکیزگی اور نجات کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ وہ تاریکی میں اپنے آپ کو خدا کے سامنے پیش کرے۔ ظاہر ہے کوئی بندۂ خدا پروہت کے وسیلے کے بغیر خدا تک نہیں پہنچ سکتا، خاص کر عورت کی کمزور ذات۔ اس لئے اس کا اپنے آپ کو پروہت جی کے سپرد کر دینا ہی واحد ذریعہ نجات ہے۔ عورت کا خاص کام مخلوق کو پیدا کرنا ہے، پروہت خدا ہے، لہذا پروہت کی خاص اجازت اور بشارت اس فرض کے سرانجام کے لئے لازمی اور لابدی ہے۔ اس خصوص میں زمانۂ حال کا ہند کسی طرح قدیم بابل اور اشور سے کم نہیں ہے، جہاں ہر کنواری کے لئے اپنی سیج تک پہنچنے سے پہلے پروہت کی مقدس معیت اور نوازش خداوندانہ ضروری ہوتی تھی۔ افریقہ کے مندروں کی کنواریاں ہماری دیوداسیوں کے سامنے آتے ہوئے شاید آج بھی شرمائیں گی۔ سورج کی کنواریاں اور کنوارے آج بھی باپ خدا، بیٹے خدا اور ماں خدا کے جلال و جبروت، رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے ہمارے گرد و پیش موجود ہیں۔

زنانہ قسم کے پروہت دنیا میں کب پیدا ہوئے، اس کا پتا لگانا مشکل امر ہے۔ وہ غریب بھی آخر انسان تھی اور ہے۔ مردوں نے عورت ذات کو ہمیشہ ہر نوع کے عیب اور گناہ کا مرکز، مرقع اور مجسمہ قرار دے رکھا ہے۔ ایسی حالت میں اس بیچاری کو اونچی بلندیوں تک پہنچنا کبھی نصیب نہ ہو سکتا تھا۔ وہ بھی انسان تھی، دل رکھتی تھی، احساس رکھتی تھی، تمنائیں، آرزوئیں، ایک معزز زندگی کی خواہش اُسے بھی ہوتی تھی۔ یہ عزت، رفعت، شان اسے پروہت کی شکل میں حاصل ہو سکتی تھی۔ لہذا اُس نے بھی پروہت کی زندگی بسر کرنے کا بندوبست کیا۔ اس میں حرما اور ثواب بیک وقت دونوں کے مل جانے کے بہترین موقعے بھی حاصل تھے۔ پھر عورت پروہت کیوں نہ بنتی؟ اور جب وہ پروہت بن گئی تو اُسے پروہت کے بہت سے فرائض کا حامل ہونا پڑا، اور اسے بھی وہ تمام مراعات مل گئیں جو اس منصب سے متعلق تھیں، اور ملائے سے عورت اس منصب کو بہ احسن وجوہ پورا کرتی ہے اور کر سکتی ہے۔ قدیم ترین زمانے سے لے کر آج تک یہی ہو رہا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا، جب تک کہ "مذہب" مذہب ہے۔ خدا بغیر پروہت کے نہیں ملتا۔ پروہت خود خدا ہے۔ پروہت مل جائے تو ہر طرح بیڑا پار ہے!

ایک وقت آیا، یک اللہ کا بندہ آیا۔ مذہب ختم ہوا دین
آیا۔ مذہب کے ساتھ ساتھ پروہت نے بھی دم توڑا۔ اس کے
بعد گئے، وہ بھی گیا۔ اب انسان کو پروہت کی ضرورت نہیں
رہی، وہ براہ راست خود ہی اللہ کے پاس پہنچنے لگا۔ انسان
کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے آخر اللہ کو پالیا، اور اس سے
خود بلا واسطہ باتیں کرنے لگا۔ اللہ حاضر و ناظر، اوّل و آخر
ظاہر و باطن، وہ نور و ظلمت، روز و شب، ہر حال میں، ہر
وقت میں حاضر و ناظر ہو گیا، ہمہ وقت قریب، حبل ورید
سے بھی زیادہ قریب نظر آنے لگا۔ کھڑے بیٹھے، لیٹے سوتے
جاگتے، ہر دم جان کے ساتھ، ہر دم حفاظت کے لئے موجود
۔۔۔ سمیع بصیر، علیم، کریم، رحیم، ملک رحمان، ستار، غفار
اللہ احد، اللہ اکبر! اللہ غائب، رابحق، اللہ قائم، باقی، حیّ
قیوم۔ پروہت ختم ہوا، فنا ہوا۔ "توحید" قائم ہوگئی "شرک"
معدوم ہو گیا۔

یعنی بظاہر فنا ہو گیا پروہت، محض بظاہر وہ صرف
روپوش ہو گیا، اور ۔۔۔ "غائب" بن گیا کہ پھر کبھی "ظاہر"
۔آ۔ سمجھ روز آرام فرمانے کے لئے تشریف لے گئے
مدفرمائے گئے کہ "بے شک میں جلد ہی آنے والا ہوں"
سچ فرماتے تھے، وہ تشریف لے آئے اور عین اہل
توحید کے ہاں نازل ہوئے، ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، سر
آنکھوں پر بٹھائے گئے۔ اے مثل و جل

گر بر سر و چشم من نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی!

شبیہ مبارک نور علی نور، وجود مبارک سراپا اعجاز
رسن مبارک سعد براق، دم مبارک مجسم قم باذنی،
مرد پر مہربان، زن کے لئے سر تا پا نائب رحمان، حامل کتاب
امام، بنی اسرائیل کے کامل و مکمل جواب۔

اے آمدنت باعث آبادی ما!

لیجئے ایک انھیں کی کمی تھی سو وہ بھی پوری ہو گئی
اور بڑی خوبی سے پوری ہوئی۔ اب لیجئے، پیدائش میں
موت میں، ہنسنے کے موسم میں، رونے کے سمے میں، عبادت
میں، معاملت میں، گھر میں، عبادت گاہ میں، روشنی میں
اور تاریکی میں، غرض یہ کہ جہاں ادھر:

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

سبحان اللہ و بحمدہ، ما شاء اللہ، اللہ جمیل و یحب الجمال۔
۔ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔
و من یضللہ فلا ہادی لہ۔

حبیب اشعر دہلوی

"طوفان"

(۱)

یوسف مخزی بیس برس کا تھا، جب اس نے دنیا والوں سے قطع تعلق کر کے تنہا خاموش اور درویشانہ زندگی بسر کرنے کیلئے اُس اُجاڑ خانقاہ کو جا بسایا، جو شمالی لبنان میں وادی قادیشا کے کنارے واقع ہے۔

آس پاس کے گاؤں والے اس کے بارے میں مختلف خیال تھے۔ کوئی کہتا: "وہ ایک شریف اور دولت مند خاندان کا فرد ہے جس نے ایک عورت سے محبت کی، لیکن اس کی بے وفائی سے دل شکستہ ہو کر شہر چھوڑ دیا اور اُسے بھلا دینے کیلئے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔"

کوئی خیال ظاہر کرتا "وہ تصورات کی دنیا میں رہنے بسنے والا شاعر ہے جو اپنے افکار و جذبات کو شعر و نظم کا جامہ پہنانے کے لئے سماجی ہنگاموں سے دامن کش ہو گیا ہے۔"

کوئی قیاس دوڑاتا "وہ عبادت گزار صوفی ہے جس نے دنیا اور اس کی دلچسپیوں سے منہ موڑ کر دین پر قناعت کر لی ہے۔"

اور کوئی دو ٹوک فیصلہ کر دیتا "وہ دیوانہ ہے!"

لیکن میں؟ — میں اس مسئلہ میں بالکل خاموش تھا، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ روح کے اندر ایسے بارِیک راز بھی ہوتے ہیں، جن کا اظہار قیاس آرائیوں کے بس کی بات نہیں۔ تاہم اس عجیب و غریب انسان سے ملنے اور گفتگو کرنے کا میں بہت مشتاق تھا، چنانچہ دو مرتبہ میں نے کوشش بھی کی کہ اس سے مل کر اس کی حقیقت معلوم کروں اور اس کے مقصد و مدعا کا کھوج لگاؤں، لیکن تیز تیز نظروں اور بعض ایسے الفاظ کے سوا جن سے اُس کی سنگدلی، سرد مہری اور رفعت پسندی ظاہر ہوتی تھی، مجھے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

پہلی مرتبہ جب میں نے اسے دیکھا ہے، تو وہ صنوبروں کے جھنڈ کے قریب چہل قدمی کر رہا تھا۔ نہایت تکلف اور شائستگی کے ساتھ میں نے اسے سلام کیا، لیکن اس نے سوائے سر ہلا دینے کے کوئی جواب نہ دیا اور فوراً وہاں سے چلا گیا۔

دوسری مرتبہ، جب میرا اُس کا آمنا سامنا ہوا، تو وہ خانقاہ کے پاس، انگوروں کے باغیچہ کے وسط میں کھڑا تھا، اُس کے قریب جا کر میں نے پوچھا "کل مجھے ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ یہ خانقاہ ایک سُریانی عابد نے چودہویں صدی میں بنوائی تھی، کیا آپ اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟"

درشت لہجہ میں اُس نے جواب دیا: "میں نہیں جانتا، یہ خانقاہ کس نے بنوائی ہے؟ اور نہ جاننا چاہتا ہوں!"

یہ کہہ کر اُس نے میری طرف پیٹھ کر لی اور طنز آمیز لہجہ میں کہنے لگا "تم اس کے متعلق اپنی دادی سے کیوں نہیں پوچھتے، وہ عمر میں بھی یہاں سب سے بڑی ہے اور ان وادیوں کی تاریخ بھی اسے سب سے زیادہ معلوم ہے!"

میں اپنی اس طفلانہ حرکت پر نادم و مغموم واپس چلا آیا۔

دو برس اسی طرح گزر گئے کہ اس پراسرار شخص کی زندگی میرے خیال و تصور پر چھائی رہی۔

(۲)

موسم خزاں کا ذکر ہے: میں یوسف مخزی کی خانقاہ کے آس پاس، پہاڑیوں اور وادیوں میں چکر لگا رہا تھا کہ طوفان باد و باراں آ گیا اور میرے ساتھ اس طرح کھیلنے لگا، جیسے بپھرا ہوا سمندر اس کشتی کے ساتھ کھیلتا ہے، جس کے چپّو موجوں نے توڑ دیے ہوں اور بادبان آندھی نے پھاڑ ڈالے ہوں۔ میں نے خانقاہ کا راستہ لیا اور اپنے دل میں کہا: "اس مردم بیزار سے ملنے کا یہ اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ طوفان اور گیلے کپڑے میری معذرت اور سفارش کیلئے کافی ہیں۔"

میں اسی حالت میں، خانقاہ کے قریب پہنچا، لیکن ابھی میں نے کُنڈی بھی نہ کھٹکھٹائی تھی کہ مجھے اپنے سامنے وہ شخص کھڑا نظر آیا، جس سے ملنے کی تمنا، ایک مدت سے میرے دل میں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرندہ تھا، جس کا سر بُری طرح زخمی اور پر ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ اس طرح پھڑپھڑا رہا تھا،

گویا اپنی زندگی کے آخری سانس پورے کر رہا ہے۔ اسے سلام کرنے کے بعد میں نے کہا: "مجھے معاف کیجئے کہ میں اس حالت میں آپکے پاس آگیا۔ لیکن کیا کروں، مجبور تھا۔ طوفان بہت شدید ہے اور بستی یہاں سے بہت دُور!"

اس نے نہایت ترش روئی کے ساتھ مجھے غور سے دیکھا اور حقارت آمیز لہجہ میں جواب دیا "یہاں بہت سے غار ہیں اگر تم چاہتے تو ان میں پناہ لے سکتے تھے!"

یہ کہا اور پرندے کے سر پر ایسی محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا کہ میں نے زندگی بھر نہ دیکھی تھی۔ اس اجتماع ضدین — رحم و سنگدلی — کو دیکھکر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ سب سے زیادہ حیرت ناک میرے لئے یہ بات تھی کہ وہ مجھ سے اس قدر سنگدلی اور بے مہری کے ساتھ کیوں پیش آتا ہے؟!

اس نے میری طرف وضاحت طلب نگاہ سے دیکھا، گویا میری ذہنی اذیت کو محسوس کر لیا ہے، اور کہا "طوفانی بھیڑئے گوشت کو اپنی غذا نہیں بناتا، پھر تم اس سے ڈر کے کیوں بھاگے ہو؟"

میں نے جواب دیا: "یہ صحیح ہے کہ طوفان، ترشی اور تلخی سے رغبت نہیں رکھتا، لیکن سرد و تر چیزیں اسے پسند ہیں، اس لئے مجھے یقین ہے کہ اگر میں دوبارہ اس کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ مجھے ایک لذیذ لقمہ سمجھکر ہڑپ کر جائے گا!"

اُس کے چہرے پر قدرے شگفتگی پیدا ہوئی اور اُس نے کہا: "اگر تمہیں طوفان ایک لذیذ لقمہ سمجھکر چٹ کر جاتے، تو یہ تمہارے لئے اتنی بڑی عزت ہوتی، جس کے تم ہرگز مستحق نہیں۔"

میں نے جواب دیا: "اسی لئے تو میں طوفان سے بھاگ کر آیا ہوں کہ وہ عزت مجھے حاصل نہ ہو سکے۔ جسکا میں ہرگز مستحق نہیں۔"

اس ہلکی سی مسکراہٹ کو چھپانے کے لئے، جو اُس کے لبوں پر بے اختیار نمایاں ہو گئی تھی، اس نے میری طرف پیٹھ کر لی اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے، جو دہکتی ہوئی انگیٹھی کے پاس رکھی تھی، مجھ سے کہا: "اس کرسی پر بیٹھ کر اپنے کپڑے سکھالو!"

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں اُس چوبی کرسی پر، جو آتشدان کے پاس پڑی تھی، اور وہ ایک سنگین کرسی پر، جو چٹان کھود کر بنائی گئی تھی۔ اُس نے ایک مٹی کی پیالی میں جس میں بہت سے تیل ملے ہوتے تھے، انگلیاں ڈبوئیں اور اُس پرندے کے زخمی بازو اور سر پر ملنے لگا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوا، اور کہا: "آندھی نے اس غریب پرندے کو دھکیلا اور یہ ادھ موئی حالت میں چٹانوں پر گر پڑا۔"

میں نے جواب دیا "اسی طرح مجھے بھی آندھی آپ کے در پر لے آئی ہے اور مجھے اب تک معلوم نہیں کہ اس نے میرے بازو توڑے ہیں یا سر پھاڑا ہے؟"

اُس نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور کہا: "کیا ہی اچھا ہوتا، اگر انسان کی فطرت پرندوں جیسی ہوتی! کیا ہی اچھا ہوتا، اگر طوفان انسان کے بازو توڑ ڈالتا اور سر پھاڑ دیتا۔ لیکن انسان فطرتاً بزدل واقع ہوا ہے، وہ طوفان کو بیدار ہوتے دیکھتا بھی نہیں کہ غاروں اور کونے کھدروں میں جا چھپتا ہے!"

سلسلۂ کلام کو جاری رکھنے کے ارادہ سے میں نے کہا: "پرندوں کو وہ شرف حاصل ہے، جو انسان کو حاصل نہیں۔ انسان اُس قانون اور اُس رواج کے سائے میں زندگی بسر کرتا ہے جو اس نے اپنے لئے خود وضع کیا ہے، لیکن پرندے اُس عام اور ہمہ گیر قانون کے مطابق زندگی گذارتے ہیں، جس کے تحت زمین سورج کے گرد گھومتی ہے!"

اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور باچھیں کھِل گئیں، گویا اس نے مجھے اپنا ایک سریع الفہم شاگرد پایا۔ وہ کہنے لگا "شاباش! زندہ باد! جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر وہی تمہارا عقیدہ بھی ہے، تو انسانوں کو چھوڑ دو، اُن کے ناقص رسم و رواج اور ناکارہ قانونوں پر لات مار دو، پرندوں کی طرح ایک ایسے مقام پر زندگی بسر کرو، جو ناموس الہٰی کے علاوہ ہر چیز سے خالی ہو!"

میں نے جواب دیا: "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، اُس پہ اعتقاد بھی رکھتا ہوں!"

اُس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور درشت لہجہ میں بولا: "اعتقاد اور چیز ہے اور اُس پر عمل کرنا اور۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو بات تو سمندر کی طرح کرتے ہیں، لیکن ان کی زندگی جوہڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ اپنے سروں کو پہاڑ کی چوٹیوں سے بھی بلند سمجھتے ہیں لیکن ان کی روحیں غار کی تاریکیوں میں

پھیلی سوتی ہیں۔"

یہ کہا اور مجھے گفتگو کا موقع دیے بغیر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پرندہ کو کھڑکی کے پاس لٹکے ہوئے ایک پرانے کوٹ پر بٹھا دیا اور پھر ادھر سے گھاس پھونس جمع کرکے آتشدان میں ڈالتے ہوئے کہنے لگا: "جوتے اتار کر اپنے پاؤں خشک کر لو رطوبت انسان کے لئے سب سے زیادہ مضر ہے، اپنے کپڑے بھی طرح سکھا لو، اور شرمندہ مت ہو۔"

میں آگ سے اور قریب ہوگیا۔ میرے گیلے کپڑوں میں سے دھواں نکل رہا تھا، لیکن وہ خانقاہ کے دروازہ پر کھڑا غضب ناک فضا کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے پوچھا "کیا آپ کو اس خانقاہ میں آئے بہت زمانہ گزرا ہے"

اس نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بغیر جواب دیا "میں اس خانقاہ میں اس وقت آیا تھا جب زمین سنسان اور ویران تھی، سمندروں پر تاریکی چھائی ہوئی تھی اور سطح آب پر روح خداوندی منڈلا رہی تھی۔"

میں خاموش ہوگیا اور اپنے دل میں کہنے لگا: "کتنا عجیب غریب ہے یہ شخص اور کس قدر دشوار ہے اس کی حقیقت کو پانا؟! لیکن اس سے گفتگو کرنا اور اس کی روح کے اسرار کو سمجھنا بھی ضروری ہے، اسلئے میں صبر کروں گا، اس حد تک کہ اس کی بے مہری اور غرور لطف و مہربانی سے بدل جائے۔

——— ۳ ———

رات نے اُن وادیوں پر اپنی سیاہ چادر پھیلا دی۔ آندھی اور بارش نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، طوفان، زندگی کو فنا اور زمین کو خس و خاشاک سے پاک صاف کرنے کے لئے دوبارہ جوش میں آگیا ہے۔ یوسف فخری کی مجھ سے ساری نفرت و بیزاری، انس و ہمدردی سے بدل گئی، گویا عناصر کی برانگیختگی نے اس کی روح میں وہ طمانیت پیدا کردی تھی، جو بعض اوقات ردعمل کے طور پر ظاہر ہوتی ہے وہ اٹھا اور دو چراغ روشن کئے، اس کے بعد میرے سامنے شراب سے لبریز ایک سبو اور ایک طباق رکھ دیا جس میں روٹی، پنیر، روغن زیتون اور تھوڑے سے خشک پھل تھے اور میرے بالمقابل بیٹھ کر لطف و مہربانی کے انداز میں کہنے لگا: "میرے پاس جو کچھ کھانے پینے کا سامان تھا حاضر ہے۔ آؤ! اور میرے ساتھ شریک ہو۔"

ہم نے رات کا کھانا خاموشی کے ساتھ کھایا۔ ہوا کی سائیں سائیں اور بارش کی چیخ پکار برابر ہمارے کانوں میں آرہی تھی۔ میں ہر لقمہ پر یوسف فخری کے چہرے کی طرف دیکھ لیتا تھا، تاکہ اس کے خد و خال سے اس کی ذہنی کیفیات اور وجدانی رجحانات میلانات کی غایت معلوم کروں۔

دسترخوان اٹھ جانے کے بعد آتشدان کے پاس سے اس نے تیل کی ایک کیتلی اٹھائی اور دو پیالیوں میں بہت صاف اور خوشبودار قہوہ ڈالا، پھر سگریٹ کا ایک ڈبہ کھول کر میری طرف بڑھاتے ہوئے نرم آواز میں کہا "لو سگریٹ پیو"

میں نے ایک سگریٹ لے لیا، اور دوسرے ہاتھ میں قہوہ کی پیالی تھی، جو کچھ اس وقت میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں مجھے اس پر یقین نہ آتا تھا۔ میرے سگریٹ سلگانے اور قہوہ کے دو چار گھونٹ لینے کے بعد، اس نے سر ہلایا، گویا میرے افکار کا علم اسے ہوگیا تھا، اور کہا "تم اس خانقاہ میں شراب، سگریٹ اور قہوہ کی موجودگی پر تعجب کر رہے ہو، یہی نہیں بلکہ یہاں کھانے کے سامان اور بستر پر بھی حیرت ہے، میں تمہیں قابل الزام نہیں سمجھتا کیونکہ تم بھی ان بہت سے لوگوں میں ایک ہو، جو انسانوں سے دوری کو زندگی اور اس کی تمام حظوظ لذتوں اور عام مسرتوں سے دوری کا لازمی سبب سمجھتے ہیں۔"

میں نے جواب دیا "جی ہاں! یہ عقیدہ پوری طرح ذہن نشین ہو چکا ہے کہ خدا کی عبادت کے لئے دنیا سے منہ موڑنے کے معنی یہ ہیں کہ تنہا اور زاہدانہ زندگی بسر کی جائے۔ زندگی کی ہر لذت اور ہر مسرت کو چھوڑ کر صرف پانی اور گھاس پر گزارا کیا جائے!"

اس نے کہا "خدا کی مخلوق کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میں اس کی عبادت کرسکتا تھا، اس لئے کہ عبادت کو بھی گوشہ نشینی ضروری نہیں ہے۔ میں نے خدا کو پانے کے لئے دنیا کو نہیں چھوڑا کیونکہ وہ تو مجھے میرے ماں باپ کے گھر ہی میں، ہر جگہ ملتا تھا بلکہ میں نے لوگوں سے اس لئے کنارہ کشی اختیار کی کہ میرا اخلاق ان کے اخلاق سے مختلف تھا اور میرے افکار ان کے افکار سے۔ میں نے انسان سے اس لئے قطع معاشرت کی کہ اپنی روح کو، بائیں سمت گھومنے والی چرخیوں

میں، دائیں سمت گھومنے والی چرخی پایا۔ میں نے تمدن پر اس لئے لات ماری کہ میرے خیال میں وہ ایک پرانا، فاسد، قوی اور ہولناک درخت تھا جس کی جڑیں رہبانیت کی تاریکیوں میں پھیلی ہوئی تھیں اور شاخیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، لیکن جس کے پھول، لالچ، بداخلاقی ورجرم وگناہ تھے اور پھل آفت، بدبختی اور فکر وغم۔ بعض مصلحین نے چاہا بھی کہ قلم لگاکر اس درخت کی طبیعت بدل دیں، لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی اور وہ مایوسی، مظلومی اور ناکامی کی حالت میں مر گئے"۔

اس نے کرسی کی پُشت کا سہارا لے لیا، اور اُس کی آواز پہلے سے زیادہ بلند ہوگئی، گویا اپنی تائید کلام میں وہ ایک لذت سی محسوس کر رہا تھا۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا "نہیں! میں نے رہبانیت اور عبادت کے لئے تنہائی اختیار نہیں کی، اس لئے کہ عبادت ــــ جو دل کا ترانہ ہے ــــ بے شمار جیبوں میں گھری ہوئی ہونے کے باوجود خدا کے کانوں تک پہنچتی ہے اور رہبانیت ــــ جس کا دوسرا نام جسم پر جبر کرنا اور اس کی خواہشوں کو کچلنا ہے ــــ ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کے لئے میرے مذہب میں کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ نے جسم کو روح کا عبادت کدہ بنایا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں تاکہ وہ جان دار، پاک وصاف اور اُس "الوہیت" کے قابل رہے، جو اس میں سکونت پذیر ہوتی ہے"۔

نہیں اے میرے دوست! میں نے زہد وعبادت کے لئے گوشہ نشینی اختیار نہیں کی، بلکہ اس لئے کی ہے کہ میں لوگوں، ان کے قوانین، ان کی تعلیمات، ان کے رسم ورواج، ان کے خیالات، ان کی مصیبتوں اور ان کے ادبار سے بھاگنا چاہتا تھا۔ میں نے تنہائی کو اس لئے بہتر سمجھا کہ ان لوگوں کی منحوس صورتیں مجھے نہ دکھائی دیں، جو اپنی روح کو بیچ کر، اس کی قیمت سے ایسی چیزیں خریدتے ہیں، جو قدر وشرف میں اس سے کہیں پست ہوتی ہیں۔ میں نے گوشہ گیری کو اس لئے ترجیح دی کہ میں ان عورتوں سے ملنا نہیں چاہتا تھا، جو اکڑی ہوئی گردنوں کے ساتھ آنکھیں مٹکاتی پھرتی ہیں اور جن کے ہونٹوں پر تو ہزاروں مسکراہٹیں ہوتی ہیں، لیکن دل میں ایک اور صرف ایک غرض۔ میں نے عزلت کو اس لئے پسند کیا کہ اُن ادھورے "فلسفیوں" کی ہم نشینی سے بچ جاؤں، جو خواب میں علم کا سایہ دیکھکر یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کا عالم معرفت میں وہی درجہ ہے، جو دائرہ میں نقطہ کا ہے اور جو بیداری میں حقیقت کی ایک پرچھائیں دیکھکر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اُس کے عام اور کامل جوہر کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔ میں نے خلوت نشینی کو اس لئے مناسب سمجھا کہ میں اُن جاہلوں کے تپاک سے گھبرا گیا تھا، جو مہربانی کو کمزوری کی، درگذر کو بزدلی کی اور غرور کو عظمت کی ایک قسم سمجھتے ہیں۔ میں نے تجرد کو اپنی زندگی اس لئے بنایا کہ میری روح ان دولت مندوں کے ساتھ رہتے رہتے تھک گئی تھی جو خیال کرتے ہیں کہ سورج، چاند اور ستارے ان کے خزانوں سے طلوع ہوکر، ان کی جیبوں میں غروب ہوتے ہیں، اُن لیڈروں سے اُکتا گئی تھی، جو قوم کی آرزوؤں کے ساتھ کھیلتے اور اُس کی آنکھوں کو طلائی غبار اور کانوں کو مترنم الفاظ سے بھر دیتے ہیں اور ان پادریوں سے تنگ آ گئی تھی، جو لوگوں کو اُن باتوں کی تلقین کرتے ہیں، جن پر خود کبھی عمل نہیں کرتے اور ان سے ایسی چیزوں کے طالب ہوتے ہیں، جو اپنے نفس سے طلب نہیں کرتے۔ میں نے تنہائی کو اپنا مرکز حیات اس لئے قرار دیا کہ آج تک مجھے انسان کے ہاتھ سے کوئی چیز ایسی نہ ملی جس کی قیمت میں نے اپنے دل سے ادا نہ کی ہو۔ میں نے گوشہ نشینی کو اس لئے اپنا مقصود ٹھہرایا کہ مجھے اِس عظیم الشان اور خوفناک عمارت سے نفرت ہو گئی تھی، جسے دُنیا "تہذیب وحضارت" کے نام سے پُکارتی ہے ــــ وہ عمارت، جو صنعت اور تعاملی کے کمالات کا آئینہ اور انسانی کھوپڑیوں کے ڈھیر پر قائم ہے۔ مجھ میں گوشۂ عزلت کی طلب اس لئے پیدا ہوئی کہ تنہائی میں روح وفکر اور قلب وجسم کے لئے ایک زندگی ہے۔ میں نے ویران جنگلوں میں اپنا مسکن اس لئے بنایا کہ ان میں سورج کی روشنی، پھولوں کی خوشبو اور نہروں کے گیت ہیں۔ میں نے پہاڑوں کو اپنا مستقر اس لئے قرار دیا کہ اُن میں بہار کی بیداری، گرمی کی شوق انگیزی، خزاں کی ترنم نوازی اور جاڑوں کا ارادہ ہے۔ میں نے اس اجاڑ خانقاہ کو اس لئے بسایا کہ میں زمین کے بھیدوں سے واقفیت اور بارگاہ خداوندی کی قربت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

وہ خاموش ہوگیا، اُس کا سانس پھُول رہا تھا گویا بہت بھاری بوجھ اس نے اپنے سر سے اُتار پھینکا ہے، اُس کی آنکھیں عجیب وغریب طلسمی شعاعوں سے روشن ہوگئیں اور چہرہ پر عظمت

ملتی۔ ارادہ اور قوت کی موجیں کھیلنے لگیں۔ میں تھوڑی دیر
تک غیر معمولی مسرّت کے زیر اثر اس کے چہرہ کو دیکھتا رہا مجھے
اس امر کی بے انتہا خوشی تھی کہ جن پوشیدہ باتوں کے انکشاف
کا اشتیاق ایک مدت سے میرے دل میں تھا، وہ اس وقت میرے
سامنے تھیں۔ آخر اس سے مخاطب ہو کر میں نے کہا "آپ نے جو
کچھ فرمایا، وہ بالکل بجا اور درست ہے، لیکن کیا آپ کو معلوم
نہیں کہ سوسائٹی کی بیماریوں اور تکلیفوں کی جو تشخیص آپ نے
فرمائی ہے، اس سے مجھے معلوم ہوگیا کہ آپ طبیب حاذق ہیں
اور ایک طبیب کو ہرگز زیب نہیں دیتا کہ وہ بیمار کی تیمارداری یا
موت سے پہلے، اس کے علاج سے گریز کرے۔ دنیا کو آپ
جیسے لوگوں کی شدید ضرورت ہے اور یقیناً یہ انصاف ہوگا
اگر آپ سوسائٹی کو نفع پہنچانے کی قدرت رکھتے ہوئے
اس سے دامن کش ہو جائیں؟"

وہ تھوڑی دیر تک مجھے غور سے دیکھتا رہا، پھر مایوسی
تلخی کے لہجہ میں کہنے لگا "آغاز آفرینش سے طبیبوں کی
خواہش ہے کہ بیمار کو اس کے روگ سے نجات دلائیں چنانچہ
ان میں سے اکثر نشتر لے کر آئے اور اکثر دوائیں لے کر لیکن
افسوس! کہ سب کے سب بغیر کسی امداد کا سامان کیے مر گئے۔
کاش زمانے کی گردشوں کا مارا ہوا یہ مریض اپنے گندے
بستر سے چمٹے رہنے اور اپنے پرانے زخموں سے مانوس ہو
جانے ہی پر اکتفا کر لیتا، لیکن نہیں! وہ اپنی چادر سے ہاتھ
نکالتا ہے اور ہر اس شخص کا گلا پکڑ کر گھونٹ دیتا ہے، جو
اس کے علاج یا تیمارداری کے لئے آتا ہے۔ تاہم جو بات مجھے
غضب ناک کرتی اور خون کو میری رگوں میں کھولتے ہوئے
شعلوں سے بدل دیتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مریض بیمار پہلے تو
طبیب کو قتل کر دیتا ہے اور پھر نادم ہوتا ہے۔ اپنی آنکھیں
بند کر کے دل ہی دل میں کہتا ہے "واقعی یہ طبیب حاذق تھا"
—— نہیں، بھائی! دنیا میں کوئی انسان کے ساتھ بھلائی
نہیں کر سکتا، جس طرح کسان، چاہے وہ کتنا ہی ماہر اور
عقلمند کیوں نہ ہو، جاڑے میں فصل نہیں کاٹ سکتا۔"

میں نے جواب دیا: "محترم! دنیا کا سرمائی موسم ہو رہا
ہے اور اس کے بعد حسین و دلکش بہار آنے والی ہے، جس
میں پھل باغوں کی زینت ہوں گے اور نہریں وادیوں میں مترنم۔"

اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور پیشانی پر بل ڈال کر مغموم
لہجہ میں کہنے لگا "کاش! مجھے معلوم ہوتا کہ کیا اللہ نے انسان
کی زندگی کو —— اور اس سے میری مراد زمانہ ہے، اپنے
تمام متعلقات کے ساتھ —— ان موسموں میں تقسیم کیا ہے،
جو اپنی رفتار اور تسلسل کے اعتبار سے عام موسموں سے مشابہت
رکھتے ہیں؟ کیا ہزارہا برس کے بعد بھی روئے زمین پر کوئی
ایسی انسانی جماعت نمودار ہوگی، جو روح اور سچائی کے
اصولوں پر زندگی بسر کرے گی؟ کیا کبھی ایسا زمانہ بھی
آئے گا، جس میں انسان کو عزت و بزرگی حاصل ہوگی
اور وہ دن کی روشنی اور رات کی خاموشی سے لطف اندوز
ہوتے ہوئے، زندگی کے دائیں پہلو میں بیٹھے گا؟ کیا یہ خواب
شرمندۂ تعبیر ہوگا —— کیا یہ خواب اس وقت شرمندۂ
تعبیر ہوگا، جب زمین انسان کے گوشت سے اپنی بھوک اور
اس کے خون سے اپنی پیاس رفع کرے گی؟"

وہ کھڑا ہو گیا اور اپنا ہاتھ اس طرح آسمان کی طرف
اٹھایا گویا اس عالم کے سوا ایک اور عالم کی طرف اشارہ
کر رہا ہے، وہ کہہ رہا تھا "یہ دنیا کے خواب نہیں اور یہ
خانقاہ خوابوں کی جگہ نہیں ہے کیونکہ میں اس کے صحن اور
اس کے گوشوں کی ایک ایک چیز کو یقینی طور پر جانتا ہوں
ہی نہیں بلکہ ان وادیوں اور پہاڑوں کے ایک ایک ذرہ
سے واقف ہوں —— میں اس حقیقت کو یقین کی حد تک
تسلیم کر رہا ہوں کہ میں موجود ہوں اور میرے وجود کی گہرائیوں
میں بھوک بھی ہے اور پیاس بھی۔ مجھے حق پہنچتا ہے کہ میں
زندگی کے اُس شربت میں اُس ظرف کو کام میں لاؤں جسے
میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں انسان
کی دعوتوں اور دستر خوانوں کو لات مار کر یہاں چلا آیا
اور اب ہمیشہ یہیں رہوں گا۔"

وہ کمرے کے وسط میں ٹہلنے لگا۔ اس دوران میں اس کی
گفتگو اور ان اسباب و علل پر غور کر رہا تھا، جنہوں نے
انسانی سماج کی تصویر اس کے سامنے اس رنگ میں پیش
کی تھی، کہ اس میں ٹیڑھی سیدھی لکیریں تھیں یا سیاہ داغ
دھبے۔ آخر میں نے یہ کہہ کر اسے ٹھہرایا "میں آپ کے تصورات
و مقاصد کا احترام کرتا ہوں اور میرے دل میں آپ کی عزلت

سندی کے لئے عزت ہے، لیکن میرے علم میں ہے ـــــ اور علم افسوس کا سبب ہے ـــــ کہ آپ کی گوشہ نشینی سے اس بدقسمت قوم نے ایک ایسے فرد کو کھو دیا ہے، جو اُسے نفع پہنچانے اور بیدار کرنے پر قادر تھا؟"

سر ہلاتے ہوئے اس نے جواب دیا: "یہ قوم بھی دوسری اور قوموں کی طرح ہے۔ اس لئے کہ لوگ ایک فطرت پر پیدا ہوتے ہیں اور اگر ان میں کوئی فرق ہے بھی تو وہ صرف خارجی مظاہر کا ہے، جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس بنا پر مشرقی قوموں کی بدبختی، درحقیقت ساری دنیا کی بدبختی ہے جس چیز کو تم مغربی ترقی سے تعبیر کرتے ہو، وہ لالچی غرور کی ایک پرچھائیں ہے اور بس اور بس، غریب ہی رہے گا، چاہے اس کے ناخن ہی کیوں نہ کاٹ ڈالے جائیں، اور کھوٹ کھوٹ ہی رہے گا، چاہے اس پر ملمع ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ دیباؤ حریر کے لباس پہن کر اور محلوں اور حویلیوں میں رہ کر بھی جھوٹ، سچ نہیں ہو سکتا اور ریلوں میں بیٹھ کر اور ہوائی جہازوں میں اُڑ کر بھی خیانت، امانت نہیں بن سکتی نامعلوم کو ناپنے اور عناصر کو تولنے سے لالچ، قناعت سے تبدیل نہیں ہو سکتا اور کارخانوں اور مدرسوں میں جرائم کے ارتکاب سے وہ جرائم، فضائل سے نہیں بدل سکتے غلامی ـــــ زندگی کی غلامی، ماضی کی غلامی، اصولوں، نصلوں اور لباس کی غلامی، مُردوں کی غلامی ـــــ غلامی ہی رہے گی قطع اس سے کہ اس کا چہرہ رنگ دیا جائے، نام بدل دیا جائے ہاں، غلامی، غلامی ہی رہے گی، چاہے وہ خود کو آزادی ہی کیوں نہ کہے۔

نہیں! میرے عزیز! مغرب مشرق سے زیادہ ترقی یافتہ نہ مشرق، مغرب سے زیادہ زوال پذیر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، سوائے اس فرق کے، جو بھیڑیئے اور بکری میں ہوتا ہے میں نے سماج کے مختلف مظاہر کو دیکھا ہے، اُن کے پیچھے مجھے وہ ازلی انصاف پسند ناموس نظر آیا، جو نیکی، اندھے پن اور جہالت کو ایک ہی درجہ میں رکھتا ہے، جو ایک قوم کو دوسری قوم پر فضیلت نہیں دیتا اور جو ایک جماعت کو چھوڑ کر دوسری جماعت پر ظلم نہیں کرتا۔"

میں نے التباس کی حد تک متعجب ہوتے ہوئے کہا: "آپ کے معنی تو یہ ہوئے کہ تمدّن اور اس کے تمام مظاہر باطل ہیں!"

پُرجوش لہجہ میں اس نے جواب دیا: "ہاں! باطل ہے یہ تمدّن اور باطل ہیں اس کے سارے مظاہر! یہ تمام ایجادات واختراعات کیا ہیں؟ سوائے اُن نقائص کے، جن سے عقلوں کو جھوٹی تسلّی دے لی جاتی ہے، حالانکہ وہ اضطراب واُداسی میں گھری ہوتی ہیں! اور یہ فاصلوں کی کوتاہی، پہاڑوں اور وادیوں کی ہمواری اور سمندر اور فضاء پر غلبہ کیا ہیں؟ سوائے اُن دُھوانسے پھلوں کے، جو نہ آنکھوں کو آسودہ کر سکتے ہیں، نہ دل کیلئے غذا بن سکتے ہیں اور نہ روح کو بلندیوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ رہے وہ معمّے اور پہیلیاں جنہیں علوم وفنون سے تعبیر کیا جاتا ہے سو وہ سُنہری زنجیریں ہیں جنہیں انسان اُن کی چمک دمک اور جھنکار سے خوش ہو کر، گھسیٹتا پھرتا ہے، بلکہ وہ پنجرے ہیں، جنہیں انسان نے آفرینش عالم کے ابتدائی دور ہی میں کھپچیوں اور تیلیوں سے بنانا شروع کر دیا تھا، یہ نہ جانتے ہوئے کہ اس کی ان تمام صناعیوں کا ماحصل صرف یہ ہوگا کہ وہ اپنے تئیں ان پنجروں میں مقید پائے ـــــ ہاں انسان کی یہ تمام کارگزاریاں، یہ تمام مقاصد، یہ تمام کامیابیاں، یہ تمام لڑائی جھگڑے اور یہ تمام آرزوئیں باطل ہیں۔ ہاں! دُنیا کی ہر چیز باطل ہے اور زندگی کی ان ساری لغویات میں ایک چیز کے سوا اور کوئی چیز، روح کی رغبت ومحبّت اور شوق و فریفتگی کی مستحق نہیں ہے ـــــ یہاں ایک اور صرف ایک چیز ہے!"

میں نے دریافت کیا: "کیوں؟ جناب! وہ کیا چیز ہے؟"

وہ ایک منٹ تک بالکل خاموش رہا، پھر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرہ پر چمک اور شگفتگی پیدا ہوئی اور لرزتی ہوئی شیریں آواز میں اس نے کہا: "وہ روح کی بیداری ہے، وہ روح کی انتہائی گہرائیوں کی بیداری ہے۔ وہ ایک تصوّر ہے جو غفلت و بے خبری کے لمحوں میں انسان کے احساسات پر اچانک حملہ کر کے اس کی چشم بصیرت کو وا کر دیتا ہے اور زندگی انسان کو نغموں میں لپٹی ہوئی، رنگین حلقوں میں گھری ہوئی اور زمین وغیر محدود فضا کے درمیان ایک نور آگیں

شمع کی طرح کھڑی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ضمیرِ ہستی کے شعلوں میں سے ایک شعلہ ہے جو ان دم روح کے اندر بھڑکتا ہے اور اس خاشاک کو بھسم کر کے، جو روح کو چاروں طرف سے گھیرے ہے، پھڑپھڑاتا ہوا وسیع فضا میں اُڑ جاتا ہے۔ وہ ایک ہے جو قلبِ انسانی پر نازل ہوتا ہے اور وہ جیرت سے تعجب میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ ہر اُس شے کو بے حقیقت سمجھنے لگتا ہے، جو اس کے مخالف ہوتی ہے، ہر اس چیز سے کراہت محسوس کرنے لگتا ہے، جو اس کا ساتھ نہیں دیتی اور ہر شخص کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیتا ہے، جو اس کے رموز و اسرار کو نہیں سمجھتا۔ وہ ایک مخفی ہاتھ ہے، جس نے میری آنکھوں سے پردہ اٹھایا، جبکہ میں اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور ہم وطنوں کے ساتھ اجتماعی زندگی بسر کر رہا تھا، اور میں نے حیران و سراسیمہ ہو کر اپنے دل میں کہا: "یہ کون لوگ ہیں؟ اور ان میری طرف دیکھنے والوں کی حیثیت کیا ہے؟ میں انہیں کیسے جانتا ہوں اور ان سے کہاں ملا ہوں؟ میں ان میں کیوں رہتا ہوں بلکہ میں ان کے ساتھ کیوں اٹھتا بیٹھتا اور کیوں ان سے ہم کلام ہوتا ہوں؟ کیا میں ان میں اجنبی ہوں یا یہ اُس بستی میں اجنبی ہیں، جسے زندگی نے میرے لئے بنا کر اس کی کنجیاں میرے حوالے کر دی ہیں؟"

وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا، گویا گذشتہ زمانے کی یادوں نے اُس کے حافظے میں وہ تصویریں اور دھندلے نقوش تازہ کر دئے ہیں، جن کا اظہار اُسے گوارا نہیں اس کے بعد اس نے بازو پھیلائے اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا: "یہ ہے وہ کیفیت، جو چند سال پہلے مجھ پر وارد ہوئی اور میں دنیا پر لات مار کے، بیدار زندگی بسر کرنے اور فکر، جذبہ اور خاموشی سے مستفید ہونے کے لئے اس ویران جنگل میں چلا آیا۔"

یہ کہہ کر رات کی اتھاہ گہرائیوں پر نگاہیں جمائے وہ خانقاہ کے دروازہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ چلایا، گویا طوفان سے مخاطب ہے: "یہ ایک بیداری ہے، جو روح کی گہرائیوں میں پیدا ہوتی ہے، جو کوئی اسے جانتا ہے، وہ گفتگو کے ذریعہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا اور جو کوئی نہیں جانتا، وہ قیامت تک اس کے بھیدوں کو نہیں پا سکتا۔"

(۴)

ایک طویل ساعت، فکر کی سرگوشیوں اور طوفان کی چیخ پکار سے ہمکلام ہوتی ہوئی گزر گئی۔ یوسف فخری کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتا اور کبھی دریچہ میں کھڑے ہو کر جھنجھلائی ہوئی فضا کو غور سے دیکھنے لگتا۔ لیکن میں خاموش بیٹھا، اس کے روحانی تموجات کو محسوس اور اس کے اقوال کو اپنے حافظہ میں تازہ کر رہا تھا۔ اس وقت میرا موضوعِ فکر اس کی زندگی اور تنہائی کی وہ لذتیں اور تکلیفیں تھیں، جو اُس کی زندگی میں پوشیدہ تھیں۔

رات کا دوسرا حصّہ ختم ہو جانے کے بعد، وہ میرے قریب آیا اور دیر تک مجھے گھورتا رہا، گویا اپنے حافظہ میں اس شخص کے حدود حال محفوظ کر لینا چاہتا ہے، جس پر اس نے اپنی تنہائی اور گوشہ نشینی کا راز ظاہر کیا ہے۔ بالآخر پرسکون لہجہ میں اُس نے کہا: "میں اس وقت طوفان میں ٹہلنے جا رہا ہوں، یہ میری عادت ہے، جس سے میں گرمی جاڑے لذت اندوز ہوتا ہوں، یہ لو سگریٹ اور قہوہ کی کیتلی، اور اگر تمہارا جی شراب کو چاہے تو وہ اس مٹکے میں ہے۔ دیکھو! لحاف اور بستر سامنے اس کونے میں ہے۔ نیند آئے تو آرام سے سو جانا!"

یہ کہہ کر ایک میلا کچیلا سیاہ کوٹ پہنا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا: "مجھے امید ہے کہ صبح کو جاتے وقت تم خانقاہ کا دروازہ بھیڑ دو گے، کیونکہ میں کل سارا دن صنوبروں کے جھنڈ میں گذاروں گا۔"

وہ دروازہ کی طرف گیا اور ایک لمبی لاٹھی ہاتھ میں لے کر بولا: "اگر تم اس خانقاہ کے آس پاس ہو اور طوفان دوبارہ تمہیں گھیر لے، تو یہاں آنے میں مطلق تامل نہ کرنا لیکن مجھے توقع ہے کہ تم خود کو طوفان سے ڈرنا نہیں محبت کرنا سکھاؤ گے ـــــ اچھا! شب بخیر!!"

یہ کہا اور بسرعت تمام وہاں سے چلا گیا۔ میں خانقاہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر دیکھنے لگا کہ وہ کدھر جا رہا ہے لیکن تاریکی نے اُسے میری نگاہوں سے روپوش کر دیا، البتہ تھوڑی دیر تک اُس کے قدموں کی چاپ میرے کانوں میں آتی رہی۔

(۵)

صبح ہوئی، طوفان فرو ہو چکا تھا اور بادل چھٹ گئے تھے

ردگرد کی چٹانیں اور میدان سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے
ے خانقاہ کے دروازہ میں قفل لگا یا اور اپنی روح میں
س معنوی بیداری کا ایک گہرا اثر لے کر واپس ہوا، جس کے
متعلق یوسف فخری نے اس قدر شدت سے اظہارِ خیال کیا تھا۔
لیکن جب میں آبادی کے قریب پہنچا، لوگوں کو چلتے
تے دیکھا اور ان کی آوازیں میرے کانوں میں پہنچیں
ٹھہر گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا۔ "بے شک! روح کی بیداری
ان کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے بلکہ وہی ہستی کی
ہے۔ لیکن کیا تمدن اپنے مختلف لباسوں اور صورتوں
ساتھ روح کی بیداری کا ذریعہ نہیں ہے؟ ہم موجودہ حقائق
کیوں کر منکر ہو سکتے ہیں، جبکہ اُن کا وجود ہی اُن کے
کار نامہ ہونے کی مکمل دلیل ہے۔ ہو سکتا ہے، کہ موجودہ تمدن
زوال پذیر عرض" ہو، لیکن ناموس ابدی نے "اعراض"
ایک زینہ بنایا ہے، جس کی سیڑھیاں "جوہرِ مطلق" پر جا کر
ختم ہوتی ہیں۔"
اس کے بعد میں پھر کبھی یوسف فخری سے نہ مل سکا،
کیونکہ زندگی کی ضروریات نے، مجھے اس موسم خزاں کے آخری
دن میں، شمالی لبنان سے کھینچ کر ایک دور دراز ملک
ڈالا، جہاں کے طوفان تیرہ و تار ہوتے ہیں لیکن
تجرد، جنون کی ایک قسم ہے۔ (جبران خلیل جبران)

"رُسوائی"

پروانے کی نگاہ میں رقصاں تھا ایک راز
یہ راز قیدِ راز میں رہتا تو خوب تھا
لیکن۔ ضیائے شمعِ غم افزوں نہ پوچھیے!
پروانہ جل مرا!!

ذرّے کی آفتاب کے آگے بساط کیا؟
اک عالمِ عدم تو جہانِ ظہور ایک،
لیکن۔ ظہورِ مہر کا تسخیر نہ پوچھیے!
ذرّہ بکھر گیا!!

میں تو نیاز وقفِ ستم ہائے ناز تھا
میری نگاہ میں بھی تقاضائے راز تھا
لیکن۔ وہ شامِ مرگ کا افسوں نہ پوچھیے!
آنسو ڈھلک پڑا!
پروانہ جل مرا!!

مانا طلوعِ مہر سے ذرّہ بکھر گیا
لیکن یہ راز، راز ہی رہتا تو خوب تھا

فیضی جالندھری

کلن نے کہا۔ "بہت اچھا جناب، آج ہی ایک پٹھا کھڑک دار اور بہت کڑوے مزاج کا پکڑا ہے اس کا ہنر دکھاؤں گا۔ اگر ہاتھ یا نگاہ چوک گئی بہت کرے گا کاٹ لے گا مر جاؤں گا میرا کیا ہے نہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔" یہ کہہ کر میاں کلن نے ایک چھوٹی سی گھڑیا سامنے رکھی پہلے آہستہ سے اوپر کا کپڑا کھولا اور اس کو ہاتھ پر لپیٹ لیا پھر آنکڑے سے آہستہ سے ڈھکنی اٹھائی مگر سانپ نہ نکلا انہوں نے آنکڑا گھڑیا میں ڈال ایک جھٹکا دیا سانپ بجلی کی طرح ... سے زیادہ کھڑا ہو گیا۔ کلن نے پھرتی سے وہ ہاتھ جس پر کپڑا لپٹا ہوا تھا اس کے آگے ہلانا شروع کیا۔ ان کی نگاہ سانپ پر گڑی ہوئی اور کپڑے والا ہاتھ برابر گھنٹے کے لنگر کی طرح ہل رہا ہے۔ سانپ بھی ہلتے ہوئے ہاتھ کی طرح جھومنے لگا جتنی سرعت سے ہاتھ ہل رہا تھا سانپ بھی اسی قدر جھومتا جاتا تھا۔ اب اس کو مسمریزم کہئے یا جادو کہئے یا ہنر اور آرٹ سانپ کو ادھر محو کر کے پھر دوسرا ہاتھ آہستہ آہستہ بلند کر کے خود سانپ کی طرف کھسکنا شروع کیا۔ ... کلن کی عدیم المثال جی داری اور بہادری کا شاہد تھا۔ جب وہ نپے تلے اندازے کے مطابق سانپ کے کافی قریب پہنچ گئے تو بلند کیا ہوا ہاتھ آہستہ آہستہ سانپ کی پشت کی طرف لے گئے اور یہ ہاتھ جب پھن کے قریب پہنچ گیا تو ہلتے ہوئے ہاتھ کو سانپ کے منہ پر مارا ادھر سانپ نے بلبلا کر ہاتھ پر پوری قوت سے چوٹ کی ادھر دوسرے ہاتھ نے جو پشت کی طرف تھا سانپ کے منہ کو دبوچا اور اوپر اٹھا لیا۔ سانپ دم کی طرف سے لپٹنا چاہا مگر کلن نے فوراً پاؤں سے دم دبا لی پھر سانپ کے جبڑے دبا کر منہ کھولا اور اس میں ایک دیاسلائی کا تنکا کھڑا کر کے اڑا لیا جس سے سانپ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر اس کے دانت اور زہر کی تھیلی ناظرین کو خوب دکھا دی۔

کلن نے اپنی زندگی میں ہزارہا سانپ پکڑ پکڑ کر گھروں اور محلوں کو خطرے سے پاک کیا مگر کبھی کوئی سانپ مارا نہیں ان کے سانپوں کو گرفتار کرنے کا آرٹ جس قدر دلچسپ تھا اس سے کہیں زیادہ المناک ان کی موت کا واقعہ ہے۔ کلن اپنے حمام کی تیسری منزل پر خود رہا کرتے تھے اور اسی جگہ اپنے سانپوں کے مٹکے ٹھلیاں بھی رکھے رہتے تھے موت کا واقعہ یوں ہوا کہ ایک شب موسم برسات میں میاں کلن اوپر چھت پر سو رہے تھے کہ زور کی بارش آئی وہ بغل میں بستر اور ہاتھ میں چارپائی لے کر اس قدر بھاگے۔ کچھ تو نیند کا غلبہ کچھ اس کی گھبراہٹ ان کو راستے کی اٹکل نہ ہوئی اور اسی حالت میں چارپائی کا پایا زور سے لگا مٹکا پھوٹا اور سانپ نکل کر بھاگا اندھیرے میں ان کا پاؤں اس پر پڑا اور اس نے پلٹ کر ان کی پنڈلی میں کاٹا اور وہ آناً فاناً میں ختم ہو گئے۔ صبح کے وقت حسب دستور جب حمام میں نہ آئے تو ان کا ملازم اوپر گیا اس نے دیکھا کہ ایک طرف مٹکا پھوٹا پڑا ہے سانپ غائب ہے اسی جگہ کلن پڑے ہیں دوسری طرف چارپائی الگ بستر الگ پڑا ہے۔ اس کے شور و غل سے اور لوگ اوپر آئے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کلن نہیں کلن کی لاش ہے چہرہ اور سارا بدن نیلا ہو گیا ہے پنڈلی میں جس جگہ کاٹا اس جگہ دانتوں کا نشان اور ورم موجود تھا اور سارا جسم اکڑ گیا تھا آج کلن بیچارے کا نام باقی ہے۔ اور جب کبھی محلہ یا کسی گھر میں سانپ سانپ کا غل سنائی دیتا ہے تو میاں کلن کی صورت اور ان کے تمام کرتب آنکھوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ اللہ بس باقی ہوس

آخر یہ سب کچھ کیوں؟

سرلا دیوی

اور تمہارے اس رسمی شکوہ کے جواب میں کہ میں نے
تم کو اب تک خط کیوں نہ ڈالا مجھے چند غیر رسمی باتیں کہنی
رہی ہیں جن کی تم کو توقع بھی نہ ہوگی۔ آخر میں تم کو خط
کیوں ڈالتی تم میرے کون ہو؟ — نہیں معلوم تم کو یہ غلط فہمی
پیدا کس طرح ہوئی کہ شاید تمہاری یاد میں میرے رخساروں
کی سُرخی خزاں کی زردی میں تبدیل ہوگئی ہوگی اور میرا جسم
سوکھ کر کانٹا بن گیا ہوگا۔ میرے گھر سے نکالے جانے کے
بعد بھی تم نے ایسا خیال کیوں کیا؟ یہ عام انسانی سمجھ سے
کی بات معلوم ہوتی ہے۔ مجھے تم آج تک یاد نہیں آئے
اور پھر کسی کی یاد میں گھل گھل کر مرنا مجھے یوں بھی پسند
نہیں۔ تم شاید سوال کر بیٹھو ان معاملات میں پسند ناپسند
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا — مگر مجھے تمہارے سوالوں
سے مطلب ہی کیا؟ زندگی کچھ ایسا معمہ ہے جس کو سمجھا نہیں
جا سکتا اور پھر میں تو ایک معمولی سی لڑکی ہوں۔ میری مجال
کہاں۔ میں تو خود ہی زندگی کی روانیوں میں موتی تلاش
کرتے ہوئے بارہا سخت چٹانوں سے ٹکرا چکی ہوں۔ مجھے
اس لئے ان لوگوں سے سخت نفرت ہے جو ایک عام حقیقت
اور معمولی حادثہ کو اہمیت دینے کے عادی ہوتے ہیں۔ تم نے
اس حقیقت کا اظہار کیا ہے اور میرے جس جذبے کو خطاب
کرنے کی کوشش کی ہے وہ عامیانہ ہے اور زندگی کے دیگر
مسائل کے مقابلے میں کسی شخص کے قیمتی وقت کا حقدار
نہیں ہو سکتا۔ میرے لہجہ کی تلخی کا ذمہ دار یہی نظریہ
ہو سکتا ہے۔ میرے دل میں تم سے نفرت کا جذبہ نہیں لیکن
اس کے معنی تم یہ نہ سمجھ لینا کہ مجھے تم سے اُلفت ہے لیکن
کوئی جھجک راہ میں حائل ہے — کیونکہ مجھے معلوم
ہے تم عورتوں کے بازاری اور عامیانہ اصولوں پر نہ صرف
اعتماد رکھتے ہو بلکہ اُن کو عملی جامہ پہنانے کی بارہا
کوشش کر چکے ہو۔

تم نے لکھا "میری شادی ہوگئی میری بیوی از حد حسین ہے"
یہ پڑھ کر نہ تو میرے اندر رشک پیدا ہوا اور نہ تعجب۔ تعجب
نہیں رمیش معاف کرنا مجھے بہت زیادہ تعجب ہوا۔ میں ڈر رہی
تھی کہ تم — بُرا مت مان جانا رمیش تم کو میری سمجھ میں
تو یہی تھی کہ تم اس دُنیا میں نہیں ہو۔ جب تم میرے گھر سے
نکالے گئے تھے تب تمہاری حالت بڑی نازک تھی۔ کہنے کو تو
تم ایم۔ اے تھے مگر نہ جانے قابلیت تمہارے اندر کیوں نہ
تھی۔ اسی لئے تم کو کئی جگہ سے نکال دیا گیا تھا اور جب میرے
گھر سے تم رومانی بہادری (معاف کرنا مجھے DANDYISH
کا ترجمہ نہیں آتا) کی بنا پر باہر کر دئے گئے تو تم کو اپنی زندگی
کی زیادہ اُمید نہ تھی۔ مگر اب تم ایک حسین بیوی کے مالک
ہو — مجھے نسوانی حسد پیدا نہیں ہوا۔ تم کو یاد ہوگا
وہ تھومنشی جس کی صورت سے تم کو چڑ تھی۔ پچاس سال
کی عمر میں شادی کر کے ایک انتہائی حسین لڑکی گھر میں لایا
ہے۔ پھر تم نے کیا میدان مارا۔ تم کپتان ہو — مجھے تمہارے
کھونے کا افسوس نہیں۔ لڑائی کا زمانہ ہے انسانی مغز
میں فطری درندگی کا ذرا سا ثبوت قصابی کے کام میں
ذرا سی دسترس تم کو جنرل تک بنا سکتی ہے۔ مگر ایک
ہندوستانی لڑکی پر جیسے بنگال کے قحط کا اثر پڑتے نوجوان
اور غلام انسانیت کا ذرا سا بھی تصوّر ہے تم زیادہ [illegible]
نہیں ہو سکتے۔

تم نے شادی کر لی۔ بھلا یہ لکھنے کی تمہیں کیا ضرورت
تھی۔ اگر کوئی بڑا کام کرتے تو میں مرعوب ہو سکتی تھی مبارک
باد دے سکتی تھی مگر ہندو قوم میں پیدائش کا لازمی نتیجہ
ہی شادی ہے بشرطیکہ موت اس سماجی نظام میں حائل
نہ ہو جائے۔ تم زندہ ہو — یہ خبر ہی مجھ کو تمہارے
انجام سے آگاہ کر دیتی۔ تم کہہ سکتے ہو تم کو رشک بلکہ حسد
ہو رہا ہے۔ بیوقوف مت بنو رمیش۔ تم دو چار غلام پیدا
کر دوگے اور کیا معرکہ مار سکتے ہو۔ ہندوستان میں کاش
تم کوئی تعمیری کام کرتے۔ قوم اور آزادی کے نام پر خود کو قربا

کر سکتی جب میں مشک کر سکتی تھی۔ محبت کر سکتی تھی۔ لڑکیوں کی کیا کمی۔ دو چار اور شادیاں کر لو۔ وقت سے اطلاع دو گے تو کچھ تحفہ ضرور بھیج دوں گی۔

ہمارے یہاں جہاں لڑکی جوان ہوئی والدین نوجوان لڑکوں یا ان کے عزیزوں اور مصاحبوں کو دکھاتے پھرتے ہیں "قبول کر لیجئے۔ رنگ برف کی طرح سفید ہے جسم میں گداز گوشت۔ اس کے ساتھ یہ زیورات یہ کپڑے۔ یہ عمر بھر کی غلامی، فرمانبرداری کا عہدنامہ" اور عورتیں بیکار اشیاء کی طرح جامد رہتی ہیں۔ مسکراتی رہتی ہیں۔ کاش یہ مسکراہٹ ایک شعلہ بن جائے۔ ایک بجلی بن کر کوندا اٹھے ــــــ مگر نہیں مجھے اپنے الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔ اتنی زیادہ بغاوت اچھی نہیں ہوتی۔ کیوں رمیش یاد ہے۔ تم کو وہ محاورہ جو تم مچھلی ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر خود بخود یا اپنے دوستوں میں دہرایا کرتے تھے "آخر بچ کر کہاں جائے گی۔ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر۔ ارے یار تم کیا کہتے ہو۔ یہ لڑکی ..... دیکھنا سو چوٹ سنار کی ایک چوٹ لوہار کی" ــــــ ہندوستانی محاورہ گھڑنے میں نہ صرف ادبی صلاحیتوں کا ثبوت دیتے ہیں بلکہ سماج کے ٹھوس بنیادی حقائق اور ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔

تم حسین بیوی پا کر خوش نہیں ہو اور اس شادی کے بعد تم حد درجہ کے شکی مزاج ہو گئے ہو۔ گھبرا مت جانا کیونکہ جو کچھ میں لے کہا وہ کچھ خطرناک طور پر سچ ہے۔ مجھے معلوم کیسے ہوا۔ مجھے کس نے بتایا۔ میں جوتش یا رمل کی ماہر نہیں۔ اس علم کے ماہرین سے میرا اس لئے واسطہ نہیں کہ میری شادی نہیں ہوئی۔ میرا شوہر کسی دفتر میں عارضی کلرک نہیں کسی دوسری عورت کے دام میں گرفتار نہیں۔ دشمنی کرنے مستری کی ضرورت نہیں۔ لڑکیوں کی افراط نہیں۔ لڑکوں کی خواہش نہیں ــــــ پھر آخر میں نے کیسے تمہارے بارے میں جان لیا؟ ..... جب شام کو تمہارے دوست غیر معمولی خلوص کا اظہار کرتے ہوئے بہترین سوٹوں میں ملبوس تمہارے گھر میں داخل ہوتے ہی "بھابی جی نمستے" کہتے ہونگے تب کیا تم جل بھن کر خاک نہ ہو جاتے ہو گے؟ جب وہ لوگ تمہاری بیوی کی جھوٹی تعریف کرتے ہونگے تب کیا تمہاری کنپٹیاں نہ جلنے لگتی ہوں گی۔ منہ نہ تمتما اٹھتا ہوگا۔ سرخ بندر کی طرح۔ اور کھڑے ہوئے پہلوان کی طرح تم کوچ پر دو تین بار جھول کر بے حد سنجیدہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوتے ہوگے اور نیم طنزیہ انداز میں ان دوستوں سے کہتے ہوگے "اچھا یار ایسا کیوں زیادہ آسمان پر چڑھاتے ہو۔ مگر بیوی کے حسین چہرے پر شعلہ ساماں آنکھیں دیکھ کر تم پٹے ہوئے کتے کی طرح دُم ہلاتے ہوئے کہتے ہوگے "ہم چھا ڈارلنگ اب چلو سینما کا ٹائم ہو گیا" ــــــ کیا ہوا سانس پھول گیا پیشانی پر رومال بار بار پھرنے لگا۔ معاف کرنا غیرارادی طور پر میں تمہاری شادی کے معاملہ کو یہاں تک کھینچ لائی۔ غیر شعوری طور پر۔ کیونکہ مجھے تم سے یا تمہاری شادی سے دلچسپی ہی کیا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ تم وہمی اور شکی مزاج ہو گئے ہو گے۔ تم غصہ کی شدت اور بیوی کے حسن کی وجہ سے خاموش بھی رہتے ہو گے۔ مگر رمیش تم آپے سے باہر مت ہو جانا کیونکہ اسی غصیلی عادت کی وجہ سے تم اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کو چھوڑ کر شہر چلے آئے تھے۔ تم بی۔ اے پاس کرنے کے بعد شہر میں رہ کر ایم۔ اے پاس کرنا چاہتے تھے اور روٹیوں کی تنگی کی وجہ سے تم اپنی ماں اور بہن کو بھی شہر لانا چاہتے تھے ماں نے تم کو بہت سمجھایا۔ "بیٹا! اگر تیرا باپ زندہ ہوتا تو تجھے ایم۔ اے بھی کرا دیتا۔ شہر میں بھی جا کر بود و باش کر لیتا مگر اب تم ہی خود دیکھو گھر بار زمین، جائداد چھوڑ کر ہم کہاں جائیں اور کون اس کا انتظام کرے۔ . . اور پھر یہ تیری بہن۔ دو چار سال بعد شادی کی فکر کرنی پڑے گی۔ بانس کی طرح بڑھتی چلی آئی ہے۔ اور میں . پھونس کی آگ کا اعتبار ہی کیا .... اور پھر تیری شادی ــــــ دیکھ کل ہی تو جگو کی ماں اپنی لڑکی کے لئے کتنا زور دے کر گئی تھی" مگر تم ایک نہ مانے۔ شہر اور کالج کے سپنوں پر تمہاری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ تم لحاف اُدھیڑتے ڈرامائی انداز میں کھڑے ہو گئے "ماں میں ایم۔ اے پاس کروں گا۔ شہر جا کر رہوں گا۔ مجھے جگو کی بہن سے نفرت ہے"

کسی دن پھر چہکنگے ہوں۔ میں ڈپٹی بنوں گا" اور ایک ڈپٹی کی طرح تم گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

تم نے ایم۔ اے کیسے پاس کیا مجھے نہیں معلوم۔ مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ تم ڈپٹی نہ بن سکے۔ ہر نوجوان ڈپٹی کلکٹر اور آئی۔ سی۔ ایس بننے کے خواب دیکھتا ہے منصوبے باندھتا ہے۔ میں انکو قصوروار نہیں بتاتی۔ ہر انسان بلندیوں میں پرواز کرنا چاہتا ہے اور خود زندگی ایک خواہش پرواز ہے۔ اور پھر ہم لڑکیاں کیا کم ہوائی قلعے بناتی ہیں۔ جو لڑکی ذرا پڑھ لکھ گئی اگر ڈپٹی یا کلکٹر نہیں بن سکتی تو کم از کم ڈپٹی اور کلکٹر شوہر کی تلاش میں رہتی ہے۔ رنگین خواہش کون نہیں کرتا خواہش جرم نہیں مگر یہاں ہمارے نظام میں یہ گناہ ہیں جرم ہیں۔ یہاں تو صرف سنگلاخ چٹانیں ہیں۔ چیخیں ہیں۔ خون کی مہیب دھاریں ہیں۔ زندہ رہو۔ بھوکے رہو۔ ننگے پھرو۔ محرومیت۔ خواہش نہ کرو۔ بغاوت نہ کرو۔ خودکشی جرم ہے زندگی خدا کی دی ہوئی امانت ہے۔

ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد تم دو چار مہینے ادھر ادھر پھرتے رہے۔ کسی بھی کالج میں تم کو پروفیسری نہ مل سکی، کلرکی کی تلاش نے تم کو اس سبق کا احساس عملی طور پر دلایا جو تم نے خشک کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ ہندوستان پینتیس کروڑ انسانوں کا ملک ہے اس ملک کے انسان جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں پرانے زمانے میں لوگ اسے سونے کی چڑیا کہتے تھے ... اس ملک کے باشندے آجکل آدھا کھانا پاتے ہیں۔ آدھا کپڑا میسر ہوتا ہے۔ ... بمبئی کی گلیوں کے فٹ پاتھ رات کے وقت فقیروں اور مزدوروں سے بھر جاتے ہیں۔ نئی دلی کی سڑکیں کشادہ ہیں یہاں کی عمارتیں عالیشان اور وہاں کے باشندے موجودہ حکومت کے رکن ہیں۔ خیر۔ اس عرصہ میں تمہارے خواب اور خمار دونوں اتر گئے۔ تم دنیا کی سطح پر آکر حقیقت کا جائزہ لینے لگے۔ تم کہو گے یہ خط ہے یا گالیوں کا چارٹ۔ نہیں مسٹر یہ گالیاں نہیں۔ گالیاں اُن کو دی جاتی ہیں جن سے ہمدردی نہ ہو۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے ——— ورنہ یہ خط تم کو کیوں لکھتی۔

میں نے تم کو پہلی بار اپنے پتاجی کے کمرے میں دیکھا۔ اُن دنوں میرے پتاجی کو ایک منیجر کی ضرورت تھی۔ بیکاری ہندوستانی خاندانوں میں بچوں کی طرح ہر جگہ نظر آتی تھی۔ ایک اُلّو کی طرح میرے پتاجی سینکڑوں نوجوانوں کو روزانہ دیکھ بھال جانچ کر کے بالآخر سر ہلا کر واپس بھیج دیتے گویا قیامت کے دن سے پہلے ہی فرشتہ انسانی نجات کا کام کر بیٹھے تھے تم بھی ملنے آئے۔ نہ جانے وہ کون سی ادا تھی۔ میرے پتاجی کے تم من بھا گئے۔ اگست کی پہلی پھوار نے گویا تمہاری زندگی میں سونے اور پیسے کی تانیں بھر دیں۔ تم پچاس روپے کی نوکری پاکر ناچ اٹھے۔ تمہاری اس حالت کو دیکھ کر میرے لبوں پر مسکراہٹ کئی بار ناچی اور بدتمیزی خیال کر کے میں نے اسے دبانے کی پوری کوشش کی، جس کو تم عورت کی حیا اور کامنی کی لاج سمجھ کر نہال ہو گئے۔ تم نے خیال کیا چلو ایک پنتھ دو کاج۔ اس دن کے بعد تم ایک سود خوار کے کارندے کی طرح میرے آگے پیچھے لگے رہنے لگے۔ دیکھو عذر پیش کرنے کی کوشش مت کرو۔ آخر ایک نوجوان لڑکی ایک اجنبی کو دیکھ کر جب ہنسے اور شرما جائے تو وہ محبت نہیں ہوتی کیا؟ تمہارا یہ جواز تمہاری غلط فہمی کی پیداوار ہے۔ آج جب اس واقعہ کو آٹھ سال گذر گئے تو میں اپنے کو زیادہ سمجھدار اور سنجیدہ پا رہی ہوں ابھرتے سورج کی طرح زندگی کے تجربات نے مجھ پر تمام حقائق اور پیچیدگیاں روشن کر دی ہیں۔ اس زمانے میں چنچل تھی۔ "ہائے رام کیسی دانتوں کی نمائش کرتی ہے یہ لڑکی۔ ہائے ہائے لڑکوں سے کیسی پٹر پٹر باتیں کرتی ہے"؟ ہر وقت مسکرانا اور خوش رہنا میری عادت تھی۔ کھلتی ہوئی کلی کا تبسم۔ اٹھتی ہوئی لہر کا قد۔ اور ڈولتی کشتی کا تموج میرے دل میرے دماغ میری روح کی تال تھی۔ مسکرانا اور خوش رہنا آج بھی میرے نزدیک گناہ نہیں۔ مجھے ان لڑکیوں سے نفرت ہے جو گھٹتی رہتی ہیں۔ کنکھیوں سے کسی لڑکے کو دیکھا اور بھاگتے ہوئے اپنی پنڈلیاں دکھاتی گھر میں جا کر دبک گئیں۔ تم اس شرمیلی سی لڑکی کو جانتے ہو ——— ہاں کمل۔ میرے پڑوس میں رہتی تھی۔ وہ کتنی شرمیلی تھی۔ کسی کو سڑک پر دیکھا اور بس سر جھکا۔ سینہ چھپایا۔ ہاتھ اوڑھنی کے اندر کئے۔ گردن جھکالی۔ ٹانگوں میں لڑکھڑاہٹ پیدا کی اور تمسخر [illegible] کر دیا۔ اگر کسی نے چلتے چلاتے کوئی فقرہ کس دیا تو تم سے [illegible]

[illegible] چلیے، آپ قریب سے گھور کر دیکھنے لگا..." اور وہ ہر لڑکے
[illegible] کہ کم از کم آٹھ دن تک تو اسے" اور مرے کے ساتھ میری آتی
رہی۔ وہ میرے ساتھ گھومنے جاتی تھی۔ تم کو خوب یاد ہوگا کہ محلے
کی تمام لڑکیاں شام کو چھ بجے کر اس نیچی تارکول کی سڑک پر
سیر کرنے جایا کرتی تھیں۔ رنگ برنگی ساڑھیوں میں ملبوس۔
شام کو مغرب میں پھوٹتی ہوئی رنگ برنگی شفق کے گالوں کی
طرح... میں شام کو بغیر سیر کئے نہیں رہ سکتی۔ تمام دن کام
کرنے کے بعد جب گھروں میں دھواں گھٹ جاتا ہے، تاریکی
پھیلنے لگتی ہے تب مغرب میں کندن سیال ہو کر لہرانے لگتا ہے
قوس قزح کے تمام رنگ بادلوں کو شرابور کر کے آسمان کو
ایک ایسے گھاٹ کی مانند بنا دیتے جہاں میلوں تک رنگ
برنگی چندریاں اور دوپٹے سوکھ رہے ہوں درختوں کی
پتیاں خاموش ہو جاتی ہیں۔ پیڑ ساکت کھڑے رہتے ہیں۔
گویا بھیم کی رنگ شالہ کو وہ معصوم ننھے بچوں کی طرح
دور کھڑے خاموش دیکھ رہے ہیں ——— اس وقت
میں باہر جانا چاہتی ہوں۔ ایک معصوم لڑکی کی طرح اس رنگ
شالہ کو جی بھر کر دیکھنے کیلئے۔ ہاں تو وہ میرے ساتھ ٹہلنے
جاتی تھی۔ سڑک پر وہ سامنے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی تھی محلے
کی بوڑھی عورتیں اُسے تمثیلاً پیش کرتی تھیں" ارے دیکھ
کمل بھی تو ہے۔ ماں باپ کی آنکھوں میں پلتی ہے جب تک
زبردستی کوئی نہ لے جائے سیر تک کو نہیں جاتی"

اور ایک دن جب اُس کی ماں اور چھوٹے بھائی بہن
کہیں گئے ہوئے تھے تو میں یونہی اپنے گھر سے نکل کر کمل کے
گھر میں داخل ہو گئی۔ سامنے کی کوٹھڑی کے کواڑ بند تھے مگر
درزوں میں سے روشنی کی دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ میں
آگے بڑھتی چلی گئی اور کوٹھڑی کے کواڑوں کو دھکا دیا ———
کمل اپنے نوکر کے قریب چارپائی پر پڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی
وہ چیخ کر اٹھ بیٹھی "دیکھو یہ میرے ساتھ سینہ زوری کر
رہا ہے۔ مجھے زبردستی چارپائی پر گرا دیا اور اب..." لڑکیوں
کی ان پوشیدہ حرکات کا بیان لڑکوں کے سامنے زیبا نہیں
مگر میں بتاتی ہوں چار دیواری میں رہنے والی گھٹتی ہوئی
[illegible] اور وہ کمزوری زیادہ محسوس کرتی
[illegible] کو جنسی شہوت دیتی ہے۔ تم اپنی بیوی کے ساتھ
تنگ نظری کا برتاؤ نہ کرنا۔ کہیں اس سے ہاتھ دھو بیٹھو۔

مجھے اب بھی ہنسی آ رہی ہے ——— تم کتنے تنگ نظر اور پست
خیال کے انسان ہو۔ تم مرد مسکراتے ہو، ہنستے ہو قہقہے لگاتے
ہو تب تمہارا مطلب خوشی کا اظہار، طنز۔ نفرت۔ زہر خند، ہمارا
اور صاف باطنی ہوتا ہے۔ مگر عورت کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی
اور تم دفتر سے بھاگے بے تحاشا۔ "ابے رشید۔ او رشید
یار میدان مار لیا ——— کہا تھا نہ تجھ سے ——— یہ سوٹ کام کر گیا
عبداللہ کے یہاں کا سوٹ سلا ہوا تھا۔ آج تو مالک کی لڑکی
مر مٹی ——— مسکرا کر دیکھا تھا۔ جب دیکھتی ہے ہونٹوں پر مسکراہٹ
بجلی کی طرح سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ اچھا ہاتھ مارا اسی بات پر
لے اب چلا" تم نے سوچا تھا چلو پیٹ کی آگ اور من کی پیاس
دونوں بجھ جائیں گی۔ مگر رتیش نہ آگ بجھتی ہے اور نہ پیاس۔
آگ اور پانی کے اس پتلے کی پیاس نہیں بجھتی۔ وہ بڑھتی جاتی
ہے۔ بھڑکتی جاتی ہے یہاں تک کہ موت کے بعد بھی اسے آگ کی
ضرورت ہوتی اور اس کی راکھ کو پانی کی۔

اور وقت گزرتا گیا۔ تم پر نکالنے لگے۔ پتاجی تم کو پیار
کرنے لگے۔ مگر مجھے ہر وقت محسوس ہوتا تم ایک خوفناک
ہستی ہو۔ جب کبھی میں پتاجی کے کمرے میں جاتی تم کسی بڑے
ہوٹل کے بیرہ کی طرح میرے سر پہ چڑھ کر کھڑے ہو جاتے
اور جب کتروں کی سی نگاہیں مجھ پر ڈالنے لگتے مگر میں
تمہاری طرف نہ دیکھتی۔ تم کو بہت غصہ آتا ہوگا رتیش۔
تمہاری خواہش تو یہ تھی کہ میں اپنا VANITY PURSE
ہوا میں اچھالتی ہوئی کمرے میں داخل ہوؤں اور پتاجی کو نکال
ہوئی تم کو اپنی بھوؤں سے خطاب کروں اور تم ایک نئے بھرتی
شدہ رنگروٹ کی طرح کرسی میری طرف بڑھا کر تن کر کھڑے
ہو جاؤ، اور میں اسی وقت اپنا رومال گرا دوں اور تم

تمہاری ناامیدی اب تمہاری آنکھوں میں انگاروں کی
طرح سلگنے لگی۔ تم میری بس کے قریب جا کر کھڑے ہونے لگے [illegible]
شام کو جب میں لوٹتی تو کمرے کی کھڑکی پر کھڑے ہو کر تم مجھے دیکھتے
ہی شاعری کو نوازنے لگتے۔ "دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے" مگر
مجھے اس گانے سے ازحد چڑ ہے۔ میرا خون اس گانے کو سن کر
اٹھتا ہے۔ مرد کبھی دیوانے بنتے ہیں؟ وہ جب دیوانے بنتے ہیں تو
خاص مقصد کیلئے شعوری طور پر۔ شاید اپنے مدِمقابل کو محسوس

سے مقابلہ کرنے کے لئے مردوں کی بےشعوری دیوانگی ایک لازمی ہنر ہے عورتیں اس دیوانگی کا ہمیشہ شکار ہوتی آئی ہیں خیر جہاں تک میرا تعلق تھا میں تمہیں دیوانہ بنانا نہیں چاہتی تھی۔ سمجھدار ہو کر تم نہ جانے کس اعلیٰ معیار کا ثبوت مجھے دینا چاہتے تھے۔ تمہاری دیوانگی بڑھتی گئی اور فحاشی کے رنگ میں جلوہ گر ہونے لگی۔ تمہاری آنکھوں میں مشعلیں سی جلنے لگیں اور مجھے محسوس ہوتا تم شعلیں لئے دیوانہ وار میرا تعاقب کر رہے ہو۔ تم دوڑ رہے ہو۔ تم نے موہنی کو جلا دیا تھا اور اب میری طرف۔

اور اُس دن جب تم گھر سے دفتر کی طرف آ رہے تھے تمہاری حجامت بڑھی ہوئی تھی تم اُداس سے تھے۔ خاموش۔ شاید دیوانگی کا دوسرا دورہ شروع ہو رہا تھا تمہاری حرکتوں کا علم میرے بھائی کو ہو گیا تھا اور تم اپنے انجام سے آگاہ ہو گئے تھے۔ اب تمہاری ٹائی کی گانٹھ ڈھیلی رہنے لگی تھی اور شاید کنگھا پیچھے گر گیا تھا کون اُٹھائے چلے سمی دو۔ مجھے دیکھ کر اب تم شعر نہ پڑھتے تھے مگر ہونٹ ضرور پھڑپھڑاتے مے تم مجھے گالیاں دینا چاہتے تھے۔ اور پھر ایک دن تم خرابی کا مُنہ دیکھتے رہ گئے تھے تمہارا حساب صاف کر دیا گیا تھا۔

اور میرے گھر سے جب تم نکلے تو شام ہو چکی تھی اور ہر طرف تاریکی مُسلط تھی، تم کھوئے ہوئے اُس لمبی سڑک پر چلے جا رہے ہو گے۔ خاموش معصوم مگر انتقام کی ایک ہلکی سی خواہش تمہارے اندر سڑک پر پھینکے ہوئے سگریٹ کی طرح سلگ رہی ہوگی۔ مندی، زخمی، بے کاری، تاریکی، جنون، انتقام، مجبوری تمہارے قدم تمہیں غیر شعوری طور پر ریل کی پٹڑی کی طرف لیجا رہے ہونگے۔ دُور سے ریل کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی ہوگی۔ تم نے اپنا سر پٹڑی پر رکھ دیا گاڑی قریب آتی گئی۔ گڑر گڑر ر ر۔ کون، وہ کہانی کے فرشتہ کی طرح کسی نے تمکو اُٹھا لیا تم نے مڑ کر دیکھا۔ تم چلائے "مجھے جانے دو۔ میں زندہ رہنا نہیں چاہتا!" اور اس کے چند منٹوں بعد تم بھرتی کے دفتر میں سینہ پھلا کر چھاتی کی ناپ دے رہے ہو گے "پاس" تمہارا آخری "اپنی اُجرت کے دس روپے لے کر مسکراتا چلا گیا ہوگا۔ اور تم "سادیا میں کیپٹن ہوں میں نے شادی کر لی ہے میری تنخواہ چھ سو روپے ہے۔ میری بیوی انتہائی حسین ہے"۔

سوچ

میں یہاں بیٹھی ہوں تنہا اور اُداس
سوچ کے دریا میں ہوں ڈوبی ہوئی
کاش تم ہوتے یہاں میرے قریب!

میں یہاں ہوں
تم کہاں ہو؟
تم بھی کیا تنہا ہو میری ہی طرح؟
یا تمہارے ساتھ ہے اب دوسری لڑکی کوئی!؟

تم اگر ہوتے یہاں میرے قریب
اور کوئی بھی نہ ہوتا آس پاس
میں تمہارے رُخ پہ لہراتی ہوئی
دیکھتی رنگین جذبوں کی بہار

کیا کبھی تم نے بھی چاہا ہے یہی؟

ضیا فتح آبادی!

اضلاع بلند شہر و میرٹھ کے چند دیہاتی گیت

گیلکس امریکہ کا ایک مشہور نقاد کہتا ہے کہ ادب اظہار کا نام ہے۔ لوگوں نے اس لفظ "اظہار" کو بہت زیادہ توڑا مروڑا ہے۔ کسی نے اپنی روح کا اظہار کیا ہے۔ کسی نے جذبات کے اظہار کے نام سے یاد کیا ہے۔ لیکن ان سب میں لفظِ اظہار مشترک ہے۔ خواہ اسے کوئی حسین اظہار کی ترکیب میں ڈھال کر کہے۔ یا کسی اور طرح۔ پھر ادب کی مختلف اصناف ہیں۔ ناول۔ ڈرامہ، افسانہ، انشائے لطیف، مضمون، مزاح، تنقید، شاعری وغیرہ وغیرہ۔ گاؤں والوں کو نہ ادب کا پتہ ہے اور نہ انہیں لفظِ اظہار کی مختلف تعبیرات کا۔ ان کے لئے زندگی کی رفتار بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دیہات میں زندگی رُک رُک کر ملتی ہے اور بڑے طویل عرصہ میں اپنی کینچلی بدلتی ہے۔ اس لئے ان کی زندگی میں ٹھہراؤ بہت ہے۔ اور یکسانیت بھی۔ مگر ان کی روح بھی تو اظہار کے لئے بے تاب ہے۔ لیکن اُن کے یہاں یہ اظہار دو ہی طرح راہ پا سکا ہے یا تو کہانیوں میں یا شاعری میں۔ چونکہ ان میں زندگی کا مدنی (CULTURAL) احساس کم ہے اس لئے انہیں تکنیک کی پروا نہیں اور نہ یہی معلوم ہے کہ لفظ تکنیک بھی اس دُنیا میں کہیں پایا جاتا ہے۔

مجھے ہندوستان کے دیہات میں زیادہ گھومنے پھرنے کا موقعہ نہیں ملا۔ میں تو صرف بلند شہر و میرٹھ کے اضلاع میں چل پھر سکا ہوں۔ اور وہاں کی زندگی کو قریب سے دیکھ سکا ہوں۔ اور زیادہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں میں بھی زیادہ تر بلند شہر ہی تک میری دوڑ رہی ہے۔ آج میں آپ کو وہاں کے چند گیت سناؤنگا۔ یہ گیت اگرچہ اکثر و بیشتر فنی معیار پر بھی پورے اُترتے ہیں۔ مگر حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں فن کے معیار پر پرکھنا ظلم ہوگا۔ دیہات کے لوگ فن وَن کو نہیں جانتے۔ وہ تو یہ جانتے ہیں کہ گنگنانا ایک فطری جبلت ہے۔ اور غیر شعوری طور سے الفاظ اور خیالات ڈھل کر زبان پر آ جاتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ وہ الفاظ ایک خاص بحر سے بھی مناسبت رکھتے ہیں اور ان میں قوافی بھی پائے جاتے ہیں تو اسے شہری لوگ غنیمت جانیں۔ اور اُس پر اچھلیں کودیں۔ انہیں اس بات سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ تو صرف یہ جانتے ہیں کہ اکثر جب ترنگ اُٹھتی ہے۔ تو یونہی ہوتا ہے وہ اِس لمحہ کی بے چینی سے بھی واقف ہوتے ہیں، جب تخلیقی قوتیں انہیں شاعر بننے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اور وہ گنگنائے بغیر ایک دردِ زہ کی سی کیفیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ شعوری طور پر۔ اس لمحے کے طویل بنانا چاہتے ہیں۔ اور نہ کاوش کرتے ہیں کہ کوئی کام ہی کی چیز بن جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے وقت میں کام ہی کی چیزیں وجود میں آنے لگتی ہیں۔

آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ دیہاتی گیتوں میں (۷۵) فی صدی جنسی جذبے سے چھلکتے ہوئے ہیں۔ اور بمشکل (۲۰) فی صدی بہادری سے متعلق ہیں۔ رہے پانچ فی صدی وہ روزانہ زندگی کے مسائل اور حکیمانہ باتوں پر مبنی ہیں جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ دیہاتی لوگ اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے تقدیر پر ایقان ایمان رکھتے ہیں۔ ہر چیز جو ظہور میں آ رہی ہے اور آئے گی وہ پہلے ہی مقدر ہو چکی ہے۔ جو ظہور میں آ چکی وہ مقدر ہو چکی تھی۔ اور پھر بھلا سب کچھ "رام کی لیلا ہے" یا "خدا کی مرضی"۔ اس لئے ان کے یہاں زندگی کے دُکھ سُکھ کا احساس کم ہے۔ اور ہے بھی تو آخر میں تان اُس یقین پر ٹوٹتی ہے۔ جو انہیں خدا کی ذات اور اپنی تقدیر پر ہے۔ یہ تو بہت تھوڑے دنوں کی بات ہے کہ سیاسی جماعتیں بنیں۔ اور شاید چند ہی برس پہلے کی بات ہے کہ انہیں (سیاسی جماعتوں کو) شہروں کو چھوڑ کر دیہات میں سیاسی سوجھ بوجھ پھیلانے کا موقعہ ملا۔ وہ بھی شاید وزارتوں کی خاطر ووٹ لینے کے لئے۔ اور اس لئے زندگی کی حرکت۔ رفتار کی تیزی اور اپنی قوتِ عمل میں یقین نئی سی بات ہے۔ اور بمشکل پانچ فی صدی طبقے میں ملتا ہے۔ پھر اس طبقے کے ذہنوں کی کیفیت بھی "نو توڑ" زمین کی سی ہے۔ اور وہ بار بار ڈر ڈر جھجک کر اپنے عقائد سے چمٹ جانا چاہتے ہیں۔

اسی سے تخلیقی لَے کی ترنگ کا اظہار صرف عشق کی صورت میں ہو سکتا تھا۔ اور چونکہ صوفیت اور مہاتماؤں کی تعلیم سے بھی انہیں کم تعلق رہا ہے اس لئے اس عشق کے معنی مادّی اور مجازی کے عشق کے تھے۔ روحانی اور مجہول عشق کے نہیں۔ اسی باعث تو ان کے گیتوں سے بھینی بھینی خوشبو پھوٹتی معلوم ہوتی ہے۔ اور جنس کا صحتمندانہ احساس ملتا ہے۔

یوں تو کہنے کو میں کہہ گیا۔ مگر "صحتمندانہ جنس" کا لفظ استعمال کرنے سے ڈر ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی صحیح تعبیر پر اردو والے ایک عرصے سے جھگڑ رہے ہیں غل مچا مچا کر کتابیں ضبط کرا رہے ہیں۔ دیہات میں یہ سارا جھگڑا اُٹھتا نہیں ہے۔ وہاں زیادہ ٹھہراؤ اور سکون ہے۔ انہوں نے صحیح اور بڑے ادب کی خوبیوں کو بلا جانے بوجھے لاشعوری طور پر قبول کر لیا ہے وہ ایجی ٹیشن کرتا ہے۔ نہ غل مچاتے ہیں۔ انہیں صرف اپنی تنقیدی اہلیت پر بھروسہ ہے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو سچا اور اچھا ہے وہ باقی رہ جائے گا۔ جو بُرا اور جعلی ہے وہ مٹ جائے گا۔ اور ان کی زندگی میں یہ اتنی بڑی اور اہم قدر ہے۔ اور اس پر انہیں ایسا اٹل ایمان بھی ہے کہ وہ حدۂ استہزاء کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ بلکہ خندۂ معصوم میں سب باتوں کو اڑا دیتے ہیں۔ کسے خبر نہیں کہ اُردو کے لاتعداد شاعر ہوتے مگر میر۔ آتش۔ سودا۔ غالب۔ امیں درد و چار اور چھوٹے بڑے شاعروں کے سوا باقی سب کے سب تحت الثریٰ میں دفن ہو چکے۔ انسانوں میں جس طرح چکھنے سونگھنے۔ سننے۔ دیکھنے اور چھونے کے پانچ احساس ہیں اسی طرح ایک حس ایسا بھی ہے جو ادب کی پرکھ سے تعلق رکھتا ہے۔ جبھی تو تھوڑے عرصے میں ذوق کی شہرت گم ہو جاتی ہے۔ اور غالب کی شہرت کا آفتاب گمنامی کے بادلوں کی اوٹ سے مُنہ دکھانے لگتا ہے۔ دیہات والے پہلے ہی اس اصول پر ایمان رکھتے ہیں۔ نہ جانے کتنے اور ان گنت گیت بنے ہوں گے۔ دیہات کی فضاؤں پر چھائے ہوں گے۔ گھر گھر پھیلے ہوں گے۔ اور گیہوں کی ہری اور سوندھی بالوں کے کھیتوں کی میڈھوں پر گائے گئے ہوں گے مگر آہستہ آہستہ مدھم رستے اور ان کی آواز فضا میں اس طرح ڈوب گئی جیسے نغمہ ایک ارتعاش پیدا کرتا ہوا کانوں سے کہیں دُور جاتا معلوم ہوتا ہے۔

دیہاتی گیتوں میں اس جنسی احساس کی ایک وجہ ہو سکتی ہے اور اس کا سلسلہ بھی تقدیر پر غیر معمولی یقین تک پہنچتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مصروفیت جسمانی مشقت اور خارجی دنیا سے بے تعلقی کی وجہ سے فکر انگیز لمحوں سے انہیں دوچار نہیں ہونا پڑتا لیکن دوسری طرف وہ اپنی منکوحہ عورتوں پر بھی قناعت کر سکتے ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں شاید "ترسنے" کی کیفیت کا فقدان ہے۔ ضروریاتِ زندگی مختصر ہیں۔ اور سیاسی سوجھ بوجھ معدوم مادّے کی قوتوں سے وہ بے خبر ہیں۔ اور اقتصادی سوالات انہیں پریشان بھی کرتے ہیں، تو وہ صرف 'مقدر' کہہ کر چُپ ہو جاتے ہیں۔ 'ترسنے' کی اور 'حسرت' کی کیفیت کیونکر پیدا ہو؟ کسی گیت کا پہلا مصرعہ ہے کہ:

ساری رینیاں گذر گئیں۔ واہ میاں واہ

اس مصرعہ کی بلاغت قابلِ داد ہے۔ کھل کر بات کہے بغیر بھی کھل کر ہی کہی گئی ہے۔ اور محض لہجے نے غضب ڈھا دیا ہے۔ ایک عورت ہے امنگوں بھری۔ الھڑ اور جوان۔ اور رات بھر تارے گن گن کر شوہر کے پہلو میں بغیر اس کی مٹھاس چکھے گذار دیتی ہے۔ نہ جانے کتنی راتیں گذر جاتی ہیں۔ اب وہ کہتی ہے۔

ساری رینیاں گذر گئیں واہ میاں واہ

اس مصرعہ میں بھی 'حسرت' اور 'ترسنے' کی کیفیت نہیں ہے شوخی ہے اور واہ کے لفظ سے مرد کو شرمندہ اور ذلیل کیا گیا ہے۔ گاؤں کی عورتیں موزونیٔ طبع میں بڑے سے بڑے شاعر کو مات کرتی ہیں۔ برات کی ٹولیوں میں اور میلوں کے موقع پر وہ ڈھولک کی تال پر نئے سے گیت سُناتی ہیں۔ جو کبھی خود انہوں نے بھی نہیں سُنے۔ لیکن کسی عورت کو علیحدہ بلا کر کوئی مصرعہ سنیے' وہ کبھی نہ سُنا سکے گی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نغمہ کی روانی کس بلا کی ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ایک برات میں مجھے جانا پڑا۔ گاؤں میں ایک مکان کی چھت پر سو رہا تھا۔ گرمیوں کی رات تھی۔ کھلی ہوا۔ چھٹکے تارے۔ اور فُدرتی رنگ روحانی کیفیت کا غلبہ کہ یکایک لڑکیوں کی آواز کان میں آئی۔

میرے صنم کا گلابی بدن۔ چلو دیکھ آویں ری

اس مصرعہ کو سُنے آٹھ سال ہوتے ہیں۔ مگر آج تک ذہن سے نہیں اُترتا۔ کیسا عجیب مصرعہ ہے۔ اور اس کی کیا کیا تعبیرت میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔ وہ سب اس وقت یاد نہیں

اور اپنی سہیلیوں سے کہہ رہی ہے کہ میرے سیاں کا بدن گلابی ہے شراب کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔ کچھ چلتی ہو دیکھنے؟ بدن کی قدرتی سیاحت اور سچائی کا ایسا بیان اُردو میں مصحفی ہی کے یہاں ملے گا۔ یا پھر فراق کے یہاں!

اب آپ کو ایک مکالمہ سُناتا ہوں۔

سوال:- تیرے مرجاں! —— دوپہر یا میں کہاں گئی تھی؟

جواب:- ہاٹ گئی۔ بازار گئی۔ لینے گئی دھنیہ
دھنیہ دنیہ بھول گئی میں۔ پیچھے پڑ گیا مہ

سوال:- تیرے مرجاں! —— دوپہریا میں کہاں گئی تھی؟

جواب:- ہاٹ گئی۔ بازار گئی۔ لینے گئی نارنگی
نارنگی وارنگی بھول گئی میں۔ پیچھے پڑ گیا بھنگی۔

سوال:- تیرے مرجاں! —— دوپہریا میں کہاں گئی تھی؟

یہ مکالمہ کافی طویل ہے اور مجھے اس کے صرف یہی دو ٹکڑے یاد ہیں۔ اس میں شوہر سوال کرتا ہے کہ تیرے مرجائیں (یعنی تیرا بُرا ہو کمبخت، تیرے مرجائیں دیہات میں ایک عام محاورہ ہے) تو دوپہر میں آج کہاں غائب رہی؟ اور لہجہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ سوال کرنے والے کو عورت کے چال چلن پر بے انتہا یقین ہونے کے باوجود کچھ شبہ ہو چلا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ میں یونہی بازار گئی تھی۔ دھنیہ خریدنے مگر ایک مہیب شرارت پر آمادہ ہو گیا۔ (شاید دھنیہ بیچنے والا ہی) میں خرید و فروخت کو بھول گئی۔ اور بڑی مشکل سے اپنی آبرو بچا کر لائی ہوں۔ اور سوال کرنے والا پھر وہی سوال دہراتا ہے اور جواب دینے والی اس دفعہ نارنگی کی خرید و فروخت کو بھی شامل کر لیتی ہے۔ (فضا سی دفعہ ایک بھنگی کا ذکر بھی اپنی شرابی اداؤں کے اسیروں میں کر لی ہے بنیہ۔ دھنیہ کا قافیہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کھپ بھی گیا تھا مگر نارنگی کے وزن پر بھنگی مجبوری کیا گیا ہے۔ یہ ہے قافیوں کا ظالم ترنم اور ان کا بہاؤ۔ مگر فن کے ڈھیلا ہونے کے لئے ہم انہیں دیہاتی گیت کہہ کر خاموش ہو سکتے ہیں۔

ایک اور گیت یوں شروع ہوتا ہے۔

"اقرار کرلے جانی! —— پنجاب لے چلونگا!"

عاشق اپنی محبوبہ کو یقین دلا رہا ہے کہ وہ اُسے موجودہ ماحول سے چھڑا کر دور دراز علاقوں میں لے جائیگا جہاں اُس کے رشتہ دار اُس کی محبت کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں گے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پنجاب کی گلزار فضاؤں کی طرف ایک اشارہ بھی ہے۔ بلند شہر و میرٹھ کے دیہات میں کسان لوگ بیل حصار کے میلے سے خرید کر لاتے ہیں اور اس لئے انہیں پنجاب کی رنگین فضاؤں کا علم ہے۔ اور وہاں کی صحت بخش آب و ہوا کا بھی۔

ایک گیت میں محبوبہ اپنے چاہنے والے سے کہہ رہی ہے۔

چلم تماکو پیتو۔ جس کے جوڑے جوڑے پات
لاکھ ٹکیو کو آدمی، سوتی آں لیا رے ہاتھ

(اے میرے پیارے شوہر تو اگر کھیتی کرتا ہے تو تمباکو کی کاشت کر جس کے جوڑے جوڑے پتے ہوتے ہیں۔ اور جس کی چاہت اتنی ہے کہ اگر لکھ پتی بھی ہو تو ایک چلم تماکو کی خاطر آ کر ہاتھ پھیلا سکتا ہے۔)

دیہاتی لوگ بھی تھیٹر کا تصور رکھتے ہیں۔ اور اس کا نام اُنھوں نے سوانگ رکھا ہے۔ سوانگ زیادہ تر مکالمے کی شکل میں ہوتا ہے اور یہ مکالمہ تمام تر اشعار ہی میں ہوتا ہے۔ سوانگ میں کسی دیہاتی عشق کا ڈرامہ اسٹیج کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک سوانگ دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا۔ ایک ایسا منظر آیا کہ محبوبہ اپنی آرامگاہ میں ہے۔ رات کا وقت ہے۔ عاشق موعودہ وقت پر اس کالی بھیانک رات میں محبوبہ سے ملنے آتا ہے۔ اور محبوبہ کے مکان کی دیوار کے تلے کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر اُسے ڈر ہے کہ کہیں کوئی شخص یا محبوبہ کا کوئی عزیز نہ دیکھ لے۔ اور اس لئے انتظار کرتے کرتے بے چین ہو کر کہتا ہے

تو تو بڑکے سو رہی۔ گٹھڑا سی
مری جائے گی جان۔ ٹکا سی

(مطلب۔ اے محبوبہ تو تو اناج کی ایک گٹھری کی طرح بے خبر پڑی سو رہی ہو گی۔ اور اپنے وعدے کو بھول چکی ہو گی۔ مگر میں تپ ہجر میں سُلگ رہا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ کہیں تیرے کسی عزیز نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو قتل نہ کر ڈالے اور میری جان کم قیمت ٹکے کی طرح رہ جاتی رہی) ایک ایسے وقت کا تصور کیجئے جب اندھیری رات ہو۔ آدمی اپنی محبوبہ کا انتظار کر رہا ہو۔ اور دشمنوں کے نرغے میں ہو۔ ہر لمحہ اُسے اپنے ہی خیالات ڈس رہے ہوں، اور یہ ہیجان پھوٹا بکر اس کی۔

رینگ رہی ہو۔ اُردو کے شاعر یہ جانے کیا کیا خیال آرائیاں کرتے۔
اور اگر دیہاتی زندگی کے متعلق کبھی کوئی نظم لکھتے اور اس میں یہ
منظر آتا تو جان کے قیمتی ہونے کا احساس انہیں ٹکے (دو پیسے
کا سکہ) کے تصور کی طرف واپس۔ لا سکتا۔ بلکہ پہلے تو وہ اُسے
الماس اور لعل و گوہر میں تولتے اور پھر کہتے کہ ایسی قیمتی جنس
مفت ضائع جا رہی ہے مگر دیہاتی شاعری کا کمال یہ ہے کہ
جان کے قیمتی ہونے کا احساس تو شعر کی آواز سے ظاہر ہے
اُسے الفاظ کے ذریعہ ظاہر نہ کر کے غیر ضروری تفصیل سے شاعر
صاف بچ گیا ہے۔ اب رہا جان سی قیمتی شے کا کسی بے قیمت
شے کی طرح ضائع ہو جانا اس کے لئے انہیں ٹکے کی تشبیہ
ہاتھ لگی۔ پھر یہ کہ بے خبر سوئے اور گہری نیند کے لئے
...ج یا کھوسے کی گٹھری سے عمدہ تشبیہ اور کیا ہو سکتی ہے۔
...ج یا کھوسے کی گٹھری تو احساس سے قطعاً ماورا ہوتی ہے
بے جان — اور عاشق جل کر اور طویل انتظار سے جھلا کر
محبوبہ کو احساس سے بالکل عاری قرار دیتا ہے۔ دوسرے
...س کے لئے شعر سے بیرونی وسیلے سے بے تعلقی کیسی صاف
جھلک رہی ہے۔ شاعر گاؤں کی فضا کے علاوہ کسی اور شے
کا تصور ہی نہیں کر سکتا ہے اور دُنیا کی دیگر چیزوں کا اسے
کوئی علم ہی نہیں ——

آیئے ایک گیت اور سنئے۔ یہ مکالمہ ہے جو ہولی کے
موقعہ پر گایا جاتا ہے یہ مکالمہ ایک چیلی اور گرو کے مابین
ہوتا ہے۔

گرو جی :۔ سری گردن کے پیچھے پیچھے کیا جنتو بالکی ؟
(اے معصوم لڑکی، تیری گردن کے پیچھے کیا چیز ہے؟ گویا
گرو جی آدمی ہی نہیں ہیں۔ اور انہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ گردن کے
پیچھے کیا ہوتا ہے۔ یہ ایک لطیف طنز ہے گرو جی کی عیاری پر)

چیلی :۔ چھتیاں گوسائیں جی ! — چھتیاں گوسائیں جی !
"چھتیاں گوسائیں جی" کی تکرار سے لڑکی کی معصومیت
کتنی اچھی طرح بلا جتائے ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور گرو جی کی معلومات
کے متعلق لڑکی کا عقیدہ بھی صاف جھلک رہا ہے جس کی وجہ
سے وہ اُسے دوبارہ کہہ کر گوسائیں جی کو یقین دلا رہی ہے)

گرو جی :۔ تیری چھتین سے چھاتا ملاؤں جنتو بالکی ؟
(شہوت کا غلبہ گرو جی پر ہوتا جا رہا ہے۔ اور وہ عورت
کی چھاتیوں کو چھتین کہہ کر اور اپنی چھاتی کو چھاتا کہہ کر
صوتی ہیبت اور مرد کی بزرگی دکھانا چاہتے ہیں۔)

چیلی :۔ آپ ملائیں گے ___ سکھ پائیں گے گوسائیں جی
(اے گرو جی اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ کو آرام ...
گویا گرو جی کو اس لذت کا پتہ ہی نہیں ہے۔ اور پہلی دفعہ
لڑکی انہیں یہ بات سمجھا رہی ہے۔ گرو جی کی بزرگی کو ...
والی، رسم و رواج میں جکڑی ہوئی لڑکی اس سوال پر ...
اعتراض نہیں کرتی بلکہ اپنے آپ کو بہ عقیدت تمام ...
کر دیتی ہے۔)

گرو جی اور چیلی کا پورا مکالمہ مجھے یاد ہے۔ مگر ایک ...
جگہ کی قلت اور دوسرے اس گانے کی عریانیت (بقول ...
سے ڈر ہے کہ کہیں ایک ہنگامہ برپا نہ ہو جائے۔ گرو جی آہستہ
آہستہ اس مکالمے میں بدن کے مختلف حصوں کے متعلق
معلومات حاصل کرنے اور ہر قدم پر لڑکی کو جذباتی طور پر ...
کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور انتہا یہ ہے کہ "وہی ہوتا ہے جو
منظور خدا ہوتا ہے"۔

مضطر خیرآبادی کے گیت بھی دیہات میں بڑے مقبول
ہیں اور اب سے چھ برس پہلے ہر طرف یہی سُنائی دیتا تھا
"کہاں گری رام مورے ماتھے کی بندیا"
اب فلمی گانوں کی دھوم آنے جانے والوں کی بدولت
دیہات میں بھی ہو چلی ہے۔ اور یہ گانے اور غزلیں وہاں
بھی چل نکلی ہیں۔

اب یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ لوگوں کو دیہاتی زبان
اور اُس کی ماہیت سے دلچسپی ہو چلی ہے۔ اس سلسلے میں
شاید سب سے زیادہ کارآمد بولی اضلاع بلند شہر و میرٹھ
کی ثابت ہوگی۔ کیونکہ یہی وہ علاقہ ہے جو پہلے 'برج' میں
شامل تھا۔ اور یہاں کی بولی 'برج بھاشا' ٹکسالی مانی جاتی
تھی۔ اس بولی کا اُردو کی پرورش میں بھی زبردست حصہ ...
اس خطے کی مردم خیزی اور یہاں کی بولی کی ماہیت پر پھر کبھی
بیٹھیں گے اور غور کریں گے۔

آجکل تو خیر ایک جنگ عظیم چھڑی ہوئی ہے لگن کی ...

...اچھی تنخواہ اور عمدہ خوراک کی فکر ہے۔ گاؤں میں بھی
...یہی چیز نظر آتی ہے۔ اسی لئے شاید گانے بجانے کا شغل
...ہے۔ مگر میں کبھی لال قلعہ (دہلی) کے برابر سے گذر رہا ہوں تو
...جنگ سے آنے اور وہاں جانے والے سپاہیوں
...کے بجائے سنتا ہے انتہائی فحش اور عریاں گیت ...
...تا تو جو جنگ کی ہولناکی کی وجہ سے ہے کس طرح دور ہو
...انتشار کس طرح سکون پا سکے [illegible] کا ایک ہی ذریعہ
...رہ جاتا ہے۔

ان گیتوں سے ایک بات اچھی طرح جھلکتی ہے اور وہ
...وں اور ہندوؤں کی دو مختلف تہذیبوں کا میل یہ
...نوں اور ہندوؤں کے مشترکہ گیت ہیں۔ اور دونوں
...وں کی مشترکہ ملکیت ہیں یہاں مذہبی اور سیاسی
...گروہ بندی کا کوئی کام نہیں۔ یہ تو سبھی انسانوں کے
...ملکیت ہیں۔

دو غزلیں

کہنے سے جو سمجھا جا نہ سکے، اس درد کا قصہ کیا کہیئے
موسیٰ بھی جسے اپنا نہ سکے، اس برق کا منشا کیا کہیئے

پلکوں سے بہا، دامن میں گرا، دامن سے اُلجھ کر کھو بھی گیا
اک اشک کے بے بس قطرے کو اظہارِ تمنا کیا کہیئے

خود دل نہ ہو پہلو سے جُدا، اس دردِ محبت کے صدقے
جو غم کہ مسیحا بن نہ سکے، اُس غم کا مداوا کیا کہیئے

جو کچھ کے لبوں تک آ نہ سکے، جو دل کے پلک تک جا نہ سکے
اس آہ کی منزل کیا کہیئے، اس اشک کا رستہ کیا کہیئے

کل رات کہیں اک راگ چھڑا، وہ چوٹ لگی پھر دل تڑپا
جو شخص ذرا سی سہہ نہ سکے اس دل کا سہارا کیا کہیئے

بیمار کی نبضیں ڈوب چلیں، لو موت کی گھڑیاں آ پہنچیں
پیغامِ اجل کہیئے اس کو، یا صبح کا تارا کیا کہیئے

اقبال محبت کی راہیں اور ان کی منازل اُف توبہ
جو یہ سب سہہ کر جی بھی سکے اُس دل کا کلیجہ کیا کہیئے

فضاؤں پر دُھندلکا چھا رہا ہے
چراغِ عمر بُجھتا جا رہا ہے

مہ و انجم کو بھی نیند آ رہی ہے
کوئی رودادِ غم دہرا رہا ہے

یہ کس نے تار چھیڑا سازِ دل کا
جہانِ حسن سمٹا آ رہا ہے

لبوں پر کپکپی، آنکھوں میں آنسو
کسی کو کوئی یوں سمجھا رہا ہے

ابھی پہلی ہی منزل ہے سفر کی
کلیجہ مُنہ کو آیا جا رہا ہے

وہ جھجکے آپ، وہ جھپکیں نگاہیں
سنبھلیئے، تیر دھوکا کھا رہا ہے

وہ مجھ سے دُور ہوتے جا رہے ہیں
محبت میں مزا اب آ رہا ہے

دعائیں دو اسے اقبال دل سے
تمہیں جو ہر گھڑی تڑپا رہا ہے

اقبال عظیم

"ثروت"

صدیقہ بیگم

بھیا کی شادی کیا ہوئی سارے گھر میں گویا طوفان سا آگیا۔ شادی کس گھر میں نہیں ہوتی۔ ڈھول تاشے بجتے ہیں، گیت گائے جاتے ہیں۔ رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں اور پھر ننھی سی، منی سی، پھول سی دُلھن آتی ہے۔ اپنے ساتھ ایک گھر کا گھر سامان بھی لاتی ہے جو ہر کس و ناکس کی اچھائیوں اور بُرائیوں کی آمیزش کے ساتھ دکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے بھیا کی بھی گڑیا سی دُلھن آئی ——— جہیز آیا ——— اور ساتھ میں سونے پر سہاگہ ایک عدد سالی بھی۔ اوّل تو اس مہنگائی کے زمانے میں ہم شادی کے ہی قائل نہ تھے اور پھر سے یہ "مان نہ مان میں تیرا مہمان" اللہ بچائے ایسی نعمتِ غیر مترقبہ سے۔ ویسے ہی گھر میں لڑکیوں کا کوسا کال تھا۔ سبری پر سبری سبر تھے۔ مجھے رہ رہ کر بھیا پر غصہ آرہا تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ آپ سے دُلھن لانے کو کہا گیا تھا اور آپ ایک سالی کا معاملہ بھی طے کرآئے اور پھر امی بگڑیں تو ان کو کس پینترے سے ڈھالا ——— "بھلا سوچو تو بے ماں کی بچی، کس در کی بھیک مانگتی، یہ بھی تو ثواب کا کام ہے ——— خدا کا خوف کرنا چاہیئے، بیچاری بے ماں کی ہے۔" بھیا کا بس چلتا تو اس فقرے پر رو ہی تو دیتے۔ اور پھر خدا کا خوف اور ثواب۔ مجھے اس پر اور بھی غصہ آیا، میاں کو روزے نماز سے تو دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ چوبیس گھنٹے لامذہبیت پر لیکچر بازی، اور ثواب کمانے کے لئے اس بھری دُنیا میں گویا ایک ہم ہی رہ گئے تھے۔

"آپا ———!" میں چونک پڑی دیکھوں تو ثروت کھڑی ہیں۔ چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی جیسے ڈیڑھ سو برس کی ہوں۔ آنکھیں جھکی ہوئی یہ آنکھیں کبھی زمین سے اُٹھتی بھی ہیں۔

"کیا ہے ———؟" میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا اور وہ حسبِ عادات خاموش۔ ایسی خاموش لڑکی تو ——— بابا۔ دُور دُور دیکھنے میں نہیں آسکتی، مجھے اس چُپ سے اور بھی چڑ لگتی جیسے کسی نے مُنہ سی دیا ہو۔ بقول طالب آملی ؎

"لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی بہ دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد"

در خدانخواستہ اگر بات بھی کرے گی تو ایسے کہ خود ہی کہے اور خود سُنے بھلا اس عمر میں نہ ہنسے بولے گی تو پھر کون سا زمانہ آئے گا جب آدھے درجن بچے گرڈھے گی۔ یہی تو الھڑپن کی عمر ہے۔ چارپائی پر چڑھ کے بیٹھ جاتی ہے جیسے کوئی بڑی بیگم۔ کوئی حد بھی ہے اس خاموشی کی، ہردم وہی اُداس نظریں ہمیشہ زمین ہی کُریدتی رہتی ہیں۔ آسمان کی طرف تو شاید اس نے کبھی سیکھا ہی نہیں ——— اب بھلا اس ٹُک لگی کہ آتیں ——— "آپا ———" اور پھر آگے "آیت" میں کچھ ہی ڈالی تھی کہ بھیا کی آواز سُنائی دی ———

"ثروت! اری ثروت کہاں چلی گئی؟"

"لو جاؤ۔ تمہیں بھیا بُلا رہے ہیں" اور ثروت آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی چلدی۔ گویا پھولوں پر چلنے کی مشق ہو رہی ہے۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن آئے ہوئے نہیں ہوئے، جو بس جیسے گھر میں ثروت، ثروت کے نعرے لگنے لگے۔ اگر کہیں بولتی ہوتی تو خدا جانے کیا حال ہوتا۔ اور امی کو تو دیکھو۔ اتنی عمر ہونے کو آئی پر ذرا عقل نہیں۔ پرائی لڑکی کو گھر میں رکھنے کے لئے تیار۔ آخر کوئی کب تک برداشت کرے۔ ایک دو روز کی بات ہو تو چلو بھگتا جائے ———

"ارے ——— رے ——— رے ایسے نہیں۔ ذرا گردن جھکاؤ۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔ ذرا یہ بال ایسے رہنے چاہئیں . . . بس ایسے ہی رہنا۔ دیکھو ہٹنا بالکل نہیں ——— ریڈی پلیز ——— پلک نہ مارنا۔"

یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے باہر جھانکا، کیا دیکھتی ہوں کہ بھیا کیمرہ لئے کھڑے ہیں اور ثروت اسٹول پر ڈٹی ہوئی ہیں۔ میں نے جھپاک سے جو قدم اُٹھائے تو پاؤں پائنچے میں آ گئے۔ وہ تو بال بال بچ گئی ورنہ چاروں خانے چت جا پڑتی۔ تصویر میں ایک اور تصویر ہو جاتی۔

"کیا ہو رہا ہے ——— بھیا؟"

"کچھ نہیں ———" جیسے میں دودھ پیتی بچی ہوں اتنی

...نہیں تھی۔

"بھیا — ہماری تصویر کھی" میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا حالانکہ میں جانتی تھی کہ اس وقت بھیا کے سامنے بات کرنا بھی مشکل ہے التجا کرکے۔"

"بھتو — تمہاری تصویر پھر کھینچ دیں گے۔ کل ایک اسپورر آ گیا ہے۔ نیا ماڈل لائیں گے تو ایک نہیں دس — عمدہ عمدہ اپنی بھتو کے۔" بھیا اس انداز سے بول رہے تھے جیسے کسی ننھے بچے کو بہلا رہے ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ثروت کی ہر تصویر سے شعلے ہی شعلے نکل رہے ہوں جو جیسے سارا چہرہ سیاہ سیاہ پلکوں، بڑی بڑی آنکھوں، گہری بھوؤں اور بالوں سے بھرا پڑا ہے میری نظر ثروت پر جم کر رہ گئی۔ بڑی ہی معلوم ہو رہی ہیں۔ یہ بھی کوئی صورت ہے گورا جسم جیسے روٹی پھولی ہو۔ ہماری بھابی سانولی ہیں لو کیا پر کیسی بھلی لگتی ہیں۔

"آپا — ثروت آپا کے بال کتنے بڑے ہیں!" اقبال نے میرا جمپر کھینچتے ہوئے کہا میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ کمینی کہیں کی — سارے گھر پر قبضہ جما لیا میں نے جھنجھلا کر اسے جھٹکا دیا کمبخت کسی وقت بھی چین نہیں دیتے اقبال لڑکھڑا کر کھڑا ہو گیا اور ثروت کی بھدی شکل کو تکنے لگا۔

نسیمہ کی نگاہیں بھی ثروت کی آنکھوں میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ جیسے اس گھر میں میرا کوئی حق ہی نہیں۔ اکیلی کمرہ میں پڑی سڑتی رہوں — کوئی اتنا بھی نہیں جو دو حرف ہی دل لگی کے۔ میں پریشان ہو کر اپنے کمرہ میں گھس گئی۔ یہ وہی نسیمہ تو ہے جو ہر دم میرے کمرے میں پڑی رہتی تھی کتنا ہی کہوں کہ ایک سیکنڈ کو پیچھا چھوڑ دے کیسا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو مگر وہ سر پر سوار — اور آج یہ حالت کہ میری صورت سے بیزار ہو گئی ہے بس وہ تو ہر وقت — ثروت آپا — ثروت آپا۔

"ثروت آپا کی تصویر کھنچ گئی — ہا ہا — ثروت آپا کیسی اچھی آ گئی ہیں" اور میں جیسے کسی عمارت کی طرح — اڑا — ڑا — دھڑام سے گر پڑی۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو نسیمہ اور اقبال ثروت کو لئے جا رہے تھے۔ جیسے بیچ میں بہا تما گاندھی — ثروت آپا — ثروت آپا۔ یہ آوازیں دیر تک کمرہ کی چہار دیواری سے ٹکراتی رہیں جیسے ان کی جے بولی جا رہی ہو۔ صبح سے یہ وقت آ گیا۔ کان پک گئے سنتے سنتے۔ ہر وقت یہی —

دنیا بدل گئی۔ ماضی کے سپنے ٹوٹ گئے حتیٰ کہ بھیا بھی بدل گئے۔ اب تو کبھی سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ اب تو ہر گھڑی — ثروت۔ ثروت — وہ کیا آئی جیسے گھر میں ایٹم بم پھٹ گیا جس نے صدیوں کے گڑے مُردوں کو بھی اکھاڑ پھینکا۔

"بیٹی ثروت — کیا کر رہی ہو۔ ذرا میری چوٹی تو گوندھ دے۔" امی کی آواز فضا میں لہرائی۔

"ثروت بیٹی —" جیسے ہم کچھ ہوئے ہی نہیں۔ بڑی آئیں ثروت بیٹی۔ جیسے سدا ثروت بیٹی ہی نے تو چٹیا باندھی تھی آج زندگی میں پہلی بار میرے دل میں امی کی چوٹی باندھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جیسے میرے الفاظ مجھ سے باز پرس کر رہے ہوں۔

"یہ امی کی چوٹی بھی روز کی مصیبت ہے۔ پہلے تیل لگاؤ۔ پھر گھنٹہ بھر چپی کرو اب کہیں ان کو چین پڑتا ہے۔"

"اتنے ذرا سے تو بال ہیں اور گھنٹوں سے ابھی میں بھی ہے۔ آج کل کی لونڈیوں سے کوئی کام بھی سلیقہ سے نہیں ہوتا خصم کے یہاں جائیں گی تب پتہ چلے گا۔"

"ٹھیک سے گندھوانا ہو تو گندھواؤ۔" مجھے غصہ آ ہی گیا۔

"یہ کیا سر ہلا رہی ہو ڈگڈگی سا؟"

"تجھے نہیں گوندھنا تو ویسے ہی کہہ دے۔ جا اپنے جھوٹے سچے قصے لکھ۔ کسی کام کو کہو تو دماغ ہی نہیں ملتا۔" اور پھر جیسے پاس والے کمرے سے سچ مچ امی کی آواز سنائی دے رہی ہو۔

"ثروت بیٹی بس — خدا تجھے نیک گھر نیک بر دے۔ مجھ بڑھیا کا چونڈا تو تو ہی ٹھیک سے باندھتی ہے۔ یہ طلو تو وہ کھینچا تانی لگاتی ہے کہ بس توبہ ہی بھلی۔ جیسے کوئی بیگار ٹال رہی ہو۔" مجھے اپنے اوپر غصہ آیا۔ کاش پہلے ہی امی کے کاموں میں دلچسپی لیتی تو آج یہ کوڑی کے تین تین نہ ہوتے۔

"ثروت آپا!"

"ثروت آپا — چلو کیرم کھیلیں۔" نسیمہ کی آواز آئی۔

"جاؤ — طلو آپا کے ساتھ کھیل لو۔ میں ذرا اماں کے کنگھی کر رہی ہوں۔"

"طلو آپا کے ساتھ — جی نہیں وہ تو نہیں کھیلتیں۔ انہیں تو

ہمیں پڑھنے ہی سے فرصت نہیں جب کہو تو یہی جواب ملتا ہے۔
عاشہ کے پڑھو ہر وقت کھیلنے ہی کی پڑی رہتی ہے۔ اب کوئی
ان کی طرح کہاں تک پڑھے جب دیکھو کوئی نہ کوئی کتاب آنکھوں
سے لگی ہے۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہوتا۔"

"اچھا ___ تم چلو میں ابھی آئی۔ دو منٹ میں۔"

"ہا ہا ___ ثروت آپا کھیلیں گی۔" اقبال کی آواز
سنائی دی۔

میرا جی چاہا کہ ان تمام کتابوں کو آگ لگا دیتی اور دن
بھر کیرم کھیلتی رہتی۔ اس نسیمہ کو تو دیکھو کتنے بورڈ اسکے
ساتھ کھیلے ہوں گے۔ احسان فراموش کہیں کی۔ میرا غصہ
بڑھتا جا رہا تھا۔ میں بستر پر دھڑام سے جا گری اور جانے
کتنی دیر پڑی روتی رہی۔ پھر جیسے کسی بیاباں میں مال
کھوئے جو شخص کی طرح بے سر و ساماں دوڑ رہی ہوں۔ جسکا
کوئی بھی پُرسانِ حال نہیں۔ آسمان کے تارے جس کو راہ
دکھاتے ہیں۔ شفق کی سرخی جس کو دھوکا دیتی ہے۔ اور پھر
ان بیاباں میں نہ جانے کتنی دیر اسی طرح ___

"ملّو بہن ___ اٹھو شام ہو گئی۔" جیسے کوئی دُور سے
آواز دے رہا ہو۔ ایک فضائی آواز۔

"کیا ہے ___؟"

میں چونک پڑی بھابی سامنے کھڑی تھیں۔ اُنکے ہونٹ
لرز رہے تھے۔ آنکھیں ساون بھادوں کے بادل کی طرح لہرا
رہی تھیں۔ جن سے نہ جانے کتنا پانی برس چکا ہو اور کتنا
برسنے والا ہو۔

"کیا ہے ___ بھابی۔ رو رہی تھیں کیا؟"

"نہیں ___ بہن۔ تمہیں اٹھانے آئی تھی۔ اپنے بھیا کا
سوٹ کہاں رکھا۔"

"نیا سوٹ ___ کیوں؟ کیا ہو گا؟ ___ وہ تو انہوں نے
سینما جانے کے لئے رکھا ہے۔"

"نہیں ___ سینما جا رہے ہیں۔ ثروت کے ساتھ۔" اور جیسے
میں کسی طویل نیند سے جاگ اٹھی۔

"ثروت! ___ ثروت!" در و دیوار سے یہی صدائیں بلند
ہو رہی تھیں میرے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔
میں دیوانی ہوتی جا رہی ہوں۔

"بھیا سینما جا رہے ہیں۔ اور بھابی تم" بھابی نے نظریں جھکا لیں۔
اُن کی جھکی جھکی آنکھوں میں جیسے ثروت کی شکل دکھائی دے
رہی تھی۔

"میں ___ ہیں ___ اچھا تم سوٹ دو۔" بھابی کی آنکھیں
اتنی جھک گئیں تھیں کہ اُن کی پلکیں میری نظروں سے اوجھل
ہو گئیں۔ ٹپ سے پیر کے پاس ایک بوند گری۔ بھابی نے
چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اور وہ تارے جو اب تک پلکوں
کے سہارے رُکے ہوئے تھے۔ زمین پر موتیوں کی طرح بکھر گئے۔
آکاش پر جیسے گھٹا چھائی ہو۔ کہیں کہیں تارے ٹمٹما رہے تھے۔
ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے گرتے گرتے کسی نے تھام لیا ہو۔
چلو اس گھر میں میرا ایک ہمدرد تو پیدا ہوا۔ اور میں نے اطمینان
کا سانس لیا۔

ذرا سی دیر میں بھیا کا کمرہ خالی ہو گیا۔ ثروت سینما جا
چکی تھی۔ حالانکہ اس کی آوازیں سمندر پار ستاروں سے آگے والے
جہان میں گونج رہی تھیں۔ جو مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ خاموشی
سے بھابی کے کمرہ میں جا کر کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ بھابی
تو جیسے گھنٹوں سے بے خبر پڑی سو رہی تھیں۔ ایک پُرسکون
نیند ___ جس میں سانس بھی خاموشی سے فضا میں تحلیل
ہو رہے تھے۔ کمرہ کی فضا رات کے اندھیارے کا اس کی
آمد سے پہلے ہی خیر مقدم کر چکی تھی۔ نہ جانے کب رات آ گئی۔
گویا ہم سب خواب دیکھ رہے تھے اندھیرا ___ گھٹا
ٹوپ اندھیرا ___

یہ اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر چراغ جلے، رات
ہوئی، اور صبح کی لالی آ گئی۔ ثروت گھر کی ہیروئن تھی۔ دن
رات اُس کا وظیفہ پڑھا جاتا۔ بس ایک میں اور بھابی ایسی
تھیں جو الگ تھلگ پڑی رہتیں ___ ثروت ہیروئن ہونے
کے باوجود بھی کسی المیہ کا ایک کردار معلوم ہوتی۔ اس کی
آنکھوں کی اُداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ جب آئی تھی تب ہی
کونسی ہنس مکھ تھی۔ مگر اب تو روز بروز اُس کی آنکھوں
میں تفکر کے آثار بڑھتے جا رہے تھے۔ ثروت کی آنکھیں
گویا سارے زمانے کی اُداسی ان ہی آنکھوں میں جذب
ہو گئی ہے۔

"بے ماں کی بچی کا دل رکھنے کے لئے ڈونڈا کتنا ہلکان

ہوتا ہے" یہ امی کا فیصلہ تھا۔ بیچارا کتنا خیال رکھتا ہے"

"امی ــــ کیا کروں۔ بے ماں کی بچی ہے۔ تمہیں بھی اُسکا خیال رکھنا چاہیئے۔ اس کی بہن کو تو ذرا فکر نہیں"

اور بھابی کی تو جیسے بہت باتیں رہ گئی ہیں۔ مجھے اس پر اور بھی غصہ آیا۔ دیکھنے میں تو کتنی معصوم نظر آتی ہے۔ منحوس کہیں کی ــــ

آخر کار بھیا کی میز پر ثروت کی تصویر آ ہی گئی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کو فریم سمیت باہر پھینک دوں بھابی کی نظریں اس تصویر کو دیکھکر اور بھی جھک گئیں ــــ

اسی طرح سورج نکلتا اور غروب ہوجاتا ــــ چاند تارے جگمگاتے اور چھپ جاتے وقت کا پہیہ اپنی پوری رفتار سے چکر کھاتا رہا۔

ایک دن جو میں کمرے میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ بھابی اوندھی پڑی رو رہی ہیں۔ تکیہ آنسوؤں سے تر ہے دوپٹہ الگ پڑا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے چادر تان لی۔

"بھابی ــــ بھابی" اور میں اس سے زیادہ نہ بول سکی۔ جیسے میں ان کے رونے کا راز جان گئی تھی۔ میرے الفاظ میں تمام قلبی کیفیات بھری ہوئی تھیں انہوں نے آنسوؤں کے تار کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کچھ نہ بولیں۔

"کیا بات ہے بھابی؟" میں نے دوبارہ کہا۔

"ثروت کی طبیعت خراب ہے"

"کیسی ہے؟ ــــ مگر تمہیں کیا۔ پرے کو مرنے بھی دو"۔ ثروت کا نام آتے ہی مجھے غصہ آ گیا۔ میں نہ بھی نہ سوچ سکی کہ کس سے کہہ رہی ہوں۔ آخر تھی تو بہن ہی۔ ایک دکھ میں پیر پھیلاتے ہیں۔

"لیکن ہوا کیا ــــ؟" میں نے بات کی تلخی کو دور کرنے کی کوشش کی۔

"خدا جانے ــــ صبح سے اوڑھے لپیٹے پڑی تھی۔ تمہارے بھیا ڈاکٹر کے لئے گئے ہیں"

"ڈاکٹر کے ــــ" میں چونک پڑی اتنے میں اقبال چلاتا ہوا آیا ــــ "ثروت آپا ــــ ثروت آپا" پھر مجھے دیکھتے ہی سہم سا گیا۔

"کیا ہے ــــ اقبال؟"

"کچھ نہیں ــــ ثروت آپا کہاں ہیں؟"

"ثروت آپا" ــــ میں کانپ اٹھی "کیوں کیا کام ہے؟"

میں نے دانت پیسے "منحوس" اور غصہ میں اس کے ایک تھپڑ رسید کیا۔ "ہر وقت ثروت آپا کا وظیفہ" اقبال کی چیخ کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

"اور یہ کیا ہے تیرے ہاتھ میں؟" میں نے اس کی مٹھی کھولتے ہوئے پوچھا اس کے ہاتھ میں چکنی مٹی کی سفید سفید ڈلیاں تھیں جس سے سوندھی سوندھی خوشبو نکل رہی تھی "بے ایماں" جیسے اچانک بھابی کے آنسوؤں نے اُن کی پلکوں کا سہارا لے لیا ہو۔ اور ان ڈھر دھکوں سے اس ہولناک منظر کو دیکھ رہے ہوں ــــ اور مجھے جیسے سانپ سونگھ گیا۔

آج

محمود ہاشمی

میں نے کہا "شامی بھیا۔ میں نے آج تک صرف ایک
تمہارے کوٹ کی تعریف کی ہے۔ اور میرا خیال تھا۔ کہ جہاں
تک کوٹوں کا تعلق ہے۔ وہ میری آخری تعریف ہوگی مگر
آج آپ کے جسم پر یہ کوٹ دیکھ کر بے اختیار جی چاہتا ہے۔
کہ مدتوں پہلے دیکھے ہوئے کوٹ کو بھول جاؤں"
شامی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ لیکن وہ منہ سے کچھ
نہ بولا اور پھر تھوڑی سی خاموشی کے بعد اِدھر اُدھر کی
باتیں چھڑ گئیں۔ نئی کہانیوں کی باتیں۔ موسم کی اداسی
کی باتیں۔ اور دوستوں کی حماقتوں کی باتیں اور اس کے
بعد مجھے یاد نہیں کہ کس طرح ایک لمبی سی بے ربط گفتگو
کے دوران ہی میں شامی نے مجھے ایک پریم کہانی سنا دی۔
اور جب یہ پریم کہانی ابھی آخری منزل پر تھی تو دریائے
راوی کے پل پر چلتے چلتے۔ پانی کو چوم کر آنے ہوئے
ہوا کے جھونکوں کو اپنے سانسوں میں سمیٹتے ہوئے شامی
دفعتاً رک گیا۔ اور پھر دور۔ راوی کے پانیوں کی طرف
ایک لمحہ تک دیکھنے کے بعد کہنے لگا ـــــ "اور اُس دن
مجھے بڑا غصہ آیا۔ بڑا غصہ آیا۔ بالوں کی وہ لٹ جو اُس
نے مجھے محبت کے ابتدائی دنوں میں بھیجی تھی۔ میں نے
اُس کے سامنے ہی اپنے کوٹ کی جیب سے نکالی اور پھر
اس کے گچھے کو تتر بتر کر کے وہیں ہوا میں اِدھر اُدھر بکھیر
دیا۔ اُس نے اُن اڑتے ہوئے بالوں کو ایک لمحہ بھر کے
لئے دیکھا۔ اور پھر میری طرف دیکھے بغیر چپ چاپ واپس
چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا۔ شاید کچھ سوچ
رہا تھا۔ پھر میں نے واپس آنے کے لئے اپنے قدم
اٹھائے اور اُس لمحہ میرے دل نے مجھ سے کہا۔ یہ بکھرے
ہوئے بال سمیٹ لے۔ ورنہ پچھتائے گا" میں مستقل سے
ڈر رہا۔ پھر بھی چلتے چلتے میں نے کچھ بال اکٹھے کر لئے۔
اور کوٹ کی جیب میں دوبارہ ڈال دئے۔ مجھے یاد ہے
گھر آتے ہی میں نے وہ کوٹ اُتار دیا۔ اور پھر کبھی نہ پہنا۔
میں نے وہ بال بھی پھر کبھی نہ دیکھے ـــــ"
شامی خاموش ہوگیا۔ اور میں جواب تک خاموش رہا
تھا۔ دفعتاً سوچنے لگا۔ مجھے اب کہنا چاہیئے "پھر؟"
مگر وہ خود ہی آگے بڑھ گیا ـــــ "اور آج میں نے
اتنی مدت بعد پھر وہ کوٹ پہنا ہے۔ پھر وہ بال دیکھے ہیں۔
پھر اُس کے متعلق سوچا ہے۔ پھر ـــــ"

× × × ×

× × ×

دریائے راوی کے پل پر سنی ہوئی اُس پریم کہانی
کو کئی مہینے بیت گئے۔ لیکن نہ جانے آج مجھے وہ اپنی ساری
تفصیلات کے ساتھ دوبارہ کیوں یاد آرہی ہے ـــــ ابھی
ابھی ساغر میرے پاس سے اُٹھ کر گئی ہے۔ میں نے منتیں
کیں مگر اُس نے چائے کی پیالی کو چھوا تک نہیں۔

یاد رکھیئے

(۱) ساقی میں شائع ہونے کے لئے جو مسودات بھیجے جاتے ہیں
اُنہیں حتی الوسع محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم اُنکی واپسی
کی ذمہ داری ادارۂ ساقی نہیں لے سکتا اس لئے آپ اپنے مضمون
کی نقل اپنے پاس رکھ لیا کیجئے۔
(۲) جواب طلب امور اور واپسی مضامین کیلئے محصول ڈاک
بھیجا کیجئے۔ (۳) ساقی کے نہ پہونچنے کی شکایت ہر مہینے کے
دوسرے ہفتے میں کرنی چاہیئے۔ اسکے بعد پرچہ قیمتاً بھیجنا بھی
مشکل ہے۔ نمبر خریداری لکھنا نہ بھولئے۔ (۴) سالانہ چندہ
چھ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجا کیجئے۔ وی پی طلب کرنے میں
آپکو چار آنے زیادہ دینے پڑیں گے (۵) نمبر خریداری اور
اپنا پتہ خوشخط لکھیئے۔
نمونہ کا پرچہ نو آنے کے ٹکٹ بھیجکر طلب کیجئے۔
منیجر ساقی دہلی

درد نہاں

بیانِ شوق وزیانِ فغاں نہیں معلوم
انہیں ابھی مرا دردِ نہاں نہیں معلوم

قدم قدم پہ ہے قربانِ عظمتِ کونین
چلا ہے لے کے مجھے دل کہاں نہیں معلوم

میں نو اسیرِ قفس ہوں معاف کر صیّاد
میں کیا کروں؟ مجھے طرزِ فغاں نہیں معلوم

ابھی قبول نہ کر میرے سجدہ ہائے خودی
ابھی جبیں کو ترا آستاں نہیں معلوم

نگاہِ عشق میں ہم رنگ ہیں حیات و ممات
نگاہِ عشق کو سود و زیاں نہیں معلوم

حضورِ دوست ہیں اللہ بیخودی میری
چمن میں ہوں خبرِ گلستاں نہیں معلوم

زہے وہ دل جو نظر کردۂ تغافل ہو
خوشا وہ راز جسے رازداں نہیں معلوم

بہار ہو کہ خزاں ہو چمن پرست ہوں میں
مرے جنوں کو بہار و خزاں نہیں معلوم

کلی کلی ہے تبسم نواز اے اخترؔ
یہ کون سامنے ہو گلفشاں نہیں معلوم

سیدہ اخترؔ

نگینے

محبّت!

تمہاری جفا ہو کہ میری وفا ہو
محبت کا ہر نقش ہے غیر فانی

نقش کفِ پا

جو ہو نہ سکا نقشِ کفِ پائے محبّت
اُس دل کا ٹھکانا ہے نہ دُنیا میں نہ دیں میں

قربتیں ...؟

کہاں کی قربتیں؟ کسکا نظارہ؟ آہ کیا کہیئے
یہ عالم ہے کہ خود اپنی نظر سے دُور بیٹھی ہوں

بیوفائے محبّت

ہوا کس کی جانب سے آغازِ اُلفت
ادھر دیکھ او بے وفائے محبّت

نَو اسیر...!

ہوں نَو اسیرِ محبّت ؛ خطا معاف مجھے
خبر نہیں کہ رہ و رسمِ عاشقی کیا ہے؟

"سہارا"

عیش کیا دل کیلئے غم بھی سہارا نہ ہوا
تم ہمارے نہ ہوئے کوئی ہمارا نہ ہوا

"خدائے محبّت"

خدائے محبت نے کیا کیا سزا دی؟
کبھی لب پہ آیا جو نام محبّت

چشمِ توجہ!

کروں اب کس طرح خاطر تری چشمِ توجہ کی
نہ دل سینے کے اندر ہے نہ دل میں درد ہے باقی

"طوفان"

ساحل سے بڑھیں کیونکر، طوفاں سے بچیں کیونکر
جو ذرّہ ہے ساحل ہے جو قطرہ ہے طوفاں ہے

سیدہ اخترؔ

شاہد احمد دہلوی

یہ آل انڈیا ریڈیو ہے

ادارۂ نشریات کو ہندوستان میں قائم ہوئے دس سال
ہونے کو آئے مگر روز اول سے جو اس کی کل بگڑی ہے تو اب تک
درست ہونے میں نہیں آئی۔ اور سنورے بھی کیسے ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

مسٹر فیلڈن اس کے پہلے ڈائریکٹر تھے۔ یہ صاحب بی۔ بی۔
سی۔ کے کسی غیر معروف شعبہ کے ایک گمنام کارکن تھے۔ ان کے
نصیب نے زور مارا اور یہاں کے حاکم اعلیٰ بن گئے۔ ہندوستان
کے تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی، لسانی حقائق سے انہیں کوئی
واسطہ اور واقفیت نہیں تھی۔ لیکن حکومت کی مشین میں تو ہر
پرزہ فِٹ ہو جاتا ہے، چنانچہ مسٹر فیلڈن بھی سات آٹھ سال
یہاں کنٹرولر رہے اور اچھی گذار گئے۔ جب وہ یہاں سے جبر سے
سدھارے تو خدا کے فضل سے ملک کی چالیس کروڑ آبادی
میں اُن کی جدائی پر افسوس کرنے والا ایک متنفس بھی نہیں
تھا۔ اِن صاحب نے اپنی بے مثل لاعلمی سے اُردو ہندی کی دبی
ہوئی چنگاری کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ بنا دیا۔ ہندوستانی
پالیسی کی گانٹھ بھی انہی کی بوئی ہوئی ہے۔ اُردو کو اِن ذاتِ
شریف سے دوگونہ نقصان پہونچا۔ ایک تو ہندی کو اُردو
کے مقابلے میں پیش کیا، دوسرے ایک مصنوعی زبان ہندستانی
کو اُردو کے بدلے رائج کرنے کی سعیِ بلیغ فرمائی۔ اس میں
شک نہیں کہ مستقبل کا مورخ ہندی مسٹر فیلڈن کے نام کو
محسنِ ہندی کی فہرست میں نمایاں جگہ دیگا لیکن اس میں
بھی شبہ نہیں کہ دشمنانِ اُردو کے باب میں مورخ اُردو
مسٹر فیلڈن کا نام سرِ فہرست درج کریگا۔ زبان کا تو اُنہوں نے
ستیاناس کیا ہی تھا ہندوستان کی موسیقی کا مٹھ مارنا بھی
اُن کی اندھیر نگری کا ایک روشن کارنامہ ہے۔ ہندوستانی
موسیقی اتنا دقیق فن ہے کہ اسے آج تک کوئی غیر ہندوستانی
نہ سیکھ سکا، اور اس کا کلاسکی پہلو تو اس قدر دشوار ہے
کہ خود ہندوستانی اِس سے گھبراتے ہیں۔ فیلڈن صاحب نے
اس فنِ لطیف کو غارت کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر کچھ تو اس
فن کی دیر پائی اور کچھ سخت جانی کہ انکے ہاتھوں اس کا کام تمام
نہ ہو سکا۔ انہوں نے جس طرح اُردو اور ہندی ملا کر ہندستانی
بنانے کی کوشش کی تھی اسی طرح یورپی اور ہندوستانی موسیقی
کا ایک مضحک آمیزہ بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کے لئے بیشرمیا
مشاہرے پر جان فولڈز کو رکھا اور اس نے کئی مہینے میں دوچار
مہمل دھنیں بنائیں اور پھر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اوّل تو موسیقی
کے پروگرام کے لئے آج تک کوئی فن کار نہیں رکھا گیا اور اگر
کوئی تھوڑی سی سوجھ بوجھ کا آدمی اتفاقاً رکھا بھی تو رفیق
غزنوی قسم کا جو راگ اور تال دونوں سے نابلد ہونے کی
وجہ سے کلاسیکل موسیقی سے خائف ہے۔ یا سرور نیازی کی
وضع کا آدمی کہ قدیم و جدید دونوں سے متنفر ہے اور
صرف نظم خوانی ہی کو ہندوستانی سنگیت سمجھتا ہے رفیق
غزنوی فلموں میں نکل گیا اور اپنے صحیح ماحول میں پہونچ گیا
سرور نیازی کو اسٹیشن ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔ یوں ان کی جان
موسیقی سے یا موسیقی کی جان اُن سے چھوٹی۔ فیروز نظامی
اور بھٹا چاریہ ناقدری کے شکار ہوئے۔ جو باقی ہیں اُن کی
ترقی اس قصور میں بند ہے کہ وہ موسیقی سے حسبِ ضرورت
واقف ہیں۔ اگر انہیں ترقی دیدی گئی تو موسیقی کا کام کون
کرے گا؟ نتیجہ ظاہر ہے کہ دیر سویر یہ تینوں بھی چار حرف بھیج کر
الگ ہو جائیں گے۔ اور یہ ساری خرابی، ملازمتوں کی یہ ساری
پیچیدگی فیلڈن صاحب ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔ وہی
صاحب آل انڈیا ریڈیو کی کارکردگی کا غلط کینڈا بنا کر گئے
ہیں۔ گورنمنٹ کے اور دفتروں کی طرح انہوں نے ریڈیو کو بھی
ایک دفتر ہی سمجھا اور یہاں بھی کلرک بھرتی کر کے کام چلانے
کی غلطی کی۔ پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت ایک کلرک کی سی
رکھی اور ایک ماہرِ فن کی بھی۔ ٹیکنیکل آدمیوں کی ضرورت
انہوں نے سرے سے محسوس ہی نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ
سارا نظام کار بگڑ گیا اور ایسا بگڑا ہے کہ اب تک ٹھیک

ہو سکا۔ اب دو سال سے پروفیسر احمد شاہ بخاری کو مسٹر
فیلڈن کی میراث ملی ہے۔ سُنا ہے کہ چند نئی اور کارآمد تدبیریں
عمل میں آنے والی ہیں اور ان کے پیش رو جو بگاڑ پیدا کر گئے
ہیں اُن کے تدارک کی کوشش کی جاتی ہے۔ خدا کرے کہ یہ خبر
صحیح ہو۔ اب بھی گنجائش ہے کہ ہم مردے ارغب بدل ایڈ کار بند
چند طریق کار بہت ناقص ہے اور یکسر بدلی چاہتا ہے۔

حال ہی میں ہماری نظر سے ایک مضمون ایک معروف پبلی
سٹی کے متعلق گذرا جس میں مذکور تھا کہ اتوار کے اتوار جو
دیہی پروگرام نشر کیا جاتا ہے اُس کی ہر ایک سکرپٹ اُس علاقہ
کے مشہور پادریوں کے ذمہ ہے۔ اسی طرح بہت ممکن ہے کہ
دوسرے شعبوں میں بھی استمداد کی جاتی ہو۔ اگر آل انڈیا
ریڈیو بھی یہی پالیسی اختیار کرے تو بہت مفید اصلاحیں
اور اضافے ہو سکیں گے۔

ریڈیو کے ہر شعبے میں ماہرین فن رکھنے کی ضرورت
ہے۔ ہر شعبے کا ایک مشورتی بورڈ ہونا چاہیئے جو اہل فن اور
اہل الرائے پر مشتمل ہو۔ اس سے بیش بہا مشورے حاصل
ہونے کے علاوہ سٹیشن کے کارکنوں کو پبلک مطالبات
کا علم بھی ہو سکے گا۔ ایک پروگرام اسسٹنٹ کے مقابلے میں
ماہرین فن اور اہل رون کی متفقہ رائے یقیناً بدرجہا نافع
ہوگی۔ تقریروں، ڈراموں، عورتوں اور بچوں، دیہاتی موسیقی
اور تعلیمی پروگراموں سب میں ماہروں اور مشورتی کمیٹیوں
کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص چاہے وہ سٹیشن ڈائرکٹر
ہو چاہے پروگرام اسسٹنٹ عالم کل نہیں ہو سکتا ع۔
ہر کسے را بہر کارے ساختند

پروفیسر بخاری انگریزی ادب کے بہت معروف معلم
ہیں۔ اُردو ادب میں ان کے لکھے ہوئے مزاحیہ مضامین غیر
فانی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اِن سے بجا توقع کی جا سکتی ہے
کہ ریڈیو کے ادبی شعبوں پر بطور خاص توجہ کریں گے سب سے
… تقریریں ہیں جن کی تعداد کم و بیش ایک ہزار سالانہ
… ہے۔ اوّل تو ان تقریروں کو "تقریر" کے زمرہ ہی
سے خارج … چاہیئے۔ تقریر کی جاتی ہے لکھی نہیں جاتی۔
… جانے والے مضامین تقریری اسلوب میں
… TALK کا صحیح مفہوم ادا کرنے والا لفظ
ہماری زبان میں نہیں ہے) اس لئے اسے فی الحال تقریر ہی کہنا
بجا ہوگا۔ مگر ریڈیائی تقریر کو ریڈیو والے "بات چیت" کہتے
ہیں جو ایک غلط اور مغالطہ آمیز "اصطلاح" ہے۔ بات چیت
میں کم از کم دو کا شریک ہونا لازمی ہے۔ خیر تو یہ "بات چیتیں"
جو نشر کی جاتی ہیں ایک مقررہ پُرانے ڈھرے پر چل رہی ہیں۔
ہر تقریر پندرہ ہی منٹ کی ہوگی چاہے موضوع اس کی اجازت
دے یا نہ دے۔ موضوع اور اس کی حدود ریڈیو والے متعین
کر دیتے ہیں۔ اس لئے لکھنے والا اپنے اختیار سے نہیں بلکہ
دوسروں کے حکم کے مطابق (TO ORDER) لکھتا ہے۔
اس آمد اور آورد سے زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ ریڈیو
کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ قیود اور پابندیاں تو
رکھنی ہی پڑیں گی لیکن ان میں کمی اور زیادتی کرنے کی حسب
گنجائش ضرورت ہے ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

تقریروں کے بعد ڈرامے ہیں، فیچر اور رنگ برنگ
پروگرام ہیں۔ ریڈیو والوں کو شکایت ہے کہ اچھے ڈرامے
ہمیں ملتے کیوں نہیں؟ اس کی وجوہ پر بھی غور کرنے کی
ضرورت ہے۔ ایک ریڈیو ڈرامے کا معاوضہ وقت کے لحاظ
سے دس روپے سے پچاس روپے تک دیا جاتا ہے۔ اس درجہ
قلیل معاوضہ پر یقیناً اچھا ڈرامہ نہیں مل سکتا۔ اگر یہ رقم
چار گنی کر دی جائے تو البتہ اچھے ڈرامے مل سکیں گے۔ اس کے
علاوہ مشہور اہل قلم کی مستقل خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں
مگر اس کے لئے بھی ضروری ہے کہ انہیں معقول مشاہرے
دیئے جائیں۔ یہ نہیں کہ ایک سعادت حسن منٹو کو دو سو روپے
ماہوار پر رکھا جائے اور اس سے روزانہ ایک ڈرامہ یا فیچر
لکھوایا جائے، یہاں تک کہ وہ سال بھر ہی میں اپنی خدمات
کے ساتھ اپنی صحت بھی نذر کر دے۔ اور اس جانفشانی کا صلہ
ایک بدجبر سندھی ڈائرکٹر یہ دے کہ اُس سے استعفے کا
مطالبہ کرے۔ معقول مشاہرے کے ساتھ ساتھ ادیب کی
نازک مزاجی کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے اور جو سلوک ایک
آرٹسٹ کے ساتھ ریڈیو سٹیشنوں پر کیا جاتا ہے اسے کوئی خوددار
انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ خصوصاً موجودہ حالات میں کہ

فلم کمپنیوں سے ریڈیو کا مقابلہ ہے۔ مقابلہ تو دراصل ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ریڈیو کی دو سو کی ملازمت چھوڑ کر جتنے بھی اب تک فلموں میں گئے ہیں کسی کو چھ سو سے کم نہیں ملے اور بعض کو ہزار سو تک مل رہے ہیں۔ یہاں ہر مہینے بیس آئٹم لکھنے پڑتے تھے اور فلموں میں ایک کہانی چھ مہینے میں۔ اس قطعی ناموزوں مقابلے کے باوجود چند اچھے ادیب مل سکیں گے بشرطیکہ انہیں اُن کی شایانِ شان مشاہرہ دیا جائے اور انہیں حقارت سے نہ دیکھا جائے۔

موسیقی کا پروگرام سات گھنٹے روزانہ ہوتا ہے اور سب سے کم توجہ اسی پر دی جاتی ہے۔ اس شعبے میں بھی فلم سے مسابقت ہے اور اگر موجودہ فیسوں پر نظرِ ثانی نہیں کی جائے گی تو دلکش آوازوں سے سُننے والے دیر سویر محروم ہو جائیں گے۔ یہاں دن بھر کے دس گانوں کا کسی مشہور مُغنّیہ کو معاوضہ زیادہ سے زیادہ پچاس روپے دیا گیا ہے اور فلموں میں صرف تین منٹ کے ایک گانے کے اُسی کو پانچ ہزار روپے مل رہے ہیں یہ شاہ بڑے کی خبر نہیں ہے حقیقی واقعات ہیں۔ جبھی تو کوئی مشہور مُغنّیہ اب ریڈیو پر سُننے میں نہیں آتی۔ ریڈیو والے جنگ سے پہلے ہی کے پیمانے سے ناپ رہے ہیں اور دُنیا ہے کہ کہیں سے کہیں جا چکی۔ پانچ پانچ دس دس روپے تھما کر گویا ہمارے احسان کے ختم کئے دیتے رہے ہیں اور وہاں پچاس کے پانچ ہزار مل رہے ہیں اور رہا تو انعام اکرام الگ۔ ریڈیو فلموں سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا مگر اسی بھی کیا اندھیر نگری ہے کہ آرٹسٹ کو بالکل جو تیوں ہی میں بٹھا دیجئے ایسی ساری خرابیاں ہو جاتی ہیں۔ اور اگر جان بوجھ کر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو یہ ناؤ ڈوبے گی اور خواجہ خضر ہی اسے ڈوبنے سے بچائیں گے روپیہ خرچ کرنے کے اعتبار سے بھی یہ محکمہ ایک عجوبہ ہے روپے کی کوئی کمی نہیں ہے اور کروڑوں روپیہ سالانہ صرف کیا جاتا ہے مگر جہاں روپیہ صرف کرنے کی ضرورت ہے وہاں حتی المقدور خرچ نہیں کیا جاتا۔ مُتذکرہ بالا مثالوں کے علاوہ ملازمین کی تنخواہیں ہیں پوری دوسری ضروریات ہیں آلاتِ موسیقی ہیں جن کی افسوسناک کمی ہے۔ حد یہ ہے کہ سٹیشن پر کرسیاں تک پوری ہی نہیں ہیں اور اتنی عالیشان عمارت میں چھوٹی ٹوٹی کرسیاں پڑی دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی ملاقاتی آ جائے تو جہاں تہاں وہاں بیٹھے چپراسی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں کرسیاں تلاش کرتے پھرتے ہیں سٹیشن پر

ایک پانی گاڑی کی وضع کی چھکڑا موٹر ہے جس میں ... نکلی کرسیاں پڑی رہتی ہیں۔ معزز نشر کرنے والوں کی ... بوسیدہ تمام حمام سے بڑھائی جاتی ہے۔ سرکار کا ... زیادہ ضروری محکمہ اگر چاہے تو دس موٹریں حاضر ہو سکتی ہیں مگر جہاں اشرفیاں لٹتی ہوں اور کوئلوں پر مہر ... اس سے بھی زیادہ ادبار ہو تو تعجب کی بات نہیں۔

ملازموں کے فرائض کے سلسلے میں یہاں عجیب ... ہے۔ یہاں ہر شخص کو ہر کام پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی فلسفے یا معاشیات کے ایم۔ اے یا سائنس کے ایم ایس سی کو تقریروں پر لگا دیا جائے گا۔ جب تین مہینے میں وہ اپنے کام کی نوعیت سے کچھ واقف ہونے لگیگا تو اُسے ڈرامے کا کام سونپ دیا جائیگا۔ اور تین مہینے بعد عورتوں اور بچوں کا پروگرام اُس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہاں ابھی جمنے نہیں پائیگا کہ موسیقی میں اُسے جھونک دیا جائے گا اور پھر یا تو اُسے نالائق بنا کر نکال دیا جائے گا یا شہر بدر کر کے کسی اور اسٹیشن پر بھیج دیا جائے گا اور وہاں اس پر پھر یہی عمل دُہرانے کے بعد کسی تیسرے اسٹیشن پر بھیج دیا جائے گا۔ جب ایسا شخص نکالے نہ ملے اور کچھ نہ سیکھنے میں کامیاب ہو جائیگا تو اُسے ترقی دے کر پروگرام ایگزیکٹو بنا دیا جائے گا تاکہ ہمہ دانی سے سب کو محروم رکھتا رہے۔ سارے اسٹیشن ملڈن صاحب کی اسی پالیسی پر آج تک کاربند ہیں اور بقول فرنگیوں کے "کُتّوں کو چارہ ملتا ہے"۔

مسٹر سلطان احمد آتے بھی اور گئے بھی اور اُنکا فسانہ بھی ختم ہو گیا۔ آئے تو کچھ تڑپ تڑپ کے ہیں مگر بیٹھ گئے اور چھوٹتے ہی جو تقریر کی تھی اُس سے معلوم ہوتا تھا کہ سارے محکمے کو تہ و بالا کر دیں گے کیونکہ جناب نے سُننے والوں کو شکایتیں کرنے کی دعوت دی تھی اور خود ان کا تدارک کرنے کا ذمہ لیا تھا مگر نتیجہ صفر ہی رہا۔ اب سر آرکچ ... آتے ہیں۔ انہیں بھی دیکھئے یہ کیا دکھاتے ہیں۔

چند باتیں حواس وقت ذہن میں آ گئیں لکھدی گئی ہیں۔ ورنہ یہ حکایت تو اتنی لطیف ہے کہ بہت دیر تک بیان کرنے کی ضرورت ہے بشرط فرصت باقی پھر کبھی۔

نقد و تبصرہ

شب تاب:- اسرار الحق مجاز کی شاعری کی عمر دس سال ہے۔
اس دس سال میں وہ چاہتے تو ہمارے بعض
نوجوان شعرا کی طرح دس ہزار نہیں تو یک ہزار نظمیں اور غزلیں
کہہ سکتے تھے مگر مجاز ایک سلجھے ہوئے خیال اور ستھرے مذاق کا
شاعر ہے۔ اس عرصے میں اس نے سو سے زیادہ نظمیں غزلیں اور
قطعات نہیں کہے اور یہ ایسے ہیں کہ دل میں کھب جاتے ہیں مجاز
کی شاعری ہنگامہ پرور اور انقلاب انگیز نہیں ہے۔ اس کی شاعری
رسیلی اور شریلی ہے۔ وہ صور پھونکنے کا قائل نہیں ہے بانسری کا
دلکش نغمہ سناتا ہے۔ اور اس نغمے میں دبی دبی سی آگ کی گرمی
محسوس ہوتی ہے مجاز صرف جمال ہی کا شاعر نہیں ہے اس کا
ایک پہلو جلال بھی ہے مگر جمال میں لپٹا ہوا اور جب اس کی آتشیں
نے سے چنگاریاں اڑنے لگتی ہیں تو وہ بھی جگنو بن جاتی ہیں اور
شرارے خوشہ رنگ تتریاں۔ مجاز کا مختصر مجموعۂ کلام "آہنگ"
کے نام سے شائع ہوا تھا اب "شب تاب" کے نام سے آہنگ مع
اضافۂ جدید کے شائع ہوا ہے اور اسے ہم اُردو کے ایک معروف
شاعر کا روشن کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ قیمت ؏ ۔ ناشر ہندستانی
پبلشرز اُردو بازار۔ دہلی!

مجھے خرید لو:- شوکت تھانوی اُن چند مزاح نگاروں میں سے
ایک ہیں جنہیں ظرافت و خوش مذاقی کا صحیح
اندازہ ہے۔ ان کے بے ساختہ فقرے پڑھکر ہر شخص کھلکھلانے
لگتا ہے۔ لکھنؤ ریڈیو کی ملازمت کے زمانے میں انھوں نے بیسوں
طربیہ ڈرامے، فیچر لکھے اور سننے والوں میں بہت مقبول ہوئے۔
"مجھے خرید لو" کے نام سے ان کے دس منتخب ریڈیائی ڈرامے
شائع ہوئے ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ انہیں پڑھنے میں بھی وہی
لطف آتا ہے جو سننے میں آتا ہے۔ ٹائیٹل کی تصویر اور کتاب
کا نام بجائے خود ایک لطیف ستم ظریفی ہے۔ قیمت ؏!
ناشر ہندستانی پبلشرز۔ اُردو بازار۔ دہلی!

ایک حمام میں:- نواب خواجہ محمد شفیع صاحب دلی کے سربرآوردہ
انشا پرداز ہیں۔ دلی میں ادب و شعر کا چرچا
انہی کی جواں ہمتی سے قائم ہے۔ موصوف کی کئی کتابیں اب تک شائع
ہوکر قدردانی کے ہاتھوں لی جا چکی ہیں۔ گذشتہ مہینے ان کا
ایک مختصر ناول "ایک حمام میں" شائع ہوا ہے۔ یوں تو طوائفوں
کے متعلق اُردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور "شاہد رعنا"
"اُمراؤ جان ادا" اور "لیلیٰ کے خطوط" بقائے دوام حاصل کرچکے
ہیں لیکن اس ناولٹ میں جو واقعاتی تصویر پیش کی گئی ہے وہ
نہ تو تصور کی کارفرمائی سے پیش کی جا سکتی ہے اور نہ نرے
مشاہدے سے۔ اِس ناول کے کردار سانس لیتے معلوم ہوتے
ہیں اور کیا عجب کہ واقعی سانس لے رہے ہوں۔ مقامی رنگ
میں ڈوبا ہوا یہ ناولٹ دلی والوں کے علاوہ باہر والوں کے لئے
بھی ایک دلکش مطالعہ ہے۔ ایک خصوصیت جو اسے پیشرو ناولوں
پر فوقیت دیتی ہے اس کا لذیذ طرز بیان ہے۔ اِس اسلوب میں
لکھنے والا اب دلی میں کوئی اور باقی نہیں ہے ہر فقرہ چپا تلا،
برجستہ ٹکسالی محاورے، بات میں سے بات نکلتی چلی آتی ہے۔
پوری کتاب اِس طرز میں لکھنا بڑی محنت اور جگر کاوی کا کام
ہے۔ قیمت ؏۔ ناشر۔ ہندستانی پبلشرز۔ اُردو بازار دہلی!

معاہدۂ ہندو برطانیہ:- سر سلطان احمد صاحب کی قانونی
قابلیت مسلّم ہے۔ ہندوستان سے
برطانیہ کے جو معاہدے ہیں اُن کی نوعیت پر موصوف سے زیادہ
لب کشائی کا حق اور کوئی نہیں رکھتا۔ ہمیں چونکہ سیاسیات
میں زیادہ درک نہیں ہے۔ اس لئے اِس کتاب کے متعلق ہم کوئی
رائے نہیں دے سکتے۔ کتاب آسان اُردو میں لکھی گئی ہے اور
چونکہ ایک مقتدر صاحب فن نے لکھی ہے اس لئے سیاسیات
سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یقیناً مفید اور کارآمد ہوگی
قیمت ؏۔ ناشر۔ ہندستانی پبلشرز۔ اُردو بازار۔ دہلی!

قندیل:- جدید اُردو شاعری میں جن شاعروں نے فن کو
سمجھکر اور بہت محتاط ہوکر آزاد نظمیں کہی ہیں
اُن میں قیوم نظر پیش پیش ہیں۔ "قندیل" اِن کا منتخب مجموعۂ
کلام ہے۔ اس میں پابند نظمیں، آزاد نظمیں اور غزلیں شامل ہیں

قیوم نظر نے ہیئت کے کامیاب تجربے کئے ہیں۔ ترقی کے لئے نئے نئے تجربے کرنے کی ضرورت بھی ہے۔ اچھوتے خیالات، نئی ترکیبیں موضوع کے لحاظ سے ہم آہنگ الفاظ، نئی بحریں، نئے اشارات، نئے اسلوب، فکر کے نئے سانچوں میں ڈھل کر جو کلام نکلتا ہے وہ نئی شاعری کی ضمن میں آتا ہے۔ قیوم نظر اس اعتبار سے ایک نئے شاعر ہیں اور چونکہ اپنے ماثراتِ شعری کو بڑی خوبی سے منتقل کرتے ہیں اس لئے کامیاب بھی ہیں۔ ان کے کلام میں وہ گہری رمزیت نہیں ہے جو آج کل بطور فیشن مروج ہے اور جو ستارِ عیوب بھی ہے۔ صرف لطیف کنائے و اشارے ہیں جو ہماری شاعری کی روح سمجھے جاتے ہیں۔ کتاب خوشنما اور دیدہ زیب ہے۔ قیمت

ملنے کا پتہ۔ اُردو بک اسٹال لوہاری گیٹ۔ لاہور۔

تعمیرِ ملت:۔ جناب محمد شریف چشتی۔ ایم۔ اے کی تصنیف ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ فرد کی اصلاح اور تہذیب پہلے ضروری ہے تاکہ ملت کی ہمہ گیر تعمیر ہو سکے۔ کتاب چار ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے باب میں اسلامی اصول و مبادیات کا بیان ہے۔ دوسرے میں ہیئت کی تعمیر بیان کی گئی ہے تیسرے میں قرآنی نقطۂ نظر سے اطاعت کی بحث پیش کی گئی ہے اور چوتھے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ موجودہ حالات میں تعمیرِ ملت کیونکر ممکن ہے اور اسے کیسے قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب اپنی افادی حیثیت کے اعتبار سے اس لائق ہے کہ ہر مسلمان، چاہے وہ کسی عقیدے اور خیال کا ہو، اس کا مطالعہ کرے۔ خدا توفیق دے تو اس کی بتائی ہوئی تجویزوں پر عمل بھی کرے۔ چشتی صاحب نے ایسے خشک موضوع کو اپنی اعلیٰ ادبی قابلیت اور دلپذیر طرزِ بیان سے اتنا دلکش بنا دیا ہے کہ کتاب شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے چھوڑی نہیں جا سکتی۔ قیمت

ملنے کا پتہ۔ اُردو بک اسٹال۔ لوہاری گیٹ۔ لاہور۔

قاتل:۔ دنیائے ادب میں میاں ایم۔ اسلم کا اسمِ گرامی اور اُن کی افسانہ نگاری اس قدر مقبول و معروف ہے کہ تعارف و تنقید کی ہر کوشش تحصیل حاصل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اُن کے افسانے اور ناول ہندوستان کے ہر گوشے میں شوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور ہر طبقہ اور ہر درجہ کے افراد بقدرِ مذاق ادب اُن کی تخلیقات سے متاثر و محظوظ ہوتے ہیں۔ اُردو زبان پر میاں صاحب کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اپنی انفرادی کوششوں سے اُردو ادب میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ "قاتل" اسلم صاحب کے سات افسانوں کا مجموعہ ہے جسے مکتبہ دارالبلاغ نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ یوں تو اس مجموعے کا ہر افسانہ میاں صاحب کے طرزِ نگارش کی تمام خصوصیات کا حامل ہے، لیکن آخری افسانہ "میرے نام" خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ اس افسانہ کا ہر لفظ سماجی بے اعتدالیوں پر ایک مکمل نوحہ ہے، جس میں درد اور تاثر کوٹ کوٹ کر بھر دئے گئے ہیں۔ پلاٹ کی دلچسپی، طرزِ بیان کی عمدگی اور مکالموں کی سادگی اس پر مستزاد ہے۔ "قاتل" ایسے افسانوں کا مجموعہ ہے، جنہیں پڑھ کر دلچسپی کے ساتھ ایک سبق بھی آپ کو ملے گا۔ صفحات ۲۰۸ لکھائی چھپائی عمدہ۔ مجلد مع نظر فریب سرورق۔ قیمت

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ دارالبلاغ محمد نگر، میو روڈ۔ لاہور۔

روپ سنگھار:۔ جہاں تک دیہاتی زندگی اور اُس کی سادگی اور معصومیت کی حقیقی تصویر کشی کا تعلق ہے، ملک کے افسانہ نگاروں میں، منشی پریم چند کے بعد ڈاکٹر اعظم کریوی کا کوئی حریف نہیں، وہ اپنے افسانوں میں، تمدن کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ دیہات کی صاف اور سادہ زندگی کی عکاسی اور کامیاب عکاسی فرماتے ہیں "روپ سنگھار" ان کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے، جس کا ہر افسانہ معاشرتی اور اخلاقی معیار پر پورا اُترتا ہے، رہیں دوسری افسانوی خصوصیات سو اُن کے لئے اعظم صاحب کا نام ہی کافی ہے۔ صفحات ۱۹۶ لکھائی چھپائی عمدہ، مجلد مع رنگین گرد پوش۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ دارالبلاغ محمد نگر میو روڈ۔ لاہور۔

ممی خانہ:۔ حجاب امتیاز علی ایک مخصوص اور ستھرے مذاق کی لکھنے والی ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے مضامین ہر حلقے میں دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں اور بڑی وقیع نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ حجاب امتیاز علی نے ایک نرالی تخیلی دنیا کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ اس پر حقیقی دنیا کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ان کے سب کردار توانا زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ بعض حضرات فراری ادب کو مطعون کرتے ہیں، غالباً اس وجہ سے کہ انہیں اس کی افادیت محسوس نہیں ہوتی۔ ذہنی ترفع اور ذہنی آسودگی کی اگر کوئی قیمت ہو سکتی ہے تو ایسے ادب کی اہمیت کا اندازہ

[illegible] سکتا ہے۔ موصوف ایک حسن کار ادیب ہیں اور ان کے تخیل کی لطافت اور اعجاز بھی انہیں اُردو کے مخصوص قلمکاروں میں ممتاز کرتی ہے۔ "میخانہ" ان کے سات ہیبت ناک و پُر اسرار افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دہشت کا ماحول پیدا کرنے میں مصنف بہت کامیاب ہیں۔ اور سب سے زیادہ دلکش ان کا وہ اسلوب بیان ہے جس کی نقل آتارنے میں اب تک کوئی کامیاب نہیں ہوا۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:- پبلشرز یونائیٹڈ چوک انارکلی لاہور۔

دیکھا تشنگی زبان کا ایک باکمال شاعر ہے،

اسرارِ حیات:- جس کا دورِ حیات صحیح طور پر متعین نہیں ہوسکا ہے، تاہم وہ زمانۂ وسطیٰ کا ایک صوفی منش شاعر ہے، جس کا کلام مساوات، خلوص، صداقت اور محبت جیسی انسانی صفات عالیہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ نہایت مصالحانہ اور دردمندانہ انداز میں چھوت چھات اور طبقاتی امتیازات کی بُرائیاں بیان کرتا ہے اور تمام انسانی معاشروں کو ایک سطح پر دیکھنے کے لئے بے چین نظر آتا ہے۔ اسرارِ حیات کے نام سے الیشور اڈیا صاحب (ڈاکٹر آف فلاسفی) جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے دیا اور اس کی شاعری پر تحقیقی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب مفید اور قابلِ قدر ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ لطیف قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:- جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد۔ دکن۔

دامِ خیال:- ضیاء الاسلام صاحب نثر تو خیر لکھتے ہی تھے، اب انہوں نے نظم پر بھی کرم فرمایا ہے ؎

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

چنانچہ "دامِ خیال" کے نام سے ان کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے، جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ اس مجموعہ میں کچھ نظمیں ہیں اور کچھ قطعات، چند غزلیں ہیں اور چند متفرق اشعار، کہیں کہیں فارسی اشعار بھی ہیں، غالباً اس لئے کہ موصوف نے تخیل کی ترجمانی کے لئے اُردو کے دائرہ کو تنگ پایا، یا پھر یہ مقصد ہوسکتا ہے کہ وہ اُردو ہی نہیں فارسی میں بھی شعر کہہ سکتے ہیں۔ بہرحال "دامِ خیال" کا سارا سرمایہ موجودہ عام رجحانات کی تصویر ہے، جس میں "انفرادیت" کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ مرقعِ چغتائی کی نہایت بھونڈی نقل کے طور پر کہیں کہیں تصویریں بھی ہیں، جنہیں دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:- حلقۂ ادب ۱۳۔ اسٹینلے روڈ۔ الہ آباد۔

شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

جرعات

ششماہی سالانہ تین روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۳۲	ساقی دہلی؛ بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۵ء	نمبر ۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاہد احمد دہلوی

نگاہِ اوّلیں

ساقی کی گزشتہ چند اشاعتوں میں ہم نے لکھا ہے کہ مشہور لکھنے والوں کے علاوہ نئے لکھنے والوں کے مضامین بھی درج ساقی کئے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ساقی مشہور لکھنے والوں سے بیزار ہے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ساقی ہر نئے لکھنے والے کا مضمون شائع کرنے کا مدعی ہے۔ ان میں سے ایک صورت بھی ممکن نہیں ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ ادب بھی بدلتا جاتا ہے۔ ادب وہی زندہ اور پائدار ہوتا ہے جو زمانے کا ساتھ دیتا ہے۔ نئے نئے عناصر ادب میں شامل ہوتے رہتے ہیں اور پرانے اور فرسودہ اجزا کھوٹے سکے کی طرح خود بخود خارج ہوتے رہتے ہیں۔ ہمارے بعض پرانے لکھنے والے جو بیس سال پہلے ادب کے درخشاں ستارے سمجھے جاتے تھے اب پڑھتے پڑھتے یکسر غائب ہو گئے۔ ادب کے ترقی پسند تقاضوں کے وہ متحمل نہ ہو سکے، اس لئے انہیں دوسروں کے لئے جگہ چھوڑنی پڑی۔ سدا سے یہی دستور ہے اور یہی رہے گا ؎

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

کتنے ہی شہاب ثاقب اپنی چمک دمک دکھا کر ہمارے دیکھتے دیکھتے غائب ہو گئے اور کتنے ہی نئے ستارے طلوع ہوئے اور آفتاب بن کر چمک رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو ادب کو زندگی دیتے ہیں اور ادب ہی سے زندگی لیتے ہیں۔ ساقی میں ہر مہینے دو چار نئے ادیب اور شاعر پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ وہ حضرات ہوتے ہیں جن سے ہم اچھی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں۔ مضمون نگاری کا شوق ماشاءاللہ اتنی ترقی کر گیا ہے کہ ساقی کے لئے ایک مہینے میں اوسطاً ایک ہزار مضامین نظم و نثر موصول ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کے سب قابل اشاعت نہیں ہوتے اور ان میں سے معدودے چند ساقی کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے ان میں سے بھی انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یوں صرف دو چار نئے لکھنے والے ہی بزم ساقی میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ہماری تو یہی خواہش ہے کہ نئے نئے لکھنے والے منظر عام پر آئیں اور مستحق نوجوان متعارف کرنے میں پیش پیش ہوں لیکن ہماری بھی چند مجبوریاں ہیں جنہیں آپ نظر انداز نہ فرمائیں اور ہماری تنگ دامانی کو تنگ دلی سے تعبیر نہ کریں۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں ساقی کی ضخامت میں کم از کم آٹھ صفحے کا اضافہ ہو سکے گا اور ہم نئے لکھنے والوں کی بہت کچھ زیادہ خدمت کر سکیں گے۔

سفید کاغذ دورانِ جنگ میں ایسا غائب ہوا کہ اس کی صورت کو ترس گئے۔ اسے جنگ کے ہتھیاروں میں شامل کر لیا گیا تھا اس لئے عوام کے لئے نایاب ہو گیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد حکومت نے قدرے قلیل راشن بطور دینا شروع کیا اور اب اس کی مقدار میں تھوڑا سا اضافہ کر دیا ہے۔ ساقی بک ڈپو کی تقریباً نصف مطبوعات نایاب ہو چکی ہیں حسب گنجائش انہیں شائع کیا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دو ایک نئی تصانیف بھی پیش کی جائیں گی۔ اُمید ہے کہ چھ مہینے میں ساقی بک ڈپو کی ویرانی دور ہو سکے گی اور حسبِ سابق عمدہ کتابیں آپ کے مطالعہ میں آ سکیں گی۔

سالنامہ ساقی کے لئے خاص اہتمام و کاوش سے اعلیٰ درجے کے مضامین فراہم کئے گئے ہیں۔ مضامین کی نا تمام فہرست اس پرچے کے آخری صفحات میں آپ کو ملے گی۔ اُسے ایک نظر ملاحظہ فرمائیے۔ سالنامہ سنہ ۱۹۴۶ء ۲۵۰ یا ۳۰۰ صفحے کا ہوگا قیمت ڈھائی تین روپے ہوگی مگر مستقل خریداروں سے اس کی علیحدہ کوئی قیمت نہیں لی جائے گی۔ ساقی نہایت پابندی اور احتیاط سے ہر مہینے مستقل خریداروں کو بھیجا جاتا ہے چنانچہ سالنامہ بھی جنوری کے پہلے ہفتے میں ارسال خدمت کیا جائے گا۔ افسوس ہے کہ ڈاکخانہ پرچہ کھوئے جانے کا ذمہ نہیں لیتا، اس لئے بہتر یہ ہے کہ آپ سالنامہ کی رجسٹری کے لئے تین آنے کے ٹکٹ دفتر ساقی کو بھیج دیں ورنہ سالنامہ کھوئے جانے کی صورت میں سالنامہ سے یا تو ہمیں ہاتھ دھونے پڑیں گے یا آپ کو یا دونوں کو۔

مُستقل خریداروں کو ساقی کے سب خاص نمبر مفت دئیے جاتے ہیں۔

میراجی

باتیں

فضاؤں کی وسعت میں ہزاروں لاکھوں ستارے ہیں، ہم سے ہزاروں لاکھوں میل دُور، ایک دوسرے سے ہزاروں لاکھوں میل دُور، ہزاروں لاکھوں سالوں سے موجود، ہزاروں لاکھوں شکل و صورت اور قد کے، کئی اتنے بڑے کہ ان میں زمین جیسے ہزاروں لاکھوں کُرّے سما جائیں، سب کے سب ہزاروں لاکھوں میل فی لمحہ کی رفتار سے رواں، کتنی ہیبت ناک اور پریشان کُن کیفیت ہے اور نجومیوں اور منجموں کی ہزاروں لاکھوں مختلف دوربینوں سے گریزاں ہو کر ان ستاروں کو شاعرانہ نظر سے دیکھئے تو کس قدر راحت و اطمینان اور تسکین حاصل ہوتی ہے۔

دو پل کی اس زندگی میں انسان کو جو دھرتی پر ایک مسافر ہے اپنے آپ سے اولاد سے آس پاس سے ہم آہنگی کی ضرورت ہے اس کے لئے وہ کسی ایسے لمحے کی تلاش میں ہے جو اس کو شانتی دے۔

دھرتی پر گنگناتے ہوئے آبشار، سرسراتی ہوئی ہوائیں، کھولتے ہوئے طوفانی سمندر، آگ اگلتی ہوئی جوالا مکھی سبھی اپنی اپنی دُھن میں مگن ہیں۔ مگر نہیں! ان ایک سے ایک نرالی دھنوں میں مسافر کو اپنے دل کی پکار یا اس پکار کی گونج ہمیں سنائی دیتی ہے وہ اب بھی اسی طرح بے چین ہے وہ پرندوں کے رسیلے گیتوں کو سنتا ہے لیکن ہمیں یہاں بھی اس کی پکار کسی آواز سے ٹکرا کر ہمیں پلٹتی اچانک دیوتا اس کی حالت کو دیکھتے ہیں پاربتی جی اُسے ایک نئی خوشی کی خبر سناتے ناچنے لگتی ہیں۔ مسافر اس ناچ کی جھنکار میں اپنی پکار کی گونج کو ایک نئے روپ میں پاتا ہے —— لیکن یہ مسافر کون ہے کس درجے میں سفر کرنا چاہتا ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایسے مسافروں کے پاس پہلے یا دوسرے درجے کا ٹکٹ ہی نہیں ہوتا بلکہ بعض صورتوں میں یہ بے ٹکٹ ہی سفر کرتے ہیں تو پھر سیدھی طرح آگرے اور بریلی کیوں نہیں چلے جاتے۔

ماضی حال اور مستقبل تین مسخرے ہیں۔ ہاتھ میں ہاتھ دئیے پہلو بہ پہلو ہر لمحہ ایک دوسرے سے دُور چلے جا رہے ہیں ایک دوسرے سے دل لگی کرتے اپنا اپنا بوجھ ایک دوسرے پر لادتے ہوئے اور اس دل لگی میں ماضی سب سے زیادہ گھاٹے میں ہے اور مستقبل سب سے زیادہ مزے میں ہے کیونکہ ہر لمحہ وہ اپنے بارِ گراں کو حال کے ذریعے سے ماضی کے کاندھے پر ڈالے جا رہا اور ماضی اپنے بارِ گراں کی دولت سمیٹتے ہوئے سنجیدہ تمسخر کا نمونہ ہے حال کا سچ کلمہ اپنا نہیں ہے۔ کیونکہ دُھندلا مستقبل چپکے چپکے اُس کے پہلو میں ننھے ننھے لمحے کی چٹکی لیتا ہے کبھی تو یہ چٹکی ایک لمحے ہی کی مانند ہلکی پھلکی ہوتی ہے اور اس صورت میں حال مسکرا دیتا ہے یا اگر زیادہ مزے میں آ گیا تو ہنس دیا اور کبھی مستقبل اس شدت سے چٹکی بھرتا ہے کہ حال کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے ہیں۔ ماضی کو اس سے کچھ غرض نہیں کہ مستقبل نے کیسی چٹکی بھری یا حال کے ہونٹوں پر تبسم نمایاں ہوا یا اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اس کا کام صرف اتنا ہے کہ تبسم ہو یا چشمِ نم خندہ ہو یا گریہ بہر صورت اسے اپنے دل میں جگہ دے اور یوں ایک ساتھ اپنا اپنا الگ سفر طے کرتے ہوئے ماضی مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا جاتا ہے اور حال کی نگاہیں دائیں بائیں آگے پیچھے اوپر نیچے سب طرف پڑتی ہیں اور مستقبل ان دونوں سے بے پروا آگے ہی آگے دیکھ رہا ہے۔ لیکن اس بات پر مستقبل مضطرب ہے کہ ہر لمحہ اسے پہلے حال اور پھر ماضی کا بہروپ بھرنا ہے۔ اور پھر کبھی اپنے آپ ہی نہیں آتا ہے اس لئے وہ اپنے اس اضطراب کو ہر ہر قدم پر اپنی شوخی اور متلون مزاجی سے مٹاتا جاتا ہے حال اپنے بارے میں کچھ نہیں سوچتا کیونکہ وہ تو صرف مستقبل اور ماضی کا مددگار ہے۔ ماضی اور مستقبل کی سوجھ ہی سے اسے فرصت نہیں —— اور ماضی مطمئن ہے اپنے [illegible]

مٹھیا رہا مگن ـــ اس بات پر کہ وقت کے آخری لمحے میں نہ مستقبل رہے گا نہ حال صرف ایک گہرا گمبھیر ماضی ہوگا، ماضی، ماضی ا ـــ اور پھر یہ تینوں مسخرے ہاتھ میں ہاتھ دئے ہر لمحہ ایک دوسرے سے منہ موڑے چلے جا رہے ہیں،

کسی دن پیچھے سے جا کر تیرے پہنے ہوئے کپڑے جو تو نے ابھی ابھی اتارے ہوں چرا لاؤں اور اسے گھر کی ہوس میں انہیں دیکھ دیکھ کر انہیں اپنے سینے سے لپٹا لپٹا کر ان سے اپنے گالوں کو سہلا کر تسکین حاصل کروں ان میں رچی ہوئی تیرے جسم کی خوشبو مجھے لاکھوں شراموں سے کہیں بڑھ کر مست کر سکتی ہے اور تیرے جسم کی ساخت سے جو سلوٹیں ان میں پیدا ہو جاتی ہیں ان کے مقابل میں سمندر کی لہریں اور گھٹاؤں کی گڈراہٹ کچھ حقیقت نہیں رکھتیں خوبصورت لڑکی! میرے خیالات ایک مرکز پر جمع ہو کر روز بہ روز دل کی بےقراری کو زیادہ کئے دیتے ہیں وہی سادہ آرزوئیں جو ازل سے انسان کے خون میں ڈال دی گئی ہیں تہذیب و تمدن کے اثرات کے تحت ذرا سے اختلاف کے ساتھ میرے دل میں بھی تڑپ رہی ہیں۔ اور ایسی ہی آرزوئیں تیرے دل میں بھی ہوں گی کہ تو بھی جوان ہے اور میں دل پسند میری نارمیں اپنے اور تیرے دونوں جسموں کو ملا کر اس ابدی راستے پر حیران ہو جو اسی قدر پریشان نظری کے باوجود ذہن و روح انسانی کا واحد مقصد ہے۔

دن بیت چکا شام آئی سورج چھپا چاند نکلا دو ایک تارا جگمگا لے لگا پھیلا ہوا چپ چاپ آکاش سوئی ہوئی چپ چاپ دھرتی اور دھرتی پر بسنے والوں سے دور ایک کلی سی چاندی برہ کی ماری دوری کے دکھ سے نڈھال بیٹھی ہوئی پیا کے آنے کی راہ تک رہی ہے، (پیا آتے ہی نہیں) وعدہ پورا نہیں کرتے ایک ایک سانس دکھ کا گیت بنتا جا رہا ہے۔ دن بھر پھیرا کر کے پنچھی بھی بسیرا کرنے کو چلے گئے پھلواری میں پھیلتی ہوئی سگندھ ہلکے ہلکے جھونکوں پر اڑ رہی ہے لیکن برہن چپ چاپ بیٹھی ہے۔ اچانک اسے دھیان آتا ہے سامنے بیٹھے ہوئے پنچھی کو اپنے پاس بلاتی ہے۔

(چبوترے پر پہلا پنچھی کم گرایا گیا) لیکن برہن پنچھی سے کہتی ہے پنچھی تو ہی پیا کے پاس جا کر برہن کے دل کا حال سنائیگا۔ برہن کا اب تو ایک ہی سہارا ہے اور پنچھی سنتا ہے برہن کے بین (محمد شاہ رنگیلے کے درباری گویّے خیال کی ایجاد کی ہے) درد سے بھرے ہوئے رسیلے میں برہن سندیس دیتی سوچتی ہے۔ کہوں نہیں یہ ٹھیک نہیں۔ کہوں اس کا اثر ہوگا نہیں یہ بھی ٹھیک نہیں، کچھ اور کہوں لیکن کیسے کہے اس کے دل کی تو یہ حالت ہے پتیاں میں کیسے لکھوں لکھ ہی نہ جائے (ابھی اس نے تو ابھی فیصلہ ہی نہیں کیا) جوں توں دل کی بات کچھ آدھی کچھ پوری پنچھی سے کہہ دیتی ہے، پنچھی پھریری لیتا ہے اور اڑتا ہے اڑ جاتا ہے پیا کو سندیس دینے گیا ہے۔ (رسمی سیٹنگ ـــ برہن بیٹھی اب بھی راہ دیکھ رہی ہے' اب آتا ہے' اب آتا ہے، لیکن آتا نہیں)۔ پنچھی تو جیسے اڑتا ہی چلا جاتا ہے (روؤ اپنی قسمت کو) کیوں نہیں آتا کون جانے برہن کا جی اٹھتی ہے ـــ آئیے ہم بھی کانپتے ہوئے پنچھی کی تلاش میں نکلیں آخر کب تک باتیں کرتے جائیں گے باتیں کرتے کرتے بھی انسان تھک جاتا ہے۔

محمد حسن عسکری

جھلکیاں

آج مجھے ایک ایسی کتاب کا ذکر کرنا ہے جو ایک ساتھ دہشتناک، ہولناک، طربناک اور سکون آمیز سب کچھ ہے ——— جو غراتی ہے، ڈراتی ہے، لیکن نرمی سے تھپکتی بھی ہے، جو زہر میں بجھا ہوا تیر بھی ہے اور امرت بھی۔ اس کتاب میں ہر بیان ایک ذاتی اور حسیاتی تجربہ ہے، ایک شخصیت کا اظہار ہے، اور وہ تجربہ وہ شخصیت ہی کیا جو ان سب چیزوں کا امتزاج نہ ہو؟ اور یہ بھی آپ اسی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر یہ کتاب اردو میں ہے تو کس کی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اگر آپ اردو کی موجودہ نظم اور شعر سے واقف ہیں تو یہ بیان سن کر آپ کا خیال صرف ایک ہی طرف جا سکتا ہے، یعنی حضرت فراق گورکھپوری کی طرف۔ اس نئی کتاب کا نام ہے "اردو کی عشقیہ شاعری"۔

پہلے ایک اعتراض سے نمٹتا چلوں۔ اس کتاب میں تاریخی حیثیت سے اردو کی عشقیہ شاعری کا ایک سرسری سا جائزہ بھی شامل ہے۔ اس جائزہ کو ایک تبصرہ نگار نے غیر تسلی بخش بتایا ہے، یا ایسی ہی کوئی چیز۔ اس کتاب پر اسی قسم کے اور اعتراض بھی وارد ہو سکتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ایسے معترض دراصل فراق صاحب کو سمجھتے ہی نہیں۔ کم سے کم وہ کسی معمولی نقاد سے وقائع نگاری یا تاریخ نویسی کی توقع رکھتے ہیں۔ [illegible] کر گزرے تو خیر اور بات ہے۔ مانا کہ یہ کام بھی ضروری ہے اور اس کی بھی اپنی اہمیت ہے، لیکن حقیقی نقاد کا کام عظیم فن پاروں سے متاثر ہونا اور ان کے متعلق سوچنا ہے یا شاعروں کی حاضری لینا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے جائزے کا خیال ہی فراق صاحب کو ناحق آیا۔ اس کے بدلے اگر وہ کچھ شعروں کا انتخاب شامل کر دیتے تو کتاب کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ بہرحال نہ تو مجھے ایسے اعتراضوں کی فہرست میں اضافہ کرنا ہے، اور نہ ان کا جواب دینا، بلکہ صرف اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔

سب سے مخدوش بات اس کتاب میں یہ ہے کہ یہ پڑھنے والے کو اپنا دل اور دماغ ٹٹولنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آپ یہ کتاب پڑھیں اور اپنے معیاروں سے غیر مطمئن نہ ہو جائیں، یا کم سے کم ان پر نظر ثانی نہ کریں۔ چنانچہ اس کے پڑھنے سے اپنی قلعی بری طرح کھلتی ہے۔ اسی وجہ سے میں نے اسے زہر میں بجھا ہوا تیر کہا ہے۔ بہت سے پڑھنے والے ایسے بھی ہوں گے جنہیں فراق صاحب پر غصہ آئے گا، اور بری طرح جھنجھلائیں گے، کچھ لوگ حقیقت سے آنکھیں چرانے کی کوشش کریں گے، کچھ اپنے آپ کو طرح طرح کے دلاسے دیں گے۔ غرضکہ یہ کتاب عجیب عجیب گل کھلائے گی۔

ممکن ہے کہ یہ کتاب کئی آدمیوں کو عشق سے، یا شاعری سے بلکہ زندگی سے ہی ڈرا دے۔ آدمی کو بزدل بنا دینے کی پوری صلاحیت اس کتاب میں پائی جاتی ہے۔ کم سے کم میرے لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہو گی اگر کوئی آدمی اسے پڑھنے کے بعد گھٹ کے، اور سکڑ سمٹ کے رہ جائے۔ اسے پڑھنا واقعی ایک امتحان ہے، صرف سخن فہمی کا ہی نہیں بلکہ آدمیت کا بھی، اور آدمی کے ذہنی کلچر کا بھی۔ یہ کتاب ان کتابوں میں سے ہے جو صاحب فہم اور احساس مند پڑھنے والے کی زندگی کو بدل کے رکھ دیتی ہیں ——— یا تو آدمی اور بھی ملیامیٹ ہو گیا، یا پھر اس کی شخصیت کو چار چاند لگ گئے۔ اگر پڑھنے والا اس کے دہشتناک پہلوؤں کو سہار گیا تو پھر اس کتاب میں سکون ہی سکون ہے۔ اگر اپنے آپ کو اس کسوٹی پر پرکھنے کے بعد بلکہ اپنے آپ میں کمی محسوس کرنے کے بعد بھی وہ اپنی شخصیت کے ارتقاء سے مایوس نہیں ہوا تو ایسے آدمی کو یہ کتاب بہت کچھ سکھا سکتی ہے۔ صرف شعر سمجھنا اور شاعری کو شخصیت کی تعمیر کا ذریعہ بنانا ہی نہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر عشق کرنا، جینا سکھاتی ہے، اپنے عشق اور اپنے جینے کو بامعنی اور اہم بنانا، بڑا بنانا سکھلاتی ہے۔ عشقیہ زندگی کا جمال اور ہولناکی دونوں کا جلوہ آپ کو یہاں نظر آئے گا۔ اب یہ پڑھنے والے پر اور اس کے انفرادی کلچر پر منحصر ہے کہ اس کتاب سے اس کی روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے یا اضم[illegible]

برہم ہو کر رہ جاتی ہے۔ بہرحال اب اردو پڑھنے والوں کو اس شکایت کا کوئی موقع نہیں رہا کہ ہمیں عشق کرنا سکھانے والا کوئی نہیں تھا۔ ذہنی اور جذباتی بحران کے دوران میں تو یہ کتاب ایسی چیز ہی نہیں جسے اپنے سے الگ کیا جائے۔ یعنی اگر اس بحران کو تخلیقی طور پر استعمال کرنا ہے تو۔

یہ نہ سمجھئے کہ میرے استاد کی کتاب ہے اس لئے اتنی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے میں نے افسانہ لکھنے سے توبہ کی ہے (اردو شاعری کے رند کی طرح جھوٹی) اس وقت سے مجھے دو موضوعات پر پڑھنے کا چسکا سا پڑ گیا ہے، اور خیر سوچا تو بھلا مجھے کیا آئے، البتہ کبھی کبھی ان دونوں کے متعلق اوروں کے خیالات دہرا کر جی ہی جی میں خوش ہو لیتا ہوں کہ میں نے بھی ایک نئی بات دریافت کی۔ یہ دو موضوعات ہیں فن کار کی شخصیت اور عشق (محض نظریاتی اعتبار سے، ورنہ ویسے تو مجھے بھی ایک یونانی ڈراما نگار کی طرح فخر ہے کہ میں نے اپنے کسی افسانے میں کسی عورت کو محبت کرتے ہوئے نہیں دکھایا، اور نہ کسی مرد کو) چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ اسی سلسلے میں، میں مارسل پروست سے الجھتا رہا ہوں، اور ابھی پچھلے دنوں میں فن کار کی شخصیت کے بارے میں [illegible] کی کہانیاں پڑھ رہا تھا لیکن اس کے بعد بھی فراق صاحب کے ہر بیان نے مجھے چونکایا ہے، اور کئی دفعہ پڑھنے کے بعد بھی اثر کی شدت میں کوئی تخفیف نہیں ہوتی۔

فراق صاحب کی ایک اور کتاب بھی ابھی شائع ہوئی ہے — "روحِ کائنات"۔ یہ ان کی نظموں اور غزل نما نظموں کا مجموعہ ہے۔ اس پر کچھ لکھنے کی ہمت میں اپنے اندر بالکل نہیں پاتا۔ کیونکہ فراق صاحب کی شاعری اتنی تہ دار ہے کہ اگر میں اسے نثر کے الفاظ میں سمیٹنا چاہوں تو سمٹنے میں نہیں آتی۔ خود فراق صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ چالیس بیالیس سال کی عمر میں جا کر وہ اپنی پسند کی شاعری کر سکے ہیں۔ تو بھلا مجھ سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ میں اسے حقیقی معنوں میں سمجھ لوں گا یا اس کے متعلق کچھ کہہ سکوں گا۔ یہ تو بڑی بے ڈھنگی بات ہوگی کہ بستر پہ ایڑیاں اینٹھتے میں [illegible] کوئی حکم لگا دوں۔ کوئی دو مہینے سے یہ کتاب میرے پاس ہے، لیکن پانچ چھ غزلوں ہی نے مجھے ایسا جذب کیا ہے کہ آگے بڑھا ہی نہیں جاتا۔ اس کتاب پر بہترین تبصرہ یہ ہوگا کہ آپ کو اس میں سے دو چار شعر سنا دوں۔

کبھی تو رکھ لے اٹھا کر جبیں کلیجے میں اور
کبھی تو نکہتِ گل سے بھی عشق کترائے

میں آج صرف محبت کے غم کروں گا یاد
یہ اور بات کہ تیری بھی یاد آ جائے

فریبِ عہدِ محبت کی سادگی کی قسم
وہ جھوٹ بول کہ سچ کو بھی پیار آ جائے

ترے قریب سراپا قصور ہے عشق
ترے حضور سے جائے تو بے گنہ جائے

لہرا لہرا سا اٹھتا ہے رہ رہ کر وہ پیکرِ ناز
دنیا دنیا ہے یہ ادا، عالم عالم ہے وہ بدن

جبر دلوں کو یہیں ملتے ہیں کہ بجھتے ہیں
ارے نہ آگ نہ پانی ہے جو وہ لاگ ہے تو

سکوت کو بھی تو کانوں میں گونجتا پایا
جو ایک کرشمے سنا ان سنا وہ راگ ہے تو

نہ دورِ جام، یہ غم خانۂ جہاں، یہ رات
کہاں چراغ جلاتے ہیں لوگ اے ساقی

ترے غلام کی اب شہر میں ہیں دنیا میں
فریب و دور سے آتے ہیں لوگ اے ساقی

سنا ہے دیر و حرم کی بھی محفلیں ہیں کہیں
وہاں بھی پیتے پلاتے ہیں لوگ اے ساقی

ہاں، فراق صاحب کی شاعری کی ایک خصوصیت کا ذکر ضرور کروں گا۔ یہ ایسی چیز ہے جو اردو شاعری میں، جہاں تک میرے محدود علم کا تعلق ہے، بہت زیادہ نمایاں نہیں ہے، اور غالباً فراق صاحب کی شاعری میں بھی ابھی پچھلے دو چار سال میں چمکی ہے۔ یعنی فراق صاحب کے شعروں میں اکثر محبوب کے حسن کا بیان کائنات کی اصطلاحوں میں ہوتا ہے، یا یوں کہئے کہ جب وہ محبوب کے حسن کے متعلق سوچتے ہیں تو ساتھ ساتھ کائنات کا حسن بھی اس کے ہم دوش ہوتا ہے۔ یہ معاملہ محض تشبیہ اور استعارے کا نہیں، بلکہ اس سے ماورا بہت کچھ ہے۔ اس قسم کے دو چار شعر سنئے۔

تو دن کی طرح حسین رات کی طرح پُر کیف
جہاں بھی جاتے ۔ اندازِ مہر و مہ جاتے
جھلمل جھلمل چھاؤں ترے دن
جگمگ جگمگ تیری راتیں
۔ ہلکی چاندنی ۔ نرم لو ستاروں کی
ترے شباب کا آئینہ رات کا جوبن
نکلتے میٹھے دنوں کی آہٹیں نگاہ میں
رسیلے ہونٹ فصلِ گل کی داستاں لئے ہوئے

یہ وہ مقام آجاتا ہے جہاں میرے پر جلتے ہیں، اس لئے میرا خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ ابھی میں اس قابل نہیں ہوا کہ بڑی باتوں کو سمجھ پانے کا دعویٰ کرسکوں۔ تعریف کرنے کے بجائے میں محوِ حیرت ہو جاتا ہوں کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے اُردو شاعری کیا سے کیا ہوئی جا رہی ہے۔ میں تو بس اتنی سی بات جانتا ہوں کہ آج اگر اُردو نظم اور نثر میں کوئی چیز پڑھنے کے قابل لکھی جا رہی ہے تو وہ فراق صاحب کی شاعری اور تنقید ہے — باقی بس اللہ کا نام ہے۔
ختم بھی مجھے فراق صاحب ہی کے ایک شعر پر کرنا چاہیئے۔

یہ غم و نشاط کی بحث کیا کبھی دیکھ آ کے فراق کو
اسی زندگی کی تجھے قسم کہ جو درد بھی ہے دوا بھی ہے

غزل

جانے وہ کیا مسکرا کر کہہ گئے
اہلِ محفل دل پکڑ کر رہ گئے

منزلِ مقصود کوسوں دور تھی
چلتے چلتے راستے میں رہ گئے

رازدارانہ ادائیں حسن کی
جو نہیں کہنا تھا وہ بھی کہہ گئے

زندگی کے چند لمحات حسیں
سیلِ اشکِ آرزو میں بہہ گئے

سُرخیِ افسانۂ تکمیلِ غم
چار قطرے خونِ دل کے رہ گئے

ہو چکی تقسیم جب کُل کائنات
غم اُٹھانے کے لئے ہم رہ گئے

لاکھ ضبطِ غم کیا لیکن ضیاؔ
خود بخود دو چار آنسو بہہ گئے

ضیاؔ فتح آبادی

معارف

حسنِ فطرت کے تخیل کا کماحقہٗ نقشِ نور[1]
دیدہ ور ہے تو اگر اس رمز کو سمجھا ہی تو
یعنی خود قطرہ کے اندر گوہرِ شہوار کو
اور دانے میں شجر کو دیکھ لینا ہو بہو

(۲)

تانت باجی راگ پایا ہے حقیقت میں یہی
خشتِ اول میں نظر کے سامنے تعمیر ہو
مانیٔ فطرت ہے اُسی مصوّر پرستار
جو خطوطِ خاکہ ہی میں دیکھ لے تصویر کو

(۳)

جلوۂ رنگِ بہاراں کا خیال ہے آئینہ
جسمِ مینا میں نگاہِ ماورائی ہے اگر
سہل ہے محبوب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا
بام تک اُس کی نگاہوں کی رسائی ہے اگر

(۴)

دیدۂ فطرت سے دیکھے حسنِ فطرت کو کوئی
یعنی دل کو دل ہیں آئینہ ہونا چاہیئے
طور کے جلوے اتیں اب بھی ہیں بیتابِ نمود
شرط اتنی ہے کہ "سینا" سینہ ہونا چاہیئے

امینِ حزیں سیالکوٹی

[1] "نقشِ نور" یعنی پردۂ سیمیں پر تصویری اورائی عکس Projected Light-Picture on the film screen

[illegible] توجیہ ہو سکتی ہے یعنی خالی پیالہ نہیں بلکہ
[illegible] شراب سے بھر کے ـــــ لیکن ثریا کی توجیہ کیا
[illegible] انتہی ہیں لیکن شراب کیا دانتوں سے
[illegible] ؟ البتہ شراب پلا کر کباب کھلانے موقع پر

سوئے ثریا ببر

کہا جاتا تو پھر بھی ایک معنے کی بات ہوتی ـــــ یہ کیا کہ
[illegible] کی طرف شراب کو ارسال کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے،
لیکن آپ نے حسن کارانہ غلو کی خرابیاں !! واہ ری تتبع
پروری الفاظ :-

ماہ دو ہفتہ ـــ ہلال ـــ شفق ـــ ثریا نقائص
مندرجۂ بالا کے علاوہ اس حسین مطلع جگت نے ایک بہت بڑا
معنوی عیب بھی پیدا کر دیا یعنی مطلع میں تو ساقی سے خشک
لبوں پر ابر کرم برسانے کی سفارش کی جا رہی تھی مگر ایک
ہی شعر کے بعد وہ سفارشی خصوصی انداز بھول گئے خود ساقی
کو "پینا" سکھا رہے ہیں !! ان کی ماتس میں ایسی معنوی
شتر گربگی ناگزیر ہے۔ تیسرے شعر میں لالہ کے معنی ہیں
صراحی دم کے معنی ہیں خون، یہاں شراب سے مراد ہے ارزن
ایک قسم کا باریک غلہ جو باجرا اور اسی قسم کے پرندوں کو کھلایا
جاتا ہے یہاں پسینے کے قطروں سے مراد ہے جو میونوشی کے
بعد میخواروں کے چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں آثر کے معنی ہیں
نتیجہ ـــ اس شعر کے معنی سنئے !

صراحی ایک مرغ ہے جس کی چونچ سے خون ٹپکتا ہے ۔
اور وہی صراحی خون ٹپکانے کے بعد ارزن تر دیتی ہے ۔
مے کی صراحی کو مرغ بنانا اور اس کی چونچ سے لہو ٹپکانا
اور اس لہو کو شراب سے تعبیر کرنا اور ایسی مکروہ شراب پلانا
اور بعد شراب خواری چہرے پر جو پسینے کے قطرے نمودار
ہوں ان کو ارزن تر کہنا نفس شاعری کو الٹی چھری سے
حلال کرنا نہیں تو اور کیا ہے ؟ فرمائیے ! یہ خونیں نظارہ
کس سے دیکھا جائیگا۔

چوتھے شعر میں خروس کے معنی ہیں مرغ، خون خروس
سے کنایہ ہے شراب سرخ، زاغ سے مراد رات بیضۂ زر سے
مراد آفتاب اور طوطی طاؤس پر سے مراد آسمان تو مطلب
[illegible] کیا بھی یہی ہے کہ :-

صبح زر پھٹی ہے شراب لا

مگر تیسرے شعر کی طرح شراب جیسی چیز کو مکروہ تر بنا دیا ہے!
ستاروں کی وجہ سے آسمان کو "طاؤس پر" کہنا جائز ہو تو ہو لیکن
رنگ کی مناسبت سے طوطی کہنا بہرحال ناجائز ہے ـــ مطلع
میں جو "سبز خواں" تھا چوتھے شعر میں وہی "طوطی طاؤس پر"
کیا خوب !! مطلع میں جو "قرص زر" چوتھے شعر میں وہی "بیضۂ زر"
یہ خوش !! شاید نارنگی گول بھی ہوتی ہے اور بیضوی بھی !۔
ہاں ان آفتابی نمایوں کے ساتھ مجاز والی "ماہتابی تشبیہات"
پر ایک نظر ڈال لیجئے ؎

جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب

بدر چاچ ہوں یا مقلدین بدر چاچ، ضرورت سے زیادہ
رنگین شعر جو شخص بھی کہے گا، اس کا انجام ان ہی رسوائیوں
کا پیش خیمہ بنے گا، وہ صنعت جو با سانی معانی کے ضمن میں
آ جائے، لطف رکھتی ہے لیکن محض صنعت کے لئے جو شعر کہے
وہ شاعر نہیں ہے [1]۔

صنعت گر است اما طبع رواں ندارد

بدر چاچ اور ان کے ہم خیال لوگوں نے صنعت کے لئے
شعر کہے ہیں ان صنعتگروں کے اشعار ان خصوصی رعایتوں
سے عاری نہیں مل سکتے حضرت شاد عظیم آبادی نے سچ فرمایا ہے

بدر چاچ بن جانا آسان ہے مگر سعدی و حافظ
بننا خیلے دشوار [2]

بدر چاچ کا تو آپ نے سرسری جائزہ لے لیا، کہیئے! تصنع
اور تکلف زاید کے سوا کچھ بھی ملا ؟ حدائق البلاغۃ اور ایسی
ہی چند کتابیں پڑھ کر ایک تعلیم یافتہ شخص عربی ایسے شعر کہہ
سکتا ہے لیکن سعدی کی طرح کسی سادہ رو کا دامن تھام کر
یوں پوچھنا ہر گز نہ آئے گا ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا میروی

اور حافظ کی طرح ایک نافہم گروہ سے پیچھا چھڑا لینے کا
یہ قطعی پہلو بھی نہ سوجھے گا ؎

---

[1] مقدمہ دیوان طباطبائی [2] فکر بلیغ۔

گرچہ بدنامی است نزد عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

اس مقام پر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ حقیقی شاعر نہ صرف تغزل کی حد تک ایسے دلکش اور سادہ پیرائے اختیار کرتے ہیں بلکہ اہم سے اہم موضوع کو اسی سادگی و پُرکاری کے باعث دلپذیر خاص و عام بنا دیتے ہیں۔۔۔ سعدی کا ایک شعر نہیں صرف ایک مصرع لکھتا ہوں کہ:۔

آنانکہ غنی ترانِد محتاج ترانِد

فرمایئے اس ایک مصرع پر مدرجاج کے کتنے قصائد قربان کئے جا سکتے ہیں؟ آدمی جتنی دولت فراہم کرتا جائے گا اتنی ہی اس کی حاجتیں بھی بڑھتی جائیں گی۔ بنابریں جو زیادہ زردار ہے زیادہ محتاج اور گرانبار ہے

جو شخص آپکے سامنے اوروں کی بُرائی بیان کرتا ہے اوروں کی انجمن میں آپکی بھی غیبت کرتا ہوگا ایسے آدمی کے شر سے محفوظ رکھنے کیلئے کتنا سلیس پیرایہ اختیار کیا ہے ؎

زباں بکردشخصے بغیبت دراز بدو گفت دانندۂ سرفراز
کہ یاد کساں پیش من بد مکن مرا بدگماں در حق خود مکن

ہم کسی کو نصیحت کرنا چاہیں تو پہلے اُسکو ہموار اور ہم خیال بنائیں نصیحت عموماً نوعمروں ہی کو کی جاتی ہے۔ حافظ کا ناصحانہ اسلوب دیکھیئے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادتمند پندِ پیرِ دانا را

جوانوں کی صفت سعادتمندی بتا کر انکی سرکشی دُور کر دی، اب وہ ہر اچھی نصیحت قبول کر لیں گے۔

جنگ چھڑی دارا مغلوب ہوا سکندر غالب۔ لوگ مغلوب کو مظلوم سمجھنے لگے اور غالب کو ظالم بنجت والقاق دارا کی مدد کرتے تو پھر کیا ہوتا؟!۔ دونوں مطلق العنان فرمانروا تھے رعیت کے حق میں نہ وہ مفید نہ یہ مفید اسکا زوال بھی اعتباری اس کا عروج بھی اعتباری اسکی شکست پر ماتم کرنا جائز نہ اسکی فتح پر شادیانے بجانا روا۔ دیکھیئے نظامی نے یہ مضمون کس سادگی سے باندھا ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

محسن بکاراں غلو گناہ عظیم ہے جو حقیقی شاعر سے سرزد نہیں ہوتا۔

نغمہ ہائے منتشر

۲۳ اکتوبر ۱۹۴۵ء

"سہانی نیند میں پھر خواب کے موتی پرونے دو
تھکی ماندی ہے رقاصہ ابھی کچھ دیر سونے دو
میں لاتا ہوں نشاطِ غیر فانی کے حسیں نغمے
مزاجِ بزم سے سازوں کو ہم آہنگ ہونے دو!"

---

۲۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء

"ساز مدھم ہوئے تھکنے لگے رقاصہ کے پاؤں
شمع گل ہونے لگی، ڈھلنے لگی بزمِ شباب
زرفشاں چاند چناروں کے پرے ڈوب گیا۔۔۔!
آؤ تم بھی مری باہوں کا سہارا لے لو
میں ابھی جاگ رہا ہوں۔ میں ابھی جاگوں گا۔۔۔"!

---

۳ نومبر ۱۹۴۵ء

"اُجالی رات میں کچھ دُور اک سُبک مورت
مرے قدم ہی کی آہٹ سے رنگ بھرنے لگے
مری نگاہ کی پرچھائیوں میں گانے لگے
مرے تخیلِ مُبہم کو واضح کرتی جائے۔۔۔!"

سلام مچھلی شہری

فریاد

آخر یہ ایک طرف اُونچے اُونچے آسمان میں شگاف کرنے والے پہاڑ اور دوسری طرف زمین کے سینے میں گہرا گھاؤ کرنے والا لمبوترا غار اور ان دونوں کے درمیان ٹیڑھی سی منحنی سی لکیر جس پر تیزی سے دَوڑتی ہوئی کار ایک کھلونا معلوم ہوتی ہے، کبھی ایک دوسرے سے جُدا کیوں نہیں ہوتے۔ یا پھر قدرت کا سنگدل ہتھوڑا ان پہاڑوں کو ہموار کر کے اس حقیر پیچدار سڑک کو بلندیوں اور پستیوں کے درمیان کیوں دفن نہیں کر دیتا۔

لیکن اس کی بجائے دلاور خاں نے جلدی سے سٹیرنگ ویل کو دائیں طرف پھیر دیا اور کار سامنے غار کی جانب آگے کو بڑھی ہوئی چٹان سے بچ کر غار کی طرف مُڑ گئی ـــــ

کوہالہ ۲۵ میل

سرینگر ۱۵۷ میل

بلندی ۶۸۲۳ فٹ

ـــــ اس خطرناک موڑ پر سفیدی سے ڈھلے ہوئے پتھر پر کالے کالے ڈراؤنے رنگ سے یہ الفاظ موڑ کو اور بھی زیادہ خطرناک بنا رہے تھے۔ دلاور خاں نے جلدی سے سٹیرنگ ویل کو بائیں طرف پھیر دیا اور کار پتھر کو توڑ کر غار میں گرنے کی بجائے واپس سڑک پر آ گئی۔

کرشنا کی ماں کے دماغ سے اُس کی پیار کرشنا جو سرینگر میں ڈل کے کنارے پر سیوائے ہوٹل میں ماری پڑی تھی، ایک لمحہ کے لئے بالکل محو ہو گئی اُس نے خوفزدہ نیم وا آنکھوں سے دور غار میں جہلم کو بہتے دیکھا۔ اُس کا متلایا ہوا دل اور بھی زیادہ متلا گیا۔ اُس نے گھبرائے ہوئے غمگین لہجے میں کہا۔

"ہولے چلاؤ، دلاور بیٹے۔ ہولے چلاؤ کار کو"

کرشنا کا خاوند جو کرشنا کی التجا پر اس کی ماں کو راولپنڈی سے لینے آیا تھا، بولا: "ماتاجی، آپ غار کی طرف سے اس طرف آ کر بیٹھ جائیں، غار کو دیکھنے سے آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی ہے"

ـــ دلاور خاں نے کہا: "ماتاجی، ہولے چلیں گے تو شام سے پہلے سرینگر نہیں پہنچ سکیں گے"

اور دلاور خاں کی ٹوٹے ہوئے بٹنوں والی سلک کی قمیص کے کالر تیز ہوا میں اُس کی چھاتی پر پھڑپھڑانے لگے اور اُس کے سر سوں کے تیل میں لتھڑے ہوئے نکھرے بکھرے کالے بالوں کے کناروں پر گرد کی سفیدی نمودار ہونے لگی۔

کرشنا کی ماں نے اپنے داماد سے جگہ بدل کر کہا:

"وہ ـــ وہ سامنے جس میں ڈرائیور پیچھے آنے والی گاڑیوں کا عکس دیکھتا ہے اس میں مجھے دلاور کا مُنہ نظر آتا ہے۔ بھولا بھالا مُنہ اگر یہ سمجھا ہو تو بالکل دلاور معلوم ہوتا۔ اور اب دلاور مجھے بشیر معلوم ہوتا ہے کیسا اُداس ہے دلاور! میرا بیٹا اُس کی آنکھیں اب بھی سُرخ پڑی ہیں۔ صبح تو میں نے پوچھا کیا ہوا بیٹا، تمہاری آنکھیں کیوں لال ہیں۔ کہنے لگا، کچھ نہیں ماتاجی۔ میں سمجھتی تھی۔ میں جانتی تھی وہ ساری رات نہیں سویا، وہ ساری رات روتا رہا ہے ـــ"

اُس کے داماد نے اپنی ساس کے جذبات کو مرطوب کرنے کے لئے بات کاٹتے ہوئے کہا: "میں نے بھی تنے ہیں، ایک دو دفعہ اُس کی طرف دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے میں نے ایک دفعہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے ہیں۔ مگر یہ معمولی بات ہے چھٹی سے واپس آیا ہے۔ گھر کی کوئی بات یاد آتی ہوگی"۔

بیوقوف دلاور۔ وہ اپنے گھر کیوں گیا تھا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو شاید میری دُنیا اُجڑنے سے بچ جاتی۔ ایک مہینہ یعنی پورے تیس دن۔ اتنا لمبا عرصہ تو بہت کچھ کر دیتا ہے کون جانتا تھا کیا ہونے والا ہے ہمارے باپ کا آخری خط۔ اتنا بڑا انقلاب اور ایک مہینے میں صرف ایک مہینے میں، ساری دُنیا بدل گئی۔ کونسی دُنیا؟ کچھ بھی نہیں بدلا یہ ایک طرف اُونچے اُونچے آسمان میں شگاف کرنے والے پہاڑ اور دوسری طرف زمین کے سینے میں گہرا گھاؤ کرنے والی لمبوتری غار اور ان دونوں کے درمیان ٹیڑھی سی منحنی سی لکیر جس پر تیزی سے دَوڑتی ہوئی کار ایک کھلونا معلوم ہوتی ہے، ابھی تک اپنی جگہ پر بدستور کھڑے ہیں۔ اور قدرت نے سنگدل ہتھوڑوں نے ان پہاڑوں کو ہموار کر کے اس حقیر پیچدار

سڑک کو بلندیوں اور پستیوں کے درمیان دفن ہیں کیا۔

ٹھنڈے پانی کا وہ چشمہ جس کے کنارے سرخ گالوں والے گندمی پہاڑی لڑکے ہاتھوں میں ٹین کے ڈبے لے کر کھڑے رہتے ہیں، تیزی سے پیچھے نکل گیا۔ دلاور نے معمول کے مطابق کار کو کھڑا کر کے اُن لڑکوں سے کار میں ٹھنڈا پانی ڈالنے اور کار کو دھونے کے لئے نہیں کہا۔ اور نہ اُس کو یہ خیال آیا کہ اس چشمے سے کشمیر کے ان چشموں کی ابتدا ہوتی ہے جنہوں نے کشمیر کو چشموں کی سرزمین کا نام دیا ہے۔

جب مری کی چڑھائی چڑھنے کے بعد کرشنا کی ماں نے مری کے سنی بنک میں سے گذرتے ہوئے دلاور کو کہا تھا کہ وہ کار کے انجن کو ٹھنڈا کر لے تو اُس نے پیچھے کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔ "نہیں ماتا جی" اُس وقت اُس نے مال روڈ کی طرف والی سڑک پر کار کے سامنے تپدق کے ایک مریض کو دیکھ کر غصے کے ساتھ زور سے ہارن بجایا تھا۔ ڈرائیور کے چہرے پر بڑھی ہوئی میلی چھوٹی ڈاڑھی جیسے مریض کا وجود [illegible] کہا جا رہا تھا کہ اُس کو کار کے نیچے کچل ڈالے [illegible] کے بیکر وہ مریض مری کی خوشگوار ہوا میں بیماری کے جراثیم چھوڑنے کے لئے آ جاتے ہیں۔

"کرشنا بیٹا! وہ آٹھ سال سے اپنے ماں باپ سے ملنے کے لئے نہیں گیا تھا۔ آخر جب اس دفعہ اُس کے باپ کا خط آیا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ اگر وہ آخری دفعہ اپنے بیمار باپ کا منہ دیکھنا چاہتا ہے تو فوراً آ جائے، ہم سب نے اُس کو مجبور کر کے اُس کے گھر بھیج دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا میرے ماں باپ میرے پاس ہیں ـــــ دلاور [illegible] تمہاری [illegible] بیٹی نہ بیٹے۔"

"اچھا ہوں، ماتا جی!"

کرشنا نے خاوند کو پھر وہی دو چہرے نظر آنے لگے۔ ایک وہ چہرہ جس کو اُس نے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کپڑوں کی الماری کے آئینے میں [illegible] دیکھا تھا [illegible] جس پر ایک خوبصورت [illegible] کسی راستہ بھولی ہوئی کار میں کی طرح پریشان کھڑی تھی؟ جس کو دولت، سیفٹی ریزر، کالج کی تعلیم اور بہت ساری آرائشی سہولتوں نے دلکش بنانے کی کوشش میں ناکام ہو کر کم [illegible]

دلفریب بنا دیا تھا۔ اور دوسرا وہ چہرہ جس کو اُس نے [illegible] میں دیکھا تھا جس میں ڈرائیور پیچھے آنے والی گاڑیوں کو دیکھتا ہے متعصب، مغرور چہرہ جس کو تمتاتی ہوئی [illegible] گالوں اور چمکدار نیلی آنکھوں کی نقاشی معصوم بنانا چاہتی [illegible] لیکن جس کو کم عمر مونچھوں کی بدنما سیاہی ایک جاہل [illegible] کا تنگ نظر پٹھان ہی رہنے دیتی ہے۔

"اور پھر جب یہ ایک دن گھر سے واپس آیا تو میں کرشنا کے کمرے میں بیٹھی رو رہی تھی تنہائی بھی کیسی بُری چیز ہے [illegible] اپنے گھر چلا گیا۔ کرشنا کو تم شادی کر کے کشمیر لے گئے۔ کرشنا کے پتا جی ادھر ہی رہتے تھے۔ مجھے خوامخواہ رونا آ رہا تھا [illegible] پھولوں کی طرح رکھی ہوئی لاڈلی بیٹی کیلحت جدا ہو گئی۔ گمان [illegible] بھی نہیں تھا کہ شادی اتنی جلدی طے ہو کر ہو بھی چکے گی۔ [illegible] میرے جگر کا ٹکڑا ہمیشہ کیلئے تمہارا ہو جائے گا ــــ"

کرشنا کی ماں کی آواز بھرا گئی۔

ـــــ "کشمیر بھی جتنا ہوتا تو اتنا غم نہ ہوتا۔ یا اگر جاتی تو دلاور کو اُس کے گھر نہ جانے دیتی۔ دلاور آیا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرا کشمیر آ گیا ہو۔ میں نے کہا۔ "دلاور بیٹا، تمہاری بہن تو چلی بھی گئی" اُس نے حیرت سے پوچھا۔ "کہاں چلی گئی ماتا جی؟" میں نے کہا۔ "اُس کا دولہا اُس کو سرینگر لے گیا ہے۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ حیران ہو کر بولا "کیا کرشنا کا بیاہ ہو گیا ہے ماتا جی؟" میں نے کہا۔ "ہاں بیٹا۔" پاس ہی ایک پلنگ تھا۔ دلاور اُس پر گر پڑا۔ سگے بہن بھائیوں میں بھی شاید اتنی محبت نہ ہو جتنی کرشنا، کشمیر اور دلاور میں تھی۔ کشمیر کی آخری بیماری میں دلاور کئی کئی رات نہیں سویا۔ اور جب ایک دفعہ کرشنا کو ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا دلاور دن رات اُس کی تیمارداری میں مشغول رہتا تھا۔ پہلے وہ کرشنا کو پیدل سکول چھوڑنے جایا کرتا تھا۔ پھر جب ہم نے کار خریدلی۔ اس نے صرف اسی لئے موٹر ڈرائیوری کا کام سیکھ لیا کہ کرشنا کو کار میں سکول چھوڑنے جایا کرے گا۔ میں نے پیار سے دلاور کا سر اٹھایا۔ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا تھا۔ میں اپنا غم بھول کر اُس کو دلاسا دینے لگی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہے۔ آزاد علاقے پر اب بھی ہوائی حملے ہو رہے ہیں۔ گاؤں کی مسجد اور بہت سے مکان گر گئے ہیں اُس کا باپ اُن کے مکان کی چھت کے نیچے آ کر [illegible]

[رہا] تھا ہم دونوں بہت رات گئے تک بیٹھے رہے؟

کار ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔

ایک ہٹا کٹا پہاڑی کسان سڑک کے درمیان جھکا ہوا اپنی چپل کو درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چاولوں کی سوکھی ہوئی نال سے بنی ہوئی نئی چپل نے اُس کے دونوں انگوٹھوں کو کاٹ دیا تھا۔ نیچے دور ڈھلوان پاس کا گھر ہے۔ گھر نہیں گھروندا" گھروندا جس کی دائیں اور پچھلی دیوار پہاڑ نے اُس کے لئے بنائی ہو گھروندے کے سامنے وہ چھوٹی سی بے قاعدہ تکون جس کو اس چار انچ چوڑے قدرتی چشمے نے بل کھاتے ہوئے رستوں میں سے نیچے جاکر پانی سے بھر دیا ہے، اُس کا کھیت ہے، وہ صبح چار بجے سے ٹخنے ٹخنے پانی میں چاولوں کی پنیری بوتا رہا ہے۔ چاولوں کی سوکھی نال کی نئی چپلوں نے اُس کے پانی سے گلے ہوئے پیروں پر زخم پیدا کر دئے ہیں۔ اُسے ابھی نمک، مرچ، تیل جیسی چیزیں خریدنے کے لئے تین چار دکانوں کے اُس قصبے تک جانا ہے سڑک کے دونوں طرف کوئی پانچ میل کے فاصلے پر آباد ہے چلا ہے۔ وہ سڑک کے عین درمیان اپنی چپلی کو ریا دہ آرام دہ بنانے کے لئے جھک گیا اور اُس کے پھٹے ہوئے کرتے میں سے نظر آنے والے مضبوط بازوؤں کی تڑپتی ہوئی موٹی موٹی مچھلیاں اور تندرست چوڑا سینہ ایک لمحے کے لئے یہ بھول گئے کہ دُنیا میں دُکھ دینے والی چپلیوں کے علاوہ کوئی اور چیز بھی ہے۔ تیز رفتار کار چٹان کے گرد گھوم کر طاقتور بریکوں کی مدد سے ایک جھٹکے کے ساتھ اُس کسان کے پاس کھڑی ہو گئی۔

دلاور بپھرے ہوئے تیر کی طرح کار سے نکلا۔

"حرامزادے!"

اُس نے اُس کی بوسیدہ قمیص کو گلے کے پاس سے پکڑ کے زور سے کھینچا۔ اور جب بدحواس کسان کا چہرہ اُس کے عین سامنے آگیا تو اُس نے اُس کے مُنہ پر اپنی پوری طاقت سے دائیں ہاتھ کا ایک تھپڑ لگایا۔ اور اپنے تو مبرکے بھاری بھرکم بوٹوں کے ایک ٹھڈے سے اُس کے گھٹنے پر زخم کر دیا۔ اور پھر اُس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے سڑک کے پہاڑ والے کنارے پر اُگے ہوئے اخروٹ کے ایک اونچے درخت پر دھکا دیدیا۔

"حرامزادے۔ میرے باپ کی سڑک ہے! ادھر میں ابھی تجھ کو کار کے نیچے کچل دیتا تو"

پُرانی قمیص کا ایک کونے والا چیتھڑا جو دھکا دینے کے بعد اُس کے ہاتھ میں رہ گیا تھا، دلاور نے حقارت سے مسل کر غار میں پھینک دیا۔

کار پھر چل پڑی۔

کرشنا کے خاوند نے سوچا۔ آخر کیوں! آخر کیوں! آخر کیوں! اور پھر وہ آنکھیں بند کر کے اخروٹ کے درخت کے نیچے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے ہوئے پہاڑی کسان کو دیکھنے لگا۔

کرشنا کی ماں بولی۔ "دیکھا رتن، کتنا طاقتور ہے دلاور پچھلے جب وہ کرشنا کو پیدل سکول چھوڑنے جاتا تھا، مجال ہے جو کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ ایک دفعہ تین بدمعاشوں نے شرارت کرنے کی کوشش کی تھی، دلاور نے ایک ایک کو پچھاڑ دیا۔"

دلاور تو بزدل ہے۔ دلاور تو بزدل ہے۔

اور دلاور کی آنکھوں کے سامنے کار کا شیشہ دُھندلا پڑ گیا دُور ایک پہاڑ کی چوٹی گڑگڑاتی ہوئی سڑک پر آگری۔ سڑک کچے دھاگے کی طرح لرز کر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ ایک گرتے ہوئے مکان کی چھت کے نیچے سے کراہنے کی آوازیں آنے لگیں "بیٹا! بیٹا! ہوائی جہاز، بم اور ہوائی جہاز اور بم۔ زندگی بھاگ رہی ہے۔ گھوم رہی ہے۔ لرز رہی ہے سسک رہی ہے۔ گرتے ہوئے مکان کی چھت کے نیچے کراہنے کی آوازیں زیادہ بلند ہوگئیں "بیٹا! ٹھہرو! بیٹا! کہاں جاتے ہو؟ یہ تمہاری دو چھوٹی چھوٹی معصوم بہنیں! یہ تمہارا چھوٹا بھائی! یہ تمہاری بوڑھی ماں! مکان گر جانے کے بعد اور میرے مرجانے کے بعد ان کے پاس کیا ہوگا؟ اِن کا کون ہوگا؟ کہاں جاتے ہو دلاور؟ کیوں جاتے ہو بیٹا؟" اور پھر یکایک اُس کی دونوں معصوم بہنیں اور اُس کا چھوٹا بھائی چیخ چیخ کر رونے لگے۔ اُس کی بوڑھی ماں نے روتے ہوئے دلاور کو گلے سے لگا کر روتے ہوئے کہا "یا خدا، اب کیا ہوگا! اب کیا ہوگا!" دلاور نے روتے ہوئے دل نے آہستہ سے کہا "میں جانتا ہوں، اب کیا ہوگا ——— نہیں نہیں۔ میں نہیں جانتا اب کیا ہوگا ——— میں نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتا ———"

آخر رتن نے اِس تکلیف دہ خاموشی کو توڑنے کے لئے تجسس کے انداز میں کہا۔ "اکثر جب کرشنا کو بخار بہت زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ بڑبڑانے لگتی ہے۔ میں نے کئی بار اُس کو یہ کہتے سُنا ہے ماں،

ہوگیا؟ دلاور کیوں نہیں آیا، ماں آتے وقت اُس کو سمجھا رہی تھا۔ کہنے لگی "اگر ماں جی کسی وجہ سے نہ آسکیں تو میں پوچھوں کہ دلاور کب آئے گا؟"

کار کی رفتار اور بھی زیادہ ہوگئی۔ دلاور کی آنکھوں کے سامنے دھندلا شیشہ صاف ہوگیا۔ سڑک کی منحنی لکیر ایک دم پھر نظر آنے لگی۔

دلاور نے دیکھا کہ دُور سڑک پر پہاڑی بکریوں کا ایک ریوڑ جا رہا ہے۔ اُس نے دو فرلانگ کے فاصلے سے ہورن بجانا شروع کردیا۔ گڈریوں نے اپنی بکریاں سڑک کی بائیں طرف پہاڑ کی جانب لیں۔ باقیماندہ راستہ ایک طوفانی رفتار کی کار کے لئے پھر بھی کافی نہ تھا لیکن دلاور کو یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ راستے کافی ہوتے ہیں یا ناکافی اُس نے تو شاید ہورن سے گڈریوں کو یہ بتایا تھا کہ میری کار آرہی ہے۔ اپنی بکریوں کو کہہ دو تمام سڑک پر پھیل جائیں، تاکہ میں اپنی کار اُن کے اوپر سے لے کر گذر جاؤں لیکن دو بکریوں کے علاوہ سب بکریاں ایک طرف کو ہوگئیں اور دلاور کو صرف دو بکریوں کے اوپر سے گذرنا پڑا۔ کار بُری طرح سے اُچھلی۔ کرشنا کی ماں اپنی جگہ سے اُچھل کر رتن کے اوپر جا گری۔

"دلاور! کیا ہوگیا ہے تمہیں آج، بیٹے!"

دلاور نے یکلخت بریک لگا کر کار کو غار کی طرف جانے سے روک دیا۔

اور وہ کار جو راولپنڈی سے دلاور کی کار سے ایک گھنٹہ پہلے چلی تھی اور جس کو مری کے نزدیک دلاور نے پیچھے چھوڑ دیا تھا ایک دفعہ پھر اُس کے پاس سے گذر کر اُس سے آگے ہوگئی۔

دلاور نے جھنجھلا کر کہا۔ "وہ سوٴر کا بچہ پھر آگے نکل گیا ۔۔۔ جی!"

اور ایک دفعہ پھر دلاور کی کار کا سپیڈو میٹر تھرتھرایا اور کار ریاست کی سرحد کی طرف بڑھنے لگا۔

رتن نے کہا "عجیب ہٹ دھرم لڑکا ہے!"

کرشنا کی ماں نے کہا۔ "رتن، اِس کی حرکتوں نے تو آج مجھے بھی حیران کردیا ہے اتنی دفعہ اس کو کہنے کی ضرورت کہاں پڑتی تھی۔ ایک اشارہ کافی تھا ایسا نیک طبیعت لڑکا ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ کبھی سے کوئی فالتو بات نہیں۔ کبھی بُرے لڑکے سے مُلاقات نہیں۔ خاموش اپنا کام کئے جانا۔ اگر کام نہ ہو تو پڑھا ہوا سبق یاد کرنے لگنا۔ ایک دفعہ معلوم ہوا کہ اس نے تین دن سے نہ کچھ کھایا ہے اور نہ کسی سے بات کی ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ناراض ہے کیونکہ کرشنا کشمیر کو ساتھ لے کر کسی سہیلی کی شادی پر چلی گئی ہے اور اُسے ساتھ لے کر نہیں گئی۔ میں نے کہا "دلاور! لڑکیاں اپنے بھائیوں کو ساتھ لے کر جایا کرتی ہیں۔" وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگا۔ میں سمجھ گئی اُس کے رونے کا مطلب یہ تھا کہ کرشنا اُسکو اپنا بھائی کیوں نہیں سمجھتی؟"

دلاور کی آنکھوں کے سامنے کار کا شیشہ پھر دھندلا ہوگیا سفید کنکروں کی سفید سڑک ایک سفید چادر بن کر اُسکی بینائی کے سامنے چھا گئی۔ کرشنا کا باپ کھدر کے سفید لباس میں کانگریس کے پنڈال کے نیچے پراونشل کانگریس کمیٹی کے پریذیڈنٹ کی حیثیت سے اپنی پہلی صدارتی تقریر کر رہا تھا۔ "ہم ہندوستان کی بھلائی چاہتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں کی بہبودی چاہتے ہیں" ـــــ وہ ہنستے ہوئے کرشنا کے باپ نے کانگریس کو دس ہزار روپے چندہ دیا تھا ایک ہفتہ ہوا اُس نے کرشنا کے جہیز میں دس ہزار روپے کی یہ کار دی تھی۔ دلاور نے والہانہ انداز میں اُٹھ کر کہا۔ "اے ہماری بھلائی اور بہبودی چاہنے والے مہاتما، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں ہندوستانی ہوں یا ہندوستانی؟" پنڈال کانپنے لگا، پراونشل کانگریس کمیٹی کے پریذیڈنٹ کی زبان بند ہوگئی۔ یکایک دراز قد کرشنا ایک سرمئی رنگ کی ساڑی میں ملبوس جواب دینے کے لئے کھڑی ہوئی۔ اور راولپنڈی کی سرمئی رنگ کی تارکول سے بنی ہوئی مال روڈ کانگریس کے پنڈال کی لمبائیوں اور چوڑائیوں پر بچھ گئی۔ سکول سے واپس آتے ہوئے کرشنا نے پیچھے مڑ کر دلاور کو کہا:-

"کتنی دھوپ ہے!"

"ہاں"

"تم تو مجھ سے بھی زیادہ گرمی محسوس کر رہے ہو۔ تمہارے گال لال ہوگئے ہیں۔"

"نہیں۔"

"بستہ مجھے دے دو۔ اور تم میری چھتری لے لو۔"

"نہیں۔"

"تم اُداس ہو؟"

"نہیں"

"تم تھک گئے ہو؟"

"نہیں۔"

"اچھا، تو اب میں بھی بات نہیں کروں گی۔"

"کچھ دور جاکر ——"

"سبق یاد کیا تم نے اپنا؟"

"ہاں۔"

"آر-او-ایس-ای —؟"

"روز۔"

"پی-او-ایس-ای-؟"

"پوز"

"ڈی-او-وی-ای —؟"

"ڈو"

"ایل-او-وی-ای —؟"

"لو"

"معنے بھی جانتے ہو تم ان سب لفظوں کے؟"

"ہاں"

"نہیں تم نہیں جانتے۔ تم نہیں جان سکتے۔ تم ہو تو بس ہو"

دلاور نے اپنے سر کے ایک انکاری جھٹکے کے ساتھ اپنی آنکھوں کو جھپک کر اپنے سامنے والے شیشے کے دُھندلکے میں سے دیکھا اگلے آگے جانے والی کار نزدیک تھی۔ دو جوان یورپین جن میں سے ایک زنانہ، دوسرا مردانہ، اُس کار کے پچھلے شیشے میں سے دلاور کو دیکھ رہے تھے۔ دلاور نے جھنجھلا کر اپنے آپ کو کہا۔ "ایک اور شادی! حرامزادی!" اور پھر زور زور سے ہورن بجانے لگا۔ اگلی کار بھورن کوشش کر اور زیادہ تیز ہوگئی، اور سڑک کے عین درمیان میں آگئی۔

رتن نے چلا کر کہا، "دلاور، کار کو آگے لے جاؤ یا پیچھے رہ جانے دو۔ گرد سے ہمارا دم گھٹا جارہا ہے۔"

دلاور نے چلا کر کہا۔ "راستہ نہیں دیتا! بے ایمان کا بچہ!"

ہورن۔ رفتار۔ اور ہورن۔ اور رفتار۔

ایک دفعہ اگلی کار ایک پتھر سے بچنے کے لئے ذرا سی بائیں طرف کو ہوگئی۔ دلاور پاگلوں کی طرح اُس کے بائیں طرف چھوڑے ہوئے ناکافی راستے میں گھس گیا۔ رفتار کے تھوڑے سے اضافے کے ساتھ وہ اگلی کار کے برابر آگیا۔ ایک لمحہ تک دونوں کاریں برابر برابر چلیں۔ یورپین جوڑے کی کار غار کی طرف تھی اور دلاور کی کار پہاڑ کی طرف۔ غار کی طرف کے ڈرائیور نے آنکھیں نکال کر زور زور سے دلاور کو کہا۔

"رونگ سائڈ چلتا ہے احمق!"

دلاور نے غضب آلود نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی بجائے اپنی کار کی رفتار اور زیادہ کر دی۔ کار آگے نکل گئی۔ دوسرے ڈرائیور کی گالی دلاور کے دماغ میں ابھی تک گونج رہی تھی۔ فتح کے احساس نے اُس کو انتقامی قسم طریقے کی طرف دھکیل دیا۔ اُس نے آناً فاناً ایک فیصلہ کیا۔ اُس کی کار آناً فاناً دور سے دائیں طرف مڑ کر دوسری کار کے سامنے آگئی۔ دلاور کا خیال تھا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنی کار کی رفتار کم کر دے گا اور دوسری کار کے ڈرائیور کو جو غار کی طرف مڑنے سے ڈرے گا، یکلخت اپنی کار کی بریکیں لگانی پڑیں گی اور وہ کار ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر جائے گی۔ لیکن دوسری کار کے ڈرائیور کو جسے ایسے خطرناک راستے پر اس قسم کی طفلانہ حرکتوں کی ہرگز امید نہ تھی، وقت کی اس حرارت میں بریکیں لگانے کا خیال تک نہ آیا۔ اور وہ ایک دھماکے کے ساتھ دلاور کی کار کے پچھلے دائیں مڈگارڈ کے ساتھ ٹکرایا۔ ٹکر نے دلاور کی کار کا رخ پوری طرح غار کی طرف کر دیا۔ اور پیشتر اس کے کہ اس کے پھٹے ہوئے دماغ کو برسوں کا بار رفتار کم کرنے کا خیال آتا، اُسکی کار پتھر دل کے اُس ڈھیر پر جو سڑک کی مرمت کے لئے سڑک کے ایک طرف پڑا تھا، چڑھ گئی، اچھلی اور ڈگمگاتی ہوئی غار میں جا گری۔

یورپین لڑکی نے جس کی کار حفاظتی دیوار کے ساتھ ایک ہلکی سی ٹکر کھا کر سنبھل گئی تھی، دل دہلا دینے والی ایک چیخ ماری۔

کھڑکھڑ —— کھڑکھڑ —— کھڑکھڑ ——

کسی پاگل خانے میں رات کے دو بجے کی پُراسرار خاموشی کے وقت کسی دہلانے والے رونے کی آوازوں اور بھیانک قہقہوں کی مانند جہلم کی وادی ایک لمحے کے لئے شور برپا ہوا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

عصمت چغتائی

مجنوں گورکھپوری

گذشتہ دہائی میں اُردو نے جو فسانہ نگار پیدا کئے ہیں ان میں عصمت کو ایک انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ بڑی بے اختیار اور بے دریغ لکھنے والی ہیں اور اپنے موضوع کے لئے ایک محدود دائرہ اور اپنے اسلوب کے لئے ایک مخصوص معیار بنا چکی ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے وہ کبھی کی جو تہ جیسی کہی جا سکتی ہیں۔ اسلوب کے اعتبار سے دونوں ان کی اپنی ذہانت اور طباعی کی پیداوار ہیں اور باہم ملکر ایک پورا امتزاج بن گئے ہیں۔

سب سے پہلے ان کے جو افسانے میری نظر سے گذرے وہ "داس" اور "بچپن" ہیں۔ یوں تو ان کا ہر افسانہ ان کی بصیرت اور دراکی کا پتہ دیتا ہے۔ ان کا کوئی افسانہ ایسا نہیں جو زندگی کی پیچ در پیچ لہروں سے خالی ہو لیکن اگر انہوں نے صرف یہی دو افسانے لکھے ہوتے تو وہ بھی وہ اُردو افسانوں میں ایک نئے عنوان اور نئے باب کا اضافہ تسلیم کئے جاتے۔ میرے ایک دوست کو سب سے خوشی یہ ہے کہ ایک عورت ایسے افسانے لکھ سکتی ہے۔ مجھے اس پر مسرت ہے کہ اُردو میں ایسے افسانے لکھے جا سکتے ہیں زندگی کی رُکی ہوئی بالیدگیوں اور اس کی پیچیدگیوں کو اس شدید اور بیباک الہامی صداقت کے ساتھ فن میں منتقل کر دینا فن کار کا وہ اکتساب ہے جس پر وہ بجا طور پر خود ناز کر سکتا ہے۔

عصمت کی فسانہ نگاری کا کوئی عنوان قائم کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ انہوں نے زندگی کے جن چھوٹے چھوٹے مگر اہم واقعات کو اپنے افسانوں کا مواد بنایا ہے وہ ایسے ہیں جو بہت دور تک موثر ہوتے ہیں۔ اور جن سے شخصی کردار کی غیر شعوری طور پر تشکیل ہوتی ہے۔ ہمارے مفکروں اور ادیبوں نے ان کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ بلکہ وہ اب تک ان کی طرف دبی زبان سے اشارہ کرتے ہوئے بھی شرماتے رہے ہیں۔ عصمت کو ان واقعات کے ساتھ پیدائشی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ ایک صناعانہ اعتماد کے ساتھ تامل انگیز اشاروں میں ان کی نمائش کرتی ہیں۔ وہ یقیناً اپنے فن کی مجتہد ہیں اور انھوں نے اس کمال کے ساتھ اس کو اپنا لیا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی دوسرا اس کو ہاتھ لگانے کی جرأت کر سکتا ہے۔ سنا ہے اُن کے دو چار افسانوں نے بعض طبقوں میں کچھ ہلچل مچا دی ہے۔ اور کچھ لوگوں نے ان کے خلاف بے حیائی اور عریانی کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ یہ تو ہونا تھا "پردے کے پیچھے" "اندھیارا" یا "آئینہ" اور "خدمت گار" کی بے درد نفسیاتی واقعیت کو ہمارے غلط معاشرتی مفروضات اور ہمارے ریاکارانہ اخلاقی معیار کیسے گوارا نہیں کر سکتے کہ ابھی وہ اپنا تسلط قائم رکھ کر ہماری ترقی کو روکے رہنا چاہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ "پردے کے پیچھے" کیا کیا ہو سکتا ہے اور عام طور سے کیا کیا ہوا کرتا ہے "لحاف" کے اندر ایسے حالات اور مواقع کے زیر اثر ایسی ہی نفسی تحریکیں اور ایسے ہی عصبی ہیجانات رونما ہوتے ہیں۔ اس کو علانیہ یا دل میں سب مانتے ہیں۔ مگر سب ان کو "پردے کے پیچھے" اور "لحاف" کے اندر ہی رہنے دینا اس لئے چاہتے ہیں کہ اگر ان کے وجود کو تسلیم کر کے ان کو سامنے لے آیا جائے تو ہمارا وہ روایتی تمدنی نظام جو ایک کہنہ سال تناور درخت کی طرح اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے اور جس کی جڑیں زمین چھوڑ چکی ہیں دیکھتے دیکھتے زمین پر آ رہے گا۔

عصمت نے جس بیباکی اور جرأت کے ساتھ ان پردوں کو فاش کرنا شروع کیا ہے۔ ہمارے ادب میں اس کی کمی تھی اور اس کی ایک حد تک ضرورت بھی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ عصمت نے بیباکی اور عریانی میں مردوں کے بھی کان کاٹے ہیں۔ مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس انداز کی جنسیاتی بیباکی (جسے عریانی کہنا تو خیر غلط بیانی ہے) اس لئے کہ عصمت کا فن اشاریت ہے مردوں کے بس کی چیز ہی نہیں ہے۔ غور کیجئے تو ماننا پڑے گا کہ ایسی جرأت ایک طناز عورت ہی کر سکتی تھی جو باغی ہو گئی ہو اور عصمت ترقی پسند ہوں یا نہ ہوں ان کو باغی تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

جس دُنیا سے عصمت اپنے افسانوں کے لئے مواد لیتی ہیں وہ رقبہ اور نوعیت دونوں کے اعتبار سے بہت محدود ہے۔ وہ دنیا

ان کے مسلمان گھرانوں کی زندگی سے باہر عصمت کی قلمرو نہیں ہے۔
لیکن اپنی محدود قلمرو میں ایک مطلق العنان حکمران کی حیثیت رکھتی
ہیں۔ اخلاق و معاشرت کے غلط رسوم و روایات اور جھوٹے معیار
کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کے تربیت طلب جنسی شعور میں کیسی کیسی
پیچیدگیاں اور رخنے پیدا کر دیتے ہیں عصمت سے بہتر پیرائے
میں شاید ہی کوئی شاعر یا افسانہ نگار ہمکو سمجھا سکتا تھا۔

عصمت کا فن اس قدر اچھوتا ہے کہ ہم اکثر مبہوت ہو کر
اس کے متعلق طرح طرح کے دھوکے میں مبتلا ہو جاتے ہیں مثلاً
ہم میں سے بعض کو اصرار ہے کہ وہ ترقی پسند ہیں معلوم نہیں
وہ خود اپنے کو کیا سمجھتی ہیں؟ اور ان افسانوں سے باہر زندگی کے
اور شعبوں کے متعلق ان کے عقائد اور نظریات کیا ہیں؟ ترقی
پسندی کی بعض علامتیں ان میں یقیناً ضرور ہیں۔ مثلاً اکبر کہنا
طبقہ اوسط (بورژوا) کے ساتھ نفرت، فضیلت کی ابتذال۔
عصمت میں یہ فضیلت ضرور ہے کہ جس طبقے کی زندگی کے ایک
خاص رخ کو وہ پیش کرتی ہیں اس سے وہ کچھ خوش نہیں معلوم
ہوتیں۔ پھر جس نفسیاتی جرأت اور جنسی آزادی کا احساس
ہم کو ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ وہ بھی ترقی پسندی کا
ایک جزو ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن عصمت کسی خاص مقصدی
میلان کے ماتحت ایسا نہیں کرتیں۔ ان کے یہاں مقصدی میلان
کا تو سرے سے کہیں پتہ ہی نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ
زندگی کی اصل و غایت پر دیر تک سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے
کی شاید تاب بھی نہ لا سکیں۔ انہوں نے تو ایک نقطے کو ساری زندگی
سمجھ لیا ہے۔ ہمارا شعور جنسی یقیناً ایک اہم خلاق قوت ہے جس کی
صحت اور خیریت کی طرف سے ہم کو کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔
اور سماجی اور جماعتی نظام تمدن نے ہماری جنسی زندگی میں
طرح طرح کی خرابیاں پیدا کر رکھی ہیں جو اصلاح چاہتی ہیں۔
لیکن ہر وقت انہیں خرابیوں پر نظر رکھنا اور انہیں میں محو
رہنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے کو کسی کوٹھی خانے میں بند کر لینا
جہاں سوا رنگ برنگ کے مناسب زخموں اور دھبوں کے اور کچھ
نظر نہ آئے۔ ہم کو اپنے بدن کے کوڑھ سے آگاہ تو رہنا چاہیے اور ان
کا تدارک بھی سوچنا چاہیے۔ لیکن اس کے دھیان میں کھوئے
ہوئے رہنا حفظان صحت کے اصول سے ہٹی ہوئی حرکت ہوگی۔
عصمت نے جیسے افسانے لکھے ہیں ان کی خدا داد ذکاوت حس اور
فطری شعور فن کی بہترین دلیل ہے۔ ایسے افسانے لکھنا ہم میں سے
کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن ہم کو یہ محسوس کرکے کچھ مایوسی
سی ہونے لگتی ہے کہ پروسٹ اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی طرح
عصمت کا فن بھی تمام تر جبلی ہے جس کا مقصد سوا اس کے کچھ
نہیں کہ ایک نرالی النفس مزاج کا بے اختیار مظاہرہ کرتا رہے
اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں نہ کوئی سمت ہوتی ہے نہ کوئی
غایت۔ کاش ان کو یہ احساس ہو جاتا کہ جنسی بھوک کے علاوہ
ہماری اور بھوکیں بھی ہیں جو ہمارے جھوٹے سماجی مفروضات
کی بدولت اسی طرح گھٹ گھٹ کر رہ گئی ہیں۔

آخر میں عصمت کی زبان اور اس کے اسلوب کے بارے
میں بھی کچھ کہنا ہے۔ ان کی زبان کے متعلق تو کبھی دو رائیں نہیں
ہو سکتیں۔ ان کو ایک خاص حوار اور ایک خاص طبقے کی
روزمرہ زبان پر الہامی قدرت حاصل ہے۔ ایسی بے تکان زبان
مشکل ہی سے کسی کو نصیب ہو سکتی ہے' وہ الفاظ اور فقروں
کے گویا طرارے بھرتی ہیں۔ اور پڑھنے والا بعض اوقات ان کا
ساتھ نہیں دے سکتا۔ عصمت کا اسلوب بیان ایسا ہی ہے
جیسے کوئی خواب میں بے اختیار بڑبڑا رہا ہو اور ایک ایسا سننے
والا جو نفسیات خواب کا ماہر نہ ہو اس کے بڑبڑانے میں بہت سی خلائیں
اور بے ربطیاں محسوس کر رہا ہو۔ میں نے عصمت کے فن کو اشاریت سے
تعبیر کیا ہے۔ وہ مربوط اور مسلسل طور پر کھل کر ہم کو کچھ نہیں بتاتیں۔ بلکہ بے
ربط اور اچانک اشاروں میں بہت کچھ سمجھا جاتی ہیں۔ ان کا سارا فن
کچھ کنائی ہے جس کو سمجھنے کے لئے درک اور مہارت چاہیے۔ اس سلسلے میں
مجھے ایک بات یاد آگئی۔ ایک مرتبہ میرے ایک دوست جو نہ قدامت پسند ہیں
اور نہ ترقی پسند، مجھ سے کہنے لگے "بخیر عصمت کا موضوع جو کچھ بھی ہوا
اور اس کے بارے میں جس طرح بھی چاہے سمجھے مگر یہ بھی کوئی لکھنے کا طرز
ہے جیسے کوئی مجذوب بڑبڑاتا چلا جائے" اور میں نے ہنس کر کہا تھا "دور
بلوغ میں لڑکوں اور لڑکیوں کو جس لذت آمیز کرب سے گذرنا ہوتا
وہ کچھ اسی طرح بہتر بیان کیا جا سکتا ہے" اور مجھے اپنی اس رائے
پر اصرار ہے۔ عصمت کی افسانہ نگاری سن بلوغ کی بے چینیوں کا بہتر
اظہار ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہنچ کر ان کے شعور کی رفتار
یکایک ٹھیراؤ پیدا ہو گیا ہے۔ اور وہ اس منزل سے عمر ہو گئے نہ بڑھ سکے

(ناتمام)

"فتح کے بعد"

ابن سعید

(اس افسانے کے تمام کردار اور واقعات محض فرضی اور تخیلی ہیں ان کا اصلیت سے کوئی واسطہ نہیں)

زرد، نیلے، سبز، سُرخ اور لاتعداد رنگوں کے چھوٹے بڑے
قمقموں کی قطاریں کی قطاریں دُور دُور تک چلی گئی تھیں۔ درختوں
کی شاخوں میں، چھتوں کی منڈیروں پر، چھجوں پر، دکانوں کے
سائن بورڈوں پر، موٹروں کے انجنوں پر، غرضیکہ سبھی جگہ یہ رنگ
رنگے قمقمے آنکھیں جھپکا رہے تھے، اور آسمان پر روپہلی روشنی
کی شعاعیں نئے نئے وضع کے جال بُن رہی تھیں۔ روشنی کی
یہ سفید ملائی جیسی موٹی شعاعیں کبھی چوکور حلقے بنا دیتیں، کبھی
گول گول دائرے یا پھر کبھی مستطیل شکلیں اور کبھی دو لمبی لمبی
شعاعیں مل کے آسمان کے عین بیچ پر ایک "وی" بنا دیتیں۔
وکٹری ڈے منایا جا رہا تھا۔

رات اندھیری ہونے کی وجہ سے روشنیوں کا یہ رنگ
رنگا منظر اور بھی واضح ہو گیا تھا، اندھیرے میں انسانوں کی
موجودگی بہت مدھم ہو کے رہ گئی تھی لیکن شعاعوں کا یہ منظر
میلوں پرے سے نظر آ سکتا تھا، جیسے تاریکی میں کوئی پھولوں کا
تختہ اُبھر آیا ہو۔

یکایک کناٹ پلیس کے وسط میں بنے ہوئے لان پر اُگے
ہوئے دو چھوٹے چھوٹے درختوں کے درمیان قمقموں کی ایک
پوری لائن آہستہ سے لرز اٹھی اور تھوڑی دیر بعد میں ان لرزتی
ہوئی روشنیوں کے درمیان وکٹوریہ کو دیکھ سکا۔

رنگ رنگ کی روشنیاں وکٹوریہ کے جسم پر بھی ایک
عجیب طرح کا جال بنائے دے رہی تھیں۔ اس کی بالوں کی لہر
میں بھی رنگ بھرا ہوا معلوم ہو رہا تھا، اور اس کے چہرے
کی رنگت بھی زرد اور سُرخ روشنی میں ہمیشہ سے زیادہ صاف
اور اُجلی معلوم ہو رہی تھی۔

"وکٹوریہ!"

"ہلو!"

وہ چونک پڑی، دراصل وہ مارگریٹ اور جوزفین اپنے
ہوسٹل سے چوری چھپے یہاں نکل آئی تھیں، وکٹری ڈے پر
ان کو سختی سے رات کے وقت ہوسٹل سے باہر نکلنے کو منع کر دیا گیا
تھا، لیکن پھر بھی وہ تینوں شاگرد پیشہ کے قریب بنی ہوئی نیچی سی
منڈیر کو پھلانگ کے ہوسٹل سے باہر نکل گئی تھیں۔ وہ وکٹری
ڈے کی گہما گہمی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھیں۔ یا پھر
شاید یہ چاہتی تھیں کہ اس ہنگامے میں جس میں دُنیا کے سب
بڑے بڑے ملکوں کا اور دُنیا کی تمام آبادی کا ایک بہت
بڑا حصہ شرکت کر رہا تھا۔ اس میں وہ بھی شامل ہو سکیں،
اور اسی لئے وہ ہوسٹل کے قانون کو بےفکری سے توڑتے
ہوئے کناٹ پلیس چلی آئی تھیں جہاں وکٹری ڈے کی گہما گہمی
سب سے زیادہ زوروں پر تھی۔

"وکٹری ڈے منا رہی ہو؟" میں نے پوچھا

"ہوں!" اور جوزفین بچوں کی طرح ہنسنے لگی، حالانکہ
اس کی عمر کوئی چوبیس سال کے قریب ہے اور عمر کے آثار
اس کے چہرے اور بھدے جسم پر بھی نمایاں ہونے شروع
ہو گئے ہیں، لیکن پھر بھی جب جوزفین ہنستی ہے تو اس کی
آواز میں ایک مہین سی گونج پیدا ہو جاتی ہے جو اس کی ہنسی
کو کم عمر بچوں کی ہنسی کی طرح بنا دیتی ہے۔

وکٹوریہ زیادہ شاعرانہ مزاج کی لڑکی ہے، وہ آسمان
کو تکنے میں محو تھی۔ آسمان پر روشنیاں حسبِ دستور وہی
نئے نئے وضعوں کی شکلیں بنا رہی تھیں، ہم لوگ تھوڑی
دیر تک خاموش کھڑے رہے چاروں طرف شور اس قدر بلند
تھا کہ بات کرنی ہی مشکل تھی، کناٹ پلیس کے اس گوشے
میں جہاں پر امریکن فوجیوں کے رہنے کی بیرکس بنی ہوئی
ہیں سب سے زیادہ شور مچ رہا تھا، انگریزی اور اطالوی
اور ہسپانوی گانوں کی ملی جلی آوازیں اور لوگوں کے
اُبھے ہوئے قہقہے، پھر باجوں کے زور زور سے بجنے کی آواز
سب نے مل کر کناٹ پلیس کے اس گوشے کو سب سے زیادہ
پُر شور بنا ڈالا تھا، امریکن فوجیوں کی بیرکس پر بھی رنگ

…کی روشنیاں جل رہی تھیں، جھنڈوں کی ایک قطار بھی بیرکس کی ہی منڈیر سے چپٹی ہوئی لہرا رہی تھی، وہ فلڈ لائٹس جو شاید بیرکس کے لان میں گڑی ہوئی تھیں، اس دو منزلہ عمارت کو روشنی کی دھند میں لپیٹے ہوئے تھیں۔ اس دھند میں سے داغ چینی امریکن لکیر دار جھنڈا تھا جو جھکا ہوا خاموش کھڑا تھا، جیسے اس سارے ہنگامے سے بے تعلق ہو۔

"روزویلٹ کی موت کی وجہ سے امریکن جھنڈا ابھی تک ہاف ماسٹ پر ہے!" وکٹوریہ نے آہستہ لہجے میں کہا جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔

"روزویلٹ بچارا وی ڈے سے پہلے ہی مرگیا" جوزفین بولی۔ اور پھر خود ہی زور زور سے ہنسنے لگی جیسے اسکو روزویلٹ کا وی ڈے سے تھوڑے عرصہ پہلے ہی مرجانا کچھ مضحکہ خیز معلوم ہو رہا ہو۔

"چلو، یہاں شور بہت ہے، کہیں اور طرف چلیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں سُنا ہے جوزی!" مارگریٹ ایکدم سے بولی۔ "ہاں سُنا ہے جوزی، گمبڈ گھر کو سر سے پیر تک روشنیوں سے سجایا گیا ہے۔ چلو اُس طرف چلیں۔"

"نہیں!" وکٹوریہ نے اسی دھیمے لہجہ میں کہا۔ مگر اس کے لہجے میں ایک طرح کی خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔

اور تھوڑی دیر تک ہم سب لوگ پھر خاموش کھڑے رہ گئے، چاروں طرف شور اس قدر تھا کہ ہماری خاموشی کے وجود کا بھی کسی کو پتہ نہ چل سکتا تھا، وکٹوریہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گویا روشنی کی ہر شعاع کو چیر کر رکھ دینا چاہتی تھی

"پھر آخر کچھ کرو گی بھی؟" جوزفین بولی "یہاں کب تک خاموش کھڑی آنکھیں پھاڑتی رہو گی؟" جوزفین پھر ہنسنے لگی، میں اس کے قہقہوں سے تنگ سا آ گیا تھا، اس لئے میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ہم کہیں اور ایسی جگہ چلے چلیں جہاں پر جوزفین بے معنی قہقہے لگانے کے بجائے کسی اور زیادہ دلچسپ چیز میں مصروف ہو سکے!

"چلو 'الیٹ' چلیں!"

"الیٹ" کناٹ پلیس کے بیرونی احاطے میں ایک چھوٹا سا رسٹوران ہے جو عموماً خالی پڑا رہتا ہے، لوگ اس طرف بہت کم جاتے ہیں کیونکہ کناٹ پلیس میں اس سے زیادہ دلچسپ اور بڑے رسٹوران موجود ہیں، میں نے سوچا کہ باقی سب رسٹوران اور ہوٹل تو آج وکٹری ڈے کے ہنگامے سے بھرپور ہوں گے اور سارے میں اودھم مچی جوت بج رہا ہوگا۔ اور "الیٹ" کی طرف کسی نے توجہ بھی نہ کی ہوگی، اس لئے ہم وہاں خاموشی سے بیٹھ کر کافی پی سکیں گے، اور وکٹوریہ کی شاعرانہ موڈ کو بھی تقویت پہنچ سکے گی!

جب ہم تانگوں، موٹروں، سائیکلوں اور راہگیروں کے طوفان سے بچکر کناٹ پلیس کے بیرونی احاطے میں پہونچے تو میں نے دیکھا کہ "الیٹ" میں بھی اُسی قدر ہنگامہ اور اودھم ہے جتنا کہ اور بڑے رسٹورانوں میں، سامنے کے دروازے پر کاغذ کی چھوٹی چھوٹی جھنڈیوں اور پام کے پتوں سے ایک محراب بنائی گئی تھی، محراب کے بیچ میں ایک اونچا سا بورڈ ہوا میں لہرا رہا تھا، جس کے دونوں طرف کاغذ کے پھولوں سے "وی" بنائی گئی تھی:

"الیٹ" میں بھی تو اتنا ہی شور اور اودھم ہے!" جوزفین نے کہا۔ "میں تو کہہ ہی رہی تھی، کہ شہر کی طرف چلو، وہاں

"ہاں واقعی یہاں تو بہت کافی بھیڑ ہے!" مارگریٹ بولی۔

"نہیں جوزی، اب یہیں چلو، ہم تو ہوسٹل سے بھاگ کے اس شور اور اودھم کے لئے آتے تھے اب شہر جاکے کیا کریں گے؟" وکٹوریہ احتجاج پر تلی ہوئی تھی، میں نے دروازے کے شیشوں میں سے دیکھا کہ "الیٹ" کا چھوٹا سا ڈائننگ ہال فوجیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، فوجی دنیا کی ہر قوم کے نمائندے تھے، انگریز امریکن، ہندوستانی، افریقی، آسٹریلینی، اطالوی۔ سب کے سب جرمنی کے ہار جانے پر شدت کے ساتھ خوشی منانا چاہتے تھے، ان کے زور زور سے قومی ترانے اور جنگی نغمے گانے کی آوازیں بہت دور سے سُنائی دینے لگی تھیں، "الیٹ" کا اپنا آرکسٹرا پہلے کبھی نہ تھا، آج معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے کہیں سے ایک بے سُرا آرکسٹرا منگا لیا تھا جو ہر قومی ترانے کے ساتھ سُر ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہاں، میرے خیال میں یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے!" میں نے کہا۔

لیکن وکٹوریہ تو بری طرح اڑی ہوئی تھی۔

"بہت ڈرپوک ہیں آپ؟ بہرحال میں تو اکیلی جانے کیلئے تیار ہوں!"

مجبوراً ہم سب کو بھی اندر جانا پڑا۔ اندر اودھم میری توقع سے بھی زیادہ شدید تھا، فوجی سپاہیوں اور افسروں نے شراب کے چھوٹے چھوٹے گلاس اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھے تھے، جن میں وسکی، رم اور جن بھری ہوئی تھی، چند نوجوانوں نے آرکسٹرا والوں کو سازوں کے پاس سے الگ دھکیل دیا تھا، اور خود پورے جوش و خروش کے ساتھ ملے بجانے اور پیپے جوتوں سے تال دینے میں مشغول تھے۔ اور فوجی عورتیں آزادی سے مردوں کے ساتھ تیز تیز قسم کے ناچ ناچنے میں مصروف تھیں، چند ایک ہندوستانی جوڑے بھی ہماری طرح سے "الٹ" کی فضا میں آن پھنسے تھے، ایک کونے کے قریب دبکے ہوئے بیٹھے تھے، ان کی میز پر رکھے ہوئے گلاسوں میں بھی وسکی بھری ہوئی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں سے کوئی بھی پینے کی طرف متوجہ نہ تھا، ان کی نگاہیں جو مجھ کو خواہ مخواہ سہمی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں، ہر ایک ناچنے والے کو گھور رہی تھیں، اور وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے، ہم لوگوں کو ہال میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ کچھ چونک سے گئے اور پھر شاید ہمارے بارے میں ہی ایک دوسرے سے کھسر پھسر کرنے لگے۔

ہال میں بکھری ہوئی تمام میزیں اور کرسیاں گھری ہوئی تھیں، اور ہم لوگوں کو بیٹھنے کی کوئی بھی جگہ نظر نہ آ رہی تھی میں نے سوچا کہ اگر یہاں بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہ ملے تو اچھا ہے، یونہی یہاں سے بھاگ نکلنے کا راستہ مل جائیگا، لیکن جب میں نے وکٹوریہ کی طرف دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی دھندلی سی نگاہیں ہال میں ناچتے ہوئے مردوں اور عورتوں پر پھسلی جا رہی ہیں جیسے کہ وہ ان عورتوں اور مردوں کے تھرکتے ہوئے جسموں کے بجائے کسی اور جسم پر اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہتی تھی، گویا وہ ان جسموں کے اندر چھپی ہوئی روح کو دیکھنا چاہتی تھی، اس روح کو جو جرمنی کے ہار جانے پر اور نازی حکومت کے خاتمے کے قبل سے ہی گویا چونک اٹھی تھی، اور شاید وہ خود بھی اس روح میں گھل مل جانا چاہتی تھی ۔۔۔ اس لئے مجھ کو تھوڑی سی مایوسی ہونے لگی، میں چاہتا تھا کہ وکٹوریہ کو "لیٹ" میں آجانے کے بعد خواہ مخواہ مایوس ہونا پڑے [illegible] ہم کو اس فضا سے باہر چلا جانا پڑے، جوزفین پر اس فضا نے کوئی خاص اثر نہ کیا تھا، وہ تو ایک کینیڈین ایئر فورس کے افسر کے سنہری بالوں کو مسکرا مسکرا کے دیکھنے میں مشغول تھی، جوزفین کو مردوں یا عورتوں کی تمام چیزوں میں بالوں سے سب سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے، ایک انسان کی خوبصورتی یا بدصورتی کا اندازہ وہ صرف اس کے بالوں سے ہی لگاتی ہے، اسی لئے وہ اس کینیڈین افسر کے بالوں کو اس قدر دلچسپی سے گھورنے میں محو تھی ۔۔۔ لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ہال میں داخل ہو جانے کے بعد سے مارگریٹ کچھ سہم سی گئی تھی، دراصل مارگریٹ کو فوجی سپاہیوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان کے درمیان آ کے وہ خود کو بے بس سا محسوس کرنے لگتی ہے، اس وقت بھی شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کچھ ڈری سی گئی تھی ۔۔۔ یکایک ایک کالے رنگ کا بیرا بالکل میرے قریب آ کے کھڑا ہو گیا۔

"کوئی خالی میز ہے؟" میں نے پوچھا،

وکٹوریہ میرے کو پرامید نگاہوں سے دیکھنے لگی، پہلے تو مجھ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ بیرا پوری طرح فیصلہ کرنے سے قاصر ہے لیکن جلد ہی وہ ذرا رازدارانہ لہجہ میں بولا۔

"ایک میز ہے صاحب! ۔ اوپر فیملی روم میں۔!"

فیملی روم کو راستہ ہال کے پیچھے سے ہو کر جاتا تھا، جب ہم زینے کی طرف جانے کے لئے ہال سے باہر نکلے تو فوجیوں کی ایک پارٹی کی نظریں ایک دم سے ہم لوگوں پر جم گئیں۔

"باہر کیوں جاتے ہو؟ کامریڈس!" وہ چلائے۔ "آؤ ہمارا جام صحت پیو!" ان سب کی آوازیں پریشان سی تھیں، اور ان کی نگاہیں گھور گھور کے ہمارے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں، مارگریٹ اور بھی ڈر گئی اور اس نے جوزفین کا بازو پکڑ لیا اور میری آڑ میں آ گئی۔

"آؤ۔ ہمارا جام صحت پیو!۔ وی ڈے کی خوشی میں نشے سے پاگل ہو جاؤ ۔۔۔ آؤ ۔۔۔ آؤ ۔۔۔ آؤ" وہ آوازیں بہت دیر تک ہمارا تعاقب کرتی رہیں۔ لیکن پھر ایک بے معنی سے بلند شور میں تبدیل ہو کے رہ گئیں، اور ہم تیز تیز قدموں سے لکڑی کے زینے پر بیرے کے پیچھے چڑھتے چلے گئے۔

ڈائننگ روم میں بھی لوگ بھرے ہوئے تھے لیکن وہ سب
بالکل خاموش اور سنجیدہ بیٹھے تھے زیادہ تر نوجوان جوڑے
جو فیملی روم میں آہستہ آہستہ سرگوشیاں کرنے کے لئے
آئے تھے ہم لوگوں کی آہٹ نے ان میں سے کسی کو بھی چونکایا
نہیں اور وہ اسی خاموشی کے ساتھ ایکدوسرے میں محو رہے۔
بیرا ہم کو ایک فیملی روم میں لے گیا جو نسبتاً چھوٹا اور
نیم اندھیرا تھا۔ کیونکہ چھت کا ایک بلب ٹوٹے ہوئے تار
میں لٹک رہا تھا، جب ہم ابھی اپنی کرسیوں پہ بذرا اطمینان
سے بیٹھ گئے تو ہم نے دیکھا کہ ہم اس کمرے میں اکیلے نہ تھے، ایک
کونے میں ایک چھوٹی سی تپائی کے قریب ایک ہندوستانی
فوجی افسر دیوار سے اپنی کرسی ٹکائے ہوئے خاموش بیٹھا تھا،
اس کے سامنے میز پر شراب کا ایک چھوٹا سا گلاس بھی رکھا
تھا جس میں سنہری رنگ کی دھکی سی چمک رہی تھی، وہ ہمارے
اندر داخل ہونے پر بھی ویسے ہی خاموش بیٹھا رہا۔ کمرے میں
اس کی موجودگی کے اچانک احساس نے مجھ کو ذرا سا چونکا دیا
لیکن وہ اس قدر خاموش بیٹھا تھا کہ مجھ کو اس کی موجودگی
سے کوئی خاص پریشانی نہ ہوئی وکٹوریہ خاموش بیٹھی اس
نوجوان افسر کو اپنی دُھندلی دُھندلی نگاہوں سے دیکھ رہی
تھی، اور مارگریٹ کی سہمی ہوئی نگاہیں شراب کے گلاس کا جائزہ
لینے لگی۔

"ہم سب کافی پئیں گے!" میں نے فیصلہ کُن انداز میں
بیرے سے کہا۔

"نہیں، میں جن اور سوڈا پیوں گی، وکٹری ڈے کی خوشی
میں!" وکٹوریہ نے بغیر میری طرف دیکھے ہوئے اپنے مخصوص
دھیمے لہجہ میں کہا

"تم شراب بھی پیتی ہو وکٹوریہ؟" میں چونک پڑا تھا،

"نہیں! لیکن میرا خیال ہے کہ میں وی ڈے کی خوشی
میں شراب پینے کے لئے بھی تیار ہوں!"

"تم کو کیا ہو گیا ہے، وکٹوریہ؟" مارگریٹ ایکدم سے
بولی۔ "آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو، آخر تم کو وکٹری ڈے پر
اس قدر مسرور ہو جانے کی وجہ کیا ہے! تمہارا اس سے کونسا
ذاتی فائدہ ہو رہا ہے!"

وکٹوریہ خاموش بیٹھی رہی، بیرا کافی اور جن لینے کیلئے
چلا گیا، میں حیران ہو کے وکٹوریہ کی طرف دیکھنے لگا، وہ آج عجیب
عجیب باتیں کر رہی تھی!

"کچھ نہیں، مارگریٹا!" وہ خاموشی کے تھوڑے سے وقفے
کے بعد بولی۔ "وہ ہمیشہ وکٹوریہ کا نام ایک مخصوص فرانسیسی
انداز میں لیتی تھی۔" مارگریٹا، میں اپنے ہوش و حواس میں
ہوں، اسی لئے تو میں وی ڈے کی خوشی میں۔"

"تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے" میں ایکدم چیخا۔ تم کو
موجودہ جنگ عظیم سے یا اس وکٹری سے کیا واسطہ؟ — نہ
تم امریکن ہو، نہ انگریز، نہ فرانسیسی، نہ روسی، تم تو ایک
معمولی ہندوستانی عیسائی لڑکی ہو — اور پھر جس
وکٹری کے لئے ہزاروں کروڑوں انسانوں کو اپنی جانیں
دینی پڑی ہوں اس سے تم کو کیا خوشی ہو سکتی ہے؟ —
کیا تم کو پتہ نہیں کہ ایک جرمنی کو ہرانے کے لئے ہزاروں
لاکھوں بلکہ ان گنت انگریز، ہندوستانی، فرانسیسی، امریکن،
روسی اور خبر نہیں کون کون سی قوموں کے نوجوانوں عورتوں
مردوں اور بچوں کو اپنی جانیں ضائع کرنی پڑی ہیں؟ بہتر
تو یہ ہے کہ تم خاموش بیٹھ کے ان لوگوں کے متعلق سوچو جو
آج موجود نہیں ہیں، بجائے اس کے کہ خواہ مخواہ شراب
پی کر پاگل ہو جاؤ۔" وکٹوریہ پھر بھی خاموش بیٹھی رہی!

نیچے ڈائننگ ہال میں فوجیوں نے امریکن قومی
ترانے گانے شروع کر دیئے تھے، ان کی آوازیں ہال میں بری طرح
گونج رہی تھیں، یکایک ایک طرف سے ذرا دھیمی آواز میں
چند آدمیوں نے "مارسیلز" (فرانسیسی قومی ترانہ) شروع
کر دیا، ان کی آوازیں گو کہ امریکن قومی ترانے کے مقابلے
میں مدھم معلوم ہو رہی تھیں، لیکن پھر بھی ان میں ایک طرح
کا زور تھا جس کی وجہ سے وہ امریکن فوجیوں کی آوازوں
سے الگ ہو کے سنائی دے رہی تھیں۔

"ہندوستان میں سب قوموں کے ترانے گائے جا سکتے
ہیں" — مجھکو معلوم بھی نہ تھا کہ وہ ہندوستانی نوجوان
جو چھوٹی سی تپائی کے قریب خاموش بیٹھا تھا کس وقت اٹھ
کے ہماری میز کے قریب آن کے کھڑا ہو گیا تھا، وہ درمیانے
قد کا معمولی شکل کا انسان تھا، اس کے گھونگھریالے بالوں
کی لٹیں اس کے کانوں اور ماتھے پر آہستہ آہستہ جھول رہی تھیں

میں نے جوزفین کی طرف دیکھا جو میری توقع کے مطابق اس کے بالوں کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

"معاف کیجئے گا میرا نام ماآجل ہے! ــــ میں وہاں اکیلا نہ بیٹھنا چاہتا تھا، لیکن میں نیچے اس شور میں بھی نہ گھرا رہنا چاہتا تھا، اور اگر میں نیچے ڈائننگ ہال میں بیٹھتا بھی تو مجھ کو لوگوں سے انگریزی میں باتیں کرنی پڑتیں، چار سال تک سراسر انگریزی میں باتیں کرتے کرتے میں اکتا گیا ہوں، اس لئے میں نے آپ لوگوں سے اپنی زبان میں بات چیت کرنے کے موقع کو غنیمت جانا۔"

"تو بیٹھئے نا! ـــ" جوزفین نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ ہندوستان عجیب و غریب ملک ہے یہاں پر سب ملکوں کے قومی ترانے گائے جا سکتے ہیں جیسے فرانسیسی، امریکن، روسی، سب قومی ترانے یہاں سنائی دے سکتے ہیں لیکن ہندوستان کا اپنا کوئی قومی ترانہ کبھی سنائی نہیں دیتا۔ یہاں پر سب ملکوں کے جھنڈے لہرائے جاتے ہیں، لیکن ہندوستانی جھنڈا لہرانا جرم سمجھا جاتا ہے ــ" اور وہ ایک ایسی ہنسی ہنسنے لگا جو کافی کھائی طور پر طنزیہ معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خاموش ہو گیا، ہم سب لوگ بھی خاموش بیٹھے رہے۔ وکٹوریہ بھی بدستور خاموشی سے اس کے چہرے کو گھورتی رہی۔

"وکٹری ڈے کی خوشی میں میرے ساتھ کون شراب پیئے گا"
وکٹوریہ نے تھوڑی دیر بعد جن کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا اس کے لب جن کے انتظار میں سنجیدہ طور پر کھلے ہوئے تھے۔

"آپ وی ڈے کی خوشی منانے کے لئے یہاں آئی ہیں؟"
ماآجل نے وکٹوریہ سے بغیر رسمی تعارف کے ہی باتیں کرنا شروع کر دیں۔

"جی ہاں۔ میں وی ڈے منانا چاہتی ہوں۔ میں ہوٹل کا قانون توڑ کے یہاں اس وقت اسی لئے آئی ہوں، آپ میرے ساتھ اس خوشی میں شرکت کرنے کو تیار ہیں؟"

"مگر آپ کو وکٹری ڈے سے کیا مطلب؟ آپ کو نازی حکومت کے خاتمے سے ذاتی طور پر کیا واسطہ ہے۔ آپ۔"

"میرے خیال میں جرمنی کا اس جنگ میں ہار جانا دنیا کی آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کیلئے بہت اہمیت رکھتا ہے! بہرحال آپ میرے ساتھ جن پینے کو تیار ہیں؟"

ماآجل اپنی کرسی پر سے اٹھ کھڑا ہوا، اس کی آنکھیں [illegible] گئی تھیں، مجھ کو وہ پیئے ہوئے معلوم ہونے لگا۔ اس نے [illegible] میں بولنا شروع کیا۔

"مگر میں تو چار سال فوج میں رہا ہوں۔ چار سال تک اس جنگ میں حصہ لیتا رہا ہوں۔ چار سال تک میں انگریز فوجیوں کے پہلو بہ پہلو دشمنوں کے مقابلے میں لڑا ہوں، چار سال تک میں نے اپنی زندگی طرح طرح کے خطروں میں گھری ہوئی دیکھی تھی ــــ میں بھی اپنے ماتحت سپاہیوں سے کہتا تھا کہ ہم [illegible] کے لئے لڑ رہے ہیں، انسانوں کی آزادی کے لئے، دنیا کو نازی حکومت کے مظالم سے بچانے کے لئے، فاشستی طاقتوں سے دوسری قوموں کو نجات دلانے کے لئے ــــ اور ہمارے ماتحت ہندوستانی سپاہی اپنی جانیں اور بھی زیادہ آسانی سے دیتے تھے۔ لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ ہم کو وکٹری ڈے پر خوشی منانے کا کوئی حق نہیں۔ ابھی آخری فتح نہیں ہوئی! ــ ابھی ــ"

"آپ میرے ساتھ شراب پینے کو تیار ہیں، وکٹری ڈے کی خوشی میں؟"

وکٹوریہ اسی مدھم لہجے میں بولی۔ جیسے اس کو کسی [illegible] بڑے خیال نے مسحور کر رکھا تھا، یا جیسے وہ ہم سب کے وجود ہی سے بے خبر تھی، اور بس اس وقت اس کے سامنے صرف ایک مقصد تھا ــــ وکٹری ڈے کی خوشی میں ایک گلاس جن اور سوڈا پی لینا ــــ ماآجل کھڑا ہوا اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھتا رہا جو گلاس کو نرمی سے تھامے ہوئے تھے اور ایک دم مجھ کو نیچے ڈائننگ ہال کا شور جو اب بہت زیادہ اونچا معلوم ہونے لگا، "ایٹ" کا عاریتاً لیا ہوا آرکسٹرا زور زور سے کوئی فوجی دھن بجا رہا تھا، عورتوں اور مردوں کے ملے زور زور سے گانے کی آواز، جس میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بلند قہقہے بھی شامل ہو جاتے تھے، بہت ہی زیادہ بلند ہو گئی تھی ــــ اور "ایٹ" کی یہ پُر شور فضا مجھ کو اور بھی پریشان کئے دے رہی تھی! ساتھ ہی وکٹوریہ، مارگریٹ، جوزفین اور ماآجل کی خاموشی بھی میری پریشانی میں اضافہ کر رہی تھی! ــ ماآجل پھر کرسی پر بیٹھ گیا، جیسے اس نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو، اور بیرے کو ایک اور گلاس جن کیلئے آرڈر دے دیا

وکٹوریہ پھر بھی خاموش بیٹھی انتظار کرتی رہی، ماٹھل کی آمادگی نے اس پر کوئی خاص اثر نہ کیا تھا۔

"دیکھئے! میں آپ کی خوشی میں شرکت کرنے کو تیار ہوں۔ مگر" ماٹھل نے اب کے ذرا دھیمے لہجہ میں بولنا شروع کیا، جیسے وکٹوریہ کو کچھ سمجھا دینا چاہتا ہو۔ "مگر میرا خیال ہے کہ آخری فتح ابھی نصیب نہیں ہوئی ہے جس فتح کو حاصل کرنے کے لئے لاتعداد انسانوں کو اپنی جانیں دینی پڑیں، اور ہر قوم کے نوجوان طبقے کے ایک بہت بڑے حصے کو اپنی قربانی دینی پڑے وہ فتح ابھی نہیں ہے۔ یہ وقتی فتح تو دراصل ایک اگلی جنگ کا الٹیمیٹم ہے۔ اس الٹیمیٹم کو قبول کرنے کے واسطے قومیں پھر تیاری میں مصروف ہونے والی ہیں، اگر ہندوستانی، انگریزی، چینی یا امریکن قوموں کو بچانے کے لئے جرمنی یا اطالوی یا جاپانی قوم کو بالکل ختم کر ڈالا جائے تو بھی یہ فتح نہیں ہے ۔۔۔ فتح تو دنیا کے ایک ایک انسان کے لئے ہونی چاہیئے نہ کہ چند قوموں کے ایک گروہ کے لئے۔ اور پھر امن کے لئے تو وہی فتح کارآمد ہو سکتی ہے جو امن کے ذریعے حاصل کی گئی ہو نہ کہ جنگ سے اور میں اس فتح کی خوشی میں سرشار ہوں گا جس میں ہمارے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی جو آج ہمارے دشمن ہیں شریک ہونگے"

"وکڑی ڈے کے لئے!" وکٹوریہ ایسے بولی جیسے ماٹھل کی پوری تقریر کی طرف سے بہری ہو گئی تھی، اور جیسے وہ اس کے الفاظ سے پرے کسی اور دنیا میں چلی گئی تھی، وہ ماٹھل کے الفاظ سے بالکل بھی متاثر نہ معلوم ہوتی تھی ۔۔۔

"وکٹری ڈے کیلئے!" اس نے پہلا گھونٹ لیتے ہوئے پھر دہرایا۔

"ہاں، ہمارے وکڑی ڈے کیلئے!" ماٹھل نے کہا اُسکی آنکھوں میں معلوم ہوتا تھا خون اتر آیا تھا۔

"وکڑی ڈے کے لئے!" ۔۔۔ وکٹوریہ نے دوسرا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"وکڑی ڈے کے لئے" کسی کے نیچے سے چیخنے کی تیز آواز آئی۔

"وکڑی ڈے کے لئے!"

"وکڑی ڈے کے لئے!"

"وکڑی ڈے کے لئے" ۔۔۔ اور نیچے ناچتے ہوئے، گاتے ہوئے اور شور مچاتے ہوئے فوجی سپاہیوں کی آوازیں جلد ہی چیخوں میں بدل کے رہ گئی تھیں، ڈائننگ ہال کی اونچی چھت سے ٹکرانے کے بعد "وکڑی ڈے" کے نعرے اور گلاس فرش اور دیواروں پر پھینکنے کی آوازیں، اور پیانو کے پردوں پر مکے مارنے کی گونج بھی چیخوں میں بدل جاتی تھیں ۔۔ ان سب چیخوں نے مل کر "ایٹ" کے ہنگامے کو ایکدم سے بہت زیادہ بھڑکا دیا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ یکایک سب مردوں اور عورتوں میں ایک ہی تحریک شروع ہو گئی ہے۔ ان کی مسخ آوازیں بجلی کے قمقموں اور پھولوں کے ہاروں سے ٹکرائیں اور گونج کو دوگنا کر دیتیں ۔۔۔ لیکن وکٹوریہ بالکل خاموش بیٹھی تھی، ماٹھل کی سرخ آنکھیں وکٹوریہ کی خاموش نگاہوں کو تکے جا رہی تھیں، اور مارگریٹ نے زور سے جوزفین کی بانہہ پکڑ لی، اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا، اس کے چہرے کا رنگ کافی زرد ہو چکا تھا ۔۔۔

"وکٹوریہ!" میں چیخا۔

"وکڑی ڈے کے لئے!"

"وکڑی ڈے کے لئے!"

"وکڑی ڈے کی خوشی میں" اور آوازیں معلوم ہوتا تھا کہ ہر لمحہ میرے اور بھی قریب آتی چلی جا رہی ہیں، جیسے میرے کانوں کے پردوں کو چیر کے میرے دماغ میں اُتر جانا چاہتی ہوں۔

"وکٹوریہ!" میں دوبارہ چلایا "وکٹوریہ ہیلو!" اور ہزاروں قدموں کے ایک ساتھ لکڑی کے زینے پر پڑنے کی آواز فیملی رومز کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگی، وہ پورا غول کا غول اندھا دھند اوپر چڑھا چلا آ رہا تھا ۔۔۔ اور یکایک ایٹ کی چھوٹی سی عمارت میں جگمگاتی ہوئی لاتعداد رنگ برنگی روشنیاں غائب ہو گئیں، سارے میں اندھیرا چھا گیا تھا، جس پر انسانوں کے لاتعداد انسانوں کے چیخنے کی آواز زیادہ سے زیادہ مسلط ہوتی چلی جا رہی تھی، ان لوگوں کی بے معنی آوازوں میں کس قدر وحشت تھی! ۔۔۔ اور تھوڑی دیر بعد مجھ کو محسوس ہوا کہ جیسے مجھ کو انسانوں کے ایک سمندر میں دھکیل دیا گیا ہے، میرے چاروں طرف آدمی ہی آدمی تھے جو اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے مختلف نعرے لگا رہے

تھے، یا قریبی تراشے کا رہے تھے، ایک دوسرے کا ...

تھے، گلاسوں کو فرش اور دیواروں پر پٹک رہے تھے اور ایک
دوسرے کو دھکیل کے اپنے پاس سے ہٹا دینا چاہتے تھے! —
سانوں کے اس سمندر میں وکٹوریہ، ماتھل، مارگریٹ یا جوزفین
کی تمیز میرے لئے ناممکن تھی، میری چیخیں اور لوگوں کی آوازوں
میں ڈوب جاتی تھیں، اور کوئی چیخ بھی مجھ کو اپنی آواز کا جواب
معلوم نہ ہوتی — اور جب میں "الیٹ" کے پام کے پتوں
سے سجائے ہوئے دروازے کے باہر نکل آیا تو بھی اندر سے
ہی چیخیں اور آوازیں میرا تعاقب کرتی رہیں لیکن جیسے
پھر سڑک کے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی چلی گئیں، باہر سڑک پر
بھی دو چار نشے میں مدہوش آدمی شور مچاتے ہوئے لڑکھڑاتے
چلے جا رہے تھے۔ اور جب گرجا گھر کے بڑے گھنٹے نے
دو بجائے تو مجھے اندازہ ہوا کہ رات اتنی گذر چکی ہے، ماتھل
وکٹوریہ، مارگریٹ یا جوزفین کا اب بھی کوئی پتہ نہ تھا، ان
میں سے کوئی بھی مجھ کو دکھائی نہ دیتا تھا، سڑکوں پر سناٹا کافی
... ہو چلی شروع ہوگئی تھی۔ "الیٹ" کا ہنگامہ بھی دھیما پڑتا
جا رہا تھا، اور ہوا کے چلنے کی وجہ سے سڑکوں کے کناروں پہ
لگی ہوئی جھنڈیوں کی سرسراہٹ مجھ کو صاف سنائی دے
رہی تھی!! —

دوسرے دن ماتھل مجھ کو کانٹ پلیس میں پھر ملا، وہ
چہرے سے پریشان اور متفکر نظر آ رہا تھا، اس کے گھونگھر والے
بالوں کی لٹیں اب اس کے ماتھے اور کانوں پر جھول رہی تھیں،
مگر اس کی آنکھوں میں اب جنون کی سی سرخی کے بجائے ایک
طرح کی سی ڈھلک آ گئی تھی۔

— "میں نے ٹھیک کہا تھا کل! — آخری فتح نہیں تھی، یہ تو
محض ایک ہنگامی اور وقتی احساس تھا جس نے ہم میں سے
بہت لوگوں کو پاگل کر ڈالا تھا، جرمنی یا جاپان یا اٹلی کے
ہار جانے سے فتح نہیں مل سکتی، جرمنی کے ہار جانے پر تو ہم
اور بھی پاگل ہو جاتے ہیں اور ہمارے ذہن، جسم اور دماغ
سب جیسے ہار جاتے ہیں! — اسی دکھ کی وجہ سے
تو وکٹوریہ، جوزفین اور مارگریٹ کو ہوسٹل سے نکال دیا
جانا ہے! — اور وکٹوریہ تو غائب ہی ہو چکی ہے، اس کو
آخری دفعہ مارگریٹ نے دیکھا تھا، اس وقت اس کی آنکھیں
میں مدہوشی سی ہی اس کو اپنے سے بالکل چپٹائے کھینچے ...
ماتھل کی آنکھوں کی نمی اب چمکتے ہوئے آنسوؤں میں تبدیل ہو ...
اور میں سوچنے لگا کہ آخر جرمنی کے ہار جانے پر وکٹوریہ بالکل پاگل
کیوں ہو گئی تھی، اس کا ذہن کیوں مفلوج ہو گیا تھا — اور ماتھل کہہ ...
— "اب میں پھر واپس جنگ پر جا رہا ہوں۔ اب کے مشرق میں
لیکن اب کے میں اپنے ماتحت سپاہیوں کو ان تقریروں سے ...
نہ دلایا کروں گا جس کی وجہ سے وہ اپنی جانیں اس قدر آسانی سے
دیتے تھے! — اب تو میں اپنے لئے لڑنے جا رہا ہوں، وکٹوریہ کیلئے ...
جا رہا ہوں! جاپانی فسطائیت کے بجائے انسانیت سے لڑنے جا ...
ہوں، مجھے معلوم ہے کہ اگر جرمنی جیت جاتا تو وہاں بھی ایسے ہی ...
مچتے اور وہاں کے انسان بھی خود کو انسان ہی سمجھتے! — وہاں بھی ...
"الیٹ" میں اودھم مچایا جاتا اور وہاں بھی ایک چھوڑ وکٹوریہ جیسی کئی ...
اپنے جسموں کو بچانے سے قاصر رہتیں، وہ لوگ بھی اتنے ہی انسا ...
ہوتے جتنے کہ کل رات تھے، اور اگر جاپان مشرقی جنگ جیت لے تو ...
کے لوگ بھی خود کو اسقدر انسان سمجھیں گے، تو میں جاپان کے فسطائیوں
سے نہیں، انسانوں سے لڑنے جا رہا ہوں، وہ انسان جو جنگ کے ...
امن حاصل کرنا چاہتے ہیں! — اور اب کی بار میں وکٹری ڈے کی ...
میں "الیٹ" میں جشن اور سوڈا پینے کیلئے واپس نہ آؤں گا۔ یہی اپنی آ ...
کے سامنے کسی وکٹوریہ کو تباہ ہوتے دیکھوں گا — اچھا تو —!
اور اس کے گلے میں بھی جیسے آنسو ابل آئے اور تھوڑی دیر بعد وہ میری ...
سے اوجھل ہو گیا! — اور مجھ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ کانٹ پلیس آج
بہت اسقدر سنسان تھا، جھنڈیاں ٹوٹ کے سڑکوں کے کناروں پر
ہوئی پتوں کی طرح پڑی چیخ رہی تھیں، امریکن سپاہیوں کی بیرکس بھی خالی
تھیں لیکن بیرکس کے لان پر اب بھی دو فلڈ لائٹس روشن تھیں جن کی شہد
جیسی ہوئی شعاعوں میں گھرا ہوا امریکن لکیر دار جھنڈا اکیلا سر جھکائے ...
کھڑا تھا اور کانٹ پلیس کے لان پر اُگے ہوئے درختوں پر اب بھی کہیں کہیں
نیلے سبز، سرخ اور لاتعداد رنگوں کے چھوٹے بڑے قمقموں کی
کی قطاریں ہوا سے آہستہ آہستہ لرز رہی تھیں — لیکن رنگ ...
چھوٹی بڑی شعاعوں کی یہ قطاریں خاموش سی تھیں، جیسے
یونہی خاموشی سے لرزتے لرزتے سو گئی ہوں —!!

تقدیر کا لکھا

ملا منک دہلوی

میاں امیرو ہمارے شہر کے اچھے کاریگر نوربافوں میں تھے ہر وضع کا کپڑا بن سکتے تھے، مگر تھے تقدیر کے ہیٹے۔ انہوں نے کبھی تنگدستی سے پریشان ہو کر کبھی بیوی کے اصرار سے کئی دفعہ کارگہ چھوڑ چھوڑ کر اور اور روزگار بھی کئے مگر کچھ نہ ہوا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ اپنے کارگہ پر بیٹھے کام کر رہے تھے، عصر کا وقت ہو گیا تھا، بیوی اسیلانی سی چھوڑا پھرتی پھراتی آئیں تو میاں امیرو نے کام پر سے نگاہ اٹھا کر کہا:-

میاں امیرو:- ارے بی نیک بخت آ بھی گئیں، شام ہی کر دی، کچھ پکانے رندھنے کا بھی فکر ہے۔

بیوی:- اے ہے یہ تو روز کا دھندا ہے اور پھر کون سا ایسا من دو من کا پکانا ہے؟ صبح کی دال رکھی ہے۔ ذرا سا پانی ڈال کر تازہ کر لوں گی۔ آدھ سیر آٹے کا پکانا ہی کیا؟ لحظہ بھر میں پک جائے گا۔

میاں امیرو:- کچھ بھی سہی مگر کب کی گئی ہو۔ اب بھی کیا ہے کہ نہ شدہ بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی۔

بیوی:- توبہ ہے تم بھی پھرے کو ٹوکا کرتے ہو۔ میرا دم اسی سے ہے۔ چار گھر پھر کر دنیا دیکھ لیتی ہوں اور پھر یہ کتنی بڑی بات ہے کہ پرائے گھروں میں پان زردہ کھا لیتی ہوں، دو پیسے تمہارے بچ ہی جاتے ہیں۔ گھر میں بیٹھوں گی تو اپنا ہی کھاؤں گی۔

میاں امیرو:- اوہو تو اللہ کی بندی ہم تمہارے دو پیسے کے پان کے لائق بھی نہ رہے؟ نہ سہی ریل پیل اللہ دے ہی رہا ہے جو کچھ تقدیر میں ہے وہ مل ہی جائے گا۔

بیوی:- ہاں (ٹھنڈا سانس بھر کر) اللہ دے ہی رہا ہے۔ دوسرے گھروں میں دیکھو اللہ کیا دے رہا ہے۔ میں تو اس گھر میں جب سے آئی میرے نام کا تار بھی نہ بنا۔ اللہ بخشے ابا کو (رونے کی آواز ہے) جس طرح انہوں نے پالا پوسا۔ چاؤ چونچلے کئے

میاں امیرو:- ارے بی تو ہماری تمہاری عمر اب چاؤ چونچلوں کی ہے؟ وہی کہاوت ہے کہ بوڑھے منہ مہاسے لوگ چلے تماشے۔

بیوی:- لے نہ سہی چاؤ چونچلے تو کم بخت اور کوئی دھندا ہی نہیں؟ میں صبح شام ٹیکر ٹسینکا کروں، اور تم سٹ نلی سٹ تارا اللہ کر کے بیڑا پار کیا کرو۔

میاں امیرو:- تو تقدیر میں تو سٹ نلی سٹ تارا ہی لکھا ہے۔ اور دھند کب چلے گا۔ کیا میں اپنی تقدیر بھی پلٹ دوں؟

بیوی:- لے ہے رہنے دو بس۔ دنیا کر ہی رہی ہے کیا ہم ہی کم بخت تقدیر کے ہاتھ گردی ہو گئے۔ لو ابھی دیکھتی چلی آ رہی پڑوس میں حبیب کنجڑا رہتا ہے، دوکان میں گھاٹا آنے لگا۔ دکان چھوڑ جھٹ مہتروں کا جمعدار ہو گیا۔

میاں امیرو:- تو پھر کیا ہوا؟

بیوی:- ہوتا کیا تقدیر بدل ہی گئی، مہینے پر بھر مٹھی روپیہ لاتا ہے کھنا کھن اور کچھ نہیں تو دو بیسی اور دس تو کہیں گئے نہیں جھوٹ الگ۔

امیرو۔ اے بی بس رہنے دو۔ جمعدار کی تنخواہ جسے معلوم نہ ہو اُس سے کہو۔ زیادہ سے زیادہ بیس، حد پچیس روپے مہینہ ہوگی تو ہم کیا اس سے گھاٹے میں ہیں؟ روپے دو روپے کی مزدوری کم ہے

بیوی۔ اہا ہا بڑے آئے حساب داں اُس کے نیچے پچیس مہتر ہیں پچیس۔ ایک روپیہ مہینہ فی مہتر کی اُگائی کدھر جائے گی؟ اور پھر اوپر کی آمدنی الگ رہی۔

امیرو۔ تو کیا وہ مہتروں سے کماتا ہے؟

بیوی:- اور کیا نہیں بھی۔

امیرو۔ لاحول ولا قوۃ، توبہ توبہ مہتر ہمارا کمائیں ہم مہتروں سے۔ سلام ہے ایسی آمدنی کو۔

بیوی۔ بس یہی تو بات ہے۔ اور پھر جمعداری نہ سہی اور کیا دھندے مٹ گئے۔ سیکڑوں کام ہیں۔

امیرو:- ہاں یہ بات کہو تو مانوں۔ مگر..

بیوی:- اگر مگر کیا۔ ہمت کرو۔ کرنے والے بنو تو میں بتاؤں۔ زیادہ لمبا چوڑا دھندا نہیں ہے۔ کر کے دیکھو۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

امیرو - اور یہ اپنا کام۔ اس کا کیا ہوگا؟

بیوی:- اے ہے تم تو لو۔ یہ کام پیاروں پیٹا بہت جیتا ہے

اس کو کون چھینتا ہے؟ وہ تو دو گھڑی دن سے شام تک کا ہے۔ دن بھر یہ کرو اس کے بعد وہ کام کرو۔ کہیں آنا نہ جانا آرام سے بیٹھے رہو۔

امیرو:۔ خدا تمہارا بھلا کرے، تو ایسے کام سے مجھے کیا انکار ہے (بہت محبت بھری آواز میں) بتاؤ میری پیاری نصیبو بتاؤ۔

بیوی:۔ اے بس لہنے دو یہ موئے ستی ما داوں کی سی باتیں۔ چپکے بیٹھ کر سنو۔ بڈھا چاؤ اچھا نہیں لگتا۔

امیرو:۔ اچھا سناؤ صاحب سناؤ۔ حفامت ہو

بیوی:۔ دیکھو کل شب برات کا چاند ہونے والا ہے۔ گلی کے نکڑ پر ایک چھوٹی سی آتشبازی کی دکان لگاؤ۔ خدا نے چاہا تو ان چھوٹ پندرہ دن کے اندر ہی اندر ایک کے دو جائیں گے اور کچھ نہیں تو اپنا تہوار تو تہوار ہو ہی جائے گا۔

امیرو:۔ مگر بیوی میں تو کچھ جانتا ہیں کہ کیا سامان لانا ہو گا۔ ہاں۔ پڑھنا لکھو چنا۔ حساب کتاب کر سکتا ہوں۔ اور ہاں وہ بات یہ ہے کہ ۔ روپیہ کہاں سے آئیگا روپیہ۔

بیوی:۔ ہوں ہوں (آہستہ ہنسی ہنس کر) میں ابھی کچی باتیں نہیں جانتی۔ اب تم سے کیا پردہ ہے۔ آخر عورت ذات ہوں۔ سب طرح کی فکر ہے، پانچ سات روپے وقت بے وقت کو ٹال رکھے ہیں۔ میرا چھوٹا بھائی (دروازہ پر دستک) کون ہے؟

آواز:۔ باجی میں ہوں انور۔ ....

بیوی:۔ اللہ رکھے کتنی بڑی عمر ہے۔ لو ابھی ذکر ہی ہو رہا تھا۔ جاؤ میاں جم جم آؤ نت نت آؤ۔ اچھے شگون لے آئے۔

انور کے آتے ہی آتشبازی کی دکان کا معاملہ طے ہو گیا۔ وہ ہر سال آتشبازی کا کام کرتا ہی تھا۔ اس لئے میاں کی یہ مدد کی پانچ روپے دے کر دس کی آتشبازی دی۔ اب میاں امیرو دو گھڑی دن رہے سے دکان لگانے لگے۔ ہوں ہے اپنی دکان پر چکر۔ چھچھوندر۔ پھلجھڑی۔ پٹاخے، مہتابی۔ انار۔ ہوائیاں۔ جھائیں جھوئیں۔ خدنگے لا کر رکھے۔ لہک لہک کر آواز لگانی شروع کی۔ بچے آتے خرید خرید کر لے جاتے۔ دو تین روز تو دکان خوب چلی۔ ایک دن ایک لڑکے نے دو پیسے کے چار چکر خریدے، اور وہیں پاس پر چھوڑنے لگا۔ ایک چکر اڑ کر آتشبازی کی دکان میں آ پڑا۔ پھر کیا تھا، فسوں شاں پھٹ پھٹ دائیں بائیں اور میاں امیرو کے ہاتھ سے بیڑی چھوٹ پٹاخوں میں گری، توبہ توبہ لحظہ بھر میں ساری دکان جل جلا کر ختم۔ بڑی خیریت ہوئی کہ میاں امیرو کی جان بچ گئی۔ ہانپتے کانپتے گھر پہنچے بیوی روتی پکارتی تھیں۔ دیکھ کر بولیں۔

بیوی:۔ اے آج ایسی بھوک لگی کہ سویرے سے چلے آئے۔ اور دکان پر کس کو چھوڑا؟

امیرو:۔ دکان ... وہ تو ... وہ تو ... ختم ہو گئی۔

بیوی:۔ سچ بتاؤ کیا بک گیا سب مال۔ اے خدا تیرے صدقے کتنا ملا۔ لاؤ دیکھیں؟

امیرو:۔ ملا کیا خاک! اللہ کی بندی آگ لگ گئی، سب جل جلا کر رہ گئی۔ جان ہی بچ گئی تو غنیمت ہے۔ ایک لڑکے کے ہاتھ سے چکر چھوٹ کر گر گیا۔

بیوی:۔ ہائے اللہ کیا ہوا روزے بخشوانے گئے نماز گلے بندھی۔ گرہ کے تو پانچ گئے ہی تھے، پانچ اور دینے پڑ گئے۔

امیرو:۔ تقدیر کا لکھا پورا۔ اور کیا ہوتا۔

آتشبازی کی دکان پھونک پھانک اور پانچ روپے کا ڈنڈ گرہ سے بھر میاں امیرو پھر کا رگہ پر آن بیٹھے اور ہڈیاں پیل پیل کر پیٹ پالتے رہے۔ کچھ دن اسی طرح گذرے۔ بیوی کو پھر کرُ بیدی لگی۔ اب کی دفعہ بار بار تقاضہ تھا کہ سوداگری کرو۔ ایک دفعہ بیوی کسی تقریب میں میکے گئیں، وہاں اُن کے بھائی انور پردیس سے کمائی کر کے لوٹے تھے، اسی خوشی میں دعوت تھی۔ وہاں سے لوٹیں تو ڈولی سے اترتے ہی میاں کی ٹانگ لی۔

بیوی:۔ لو دیکھا تم نے ماشا اللہ انور اور سخاوت دونوں بھائی پردیس سے کمائی کر لائے۔ تم بیٹھے ہی رہے۔ لاکھ کہا کہ تم بھی چلے جاؤ، نہ جانا تھا نہ گئے۔ تقدیر کو لئے بیٹھے رہے۔

امیرو:۔ اے بی نیک بخت جتنا رزق ہماری تقدیر میں ہے اتنا ہی ملے گا۔ کوئی اپنا رزق کا پیالہ بھی بڑھا سکتا ہے۔

بیوی:۔ اے ہٹو بھی، تم کو تو یہی الٹی سیدھی منطق آتی ہے۔ جب رزق کا پیالہ سکڑ سکتا ہے تو بڑھ کیوں نہیں سکتا۔ تم کو خبر نہیں کہ انور اور سخاوت نے پچھلے سال دکان میں کتنا گھاٹا اٹھایا کیسی کیسی سختیاں اور دقت اُن پر پڑے، فاقہ پہ فاقہ ہوئے جب تو انکے رزق کا پیالہ سکڑتا گیا، اب خدا نے دن پھیرے

[illegible] کھائیں دوسرے کو بھی کھلائیں۔ آخر وہی رزق کا پیالہ تھا [illegible] یا نہیں۔

[illegible] تمہارے کہنے سے کب باہر ہوں۔ جو بتاؤ وہ کروں۔ [illegible] آزماؤں۔ رزق کے پیالے کو بڑھا کر دیکھوں۔ ایک [illegible] کا پھر آہی۔

بیوی:۔ لے بھئی میں کہتی ہوں کہ ہر کام میں تقدیر کو کیوں گھسیڑتے ہو۔ کچھ ہاتھ پاؤں نہ ہلاؤ، جتن نہ کرو، تقدیر کو پیٹتے رہو۔ کل سے اپنا دھندا بھی چھوڑ دو، دیکھوں تو سہی تمہاری تقدیر کیا دیتی ہے (غصّہ کی آواز میں) بڑے آئے تقدیر والے۔

امیرو:۔ نیک بخت کچھ بتاؤ بھی، یا یوں ہی خفا ہوتی ہو۔

بیوی:۔ دیکھو تمہارے ہی محلے میں کلّو بیچارہ رہتا ہے۔ ذرا اسکے رہن سہن کو دیکھو۔ دو بچے ایک بیوی ایک آپ، چار لوگوں کا خرچ، ماشاءاللہ گھر میں رونق ہے۔

امیرو:۔ تو پھر میں کیا کروں ؟

بیوی:۔ وہ آس پاس گاؤں میں پینٹھ کی پیٹ تھوڑا بہت مال لے کر جایا کرتا ہے، اُسکے ساتھ شریک ہو جاؤ۔

امیرو:۔ تو میں کیا مال لے جاؤں . . . ہاں یاد آیا تھوڑا بہت کپڑا لیجاؤں۔

بیوی:۔ ہاں اسی سے شروع کرو، اللہ اسی میں برکت دے گا، ہاتھ پاؤں تو چلاؤ۔

امیرو:۔ اچھا تو پھر میں کلّو سے بات کروں گا۔

میاں امیرو کلّو کے شریک ہو گئے، بیوی کے ہاتھ کے کڑے گروی رکھ موٹا جھوٹا کپڑا خریدا۔ کلّو نے روپیہ قرض لیا اور ایک دن اچھا سا دیکھ کر چل کھڑے ہوئے۔ میاں امیرو آج تک گھر سے میل بھر باہر نہ نکلے تھے۔ اب چلنا پڑا زیادہ، بیچارے مارے شرم کے کشاں کشاں چلتے رہے۔ تھوڑی دور چل کر دریا کے کنارے پہنچے، اس وقت وہاں کشتی نہ تھی کلّو نے کہا۔

کلّو:۔ شیخ جی ذرا بیٹھ کر سستا لو، کشتی آئے تو پار چلیں۔

امیرو:۔ ارے بھائی کشتی میں تو بہت پیسے لگیں گے۔ پانی ہی [illegible] ہے۔ لاؤ پار اتر چلیں۔

کلّو:۔ شیخ جی پانی ڈھباؤ ہے۔ یہ دریا ہے، کوئی نالہ تھوڑی ہے۔

امیرو:۔ ارے بھائی ڈھباؤ کی بھی ایک ہی کہی۔ آخر تھوڑا بہت میں [illegible] لاؤ لکڑی، ابھی حساب لگاتا ہوں۔ لحظ بھر میں پانی کی گہرائی نکال دوں گا۔ میاں امیرو نے کنارے کے پاس پاس دو چار جگہ لکڑی سے پانی ناپا، کچھ زمین پر ہندسے لکھے اور فوراً ترلاق سے بولے:۔

امیرو:۔ دیکھا میاں کلّو تم نے ہمارا علم؟ دریا بھر کا پانی ناپ لیا لو چلو خچر کو آگے رکھو۔ پانی کمر کے برابر ہے۔ پھر کیا مشکل ہے کوئی فکر نہیں۔

کلّو لاکھ منع کرتا رہا، میاں امیرو ضد کر کے پانی کے اندر ہو گئے۔ آگے آگے خچر اس کے بعد میاں امیرو پھر کلّو۔ تھوڑی ہی دُور چلے ہونگے پانی ڈھباؤ آنے لگا۔ کلّو لاکھ چیختا رہا امیرو بڑھتے ہی گئے آخر ڈھباؤ پانی میں پہنچنا تھا کہ پاؤں اُکھڑ گئے۔ تیرنا جانتے نہ تھے، لگے ڈبکیاں کھانے۔ کلّو نے گھبرا کر سنبھالا۔ اُدھر خچر نے پانی زیادہ دیکھ کر تیرنا شروع کیا۔ تیرنے میں تنگ ڈھیلا ہوا اور سارا بوجھ اور بھار کس پانی کی نذر ہوا۔ خچر پانی سے گھبرا کر کنارے لوٹا، اور باہر آتے ہی ہوک دُم گھر کی طرف۔

اِدھر میاں امیرو بے ہوش ہو گئے تھے۔ اُن کو کنارے پر لٹا کر کلّو خچر کی تلاش میں چلا۔ تھوڑی دیر کے بعد میاں امیرو کو ہوش آیا۔ دیکھیں تو کلّو اور خچر دونوں غائب، بھیگے بھاگے اُٹھتے بیٹھتے، ہانپتے کانپتے گھر پہنچے اور جاتے ہی بیوی پر برس پڑے۔

امیرو:۔ چلو اب تو خوش ہو گئیں۔ اچھے سے ساجھا کرایا، مجھے پر چھوڑ مال لے سیدھا ہوا اب ٹاپا کرو۔ اور ہمیں کا ڈنڈ پڑا۔ ہائے تقدیر۔

بیوی:۔ لے ہوش کی دوا کرو۔ کلّو کوئی بے ایمان چور اُچکا نہیں ہے تم تو نرے سیخ چلّی ہو۔ جبر نہیں کیا گزرے۔ تمہاری تو وہی کہاوت ہے کہ آنکھوں کے آگے ناک، سوجھے کیا خاک ہر کام میں تقدیر منہ کے سامنے ہے اور بس۔

میاں بیوی میں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کلّو دُہائی مچاتا آیا، اور سارا قصّہ سُنایا۔ بیوی مال کے نقصان کا حال سُنکر سنّاٹے میں آگئیں۔ بک دھک رہ گئیں۔

بیوی:۔ اچھا بھائی کلّو خدا تیرا بھلا کرے تو نے جان بچائی اب [illegible]

امیرو:۔ اور بھائی کلّو وہ ہمارا مال کدھر گیا۔ اللہ کا شکر ہے تم آ گئے۔

کلّو۔ شیخ جی سُنتے جا رہے ہو کہ حجر کی کرپرسے لادی پھسل کر دریا میں ڈوب گئی۔

امیرو۔ دریا میں ڈوب گئی لادی کی لادی۔ ارے میاں بندۂ خدا ہوش کی دوا کرو۔ سوت بھی کہیں پانی میں ڈوبتا ہے۔ اور ڈوبنا کیسا آخر میرا حساب کدھر گیا۔

کلّو۔ شیخ جی تمہیں سب کی خبر بھی ہے۔ اس میں مٹی کے تیل کا کنستر اور تمام بساط خانہ کا سامان میرا بھی تو تھا پھر کیوں ڈوبتا میرا تو کم سے چوگنا مال گیا شیخ جی۔ دریا میں ہاتھی ڈوب جاتے ہیں۔ کیسا حساب کس کا کچھ۔

امیرو۔ تو یوں کہو بھائی کہ تمہارے مال نے میرا بھی سامان ڈبویا۔ اپنے ڈبویا تو ڈبویا میرا بھی گنوا دیا۔ وہی کہاوت ہے کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

کلّو۔ شیخ جی بھلائی کا زمانہ نہیں ہے میں منع کر رہا مگر تم نے نہیں مانا زبردستی پانی میں اتر پڑے یہ سب تمہارے ہی کرتوت ہیں۔ مال کو بچاتا تو تم چلے تھے۔

امیرو۔ بھائی کلّو حق ناحق کی بات مت کرو۔ یہ حساب کا معاملہ ہے۔ میں نے دس دفعہ جانچ لیا۔ اس میں کسی کے باپ کا اجارہ نہیں۔ وہی کہاوت ہے کہ حسب میرا حق کا تو مال ہمارا ڈوبا کیوں میرا نام لیتے ہو یہ نہیں کہتے کہ ہماری تمہاری تقدیروں کا لکھا پورا ہے۔ لکھا پورا۔

بوی۔ بس تم سے ہونا ہی کیا تھا سوائے اسکے وہی تقدیر کا دکھڑا رونے لگے۔ آخر تمہاری تقدیر کم بخت میں سدا نقصان ہی نقصان لکھا ہے۔ کبھی فائدہ نہیں ہوتا؟

امیرو۔ ہوتا کیوں نہیں۔ آنے دو چلتی کا سماں پھر دکھادوں گا جنم سے تو۔ کام ہوتا آیا ہے تم کرا زبردستی دوسرے دوسروں کا کام۔ دنیا سے کیونکر چلے؟ جس کا کام اُسی کو ساجے۔

بوی۔ ہاں اور ہونا بھی کیا تھا۔ وہی کہاوت ہے کہ فعل بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر۔ تم کیا کر دگے۔ تم سے کیا ہوگا؟ تقدیر کے بیمار آج کو میں مرد ہوتی تو کر دکھاتی۔

امیرو۔ چھوڑ بی بی چولہے دربھلا۔ میں بھلا اور میرا گھر۔ الّٰلہ الّٰلہ خیر صلّا۔

آنسو

آج پھر میں نے تمنّاؤں کا اک جال بُنا
آج پھر میں نے ستاروں سے شرارے لے کر
اپنی اُمید کے ساحل پہ جلائی قندیل ــــ
جس پہ گھبرا کے اُمڈنے لگے پروانے کئی
سوز میں ڈوبے تڑپتے ہوئے افسانے کئی
قلزمِ زیست کے بے نور سفینوں کی طرح

آج پھر رات کے رخشندہ و تابندہ نجوم۔
موج در موج تڑپتے ہوئے ٹکراتے ہوئے
روندتے روندتے شب بھر کے حسیں خوابوں کو
میری بے نور نگاہوں سے چھلک اُٹھے ہیں
چُپکے چُپکے رُخِ ہستی پہ چمک اُٹھے ہیں

آج پھر موت دُھندلکوں سے اُبھر آئی ہے
موت بُجھتی ہوئی تقدیر کا اک سیلِ رواں
موت بھٹکے ہوئے تاروں کی گذرگاہِ جمیل
میرے ٹوٹے ہوئے اشکوں کا سہارا لے کر
جانے کس روزنِ ساحل سے چھلک آئی ہے!

نصرت آرا نصرت

"شکستِ پندار"

ہر روز کشمیری گیٹ سے چاندنی چوک جاتے ہوئے مجھے کاٹھ کے پل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ہر روز مجھے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں انسانیت تہذیب کے ہاتھوں دم گھٹ کر مر جانے والی تو نہیں۔ اور عورت جسے ہم دیوی اور جگت ماتا کہتے ہیں کیا واقعی اس عزت کی مستحق ہے۔ اور اگر ہے تو یہ ادھیڑ عمر کی برہنہ بھکارن جو سیڑھیوں پہ بیٹھی ہی اپنے گرد اور دھول سے اٹے ہوئے جسم کی برہنگی کا مظاہرہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ کیا سچ مچ اُسی جنس سے تعلق رکھتی ہے۔ جو چاندنی چوک اور کناٹ پلیس میں قیمتی ساڑھیاں پہنے چہکتی گزر جاتی ہیں۔ اور جن کے ایک بار قریب سے گزر جانے پر دل دیر تک دھڑکتا رہتا ہے۔ جیسے کوئی گھڑیال بڑے دردی سے ضرب لگا کر آگے چل دیا ہو۔ میں حُسن کی برق افگنی کا قائل ہوں۔ لیکن بدصورتی اس قدر جان لیوا ہو سکتی ہے، اس کا مجھے احساس نہ تھا لیکن اب تو یہ حالت ہے کہ اُس برہنہ بھکارن کو پل پر بیٹھا دیکھ کر کراہت سے میرا دل تلملا اٹھتا ہے، اور میں مُنہ پھیر کر اُس کے پاس سے گزر جاتا ہوں۔ بارہا پل پر سے گزرتے ہوئے میرا جی چاہتا ہے کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس برہنہ بھکارن کے سینے میں خنجر گھونپ دوں۔ تاکہ ناپاکیزگی ایک بار اچھی طرح عریاں ہو کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اور انسانیت کی پیٹھ پر اس کی برہنگی ہر روز یوں دیوانہ وار کوڑے نہ لگائے۔ انسان ایک حُسن پرست جانور ہے۔ اس سلولس کھائے جسم میں حسن پرستی کا ایک ایک لمحہ نشت ہے۔ خوبصورتی کا شائبہ تک نہیں۔ یہ بھدا اور بدنما جسم جس کو گرد اور سیاہی سے پوت دیا گیا ہے اور جس پر اُس کے ہونٹوں سے بہتی ہوتی رال ہر لمحہ ایک نئی گزرگاہ بناتی ہے۔ کسی پہلو سے بھی حسین نہیں کہلا سکتا۔

وہ ہر روز وہیں بیٹھی نظر آتی ہے۔ گرمی میں سردی میں۔ بارش میں۔ آندھی میں۔ برہنہ بالکل برہنہ۔ اور اُس کی برہنگی ہر راہ رو کے مُنہ پر تھپڑ مارتی ہے کہ چلنے والے دیکھ، میری ہی ایک بہن کو تو ماں کہہ کر پکارتا ہے۔ مجھے اسی راستے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور یہ مجسمۂ برہنگی وہیں ٹانگیں پھیلائے [illegible] ہوتی ہے۔

اُس کا تصور بعض دفعہ ایسی جگہ دماغ سے آٹکراتا ہے۔ کہ جی متلانے لگتا ہے۔ اور اُبکائیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔

چاندنی چوک کی ایک دکان میں میں ایک روز قلفی کھا رہا تھا۔ ایک شیریں ادا پنجابی لڑکی ایک نوجوان کے ہمراہ مستانہ روی سے داخل ہوئی۔ اور میری تپائی کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اُس نے ہلکے سبز رنگ کا پرنٹڈ سوٹ پہن رکھا تھا، اور شانوں پہ اسی رنگ کا دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔ اس سوٹ میں اس کا سرخ و سپید جسم جیسے سبزہ کو آگ لگ رہی ہو۔

مٹھاس باتیں کرتے کرتے وہ شعلہ رُو کھلکھلائی۔ اور میں نے ایک بھرپور نگاہ اُس کے چہرے پر ڈالی، وہ ہنس رہی تھی۔ اور اس کے موتیوں سے شفاف دانتوں کی لڑیاں بجلی کے قمقموں کی طرح روشنی میں جگمگا رہی تھیں اور پھر ایکا ایکی ہنستے ہنستے اُس کے ہونٹوں سے ایک رال ٹپکی اور اس کے دوپٹے میں جذب ہو گئی۔ نہ جانے کیسے میرے تصور نے اُس بھکارن کو میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، اور اب پہلی ہی اُبکائی کے ساتھ تڑپ کر باہر آ پڑے گا۔ میں جلدی سے وہاں سے اٹھا۔ اور دام ادا کر کے باہر نکل آیا لیکن اب اُس لڑکی کے بجائے میرے دماغ پر وہ بھکارن سوار تھی۔

گذشتہ چند دنوں سے میں پل کی سیڑھیوں پر دو برقعہ پوش عورتوں کو بھی دائیں بائیں بیٹھے دیکھ رہا ہوں۔ جن کے ہاتھوں میں ایک ایک گتے کا بڑا سا ٹکڑا ہے۔ جس پر غربت کی علیحدہ علیحدہ داستان تحریر ہے۔ آنے جانے والے ان گتوں پر حسبِ توفیق کچھ پیسے رکھ جاتے ہیں، اور وہ اللہ کی بندیاں چہرہ ڈھانپے مُنہ سے کچھ کہے بغیر پیسے بٹورتی رہتی ہیں۔ بارہا مجھے خیال آتا ہے کہ کاش کوئی اُس برہنہ بھکارن کو بھی برقعہ پہنا سکے۔ لیکن شاید اُسے برقعہ پہنانا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ ایک بار اُس کی برہنگی پر ترس کھا کر کسی نے اُس پر چادر ڈالی تھی، تو وہ چادر دوسرے ہی دن غائب تھی۔ شاید اُس کی برہنگی کسی پیراہن کی محتاج نہ تھی۔

اوڈین پر تانگے سے اُترتے ہوئے میں نے چاروں طرف دیکھا۔
ایک جانب وہی پنجابی لڑکی کھڑی تھی۔ آج اُس نے ہلکے سبز رنگ کے بجائے سرخی مائل لاکھی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ابھی میں حیران ہی تھا کہ اس قدر خطرناک حُسن کو یوں تیر و تفنگ سے آراستہ ہو کر سر بازار قتلِ عام کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ معاً مجھے اُس کے ہونٹوں سے رال کا بہنا یاد آگیا۔ اور پھر وہ برہنہ سکارن میرے تصور میں میخیں گاڑنے لگی۔ اور میں سوچنے لگا کہ اس جسم کیلئے اس قدر زیبائش [illegible] کیا ضرورت ہے۔ یہی تو وہ جسم ہے جو کاٹھ کے پُل پر برہنہ پڑا ہے اور اُس پر کوئی تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اور میں نے بیقرار ہو کر ایک جانب تھوک دیا۔
کیا انسانیت کا عروج ہی اس کا زوال ہے؟ مجھے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں انسانیت تہذیب کے ہاتھوں دم گھٹ کر مر جانے والی تو نہیں؟

کلامِ ظریف

روز سر ہونے سے خاص و عام کے
چل پڑے احکام پر اسلام کے
ہائے جورو نے نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اپنے شوہر سے نہ اُلجھا کرو بس جانے دو
وہ فلک سیر جو کھاتے ہیں انہیں کھانے دو
تم بھی انگور کی بیٹی سے بڑھالو پینگیں
خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

تھے کبھی ہم بھی تناور اب تو ہیں مثلِ ارنڈ
بھر گئے ہیں زخم دل کے آگیا اُن پر کھرنڈ
کھیلتے رہتے ہیں روز و شب لنگوٹی ہی میں پھاگ
پیلا کرتے ہیں سدا املی کے پتّے ہی پہ ڈنڈ

اپنی صلاح جیب میں اپنی گھسیڑ تو
چھتّے کو یوں بھڑوں کے نہ زنہار چھیڑ تو
کیوں دوسروں کی بات میں اپنی اڑائے ٹانگ
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ظریف دہلوی

صدیقہ بیگم

"تاش کا گھر"

میں نے جب اس گھر میں آنکھ کھولی۔ ماں باپ، بھائی بہن، سب ہی موجود تھے، جو اپنی زندگیاں کسی نہ کسی طرح سسٹم پسٹم گزار رہے تھے۔ صرف جی اس لئے رہے تھے کہ مرا نہ جاتا تھا، اور میں بھی اس چھوٹے سے قافلے کے پیچھے گھسٹتی گھسٹتی کرتی ہوئی ہولی۔ میری منزل بھی وہی تھی جو دوسرے راہیوں کی ——— بچپن ہی میں بچپن کی لطافتوں، راحتوں، اور سب سے زیادہ بے فکری سے محروم رہی، جو بچپن کی امتیازی شان ہے، جو بچپن کو ہر زندگی سے بلند رکھتی ہے۔ میرے بچپن نے بھولے سے بھی کبھی یہ موقع نہ دیا کہ آج اوروں کی طرح یہ گاتی ——— "لے لے شباب، دے دے، پروردگار بچپن" کیا فرق پڑے گا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ بچپن گیا تو کیا گیا اور جوانی آئی تو کیا لائی ——— ایک سپاٹ زندگی جس میں کچھ بھی تو نہیں۔ اس میں کبھی بھی مدوجزر نہیں آیا۔ پانی کی یہ لہریں جو ہوا سے اٹھتی ہوئی ساحل سے ٹکراتی ہیں اُن میں بھی وہی ہم آہنگی ہوتی ہے۔ دراصل کوئی فرق نہیں اس کا ماضی اور حال ایک جیسا تھا۔ ہمیشہ ہی سے گپ چپ بیٹھے ہوئے سوچنے کی عادت ——— بے معنی باتیں۔ جو اپنی مہمل ہونے کے وجود زندگی پر اثر ڈالتی ہیں ——— اختر کی دوستی، ان کی کھوکھلی شان و شوکت جو تاش کے پتوں پر کھڑی ہے۔ ذرا اشارہ لگا اور "اڑا اڑا دھم" ——— تعلقات بھی تو دیکھو، کوئی نواب کا بیٹا ہے تو کوئی کلکٹر کا بھتیجا۔ ڈپٹی کے بچے تو بیٹھا کسی سے بات ہی نہیں کرتا۔ اور ہر دم کالج کی چھوکریوں کے قصے ——— کالج کی لڑکیاں خدا جانے یہ کچھ پڑھتی لکھتی بھی ہیں یا ہر وقت رومان ہی لڑاتی ہیں ——— اور وہ رومال والا قصہ۔ سبحان اللہ اگر کسی لڑکی کا رومال رہ گیا تھا تو کیا ہوا؟ ایسی کونسی عجب بات تھی بھول گئی ہوگی بیچاری یا اتفاقاً گر گیا ہوگا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ مگر نہیں ——— وہ نوجوان دچھوڑ گئی تھی کہ جناب اختر صاحب تشریف لائیں گے اور اٹھا لیں گے۔ اس حماقت پر بھلا کس کو ہنسی نہ آئے گی۔ کالج میں سینکڑوں لڑکے پڑھتے ہیں۔ یہی تو ایک گویا شہزادے سلیم رہ گئے ہیں جن پر ساری لڑکیاں

چھڑکی ہو رہی ہیں۔ ارے احمقو ——— اگر لڑکیاں تمہاری طرح کا دو دی ہوتیں تو آج ہر طرف "لیلائیں" ہی "لیلائیں" نظر آتیں اور پھر میاں مجنوں اپنی لیلیٰ کو بھول کر گھر کی کسی لیلیٰ کی تلاش میں بادہ پیمائی کرتے نظر آتے ———

"نکو آپا ——— ذری چائے تو بنا دے۔ پلیز کے"

"پھر وہی بدتمیزی ——— آج بنوا لے تو میں بھی دیکھوں"

"اچھا۔ نہیں نہیں۔ میری نکہت آپا، ناراض ہو گئی۔ اب سے کبھی نہیں کہوں گا، لو کان پکڑتا ہوں"

"کالج میں کیا پہونچ گیا ہے۔ بڑی باتیں بنانی آ گئی ہیں"

"مان جاؤ نا ——— میری آپا، اب نہیں کہوں گا" اختر نے خوشامد کی

"مگر چائے تو ہے ہی نہیں۔ اور ابھی ابا جان کی تنخواہ ملنے میں کئی دن ہیں۔ سات تاریخ سے ادھر تو کبھی ملتی ہی نہیں"

"چائے ختم ہو گئی۔ اچھا میں ابھی بنئے کے یہاں سے چھوٹا پیکٹ منگائے دیتا ہوں۔ دیکھو ذرا جلدی بنا دینا۔ عزت کا سوال ہے آپا ——— میری نکو آپا ——— اچھا نہیں نہیں ———"

میرے چہرے پر ایک رنگ آیا جو فوراً ہی غائب ہو گیا ہاں اگر چائے ہی پر عزت کا دارومدار ہے تو پھر کیوں نہیں ضرور رہے گی۔ میں خاموش ہو گئی۔ کہیں ابا میاں کو پتہ لگ جائے تو بچو کو معلوم ہو جائے۔ اُسی روز امی نے ذرا سی دال اُدھار منگوا لی تھی تو اُس پر کیا لے دے ہوئی۔ سارا گھر سر اُٹھا لیا تھا۔ ابا میاں کا غصہ خدا اپنی پناہ میں رکھے، جیسے آندھی اور طوفان۔ اور ہم سب جیسے پرندوں کی مانند ادھر اُدھر دبکے پھر رہے تھے۔

"میں کہتا ہوں، ابھی واپس کرو۔ کس نے کہا کہ اُدھار منگواؤ خاندانی آن پر بٹہ لگانے کے لئے اس گھر میں آئی ہو۔ باپ دادا کی عزت دھول میں ملانے کے لئے"

"عزت" ——— ہی ہی ——— کتنا سستا لفظ ہے۔ امی بے بس ہاتھ پاؤں بے جان ہو گئے۔ میں نے بمشکل ان کو اپنے بازو کا سہارا دیا۔ کھلی ہوئی خاندانی عزت۔ ایک نہ ایک روز یہ عزت امی ...

حال لے کر ہی رہے گی۔ ڈاکٹر نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ ان کو ہمیشہ
خوش رکھنے کی کوشش کرو۔ ان کے دل پر کسی بات کا اثر مت
ہونے دو۔ ورنہ زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ میرے خیالات
بہنے لگے۔

"ارے کہاں گئیں۔ نکہت آپا؟"

میں چونک پڑی۔ یہ تو شہزادی بی آگئیں یک شد دو شد۔
"آپا ـــ یہ دیکھو ہماری دوست آئی ہیں۔ ان سے ملو آپ
ہیں مس ممتاز، سلطانیہ کی طالب علم ـــ آپ مس عظیم فورتھ ایئر
اور آپ مس صائمہ فرسٹ اسٹوڈنٹ ہیں" اور ایک بلند قہقہہ
سے ہنسنے لگی جیسے کر رہی ہو میں چونک پڑی۔ بس شہزادی
کی اس عادت پر تو مجھے انتہائی کوفت ہوتی ہے۔ بغیر پوچھے
دوسرے ہر کسی سے تعارف کرا دیتی ہیں۔ ایسی روز جب اختر کے
دوست میں لڑکے بیٹھے ہوتے تھے اور میں کھڑی سن رہی تھی کہ
کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ حالانکہ کوئی نئی بات نہ تھی یہی لیلیٰ
مجنوں والے فسانے جو روز ہی تو دہرائے جاتے ہیں ــ
اور جب کہانی رومان کے موڑ پر تھی یہ شام کی دھیمی دھیمی
روشنی رات کے تاروں میں جذب ہو رہی تھی جیسے کوئی دور
بیٹھا سہاگ گا رہا ہو۔ شہزادی بی آ کر اپنے مجھے چونکا دیا۔
"دیکھو تمہاری ملاقات نئے نئے آدمیوں سے کرا دوں۔"

مجھے غصہ آیا ـــ پہلی ملاقات ہوئی روزانہ ایک ایک
جدید محترمہ چلی آ رہی ہیں۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی ایک کہرام مچا دیا لڑکوں نے
بھی کیا کہا ہوگا کہ یہ ہماری ماتیر حسن ہی ہیں
"کیا سوتے سے اٹھا دیا" میں نے دھیرے سے کہا تاکہ پاس
والے کمرے تک آواز پہونچ جائے۔

"سو رہی تھیں بائیں آنکھیں بیت بیا ہو حسن ہوتے
بھی تو بے بیاتی ہو؟"

جو میں جواب دینے کی ... ہمت ... تو ... اظہار
... ایسا چلی گئی۔ میرے سامنے شہزادی بی کے تین بڑے
(BIG-THREE) سامنے کھڑے تھے جو نہ جانے کس کے
مستقبل کا فیصلہ کرنے آئے تھے۔ میری زبان سے باوجود کوشش
کے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔

"آؤ ـــ ادھر ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔" اور شہزادی بی
ان کی رہنمائی کرتی ہوئی لیلیٰ مجنوں والے کمرے کے پاس لے گئیں
جہاں صبح سے شام تک شیشے کھنکتے ہیں، آنچل سرکتے ہیں، کلیاں
کھلتی ہیں۔ اور میں خاموش کھڑی ہو گئی جیسے کسی کے حکم کا انتظار
کر رہی ہوں۔

"کیسی کھڑی ہو، تم بھی بیٹھ جاؤ نا!" تین بڑوں میں سے
ایک نے کہا حسن کی ساری کے پلو کا سرخ آنچل اُن کے رنگ کو
اور بھی نکھار رہا تھا۔

"مجھے ذرا چائے تیار کرنی ہے۔ اختر کے دوست بیٹھے ہیں۔"

"تم بیٹھو۔ میں نوکر سے کہے دیتی ہوں وہ تیار کر دے گا۔
تمہیں کیا فکر پڑی رہتی ہے۔ مجھے تمہاری یہ عادت زہر لگتی ہے
کہ نوکروں کے ہوتے ہوئے ہر کام خود ہی کرنے کو تیار رہتی ہو، اسی
سے تو ان کی عادت بگڑتی ہے اور دن بہ دن آرام طلب ہوتے
جا رہے ہیں۔" شہزادی بولیں۔

میں خاموش رہی چلو ان کی ہی بات اونچی ہونے دو نہ سے
نوکر ہی تو جڑے ہیں جیسے آپ سچ مچ کی شہزادی ہیں۔ نہالے
کچھ ہوتیں تو شاید زمین پہ قدم نہ جمتا۔ گھر میں لے دے کر ایک
باپ دادا کی کمائی ہوئی عزت ہی تو رہ گئی ہے، سو اس کا بھی
اب اللہ ہی بیلی ہے۔

اختر نے کمرے سے آواز لگائی ـــ بڑی بی ذرا چائے
جلدی لانا اور اگر شکر ہو تو حلوا بھی ـــ"

میں دل ہی دل میں ہنسی اور پھر میرے کان برابر والے
کمرے کی طرف لگ گئے

"ہائے ـــ میاں جب سے یہ کنٹرول ہوا ہے اچھی اچھی چیزوں کو
تو ترس ہی گئی۔ بھلا اتنا راشن کارڈ پر تو شکر ملتی ہے،
اور اس میں بھی پابندی۔"

پرے گھر میں ماچ ہیں اور ماں بیٹے گئیں" میں بغیر کچھ
سوچے سمجھے باورچی خانے کی طرف ہو لی ـــ بوتلوں کے کاگ
فضا میں اچھلنے لگے، بادلوں کے ٹکڑے چاند سے سرکنے لگے،
چاند جیسا صاف ہوتا جاتا تھا دھبے اور نمایاں ہوتے جا رہے
تھے۔ مگر انسانیت کا مستقبل ـــ تاریک ـــ نہیں نہیں۔ چودھویں
کے چاند کی مانند روشن ہے

"ارے ـــ وہ اپنا نیا والا سلکن جمپر تو دکھاؤ"

"وہ تو دھوبی کے گیا ہے" میں شہزادی کی آواز سنکر

[illegible] پھر باہر والے کمرے کی آوازیں کچھ اس طرح ہنگامہ [illegible] تھیں کہ شہزادی کی سہیلیوں کی آواز فضا میں گھل رہی تھی۔ میرا خیال شہزادی کے سلکن جمپر کی جانب پھیلنے لگا۔ خدا جانے یہ کونسا جمپر ہے۔ لڑائی کے زمانہ میں کون سلک کا پہنے گا۔ [illegible] اچھوں کو تو میسر نہیں۔ یہاں تو معمولی کپڑے جڑنا بھی مشکل ہیں۔ اس شہزادی نے بھی اپنی ہمجولیوں میں کیا رعب جما رکھا ہے۔ جیسے بھیا ویسی بہن۔

میرا دماغ پراگندہ ہو رہا تھا۔ مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ چائے بنانی ہے۔ شمو کو باہر سے مٹی میں لت پت آتے دیکھ کر اچانک خیال آ گیا۔

"کہاں گیا تھا بھیا؟"

"تمبلوا کے چھات کھیل رہا تھا۔"

"دیکھ بھیا — چماروں کے ساتھ ہر وقت نہیں کھیلا کرتے۔ بُری بات ہے۔ نہیں تو بھیا ماریں گے۔ اچھا۔ جا لپک کے بھیا سے کہدے کہ ابھی چائے نہیں منگوائی۔" اور شمو تیزی سے اُچھلتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں ماضی کے سُہانے سپنوں میں کھو گئی — چند ہی سال پیشتر کا اختر — بچپن — جب زندگی حقیقتوں کو چھپا نہیں سکتی تھی۔ بچپن سچائی کا دوسرا نام ہے جس پر کوئی ملمع چڑھایا نہیں جا سکتا۔ میری آنکھیں ماضی کی آہنی دیواروں کو مسمار کرتی ہوئی — کہاں سے کہاں پہونچ گئیں — آج کے شمو کی طرح کل کا اختر۔ اُچھلتا کودتا میری نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اختر میاں کا سارا بدن اور کپڑے مٹی میں لت پت تھے اور آنکھیں لال انگارہ — جیسے ابھی رو کر آیا ہو۔ گیلی گیلی مٹی پلکوں اور بھوؤں میں سنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دو بچے اور بھی تھے۔

"بھیا تجھے کسی نے مارا ہے؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

"نہیں تو۔" اختر نے قمیص کے دامن سے آنکھیں اور ناک پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

"نا ھیں۔ مارا۔" اُسکے ساتھی نے کہا "ملوا نے تو مارا ہے۔"

"کیوں رے ملوا۔ میرے بھیا کو کیوں مارا۔" اور ملوا سہم گیا۔ اُس کے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں دروازہ کے پردے سے ہٹ کر دُور فضا میں جیسے کسی چیز کی تلاش کرنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ ایکدم ہی تو چیخ اُٹھے گا۔ اختر کی گھبراہٹ ہر لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے سامنے انسانیت کے "بڑے تین" نہیں "چھوٹے تین" نمائندے کھڑے تھے۔

"کہاں مارا۔ یہ جھوٹا ہے۔ میں تو گر گیا تھا" اور اختر ملوا کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ تب کہیں جا کر ملوا کے جان میں جان آئی۔

انسانیت کا مستقبل بہت روشن ہے اور "تین چھوٹے" گویا بڑے ہوتے ہوتے "تین بڑوں" سے بھی بڑھ گئے — جیسے چاند کا دھبا روشن ہو گیا۔ سیاہی دور ہو گئی اور اب اُس کی روشنی ہر جگہ یکساں طور پر پڑے گی۔ دوسرے لمحے اختر کا ہاتھ ملوا کے گلے میں پڑ گیا۔

"اچھا چل، بہت پیار ہو چکا۔ مُنہ ہاتھ دھو کے کھانا تو کھالے۔"

"مجھے بھوک نہیں — چل رے ملوا گلی ڈنڈا کھیلیں۔"

"کیوں بھوک نہیں۔" میں نے اس کو جاتے سے روک کر پوچھا۔

"اچھی آپا — ایک بات بتاؤں۔ بگڑو گی تو نہیں۔"

"کیا بات؟"

"امی سے تو نہیں کہو گی — دیکھو مت کہنا۔"

"اچھا اچھا نہیں کہونگی۔ مگر کچھ کہے گا بھی۔"

"ملوا کی ماں نے زبردستی تھوڑا سا دال بھات کھلا دیا" اور پھر اُس نے میری طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ "میں نے جان کر تھوڑا ہی کھایا ہے" — اس نے مُنہ بسورا۔ مجھے اس کی معصومیت پر ہنسی آ گئی۔ کس قدر بھولپن کا زمانہ ہے کہ بچپن بھی اپنی سچائی پر نادم ہے۔ میں اس بھول بھلیاں میں نہ جانے کب تک بھٹکتی کہ اختر کی گرجدار آواز سنائی دی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سینما ہال میں بیٹھی ہوئی تھی اور جیسے اچانک فلم کا "دی انڈ" ہم کو حقیقتوں کی دنیا میں لا کر پٹک دے — میں نے مڑ کر دیکھا، شمو میاں بے تحاشا چیخ رہے تھے اور اختر اسکو پیٹ رہا تھا۔

"کمبخت کہیں کا، دن بھر چماروں میں کھیلتا پھرتا — صبح سے شام تک یہی۔ صورت تو دیکھو — نالائق نہ پڑھنے کا نہ لکھنے کا۔ شرافت تو چھو تک نہیں گئی۔ جب

دیکھو چاروں کی تیم سالگرہ ہے۔ جب دیکھو ہمیشہ ساتھ۔ اماں نے زور زور سے دو تین تھپڑ پھر رسید کئے۔ منّو دہاڑ دہاڑ کر رو رہا تھا۔

"ہائے اللہ۔ مار ڈالا۔ آپا بچاؤ۔ بچاؤ" اور سارا گھر جیسے اسمیں چیخوں سے گونج اُٹھا۔ انسانیت کا مستقبل چیخ رہا تھا۔ انسانیت کا وہ چھوٹا سا ننھا چیخ رہا تھا جو ایک دن تین سڑوں سے بھی بڑا ہو سکتا ہے اور تاش کا گھر جیسے گر رہا ہو۔

نکات

نگاہ کو نگاہ رکھ کہ آنکھ ہے نگاہ سے
سمجھ نہ کھیل چاہ کو کہ زندگی ہے چاہ سے
کسی کی بزم ناز کا طواف صبح و شام کر
ہے دو قدم "حضور" اس "مقامِ آہ آہ" سے

(۲)

درِ جمال پر سجود اگر کریں نیاز سے
تو پوچھنے کو آئے کوئی اُٹھکے بزم ناز سے
کمالِ مطربی ہے یہ کہ کوچۂ حبیب میں
یم سرور بہہ رہا ہو تارِ تارِ ساز سے

(۳)

نوائے بربطِ حیات پر اثر ہے سوز سے
یہ اشکِ ناچکیدہ جگر کہ ہے سوز سے
قمر کی تابناکیاں حسین ہی سہی مگر
سحر کی شان کی قسم اثر سحر ہے سوز سے

(۴)

نگہ نگہ نہیں امیں! یہ برق یا کمند ہے
زمیں سے لیکے آسماں تک اسکی اک زقند ہے
گرفت سے تری لگام اگر ذرا کو چھٹ گئی
تو یوں سمجھ کہ جوڑ جوڑ تیرا ابند بند ہے

امین حزیں

مسعود رشید

"ہندوستانی ناچ"

ناچ نام ہے زندگی کے اظہار کا۔ جب انسان حیوانِ مطلق تھا جب انسان گانے بجانے کے اصول سے ناآشنا تھا تو وہ جسم کی مختلف متناسب حرکتوں سے اپنے خوف و غصہ، خوشی و غم کا اظہار کرتا تھا۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے سانپ تن کر، ہاتھی جھوم کر اپنے غصہ اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن جانور جانور ہی رہے اور انسان ارتقا کی منزلوں کو طے کرتا ہوا جب حیوانِ ناطق بنا تو اس کی زندگی کا اظہار بہت بلند ہو گیا۔ اتنا بلند کہ ناچ لطیف ترین فن بن گیا۔

زندگی کا اظہار شاعری کی پہلی شرط ہے۔ اس لئے بجا طور پر ہم ناچ کو جسم کی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ اور ہے بھی یہی۔ چڑیوں کو دیکھئے جُھرمٹ میں شاعری کرتی ہیں۔ مور پر پھیلا کر، ریچھ تھرک کر، بندر اُچھل کود کر شعر الاپتے ہیں لیکن انسان کی شاعری ان کی طرح رکیک نہیں بلکہ بہت بلند، لطیف اور تخیل افزا شاعری ہوتی ہے۔

ناچ انسانی جذبات کی ایسی سُتھری تاویلیں پیش کرتا ہے کہ ضخیم سے ضخیم کتابیں اس اثر سے پیش نہیں کر سکتیں۔ کم از کم ہندوستانی ناچ میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ہندوستان اگر اس کی طرف متوجہ ہو تو ہندوستانی ناچ بھی روسی ناچ کی طرح دُنیا میں ایک امتیازی درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

ہندوستانی ناچ تغزل کی جان ہوتا ہے۔ اسکے تغزل میں عریانی، عریانی میں پردہ ہوتا ہے۔ اس کے صوری حسن دل و دماغ کو جمالیاتی تسکین پہنچاتا ہے۔

ناچ مختلف ملکوں میں مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن اختلاف بنیادی نہیں ہوتا محض ماحول اسے پیدا کر دیتا ہے جیسے زمانہ ایک نیا روپ، فنکار ایک نیا رنگ اور نقاد ایک نیا نام دیتا ہے اور اس طرح آپس کا میل مٹ جاتا ہے۔ مثلاً جسم کی متناسب حرکت پر ناچ کا بنیادی اصول ہے مگر مغرب والے پاؤں کی حرکت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ہندوستان میں ہاتھ کو مقدم رکھا جاتا ہے، اس کے برخلاف ترکی ناچ میں چھاتی کی حرکتوں پر ساری توجہات صرف کر دی جاتی ہیں۔

ہندوستانی ناچ ہندو مذہب کا عکسِ جمیل ہے جو اصل غ

ہوتے ہوئے بھی ایک مکمل و منظم چیز ہے۔ جب ہی تو اس کی ہر ادا آوارہ خوشبو، ہر جھنکار قلقلِ مینا ہوتی ہے اور فروغِ نظارگی کا عالم ہوتا ہے کہ تارِ نظر آئینہ آسا، ریشۂ دل خمار آلودہ ہو جاتا ہے اور سفلانہ سرمستیوں کی بجائے مقدس جذبات، عاشقانہ کیفیات کے مافوق الطبعی اسرار جھلکنے لگتے ہیں۔

ناچ جیسا کہ میں نے کہا جسم کی شاعری ہے۔ عضو اس کی بحر ہے۔ عضو کو ہندی زبان میں "انگ" کہا جاتا ہے۔ گردن، آنکھ، کمر، ہاتھ جولانیاں جگاتے ہیں۔ آنکھ اور گردن لجاتے شرماتے ہوئے جذبات کو ایکدم گستاخ و بیباک بنا ڈالتے ہیں تو کمر بل کھا کھا کر اُدھم ہو جاتی ہے اور ہاتھ، ہاتھ کو تو ہاتھ یقین کیا ہی نہیں جاتا۔ کہیں تو یہ آڑیا اوڑھنی بنا ہوا ہے یا کہیں پنکھا، پنکھڑی کی طرح ڈھلک رہا ہے اور کہیں سانپ سا ڈسنے کے لئے پھوں پھوں کر رہا ہے تو کہیں پیارے پھول برسا رہا ہے غرض ایک ہاتھ بیسیوں انداز دکھاتا ہے۔ اس کے انداز کو سمجھنے کے لئے اکثر پہلی اور بعد کی حرکت کی مدد لی جاتی ہے۔

ہندوستانی دیومالاؤں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک موقع پر اندر راج دوسرے دیوتاؤں نے برہما سے کہا کہ تفریح کا کوئی ایسا سامان پیدا کیا جائے جو حواس کو مسرور کرنے کے ساتھ ساتھ روح کو معراج بھی بخشے۔ اس پر برہما نے وید تصنیف کئے۔ رگ وید میں دریائے معنی بہایا۔ یجر وید میں موجِ حرام کی لہریں پھونکیں اور ان اعلیٰ تصانیف کی مدد سے بھرت نے سب دیوتا کے حضور میں گندھرویوں اور اپسراؤں کے حسن میں تین طرزوں کے ناچ پیش کئے۔ وہ تین طرزیں ناٹ، نرت اور نرتیہ تھیں۔

ناٹ ناچ ڈرامائی ناچ ہے۔ بلکہ ڈراما کا ایک اہم جزو ہے اور تمام ڈرامائی انداز صرف جسم کو تھرکا اور لچکا کر ظاہر کئے جاتے ہیں جس ناچ میں جسمانی لچک لچک کے ساتھ ساتھ صورتی بھاؤ بتایا جا ہو وہ نرت ناچ ہے۔ یہ ایک خاص مضمون بھی قائم کرتا ہے اس کے برعکس نرتیہ ناچ کوئی خاص مضمون قائم نہیں کرتا تاہم یہ اس قدر خود ظاہری ہوتا ہے کہ ایک افسانہ بکمال لطافت کہہ دیا جاتا ہے جو

دھڑکن پر جھٹکے ہوئے تاروں کی طرح ابھر جاتا ہے اور پھر ٹوٹتے ہوئے شعر کی طرح چونکا دیتا ہے۔

رتیہ ناچ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سراسر موسیقی کے اتار چڑھاؤ پر حرکات کے مدوجزر دکھاتا ہے۔ موسیقی کے بغیر یہ کوئی خاص اثر پیدا نہیں کرتا۔ رتیہ ناچ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ مارگ اور دیسی۔

مارگ ناچ خالص موسیقانہ ناچ ہے جس کی چھم چھم دیوتاؤں کے سامنے چھل بل دکھاتی ہے اور دیسی ناچ رسیلا ناچ ہے جو راجاؤں اور رئیسوں کی رنگ رلیوں میں چاؤ چونچلے دکھاتا ہے۔

ہندوستانی ناچ ایک طرف اگر عشق میں پیچ و تاب کھا کر دیوتاؤں کو مخاطب کرتا ہے اور دعا التجا سے جکڑ دکھا کر ان کے کرم کو جوش میں لاتا ہے تو دوسری طرف تفریح و نشاط کے ساتھ ساتھ علمی آرٹ میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ آج سے ہزاروں برس پہلے ہی یہ آرٹ میں شمار ہو چکا تھا جسے راجا، علما اور راجکمار بڑے شوق اور محنت سے اس فن کو سیکھتے تھے۔ بہادروں کو بھی عار نہ تھی۔ ارجن اس کی بہترین مثال ہے۔ ارجن نہ صرف ناچ سکتا تھا بلکہ زمانے کا بہترین [illegible] بھی تھا [illegible] کی ٹولی آن بان [illegible] یہ ناچ عوام کی زندگی کا جزو بن گیا۔ ان عوام کی گود میں اس نے ایک نئی انگڑائی لی جسے دیہاتی ناچ یا فوک ڈانس کہا جاتا ہے۔ یہ دیہاتی ناچ عوام کی زندگی میں اس قدر سرایت کر گیا تھا کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا بھی ایک ادا سے رقصیہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ ناچ شمالی ہندوستان اور بنگال میں خاص طور پر پروان چڑھا۔

جدید ہندوستانی ناچ کو تین زمروں میں ملایا جا سکتا ہے

اول وہ ناچ جو صرف موسیقی کے اتار چڑھاؤ پر ناچا جاتا ہے۔ ایسے ناچ پر مسلم کلچر کا بھی اثر ہے اور شاید اسی لئے ایسے ناچوں کو شمالی ہندوستان میں بہت پسند کیا جاتا ہے

دوسرا وہ ناچ ہے جس کی تمام خصوصیات صرف چہرے سے ظاہر ہوتی ہیں اور دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چاند میں آفتاب آ گیا۔ زیادہ تر ناچ اسی زمرے میں آتے ہیں اور وہ تمام کے تمام عوام کو مرغوب ہیں۔

تیسری قسم کا ناچ گویا مجسم کہانی ہے اس قسم کا ناچ یورپ اور امریکہ میں بیلے (BALLET) کہلاتا ہے مالابار کا کتھکلی ناچ اسی حلقے میں آتا ہے۔ کتھکلی کی ایک ایک جنبش ایک ایک اشارہ لکیر معلوم ہوتا ہے جو کوئی شاہکار تصویر کی طرح رواں ہو مگر یہ طویل اور مشکل ناچ ہے اس لئے عورتیں اس میں حصہ نہیں لیتیں۔

کتھک ناچ جسم میں بے چین تناؤ، پرسکون جنبش پیدا کر کے ناچنے والے کے عضو عضو میں اتر جاتا ہے۔ اور قدموں کی مدہوش ہوشیاری پیچیدہ تالوں کے اشاروں پر لڑکھڑا کر اور سنبھل کر دیکھنے والے کے ہوش و حواس پر ایسی رم جھم پیدا کرتی ہے کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں پر محسوس ہوتا ہے کہ بند ہو رہی ہیں۔ کتھکلی کی طرح گندھروا ناچ بھی رقص عالیہ کا ایک نادر نمونہ ہے۔

دوسرا مشہور ناچ راس لیلا ہے اور اسی ناچ نے آجکل کے ناچ پر ایک گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کی ہر ادا عشق و محبت کی سرشاریاں لٹاتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے کرشن اور رادھا اس دھرتی پر اتر آتے ہیں اور آج سے ہزاروں برس پہلے کا فسانہ محبت دہرا رہے ہیں۔ اس ناچ نے یورپ والوں کے دلوں پر بھی ایسا رنگ چھوڑا ہے۔ دی لٹریری سپلیمنٹ کے چند جملے سنیئے۔

"وہ جنہوں نے بودلا آدا کولی سائنس کے تجسم میں دیکھا ہے تصور کر سکتے ہیں کہ وہی دھندلی سی بودلا وا بہت دور کرشن اور گوپیوں کے اصول بہار میں ان کے سروں پر تمام خم و چم سے ٹھمک رہی ہے"

ہزاروں سال قبل راس لیلا نے ہندوستان کے باہر لوگوں کے دلوں پر ایسی روح پھونکی تھی کہ ان کا شعور فن جاگ اٹھا تھا۔ اور اسی شعور کے تحت مختلف قسم کے ناچ اختراع کئے گئے تھے جو اب بھی جاوا، سیام، تبت اور چین میں اٹھلاتے نظر آتے ہیں

ہندوستانی ناچ کی تنزلی کے اسباب میرے خیال میں تین ہیں۔ اول۔ کہ ناچ جب عوام کی زندگی میں پیوست ہو گیا تو راجاؤں اور رئیسوں نے اس کی سرپرستی چھوڑ دی اور اس اعلیٰ فن کا رتبہ آہستہ آہستہ گھٹتا گیا۔ دوم جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو اپنے ساتھ پردہ بھی لائے جس سے عورت کی آزادی ہر طبقے میں کم ہوتی گئی اور اس فن کا چرچا بھی کم ہوتا گیا اور اس طرح یہ فن شرفا اور درمیانہ طبقے سے بھی جاتا رہا۔ [illegible]

رہ گیا نچلا طبقہ۔ سوا اورنگ زیب کی حکومت کا ماحول کچھ ایسا تھا کہ نچلے طبقے نے بھی اسے سراہنا چھوڑ دیا اور جن دو چار خاندانوں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھا رکھا تھا انہوں نے انگریزوں کے زمانے میں اپنا ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ چنانچہ سوانگی یا نانگی ناچ آج بھی نچلے طبقوں کی شادی بیاہ میں ایسی جھلکیاں دیکھا جاتا ہے۔

غرض ہندوستانی ناچ اس بُری طرح مٹ چکا تھا کہ اس کی اصلی شکل پہچانی نہ جا سکتی تھی مگر خیر ہو جدید ترقیات کی کہ بھولے ہوئے مندروں اور نامعلوم کھنڈروں کی ہزاروں برس کی پُرانی مورتیاں اور ان دیکھے مجسمے ڈھونڈ نکالے گئے۔ جن کی وجہ سے اب رقص عالیہ کی نہ صرف اصلی شکل معلوم ہو گئی بلکہ کم سے کم عرصے میں اسے زندہ کر کے البیلا اور چھبیلا سا دیا گیا۔ اس فن پر کئی پُرانی کتابیں بھی ہیں لیکن شاید یہ وہ کام نہیں کر سکتیں جو ان مورتوں اور مجسموں سے کئے۔

ہندوستانی ناچ کا تجدیدی دَور بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ناچ سے مذہبی عقائد ایک دم نکال دئے گئے۔ پھر پُرانے لباس، پُرانی موسیقی، پُرانے مضامین کی جگہ نئے لباس، نئی موسیقی اور نئے مضامین آ گئے اور کچھ ایسی تبدیلیاں بھی پیدا کی گئیں کہ قدامت پسندوں کو عتاب آ گیا۔

شاید اسی عتاب کی بنا پر انہیں نظر نہیں آتا کہ جدید ناچوں میں ایسی خوبیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔ جو ہر مضمون کو ہر رنگ میں اُبھار کر نظروں کو جامِ دل کو خم خانہ بنا دیتی ہیں اور صفت تو یہ ہے کہ یہ خوبیاں رقص عالیہ کی ٹکنک کو مجروح کر کے نہیں پیدا کی گئیں جو کہ مجتہد فن کے نزدیک رقص عالیہ کے بنیادی اصول ہمیت میں نظر ہے اس لئے کہ ان کے دل و دماغ پر یہ خیال بیٹھا ہوا تھا کہ ہندوستانی ناچ مکمل آرٹ ہے۔

"چاندرات"

دُور، کونوں نے بیٹھ کر لبِ جُو
پھیلائے تھکے تھکے بازو ـــــ
گر رہی ہیں سیاہیاں ہر سُو۔

ایک ہی بار دل کے دروازے
کُھلتے ہیں اور پھر نہیں کُھلتے ـــ

رات عورت ہے اگرچہ تیرہ جبیں،
دل مگر کاروانِ سرائے نہیں
ایک ایواں ہے، جس کے دروازے
کُھل کے اک بار پھر نہیں کُھلتے

ایک بیوہ کے نوجواں جذبات،
سوچ روشن مگر اندھیر حیات ـــ
چاندنی ـ نغمہ ہائے کیف و سرُور،
چند لمحوں کا اک فسانۂ نُور،
اور پھر تیرگی ـــ سحر اندیش!
جس طرح کوئی ایک پل کے لئے
اپنا آنچل بکھیر کر چُن لے،
اور پھر پردہ ہائے تاریکی ـــ

ایک ہی بار دل کے دروازے
کُھلتے ہیں اور پھر نہیں کُھلتے۔

سید لطیف

سید شبر حسینی

ایک سرد رات

وہ ادیب تھا۔ ایک ترقی پسند ادیب ـــ اُس کے افسانوں میں سڑی ہوئی لاشوں کی عفونت اور بھوکی انتڑیوں کی تپش سے بھری ہوئی تھی۔ اُس نے آج تک زندگی کے ہر ایک تاریک پہلو کو اپنی کہانیوں میں بے مواد اور بدبو دار گوشت سے سجایا تھا ـــ آج کی رات بھی اُس کا قلم ایسے ہی تیز دانتوں والے کیڑے اُگل رہا تھا۔ جن کے خمیر سے ـــ وہ جانتا تھا کہ وہ عنقریب ہی افلاس کی اُبھری ہوئی کالی رگیں بحال کر دے گا ـــ

رات سردی سے ٹھٹھری ہوئی تھی۔ اور کائنات کی ایک عجیب دُھند میں نہائی ہوئی تھی۔ باہر درختوں کی گھنی چھاؤں میں چند سردی سے ٹھٹھرے ہوئے جگنو جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ اور دُھند بڑھنے کی وجہ سے ستاروں کی روشنی بھی مُرجھائی ہوئی اور پھیکی نظر آ رہی تھی۔ سارے ماحول میں ایک ہولناک اُداسی اُس کی زندگی کی رگ رگ سے پھوٹ کر فضا میں بجھی ہوئی چنگاریاں بکھیر رہی تھی ـــ وہ یہی چاہتا تھا۔ کہ اُس کی زندگی میں ہمیشہ تاریک کہرا چھایا رہے۔ تارے ہمیشہ اندھے ہو کر چمکا کریں۔ اور وہ دُنیا کی کسی اُجلی چیز کو دیکھ نہ سکے ـــ

وہ ماحول کی تاریکی اور بجھے ہوئے دل کی اُداسی کو اپنی زندگی کے گلے سے لگائے ہوئے ـــ کچھ لکھے جا رہا تھا۔ جب اُس کی اُنگلیاں رنج ہو کر نڈھال ہونے لگتیں۔ اور اُس کا جسم سردی سے سُکڑنے لگتا، تو وہ چند لمحات کے لئے ٹھہر جاتا۔ اور اپنے جسم کو گرمانے کے لئے لحاف اوڑھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ یہ چھوٹا سا وقفہ اُس کی زندگی کو اور بھی دُھندلاہٹوں کی طرف گھسیٹ کر لے جاتا۔ اور اُسے پھر اِس اندھیری دُنیا میں ـــ اس بے کیف ماحول میں دو پتلے پتلے عنابی ہونٹ۔ جنکو اُس نے آج سے کئی سال پہلے چوما تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر رینگنے لگتے۔ اندھیرے میں دھیرے دھیرے روشنی کے سوتے پھوٹنے لگتے۔ لیکن ایک ہی جھماکے کے ساتھ روشن ہوتی ہوئی بتیاں پھر سے گُل ہو جاتیں۔ اور پھر اُس کی زندگی میں کالے کالے ناگ پھنکارنے لگتے۔

آج سے کئی سال پہلے جبکہ وہ ادیب نہیں تھا۔ بلکہ ایک نا سمجھ اور آوارہ نوجوان تھا۔ اُسے ایک لڑکی سے پیار ہو گیا تھا ـــ ایک سرمایہ دار کی لڑکی سے ـــ وہ لڑکی کتنی نازک تھی۔ اگر کوئی مرد اُسے چھو بھی لیتا تو اُس کا نقرئی بدن اُس کی حرارت سے پگھل جاتا۔ اُس کے جسم کی بھینی بھینی خوشبو ابھی تک اُس کی جوانی میں ـــ اُس کی زندگی میں ـــ ایک کھلی ہوئی کلی کی طرح زندہ تھی۔ اُسے ابھی تک یاد تھا۔ کہ اُس لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے اُس نے اپنے جیون کی کایا پلٹ دی تھی ـــ لیکن پھر بھی وہ اُس لڑکی کو حاصل نہیں کر سکا ـــ عورت کا جسم جو سرمایہ داری کے خمیر میں بس کر پیدا اور جوان ہوتا ہے۔ ـــ اُسے ایک غریب حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو اُس عورت کے جسم سے باس آنے لگے گی۔ اور سرمایہ داری کا خمیر بھوک نگل جائے گی ـــ

کئی ڈراؤنی راتوں میں وہ اُسے یاد کر کر کے رویا تھا ـــ لیکن اُس کی ہچکیوں کی آواز سوائے زنگ سے کھائے ہوئے ٹائم پیس اور ایک لنگڑی کُرسی کے کوئی بھی نہ سُن سکا ـــ وہ وقت اُس کی زندگی کے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اب وہ ایک ادیب تھا۔ اور وہ بھی ترقی پسند ـــ لیکن نہ جانے اُس موہنی لڑکی کی یاد اور اُس کے رس بھرے ہونٹوں کی مٹھاس اُس کی گھٹی میں ابھی تک کیوں جی رہی تھی ـــ جب وہ وقت ہی بیت گیا۔ اور وہ لڑکی بھی کسی اور کی ہو گئی۔ تو یہ مٹھاس اُس کے ہونٹوں میں کیوں رس گھولتی ہے۔ اور اُس کی یہ یاد اُس کی ہڈیوں کو کیوں گلاتی ہے ـــ

وہ دن اُسے اچھی طرح یاد تھا۔ جب وہ ایک پھٹا ہوا سوٹ پہن کر اُس لڑکی کے باپ کے پاس گیا تھا ـــ اُس نے بھیک مانگی تھی صرف ایک جسم کی ـــ جو ایک سُنار کے گھر پلا تھا۔ اور جس کے گوشت سے سونے چاندی کی مہک پھوٹ رہی تھی ـــ وہ بہت رویا تھا۔ گڑگڑایا تھا ـــ لیکن اُس کے باپ نے اُس کے رونے اور گڑگڑانے سے متاثر ہو کر صرف اتنا کہا تھا میں ایک میونسپلٹی کے کلرک کو اپنی لڑکی نہیں دے سکتا ـــ اس سے زیادہ تنخواہ تو میرا ڈرائیور ہی لیتا ہے ـــ

اس کے بعد اس کی زندگی میں ایک طوفان آیا۔ گھٹائیں چھائیں

اور پھر یہیں ـــــ وہ ایک کلرک سے ادیب بن گیا۔ اور وہ بھی ترقی پسند۔ آج تک اُس نے اپنے ماحول کے لئے بہت کچھ لکھا تھا۔ لیکن وہ اپنے لئے کچھ نہ لکھ سکا ـــــ وہ جانتا تھا۔ کہ ہندوستان کی بیمار زندگی ایک نہ ایک دن ضرور جیتی ہو جائے گی۔ اُس کے افسانے اور اُس کی بھیانک کہانیاں ایک دن ضرور سیلاب کی صورت میں سماج کو اور کرکٹ اپنے ساتھ بہا کر لے جائیں گی ـــــ اور پھر ہندوستان میں نیا چاند چمکے گا ـــــ جس کی ٹھنڈی چاندنی میں نئے دل پیدا ہوں گے ـــــ نئے اجسام بنیں گے ـــــ خرید و فروخت بند ہو جائے گی نئی زندگی سونا اُگلے گی ـــــ اور ہم لوگ اُس میں نہا سکیں گے۔ لیکن وہ رس بھرے ہونٹ ـــــ وہ لال لال گال ـــــ وہ سینے کا گداز اُبھار ـــــ ایک کلی جس نے عورت کے روپ میں جنم لیا تھا ـــــ یہ سب کچھ میرے صحن میں اندھیرا بن کر کیوں چھا گیا ـــــ وہ لڑکی میری زندگی سے کیوں چھن گئی ـــــ میں نے کیا گناہ کیا تھا۔ ہاں میں نے ایک گناہ کیا تھا ـــ میں بھوک کا شکار تھا ـــــ بھوک ـــــ عورت ـــــ محبت ـــــ اُس کی آنکھوں میں تاریکی چھانے لگی۔

ـــــ ہاں تو رات بہت سرد تھی۔ برف کی طرح یخ۔ اور وہ ایک مرے ہوئے دل کو اپنے سینے میں چھپائے کچھ لکھ رہا تھا ـــ ہر طرف وحشت چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں سکوت ٹوٹا۔ اور اُس نے اپنے کمرے کے باہر کسی کے کراہنے کی آواز سُنی ـــــ اُس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اور جو کچھ وہ لکھ رہا تھا۔ یار دو بن کر اُس کے دماغ سے اُڑ گیا۔ کیا انسان کے کراہنے میں اتنی شدّت ہوتی ہے ـــ اتنا درد ہوتا ہے ـــــ وہ لحاف پرے ہٹا کر باہر نکلا ـــــ اُس کی آنکھوں نے اندھیرے میں ایک جسم کو دیکھا۔ جو ایک عورت کا جسم تھا۔ بھوک اور سردی کا مارا ہوا ـــــ یہ بھی عورت ہے۔ اور وہ بھی عورت تھی۔ لیکن اِن کے جسموں کا خمیر الگ الگ سانچوں میں ڈھالا گیا تھا ـــ کتنا فرق ہے اِن دونوں میں ـــ کتنی بے انصافی ہے ـــ ایک جسم اتنا قیمتی ـــــ اور ایک جسم اتنا سستا ـــ آج ہر کوئی اس کی بھوک مٹا کر اس کی جوانی لوٹ سکتا ہے ـــــ وہ اُس کے قریب چلا گیا۔ اور اُس نے نہایت ہمدردانہ لہجہ میں اس سے پوچھا "تمہیں کیا ہو گیا ہے" اُس لڑکی کا جسم اگرچہ بھوک اور سردی کی شدّت سے کسی حد تک مُرجھا گیا تھا لیکن اُس کے چہرے اور سینے پر جوانی کی تازگی ابھی تک موجود تھی۔ اتنا سُن کر اُس کے چہرے پر ایک گہری تاریکی چھا گئی ـ اور اُس نے سسکتے ہوئے کہا "میں یہاں روٹی کی تلاش میں آئی ہوں۔ میرے ماں باپ بنگال میں بھوک نے مار ڈالے ـــــ میرا اِس دُنیا میں کوئی نہیں بابو جی" ـــــ وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔

"تم گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں روٹی دونگا ـ میں تمہارا سہارا بنوں گا۔ چلو اندر ـــــ چلو" اُس لڑکی نے اُس کی آنکھوں میں ایک ایسی پاکیزگی کی لَو جلتی ہوئی دیکھی۔ جو آج سے پہلے اُس نے کسی مرد کی آنکھوں میں نہیں دیکھی تھی ـ وہ سمجھ گئی کہ یہ آدمی شریف ہے اور اُسے کچھ نہ کہے گا ـــــ وہ اُس کے ساتھ اندر چلی گئی ـــ بجلی کی شفاف روشنی میں اُس کا سانولا چہرہ بکھرے ہوئے آسمان کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اور اُس کی سیاہ گھنی زلفیں اُس کے شانوں پر ایک اندھیرے کا غبار اُڑا رہی تھیں۔ آج پہلی دفعہ ایک نوجوان لڑکی اُس کے کمرے میں آئی تھی۔ اُس کے کمرے کی ہر ایک چیز شفاف اور اُجلی نظر آ رہی تھی ـ اُس لڑکی کی آنکھوں میں ایک سُہانی رُت چھائی ہوئی تھی۔ اور جسم پر ایک ڈرائونی تازگی ـــــ وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا ـــــ آج پہلی دفعہ اُس نے اپنی زندگی میں ایک نوجوان عورت کو ایک عرصے کے بعد اتنی گہری نظروں سے دیکھا تھا ـــــ بھوک ـــــ عورت ـــــ محبت ـــــ اور چاندی کے ٹکڑے ـــــ اُس کی آنکھوں میں چاندنی ناچنے لگی ـــــ اُس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا ـ پیٹ میں روٹی بولنے لگی ـــــ جیبوں میں ہاتھ ڈالے ـــــ چاندی کے ٹکڑے کھڑکھڑائے ـــــ

عورت اور بھوک ـــــ بھوک عورت کی بدترین دشمن ہے ـــــ اور عورت تو ایک کنول کا پھول ہے۔ جس کا نکھار چاندی اور سونے کے پانی سے ہی برقرار رہ سکتا ہے ـــ اس لڑکی کے گال کتنے اُجلے ہیں ـــــ اس کے ہونٹوں کا رس کتنا میٹھا ہو گا ـــــ

وہ ایک ادیب تھا۔ اور وہ بھی ترقی پسند ـــــ لیکن آج نہ جانے ایک نہتی لڑکی کو اپنے پاس پا کر اُسے کیا ہو گیا تھا ـــــ سونے چاندی کا دھواں اُس کے دماغ پر چھا ـ گیا ـــــ پیٹ میں روٹی بول رہی تھی ـــــ اور جیبوں میں پیسے ناچ رہے تھے ـ وہ اُس کے ہونٹ چومنے چاہتا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی پنکھڑیوں سے کھیلنا چاہتا تھا ـــــ اُس لڑکی کے جوان جسم کی خوشبو ہوا کے جھونکوں میں لپٹی ہوئی اُڑ ـ

(بقیہ صفحہ ۶۲ پر)

اُردو رسم الخط

محمد نصیر الدین

بہی خواہانِ اُردو کے لئے میں آج چند باتیں پیش کرتا ہوں
امید کرتا ہوں کہ میری ان باتوں کو ٹھنڈے دل سے غور و فکر
کے ساتھ سُنا جائے گا۔ اُردو باوجودیکہ بہ عمومہ ہندوستان
کی چیدہ نمائندہ زبان ہے مگر پھر بھی اس کے پڑھنے اور پڑھانے والے
ہندی سے کم ہیں۔ کسی تعلق زبان دانی سے پوچھئے کہ ہندوستان
کی تمام زبانوں میں سہل الحصول کون ہے وہ یقیناً اس معاملے
میں اُردو کو بہت پیچھے رکھے گا۔ اس کے نقطۂ خیال سے اُردو میں
مندرجہ ذیل خامیاں ہیں۔

(۱) اس کی کتابت عمدہ نہیں اور اس کا کوئی ٹائپ نہیں
اسی وجہ سے اُردو کی کتابیں اغلاط سے پُر ہوتی ہیں۔

(۲) اس کا پڑھنا مشکل ہے اور اس کو روانی سے پڑھنے
کے لئے کثرتِ مشق کی ضرورت ہے اس کے اکثر الفاظ لکھے اور طرح
جاتے ہیں اور پڑھے اور طرح جاتے ہیں۔

(۳) اس کا لکھنا پڑھنے سے زیادہ مشکل ہے اس میں ہم
صوت حروف کی کثرت ہے مثلاً ز، ذ، ض، ظ۔ پڑھے ایک
طرح جاتے ہیں مگر لکھے اور طرح جاتے ہیں اسی طرح ح اور ہ،
ا اور ع، ث، س اور ص میں بولنے میں کوئی فرق نہیں مگر لکھنے
میں زمین آسمان کا فرق ہے

(۴) اس کے الفاظ میں حروف کا اجتماع تنگ کرتا ہے
دقت یہ ہے کہ پتہ نہیں چلتا کون حرف کس سے اور کس طرح ملیگا
مثلاً ایک لفظ ہے سمجھا، اس لفظ کے تمام حروف ملاکر ایک ساتھ
لکھ دئے گئے ہیں اور جب تک ان کو بار بار پڑھکر اپنی آنکھوں
کا عادی نہ بنا جائے اُن کا فراٹے سے پڑھنا تقریباً ناممکن
ہے ایک طالب العلم کے لئے اُردو میں ایسے الفاظ کی کثرت ہے
اس کو پریشان کرنے کے لئے کافی ہیں۔

کیا مندرجہ بالا اعتراضات صحیح نہیں ہیں؟ کیا اُردو میں
خامیاں بدرجہ اتم موجود نہیں؟ سوچئے اور ٹھنڈے دل سے
سوچئے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا اور کہنا کہ اُردو مکمل اور نمائندہ
زبان ہے کس حد تک واقعات پر مبنی ہے۔ اُردو کو جب تک سہل الحصول
اور عام فہم نہ بنایا جائے گا اس کی ہر دلعزیزی محض ایک مخصوص طبقہ
میں محدود رہے گی اور اس سے چند ایک لوگ مستفیض ہو سکیں گے۔
اُردو کو نہ صرف عالموں کی زبان ہونا چاہئے بلکہ جنتا کی بھی۔ عوام
کی زبان کے لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ زبان کا لکھنا
پڑھنا صد درجہ آسان ہو اور اس کے لئے جو کتابیں لکھی جائیں وہ
کم داموں میں ملیں چونکہ مزدور پیشہ جماعت کے پاس نہ اتنا وقت
ہے اور نہ روپیہ اس لئے مندرجہ بالا شرطیں بہت ضروری ہیں۔ اب
آئیے اُردو کی خامیاں جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں ان کو ایک
ایک کرکے حقیقت کی روشنی میں جانچا جائے۔

(۱) اُردو کی طباعت ابتک دورِ حجر کی داستانِ پارینہ ہے۔
اس کی طباعت کے لئے ایک عینک لگاتے ہوئے کبڑے کاتب کا
ہونا ضروری ہے اور یہ کاتب اپنے قلم کا خود مختار بادشاہ ہے جو
اسے جس طرح چاہتا ہے چلاتا ہے اور اسے قلم کے پیدا کئے ہوئے
حرکوں کے اثرات سے یکسر ناواقف یا لاپرواہ ہوتا ہے ایک ضخیم کتاب
کی اشاعت کم از کم چھ ماہ کی طویل مدت کا کام ہے اور وہ بھی اس
طرح کہ ایک وقت میں اس کتاب کی محض ایک یا ڈیڑھ ہزار کاپیاں
چھپ سکتی ہیں اس کے بعد پتھر کے حروف گھس جاتے ہیں اور دوسرے
ایڈیشن کے لئے ازسرِ نو کتابت کرانا پڑتی ہے اگر دورانِ کتابت
میں کہیں حضرت زریں رقم چل بستے ہیں تو پھر کتابت کسی اور رقم
صاحب کے حوالے کی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدھی کتاب
سُنہری ہوتی ہے تو آدھی روپہلی۔

اس طریقۂ طباعت میں ایک اور قباحت یہ ہوتی ہے کہ کتاب
مصور نہیں ہو سکتی آجکل زمانہ اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ کتاب
رسالہ یا اخبار جب تک مصور نہ ہو اُس کی قیمت اور جاذبیت صفر
کے برابر ہوتی ہے۔ اُردو کی یہ کمزوری سب پر نمایاں ہے اور اُردو
کی کتابیں علی الخصوص جو علمی ہیں اور جن کے لئے نقوش اور تصویریں
از بس ضروری ہیں، کسی کام کی نہیں ہوتیں۔ اگر کاتب صاحب
کے ذمے ان نقشوں کو لگانا پڑ گیا تو پھر یوں سمجھئے کہ دائرہ مستطیل
ہو جاتا ہے اور چوپائے۔

دفاتر کی زبان کے لئے ٹائپ رائٹر ضروری ہے اور اس معاملہ میں بیچاری اُردو کے لئے جو ٹائپ رائٹر بنایا گیا ہے وہ اولاً خط نسخ میں ہے دوسرے اس پر کام کرنا کوہ کندن اور کاہ برآوردن کے برابر ہوتا ہے۔ انگریزی یا ہندی کا ٹائپسٹ جہاں ایک گھنٹہ میں چھ صفحے ٹائپ کرے گا وہاں اُردو کا صرف ایک صفحہ بڑی دیدہ ریزی کے بعد ہوگا۔

خطِ نسخ اور خطِ نستعلیق کا جھگڑا بڑا پرانا ہے اور اس کا نتیجہ اب تک کچھ بھی نہیں نکلا خطِ نستعلیق سے اُردو داں طبقہ علیحدگی اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں اور اس خط کا ٹائپ اب تک تیار نہ ہوسکا اور نہ ہونے کی اُمید ہے۔ حیدرآباد میں سُنا تھا کہ یہ ٹائپ بنا ہے مگر وہاں بھی سرکاری دفاتر میں دیکھا کہ باریک تحریر خطِ نسخ میں ٹائپ ہوتی ہے اور موٹے حروف جو صرف سرخی میں استعمال کئے جاتے ہیں خطِ نستعلیق میں ٹائپ ہوتے ہیں۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ باریک تحریر کے لئے خطِ نستعلیق کا ٹائپ کمزور ہوتا ہے اور الفاظ و حروف کی خوبصورتی غارت ہو جاتی ہے۔ اُردو ٹائپ کے متعلق اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس پر زیادہ لکھنے کی گنجائش نہیں اور اُردو کا یہ کمزور پہلو سب صاحب علم حضرات پر روشن ہے۔

(۲) اُردو کے بہت سے الفاظ جو غیر زبانوں سے لئے گئے ہیں اب تک بالکل اسی طرح لکھے جاتے ہیں جیسے یہ اپنی مادری زبان میں لکھے جاتے تھے مگر اب ان کا تلفظ اُردو میں کثرت استعمال سے مختلف ہوگیا ہے۔ ایسے الفاظ اُردو کے سیکھنے والوں کے لئے دامن پکڑنے والے کانٹوں کا کام کرتے ہیں۔ بیچارہ نوآموز اس بھول بھلیاں میں پڑ کر اپنا سر پکڑ لیتا ہے ایسے الفاظ اگر غور کئے جائیں تو بہت ملیں گے۔ سردست جو یاد آرہے ہیں انکو لکھتا ہوں۔ خواہش، خواہ مخواہ، سُنبل، بالکل، مثلاً، جملہ وغیرہ یہ الفاظ بولے اور لکھے جاتے ہیں مگر بالکل مختلف طرح سے۔ تلفظ کے لحاظ سے انکو اُردو میں یوں لکھنا چاہیئے تھا۔ حاہش، [illegible] مخاہ، سُمبل، بِلکُل، مِثلن، جملہ وغیرہ۔

(۳) اُردو کا لکھنا پڑھنے سے زیادہ مشکل ہے علی الخصوص ایسی حالت میں جب کہ سُن کر اسے لکھا جائے۔ اس میں ہم صوت حروف کی کثرت ہے جو مختلف زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ ان کا تلفظ ان کی مادری زبان میں مختلف تھا مگر اب اُردو میں یہ حروف بالکل ایک طرح سے ادا کئے جاتے ہیں۔ اُردو میں کثرت استعمال سے یہ حروف ہم آواز ہوکر رہ گئے ہیں اور صرف ان کو سُن کر لکھا نہیں جا سکتا جب تک کہ لکھنے والا ان حروف کے محل استعمال اور الفاظ زیر غور کے معنی اور معدن سے واقف نہ ہو۔

اُردو کے حروف یہ ہیں۔ ذ، ز، ژ، ض اور ظ۔ یہ حروف زیادہ تر عربی سے لئے گئے ہیں اور ان کا تلفظ عربی میں جُدا جُدا ہے جس کی وجہ سے لکھنے والا ان حروف کے اختلاف کو سمجھ لیتا ہے مثلاً عربی میں قبض بولا جائے تو لکھنے والا سمجھ جائے گا کہ آخری حرف ض ہے اور ز نہیں، اسی طرح ژند یا ژندجب فارسی میں بولا جاتا ہے تو اس ژ کا تلفظ صاف ہوتا ہے۔ مگر اُردو میں یہ تمام حروف ہم آواز ہوکر رہ گئے ہیں اور ایسے سارے ہم آواز حروف کا ایک زبان میں جمع ہونا اس زبان کی زیر باری کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح ع اور الف عربی میں بالکل مختلف آواز کے حروف ہیں مگر اُردو میں بیچارے پنجابی تو ع کو عمر بھر بول نہیں سکتے اور اس کے ماسوا آجکل ہر اُردو داں ع کو الف کی طرح بولتا ہے مثلاً عربی کو حلق سے کوئی نہیں بولتا عبادت کو صحیح عربی لہجہ میں کوئی نہیں بولتا۔ قصہ مختصر عربی کی ع ہمارے ہاں الف ہوکر رہ گئی ہے۔

اُردو کے دوسرے ہم آواز الفاظ ث، س اور ص ہیں۔ عربی جہاں سے یہ حروف لئے گئے ہیں اُن کے لئے جُدا جُدا تلفظ رکھتی ہے مگر ہمارے ہاں تو یہ حروف س ہوکر رہ گئے ہیں۔ مثلاً حوادث، اثاثہ، عاصی، صحیح وغیرہ الفاظ میں ث اور ص بالکل س کی طرح بولے جاتے ہیں۔ اُردو کے دوسرے ہم آواز الفاظ، ط اور ت ہیں۔ ان کو بھی سُن کر ان کا خفیف اختلاف تلفظ جو عربی میں رائج ہے پہچانا نہیں جا سکتا۔

مندرجہ بالا گذارش احوال واقعی کے بعد اگر دیکھا جائے تو اُردو کے ۳۷ حروف میں ۹ بالکل زائد ہیں اور یہ آسانی سے نکال دئے جا سکتے ہیں۔ اُردو ہی شاید تنہا ایسی زبان ہے جس میں ۳۷ حروف ہیں ورنہ رومن رسم الخط میں صرف ۲۶ ہیں البتہ چینی اور جاپانی زبانوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، یہ کثرت حروف والفاظ کی وجہ سے ساری دُنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتے اُردو کے مجوزہ ۲۸ حروف یوں ہوجائیں گے:۔

ا ب پ ت ٹ ج چ خ د ڈ ر ڑ ز س ش غ ف ق ک

گـ ل م ن وہ ھدی ے۔

(۴) خط نستعلیق کی خوبیاں ظاہر ہیں۔ اس خط کی سب سے بڑی خوبی اس کی خوبصورتی ہے۔ حروف کی گولائی، موٹائی وغیرہ تمام کی تمام ایسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے خط نستعلیق دنیا کا نہایت حسین ترین خط تحریر ہو جاتا ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے خط نسخ پسند نہیں کیا جاتا اور سچ پوچھئے تو خط نستعلیق خط نسخ کی بہتر اور ترقی یافتہ صورت ہے اور اسے حتی الوسع کسی صورت میں بھی ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیئے۔

اس خط کی دوسری خوبی اسکی مختصر نگاری ہے یعنی بعض شوشوں کے اجتماع سے ایک پورا لفظ بہت جلد لکھ لیا جاتا ہے۔ تحریر کی یہ خوبی طباعت کی آسانیوں سے پہلے نہایت کارآمد تھی اس کی وجہ سے اُردو دُنیا کی تمام زبانوں سے زیادہ آسانی سے لکھی جاتی تھی مگر اس کی یہی خوبی آج اسکی ترقی کے لئے وجہ خطر بنی ہوئی ہے۔ یاد رکھیے جب تک اُردو کی اس مختصر نگاری کو آسان کر کے اُس کو ٹائپ کے لائق بنایا … اس وقت تک یہ زبان کی اشاعت نہ تو عام ہو سکتی ہے اور اس کی پہونچ لاکھوں کروڑوں آدمیوں تک ہو سکتی ہے۔ [illegible] زبان آب حیات پی سکتی ہے جس کی جڑیں عوام کے دلوں میں پرورش پاتی ہیں۔ اُردو کو جس قدر آسان اور سہل الحصول بنایا جائیگا وہ اُسی قدر دیرپا اور لافانی ہوگی۔

اُردو کی یہ کیفیت کہ ایک لفظ میں بے شمار حروف جمع کر دئے جاتے ہیں میرے خیال میں اب اسکی کوئی خوبی نہیں رہی جب دُنیا کا ہر متمدن باشندہ ایسی زبانوں کو لکھنے اور پڑھنے کا عادی ہو چکا ہے جس میں الفاظ کی ساخت جُدا جُدا حروف سے ہوتی ہے تو پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم اُردو میں اس قسم کے اجتماع ہوش ربا صبر آزما کو جائز سمجھیں میرے خیال میں حروف کو ملانے کی حد مقرر ہونی چاہیئے زیادہ سے زیادہ دو حرفوں کا ملانا جائز سمجھا جائے اور اس سے زیادہ کسی حالت میں بھی جائز قرار نہ دیا جائے۔ اس حد بندی سے جو فوائد ہونگے وہ ظاہر ہیں اُردو کا نہایت خوبصورت خط نستعلیق کا ٹائپ بن جائیگا اور ٹائپ بننے سے جو زبان کو آسانیاں ملیں گی وہ بیان کرنے کی چیز نہیں خیال کیجئے اُردو کی خوبصورت کتابیں، خوبصورت اخبار، مصوّر رنگین

ملک کے ہر گوشے میں، شہر کی ہر گلی میں، ملک کی ہر آنکھ میں [illegible] کی ہر زبان پر۔ اُردو کا یہ شاندار مستقبل ہمارے ہاتھوں میں ہے آخر ش ہم کب تک لکیر کے فقیر بنے رہیں گے اور یوں تو دُنیا کے تگ و دو میں پیچھے پیچھے رہیں گے؟

اب میں اپنی پیش کی ہوئی تجویزوں کو لکھ کر آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آپ کی آنکھیں اس خط تحریر کی عادی تو نہیں ہیں مگر آپ اس کو غور سے پڑھیئے اور ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ یہ صحیح راستے میں ایک لمبا قدم ہے یا نہیں؟ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی مشہور تصنیف "ابن الوقت" کا ایک باب جو (پارہ ۵) اُردو کی مجوزہ تبدیلی کے بعد لکھ کر پیش کرتا ہوں، پڑھیئے۔

"اتنے میں نوبل ساہب کے باہر نکلنے کی آہٹ سی معلوم ہوئی۔ سارے چپراسی اور جس قدر لوگ مُلاقات سے رہ گئے تھے سب کے سب ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جو شخص ساہب کے ساتھ ساتھ باتیں کرتے ہوئے اندر سے آئے تھے وہ دروازہ سے سلام کر کے رُخصت ہوئے باقیوں کو ساہب سلامت کے باد ساہب نے رُخصت کر دیا کہ آج بہت دیر ہو گئی۔ اور خود ابن الوقت کے کمرے میں پہنچ لے گئے پہلی بات جو ساہب نے ابن الوقت سے کہی تھی کہ افسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔ آپ کے شہر میں غدر کا بازار اس قدر گرم ہو رہا ہے کہ جس نے کچھ نہیں کیا وہ بھی خوف کے مارے پریشان ہے کہ دیکھئے کوئی کیا جا کر لگا دے اور کہاں کام کی نظر سے بیچ ہے۔ اس سے لوگ اور بھی ہراساں ہو رہے ہیں" ابن الوقت کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ساہب بول اٹھے "مجھ کو آپ سے بہت دیر باتیں کرنی ہیں اور کھانا بھی میز پر رکھا جا چکا ہے۔ چلئے کھاتے بھی جاتے ہیں اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔"

اُوپر کی تحریر اس وقت تو انوکھی سی معلوم ہو رہی ہوگی مگر انصاف سے کہیے کہ اس میں تمام سادگیاں جمع ہو گئی ہیں یا نہیں اس میں نستعلیق کی خوبصورتی الفاظ کا سلجھاؤ اور لکھنے بولنے کا ایک جیسا طریقہ ہو گیا ہے یا نہیں بلکہ اس میں ایک اور خوبی پیدا ہو گئی ہے وہ یہ کہ لفظ کے جس حصہ پر کھینچاؤ یا زور دینا چاہتے تھے وہ کھینچ کر لکھ دیا گیا ہے مثلاً ایک لفظ ہے پریشان۔ اسکی موجودہ صورت

دیکھ کر کیا اجنبی یہ نہیں جانتا کہ اس کا تلفظ کس طرح ادا کیا جائے۔ یہ لفظ مجبور ہے پڑا دریشان کا۔ ایک تو ارمودہ اس کو پریشان پڑھے گا۔ مگر خط تحریر کی موجودہ صورت یہ ہوگئی ہے کہ اس لفظ کا تلفظ بھی لکھنے میں آگیا ہے اور یہ اس رسم الخط کی بہت بڑی خوبی ہوگئی ہے۔ پریشان کو لکھا بالکل اسی طرح گیا ہے جس طرح پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر آپ اس نئی تحریر کے ہر لفظ پر غور کریں گے تو الفاظ کی صورت ان کے ایکسنٹ کے محافظ پائیں گے۔ تحریر کو یوں بدلنے میں لکھنے اور پڑھنے دونوں کی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ہم آواز حروف کو نکال کر صرف ایک حرف رکھنے میں ایک صورت پیدا ہوگئی ہے وہ بعض الفاظ کے معنی بدل جانے کا اندیشہ ہے مثلاً اوپر کی تحریر میں ایک لفظ ہے نظر جسکو نذر لکھنا پڑا ہے گویا اس تحریر کے سبب نظر نذر ہوگئی ہے اور دونوں الفاظ کے معنی میں زمین و آسمان کا فرق ہے یہ صحیح ہے مگر یہ لفظ یہاں صرف بہ معنی نظر استعمال ہو سکتا ہے جو ہر سمجھدار آدمی پڑھتے وقت سمجھ جائے گا انگریزی زبان میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو لکھے ایک طرح جاتے ہیں مگر اُن کے معنی جُدا جُدا ہیں مگر اس خامی سے اس زبان کی ہمہ گیری اور وسعت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

میں نے اُردو رسم الخط کو زمانہ کے لحاظ سے تبدیل کرنے کے لئے اپنی ناقص رائے پیش کی ہے جو بہت کچھ کمزور ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اس راہ پر چل کر ہم اس رسم الخط کی تمام خامیوں کو دُور کر سکتے ہیں اور معترضین کے ہر اعتراض کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر سکتے ہیں۔ میں یہاں انجمن ترقی اُردو کے بانی بابائے اُردو کا خیال اس طرف پھیرنا چاہتا ہوں میں نے یہ مضمون انہی کی دقیقہ رس نگاہوں کیلئے لکھا ہے تاکہ وہ دیکھیں کہ اُردو رسم الخط میں تھوڑی سی تبدیلی کے بعد وہ خوبیاں پیدا کی جا سکتی ہیں جو رومن رسم الخط میں بھی نہیں کی جا سکتیں۔ خطِ نستعلیق کی خوبصورتی اور مختصر نگاری سے کسکو انکار ہے اور اسکی یہی دونوں خوبیاں مجوزہ رسم الخط میں باقی رہتی ہیں اور ساتھ ہی یہ طریقہ نہایت آسان اور سہل الحصول ہو جاتا ہے۔ ترکوں نے عربی رسم الخط کو چھوڑ کر رومن رسم الخط کو اختیار کر لیا کیا ہمیں اتنا بھی حق حاصل نہیں کہ ہم اپنی چیز کو قائم رکھیں اور ساتھ ہی اسے آسان اور ترقی پسند بنالیں؟

برزخ

فکرِ جنّت ہے نہ تادیب کے شعلوں کا ہراس
شکر ہے کوئی تو دنیا ہے جہاں آج نہ کل
نیم مدہوشی تھپکتی ہے مری آنکھوں کو
ہلکے خوابوں سے ہوئی جاتی ہیں پلکیں بوجھل
ہر رگ و پے میں رچا جاتا ہے اک نیم گداز
دھڑکنیں گنگ ہیں اسوقت ابد ہے نہ ازل
آج بھی، اب بھی تھکی روح نہ کیوں سُکھ پائے
منّتیں موت کی مانیں تو یہ لمحے آئے
غمِ امروز بھی اندیشۂ فردا بھی مِٹا

آج ماضی کی بہاروں کا خیال آیا ہے
سامنے آئے ہیں بچپن کے طلسمی سپنے
اپنے ڈوبے ہوئے تاروں کا خیال آیا ہے
یاد آئی ہیں جوانی کی نشیلی گھڑیاں
بے اماں میکدہ زاروں کا خیال آیا ہے
پہلی چاہت نے بنائے تھے جہاں رنگ محل
اُن کٹھن راہ گزاروں کا خیال آیا ہے
جن کو ہم نے کبھی جینا، کبھی مرنا سمجھا
آج اُن جھوٹے سہاروں کا خیال آیا ہے
خیر — اب پاپ کٹا، دیکھئے کیا یاد آیا
دردِ ہستی کا مِٹا کیا کہ خدا یاد آیا!!

مختار صدیقی

امر سنگھ

الجھن

سرمئی تاریک آسمان پر روشنی کی فاسفورسی لکیریں عجیب و غریب اقلیدسی شکلیں بنا کر چکر کاٹنے لگیں۔ ان شکلوں میں سے سفیدے کے درخت کا مربع تنا ابھرنے لگا جس پر دو شاخیں بازوؤں کی طرح پھوٹ نکلیں۔ سرخ گلاب کے دو غنچے ان بازوؤں کے درمیان ہوا میں معلق جھومنے لگے۔ روشنی کے دائروں میں سے شعلے رسنے لگے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا۔ سفیدے کے درخت میں حرکت پیدا ہوئی اور شاخیں گول مول نرم ملائم اور پرانجیاب بازوؤں کی طرح اس کے گلے میں حمائل ہو گئیں۔ سرخ گلاب کے غنچے آہستہ آہستہ نیچے جھکنے لگے۔ اتنے نیچے جھکے کہ اسے ان کا ہوائی لمس اپنے ہونٹوں سے مس کرتا ہوا محسوس ہوا۔ اس لمس میں اسے عجیب مبہم سی لذت کا احساس ہونے لگا۔ ایسی لذت جو مبہم ہونے پر بھی غیر مبہم تھی۔ اس میں عجیب مٹھاس تھی، عجیب تلخی تھی، عجیب ترشی تھی۔ لیکن مٹھاس ہوتے ہوئے بھی وہ میٹھی نہ تھی۔ تلخی ہوتے ہوئے بھی تلخ نہ تھی۔ ترشی ہوتے ہوئے بھی ترش نہ تھی۔ وہ کچھ نہ تھی وہ سب کچھ تھی۔ اس میں ترشی بھی تھی تلخی بھی۔ اور مٹھاس بھی۔ اس میں شبنم کی خنکی بھی تھی اور کوئلوں کی حرارت بھی۔ وہ لمس، وہ کیفیت، وہ لذت قابلِ فہم تھی مگر ناقابلِ بیان۔ وہ صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔ اور ——— اور ——— بس ایک ہیبت ناک بڑے بڑے جبڑوں والا زنبور بڑھا اور سرخ گلاب کے غنچوں کو اپنے دانتوں میں دبا لیا۔ وہ غیر مرئی ہاتھوں سے زنبور کو کھینچ کر سرخ غنچوں کو اس طرح اس کے ہونٹوں سے جدا کر رہا جیسے نعل بند گھوڑے کے نعل تبدیل کرتے وقت پرانے نعل کی میخوں کو کھینچتے۔ اس کے ہونٹوں سے خون کے فوارے اچھل اچھل کر اس کی آنکھوں میں گرنے لگے۔ ہر طرف خون ہی خون پھیل گیا اور سفیدے کا تنا، گول گول بازو، اقلیدسی شکلیں، سرمئی آسمان سب اسی خون میں ڈوب کر تحلیل ہو گئے۔

وہ ایک بے صدا چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی میں سے اس نے دیکھا سورج طلوع ہونے کے قریب تھا۔ افق میں بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کثیر تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ اور ان کی وجہ سے شفق غیر معمولی طور پر سرخ ہو رہی تھی۔ شفق کے انعکاس نے سارے کمرے کو سرخ رنگ میں رنگ دیا تھا۔

وہ سوچنے لگا کہ اس خواب کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ سفیدے کے بازو اس کے گلے میں کیوں حمائل ہوتے اور وہ غنچے کیوں اس کے ہونٹوں کو چھونے لگے اور ان کے لمس میں جو لذت اور کیفیت اسے محسوس ہوئی اس کا پس منظر کیا تھا۔ لذت کا خیال آتے ہی اس نے سارے خواب کا تصور باندھنا شروع کیا۔ آہستہ آہستہ اسے سفیدے کے بازو کچھ آشنا سے معلوم ہونے لگے اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے یہ بازو کہیں دیکھے ضرور ہیں لیکن کہاں؟ کب؟ یہ اسے قطعاً یاد نہ آتا تھا۔ اس نے دماغ پر زور دینا شروع کیا۔ مگر بے فائدہ کچھ یاد نہ آیا اور اسے الجھن سی ہونے لگی۔

اس نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی۔ شفق کی سرخی نارنجی اور پھر گلابی ہو کر اب سنہری ہو چکی تھی۔ کمرہ اب شفق کے عکس کی بجائے سورج کی براہ راست روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ سنہری کرنیں عقبی دیوار میں لگی ہوئی الماری پر پڑ رہی تھیں جس سے الماری کے دھندلائے ہوئے شیشوں میں سے کارل مارکس، سگمنڈ فرائڈ اور دیگر فلاسفہ کی کتابیں کسی قدر واضح ہو کر نظر آنے لگی تھیں۔ فرائڈ کی کتابوں پر نظر پڑتے ہی اسے اپنے ذہن میں ایک کھونٹی سی لٹکتی محسوس ہوئی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے یہ کھونٹی نکال کر باہر پھینک دی۔

اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے وہ بازو انارکلی میں ایک بک شاپ سے نکلتی ہوئی عورت کے دیکھے تھے جن کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک گئی تھیں اور جب وہ لارنس گارڈن میں گھوم رہا تھا تو ایک سفیدے کے درخت کو دیکھ کر اس کی لطیف رنگت، اس کی ملائمت اور اس کی تراش نے اسے ان بازوؤں سے

تا سا معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے اِس خیال کو دماغ سے باہر نکال دیا تھا۔ عورت کا ذرا سا تخیل بھی اُسے گوارا نہ تھا۔

اور وہ غنچے اُس نے اپنی ننھیال فتح آباد میں دیکھے تھے، اُس گاؤں میں جہاں کبھی کسی نے گلاب کا پودا تک نہیں لگایا تھا۔ اُس نے سُرخ گلاب کے غنچے دیکھے تھے۔ یہ غنچے اُس نے چودھری ملا سنگھ کی لڑکی امرت کے ہونٹوں پر کھلتے دیکھے تھے لیکن معل شاپ والے بازوؤں اور امرت کے ہونٹوں میں کیا مناسبت ہو سکتی تھی۔ اور وہ پھر سر پکڑ کر سوچنے لگا۔ امرت کی شادی ہوئے بھی دو تین برس ہو گئے تھے اور گذشتہ تین چار برس میں اُسے کبھی اس کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ چار برس پیشتر دیکھی ہوئی امرت اور چند روز پیشتر دیکھے بازوؤں میں آخر کیا تعلق ہے وہ سنہرے کا تنا کیا ہے۔ اس پر شاخیں تو کچھ قابل فہم ہیں مگر اِن غنچوں کا کیا مطلب ——— اور اُس کے ذہن میں ایک لفظ گونجا ——— فرائڈ۔

وہ الماری کے قریب گیا۔ الماری کھولی اور ایک طرف لگی ہوئی فرائڈ کی تصنیفات کو انگلیوں سے گننا شروع کیا۔ جیسے اُن میں سے کوئی کتاب منتخب کرنا چاہتا ہے

ایک ہی ہیں ہیں ایں ایں مارا رمیں کسی گھوڑے کی ہنہناہٹ سُنائی دی۔ ساتھ ہی ٹاپوں کی آواز آئی وہ جلدی سے کھڑکی میں آ گیا۔ اُس نے دیکھا دور ایک گھوڑا بھاگا جا رہا ہے اور اُس کے تعاقب میں دو تین آدمی چلاتے ہوئے بھاگ رہے ہیں۔ سامنے نعلبند اپنے ہاتھ میں رسہ لئے کھڑا بھاگتے ہوئے گھوڑے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

زنبور پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اُٹھا۔ یہ نو نعلیہ دیسا ہی تھا جیسا اُس نے خواب میں دیکھا تھا۔ جس نے امرت کے غنچوں کو اُس کے ہونٹوں سے جُدا کیا تھا۔ اور اُسے پھر اُلجھن ہونے لگی۔

کھڑکی سے پیچھے ہٹ کر اُس نے اپنے آپ کو چارپائی پر گرا لیا۔ پھر جیسے کوئی کسی برتن میں چھوٹے چھوٹے کنکر ڈال کر خوب زور زور سے ہلانا شروع کر دے سفیدے کی شاخیں، گلاب کے غنچے، معل شاپ والی حسینہ کے بازو، امرت کے ہونٹ، اقلیدسی شکلیں، شبنم کی پھوار، دہکتے ہوئے کوئلے، نعلبند کا زنبور سب اُس کے ذہن میں کھنکنے لگے۔ اور اُس کے سر میں شدت سے درد ہونے لگا۔ اس درد، اس خواب، اِس اُلجھن سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ اُٹھا۔ سر کو زور سے جھٹک دیا۔ جیسے اِن سب چیزوں کو نکال کر پھینک دینا چاہتا تھا۔

کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ فرش پر نظر پڑتے ہی اُسے یاد آیا کہ کمرے کی صفائی کئے ہوئے ایک مدت گذر گئی ہے۔ فرش پر اس قدر گرد جمع ہو رہی تھی کہ کتابوں والی الماری کے قریب اُس کے پاؤں کے گہرے گہرے سُرخ نشان بن گئے تھے اور اُن نشانوں کے اِرد گرد سُرخ کنکریٹ کا فرش محض خاکی ہو کر رہ گیا تھا۔ میز پر بکھری ہوئی کتابیں، ٹیبل لیمپ کے شیڈ، طاقچے میں پڑے ہوئے آئینے، غرضیکہ ہر ایک چیز پر گرد ہی گرد کا دور دورہ تھا۔ کھونٹی سے ٹنگی ہوئی سفید قمیصیں جو یہ معلوم کرتے ہوئے اُس نے دھوبی سے دھلوا کر سوکھنے کے لئے لٹکائی تھیں گرد پڑ پڑ کر اس طرح ہو گئی تھیں جیسے بازار میں بہتے ہوئے بارش کے پانی میں بھگو کر نکالی ہوں

اِن سب چیزوں کا جائزہ لیتا ہوا وہ کونے کے قریب ایک چھوٹے سے طاقچے کے سامنے آ کر رُک گیا۔ طاقچے میں ایک چھوٹی سی گنیش کی مورتی پڑی تھی۔ یہ مورتی غالباً اُس کے پیشرو نے دیوالی کی پوجا کر کے اس طاقچے میں ہی رکھ چھوڑ دی تھی۔ اور جب یہ کمرہ خالی کر کے گیا تھا تو اُسے فضول سمجھ کر وہیں چھوڑ گیا تھا۔ دیوالی کی پوجا تو کبھی کی ختم ہو چکی تھی آج سے ڈیڑھ ماہ پیشتر جب اُس نے یہ کمرہ کرایہ پر لیا اُس روز سے آج تک پہلی اور آخری مرتبہ اس کمرے کی صفائی کی تھی تو اُس نے اِس مورتی کو اُٹھا کر پھینک دینا چاہا تھا مگر پھر نہ معلوم کسی خیال کے زیر اثر وہ پھینکتا پھینکتا رُک گیا تھا اُس دن سے آج تک یہ مورتی وہیں پڑی تھی اور اُسے کبھی اِس کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔

مورتی پر مکڑی نے گہرا جالا تن دیا تھا۔ لیکن مکڑی کا جالا گہرا ہونے پر بھی اس قدر گہرا نہ تھا کہ اُس میں سے گنیش کی مورتی دکھائی نہ دے سکے۔ وہ جالے کی تاروں کو الگ الگ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن کافی کوشش کے باوجود تاروں کے سرے تلاش نہ کر سکا۔ دراصل یہ تار ایک دوسرے میں اس قدر اُلجھ کر رہ گئے تھے کہ اُن کا آغاز و انجام معلوم کرنا نا ممکن نظر آتا تھا۔ اُس نے اُنگلی مار کر جالے کو توڑ ڈالا۔ جونہی اُسکی

آنکھوں نے ان تاروں کا لمس محسوس کیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا اور جلدی ہی انگلی دیوار سے رگڑ کر پونچھ ڈالی۔

پھر جب پیچھے مڑ کر اس نے کمرے پر طائرانہ نظر ڈالی تو اس کا ارادہ پختہ ہو گیا کہ آج اس کمرے کی صفائی کر ہی دینی چاہئے۔ دراصل یہ شوہر اس نے وقت گذارنے اور ساتھ ساتھ اس حواب دہ ملی ذہنی الجھن سے نجات حاصل کرنے کے لئے سوچی تھی۔

دور کسی فیکٹری میں گھگو سی۔ تو وہ اس وقت ہاتھ دھو کر کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کی طبیعت بالکل ہلکی ہو چکی تھی۔ اور جسم میں ایک لطیف سی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ ذہن بالکل پرسکون ہو چکا تھا کمرے میں جہاں ایک گھبراہٹ سی تھی اور ایک ہیجان کی سی فضا تھی۔ اب بالکل سکوت تھا اور ایک چیز اپنی صحیح جگہ اور صحیح حالت میں چمک رہی تھی۔

گھگو کی آواز سن کر اسے بھوک محسوس ہونے لگی ایک بج گیا تھا۔ اور ابھی تک اس نے پانی تک نہ پیا تھا۔ انارکلی تک جاتے جاتے اسے اڑھائی بج جائیں گے۔ یہاں سے دو میل سے کم فاصلہ نہ ہو گا۔ اس علاقے میں کوئی اچھا ہوٹل نہ تھا۔ ایک آدھ ہوٹل تھا جہاں سے اس قدر ناقص خوراک ملتی تھی۔ جو انسانوں کے کھانے کے ناقابل تھی۔ اسکی سبزی سے تو گھاس بھی بہتر تھی۔ اس لئے وہ کھانا کھانے انارکلی جایا کرتا تھا۔ اور آج وہاں تک جاتے جاتے تو بھوک بالکل مر جائے گی اس نے سوچا کہ آج فاقہ کرنا چاہئے کبھی کبھی فاقہ کرنا صحت کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج دوپہر کا کھانا نہیں کھائے گا صرف دودھ پئے گا۔

اس نے جلدی سے کنگھی سے بال سلجھے گئے۔ کمرے کو تالا لگایا اور چوک میں حلوائی کی دوکان پر آ گیا۔ اس علاقہ میں ایک ہی حلوائی کی دوکان تھی اس کے ساتھ ہی ایک پنواڑی کی دوکان تھی جس نے پان سگریٹ کے ساتھ ساتھ سوڈا اور گھٹیا قسم کے شربت کی بوتلیں اور چند ایک اخبار بھی رکھ چھوڑے تھے۔ اس نے حلوائی سے دودھ کا گلاس لیا اور وہیں بازار میں کھڑے ہو کر گھونٹ گھونٹ پینے لگا اس کے ساتھ ہی وہ غیر ارادی طور پر پنواڑی کی دوکان پر سجے چوکھٹے میں رنگین پانی سے بھری ہوئی بوتلوں کو دیکھنے لگا۔

"ادھر آ جائیے بابو جی!" اس نے چونک کر دیکھا پنواڑی کی دوکان پر گوکل لوہے کی کرسی پر سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اسے اپنی جگہ پر بیٹھنے کی دعوت دے رہا تھا۔

"نہیں نہیں بالکل ٹھیک ہے مجھے بیٹھنے کی ضرورت نہیں" اس نے تھوڑا سا مسکراتے ہوئے کہا۔ اور دودھ کا ایک گرم گرم گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا اس کی رگوں میں ایک گرم سی رو دوڑنے لگی۔

اگرچہ اسے اس آبادی میں آئے صرف ڈیڑھ مہینہ گذرا تھا مگر اسے گوکل کی بابت پوری طرح علم ہو گیا تھا کہ وہ اس علاقے میں رہنے والے جنسی فاقہ کشوں کے لئے خوراک مہیا کرتا ہے گوکل کے گاہکوں کی اکثریت اس کی اپنی طرح کے لڑکوں کی تھی جو حصول تعلیم کے لئے اس شہر میں وارد ہوئے تھے اور گھروں سے دور تنہائی اذیت دہ اور تنہائی کی زندگی کو عارضی طور پر گوکل کی مدد سے رنگین بنا لیتے تھے۔ جیسے بطخ کی چونچ جوہڑ کے پانی میں سے اپنی خوراک ڈھونڈ لیتی ہے ویسے ہی گوکل کی نگاہ مردوں اور عورتوں کی بھیڑ میں سے اپنے گاہکوں کو ڈھونڈ نکالتی تھی جس روز سے اس کی آمد کی اطلاع ملی تھی اس کی پیشہ ورانہ آنکھوں نے اسے اسی دن سے تاڑ لیا تھا۔ اب اسکے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ کس طرح اپنے شکار کو پھانسے۔

گوکل نے کئی بار اس سے بول چال پیدا کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہر بار اس نے اسے نہایت روکھے پھیکے جواب دے کر ٹال دیا تھا مگر آج جب گوکل نے اسے کرسی پیش کی تو بے شک اس نے اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ مگر جواب دیتے وقت نہ معلوم اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ کیوں پیدا ہو گئی تھی۔ اسی کی مسکراہٹ نے گوکل کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پیدا کر دی تھی۔

دودھ ختم ہو چکا تھا اس نے خالی گلاس بجھی ہوئی بھٹی کے سوراخ کے قریب بازار میں رکھ دیا۔ اور پھر پنواڑی کی دوکان پر آ گیا ایک سگریٹ خریدا اور اسکے سرورق پر وہیں کھڑے کھڑے سرسری نظر دوڑانے لگا۔

"کیا حال ہے بابو جی؟" اس نے مڑ کر دیکھا۔ گوکل اس کے ساتھ سلسلۂ کلام شروع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اچھا ہے" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ مگر اس کے

ہونٹوں پر پھر ایک مسکراہٹ پیدا ہوگئی۔ یہ مسکراہٹ دیکھ کر گوکل کی آنکھیں قدرے چمکیں اور پھر اپنی اصلی حالت پر آگئیں۔

جب وہ سینما دیکھ کر لوٹا تو گیارہ بج چکے تھے۔ چوک اس وقت بالکل سنسان تھا۔ حلوائی کی دوکان بند تھی۔ صرف پنواڑی کی دوکان کھلی تھی۔ اور اس کے سامنے گوکل لوہے کی کرسی پر پاؤں کے بل بیٹھا تھا گوکل کو دیکھکر اس کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اور دوسرے لمحے وہ پنواڑی کی دوکان پر پہنچ کر سگریٹ خریدنے لگا سگریٹ لیتے وقت اس نے گوکل سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

"کیوں بھئی گوکل ... ہے؟"

"اچھا ہے بابو جی" گوکل کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہوئی، اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ لیکن وہ کرسی پر سے اٹھا اور لاپرواہی سے تھوڑی دور جاکر ایک مکان کے سائے میں گم ہوگیا۔ پرکاش کے دل میں مایوسی سی پیدا ہوگئی۔ اس نے سگریٹ کی قیمت ادا کی اور چل دیا۔ جب وہ اس مکان کے قریب پہنچا جس کے سائے کی تاریکی میں گوکل گم ہوگیا تھا۔ تو اس نے اسے وہیں کھڑے پایا "تم یہاں کھڑے ہو گوکل؟" پرکاش نے اس سے پوچھا "وہاں سے تو اٹھ کر چلے آئے تھے۔"

کوئی دس منٹ بعد وہ اس تاریکی میں سے نکلا اور اپنے کمرے میں جاکر ... کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں دروازے پر دستک سنائی دی اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا ٹیبل لمپ کی ہلکی روشنی میں اسے دو چہرے دکھائی دیئے۔ ایک ان میں سے گوکل کا تھا اور دوسرا قطعی ناآشنا۔ گوکل پھر سیڑھیوں کی تاریکی میں غائب ہوگیا اور وہ ناآشنا چہرہ کمرے میں آگیا۔ پرکاش کا ہاتھ پکڑ کر ٹیبل لیمپ کے نزدیک آگیا۔ جس کے قریب ہی اس کی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ ٹیبل لمپ کی روشنی جس وقت اچھی طرح اس کے چہرے پر پڑی تو پرکاش کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ چہرہ ناآشنا نہیں ہے وہ مدت سے جانتا ہے۔ اس کی روح، اس کا دل اسے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لمپ کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں ایک سرخی سی تاریکی چھا گئی۔ اس تاریکی میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے سفیدے کی شاخیں سرخ گلاب کے غنچے۔ دو دل شکن بازو اور حسرت کے ہونٹ شبنم کی خنکی اور کونپلوں کی حرارت سب یکجا ہوکر ایک لطیف لمس کی طرح اس کے عضو عضو میں رچ گئی ہے۔ اس کی روح میں اتر گئی ہے۔ اور اس پر ایک مدہوشی سی طاری ہوگئی۔

شفق کی روشنی نے سارے کمرے کو سرخ رنگ میں رنگ دیا تھا۔ جیسے خون کے فوارے اچھل رہے تھے۔ اس نے رات والے ناآشنا مگر آشنا چہرے کو ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے کمرے سے رخصت کیا تھا اور اس وقت چارپائی پر بیٹھا عجیب الجھن میں گرفتار تھا وہ سوچ رہا تھا کہ رات کو اس کے اعصاب پر عورت سوار تھی یا فرائڈ ——

ساحلی

گل و بلبل

تذکرۂ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

(حالی)

یہی حالی ہیں جنہوں نے پرانے رنگ کی شاعری کے خلاف سب سے پہلے احتجاج بلند کی اور نئی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ 'حبِ وطن' 'برکھا رت' جیسی نظمیں لکھیں جن میں انگریزی شاعری کی تقلید کی کوشش کی لیکن اگر آپ ان کا دیوان اٹھا کر دیکھیں تو اس میں وہی بیشتر بلبل کا فسانہ، وہی صیاد کے مظالم وہی عاشقوں کی سرگذشت اور معشوقوں کی بے اعتنائی نظر آئے گی۔ اور کچھ ایسے لطف سے بیان کی ہیں کہ آپ شکایت نہیں کرتے۔ برخلاف اس کے 'برکھا رت' اور 'حبِ وطن' میں شاعری کم ہے، اور درسیات زیادہ۔ شاید اسی لئے یہ نظمیں ہمیشہ اسکولوں کے کورس میں داخل رہتی ہیں۔

اسی طرح محمد حسین آزاد نے بھی چند نظمیں اسی نمونے پر لکھی ہیں۔ لیکن آبِ حیات کا دریا بہانے والے کی زبان سے وہ پھیکی معلوم ہوتی ہیں اور ان کا اصلی رنگ یہی دوسرا ہے۔

دن ہجر و وصلِ یار کے ڈھلتے چلے گئے
عالم کے رنگ تھے کہ بدلتے چلے گئے

اگر آپ عملی زندگی کے نقطۂ نظر سے دیکھیں اور جس طرح صبح سے شام تک اپنے دفتر میں کام کرتے ہیں یا کچہری میں مقدمہ کی پیروی کرتے ہیں۔ یا لیبارٹری میں کیمیاوی تحقیقات میں مشغول رہا کرتے ہیں تو آپ کو یہ شعر کیا، دیوان کے دیوان مہمل معلوم ہوں گے۔ وہ انسان جس کی زندگی صرف دو ہی حصوں میں منقسم ہو سکے۔ 'وصلِ یار کے دن' اور 'ہجرِ یار کے دن' یا پاگل ہوگا یا اوباش۔ کوئی معقول دنیادار انسان ایسا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن دنیادار انسان بھی کبھی نہ کبھی وقت دنیاداری سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں حسن و جمال کو ڈھونڈھتی ہیں کبھی بہار کے لئے اور کبھی خزاں کی بے بسی اس پر اپنا پورا اثر کرتی ہے۔ شاید کسی وقت آپ ضرور محسوس کرتے ہوں گے کہ اصل زندگی صرف دو ہی حصوں پر مشتمل ہے ایک وصلِ یار کے دن اور دوسرے ہجرِ یار کے۔ باقی یہ دفتر کے کام، عدالت، کچہری کی مثلیں، آٹے دال کا بھاؤ، کارخانوں کا شور، ان کے دھوئیں یہ سب اصل میں بہت مکدر ہیں۔ جس وقت غالب نے یہ شعر کہا ہوگا۔

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

اس درد دل سے ایک آہ نکلی ہوگی۔

ایسا آہ اں نہیں ہو رہا۔ دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

لیکن عاشق اور شاعر بھی دنیا سے علیحدہ نہیں رہ سکتے۔ اور اکثر اوقات جب وہ بہار اور خزاں کا ذکر کرتے ہیں تو محض زندگی کے اچھے دن اور برے دن، خوشی کے دن اور رنج کے دن مقصود ہوتے ہیں۔ ظالم، ہمیشہ معشوق ہی نہیں ہوتا بلکہ اکثر ہٹلر اور مسولینی جیسے چھوٹے اور بڑے دنیا کے جیتے جاگتے ظالم ہی مقصود ہوتے ہیں۔ اسی طرح قفس سے صرف قید خانہ نہیں اور بیڑیوں سے محض لوہے کی بیڑیاں نہیں۔ بلکہ دنیا کی تمام مجبوریاں جن کے سامنے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ ناکامی کا فلسفہ میر تقی میر سے سنیئے۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

اسی طرح 'گل و بلبل'، 'ہجر و وصال'، 'رقیب و ہم نشیں'، 'خزاں و بہار'، 'قفس و آشیاں'، 'عاشق و معشوق' کی باتوں کے پردہ میں ہمارے شاعر زندگی کا گیت گاتے تھے۔ میر و غالب کے دیوان میں آپ کو اس کی صدہا مثالیں ملیں گی اور دوسروں کے یہاں بھی کم و بیش۔ یہ لوگ فطرت سے دور نہیں تھے لیکن فطرت کو تخیل کا رنگا رنگ جامہ پہنا رکھا تھا۔ شاعر اور مصور کا کام یہ ہے کہ فطرت اور زندگی کو ایک ایسے انداز سے پیش کریں

اُن کے خدوخال نمایاں ہو جائیں۔ جذباتی اور خیالی دُنیا جو ہر شخص کی نگاہ کے سامنے نہیں ہے وہ بھی ظاہر ہو۔

اُردو شاعری کی عمر دو سو سال ہے۔ ملک اور قوم کی تاریخ کے اس قلیل عرصہ میں اُس نے حیرت انگیز ترقی کی۔ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کے تباہ ہونے کے بعد محمد شاہی عہد میں اس نے پرورش پائی۔ عروج اور زوال دونوں خاتمہ کو پہونچ چکے تھے۔ قوم کو تباہی کا احساس تھا۔ ایسی حالت میں دل نرم ہو جاتے ہیں اور احساسات تیز۔ یہی میرؔ اور سوداؔ۔ مومنؔ اور آتشؔ جیسے جلیل القدر شاعر پیدا ہوئے۔ سوداؔ کے مخمس شہر آشوب میں سے ایک بند آپ کو یاد دلاتا ہوں۔ جس سے اس زمانہ کے لوگوں کی ذہنی اور قلبی کیفیات ظاہر ہوں گی۔

جہاں آباد تو کب اِس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

حکومت نہ رہی اور حکومت کرنے والے رہ گئے ایسی صورت میں دل بہلانے کا ہر ذریعہ اختیار کیا گیا۔ جس طرح لوگوں نے پتنگ بازی۔ شطرنج۔ کبوتر بازی اور بٹیر لڑانے میں شغف پیدا کیا اسی طرح ہر وہ شخص جو دو مصرعے موزوں کر لیتا تھا اُس نے شاعری اختیار کر لی۔ مشاعرے گلی گلی ہوتے تھے۔ اُستاد موجود تھے۔ جو ہر جاہل گنوار کو شاعر بنانے کے لئے تیار تھے۔ ہزارہا شاعر بن گئے اور یہی وجہ اُردو شاعری کی بدنامی کی ہوئی۔

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

مشاعرے اور اُستادی شاگردی کا سلسلہ اُردو شاعری کی خصوصیات ہیں جو اور کہیں نظر نہیں آتی ہیں۔ اس سے فائدہ تو یہ ہوا کہ زبان نے ترقی کی۔ اچھی اور پاکیزہ اُردو دہلی اور لکھنؤ اور چند دوسرے مقامات پر جہاں یہی حالات تھے ہر خاص و عام میں رائج ہو گئی۔ اِن شہروں کے گلی کوچوں میں ادنیٰ سے مرد عورت اور بچے کی زبان میں وہ لوچ اور شیرینی پائی جاتی تھی جو دوسرے ممالک اور دوسری قوموں کے ان طبقوں کی زبانیں بالکل مفقود تھیں۔ اور اس لحاظ سے اُردو زبان کو عام بولی سے دوسری زبانوں کے مقابلے میں بڑی ترقی کی۔ مگر شاعری کو اس سے نقصان ہوا۔ اور وہ پستی کی طرف مائل ہو گئی۔

اکثر اُستادوں نے شاگردوں کو اپنے ہی رنگ میں ڈھال دیا اور اُن کے فطری رجحان مارے گئے۔ لیکن دیکھئے ذوقؔ کو۔ فطری شاعر تو وہ نہ تھے لیکن اُستاد اس پایہ کے تھے کہ ظفرؔ اور داغؔ کو اپنے سے مختلف رنگوں میں اُستاد بنا گئے۔ پُرانے رنگ کی ٹھیٹ عاشقانہ شاعری اب ذرا مصنوعی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ وہ زمانہ ہی بالکل مختلف تھا۔ رسم و رواج دوسرے تھے مرد و عورت میں شادی کے علاوہ اور کوئی برابری کا رشتہ نہ تھا اس لئے جو لوگ جذباتی اور سچے عشق کی طرف مائل تھے اُن کو میر تقی میرؔ کی طرح ہمیشہ مایوس حسرت۔ ہجر و ناکامی کا رونا رہتا تھا۔ اور جو یہ سب برداشت کرنے کے لائق نہ تھے۔ وہ جرأتؔ۔ داغؔ اور امیرؔ کی طرح بازاری عشق کی شاعری میں پڑ گئے۔ مومنؔ کے یہاں کم و بیش دونوں رنگ جھلکتے ہیں۔ بہت سے عشقیہ شاعر ایسے بھی تھے جن کو اپنی زندگی میں ان جذبات کا کوئی ذاتی تجربہ ہونے کا موقع ہی نہ تھا۔ اس لئے اُن کے مضامین بالکل خیالی اور اس حد تک واقعی مصنوعی ہیں۔

دُنیا کی سب سے بلند عشقیہ داستانیں ہمیشہ ناکامی پر ختم ہوتی رہی ہیں اس کی مثالیں یونانی عہد سے لے کر انگلستان تک ملتی ہیں۔ اور یہ صرف مشرق ہی سے مخصوص نہیں ہیں اس لئے باوجود اس کے کہ ہمارے تہذیب اور تمدن میں رسمی عاشقی قریب قریب مفقود تھی۔ عاشقانہ شاعری بلند درجہ کی پائی جاتی ہے۔

اُردو شاعری پر شاہی درباروں سے بھی زیادہ صوفیائے کرام کے درباروں کا اثر پڑا ہے۔ امیر خسرو کے زمانے سے لے کر بہادر شاہ ظفرؔ تک یہ خصوصیت مستقل طور پر نظر آتی ہے اور اس سے اُردو شاعری کا ایک بڑا جزو صوفیانہ فلسفہ قناعت و استغنا دُنیا کی بے ثباتی۔ روحانی زندگی کی عظمت اور اس قسم کے دوسرے مضامین پر مشتمل ہے۔ بعض بعض شعرا تو بالکل اس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مثلاً خواجہ میر دردؔ (جو سجادہ نشین بھی تھے) خواجہ آتشؔ نظیر اکبر آبادی اور بہادر شاہ ظفرؔ۔ ملک کی تباہی اور قوم کی بے بسی نے اِس رنگ کو اور چمکا دیا تھا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ اُردو شاعری کا عشق اکثر غیر فطری ہوتا ہے یعنی معشوق کا صنف نازک سے ہونا ضروری نہیں۔ یہ ایک

یہ تک صحیح ہے اور یہ ایرانی مذاق، فارسی شاعری کی دوسری خصوصیات
کے ساتھ اُردو شاعری میں داخل ہوا۔ مغرب میں اس ایرانی مذاق
کا نام یونانی مذاق ہے۔ ایران اور یونان سے قدیمی تاریخی تعلق
ہے۔ اور بہت ممکن ہے ایک ملک سے دوسرے ملک پر اس کا اثر
ہو۔ ہمارے بعض نقاد جس طرح اس رواج کے اخلاقی
پہلو پر اپنے قلم کی زور آزمائی کرتے ہیں وہ خود قابلِ اعتراض ہے
کیونکہ وہ ناصح کا رویہ اختیار کر لیتے ہیں۔

یہ بیان بحث کا محتاج نہیں کہ یہ یونانی یا ایرانی مذاق
تمام دنیا میں آج تک رائج ہے۔ جرمنی میں اور انگلستان
میں بھی پایا جاتا ہے یہ بحث شاعری کے دائرے سے دور جا
پڑے گی اس لئے اس کو ہم یہیں پر چھوڑتے ہیں لیکن اتنا
کہہ دینا ضروری ہے کہ یہ مذاق اُردو شعر میں عام نہیں کہا
جاتا زیادہ تر اُن کے یہاں معشوق عورت ہی ہے اور
اُن کے لئے صیغۂ تذکیر کا استعمال محض ایک رسمِ بیان ہے
کیونکہ وہ تشبیہوں کا ذکر یوں ہی کرتے تھے۔

پرانے رنگ کی اُردو شاعری میں نیچرل مضامین یعنی
مناظرِ قدرت۔ پہاڑ دریا سمندر جنگل سبزہ زار۔ چڑیاں
جانور، موسموں کی تبدیلیاں بہت ہی کم پائے جاتے ہیں تو
ہیں مثلاً بہار و خزاں وہ ایران سے آئے ہیں میر حسن کی مثنوی
اور میر انیس کے مرثیوں میں بڑے طولانی بیان مناظرِ قدرت کے
متعلق موجود ہیں لیکن وہ زیادہ تر مصنوعی ہیں یک خیالی اور
خیالی دنیا کی تصویریں ہیں بعض خاص مضامین کے مثلاً چاندنی
رات کا بیان، یا گرمی کا ذکر۔ اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔
وہ یہ کہ ہندوستان کا کلچر ادب اور شاعری ایک عرصۂ دراز
سے صرف شہروں سے تعلق رکھتے آئے ہیں۔ اکثر شعرا نے شاید
شہر کے چھوٹے چھوٹے باغیچوں اور اُن کے قدرتی مناظر کے
سوا کچھ بھی نہیں دیکھا جنگل پہاڑ اور سمندر تو حقیقت
دور تھے۔ اِن کی پوری زندگی شہر کی گلیوں اور حویلیوں میں
گزرتی تھی البتہ انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کرتے تھے اور
اُس دنیا کی بہت کم خصوصیات اُن سے چھوٹی ہیں۔

اُردو شاعری اٹھارویں صدی کی [illegible] اگر آپ
اس کا مقابلہ سترھویں صدی کی انگریزی شاعری سے کریں تو
تعجب انگیز مناسبت نظر آئے گی۔ خصوصاً ڈرائڈن اور سودا تو
بالکل ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور ان دونوں
کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک دلچسپ مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ افسوس
ہے کہ زرّیں عہدِ اکبری میں اُردو زبان شاعری پر قدرت نہ رکھتی
تھی۔ اور ہندی جو اُس زمانے کی بول چال اور اُردو کا پیش خیمہ
تھی وہ کسی دوسرے راستے ہی پر چل کھڑی ہوئی۔ ورنہ کیا تعجب
کہ اُس زمانے میں یہاں بھی کوئی شیکسپیئر پیدا ہو جاتا۔ انگریزی
شاعری میں اُنیسویں صدی میں ایک دوسرا رنگین دور شروع
ہوا۔ لیکن ہندوستان میں یہ زمانہ تباہی اور بربادی کا تھا۔
اور اس لئے اُردو شاعری جہاں اٹھارویں صدی میں تھی
اُس سے آگے نہ بڑھی۔ بیسویں صدی کی دنیا میں ہندوستان
مغربی رجحانات کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ اور اب ہماری
شاعری میں انقلاب کی لہر دوڑ رہی ہے۔ صرف ہندوستان
ہی کیا ساری دنیا میں اب رومانی شاعری کا دور ختم ہو گیا
ہے۔ گل و بلبل کی داستانوں سے کھیلنے کی فرصت کسے۔
رنگین بیانی اور نازک خیالی سے لوگ تنگ آ گئے ہیں بلبل
کے نالوں کی جگہ بھوکوں کی فریاد سنائی دیتی ہے بہلاوے
کی شاعری سننے کے لئے صبر نہیں۔ اس طرح نیا ادب ظہور میں
آ رہا ہے لیکن کوئی تعجب نہیں اگر آئندہ پھر اطمینان اور سکون
کا زمانہ آئے اور بجائے جھوٹے بہلاوے کے سچی رومانی شاعری
کا عروج ہو۔

بلونت گارگی

دو نظریے

(اندر اور گیان میز پر آمنے سامنے بیٹھے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ جب بروہ اُٹھتا ہے تو اُنکی آوازیں بلند ہیں، جیسے وہ کسی بات پر بحث کر رہے ہوں)

اندر:- بھئی مجھے تم سے بالکل اتفاق نہیں

گیان:- کیوں؟

اندر:- تم عورت کی محبت ہی کو سب کچھ سمجھے بیٹھے ہو۔

گیان:- اگر عورت کی محبت سب کچھ نہیں تو کچھ تو ضرور ہے۔

اندر:- میری رائے پوچھو تو کچھ بھی نہیں

گیان:- آج تک سب آرٹسٹ عورت کے حُسن کی تعریف کرتے رہے ہیں عورت کی پُراسرار شخصیت اور اُس کی بے بہا محبت کی۔

اندر:- عورت کی محبت! اوہ ـــــ دُور سے جھاگ کی طرح خوبصورت اور نرم۔ لیکن مجبور تو جاؤ ـــــ محض جھاگ۔ یعنی کچھ بھی نہیں۔

گیان:- تو کیا جھاگ کی کوئی اصلیت نہیں؟ لہروں کی بے ثباتی ہی تو اُن کا حُسن ہے۔ تمہارا یہ نظریہ کہ کنجوس سیٹھ کی طرح ہر چیز کو مٹھی میں دبا لیا جائے بہت بیہودہ ہے سراسر لغو۔ لیکن عورت ـــــ

اندر:- بس عورت کا نام سُنا اور تمہارا شاعر بھڑک اُٹھا گھٹنوں بولتے نہیں تھکیں گے۔ یہی تو ہمارے آج کل کے ادیبوں میں عیب ہے۔ جہاں عورت دیکھی وہیں چپک گئے۔ عورت ـــــ شیکسپئیر کا یہ خیال کتنا ٹھیک ہے۔

"اے کمزوری تیرا نام عورت ہے!"

گیان:- اچھا۔ تو پھر تم کس چیز کو سب سے افضل سمجھتے ہو۔

اندر:- روپے کو۔

گیان:- ایسی باتیں کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تم ایک ادیب ہو۔ آج تک ہر ادیب نے روپے کی مذمت کی ہے۔

اندر:- اِس لئے کہ وہ بھوکوں مرتے تھے۔ مذمت نہ کرتے تو زندہ کیسے رہتے۔ اُن کو روپے کی بے حد ضرورت تھی۔ اسی لئے وہ روپے کی بُرائی کرتے کرتے مر گئے۔ ہر ادیب ہمیشہ اُس چیز کی مذمت کرتا ہے جو اُس کی پہنچ سے باہر ہو۔

گیان:- تمہارا یہ خیال بہت بورژوائی ہے۔ تمہیں تھوڑا سا کمونسٹ لٹریچر پڑھنا چاہیئے۔

اندر:- میں نے بہت پڑھا۔ وہ سب کتابیں جو تم آجکل پڑھتے ہو میں اُن دنوں ختم کر چکا جب تم الف لیلےٰ اور علی بابا کے قصّے پڑھا کرتے تھے۔

گیان:- ہوں۔ تو پھر آجکل تم روپیہ کمانے کی دُھن میں ہو

اندر:- ہاں۔

گیان:- اسی لئے تو تم کام کی کوئی چیز نہیں لکھ سکتے۔

اندر:- لکھنے کے لئے بھوکا مرنا شرط نہیں۔ فاقہ مست ادیبوں کی تحریر سے ہمیشہ فاقہ اور بھوک ٹپکتی ہے۔

گیان:- (دلچسپی سے) آجکل تمہارے پاس کتنی ٹیوشنیں ہیں؟

اندر:- تین۔

گیان:- تین؟

اندر:- ہاں۔

گیان:- کتنے روپے کما لیتے ہو؟

اندر:- دو سو۔

گیان:- اور پھر پیٹ پر ہاتھ پھیر کر مزے سے سو جاتے ہو۔

اندر:- نہیں لکھتا بھی ہوں۔

گیان:- میاں کہانی لکھنا اور ٹیوشن کرنا۔ ان میں اتنی ہی نسبت ہے جتنی بھاڑ جھونکنے اور گانے میں۔

اندر:- تمہارے ذہن پر تو عورت سوار ہے۔ اس کے سوا تمہیں کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ میرا خیال ہے پیسوں کے لئے لکھنا بُرا نہیں اور اگر بُرا بھی ہے تو اتنا ہی جتنا کسی لڑکی کا دل جیتنے کے لئے لکھنا۔ لڑکی کے تصوّر کو اس طرح اپنے دل سے چمٹائے رکھنا بھی مجبوری ہے ـــــ اگر مجھے لڑکی کی محبت اور سو روپوں میں سے ایک کو چُننا ہو تو میں سو روپے چُنوں

گیان:- یہودی!

اندر:- یہ فقرہ کسی مغربی ادیب کی نقل ہے ہمارے ملک میں یہودی ایسے کنجوس نہیں جتنے ہمارے ادیب۔

گیان:- تم بھی ادیب ہو۔ شاید اسی لیے روپے پر جان دیتے ہو۔

اندر:- روپیہ اتنی سستی چیز نہیں جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے

گیان:- یہ کس نے کہا کہ میں روپے کو سستا سمجھتا ہوں۔

اندر:- اچھا تو تمہیں کونسی چیز سب سے زیادہ عزیز ہے۔؟

گیان: دو چیزیں

اندر:- وہ کیا۔؟

گیان:- موسیقی اور عورت۔

اندر:- یہ دونوں عورتوں کی باتیں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں تم اس کے علاوہ کچھ بھی چاہتے ہو؟

گیان:- تو کیا عورت کی محبت کچھ نہیں؟ تم اسے کچھ بھی نہیں سمجھتے؟

اندر:- گھنٹہ بھر سے عورت کی محبت کا راگ الاپ رہے ہو۔ میں کہتا ہوں شاعر کے کھوکھلے دماغ کے سوا عورت کی محبت کہاں ہے؟ میں نے تو کہیں نہیں دیکھی۔

گیان:- تم نے عورت دیکھی ہے؟

اندر:- دیکھی ہے۔ لیکن عورت سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی

گیان:- مطلب؟

اندر:- مطلب یہ کہ مجھے عورت کی قربت کا موقعہ کبھی نہیں ملا میں نے اُسے دُور سے دیکھا ہے جیسے کوئی سنہری مچھلی کو شیشے کے مرتبان میں دیکھ لے دیکھتا ہیں۔

گیان:- اُسے چھونے کا نہیں موقعہ ہی کب ملا ہے؟ دن رات تو تم روپیہ کمانے کی فکر میں ڈوبے رہتے ہو۔

اندر:- روپیہ — ہاں میں روپیہ کماتا ہوں۔ لیکن کئی مرتبہ میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ میں روپیہ کیوں کماتا ہوں میں ایک ادیب ہوں۔ میں کیوں زندہ ہوں؟ کیوں؟؟ میرے بال ایک ایک کر کے سفید ہو چلے۔ آہ۔ کئی بار میں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ میں روپیہ کیوں کماتا ہوں۔

گیان:- تمہارے کانوں کے پیچھے بالوں کا یہ گچھا بالکل سفید ہو چلا ہے۔

اندر:- ہاں۔ میرے سر کے بال بہت سے سفید ہیں۔ لیکن میں کیا کروں اس احساس سے کہ میں بڈھا ہو چلا ہوں میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ پھر میں عورت کے خیال سے بھاگ کر سوچتا ہوں کہ اسے آپ کو روپیہ کمانے اور ڈرامے لکھنے میں غرق کر دوں

گیان:- تمہاری عمر کیا ہے؟

اندر:- اڑتیس سال۔

گیان:- صرف؟

اندر:- ہاں۔

گیان:- اور تمہارے بال سفید ہو چلے۔

اندر:- میں اسے زندگی کی سب سے بڑی شکست سمجھتا ہوں۔ میری زندگی ایک بہت بڑی خلا ہے — اس میں کبھی کوئی لڑکی نہیں آئی — اُف — اف!!!

گیان:- تمہیں اس بات کا دُکھ ہے؟

اندر:- بے حد — بے شک میں لڑکیوں کی مذمت کرتا ہوں لیکن چلو چھوڑو ان باتوں کو — باتوں میں کیا رکھا ہے میں بھی لوگ ایسی باتیں بنے بیٹھا ہوں — دراصل بات یہ ہے کہ لڑکی کہیں ملتی ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں لڑکیوں کی باتیں نہیں کرتا۔ مفت کی دل سوزی — حاصل کرنے سے حاصل؟ لڑکی کی محبت نہیں بھی نہیں۔ یہ محض کتابی باتیں ہیں۔ (ٹھہر کر) اچھا تمہیں لڑکی کی سچی محبت پر یقین ہے؟

گیان:- محبت سچ اور جھوٹ کا مطلب میں نہیں سمجھتا محبت محبت ہے جیسے یہ کرسی کرسی ہے اور بس۔ بھلا اس کرسی کا سچ اور جھوٹ کیا ہے؟

اندر:- میرا مطلب بناوٹی محبت سے ہے۔ بناوٹی۔

گیان:- یعنی ہماری بہت سی چیزوں کی اصلیت اس وہم اور بناوٹ پر قائم ہے۔ ہم اس وہم کے آسرے ہی تو جیتے ہیں۔ محبت ہمیشہ بناوٹ پر ملتی ہے۔ اگر اس میں ایک دوسرے کی اصلیت کا پتہ چل جائے تو ہم دونوں بھی ایک دوسرے سے پیار نہ کر سکیں۔ یہ سراب محبت کی اصلیت ہے۔ زندگی خود ایک سراب ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ سراب ایک بہت خوبصورت چیز ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

اندر:- زندگی میں صرف ایک مرتبہ مجھے لڑکی سے محبت کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ لڑکی میرے ڈرامے پڑھ کر ایک بعد مجھ

سے ملنے چلی آئی۔ ..

(بیک گراؤنڈ میں ہلکی سی ستار کی دُھن، اسٹیج پر اندھیرا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جب ہلکی نیلگوں روشنی پھیل جاتی ہے تو اِندر اکیلا ہی کُرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔ میز پر کاغذ بکھرے ہوئے ہیں۔ بائیں طرف سے ایک لڑکی داخل ہوتی ہے۔)

لڑکی:- میں ـــــ یونہی آپ سے ملنے چلی آئی

اِندر:- بیٹھئے۔

لڑکی:- بیٹھو نگی ہیں۔ اور بیٹھوں بھی تو کہاں آپ کے پاس ایک ہی تو کُرسی ہے جس پر آپ بیٹھے ہیں۔

اِندر:- مجھے افسوس ہے کہ ـــــ

لڑکی:- یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیا لکھ رہے ہیں آپ؟

اِندر:- نیا ڈرامہ۔

لڑکی:- کس لئے؟

اِندر:- کس لئے ـــ؟ خوب بھلا ڈرامہ لکھنے کی کیا وجہ ہوگی؟

لڑکی:- ہر چیز کی وجہ ہوتی ہے۔

اِندر:- اچھا تو بتلایئے آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟

لڑکی:- آپ سے یہ کہنے کہ آپ ڈرامے نہ لکھا کریں۔

اِندر:- میرے ڈرامے کیا آپ کو ناگوار گزرتے ہیں۔؟

لڑکی:- نہیں۔ اگر ناگوار گزرتے تو میں آپ سے کہتی کہ ڈرامے ضرور لکھئے۔ ایک آرٹسٹ کے لئے ناگوار ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا دھار دار کیلئے تیز ہونا۔

اِندر:- تو پھر؟

لڑکی:- آپ کے ڈرامے نہ تو خوشگوار ہیں اور نہ ناخوشگوار۔ اُنہیں پڑھکر ہمارے تاثرات نہ پھیلتے ہیں نہ سُکڑتے ہیں نہ ہمیں جوش آتا ہے نہ تسکین ہوتی ہے۔ اُن سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ـــــ وہ کچھ بھی نہیں۔

اِندر:- کیا یہی وجہ ہے کہ لڑکیاں میرے ڈرامے پسند نہیں کرتیں۔

لڑکی:- ہاں اگر آپ ڈرامے نہ لکھیں تو لڑکیاں آپ کو زیادہ پسند کریں۔

اِندر:- تو اور کیا کروں؟

لڑکی:- بیڈن روڈ پر ٹیلرنگ کی دکان کھول لیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ڈرامہ نویس کی نسبت آپ ایک درزی بہتر ثابت ہوں گے۔

اِندر:- کیا میرے ڈرامے آپ کو پسند نہیں۔ وہ ڈرامے جو میں نے رات کے کانپتے ہوئے سایوں میں لکھے، ان ڈراموں میں میرا ایک لڑکی کے لئے انتظار، سیسے کی مانند پگھل کر ایک ساکت پُتلے میں ڈھل گیا ہے۔ ایک ایسا پُتلا جو مدتوں کسی کا انتظار کرتا رہا ہو۔

لڑکی:- آپ کے اس پُتلے سے مجھے خوف آتا ہے۔ اب بھی جب آپ آنکھیں پھیلا کر اس پُتلے کی باتیں کر رہے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کی آنکھوں کی نظر کہیں اُڑ گئی اور وہاں خلا رہ گیا ہو۔ وقت کے اُفق میں جھانکتا ہوا خلا ـــــ

اِندر:- آپ کانپ کیوں رہی ہیں ـــ؟ آپ بولتے بولتے یکدم رُک کیوں گئیں؟ آپ میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں ـــ؟

لڑکی:- میں جاتی ہوں۔

اِندر:- تھوڑی دیر ٹھہرئے میں آپ سے التجا کرتا ہوں۔

لڑکی:- نہیں۔ میں نہیں ٹھہر سکتی ..

(اسٹیج کی بتیاں مدھم ہو جاتی ہیں۔ اِدھر اُدھر ہلکا اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ لڑکی بائیں طرف کو چلی جاتی ہے۔ جب فٹ لائٹ کی بتیاں روشن ہوتی ہیں تو اِندر اور گیان پہلے کی طرح بیٹھے باتیں کر رہے ہیں)

گیان:- ہم ـــ کیا وہ چلی گئی؟

اِندر:- ہاں۔

گیان:- تم عورت کی نفسیات کو کبھی نہ سمجھ سکو گے۔ ڈرامے لکھ لینا اور بات ہے لیکن عورت کو سمجھنا اور بات۔ تم بہت زیادہ سوچتے ہو اور عورت کو سمجھنے کی بے حد کوشش کرتے ہو۔ یہی تم میں خرابی ہے۔ عورت کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہ کرو۔ یہی اس کے سمجھنے کا راز ہے۔ وہ آپ سے آپ تمہاری سمجھ میں آجائے گی ـــ تم یہ کیا سوچ رہے ہو؟

اِندر:- یہی کہ اگر میں ڈرامے لکھنے کی بجائے ٹیلرنگ کی دوکان کھول لیتا تو لڑکیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ میرے پاس آتے۔

گیان:- تمہیں عورت اور مرد کی محبت کا کچھ بھی پتہ نہیں۔ تم نرے بدھو ہو۔

اِندر:- میں اکیلا ہوں۔ تنہا ہوں۔ اسی لئے مجھے کسی بات کا علم نہیں۔

گیان:- مجھے تم سے ہمدردی ہے۔

اِندر:- صرف ہمدردی۔ اور کچھ نہیں؟

گیان:- اس سے زیادہ میں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ ہم سب کے سب کسی نہ کسی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ زندگی کی مصیبتیں چھوٹے سے تصور میں — رات دن اسی تصور میں کھوئے رہتے ہیں۔ پرسوں میرا بٹوہ گم ہو گیا۔ مارے غم کے دو راتیں سو بھی نہیں سکا۔ سوا سو روپے کے نوٹ تھے اس میں۔

اِندر:- سوا سو۔!

گیان:- ہاں۔

اِندر:- بٹوہ ملا پھر؟

گیان:- نہیں!

اِندر:- تم نے کچھ تدارک کیا ہوگا۔

گیان:- تدارک کیا کرتا۔

اِندر:- مجھے بڑا افسوس ہے۔ پھر کیا سوچا؟

گیان:- آخر میں نے یہی سوچا کہ ایک ٹیوشن کر لوں۔

اِندر:- ملی کوئی ٹیوشن؟

گیان:- میں نے کوشش کی۔ لیکن لاہور شہر میں لڑکی ملنی آسان ہے اور ٹیوشن مشکل۔ ہر جگہ دریافت کیا لیکن کہیں سے بھی امید افزا جواب نہ ملا۔ اس لحاظ سے یہ شہر بڑا رذی ہے — آہ — زندگی میں پیسے کی بہت ضرورت ہے۔!

اِندر:- اور — لڑکی کی بھی!

گیان:- ہاں — ماتھے سے پسینے کی بوندیں پونچھتا اُف ف — بڑی گرمی ہے۔ سکنجبیں پیو گے؟

اِندر:- پیوں گا۔

گیان:- ارے راموُ!

(اندر سے آواز) جی آیا۔

(راموُ آتا ہے)

گیان:- جا نکڑ والی دکان سے دو گلاس سکنجبین کے لے آ۔ یہ لے چار آنے۔

(راموُ پیسے لیکر چلا جاتا ہے)

روپے کے بغیر ہم سکنجبیں بھی نہیں پی سکتے! اس کے لئے بھی پیسہ درکار ہے۔

اِندر:- ہاں۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ چاہے مجھے کتنی ہی پیاس کیوں نہ لگی ہو۔ اگر میرے قریب کوئی لڑکی بیٹھی ہو تو میں شدید سے شدید پیاس کی بھی پروا نہ کروں۔ نہیں۔ نہیں — دراصل پھر مجھے پیاس لگتی ہی نہیں —

گیان:- (کھوئی ہوئی آواز میں) میں سوچتا ہوں اگر میرے پاس کچھ روپے ہوتے تو اس سال ضرور کشمیر جاتا۔ میں نے سنا ہے وہاں کیسر کے کھیت ہیں اور جھیلیں ہیں اور اور

اِندر:- ہاں اور خوبصورت لڑکیاں!

(آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے)

با حیا باوقار بے حیا بے وقار

پا رہے ہیں مزۂ وجد جوانانِ چمن
گا رہے ہیں وطنی گیت مُحبانِ چمن

"یہ چمن دوست" اُن افراد سے رکھتے ہیں عناد — غیر سے ہیں جو مددخواہ بوقت امداد
غیر کو اپنے چمن میں جو بُلا لیتے ہیں — بے حیا ہی اُنہیں جینے کی دُعا دیتے ہیں
خویش و بیگانہ میں تفریق جو کرتے ہی نہیں — با حیا لوگ کبھی ایسوں پہ مرتے ہی نہیں
غیر جس باغ سے محظوظ ہو وہ جل جائے — غیر کیوں ان کی ریاضت سے بھلا پھل پائے
ان کے چہرہ سے عیاں ہے عصبیّت ان کی — طالبِ رحم نہیں غیر سے غیرت ان کی
باغ میں آئیں بہاریں کہ جُھلس کر رہ جائے — چاہتے ہیں کہ حمیّت پہ کبھی آنچ نہ آئے
غیر کی سیر کو اپنوں نے گوارا نہ کیا — پھول تو پھول ہیں کانٹوں کو بھی چھونے نہ دیا
غیر تو غیر ہی تھا، غیر کو اپناتے کیوں — عُمر بھر زندہ ضمیروں سے یہ شرماتے کیوں
بل میں بل اپنا بل اغیار کا بل جائے جل — مُنتظر وقت کے ہیں انکا ارادہ ہے اٹل
غیر کو دیکھ سکیں۔ یہ نہیں فطرت ان کی — اور کچھ چاہتی ہے اب تو حمیت ان کی
صولت زندہ ضمیری اسے دکھلا دینگے — کیا ہے غیرت کا تقاضا کبھی سمجھا دینگے
پختہ جو لوگ کئے جاتے ہیں اپنی دُھن کو — داغ یہ شعر سُناتے نظر آئے اُن کو

"شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری"
"غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری"

علی منظور

امین حزیں

یہ کیا اندھیر ہے؟

گورنمنٹ ہند کے محکمۂ اطلاعات و نشریات کے "شعبۂ ہوائی" (ریڈیو) کا اردو زبان سے قابلِ صد ملامت سلوک

"ہماری زبان" دہلی کے یکم نومبر ۱۹۴۵ء کے پرچہ میں "چہ دلاور است دزدے" کے زیرِ عنوان ایک شذرہ حال ہی میں نظر سے گذرا ہے۔ جسکا اقتباس حسبِ ذیل ہے:۔

"حکومتِ ہند کے محکمۂ اطلاعات و نشریات نے جس طرح مرہٹی، تلنگی اور بنگالی زبانوں کے شعبے علی الترتیب بمبئی، مدراس اور کلکتہ منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی طرح اردو شعبہ لاہور منتقل کر دیا جائے گا۔ اور مرکز (نئی دہلی) میں صرف ہندی شعبہ باقی رہے گا۔ گویا اردو بھی مرہٹی تلنگی اور بنگالی کی طرح ایک صوبائی زبان ہے اور ہندی کو ہندوستان کی مرکزی زبان ہونے کا شرف حاصل ہے۔"

غالباً دسمبر گذشتہ میں "ہندی دیوی" کے مہا پجاریوں کی بہت سے ہندی ادیبوں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اور سر سلطان احمد بالقابہ کی دعوت پر ہندی اور اردو کی ادبی بالیں طرفین کے گھاگ لڑاکا مرغوں میں کچھ چونچیں ہو جانے کے بعد حکومتِ ہند کے محکمۂ اطلاعات و نشریات نے "بازیں مشورہ رانده وازاں سود مانده" قسم کا بیان بھی نشر کیا تھا۔ اہلِ نظر جب ہی تاڑ گئے تھے کہ انجام بخیر نظر نہیں آتا اور اس بات کا دھڑکا تھا وہ ہو گئی "آخر" کی سنادنی آج "ہماری زبان" کی زبانی سننی ہی پڑی۔

کیا لطیفہ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ تو ہے اردو زبان کا گھر اور وہیں سے اسے دھکے دے کر نکال دیا جائے! وہاں کے پڑھے لکھے تو خیر مگر ان پڑھ بھی اہلِ زبان ہونے کے بعث پنجاب کے پڑھے لکھے اردو کے ادیبوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتے دیکھلی انہوں نے اپنی زبان کی توقیر کہ بیک بینی و دو گوش ان کی اس گھر کی لونڈی کو دھکے دے کر پنجاب کی طرف ہانک دیا گیا ہے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ اردو زبان کا مرکز ہی نہیں تبدیل کیا جا رہا بلکہ حاکم مذہب اہلِ زبان کے طرۂ امتیاز پر قینچی چلائی جا رہی ہے اور ان کے شعراء کے شاہکار کو یوں پھینکا جا رہا ہے جیسے روائتی حبشی نے ایک آئینہ کے ٹکڑے میں اپنی صورت دیکھکر اسے زمین پر دے مارا تھا۔

ہماری زبان کے مدیر شہیر غالباً طبقہ بالا کے ہندوستانیوں کی مغرب زدگی سے یا تو ناواقف معلوم ہوتے ہیں (جو اغلب ہے) یا تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ مسٹر بازمین تازہ ولایت انگریز" اور مسٹر شرما اور مسٹر سین ایسے لوگوں میں امتیاز کرنے کے جھنجھٹ میں نہ پڑتے۔ "مسٹر لوگوں" کو اردو یا دیسی زبانوں سے تعلق؟ ان کا تو اوڑھنا بچھونا ہی انگریزی زبان ہے۔ اور ان کے مطالعہ میں بھی انگریزی اخبارات رسالے اور کتابیں ہی رہتی ہیں۔ جب بچے اور بچیوں کی اماں جان تک صرف انگریزی ہی بولیں اور دیسی نوکروں تک سے بھی انگریزی ہی میں بات کرنے کو "صحت ذوق" سمجھا جاتے تو ان سے کسی دیسی زبان کے باب میں خوشگوار توقعات رکھنا لاحاصل ہے۔ میرے خیال میں شاید مسٹر بازمین نے مسٹر شرما اور مسٹر سین صاحبان سے کچھ زیادہ ہی اردو زبان سیکھلی ہو گی (ہندوستان میں کوئی دوسری دیسی زبان نووارد مغربی سیکھتے ہی کب ہیں؟)

واقعہ یہ ہے کہ اردو ہندی کا مسئلہ "لسانی" نہیں بلکہ سیاسی جھگڑا بن کے رہ گیا ہے۔ برادرانِ ہنود کے اکثر کثیر الاشاعت پرچے خاص کر پنجاب میں۔ اردو زبان ہی میں نکلتے ہیں۔ مگر کبھی کسی ہندی کے بھگت نے ان پر ندر نہیں دیا کہ تعاقی کی

[مصنوعی] زبان میں پرچے نکالے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس "مصنوعی زبان" کو سوائے چند گنتی کے ہندی بھگتوں کے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے ان پرچوں سے فی الحال صرف اتنی ہی خدمت لی جا رہی ہے کہ ٹکسالی اُردو میں پوتر ہندی کا پرچار کرنے سے کبھی نہ چوکیں۔ اور ان اخباروں کے مالک اور ناشر بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج ان کے اخبار اور پرچے ہندی میں نکلیں تو ایک ہفتہ کے اندر اندر دیوالہ نکل جانا اٹل ہے۔ اور یوں تو دہلی اور یو۔ پی کا کون سا شہر یا بڑا قصبہ ہے۔ جہاں کے ہندو شرفا کا اور کیا متوسط طبقہ دن رات پاکیزہ اُردو نہ گھر میں اور گھر سے باہر کبھی نہیں بولتا۔ البتہ ہنگامہ آرائی کے لئے اس چاندسی نکھری ہوئی زبان جو نہ صرف صدیوں سے ہر معنی میں "کل ہند زبان" ہے بلکہ بیرون ہند بھی ہر کہیں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ دانستہ متھرا کے گھاٹ پہ اشنان کرا کے ہی منظرِ عام پر لایا جاتا ہے۔

ریڈیو کا ادارہ تھا سرکاری۔ اس پر مہاشائی زور چلا اور بظاہر خوب چلا۔ اور کیوں نہ چلتا۔ محکمے کے کرتا دھرتا ہندو اور خیر سے گورنمنٹ کی نگاہ جو کبھی غضب آلود تھی وہ بھی آج کل مائل بہ کرم ہو رہی ہے۔ اس مہاسبائی سکیم سے کوئی نقصان اگر پہنچ سکتا ہے تو گورنمنٹ کو یا جیسے کہیں گے تو مسلمانوں کے دل و جگر پر۔ اور دونوں صورتوں میں فائدہ ہے "ہندو جاتی" ہی کا۔

واقعی ہندو خواہ کسی طبقہ کا ہو "عمل مست" اور مسلمان مجرمانہ حد تک "بے نیاز نتائج ہے"۔

اب ذرا پنجاب کی فضا کا بھی جائزہ لے لیجئے دوسرے اداروں کو چھوڑئیے کیوں کہ ان کا تعمیر اخلاق اور تربیت و اصلاح ذہنیتِ افراد میں اتنا ہاتھ نہیں جتنا کہ یونیورسٹی یا علمی تعلیمی ادارے کا ہو سکتا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے پنجاب ہے تو اسلامی صوبہ مگر اس تعلیم دینے والی مشین کو چلانے والے قریب قریب (سب نہیں تو بڑھی ہوئی اکثریت کہہ لیجئے) برادران یوسف ہی ہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ مسلمانوں نے جب بھی اکثریت کی بنا پر اس ادارہ میں اپنے جائز حقوق کے لئے آواز اٹھائی تو کس دیدہ دلیری سے کہا جاتا رہا کہ ایک علمی ادارہ میں فرقہ وارانہ مسائل کی دراندازی گوارا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ گویا آپ خود تو سرسے فرقہ وارانہ ذہنیت کے ہیں ہی نہیں! "چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد" کا اطلاق اگر صحیح طور پر ہو سکتا ہے تو وہ یہی صورت ہے۔ چوری اور سینہ زوری کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں نظر آسکے یہ بزرگوار اپنی برسوں کی اجارہ داری کو چھوڑنے سے رہے۔ کٹر فرقہ دار تو ہیں خود مگر اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹ بتلائے جا رہا ہے۔ اور دُنیا ہے کہ دیکھ رہی ہے۔ گو کل تک برادرانِ یوسف کے فرقہ وارانہ بڑھے ہوئے جذبات پر "آب رواں" کی ہلکی سی نقاب پڑی تھی۔ مگر خیر سے اس ہمہ گیر عریانی پسندی اور بے حجابی کی تقلید میں اس کی دھجیاں بھی اُڑ چکی ہیں۔

کن کن ہتھکنڈوں سے پنجاب میں اُردو زبان کی تخریب کی گئی ہے ان کی خونچکاں داستان یہاں کسے معلوم نہیں؟ اسی یونیورسٹی کے ہاتھوں عربی اور فارسی زبانوں کو پنجاب میں نیچا دیکھنا پڑا۔ قوانین ایسے بنا دئے گئے کہ عربی اور فارسی زبانیں چند ہی لازمی مضامین کے ساتھ لی جا سکیں نتیجہ یہ کہ اسکولوں کے اکثر لڑکے ان سے بے بہرہ ہو کر رہ گئے۔ اور یہی دو زبانیں ہیں جن سے اُردو کی علمی زبان کا خمیر اُٹھایا گیا تھا۔ اُدھر بہ لطائف الحیل "ہندی نوازی" اور "پنجابی گردی" کی تخریبی قوتیں بروئے کار آنا شروع ہو گئیں۔ جو آج اُردو زبان کے لئے پنجاب میں مستقل خطرہ ثابت ہو رہی ہیں۔

یوں تو ریڈیائی اُردو مشاعرے بھی ایسے نہیں جن کے مواد اور ادبی معیار پر آل انڈیا ریڈیو زیادہ فخر کر سکے (یہ اور بات ہے کہ مشاعرے کے بعد خطوں کے جوابات کے دن چند نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے آئے ہوئے تعریفی خطوط پڑھ دئے جائیں۔ یہ نوجوان معیار ادب تو کہاں ہوں گے البتہ یہ خطوط نویسی کا فیشن یا جنون ہے جس کا موجد کوئی فلمی پرچے کا ایڈیٹر تھا۔ اور جسے مفید مطلب سمجھ کر ریڈیو والوں نے بھی اپنا لیا ہے اور اسکا محرک ذوقِ ادب نہیں بلکہ وہ تحت الشعوری سستی نمود و نمائش کا جذبہ ہے جو آج کل خاص کر "اُٹھتی جوانیوں" میں ضرورت سے کچھ زیادہ پیدا ہو رہا ہے) لیکن یہ ریڈیائی "پنجابی کوی دیوان" تو صحیح معنوں میں "وبال سماعت" ہیں۔ خاص کر خوش ذوق و ادب آشنا طبقہ کے لئے جو اس صوبہ میں ماشاء اللہ خاصہ ممکن ہے کہا جائے کہ یہ حساس شہریوں کے ذوق کی تسکین کیلئے

ہیں ملکہ دیہاتی بھائیوں کی تفریح کے لئے ہوتے ہیں۔ خیر یوں ہی سہی، تو اس صورت میں انہیں دیہاتی پروگرام کا جزو دکھانا چاہئے نہ کہ ایک الگ تھلگ اور پائے کے ادبی کارنامے کی حیثیت سے۔

سوء اتفاق سے میں نے بھی دو ایک پنجابی کے ریڈیائی مشاعرے سنے ہیں۔ اور اسی ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ آج کل کی پنجابی شاعری کم از کم الفاظ کے صحیح تلفظ سے بالکل نابلد ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ پنجابی کے کہنہ مشق شاعروں تک بھی عشق اور مشک جیسے گدے چڑھے الفاظ کو اکثر عشک و مشک باندھ اور پڑھ جاتے ہیں۔ اور شعر اگرچہ پنجابی کی مروجہ اور مستند بحروں ہی میں ہوتے ہیں بلکہ کبھی اکثر میں "زحاف" کا عیب نمایاں ہوتا ہے۔ رہے خیالات تو عامیانہ ہی ہو سکتے ہیں۔ ہاں طرز ادا "نیر نگ آہنگ" ضرور کہی جانے کے لائق ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا ایسے حالات میں پنجاب کے صوبے میں بھی "اردو زبان" جسے اپنے وطن مالوف سے بدر کیا جا رہا ہے خاطر خواہ طریق پر پنپ سکتی ہے کہ نہیں؟ اس میں شک نہیں کہ پنجاب نے اردو زبان کی اپنی سگی ماں کی طرح خدمت کی ہے۔ اور پنجاب کے ادبی سپوتوں سے آئندہ بھی ایسی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اور مخلصانہ خدمت کی جائز توقع کی جا سکتی ہے۔ لیکن جب اغیار کی شاطرانہ چالوں سے ہندی کے لئے تمام ہندوستان کو جاگیر بنا لیا گیا اور برادران یوسف اسی طرح چند سالوں میں اسے دامے قدمے اور قلمے ہندوستان گیر زبان بنانے میں کامیاب ہو گئے تو کیا اردو کا صوبہ پنجاب کی کال کوٹھڑی کی مسموم ہوا میں خود بخود ہی دم گھٹ نہ جائیگا؟

کیا اہل زبان اور کیا زباندان جو اردو زبان کو اپنا سمجھتے ہیں سب کے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے یاد رکھئے اگر ذرا بھی سہل انگاری سے کام لیا گیا تو یہ کھیت چڑیاں اس طرح چگ جائیں گی کہ پھر پچھتائے کچھ نہ ہو سکے گا۔

پنجاب میں "پنجابی گردی" کے سلسلے میں ایک مقامی نئے شگوفہ کا تذکرہ یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ وھو ہذا۔ سات آٹھ سال سے شہر سیالکوٹ میں "رہنمائے ترقی" نامی ایک دیہات سدھار پرچہ اردو زبان میں نکل رہا ہے ڈاکٹر نیاز الدین صاحب ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر ابتداً چلاتے تھے۔ دوران جنگ میں اس سے پروپیگنڈے کا کام تو لیا ہی جاتا تھا۔ اس لئے خوب لیا گیا۔ مگر زبان اس کی اردو ہی رہی۔ یہ پرچہ زیادہ تر ضلع کے دیہاتوں اور مڈل و پرائمری سکولوں ہی میں جاتا ہے۔ غالباً گذشتہ اپریل ڈاکٹر نیاز الدین صاحب یہاں سے تبدیل ہو گئے اُن کے جانشین چونکہ اس کی اعزازی ایڈیٹری وغیرہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل سمجھتے تھے یہ پرچہ بمنظوری حکام بالا مقامی محکمہ تعلیم یعنی ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز سیالکوٹ کو منتقل کر دیا گیا۔ غالباً یہ انتقال گذشتہ اکتوبر میں مکمل ہوا۔ جناب ڈسٹرکٹ انسپکٹر سردار سادھو سنگھ صاحب ایم۔ اے اس کے اعزازی چیف ایڈیٹر بنا دیئے گئے۔ جنہوں نے چھوٹتے ہی پہلا ایڈیٹوریل پنجابی زبان میں دھڑ گھسیٹا۔ اداریہ کی سرخی کے نیچے نوٹ تھا "از قلم چیف ایڈیٹر" (ذرا اس چھوٹے سے فقرہ کی ادبیت ملاحظہ ہو!) لیکن یہ اداریہ بھی اُس پنجابی میں نہ تھا جسے تو لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے پنجابی بول اور سمجھ سکتے ہیں بلکہ ٹھیٹ "متھرانی پنجابی" میں۔ جسے "جناتی پنجابی" کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ ممکن ہے اسی قسم کے شگوفے دیگر اضلاع پنجاب میں بھی چھپتے ہوں۔ مگر یہ تو آنکھوں دیکھی خبر ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے اگر میں یہ کہہ دوں کہ ریڈیو کے محکمہ کے دیوتاؤں کو اگرچہ اردو کی بیخ کنی کی تجویز خوب ہی سوجھی ہے لیکن ایک "پاکستانی" اس سکیم کو پڑھ کر یہ پھبتی کہنے سے چوک نہیں سکتا کہ "ان مٹی کے مادھوؤں نے عملاً (نادانستہ ہی سہی) پاکستان کی تائید مزید کر دی ہے" کیونکہ پنجاب ہی پاکستان کے مزعومہ ہونے کا قلب بھی ہے جگر بھی ہے"

فاعتبروا یا اولی الابصار

سالنامہ ساقی ۱۹۴۶ء

ساقی کی سولہویں سالگرہ کے موقع پر

ساقی کا شاندار سالنامہ

جنوری ۱۹۴۶ء کے پہلے ہفتے میں شائع ہونے والا ہے

سالنامہ میں ہندوستان کے تقریباً سب مشہور ادیب و شاعر شامل ہو رہے ہیں۔ ہر قلمکار نے اپنا شاہکار سالنامہ ساقی کے لئے پیش کیا ہے۔ جو حضرات ساقی کے خاص نمبروں کی خصوصیات سے واقف ہیں سمجھ سکتے ہیں کہ ۱۹۴۶ء کا سالنامہ کیا ہوگا۔ خصوصاً زمانۂ جنگ کی ہولناک نایابیوں کے بعد جب یہ ضخیم اعلیٰ درجے کے مضامین کا مجموعہ آپکے ہاتھوں میں ہوگا تو اسے دیکھکر آپ چونک پڑینگے اور آپکی وہ تمام کوفت اور بددلی دور ہو جائیگی جو گذشتہ چھ سال سے آپ پر طاری ہے۔ اگر آپ ساقی کے مستقل خریدار نہیں ہیں تو آج ہی چھ روپے بھیج کر جنوری سے خریدار بن جایئے تاکہ آپکو یہ سالنامہ مفت مل جائے۔ اگر آپ مستقل خریدار ہیں تو تین آنے کے ٹکٹ رجسٹری کیلئے بھیج دیجئے تاکہ ڈاک میں کھوئے جانے کا اندیشہ نہ رہے۔

ساقی کا سالنامہ آپکو ہر شہر کے اخبار فروشوں اور ریلوے اسٹیشنوں سے مل سکے گا۔

سالنامہ کی قیمت ڈھائی — تین روپے ہوگی۔ چونکہ پرچہ محدود تعداد میں شائع ہوگا اسلیئے ۱۵ جنوری کے بعد غالباً کسی قیمت پر بھی نہیں مل سکے گا۔ اِس لئے اپنے پرچے کا آج ہی انتظام کر لیجئے!

مینجر ساقی - دہلی!

سالنامہ ساقی جنوری [illegible] کے چند مضامین

(۱) لاحول ولا :- مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔
(۲) خبطی :- پروفیسر رشید احمد صدیقی۔
(۳) پچاس برس پہلے کی دلی : علامہ یزدانی ایم اے او بی ای
(۴) ورنگ زیب اور تعصب :- پرنسپل محمد شفیق احمد زاہدی ایم ۔ اے۔
(۵) تمہارے دل سے کہو آہستہ چلیں :- ایم اسلم۔
(۶) اُردو ادب پر غدر کا اثر :- ڈاکٹر ایم ۔ ڈی تاثیر۔
(۷) ایک شگفتہ افسانہ : حجاب امتیاز علی۔
(۸) چند ٹروی گوساں / افسانہ نگاروں کے لئے } پروفیسر وقار عظیم ایم ۔ اے
(۹) رقصِ شرر :- قرۃ العین حیدر۔
(۱۰) روپا چمار :- اشرف صبوحی
(۱۱) سنسکرت ڈرامہ کے کردار :- سید انصار ناصری۔
(۱۲) جیمس جوئس :- محمد حسن عسکری ایم ۔ اے۔
(۱۳) نما تو بڑے پہلوان :- علامہ مشفق دہلوی۔
(۱۴) چکوری :- ملوسے گھ بی ۔ اے۔
(۱۵) سورداس اور تلسی داس / پر اُردو کا حق } پروفیسر احتشام دریوی۔
(۱۶) خندۂ تقدیر :- ناکارہ حیدرآبادی۔
(۱۷) بی زمانی بیگم :- سعادت حسن منٹو
(۱۸) ناک کاٹنے والے :- غلام عباس۔
(۱۹) پکری کا میلہ :- مرزا ابراہیم بیگ چغتائی۔
(۲۰) شیطان :- خلیل جبران مترجم حبیب اشعر دہلوی
(۲۱) نیا ادب زندہ باد :- پریم پجاری۔
(۲۲) تاریکی بڑھتی جارہی ہے :- سرلا دیوی۔
(۲۳) میرا دل پسند صفحہ :- پروفیسر سراج حسین نقوی۔
(۲۴) ندرالاسلام کی نظمیں :- مترجمہ محمد یونس احمر
(۲۵) انگاروں کے اوپر :- انور ۔ بی ۔ اے۔
(۲۶) اپنی ڈائری سے :- ڈاکٹر نصیر الدین۔
(۲۷) تارے کھیے :- طاہرہ دیوی شیرازی۔
(۲۸) ہم کیا کریں؟ :- ظریف الملک ظریف دہلوی۔
(۲۹) غالب کی عشقیہ شاعری :- آفتاب احمد۔
(۳۰) رات کی رانی :- پرتھوی ناتھ شرما ایم ۔ اے۔
(۳۱) حرام :- قیسی رامپوری
(۳۲) کسوٹی :- ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم ۔ اے پی ایچ ۔ ڈی۔
(۳۳) شاداب مرغزار اندر میں :- صادق الخیری دہلوی ایم ۔ اے۔
(۳۴) اُردو شاعری میں اشاریت :- ڈاکٹر ابواللیث ایم اے پی ایچ ۔ ڈی۔
(۳۵) اتفاقات :- فضل حق قریشی دہلوی۔
(۳۶) ریڈیو کے دس سال :- آغا محمد اشرف ۔ ایم ۔ اے۔
(۳۷) بہلاوے :- مہندر ناتھ بی اے۔
(۳۸) لاوارث :- دلوندر ستیارتھی۔
(۳۹) حسرت موہانی کی تلمیحات :- پروفیسر نعیم الرحمٰن ایم ۔ اے۔
(۴۰) ایک کمبل :- چندر کانت۔
(۴۱) طوفان کا دیو :- ستپال
(۴۲) میرے اشعار کی شانِ نزول :- پریم پجاری۔
(۴۳) جل ترنگ : قدرت اللہ شہاب آئی ۔ سی ۔ ایس۔
(۴۴) ادب کا افادی پہلو ۔ عبادت بریلوی ایم ۔ اے۔
(۴۵) مریا ۔ ابنِ سعید۔
(۴۶) ایک تھے راجہ :- ساحلی۔
(۴۷) بہشتو :- احمد ندیم قاسمی بی ۔ اے۔
(۴۸) اندیشے :- ناہید عالم۔
(۴۹) گدھ :- ملوسے نارنگی۔
(۵۰) تاریخ ہند مذاہب :- کرشن حیدر ایم ۔ اے۔
(۵۱) میرا ہمدم میرا دوست ۔ راما نند ساگر۔
(۵۲) وہ لال لال شعلے :- اکالی گرچن سنگھ۔

ان کے علاوہ بھی چند مشہور لکھنے والوں کے مضامین شامل ہونے کی توقع ہے۔ حصۂ نظم میں آپ کے سب محبوب شاعر شریک ہیں

سالنامہ کی قیمت ڈھائی ۔ تین روپے ہوگی۔ مگر مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ ہی میں دیا جائے گا صرف تین آنے رجسٹری کے بھیج دیجئے تاکہ سالنامہ آپ کو بحفاظت کے ساتھ پہونچ جائے۔

ساقی بُک ڈپو کی کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
رفتار۔	قیمت ۱۲؍	تابندہ کیل۔	قیمت ۱۲؍	سائے۔	قیمت عہ
فراغت۔	۱۲؍	ناسور۔	۱۲؍	حالے۔	عہ
لطافت۔	۱۲؍	قلمس	عہ	جہرے۔	۱۲؍
کمزوری۔	عہ	گذرگاہ خیال۔	۱۲؍	میرا بہترین افسانہ	عہ
سفر کوچک	عہ	دریچے۔	۱۲؍	گرداب۔	عہ
آدم خور۔	عہ	تعلیم زدہ بیوی	۸ر	مضراب۔	عہ
جنت کا بھوت	۸ر	فرعون۔	عہ	آئینہ حیرت	۱۲؍
غلام۔	للعہ	ریڈیو ڈرامے	عہ	نغمۂ نور۔	عہ
سونے کی ہرن	۸ر	لیسٹر۔	۶ر	کیف و سرور	عہ
چینی کی انگوٹھی۔	۸ر	چار چاند۔	۸ر	چراغ طور۔	عہ
ملفوظات طامی	۱۲ر	لال قلعہ کی جھلک	عہ	موج طہور۔	عہ
مضامین چغتائی۔	عہ	بدقدرت۔	۶ر	موج نور۔	عہ
قرآن اور پردہ۔	عہ	پروین و ثریا۔	عہ	بیان حضور	عہ
حدیث اور پردہ	عہ	چندرا موہنی	عہ	پائل۔	عہ
سلامبو۔	للعہ	وحشی۔	عہ	ملقبس	عہ
نجم السحر	ےؔ	میراجی کی نظمیں	عہ	شمع انجمن۔	۱۲؍
تائیس۔	عہ	گیتا ہی گیت	۱۲؍	سفینے۔	ےؔ
ہیرودیاس۔	عہ	تکنت۔	ےؔ	شاہد رعنا	ےؔ
انطونی کلابطرہ	عہ	نئے فسانے	للعہ	پھانسی۔	۱۲؍
نرگس۔	۱۲؍	محبت و نفرت	۱۲؍	وتاب	عہ
گنہگار۔	عہ	اتاترک۔	۱۲؍	نمرجہاں	عہ
کلیاں۔	ےؔ	دھنک	۱۲؍	دو شیزۂ صحرا	عہ
صندی۔	عہ	کہکشاں	ےؔ	شمع فروزاں	۱۲؍

ملنے کا پتہ۔ ساقی بُکڈپو۔ دہلی!

ایک سردرات (بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۰)

کمرے کا دروازہ مار مار کھٹکھٹا رہی تھی ـــــ وہ انگڑائی لے کر اُٹھا اور بتی گل کرکے دوسرے کمرے میں داخل ہوگیا۔ جہاں مفلسی اور بھوک کا مارا ہوا بیمار جسم دھڑک رہا تھا ـــــ لڑکی کراہی۔

"مجھے چھوڑ دو میں بھوکی ہوں ـــــ میرا جسم ٹوٹ رہا ہے"ـــــ

کہتے ہیں زیادہ سڑا ہوا گوشت گِدھ بہت مزے لے کر کھاتے ہیں ـــــ اُس اندھیرے میں بھی اُس بھوکے سڑے ہوئے جسم کو نوچ نوچ کے کھایا گیا ـــــ کتے بھونکنے لگے ـــــ ستاروں کی روشنی تیز ہوگئی ـــــ ہر طرف گرمی کے سوتے پھوٹ رہے تھے ـــــ اندھیرا پھٹ گیا ـــــ اب ہر ایک چیز دُھلی ہوئی اور اُجلی نظر آرہی تھی ـــــ

رائل کشیدہ کاری
کشیدہ کاری
کراس سٹیچ ورک
مرتبہ بیگم نصیر سبزواری
لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ سہ رنگا سرورق
قیمت
رونق
ملنے کا پتہ۔ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو ۵۶۔ اردو بازار۔ دہلی

پاکستان کیا ہے؟

پاکستان کیا ہے؟ پاکستان کے معنی کیا ہیں؟ پاکستان ممکن ہے یا ناممکن، عملی ہے یا غیر عملی؟ پاکستان ہندو مسلم سوال کا حل ہے یا نہیں؟ غرضکہ آج ہر شخص کے دماغ کو یہ سوالات پریشان کر رہے ہیں لیکن ہماری زبان میں کوئی ایسا لٹریچر موجود نہیں جو عوام الناس کی تشفی کر سکے، چنانچہ اسی ضرورت کو مدنظر رکھکر۔

مشہور سیاسی رسالہ

نئی زندگی

کے ادارے نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کا جنوری نمبر خاص نمبر ہوگا جو صرف اسی مسئلے پر بحث کرے گا۔ چنانچہ

یکم جنوری ۱۹۴۶ء کو یہ

خاص نمبر

شائع ہو جائیگا

جس کے ۲۵۰ صفحات محض پاکستان کے لئے وقف ہوں گے۔

اِس خاص نمبر میں ملک کے مشہور لیڈروں، مصنفوں، مفکروں، اور علمائے کرام کے مضامین شامل ہونگے جو پاکستان کے جغرافیائی، معاشی، اقتصادی، صنعتی، زراعتی، سیاسی اور مذہبی غرض کہ ہر پہلو پر سیر حاصل بحث کریں گے، علاوہ ازیں اس نمبر میں پاکستان سے متعلق تمام و کمال معلومات، بیانات، تجاویز، نقشے، چارٹ، تصاویر اور اعداد و شمار ہوں گے جنہیں ادارے نے بڑی کاوشوں سے فراہم کیا ہے غرضکہ اس نمبر میں تمام معلومات مل جائیں گی جو یکجا طور پر انگریزی یا اردو کسی زبان میں بھی نہیں مل سکتیں۔

غرض کہ یہ خاص نمبر مسئلۂ پاکستان کی ایک ریفرنس بک ہوگا۔

خریداروں سے — عرض یہ ہے کہ کاغذ کی راشننگ کے سبب ہم اتنی ہی کاپیاں چھاپ سکیں گے جتنی کی مانگ ہو۔ لہذا ۱۲؎ پیشگی روانہ کرکے پرچہ رجسٹرڈ کرالیں۔ وی۔پی نہیں بھیجا جائیگا سالانہ خریداروں کو مفت نذر کیا جائیگا۔

مشتہرین سے — درخواست ہے کہ اشتہارات کے صفحے نہایت محدود ہونگے اس لئے اپنے اشتہار کی جگہ ریزرو کرالیں ورنہ بعد میں مایوسی ہوگی۔

ایجنٹوں سے — گذارش ہے کہ جتنی کاپیوں کی ضرورت ہو رقم پیشگی جمع کرا کے کاپیاں محفوظ کرالیں، وی۔پی نہیں کیا جائے گا۔

قیمت خاص نمبر ۱۲؎   سالانہ چندہ پانچروپیہ (۵ؔ)

مینیجر رسالہ "نئی زندگی" الہ آباد
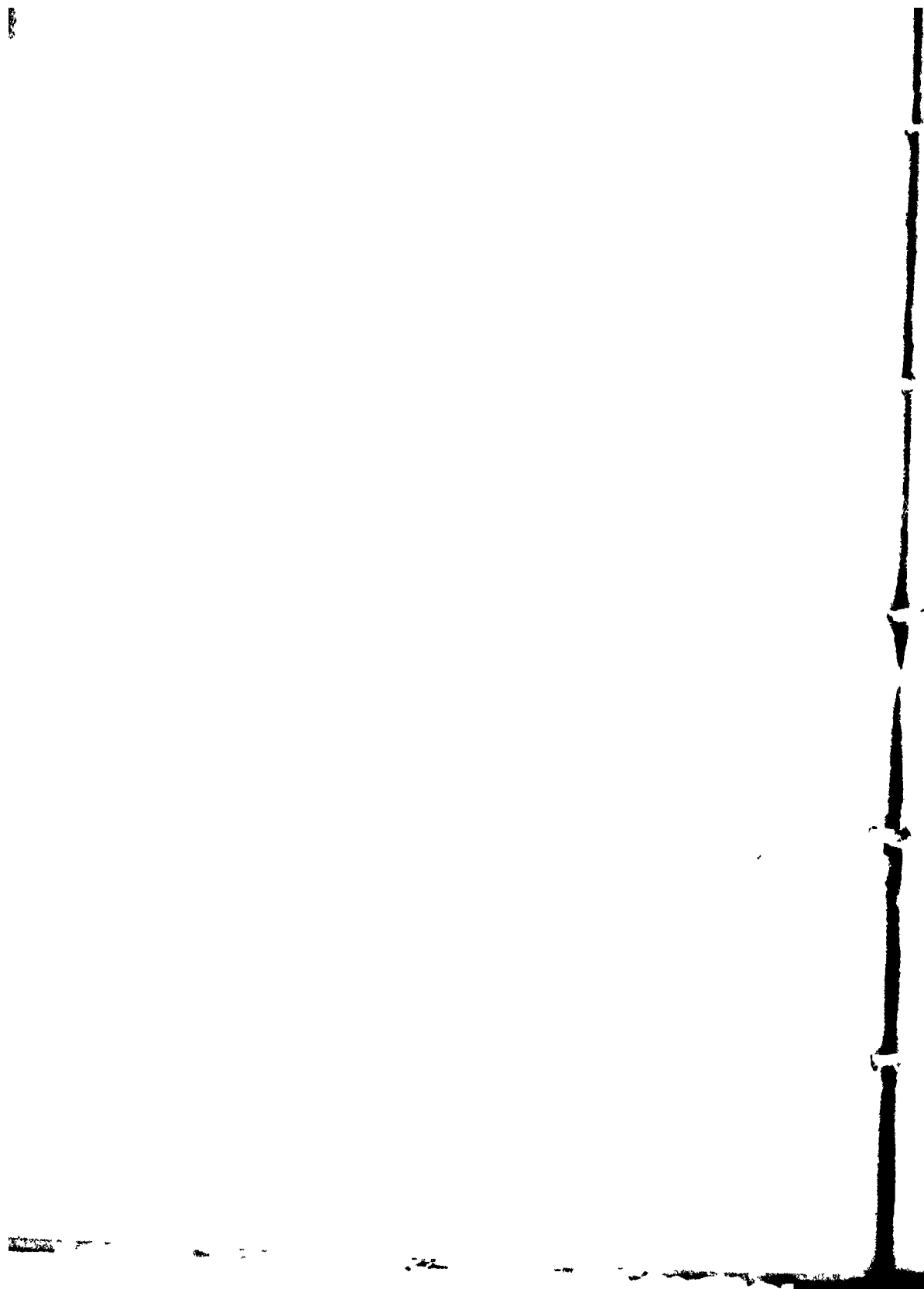
Regd. No L [illegible]

Printed at the Mahbob-ul-mataba Press, Delhi & Published by Shahid Ahmad B.A Hons from the officeof the "SAQI" Delhi
Only Cover Printed by Calcutta Art Press, Delhi

شاہد احمد دہلوی
محمد حسن عسکری

جرعات

ششماہی ساڑھے [illegible]
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۳۲ | ساقی دہلی، بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۴۵ء | نمبر ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شاہد احمد دہلوی

نگاہِ اولیں

ساقی کی گزشتہ اشاعت میں ہم نے بتایا تھا کہ نئے مضمون نگاروں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی ساقی کی ایک خصوصیت ہے۔ چنانچہ ایک کثیر تعداد آج کل کے عمدہ لکھنے والوں کی پیش کرنے کا فخر ساقی کو حاصل ہے۔ ادب کی زندگی اور ترقی کا ضامن یہی نیا خون ہے۔ ساقی کی ہر اشاعت میں آپکو دو ایک نئے نام نظر آئیں گے۔ ان میں بعض بہت پُرانے لکھنے والے ہیں مثلاً پرنسپل مشتاق احمد زاہدی جو کم و بیش چالیس سال سے علم و ادب کی خاموش خدمت کر رہے ہیں۔ زاہدی صاحب دلّی کے مُعتمد اہلِ کمال میں سے ہیں اور بزمِ ساقی میں اکی شمولیت ہمارے لئے باعث افتخار ہے۔ "نقل" نے اپنا مضمون محاذِ جنگ سے بھیجا ہے۔ اِن کا مضمون پڑھکر رفیق حسین مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی۔ واقعات کی ایسی تفصیل جو افسانے سے زیادہ دلچسپ ہو کم دیکھنے میں آتی ہے۔ مفتون احمد کا افسانہ "لا متناہی" جدید رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر نصیر الدین نے "محبوبہ" کے گزشتہ اور موجودہ حالات کا دلچسپ جائزہ لیا ہے۔ موصوف ساقی کے پُرانے معاون ہیں اور دو سال کے سکوت کے بعد رجوع ہوئے ہیں۔ ناصر شمسی بھی ساقی میں پہلی دفعہ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ڈرامہ سے انہیں خاص دلچسپی ہے۔ اُردو میں ڈرامہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمارے ادیبوں کو بطورِ خاص اس صنفِ ادب کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ نفضلی صاحب نے کئی سال کے بعد افسانہ لکھا ہے جس طرح اُن کی غزلوں میں ایک نُدرت ہوتی ہے افسانوں میں بھی ایک جدّت ہوتی ہے۔ حکیم حبیب اشعر کے عربی سے اور محمد یونس احمر کے بنگالی سے ترجمے ہمارے ادب میں قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سالنامہ ساقی:- جنوری کے پہلے ہفتے میں شائع ہوگا۔ اس کے لئے مضامین فراہم کئے جارہے ہیں۔ اُردو کے بہترین انشاء پردازوں اور شاعروں سے قلمی اعانت کی درخواست کی گئی ہے، اور چند مضامین موصول ہو چکے ہیں جن کا اعلان اسی پرچے میں کہیں اور کر دیا گیا ہے۔ شائقین منتظر رہیں اور نومبر اور دسمبر کے پرچوں میں مزید مضامین کا اعلان ملاحظہ فرمائیں۔ حکومت نے کاغذ کا کوٹہ بڑھا دیا ہے، اس لئے اُمید ہے کہ ۱۹۴۶ء کا سالنامہ گزشتہ پانچ سال کے سب سالناموں سے بازی لے جائے گا۔

نوابِ سراج الدین احمد خاں سائل

ستمبر کے وسط میں وضعدار دلّی کی بساط کا آخری مہرہ بھی ہم سے چھن گیا۔ سائل دلّی میں رہتے تھے، نواب لوہارو کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ لوہارو سے وثیقہ پاتے تھے۔ نواب مرزا داغ کے داماد تھے بڑے خوبصورت اور وجیہہ آدمی تھے۔ اگلے دلّی والوں کی ساری خوبیاں ان میں تھیں۔ شعر و شاعری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ قدیم رنگِ سخن کے رسیا تھے، دلّی کی زبان اور بیان ان کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، اور حق یہ ہے کہ اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوا کے چھوڑا ہندوستان بھر میں انکی اُستادی اور بزرگی مسلم سمجھی جاتی تھی۔ سات دیوان انکی یادگار ہیں جن میں ہزاروں غزلیں ہیں مگر افسوس کہ اُنہیں چھپوانے کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔ کئی سال سے ایک مثنوی جہانگیر اور نور جہاں کے تاریخی رومان پر لکھ رہے تھے جو مکمل ہو جاتی تو نظم اُردو میں ایک شہ پارہ قرار دی جاتی۔ افسوس کہ وہ ناتمام رہی اور اسکی تکمیل کسی اور سے بھی ناممکن ہے۔ سائل نے ترنم کا ایک نیا ڈھنگ ایجاد کیا تھا جس کی نقل جیتے جی کسی سے نہ اُتر سکی تو اب بھلا کیا اُترے گی۔ وہ بات کوہن کی گئی کوہکن کے ساتھ اللہ تعالیٰ اُن کی قبر کو عنبریں کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل مرحمت فرمائے۔ آمین!

نہال سیوہاروی

ماتم سائل

نوٹ: نواب سراج الدین احمد خاں سائل ابن نواب شہاب الدین خاں ثاقب نبیرۂ نواب ضیاء الدین خاں نیر و رخشاں۔

ہے جوشِ غم ہمہ تن بے قرار ہے دہلی ۔۔۔ کسی فسکے ہوئے دل کی پکار ہے دہلی
فغاں کا عالمِ شعر و سخن سے شور اٹھا ۔۔۔ گری چمن پہ وہ بجلی چمن سے شور اٹھا
رہینِ نوحہ گری ہر ادب شناس ہوا ۔۔۔ دیارِ غالب و مومن اُداس اُداس ہوا
ظہورِ ظلمتِ غم بزمِ بے چراغ سے ہے ۔۔۔ بلند شورِ بکا سرزمینِ داغ سے ہے
دلِ جہاں پہ قیامت گذر گئی یارب ۔۔۔ تنہیائے نیر رخشاں کدھر گئی یارب
جفائے خنجرِ دوراں سے دل فگار ہوں میں ۔۔۔ ندیم! جام اُٹھالے کہ سوگوار ہوں میں
نکاتِ فن کئے اک عمر جس نے حل، نہ رہا ۔۔۔ دریغ! ساقیِ میخانۂ غزل نہ رہا

زدیدہ موجۂ خونناب حاصل است مرا
چہ دشنہ در جگر از مرگِ سائل است مرا

بلند رتبہ و عالی مقام تھا سائل ۔۔۔ جہانِ شعر و ادب کا امام تھا سائل
سخنوری میں مسلّم وقار تھا اُس کا ۔۔۔ ہر ایک شخص عقیدت گذار تھا اُس کا
وہ کیف بار رد حیات آفریں غزل اُس کی ۔۔۔ بہارِ تازہ کی صورت حسیں غزل اُس کی
وہ مثنوی میں طبیعت کا رنگِ جولانی ۔۔۔ فرازِ کوہ سے بہتا ہو جس طرح پانی
جُدا زمانے سے اسلوب شعر خوانی کا ۔۔۔ ہر اک زباں پہ ہے ذکر اس کی خوش بیانی کا

اسیرِ خوابِ اجل نغمہ خواں ہوا صد حیف
خموش طوطیِ ہندوستاں ہوا صد حیف

بیاں نہ ہو وہ مصیبت ہے رحلتِ سائل ۔۔۔ وداعِ خلق و مروت ہے رحلتِ سائل
ترے فراق میں خوں گشتہ ہر جگر ہے آج ۔۔۔ شبیہِ غالبِ مرحوم تو کدھر ہے آج

گذر جہاں تھا وہ راہیں تلاش کرتی ہیں
ترے وطن کی نگاہیں تلاش کرتی ہیں

محمد حسن عسکری

جھلکیاں

جب میں دسویں یا نویں جماعت میں پڑھتا تھا تو ہمارے ایک ساتھی تھے جو بعض نسخے تجویز کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے اُسی زمانے میں ایک نسخہ تصنیف فرما دیا تھا، اور نسخہ بھی کیا! اسے تو معجزہ کہنا چاہیئے، کوئی مرض اس کی زد سے باہر نہیں تھا۔ اس وقت تو انہیں اپنی جدت طبع کی داد بھی کافی سے زیادہ خوب ملی، لیکن شاید یہ نسخہ ایسا طبع زاد نہیں بلکہ مدتوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ بہرحال چونکہ اس کے فوائد ایسے گوناگوں ہیں اس لئے آپ کے کان میں بھی پڑ جائے تو اچھا ہی ہے۔ نسخہ حرف بحرف نقل ہے:۔ کاڑی کی جوں بجوں دو سو من، چرخے کی گھوں گھوں پانچ سو من، مچھر کا کلیجہ، سات سو من، مکھی کا بھیجا نو سو من، ان سب اجزا کو اچھی طرح کوٹ کر کنجر کے لنگوٹے میں چھانا جائے اور پھر استعمال میں لایا جائے، انشاء اللہ ہر مرض کے لئے تیر بہدف ثابت ہوگا۔

ایک ایسا ہی مجرب اور خاندانی نسخہ ترقی پسندوں کے پاس بھی ہے۔ یہ نسخہ "ہوالمارکس" سے شروع ہوتا ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:۔ طبقاتی کشمکش، مادی جدلیات، ذرائع پیداوار اور اسی قسم کی دوسری کھادیں۔ رہا سوال کنجر کے لنگوٹے کا، تو وہ کسر کاڈویل کی کتاب "Illusion And Reality" سے پوری ہو جاتی ہے۔ بس یہ دو چار چیزیں آپ کو ازبر ہو جائیں تو پھر تو یہ سمجھیے کہ آپ کو اسم اعظم آگیا عقل کا حملہ ہو یا احساس کا شبخون، سب سے مکمل محافظت ہو گئی۔ سیاست، معاشیات، فلسفہ، مذہب یہاں تک کہ ادب، جس سرزمین میں جی چاہے دندناتے پھریئے، سب راستے آپ پر کھلے ہوئے ہیں، یہ نقشہ ہر جگہ آپکی رہنمائی کرے گا۔ بلکہ اصلی ترقی پسند تو وہ ہے جو جان جان کر اینڈی بینڈی بھول بھلیوں میں اپنے آپ کو پھنسائے، اور رفتہ رفتہ کے ذرا میں ... باہر نکل آئے اور اس کا سانس تک نہ بگڑا ہو۔ ... کہ ترقی پسند نقطۂ نظر بلفظ سیموئل بٹلر کے ... عالم دین کی طرح ہیں:

"یہی جناب بڑے بڑے نازک اور گہرے شکوک پیدا کر سکتے تھے اور پھر انہیں یوں چٹکی بجاتے میں حل کر کے رکھ دیتے تھے، گویا علم الٰہیات نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو یہ کھجلی کا روگ لگا لیا تھا تاکہ کچھ کھجوانے ہی میں لطف آئے، یا پھر ترک کے حکیموں کی طرح اپنے ہاتھ سے اپنے جسم میں ان زبردست شکوک و شبہات کے خنجر بھونک لیتے تھے یہ دکھانے کے لئے کہ عقیدے کے زخم کتنی آسانی سے اچھے ہو جاتے ہیں!"

خیر، جہاں تک سائنس، معاشیات، سیاست، فلسفہ مذہب وغیرہ کا تعلق ہے وہاں تک تو مجھے دم مارنے کی مجال نہیں۔ ان چیزوں میں تو میں ترقی پسندوں کو بالکل مولوی محمد اسمٰعیل کی چیونٹی سمجھتا ہوں ——— بڑی عاقلہ ہے بڑی دور بیں ہے"۔ یہاں ترقی پسند جو کچھ کہہ دیں مجھے سب تسلیم ہے ؎

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

ممکن تھا کہ ادب اور آرٹ کے سلسلے میں بھی میرا یہی رویہ ہوتا، لیکن مشکل یہ آپڑتی ہے کہ یہ معاملہ سرے سے "خبر" کا ہے ہی نہیں، یہاں تو "بے خبری" سے زیادہ کام چلتا ہے۔ سیاست یا معاشیات کی طرح یہ سمجھنے اور سمجھانے کا قصہ ہی نہیں۔ نہ آرٹ کوئی دلیل یا اُقلیدس کا مسئلہ ہے (جسے ساتویں کلاس کے لڑکے تک سمجھ سکتے ہیں) آرٹ تو ایک تجربہ ہے، یہ ایسی چیز نہیں جسے محض تحلیل و تجزیہ، محض دلیل، محض معلومات، یا محض "علم" کے زور سے طے کیا جا سکے، بلکہ شاید "عالم" ہی وہ لوگ ہیں جو دروازہ کھٹ کھٹاتے کھٹ کھٹاتے ڈھیر ہو جائیں، لیکن اندر بار نہیں پا سکتے۔ مگر اطمینان کی بات یہ ہے کہ عالم کبھی دروازہ کھٹ کھٹانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ آرٹ کے معاملے میں علم سے زیادہ وہ جہل کار آمد ...

ایک مستقل انفرادیت تسلیم کرتا ہو، وہ جہل جس میں اتنی صلاحیت ہو کہ آرٹ کی عزت آرٹ کی حیثیت سے کرسکے اور جو اپنے بے پایاں جہل کے ساتھ ساتھ مجھ میں آرٹ پر اس قسم کا اندھا اعتقاد بھی موجود ہے اس لئے میں بھی ادب کی بحث میں [illegible] ملاتا ہوں۔ میں یہ قطعاً دعویٰ نہیں کرتا کہ میں وہاں باریاب ہوچکا ہوں جہاں سے عالموں کو بھی مایوس لوٹنا پڑتا ہے۔ آپ نے غالباً اناطول فرانس کا وہ مشہور افسانہ تو پڑھا ہی ہوگا — جس رومی حاکم کے حکم سے حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھایا گیا تھا، اس سے بڑھاپے میں ایک دوست اس سے حضرت عیسیٰ کے بارے میں پوچھتا ہے، وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے یاد نہیں یہ کون آدمی تھا۔ بالکل یہی حال میرے پڑھنے کا ہے، میں نے بھی ہر صبح پرچوں کا اسی بے دردی سے خون کیا ہے، لیکن مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ پھر بھی میں کچھ نہ کچھ کہنے کی جرأت کر لیتا ہوں کیونکہ اس ہم نالحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ کے زمانے میں مجھے ہی جھجکنے کی کون سی ضرورت ہے۔

ادب میں حقیقت کے تصور کا مسئلہ ایسی چیز نہیں تھی جس پر قلم اٹھانے کی میں پچاس سال کی عمر سے پہلے ہمت کرتا لیکن ترقی پسندوں نے مجبور ہی کر دیا۔ اب تک تو یہ حضرات ذرا صاف صاف لفظوں میں باتیں کرتے تھے، لیکن چونکہ لوگ ایک ہی بات کی رٹ سے اکتا چلے تھے، اس لئے گھما پھرا کر بات کہنا اور مابعد الطبیعاتی قسم کا خلفشار پیدا کرنا لازم آیا۔ لیکن مرغے کی ٹانگیں اب بھی ایک سے دو نہ ہوئیں۔ سیاست ہو یا فلسفہ یا ادب حقیقت کے معنی ہر جگہ ایک ہی رہتے ہیں۔ جدلیاتی مادیت اور طبقاتی کشمکش میرا دماغ خود ایک خلفشار ہے جس کی تربیت و تہذیب میں نے کبھی نہیں کی، اس لئے میں حقیقت کے مفہوم پر کوئی فلسفیانہ یا منطقی بحث کرنے سے قاصر ہوں، لیکن کم سے کم اتنا تو مجھے بھی محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت کا مفہوم زندگی کے ہر شعبے میں ایک نہیں ہوسکتا۔ اس کا تعین تو حقیقت کے شاہد کی شخصیت، اس کا نقطۂ نظر اور اس کی ضرورتیں کرتی ہیں — ضرورتوں سے مطلب مادی ضرورتیں نہیں، لیکن جدلیاتی مادیت کے ماننے والوں کے سلسلے میں مادی ضرورتیں، مثلاً قوم کا رہنا [illegible] معاشیات، فلسفے یا زندگی کے اور شعبوں میں حقیقت [illegible] ہوتا ہے یا کیا تصور ہونا چاہیے، اس سے مجھے کوئی سروکار [illegible] میں نے ان چیزوں کا کبھی سنجیدگی سے مطالعہ کیا [illegible] البتہ ادب میں حقیقت کے تصور کے متعلق میں [illegible] کوشش کروں گا۔ یہاں بھی میں حقیقت کا کوئی بندھا ٹکا یا تلا معیار پیش نہیں کرسکتا۔ میں پہلے ہی کہہ آیا ہوں کہ ادب کا آپ اس طرح تجزیہ نہیں کرسکتے جس طرح کیمیا والوں کی سیاست کا کرسکتے ہیں یہاں تو آدمی مبہم اور پُراسرار الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے، بلکہ میں تو کوشش کروں گا کہ ادب میں حقیقت کے مفہوم کو جتنا سیال اور غیر مرئی بنا سکوں اتنا ہی اچھا ہے۔ ادب میں حقیقت کا اور رہا ہے جو کچھ مفہوم ہو لیکن کم سے کم یہ نہیں ہوسکتا:

چار حصے نہیں چاروں کے ؛ سوکھی ٹوٹے گرے بچاروں کے

اس میں شک نہیں کہ ایک زمانے میں فرانسیسی فطرت نگار اسی کو حقیقت سمجھتے تھے اور ترقی پسند اس پر صرف ذرا سا اضافہ اور کرلے رہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ شاعر اس کے آگے ایک جملہ اور بڑھا دے — ایک دن ایسا آئیگا جب یہی چھپیر محل بن جائیں گے۔ بس جس شاعر نے یہ جملہ بڑھا دیا اُس نے حقیقت کو پوری طرح سمجھ لیا، اور اس کی ترجمانی کر دی۔ اگر یہ شاعر کمیونسٹ پارٹی کو چندے میں [illegible] اور بھیج دے تو وہ ملک کا سب سے بڑا شاعر ہوجائیگا۔

خیر صاحب یہ تو رموزِ مملکت خسرواں ہیں [illegible] آپ ایک گدائے گوشہ نشین کی بات پوچھتے ہیں تو میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ آرٹسٹ کے لئے حقیقت نہ تو چھپیر ہیں نہ محل نہ کمیونسٹ اعلان نامہ۔ اُس کے لئے تو حقیقت ایک احساس ہے، ایک سنسنی، ایک سرمستی، ایک ہسٹریا کا دورہ، یا جیسے شیکسپیئر نے [illegible] کہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ آرٹسٹ کے لئے شعور اور حقیقت ایک چیز ہے۔ یہاں میں لفظ "شعور" کو نفسیات کے معنوں میں استعمال نہیں کر رہا ہوں بلکہ بہت مبہم طور پر، فن کار اپنی حقیقت کا ادراک صرف عقل یا تخلیلی صلاحیت کے ذریعے [illegible]

[illegible] ہے۔ اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے وہ اپنے [illegible] بالکل ہی سے کام لیتا ہے۔ ترقی پسند فن کار سے [illegible] جو سیاسی اور معاشی [illegible] کا مطالبہ کرتے ہیں وہ صرف دماغ کا کام [illegible] اور دماغ فن کار کا کل شعور نہیں ہے، بلکہ اُس کے شعور [illegible] سا حصہ ہے۔ جو حقیقت کے احساسات اور مدرکات [illegible] رنگ سے ہوتے ہوئے گئے ہیں انھیں آپ کس کھاتے میں رکھیں گے؟ فن کار کی حقیقت سیاسی یا معاشی حقیقت سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اُس کے لئے تو حسیاتی حقیقت سب سے بڑی حقیقت ہے، اور اس سے الگ ہو کر وہ فن کار بھی نہیں رہتا۔ یہاں یہ نہ بھولئے گا کہ فن کار کے لئے خیالات بھی حسیاتی حقیقت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ فن کار کے لئے اپنے زمانے کے مروجہ سیاسی نظریوں اور اس قبیل کی دوسری نظریاتی چیزوں کو اس طرح "سمجھنا" بالکل ضروری نہیں جس طرح سیاسی لیڈر یا اسمبلی کے لئے ووٹ دینے والے کو یہ باتیں سمجھنی چاہئیں۔ بلکہ اگر غور کیجئے تو ان سیاسی یا فلسفیانہ نظریوں کے اولین نشانات کسی فن کار ہی کے یہاں ملیں گے اور ایسے زمانے میں جب ان کا سمجھنا سمجھانا تو الگ رہا، لوگوں کو ان باتوں کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ اگر فن کار ان چیزوں تک جا پہنچا تو اس وجہ سے نہیں کہ اُس نے اپنے معاشی ماحول کا یا اپنے دماغ کا تجزیہ کیا تھا، بلکہ صرف اس وجہ سے کہ یہ چیزیں اُس کے حسیاتی شعور اور حسیاتی حقیقت کا ایک حصہ تھیں۔ گولڈسمتھ نے مارکس سے تقریباً ایک صدی پہلے کہہ دیا تھا:

*Ill fares the land, to
hastening ills a prey,
Where wealth accumulates,
and men decay.*

"گہرے تجزیے اور نظریے اور عمل کا اشتراک" ایک گرجدار [illegible] ہے، لیکن فن کار سے اسکا کوئی لازمی تعلق نہیں، یہ [illegible] ہے کہ اتفاقیہ کبھی ایک فن کار کے لئے یہ چیز مفید ثابت [illegible] طرح ایک صاحب نے افسانہ نگار کو ہدایت دی ہو [illegible]

تو ہونا ہی چاہیئے۔ [illegible]... وہ صفات جن سے انسان انسان بنتا ہے اُسے عزیز ہوں گی اور وہ انھیں عام ہوتا دیکھنا چاہیگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ فن کار کو مردم آزار یا آدم بیزار یا انسانوں سے بالکل بے تعلق ہونا چاہیئے، لیکن ادب محض شرافت یا محض رحمدلی بھی تو نہیں ہے ——— شرافت ان معنوں میں کہ جھوٹ نہ بولو، کسی کی چیز نہ چھاؤ، زنا مت کرو، کیا اصلی فن کار دوسروں سے یا اپنے آپ سے اپنی نیک دلی منوانے کے لئے تخلیق کرتا ہے؟ کیا فن کار کی دُنیا، اُسکی حقیقت ایسی ہی سہانی ہوتی ہے؟ مارسل پروست نے کہا ہے کہ کائنات ایک مرتبہ بن کر ختم نہیں ہو گئی، بلکہ جب کوئی بڑا فن کار پیدا ہوتا ہے تو کائنات نئے سرے سے بنتی ہے۔ تو جو آدمی حقیقت کو نئے سرے سے تخلیق کر رہا ہے وہ یہ سوچنے کے لئے کیسے رُک سکتا ہے کہ لوگ مجھ سے خوش بھی ہوں گے یا نہیں، مجھے انسانیت کا بہی خواہ سمجھا بھی جائے گا یا نہیں، "قومی جنگ" میں میری تصویر چھپے گی یا نہیں؟ بلکہ مادی جدلیات یا کسی اور غیر حسیاتی نظریے کے کمربند سے چپکے رہ کر وہ اس نئی حقیقت کا جلوہ کیسے دیکھ سکتا ہے؟ صرف ترقی پسند ہی اس کا تصور کر سکتے ہیں، اور لاریب وہ بڑی قدرت والے ہیں۔

سیاسی مفکر یا سماجی مصلح اور فن کار دونوں حقیقت کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ سیاسی مفکر بغیر کسی سہارے، بغیر کسی طفل تسلی کے اس نظارے کی تاب نہیں لا سکتا۔ یہ صرف فن کار ہی کا دل گردہ ہے کہ وہ بغیر کسی چیز کی آڑ لئے حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے۔ پرولتاریہ کی آمریت اور جدلیاتی مادیت جیسے تصورات کے بغیر کارل مارکس ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا تھا، لیکن بودلیر نے ایسی سستی تسکین قبول نہیں کی۔ اگر حقیقت کی دیواروں میں دراڑیں نظر آتی ہیں تو سیاسی مفکر کو یہ فکر پڑتی ہے کہ کسی طرح جلدی سے جلدی ان میں چونا بھرا جائے، لیکن فن کار انھیں اُلٹا اور توڑتا ہے، کیونکہ اُسے تو ایک نئی عمارت بنانی ہے۔ سائنس دانوں نے تو اب آکر ایٹم کو توڑنے کا طریقہ دریافت کیا ہے، لیکن فن کار [illegible]

[illegible] دلیل کی حفاظت کی خاطر کسی حقیقت [illegible] نہیں ہو سکتا۔ اگر میری دلیل [illegible] کوئی شہادت مل سکتی ہے تو میری دلیل کو ختم [illegible] جانے دیجئے، مجھے کوئی پروا نہیں ہوگی۔ میں خود ہی ایک [illegible]ت کا ذکر کرتا ہوں جو بظاہر میری ساری بحث کی تردید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہمارے زمانے کے سب سے مشہور مصور پکاسو نے پانچ چھ مہینے ہوئے کمیونسٹ ہو جانے کا اعلان کیا تھا، اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ صرف کمیونزم ہی میری تصویروں میں کوئی معنی پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن ترقی پسند اس پر بغلیں بجانے سے پہلے یہ بات یاد کر لیں کہ یہ ساری تصویریں پکاسو نے کمیونسٹ ہونے سے پہلے بنائی تھیں۔ یعنی کمیونزم اُس کی تصویروں میں معنی پیدا کرتی ہے، مگر خود اُس کے لئے نہیں، بلکہ اوروں کے لئے۔ گویا اُس کی تصویریں اصل متن ہیں، اور کمیونزم محض حاشیہ یا تفسیر۔ آپ نے آرٹ کے متعلق "شکر لگی ہوئی گولی" والے نظریے کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ یعنی اصل گولی تو افادیت ہے، اور آرٹ محض شکر، تاکہ لوگ ذرا آسانی سے گولی حلق کے نیچے اُتار لیں۔ یہ نظریہ بہت مقبول ہے، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اصل گولی تو آرٹ ہے، اور افادیت محض اُوپر سے لگی ہوئی شکر ہے۔ افادیت میں سیاسی، سماجی اور فلسفیانہ نظریوں کو بھی شامل کر لیجئے۔ ایسے لوگ بس گنے چنے ہی ہوتے ہیں جو براہِ راست آرٹ سے مانوس ہو سکتے ہوں یا اسے پہچان سکتے ہوں۔ عام طور پر لوگوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ آرٹ کسی نہ کسی جانے بوجھے نظریے میں ملبوس سامنے آئے، تب تو وہ اس کی قدر کر سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ ہربرٹ ریڈ تو اس سے بھی آگے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عام طور پر تو لوگ آرٹ کے عنصر تک بالکل پہنچتے ہی نہیں۔ اگر وہ کسی نظم کی تعریف کرتے ہیں تو یہ تعریف آرٹ کی نہیں ہوتی، بلکہ صرف افادیت کی۔ تو جناب، اس طرح معنی ڈالتی ہے [illegible] کی تصویروں میں فن کار کا کام مسائل کا حل کرنا نہیں ہے بلکہ ہیئت کی جستجو، اور [illegible] آنا [illegible] کی صدائے بے ہنگام ہی کیوں نہ

سمجھیں میں تو یہ کہوں گا کہ ہیئت ہی کل آرٹ ہے اور ہیئت ہی فن کار کی حقیقت ہے۔ ہیئت کی تلاش ایک اخلاقی جدوجہد ہے —— خود زندگی کی تلاش ہے۔ مثلاً اگر آپ نے "Bouvard and Pécuchet" کی ہیئت اور طریقۂ کار کو نہیں سمجھا تو آپ اس دُنیا کو ہی نہیں دیکھ سکتے جو فلوبیر نے یہاں تخلیق کی ہے، بلکہ اس چھپی کتاب کو پڑھ تک نہیں سکتے۔ اُٹھا کر دُور پھینک دیجئے۔

لیکن ان تمام کاوشوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے، اگر آپ مصنف بننا ہی چاہتے ہیں تو آسان سا نسخہ موجود ہے۔ "حکیمانہ حقیقت نگاری" کیجئے۔ فن کار نہ سہی، "نیم حکیم" تو بن ہی جائیں گے۔

اعترافِ شکست

یہ حال ہے کہ حقیقت ذرا نہیں معلوم
مرا دعا ہے یہی۔ ہم کو کیا نہیں معلوم؟

یہ کائنات یہ نیرنگ دلفریبِ وجود
وہ گنجلک ہے کہ جس کا سرا نہیں معلوم!

طبیبِ فکر نے مانا مرض تو تاڑ لیا
مگر جناب کو اس کی دوا نہیں معلوم

کسی نے ڈال دیا جیسے لا کے صحرا میں
پتا ہی منزلِ مقصود کا نہیں معلوم

ہزار رنگ کے جلووں سے ہے نظر الجھی
مگر یہ سحر یہ جادو ہے کیا؟ نہیں معلوم!

جھلک دکھائی ہی کیوں گلستاں میں غنچے نے
کھلا تو کس لئے مرجھا گیا نہیں معلوم

نہاں ہے نور میں ظلمت تو درد راحت میں
ہے راز کیا! یہ ہے کیا ماجرا! نہیں معلوم

ہے وقت ایک مگر مختلف اثرات
کہاں سے آئی یہ "بے ڈھب بلا" نہیں معلوم

یہی جوان یہی پیر کرتا جاتا ہے
مگر کسی کو بھی اسکی دغا نہیں معلوم!

مئے حیات فزا خانہ ساز تھی لیکن
اسی میں زہر کہاں سے ملا؟ نہیں معلوم

ہماری سعی کا انجام تک خلافِ امید
کوئی کہاں ہوئی سرزد خطا؟ نہیں معلوم

امیں قصور ہے اپنی ہی کم نگاہی کا
گدا کو چاہیے دیکھے نہ خواب شاہی کا

امین حزیں

بازِ دستِ آموز

فریب خوردۂ صیاد بازِ دست آموز!
ہزار حیف کہ فطرت کا تجھ کو پاس نہیں!
تجھے ذرا نہیں احساسِ تسمہ برپائی
[illegible] کعبہ، اسیری خودی شناس نہیں

(۲)

چڑھا ہے ہتّے، مگر دستِ راست بنا ہے
خدا کو تیری سمجھ کب سے ہو گئی پیاری؟
پہن کے نقرئی گھنگرو مغالطے میں نہ پڑ
فریب کار شکاری کی جانب عیاری

(۳)

ترے شکار کا ممنون سفرۂ صیاد
کمائی تیری مگر عیش کوئی اور کرے!
ستم ظریفیٔ صیاد کا سبب کیا ہے؟
ترا یہ فرض نہیں کیا کہ تو بھی غور کرے؟

(۴)

فضائے دشت و جبل کی کہاں وہ آزادی
کہاں وہ عیش [?] آشیانے کے؟
وہ جد و جہد کا جذبہ تری جھپٹ میں کہاں؟
کہ تیرے طور طریقے ہیں ننگ کھانے کے

امین حزیں (سیالکوٹی)

ذہنی اُلجھن

حجاب امتیاز علی

(۳)

نمازِ ظہر کے بعد موم بتی کا جنازہ نہایت تزک و احتشام سے قبرستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سے کچھ ہی دیر پہلے فیروز کا ایک خط مجھے ملا جس میں لکھا تھا کہ محلسرا کی کئی ایک کنیزیں اور خادمائیں اور دوسری رفیق عورتیں جنازے کا نظارہ دیکھنے کو سرخ سیبوں کے اُس باغ میں جا رہی ہیں جو قبرستان کے رخ واقع ہے۔ میں بھی ضرور وہاں پہونچوں اور تجہیز و تکفین کے بعد باغ کے عقبی دروازے پر اس کی منتظر رہوں۔

یہ خط پڑھکر میں عجیب کشمکش میں گرفتار ہو گئی کہ مجھے فیروز سے وہاں ملنا چاہیئے یا نہ ملنا چاہیئے! موم بتی کی پاکیزہ زندگی اور موت کا میرے دل پر اتنا گہرا اثر تھا اور اس کی شرافت و حیا کا مجھ پر ایسا سکہ بیٹھ چکا تھا کہ اپنے اس انسانی جذبے پر سخت اعتراض تھا کہ میں کیوں فیروز سے ملنا چاہتی ہوں۔ ارادہ ہوا کہ خط لکھکر دردِ سر کا بہانہ کر دوں۔ مگر دل یہ بھی نہ مانتا تھا۔ کئی ہفتوں کے بعد فیروز سے ملنے کا اک موقع نصیب ہوا ہے۔ بہانہ بنا کر اسے بھی ٹال دوں؟ اس سے ملوں یا نہ ملوں ــــــ؟ اس قسم کا سوال آج تک میرے دل میں پیدا نہ ہوا تھا۔ مگر آج میں فیصلہ نہ کر سکتی تھی کیا کروں۔ اک عجیب قسم کی ذہنی اُلجھن تھی جو منٹوں میں مجھے دیوانہ سا بنائے دے رہی تھی۔ میں اپنے آپ سے جھنجلائی ہوئی تھی۔ حقیقی ذہنی کشمکش ذہنی ارتقا کی دشمن ہے!

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ اور رفیق خواتین کے ساتھ جنازے کا نظارہ دیکھنے سرخ سیبوں کے اُس باغ میں چلی گئی جو قبرستان کے رخ تھا۔

میت سپردِ خاک کر دی گئی۔ اور بظاہر اسکی کتابِ زندگی ختم ہو گئی ــــــ مگر اندرونی طور پر میں محسوس کر رہی تھی کہ اس کی کتابِ حیات کی اک اک سطر میرے صفحۂ ذہن پر ابھرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرے ساتھ کی عورتیں دیکھ کر [illegible] چلی گئیں۔ ادھر میں اپنی کشمکش اور اُلجھن سے نڈھال سی ہو رہی تھی۔ اور اب تک فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ مجھے اپنے عاشق سے ملنا چاہیئے یا نہ ملنا چاہیئے۔ موم بتی مرحومہ کے وہ الفاظ "حیا عورت کا زیور ہے" میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اُدھر فیروز کے وہ دلربا فقرے "تشنہ رخ! دُنیا میں محبت سے سُہانا اور پاکیزہ جذبہ اور کوئی نہیں"۔ رہ رہ کر میرے جذبات کو اُبھار رہے تھے۔ فطرتِ انسانی کا تقاضا یہی تھا کہ میں فیروز سے ملتی۔ مگر شرافت و حیا کا جو معیار تمدن و تہذیب نے بنا رکھا ہے، وہ مجھے اپنے اس خالص انسانی جذبے پر نفریں کرنا سکھا رہا تھا۔ میں سخت ذہنی تکان محسوس کرنے لگی۔

اُس دن سورج بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ اور زمین سے اک عجیب قسم کی گرم بھاپ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر لوگ منتشر ہو چکے تھے۔ میں تھکی ماندی زنانہ باغ کے عقبی دروازے میں جا بیٹھی کہ اپنے مضمحل اعصاب کو سبک رو سمندری ہوا کے جھونکوں سے تر و تازہ کر سکوں۔ باغ کی دیوار سے تھوڑے ہی فاصلے پر نیلا سمندر موجیں مار رہا تھا اور اس کی مسلسل ہوائیں میرے گرم رخسار سے مس ہو ہو کر گذر رہی تھیں۔ فضا میں سرخ سیبوں کے نوشگفتہ پھولوں کی نکہتیں ملفوف تھیں۔ وہاں میں بے ارادہ جا بیٹھی تھی۔ مگر نہ معلوم کیوں اپنے آپ کو بلا وجہ سخت گناہ گار اور مجرم محسوس کر رہی تھی۔ میں نے کونسا گناہ کیا ــــ اور میرا جرم کیا تھا ــــــ؟ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پھر بھی میں اپنے کو نہ معلوم کیوں کمتر اور ناچیز نظر آ رہی تھی۔

موم بتی کا یا اسکی موت کا ویسے مجھ سے کوئی ذاتی تعلق نہ تھا مگر قدیم معاشرت کی اس ہیروئن کے اخلاق اور اسکی غمناک زندگی نے مجھے اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ میں اپنے دل کے تقاضوں اور جبلتِ انسانی کو نفرت کی نگاہ

عہد بھی لگی تھی۔ اُس باحیا بے زبان عورت نے محض تمدنی ثقافت کے زیرِ اثر رہ کر مرد معالج سے علاج کرانے پر موت کو ترجیح دی تھی اللہ میں ؟ محض انسانی جذبات سے مجبور یہاں فیروز سے ملوں یا نہ ملوں، کی اُلجھن میں گرفتار ہونے آئی تھی۔ موم بتی نے فطرتِ انسانی کو کچل کر تہذیب کی لاج رکھ لی۔ اور میں دل کے تقاضوں سے مجبور ہوئی جا رہی ہوں۔ میں خیال ہی خیال میں اپنا اور مرحومہ کا موازنہ کرنے لگی۔

میں انہیں اُلجھنوں میں مبتلا تھی کہ یک لخت قدموں کی چاپ سُن کے میرا خون تیزی سے دوڑنے لگا۔

"فیروز!" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور میں دو قدم پیچھے ہٹ کر خاموش کھڑی ہو گئی۔

"تم آ گئیں!" وہ اشتیاق سے میری طرف بڑھا۔

میں دو قدم اور پیچھے ہٹ گئی۔ "میں آنا نہ چاہتی تھی مگر پھر ...."

"آنا نہ چاہتی تھیں ــــ ؟ کیوں ــــ ؟"

"کیونکہ ـ کیونکہ" میں کوئی صاف جواب نہ دے سکی اور نظریں نیچی کئے چپ چاپ زمین کو تکتی رہی۔

"تھکی ہوئی ہو میری شہ رخ ؟"

"ہاں ـ نہیں ــ" میری کشمکش جاری تھی۔

وہ حیران سا رہ گیا۔ "صاف صاف بتاؤ نا کیا بات ہے۔ تم ایسی کیوں ہو؟ خفا ہو؟ کوئی بات ہوئی ؟ قریب تو آؤ۔ تمہارے دل کی دھڑکن سُن لوں تو خود سمجھ جاؤں گا کہ تم ایسی کیوں ہو۔" یہ کہہ کر وہ قریب آ گیا۔

میں نے گھبرا کر کہا۔ "نہیں۔ ٹھہرو۔ وہیں ٹھہرو۔"

فیروز دل شکستہ سا ہو گیا "تمہاری حرکتیں بہت دل شکن ہیں۔"

یہ سُن کر میں نے سوچا اسے اپنی اُلجھن بتا دینی چاہئے۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "تم سے کئی باتیں کرنی ہیں۔"

یہ سُن کر اُسے ڈھارس سی بندھی بولا۔ "تو چلو سمندر کی طرف چلو۔ آسمانوں سے اک شفاف نور برس رہا ہے۔ اور زمین پر گھاس کے شگوفوں کی مہک آ رہی ہے۔ ایسی چمکیلی حسین دوپہر میں زندگی میں کتنی آتی ہوں گی ؟ وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے میری شہ رخ۔ تم بھی بہت چھوٹی ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ تو آؤ میرے پہلو کا سہارا لے کر سمندر کی طرف چلو۔"

دو لمحوں کے لئے تہذیب و شائستگی کی زنجیریں میں نے بھی ڈھیلی کر دیں اور اک ننھی چڑیا کی سی آزادی محسوس کرنے لگی۔ ہم دونوں سمندر کی لہروں کے قدموں میں اک چھوٹی چٹان کے زیرِ سایہ اک دوسرے کے سہارے بیٹھ گئے۔

میرے انداز میں اجتناب محسوس کر کے فیروز کسی قدر بُرا مان گیا۔ "تم کچھ خوش نظر نہیں آتیں۔ کہیں اپنے نئے عہدے پر تو نازیبا نہیں ہو گیا ؟"

"میں تم سے ملنے کو بیتاب تھی۔" میں نے کہا۔

"خوب بیتابی ہے کہ دو ہفتوں میں اک ملاقات بھی نہ ہو سکی۔ ہوتی بھی کیونکر؟ اب تو تم ملکہ کی خاص الخاص رفیقہ کی اعلیٰ خدمات پر مامور ہو چکی ہو۔ شاہی محفلیں اور دلچسپیاں۔ اور ــــ اور" اور فیروز نے اک آہ بھری۔

"میں تم کو کئی اک نئی خبریں سُنانا چاہتی تھی اور تم روٹھے بیٹھے ہو۔" میں اس کی ناراضی کو رفع کرنے کے لئے اس سے باتیں کرنے لگی۔

"ہمہ تن گوش ہوں سُناؤ۔"

میں کہنے لگی۔ "تمہیں معلوم ہے جب سے میں ملکہ کی قربت میں رہنے لگی ہوں مجھے شاہی محفلوں میں بھی شریک ہونا پڑتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اُس نے کہا۔

"تو گذشتہ ہفتے کی بات ہے کہ نواب محبوس نے مجھے اک جشنِ رقص سے واپسی پر اپنے ساتھ اپنی گاڑی میں بٹھا لیا اور ملکہ کے محل تک پہونچایا۔ میں تمہیں یہ خوشخبری سُنانے کا موقع ڈھونڈتی رہی کہ اب میرا ملنا جلنا کس قدر اعلیٰ مرتبت لوگوں کے ساتھ ہے۔ یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے نا فیروز ؟"

"ہو گا۔ مگر میرے لئے خوشخبری نہیں ہے۔" فیروز نے خشکی سے کہا۔

"اور میں تمہیں سُنانے کو بے چین تھی۔"

"میں سُن کر بے حد [illegible] ہوں۔"

"... [illegible] کا آدخیال کرو" میں نے کہا۔

"... [illegible] سنہری زلفوں کو دیکھو جو آفتاب کی [illegible] طرح [illegible] اور چمکیلی ہیں۔ ان ہونٹوں کو دیکھو جو بہار کے گلاب کی پنکھڑیوں سے مشابہ ہیں۔ آلائش [illegible] گرم ہیں [illegible] آپ پر کیا۔ تمہارے ساتھ چند لمحے بسر کر لینا ہر مرد کے لئے ایک نئی فردوس بستر آجانے کے مترادف ہے [illegible]۔ آہ! تم بے حد بھولی ہو۔ اسکا کیا علاج کروں؟"

"مگر نواب محبوس ..."

فیروز نے بات کاٹ دی "اب خدا کے لئے بوڑھے نواب کا ذکر جانے دو۔ جوان دلوں کی بات کرو۔ نواب کے کرم سے [illegible] اور نوازش کی داستانوں کو تہہ کر ڈالو۔ مجھے باتیں سناؤ۔ اپنی صرف اپنی۔ !! اس درخشاں بہاریں دو پہر میں تم اس سرو کی طرح معلوم ہو رہی ہو جس کی شاخیں جنوب کی ہواؤں سے مست ہو کر جھوم رہی ہوں۔ دو ہفتوں کے اندر اندر تم کسقدر حسین نکل آئی ہو!"

یہ کہہ کر فیروز نے میری ٹھوڑی اوپر کو اٹھائی اور جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو لرز گئی۔ سورج کی تیز اور سنہری روشنی میں اور سمندری چٹان کے دلفریب سایہ تلے اسکا چہرہ یونانی [illegible] کے زہد شکن بت کی طرح دلکش نظر آ رہا تھا۔ اگر اس کی بے پناہ کشش نے مجھے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیا تو ...؟ میں یک لخت ڈر سی گئی۔ اس لئے کہ موم بتی کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے آیندہ میرا ارادہ اسی کے نقش قدم پر چلنے کا ہو رہا تھا۔ لیکن اب فیروز کی ہوشربا باتیں سنکر اور اس کی زاہد فریب صورت دیکھکر میں بے ضبط سی ہو رہی تھی۔ میں ایک بے چینی محسوس کرنے لگی۔ یہ بے چینی کیسی نامعلوم اندرونی کشمکش اور شدید احساس جرم کا نتیجہ تھی۔ مجھے رہ رہ کر موم بتی اور شریف عورت کے کردار کا خیال آنے لگا۔ آہ! میں تو اپنی معاشرت اور ثقافت کی شیدائی اور موم بتی کی سی خصلتیں اپنے آپ میں دیکھنے کی متمنی! اب مجھے یک لخت یہ کیا ہو رہا تھا؟

"میں کس قدر گناہ گار ہوں" بے ساختگی اور بے بسی میں میرے منہ سے نکلا اور میں فضا سے ہٹ گئی منہ کے زہریلے سانپ نے مجھے ڈسنا شروع کر دیا۔

"تم یک لخت گھبرا کیوں گئیں؟" فیروز کہنے لگا۔

"کچھ نہیں فیروز۔ مجھے موم بتی کا خیال آگیا۔"

"تو گھبرا کیوں گئیں؟ پہلے کبھی موت نہیں دیکھی؟"

"یہ بات نہیں" میں نے رکتے رکتے کہا "دیکھو اب ہمیں واپس جانا چاہیئے۔"

"بس اکتا گئیں؟"

"اکتائی کیسے! مگر ہمیں واپس جانا چاہیئے۔"

"تمہاری یہ حرکتیں کسقدر حوصلہ شکن ہیں۔ نجانے سر میں ان دنوں کیا سمائی ہوئی ہے! اتنے دنوں بعد آج ملیں تو یہ تامل اور اجتناب؟"

مگر میرا احساس جرم بڑھتا ہی گیا۔ فیروز سے تنہائی میں باتیں کرتے ہوئے مجھے جہنم کے شعلے نظر آنے لگے میں نے بے صبر ہو کر کہا "اب مجھے جانے دو۔"

"نہیں ابھی نہیں! پہلے یہ بتاؤ میری طرف سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے یا واقعی نئے تقرر اور نئی اعلیٰ سوسائٹی نے تمہیں بدل ڈالا ہے۔ اور نئی محبت کی تلاش ہے؟" فیروز بے حد دل شکستہ نظر آ رہا تھا۔

"ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے صرف اپنی پاکبازی پر غرور کرنے کی تمنا ہے۔ تم نے موم بتی کی زندگی کی تفصیل نہیں سنی؟ تم نے اس کی موت کے حالات نہیں سنے؟ وہ کتنی پاکباز تھی؟"

فیروز چڑ سا گیا۔ "کیا مطلب؟ مجھ سے علیحدہ رہ کر تم پاکباز کہلاؤ گی؟ موم بتی بیچاری پرانے زمانے کی قیدی عورت تھی۔ اس کا اور تمہارا کیا مقابلہ؟"

بے اختیار میں بول پڑی "تم اس کی شان میں ایسے کلمات نہ کہو۔ وہ بے حد پاکباز تھی!"

"اور تم کیا ہو؟"

"میں!" میں نے رکتے ہوئے کہا "اس کے مقابلے میں گناہ گار۔"

فیروز چڑ سا گیا بولا "بہار کی اس جمیل دوپہر میں ایسی احمقانہ باتیں نہ کرو۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہو۔ اپنے عقل و ہوش میں آؤ۔ اب تم ملکہ شہر سے بہت قریب ہو گئی ہو مجھے تمہارے نئے تقرر سے زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ اب تم

موقع محل دیکھکر علیا حضرت پر ہماری محبت کو ظاہر کردوگی اور ان سے شادی کی اجازت جلد حاصل کر سکوگی۔"

"ابھی مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ ملکہ سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ کنواری لڑکیوں کی زبان سے شادی کا نام سُننا ناپسند کرتی ہیں۔"

وہ ہل گیا۔ "تو کیا بیاہی ہوئی عورتوں کی زبانی انہیں شادی کا لفظ بھاتا ہے؟ جو اپنے پُرانے شوہروں سے بیزار ہو چکی ہوں؟ اور نئی شادی کی فکر میں ہوں؟"

"توبہ توبہ! تم کیسی باتیں کرتے ہو! ملکہ اور ایسی باتیں سُنیں! میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کنواری کی زبان سے محبت و عاشقی کا نام سُننا گوارا نہیں کرتیں۔"

فیروز حقارت سے بولا۔ "کریں بھی کیونکر؟ جو خود بھوکا ہو وہ دوسرے کو روٹی کھاتا کیسے دیکھ سکتا ہے؟ وہ خود جو بیچاری تمام عمر محبت سے محروم رہیں۔ مگر اس سے ہمیں کیا! تم جلد سے جلد اپنا مطلب ادا کردو۔"

"مگر تم جانتے ہو وہ عورت میں کس قسم کے اوصاف دیکھنا پسند کرتی ہیں؟"

"شہ رخ! تم کیسی دل جلانے کی باتیں کرتی ہو! ملکہ خود عورت ہیں پھر آخر کیوں وہ عورت کی دشمن بنی ہوئی ہیں؟ سب جانتے ہیں کہ عورتیں انسان ہیں موم کی پتلیاں نہیں۔ عورتیں انسانی جذبات اور انسانی ولولے رکھتی ہیں ملکہ چاہتی ہیں کہ عورتیں فطرت کے خلاف بغاوت کریں؟ اپنے اُن فطری خیالات وجذبات کو تہذیب وثقافت کے مصنوعی پردوں کے پیچھے ذبح کردیں جو قدرت نے انہیں عطا کر رکھے ہیں؟ بتاؤ ملکہ چاہتی کیا ہیں؟"

اسی وقت دُور سمندر کی سبز موجوں پر کسی تنہا حواصل کی چیخ سُنائی دینے لگی۔ اور گہرا نیلا سمندر کسی وحشی درندے کی طرح گرم دوپہر کی ویرانی میں گرجنے لگا۔

"تمہیں ملکہ کے متعلق ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔ "شادی کے سلسلے میں میں خاتون ندحی سے امداد لوں گی۔"

"تم براہِ راست ملکہ سے اجازت کیوں نہیں لیتی ہو؟"

"مجھے شرم اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔" میں نے نظریں نیچی کرکے کہا۔

"شرم اُس وقت آتی ہے جب انسان کوئی گناہ کرتا ہے۔ تم شادی کو گناہ سمجھتی ہو؟"

"کہہ جو دیا۔ میں خاتون ندحی سے مشورہ کروں گی۔"

"تو جواب کب دو گی؟"

"اتنے بے صبر کیوں ہوتے ہو؟"

"تم نے محبت کی بے صبریاں نہیں دیکھیں۔ اگر تم نے اس میں دیر لگائی تو میں خود علیا حضرت سے اجازت حاصل کرلونگا۔ سُن رہی ہو؟"

"نہیں نہیں ــــــ کہیں ایسا نہ کرنا۔ اور پھر اس موقع پر جبکہ ملکہ موم بتی جیسی پاکباز عورت کی موت سے متاثر ہیں یہ سلسلہ جنبانی بہت ہی نامناسب ہے۔"

فیروز خشکی سے بولا۔ "اونہہ نامناسب!! اک مُردہ عورت کو زندگی کے ولولوں سے لبریز ایک زندہ جوڑے کی زندگی میں مخل ہونے کا کوئی حق نہیں۔"

میں التجا کے پیرائے میں بولی۔ "خدا کے لئے میری بات مانو۔ آجکل ملکہ بے حد متاثر ہوں گی۔"

فیروز کہنے لگا۔ "ان کے متاثر رہنے کی مدت کتنی ہوتی ہے؟ کچھ تمہیں اندازہ ہے؟"

میں بولی۔ "یہ تو واقعات پر منحصر ہوگا اتنی جلدی نہ کرو۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہوکر رہے گا۔"

وہ کہنے لگا۔ "یہی تو مجھے خدشہ ہے کہ کچھ نہ کچھ ہوکر رہے گا۔ خدا نہ کرے جو کچھ نہ کچھ ہوکے رہے۔ خدا کرے وہ ہو جس کی تمنا میرے جسم میں اک علیحدہ روح بنائے ہوئے ہے۔ نہ وہ جس کے خیال سے میں لرز جاتا ہوں۔"

"بھلا وہ کونسا خیال ہے جو تمہیں لرزاتا ہے؟"

"کیوں زخم کو کُریدتی ہو شہ رخ؟ کیوں میرے نفس سے کھیلتی ہو؟ کیوں سُننا چاہتی ہو کہ مجھے کونسا خیال لرزہ براندام کردیتا ہے۔ بس تمہاری نئی خدمت کا خیال تمہاری بے وفائی کا اندیشہ۔ تمہاری معصومیت اور محل کی زندگی کا کھٹکا اک بات ہو تو کہوں۔ ہزاروں ہیں۔"

[illegible] ہو۔"

"ہاں۔ کچھ عرصہ بعد تم مجھے اس نعتبے مخاطب کر سکو گی۔"

"[illegible] مجھے اس وجہ پریشان کئے ہوئے ہیں؟"

میں بولی "بے بنیاد باتوں پر غور کر کے ہلکان ہونا عقلمندی ہے؟"

وہ کہنے لگا "باتیں پہلے بے بنیاد ہی ہوتی ہیں بعد میں ان کی بنیاد پڑتی ہے"

"فیروز! تمہیں اگر مجھ سے محبت ہے تو ضبط و صبر سے کام لینا سیکھو۔"

وہ جل گیا "میں اس ضبط و صبر کا قائل نہیں جو انسان میں مجرمانہ خیالات کو ابھارے۔ ضبط و صبر تو اس چیز کے لئے کیا جاتا ہے جو قبضۂ اختیار سے باہر ہوتی ہے جیسے موت! مگر ان باتوں میں صبر اور ضبط کو میں حماقت سمجھتا ہوں۔"

"تمہارا اداس چہرہ مجھ سے نہ دیکھا جائے گا فیروز! مسکراؤ خدا کے لئے مسکراؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں خاتون روحی سے کل ہی ملنے کی کوشش کرونگی اور پھر بہت جلد تمہیں جواب دوں گی۔ وہ دیکھو بانس کی سربلند ٹہنیاں کانپنے لگیں۔ اور کوئل کی چیخ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ عصر کا وقت ختم ہو رہا ہے مجھے اس وقت ملکہ کے لباس خانے میں حاضر ہونا چاہیئے۔ اس لئے مسکرا دو اور مجھے خدا حافظ کہو۔"

مختصر افسانے

کمسنی

کتنی ٹھنڈی ہے کمسنی کی رُت
دُور ابھی ہے شباب کی گرمی
ابھی تلخی نہیں ہے جلووں میں
ابھی ہلکی ہے مے نگاہوں کی

شفق کی دھاریاں

ڈوبتا جاتا ہے سورج دُور دریا سے پرے
چاند اُبھر آنے کو ہے مشرق سے لیکر کروٹیں
یوں شفق کی دھاریاں آتی ہیں پانی میں نظر
جیسے سیمیں جسم پر ساری کی بھیگی سلوٹیں

کافرجمال

دلِ بیتاب تو نے بھی دیکھا
کتنا کافرجمال تھا اُس کا
یعنی اُسکی طرف بس ایک نظر
دیکھ لینا ہی عشق کرنا تھا

یاد کی گونج

گونجتی ہے یوں کسی کی یاد میرے ذہن میں
جیسے کنج گل میں بھونروں کی نوائے دلنشیں
جیسے ریتیلی زمیں پر سُست رَو ندی کا گیت
جیسے پنگھٹ پہ سُنہرے کنگنوں کی بھیرویں

علی احمد

سلام مچھلی شہری

میں تمہارے علاوہ بھی کچھ سوچ سکتا ہوں ——!

۱۴ اگست ۴۵ء

سرد ہواؤں کے دامن پر اے پرچم! لہراتا جا
بربطِ آوِ گنگ و جمن پر اے پرچم! لہراتا جا
مُردہ انسانوں کے کفن پر اے پرچم! لہراتا جا
میرا پرچم چھوٹ گیا ہے ہاتھوں میں زنجیریں ہیں
تیری زد میں میرے وطن کے افسردہ نظارے ہیں
دوشِ ہمالہ پر لرزیدہ ٹھنڈے چاند ستارے ہیں
میرا پرچم چیخ رہا ہے "یہ ایوان ہمارے ہیں"
لیکن میرے ہاتھ بندھے ہیں اور سر پہ شمشیریں ہیں
تو بھی اس غمگین فضا سے شاید کچھ مانوس نہیں
میری زمیں امریکہ نہیں ہے چین نہیں ہے روس نہیں
لیکن تیرا لہرانا بھی میرے لئے منحوس نہیں
میری اسیری، تیری بلندی خواب کی سب تعبیریں ہیں

---

۱۵ اگست ۴۵ء

ہیلو کامریڈ! چائے حاضر کروں
کہ کافی؟
مگر ایسے میں جبکہ موسم بھی ہے آج توبہ شکن
"وھسکی" بہتر رہے گی خدا کی قسم
بڑھ رہی ہے پھوار
اور فضا نغمہ بار
اشتراکی نظریوں کا کیا بھرم
یہ تو ہے اپنے اوپر سراسر ستم
جبکہ فطرت بھی کرتی ہے ہم پر کرم ——!

—— پاسِ ناموسِ گنگ و جمن، خوب ہے
واقعی یہ خیالِ وطن، خوب ہے
یہ ــــــ یکھو وہ نازک بدن خوب ہے
—— ہاں تو ہم ــــــ ستاں
جس کو کہتے ہیں لوگ جنت نشاں
کچھ نہیں، سڑتی نعشوں سے آباد ہے
نعش ــــ طاعون زدہ ——
سوکھی ہوئی نعش
بکھری ہوئی نعش
اور اُن میں شیطانوں، بھوتوں کے یہ قہقہے
جنکو ہم اور تم اپنے الفاظ میں ڈھالتے ہیں یہاں
اور "وھسکی" کا اک گھونٹ لیکر سمجھتے ہیں اپنا ہی ہے ہندوستاں!
انقلاب اور تخیل میں کچھ فرق ہے
جیل بھرتا رہے تم کو کیا
اور بنگال مرتا رہے تم کو کیا
چند تحریریں کافی ہیں
تقریریں کافی ہیں
کرتے رہو
اور مضامین پرچوں میں لکھتے رہو
اس سے بھی اور زیادہ کرو ہی گے کیا ——؟!
موت افروز لمحات گھٹنے لگے
جنگ کے سُرخ بادل بھی چھٹنے لگے
اور قیصر بکنگھم "بھی سمجھنے لگا!
ہم بھی لے جا رہے ہیں خوشی کے چراغ

سحرِ تہذیب ہے منتظر ہے تو ہو
اور اجنتا کے بت ہنس رہے ہیں تو کیا —
جنگ جیتی ہے ہم نے
ہمارے وطن نے
ہمارے سپاہی نے —!
یہ ٹھیک ہے!!
ہاں مناؤ خوشی۔ رقص ہو۔ گاؤ
کہ یہ ٹھیک ہے۔
پر بہیمیت یہاں سی چھا گئی!
لیکن، مجھے اک بات یاد آ گئی
کہ تم نے ایک تحفہ دیا ہے ہمیں
یعنی "ذراتی بم"
جس کے آگے ہے تہذیب اب سر بہ خم
پھر بھی تہذیبِ نو کی کرن کی قسم
ایک تحفہ ہے یہ
جنگ کے دیوتاؤں نے بخشا ہے یہ
اور یہ دیوتا میرے اپنے خدا ہیں خدا ہیں۔ خدا کی قسم
میرا اپنا وطن اس سے مسرور ہے۔
پھر بھی مجبور ہے
ورنہ طوق و سلاسل کی جھنکار میں
ناچتا۔ گیت گاتا
کچھ اس طرح کے گیت گاتا
کہ دنیا سمجھتی زمیں جل گئی
آسماں جل گیا
اور تہذیبِ نو کا خدا جل گیا
"معاف کر دو مجھے کامریڈ!
میں بہکنے لگا ہوں۔ بہکنے لگا ہوں
مجھے تھام لو —!!!

۲۶۔ اگست ۱۹۴۵ء

"مسجد" کے مینار پکارے
"آؤ بہرِ نماز!"
"مندر" کی دیوار پکارے
"لو پوجا کا ساز!"
"اللہ اکبر — اللہ اکبر!!"
"نارائن — نارائن"
"خالقِ اکبر" شاداں شاداں —!
"مندر کے بت" رقصاں رقصاں —!!
ایسے میں شیطان پکارے
دور سے گورستان پکارے —
"جنگ اور موت اور خون!"
"دنیا ایک جنون —!"
مسجد کے اشجار پکارے
مندر کے شہکار پکارے
"اللہ اکبر۔ اللہ اکبر!"
"نارائن۔ نارائن"
"ہندوستان" کی نم آنکھوں سے
دھیرے دھیرے آنسو ٹپکے —!!
مسجد کے مینار پکارے۔
"آؤ بہرِ نماز!"
مندر کی دیوار پکارے —
"لو پوجا کا ساز —!!"

***

گیت اور تہذیب و تمدن

مشتاق احمد مہدی

کسی قوم کے گیت پر اگر غور کیا جائے تو اُس قوم کے مذہبی اعتقادات اور تہذیب اور تمدن کا آسانی سے پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض گیتوں سے سیاسی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ گیت کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کو عوام اور گھریلو عورتیں گاتی ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنکو گویّے گاتے ہیں۔ پہلی قسم کے گیتوں میں فن موسیقی کا بہت کم حصّہ ہوتا ہے دوسری قسم کے گیتوں کا تعلق زیادہ فن موسیقی سے ہوتا ہے۔ عوام کے گیت زیادہ سیدھی سادی گھریلو زندگی کے ترجمان ہوتے ہیں جس میں سہیلیاں یعنی خاوند اور ساس و نند کا ذکر ہوتا ہے یا سہیلیوں سے بات چیت۔ اور چُہل ہوتی ہے یا موسم کا ذکر ہوتا ہے اور اس موسم کا جو اثر گانے والی کے جذبات پر پڑتا ہے اس کا اظہار ہوتا ہے جیسے بارہ ماسہ کے گیت ہیں۔ خاوند کے ہجر و وصل کے سوا ان گیتوں میں عشق یا پریم کی خانہ براندازی نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے موسیقی کے گیتوں میں ہر طرح کے گیت ہوتے ہیں۔ ایسے بھی جن میں خاوند یا کرشن کنہیا کی بے اعتنائی کی شکایت اور اُن کے ساتھ عشق کی تڑپ کا اظہار ہے اور ایسے بھی جن میں غیر سے آنکھ لگائی جاتی ہے۔ ہندی گیتوں میں جذبات کا اظہار ہمیشہ عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ عورت طالب ہوتی ہے اور مرد مطلوب۔ علم موسیقی کے قواعد کے مطابق صبح شام دوپہر کے راگ جُدا جُدا ہیں، اسی طرح خاص موسموں کے بھی راگ ہیں جیسے ملہار، بسنت اور ہولی وغیرہ۔ صبح کے راگ از قسم بھیرویں وغیرہ میں اکثر فراق کے مضمون ہوتے ہیں کیونکہ صبح ہوتے ہی محبوب سے جدائی ہو جاتی ہے۔ شام کے گیت وصل یا انتظار کے ہوتے ہیں۔ علم موسیقی کے ماہران کا خیال ہے کہ یہ علم چونکہ حکماء نے ایجاد کیا ہے لہٰذا انہوں نے مختلف امراض کا علاج مختلف راگ راگنیوں کے ذریعہ کرنا تجویز کیا تھا۔ کسی زمانے میں اس پر عمل بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح بعض گانے ایسے تھے جن سے چراغوں میں آگ لگ جاتی تھی جیسے دیپک راگ

اور بعض گانوں سے مینہ برسنے لگتا تھا۔ دُھرپد میں تان سین کمال میں شاہ سدا رنگ۔ ٹھمریوں میں واجد علی شاہ اور محمد شاہ رنگیلے۔ بھجن میں سورداس اور میرا بائی مشہور ہیں اور دوہے گسائیں تلسی داس اور کبیر کے زبان زد خلائق ہیں۔ اس زمانہ کے بعد مظہر، تراب، خادم، مشتری، نظامی، اشرف علی، سلطان، فرحت، تائب وغیرہ بہت سے گانے بنانے والے حضرات پیدا ہو گئے اور لطف یہ ہے کہ یہ سب مسلمان ہیں اور گیت سب ٹھیٹ ہندی میں ہیں۔ اکثر وہ غلط ہندی میں نہیں جس میں سینما اور ریڈیو کے گیت بنانے والے حضرات طبع آزمائی فرماتے ہیں۔ اور مضمون بھی زیادہ تر ہنود کے اعتقادات و رسم و رواج کے مطابق ہیں۔ ان حضرات کے گیت تقریباً ایک صدی سے ہر گویّے کے مُنہ پر ہیں۔ اور مقبول خاص و عام ہیں۔ اور ان کو ہندو مسلمان عیسائی سب خوش ہو کر گاتے ہیں۔ اور قومی یک آہنگی کا ثبوت صاحب بصیرت کے لئے پیش کرتے ہیں اور اسلامی بے تعصبی کی لاجواب مثال قائم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندی راگ کو نہ صرف اپنایا بلکہ بے حد کمال اور ترقی پر پہنچایا۔ نئے نئے راگ ایجاد کئے اور ہر قسم کے خوشگوار تصرفات کئے۔

یوں تو بعض قوموں میں گھر والی عورتیں بیاہ شادی اور ہر خوشی کے موقع پر خود ہی آپس میں مل جل کر ڈھولک پر گا نا گا لیتی ہیں چنانچہ ریڈیو پر ڈھولک کے گیت جو عام طور پر پنجابی میں ہوتے ہیں بہت مقبول ہیں مگر گھریلو جھولے کے گیت بہت مشہور ہیں خاصکر دلی اور نواح دہلی میں مثلاً سب سے زیادہ عام گیت تو یہ ہے۔

"جھولا کِن گارو رے امریاں (راتی رو) دو کبھی جھولیں دو ہی جھلا دیں۔ چار دن مل گیاں بھول بھلیاں"

اس گیت کے معنے صاف ہیں کہ کسی محبت کرنے والے نے باپ بھائی یا سیّاں نے امریوں میں جھولا ڈال دیا ہے۔ امریاں آم کے پیڑ کے جھنڈ کو کہتے ہیں اور دلی میں قطب

یعنی مہرولی میں جھرنے کے پاس ایک جگہ امریاں کہلاتی ہے جہاں صرف ایک دو بچے آم کے درخت نظر آتے ہیں۔ کبھی زمانے میں یہاں آم کا گھنا باغ ہوگا۔ لوگ میلوں کے موقعہ پر اب بھی امریوں میں جھولا ڈالتے ہیں اور اپنی عورتوں کو جھولا جھلاتے ہیں۔ شاہی زمانے میں اس جگہ شہزادیاں جب سیر کو آتی تھیں تو جھولے جھولتی تھیں اور پاس ہی ایک پھسلن بنی ہوئی تھی اس پر سے پھسلتی تھیں۔ اس گیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی عورتوں میں جھولا جھولنے کا یہ دستور ہے۔ دو عورتیں تو پاؤں جوڑ کر جھولے پر بیٹھ جاتی ہیں اور دو پاس کھڑے ہو کر جھونٹے دیتی ہیں اور سب مل کر گاتی ہیں۔

دوسرا گیت عام طور پر یہ گایا جاتا ہے کیونکہ جھولے کی بہار برسات ہی میں ہے اور ان جھولے کے گیتوں کو ملہار میں گایا جاتا ہے۔

سکھی تنے بدرا جھوم کے (اجی) سنگ کی سہیلیاں
پار پہنچیاں۔ مولا میں بھی پہنچوں لاج سے۔

اس گیت کو حقانی معنوں میں بھی لیا جاتا ہے کہ سب ساتھی تو خدا رسیدہ ہو گئے کاش کہ ہمیں بھی یہ درجہ حاصل ہو جاوے۔ قوالی میں اس گیت پر رقیق القلب حضرات کو بہت حال آتا ہے۔

اسی قسم کا ایک اور گیت ہے:

دھیرے بہو ندیا دھیر بہو سیاں اترینگے پار
گہری ہے ندیا ناؤ پرانی۔ مولا لگا دے بیڑا پار۔ ندیا دھیرے بہو۔

معنے صاف ہیں کہ محبوب یعنی شوہر سفر سے واپس آ رہا ہے۔ اُسے پہاڑ اور دریا پار کرنے ہونگے اس لئے دعا ہے کہ ندی اتر جائے کہ سیاں سہولت سے پار ہو جاوے۔ پھر گانے والی ڈرتی ہے کہ ندی تو گہری ہے اور کشتی پرانی ہے اس لئے خدا سے التجا کرتی ہے کہ تو ہی بیڑا پار کرے گا۔ اس گیت میں بیوی کی اپنے شوہر سے دلی محبت معلوم ہوتی ہے۔ اس گیت کو اس معنے میں بھی لیا جاتا ہے کہ ہم کو دنیا میں مشکلات کا سامنا ہے خدا ہی ان کو رفع کرنے والا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی ہر موقعہ پر خدا کی طرف رجوع ہوتے تھے۔

ایک اور گیت جھولے پر گایا جاتا ہے:

سنو سکھی سیاں جوگیا ہو گئے۔ میں بھی جوگن ان کے ساتھ
رنگ کے لال لال کپڑے۔ جوگن کے لمبے لمبے کیس۔ سنو سکھی الخ
جوگیا نے چھائی جنگل جھونپڑی جوگن نے دیا ہر ساتھ۔ سنو سکھی سیاں الخ
جوگیا بجائے بین اور بانسری۔ جوگن گائے ملہار۔ سنو سکھی سیاں الخ

اس گیت میں ہنود کی اس رسم کی طرف اشارہ ہے کہ اکثر لوگ دنیا سے بیزار ہو کر جوگ اختیار کر لیتے تھے اور جنگل میں جا بستے تھے۔ مگر ہندو عورت کی وفاداری کا بھی اس میں ذکر ہے کہ اگر پتی جوگی ہو گئے تو کیا ہوا بیوی ہر حال میں اس کی شریک ہے۔ وہ بانسری بجائیگا تو میں ملہار گاؤنگی۔ وہ گیروا کپڑے پہنے گا تو میں اپنے بال کھول دونگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

دو ایک اور جھولے کے گانے ہیں جو چھوٹی بچیاں گاتی ہیں۔ ایک ہے:

"نیم کی نبولی پکی ساون کب آویگا
جئے میرا ماں کا جایا ڈولی بھیج بلائیگا
ڈولی کا ڈنڈا ٹوٹا گاڑی بھیج بلائیگا
گاڑی کا پہیہ ٹوٹا چادر بھیج بلائیگا"

مطلب یہ ہے کہ سسرال میں لڑکی گئی ہوئی ہے ساون آنے کا انتظار کر رہی ہے کہ تیجوں پر جو گھر میں رسم ادا ہوگی تو اس کی شرکت ضروری ہے اُسے بلایا جائے گا۔ نیم کی نبولی ساون میں پکا کرتی ہے وہ بھی پک گئی اب دیر کیا ہے۔ پھر اُمید بندھتی کہ بھیا مجھے جس طرح بھی ہوگا ضرور بلائے گا۔ ڈولی نہ ہوئی تو گاڑی سہی اور گاڑی نہیں تو بھیا چادر بھیجینگے جسے اوڑھ کر میں پیدل ہی چلی جاؤنگی۔ اس گیت میں بہن بھائی کی محبت پر روشنی پڑتی ہے کہ بہن کو کس قدر اپنے بھائی پر اعتماد ہے اور کس محبت سے وہ اس کا ذکر کرتی ہے۔ اور یہ کہ تیجوں میں لڑکی کی شرکت ضروری ہے۔ ایک اور گیت تیجوں کا ہے

کوئی نیا چاول لائیو رے دال ہے مسور کی
میرا بھیا چاول لائیو رے دال ہے مسور کی

اس گیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مسور کی دال کے ساتھ چاول کا جوڑ ہے۔

سیاسی گیت ۱۸۵۷ء سے قبل اور اس کے بعد انگریزوں کے متعلق گائے جاتے تھے جو اب تلاش سے بھی دستیاب نہیں ہوتے۔ چند بول یاد ہیں اُن سے فرنگیوں کی طرز زندگی کے متعلق جو عوام کا اس وقت خیال تھا وہ ظاہر ہوتا ہے یعنی اُس زمانے میں اوّل تو بہت کم تھے دوسرے عوام ان کی معاشرتی زندگی اور خوبیوں سے واقف نہ تھے۔ ظاہرا جو دیکھتے اور سنتے تھے

اس پر رائے قائم کرتے تھے۔ شراب خواری اور ناچ یہ دو ایسی چیزیں تھیں جس کے طریق استعمال کو ہندستانی تحقیر سے دیکھتے تھے، چنانچہ ایک گیت کے بول ہیں۔

ہوٹل ناچے بوتل ناچے ناچے بوتل خانہ
بلبلی صاحب کی ٹوپی ناچے میم صاحب کا جامہ

اس گیت سے اُس زمانے کے انگریزوں اور ہندستانیوں کے روحانی تعلقات پر روشنی پڑتی اور عوام کی بے باکی پر کہ اس واقعہ پہ گیت جوڑ لئے۔ مندرجہ بالا تینوں گیتوں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس وقت تک انگریز کا وہ رُعب نہ تھا جو اب ہے، اور ہندستانی میں غلامانہ ذہنیت کا نہیں بلکہ کچھ اپنی برتری کا احساس تھا۔

گوتے اور رقاصہ و مغنیہ کے گیت کے بول راگ راگنیوں اور تال و سُر کے مطابق لگائے جاتے تھے۔ مطلب مضمون سے اتنا نہ تھا جتنا کمال موسیقی کے اظہار سے تھا اس لئے بول بہت خفیف ہوتے ہیں البتہ موسموں کے گیت میں چونکہ موسم کی تصویر کھینچی جاتی ہے جس کے لئے تفصیل کی ضرورت ہے اس لئے ان میں بول زیادہ ہوتے ہیں۔ پہلے عام راگ راگنیوں کے گیتوں پر غور کیجئے۔ کافی راگ کی ٹھمری لیجئے۔

کاہے شام موری چولی مسکائی ۔ کرو نہ ڈھٹائی موری چھوڑو کلائی
انترہ۔ اپنی گرج پر پیاں پڑت ہو
دیکھی شام توری سب چترائی۔ کاہے شام الخ
انترہ۔ جاؤ پیا کرو کوئی جتن اب
ایک نہ مانوں میں تو رام دُہائی۔ کاہے شام موری الخ

شام سے مُراد کنہیا جی سے ہے سانورے یا سانولے رہی ہیں۔ اس ٹھمری میں ایک گوپی کنہیا جی کے چھل معشوقانہ انداز میں شکایت کر رہی ہے اور اپنی عصمت بچانے کے لئے رام دُہائی دیتی ہے۔

محبوب خفا ہو گئے ہیں عورت اپنی لاچاری کا اظہار جھنجوٹی میں اس طرح کرتی ہے:۔

مورا سیاں۔ مانے ملائے ہاری۔ مورا سیاں الخ
(انترہ) بنتی کرت ہوں کر جوڑت ہوں بسیں ہو جبر من جھکائے ہاری رے مورا سیاں۔ بنتی بمعنی منتی کر بمعنی ہاتھ بسیں سر اور جبر من پاؤ۔ مطلب صاف ہے کہ عورت پیر

بڑے ہی ہے مگر موصاحب اکڑے ہوئے ہیں کسی طرح بات نہیں سُنتے

اسی طرح ایک اور گیت کے چند لفظ یاد ہیں۔ یہ گیت کنجریاں گایا کرتی تھیں۔

اپنی میم کو نچائے گورا نیم کے تلے۔ گورا نیم کے تلے کھڑا نیم کے تلے۔ اپنی میم کو نچائے۔ الخ

پہلے گیت میں شراب پینے سے جو چکر آتا ہے اور ساری دُنیا چکر کھاتی نظر آتی ہے اس کی حقارت آمیز تصویر کھینچی ہے دوسرے میں کھڑے ہو کر منظر عام میں بے شرمی سے ناچنے پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ ایک اور گیت ہے جو تاریخی نقطہ نظر سے زیادہ اہم ہے، وہ بھی ناتمام ملا ہے مگر اس سے مطلب کھل جاتا ہے۔ گیت کے چند بول یہ ہیں۔

"دُھر بھگنے سے چلا فرنگن پانچوں پیر منائے
رب مرا جانے رے پانچوں پیر منائے
دو مقام دلّی کے کئے تیجی گنگینہ گام
سارے گام میں جا کر ڈھونڈا سرتن ملتی نائیں
بھیدی نے بھید دیا دادا کو۔ باجرہ کاٹتی سرتن پکڑی۔ دھاکے ڈھو لئے میں۔ رب مرا جانے رے الخ
ہاتھ پکڑ دادا کو ہاتھی پہ بٹھایا سرتن روتی جائے
مرا رب جانے رے سرتن روتی جائے "

(اب جب سرتن کی شادی فرنگن سے ہو جاتی ہے اور اپنے ملنا جلنا ہوتا ہے تو بھیا بھتیجے سب مل لئے آدمی چند ملنا نائیں۔
(جب سرتن یورپین گھر میں پہنچتی ہے تو اس کو طرز رہائش بدلنے کی نصیحت ہوتی ہے)

پیڑھی کا بیٹھنا چھوڑ مری سرتن کرسی کا بیٹھنا سیکھ۔ رب جانے رے کرسی کا بیٹھنا سیکھ۔ چوکے کا کھانا چھوڑ مری سرتن میز پہ کھانا سیکھ ..... وغیرہ وغیرہ۔

اس گیت میں تین نام ہیں جن میں سے ایک تاریخی ہے اور اس کے ساتھ دوسرا نام بھی اب تاریخی ہو گیا۔ فرنگن صاحب اصل میں فریزر صاحب تھے شاید یہ دلّی میں ریزیڈنٹ بھی رہ چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے یہ کسی جاٹنی پر جس کا نام سرتن تھا اور جو گنگینہ گاؤں کی رہنے والی تھی عاشق ہو گئے اور اسے کھیت کاٹتے ہوئے پکڑ بلوایا۔ پہلے اس کو صدمہ ہوا مگر جب وہ راضی ہو گئی اور چند عزیز بھی اُس سے مل لئے تب

چل دیکھو سکھی شرب کی گلی۔ جہاں احمد پیارو سانور یا (انترہ) مدینے کی گلیوں میں حیرت پھرت رسول حسین یا ایک وحدت و حدت سادات کی کاندھے یہ کملی وحدت۔ کلمے کی بجاوت باسریا اتنو، توحید کا رنگ جماوت ہو عرفان کا گلال اُڑاوت ہے۔ وہ شرب طہورا پلاوت ہے۔ جیسے پی کے بھئی میں باوریا۔

معراج کے متعلق ہندی میں ایک گیت پہلے بہت گایا جاتا تھا جس کا صرف یہ بول یاد ہے۔

علی کو باتی من موہن جا عرش ۔ آیو آ من میں۔ واللیل ہے وا کی زلف دتا۔ والشمس ہے مکھڑا چاند سا ہے ملاکو دکر قرآن میں؛ ایک نعت ماندھیں ہے۔ نام محمد مصطفےٰ مجھے پیارو لاگو جی۔ پشت یہ مہر نبوت چمکے سر۔ قطب تارا۔ پل میں ی معراج کو پہیچے حوروں نے تن من وارا۔ لولاک لما کا چتر پرلے گلے حمائل قرآن۔ ستوہ مجادے الم نشرح سورت کی شان۔

ہندو مسلمانوں کے من بوسندم تومن ستدی کے مونے وہ گیت ہیں جن میں اُردو ہی نہیں جس سے بعض لوگ اب حراغ پا ہو رہے ہیں بلکہ فارسی اور بھاشا گنگا جمنا کی طرح تھا ہوگئی ہے ایک زمانے میں اس قسم کے گیتوں کا رواج عام تھا۔ نمونہ از خروارے ملاحظہ ہو۔

(۱) اے جان جہاں تا چند طپیم : دکھلا دو موہے ٹک اپنی جھلک
(۲) یکدم نہ رود از یاد مرا ÷ تو را سندر مکھ نوری کھری الک
(۳) باز آنکہ بہ درد تمنا یت۔ مورے نبناں روت بلک بلک

. . . . . .

(۴) القصہ چو مرغ بریدہ گلو۔ کلپوں تڑپوں تم بن کب تک
(۵) یا شاہ رسل کرم بہ دنگاہت۔ ہیں سیس وحدت سب جو ملک
(۶) بطفیل غلام سگ نشہ حسن ۔ اب جائے ہیچ توپے ملاوے ملک

ہندی میں حضرت علی کا یہ بدھاوا جوگیا میں گایا جاتا تھا۔

"حضرت علی گھر بجت بدھاوا ۔ حوروں نے پریوں نے منگل گاوا (انترہ) جودھ طبق میں باجی ودھائی ۔ حسن حسن جنم جگ پاوا۔ حوروں نے پریوں نے منگل گاوا"

ایک بدھاوا اور ہے جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

"سکھی آدگا قدری بدھاوا مل مل آج قطب جمال گھر کاج (انترہ) اپیر تیسیر ہانسی تحت بر برتی پال کے رین برس کرو راج" اسی طرح محمد شاہ کا چتر رنگ سینے: "چتر رنگ ملی سنگ تو ہی چرلیے جہانگیر محمد شاہ بادشاہ غازی" اکبر اعظم کے تخت نشینی کا گیت کا نرو راگ میں یوں ہے: "شب گھڑی شبھان مہورت۔ بیٹھے تخت آج دلی پت برسے (انترہ) چار و جگ جیو ہمایوں کے نندن اور دھت ہن پت شاہ اکبر رسے۔

مندرجہ بالا گیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندو مسلمان میں مذہب جُدا ہونے کے باوجود کوئی فرق نہ تھا اور ایک دوسرے سے کوئی تعصب نہ رکھتے تھے جہاں مسلمان ہندی میں گیت اور دوہے لکھتے تھے اور ہندی موسیقی میں کمال حاصل کرتے تھے اور یہ کام معمولی لوگ ہی نہیں بلکہ امراء میں عبدالرحیم خان خاناں و مشائخ میں حضرت امیر خسرو و محمد جائسی جیسی ہستیاں اپنے ذمے لیتی تھیں وہاں ہندو فارسی میں کمال حاصل کرنا اور تصوف کی تعلیم پانا اپنا فخر سمجھتے تھے اور مشائخ اسلام کی دل سے عزت کرتے تھے۔ ایک طرف مسلمان کنہیا جی کے گیت سُن کر حقانیت کی طرف رجوع ہوتے تھے دوسری طرف ہنود مناجات و قوالی بڑے شوق سے سنتے تھے اور مسلمانوں کے مشائخ کے عرس اور ہنود کے میلوں میں دونوں برابر کا حصہ لیتے تھے۔ ہنود میں کبیر اور نانک جیسے بزرگ مسلمانوں کے اصولوں کو اپنے دوہے اور گیتوں کے ذریعہ رواج دے کر وحدت کی تعلیم پھیلاتے تھے۔ اس موقعہ پر چند دوہے لکھے جاتے ہیں جو مشرقی اخلاقی تعلیم کا نچوڑ ہیں اور جس پر ہندو مسلمان سب متفق ہیں۔ یہ دوہے روزمرہ گانے والے بابجا استعمال کرتے تھے۔ اور روز سنتے سنتے زبان زد خلائق ہو گئے تھے ان میں بے ثباتی زندگی و گردش زمانہ و عشق حقیقی و نصائح اقسام پائے جاتے ہیں نمونہ ملاحظہ ہو

تن کی تنگ سرائے میں کمی نہ پاؤ چین
کوچ نقارہ عشق کا باجت ہے دن رین
بیتے گھٹ میں سوجت نہیں لعنت ایسی چند
نانک یا سنسار کو ہوا موتیا بند
پہلے رزق باندھے پیچھے اور درویش
جن کو تکیہ رب کا ان کو رزق ہمیش
جو میں ایسا جانتی پریت کیے دُکھ ہوئے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی پریت نہ کیجیو کوئے

محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے

فضل احمد کریم فضلی

"میرے پیارے! تم بڑے شریر ہو، لکھتے ہو اب میرا خط تمہیں نہ ملا کرے گا (میرا دل دھک سے ہو گیا آگے پڑھتی ہوں تو) ..... لکھنے والا خود تمہاری آغوش میں ہوگا! مارے خوشی کے میرے ہاتھ سے خط گر پڑا، اُف، خوشی برداشت کرنا بھی کتنی مشکل چیز ہے! میں چیختی ہوئی کمرے سے باہر دوڑ گئی اور ڈالی (بیٹی) کی انگلیاں پکڑ کے ناچنے لگی، ذرا سی بچی گھبرا گھبرا کے مجھے دیکھنے لگی، میں نے اُسے اُچک کے گود میں اُٹھا لیا اور زور سے پیار کر کے دھڑام سے زمیں پر گرا دیا، تمہارے ڈیڈی آ رہے ہیں، تمہارے ڈیڈی آ رہے ہیں! یہ سنتے ہی وہ جھٹ سے اُٹھ بیٹھی اور اپنی ممی تالیاں بجانے لگی جیسے اسے چوٹ ذرا نہیں لگی، ڈیڈی آ رہے ہیں، ڈیڈی آ رہے ہیں، ہم اور وہ ہوائی جہاز میں اُڑ یں گے، ممی! تمہیں نہ لے جائیں گے، اچھا تمہیں بھی لے جائیں گے، اوہو ہو، ڈیڈی، ڈیڈی، اُف، اُف میں کتنی خوش ہوں، دو برس تو انتظار کے گذار دیئے مگر اب یہ چند دن کیسے گذریں گے، مجھے اپنی خوش قسمتی کا یقین نہیں آتا، جی چاہتا ہے چیخوں، بھاگوں، دوڑوں، جس دن تمہارا ہوائی جہاز آئے گا اس دن میرا کیا حال ہوگا، خیال آتے ہی بدن میں تھرتھری پیدا ہونے لگتی ہے۔"

حرف دُھندلے ہونے لگے اور میں مبہم خیالوں میں کچھ کھو سا گیا، پیارے اور شریر شوہر! میرے قدموں کے پاس پھولی ہوئی چار لاشیں پڑی ہوئی تھیں، تھوڑی دیر ہوئی دریا میں ڈوبے ہوئے ہوائی جہاز سے نکالی گئی تھیں، ان میں سے ایک اس "پیارے اور شریر شوہر" کی بھی تھی، مگر یہاں ان بگڑی ہوئی شکلوں کو پہچاننے والا تھا ہی کون؟ کسے معلوم تھا کہ ان میں لکھنے والی کا پیارا اور شریر شوہر کون تھا اور کون وہ تھے جن میں کوئی پیارا اور شریر کہنے والا نہ تھا، شاید وہ پیارے اور شریر ہی نہ رہے ہوں یا رہے ہوں، کون جانے!

بہرحال اب تو سبھی برابر تھے، ایک لاش کی انگلی میں انگوٹھی پہننے کا نشان نظر آیا، لاشیں نکالنے میں کچھ لوگوں نے بڑی مستعدی دکھائی تھی، دیسیوں کی لاشیں نہیں بلکہ صاحب لوگوں کی، دیسی جیسے زندگی میں ٹھکے ہوئے تھے ویسے ہی مرنے کے بعد بھی، ہاتھ خالی، جیب خالی، پیٹ خالی، صاحب لوگ جس طرح زندگی میں صاحب مال و متاع تھے اسی طرح ان کی لاشیں بھی تھیں، نوٹ سے بھرے منی بیگ، فاؤنٹین پن، سگریٹ کیس، انگوٹھی، قیمتی گھڑیاں وغیرہ بہت ملی ہوئی تھیں، پہلے تو "صاحب" کی لاش چھونے میں ہماری جھجک، آخر ایک منچلا ہمت کے محیط کا تیرا اور دست درازی کر ہی بیٹھا، ایک ٹانگ جو نظر آ رہی تھی پانی سے کھینچ لی، لیکن اس بے ادبی پر صاحب نے ٹھوکر نہ ماری، لاش بھی گھسٹتا چلا آیا اس سے نہ صرف یہی بلکہ کچھ مال غنیمت ہی ہاتھ لگا، پھر تو دوسرے بہادر بھی جھم جھم پانی میں کودنے لگے، لوٹ کھسوٹ شروع ہو گئی ایک ایک لاش سے دو دو تین تین زندہ چمٹنے لپٹنے لگے، قسمت آزمائی کا اچھا موقع تھا، ایک چھینا جھپٹی تھا دوسرا چھینتا تھا، کچھ پکڑے گئے تو خیر ورنہ بعد میں جب پولیس آئی تو اطلاع کر دی، انگوٹھی کے نشان والی لاش کا معائنہ جاری تھا کہ ایک شخص نے آ کے انگوٹھی کے چور کا پتہ نشان بتایا، اُس نے اپنی آنکھوں سے انگوٹھی اُتارتے دیکھا تھا، چور منع کرنے سے بھی نہ مانا، پولیس نے چور کو گرفتار کیا، انگوٹھی برآمد ہوئی، شادی کی انگوٹھی، اس کے ایک حصے میں ای، ایچ (E.H) کندہ تھا، خط کے لفافے پر فلائٹ لفٹننٹ ایڈمنڈ ہارڈی [illegible] لکھا تھا، E.H یقیناً ایڈمنڈ ہارڈی [illegible] کا مخفف تھا، یہ خط ایک چمڑے کے بیگ سے نکلا تھا، اسی کی وہ عبارت تھی جسے ابھی پڑھ رہا تھا، اس خط کے علاوہ بیگ میں اور بہت سے خطوط تھے اور خط لکھنے کا سامان وغیرہ، خط ہاتھ میں تھا اور خیال کہاں

[illegible] سب [illegible] نے تھیں جو ایسے موقعوں پہ
[illegible] والے کے دل میں کیا کیا ارمان رہے
[illegible] ہو گا کہ مستقبل کیوں ہنس رہی ہے'
[illegible] کیا حال ہو گا دیکھو وغیرہ"! بیگ میں نمایاں طور
[illegible] سائز کی تصویر لگی ہوئی تھی، تصویر ایک خوبصورت
[illegible] کی تھی، چہرے پہ دلکش مسکراہٹ تھی، ایک کونے میں
[illegible] (خاص تمہاری) لکھا تھا، دستخط تصویر
کے [illegible] حصہ پر تھی اور صاف پڑھی نہ جا سکی، اس تصویر
سے کچھ خیالی باتیں بھی ہو گئیں، موجودہ مسکراہٹ اور آئندہ
آنسوؤں کے متعلق فرسودہ خیال آرائیاں.....

فرائض منصبی کی مشین جو ان خیالات کے ریلے میں پڑ کے
تھوڑی دیر کے لئے رک گئی تھی پھر چلنے لگی مگر اسی قسم کے
خیالات آ آ کے رکاوٹیں پیدا ہی کرتے رہے، ایک خفیف
سی ذہنی جنگ چھڑ گئی، دل میں خود بخود ان خیالات کی
تردید میں دوسرے قسم کے خیالات آنے لگے۔ ایسا ہوا ہی
کرتا ہے، لوگ مرا ہی کرتے ہیں، کوئی کسی طرح، کوئی کسی طرح
اکثر موت بے سان وگمان ہی آتی ہے، معلوم نہیں اس حادثہ
سے بڑے بڑے اور کتنے حادثے اسی وقت رونما ہو رہے
ہوں گے، آدمی اگر یہی سب سوچا کرے تو کوئی کام ہی نہ کر سکے
آخر اس تضیع اوقات سے فائدہ؟ فائدہ کی بھی ایک ہی رہی
کیا آدمی سب باتیں فائدے ہی کے لئے کرتا ہے!

خط کے حرف پھر صاف نظر آنے لگے۔ "تمہاری پہنی ہوئی
قمیض اب تک میرے پاس ویسی ہی رکھی ہے، میں نے اسے
دھلوایا تک نہیں، کیوں دھلواتی، اس میں تمہاری خوشبو
بسی ہے، خاص تمہاری، میں روز سوتے وقت اسے سونگھتی
ہوں، رات بھر میرا دماغ اس سے معطر رہتا ہے اور میں
اچھے اچھے خواب دیکھا کرتی ہوں۔ اُف تمہارے بدن کی خوشبو!
اب میں بجائے قمیض کے تمہارے تمام جسم سے یہ خوشبو
سونگھوں گی"۔ میں رومال سے نتھنے بند کئے کھڑا تھا،
تماشائیوں میں کوئی ناک سکوڑ رہا تھا، کوئی ناک کپڑے سے
ڈھانکے تھا، قریب قریب سبھی چک چک تھوک رہے تھے!
اب چاہنے والی بیوی صاحبہ جسم کی خوشبو سونگھیں، نا لاش
[illegible] کو کوئی راضی نہ ہوتا تھا، بڑی مشکل سے انہیں مٹی کے

نیچے دبوایا گیا، جب مٹی کے ڈھیر کے نیچے انگوٹھی والی لاش دبی
تھی اس پر لکڑی کا ایک نشان لگا کے "ایڈمنڈ ہارڈی" لکھ
دیا گیا، یہ نشان کب تک رہے گا! اسے کون دیکھنے آئے گا!
آخر یہ حماقت کیوں؟ مگر اس کا کیا علاج کہ دل بعض وقت
اسی قسم کی حماقتیں بلا وجہ کیا کرتا ہے اور انہیں بلا وجہ
حماقتوں سے تسکین پاتا ہے۔ وہ زمین جہاں لاشیں پڑی
تھیں فنائل سے خوب دھو کے پاک کی گئی، مرنے والوں کی
چیزوں کا تفصیلی جائزہ لیا جانے لگا۔ اُن کی باضابطہ فہرست
تیار ہونے لگی، داروغہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا جاتا
تھا اور رکھتا جاتا تھا جیسے چوری کے مال کی فہرست تیار کر رہا
ہو، خطوط کے بیگ کو میں نے اپنے قبضے میں عارضی طور پر
لیا، کیوں نہ اس خیالی تصویر میں جو دماغ سرا پر بنائے جا رہا
تھا خط پڑھ پڑھ کے حقیقت کی رنگ آمیزی کروں، خط
پڑھنے کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔

۱۵ر جنوری" میرے پڑوس میں تین چار دن ہوئے
ایک مسز براؤن آ کے رہنے لگی ہے، محلہ کی عورتوں سے اس کی
بڑی نوک جھونک رہتی ہے، طعنے دینے میں ماہر ہے۔ بڑا
اتراتی ہے بچی ری! اس کا میاں ہوائی بیڑے میں سارجنٹ
ہے، جب اسے معلوم ہوا کہ تم ہوائی بیڑے میں لفٹننٹ
ہو تو جھینپ گئی، اب مجھ سے کم ملتی ہے"۔

قبر پر نام لکھنے والے سے میں نے پوچھا کہ اس نے کیا نام
لکھا ہے؟ اس نے جواب دیا: "ایڈمنڈ ہارڈی"!
میں "نہیں لفٹننٹ ایڈمنڈ ہارڈی لکھو"!

۲ر اپریل"... مسز براؤن کو اس کے شوہر کا خط مہینوں
نہیں ملتا، تین مہینے سے کوئی خط نہیں آیا اور تمہارا خط
ہوائی ڈاک سے ہر ہفتے آتا ہے، تم میں اور دوسروں میں
کتنا فرق ہے، مجھے سب رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں اور
میں فخر سے مسکرا دیتی ہوں... !"

۱۰ر اپریل"..... مسز براؤن کی سب ہیکڑی ختم ہو چکی
ہے، میرے سامنے تو یوں بھی ہیکڑی نہ کرتی تھی آج ڈاک
کا دن تھا، اس کے شوہر کا پھر کوئی خط نہیں آیا، مسز براؤن
ڈاکئے کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی، میں نے بڑی شان سے
تمہارا خط لیا، لیکن ویسے ہی وہ آ گئی، عجب بے تُک عورت ہے

اب میں اُس کے سامنے تمہارا خط کیسے پڑھوں، اس کا حال [illegible] نہ پڑھوں تو چین کیسے آئے، جوں توں اسے ٹالا، اس نے پوچھا کہ تمہارا خط آیا ہے یا نہیں، شاید یہ سوال پوچھتے ڈرتی تھی، جواب جانتی ہی ہوگی، اس کے جانے کے بعد مجھے بڑا افسوس ہوا، اب جا کے شام کو اس کی تسلی تشفی کروں گی .... "

۳۰ اپریل" آج قریب چار مہینے کے بعد مسز براؤن کو اس کے شوہر کا خط آیا، بس چند سطریں ٹیڑھی میڑھی کھنچی ہوئی تھیں "میں اچھا ہوں کام میں مصروف، اُمید کہ تم بھی اچھی ہوگی" معلوم ہی نہیں ہوتا کہ بچھڑی ہوئی بیوی کے نام اس کے دور افتادہ شوہر کا خط ہے، اور تمہارے خطوط! ہر لفظ محبت کا دہکتا ہوا انگارہ معلوم ہوتا ہے، پڑھتی ہوں اللہ اس کی گرمی دل و جان میں سرایت کرتی محسوس کرتی ہوں، جب دوسروں سے تمہارا مقابلہ کرتی ہوں تو مجھے اپنی خوش قسمتی پر پہلے سے بھی زیادہ ناز ہونے لگتا ہے ."

۸ مئی "..... کل ہماری ڈالی [illegible] کی سالگرہ تھی، میں نے اسے جیتی جاگتی گڑیا بنایا تھا، تمہارا تحفہ پا کے بہت خوش ہوئی، اس کے قد کے برابر کی گڑیا، اُٹھانے میں مشکل ہوتی ہے مگر شوق اتنا ہے کہ لئے لئے پھرتی ہے "ڈیڈی، ڈیڈی" کی رٹ ہے، تم نے اسے دو برس کا دیکھا تھا، اب دیکھنا تو کہنا، ایسی بانکی نکل رہی ہے کہ کچھ نہ پوچھو، کیوں نہ ہو کس کی بیٹی ہے! تم اتنا یاد آئے کہ میری آنکھیں خود بخود بھیگ گئیں. "

۱۴ مئی "... میری پرانی سہیلی للی [illegible] کل مجھ سے ملنے آئی تھی، اپنے شوہر کی بیوفائی کا رونا رو رہی تھی، وہ سخت برہم تھی، غصے کی بات ہی ہے، اُس کو اطلاع ملی ہے کہ اُس کا شوہر ہندوستان میں خوب رنگ رلیاں کر رہا ہے، وہاں کی عورتوں کے متعلق مشہور ہے کہ بڑی جادوگر ہوتی ہیں، للی کا خیال ہے کہ اس کے شوہر پر جادو کر دیا گیا ہے، ورنہ وہ ایسا نہ تھا، مجھے اس کے جادو کے قصے پر بڑی ہنسی آئی، کتنی بھولی بھالی ہے، میں نے تمہارا ذکر کیا آخر تم بھی تو ہندوستان میں ہو، تم پر تو کوئی عورت جادو نہ کر سکی، للی کی سمجھ میں بات کچھ کچھ آئی اور وہ بہت روئی، مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ناحق اس کے شوہر کا تم سے مقابلہ کیا مگر کیا کرتی مجھ سے نہ رہا گیا، جب دوسروں پر تمہارے تفوق کا ذکر کرتی ہوں تو مجھے ایک خاص خوشی محسوس ہوتی ہے، مجھے کیا معلوم تھا کہ میری بات [illegible] للی کا صدمہ بڑھ جائے گا، وہ اپنے شوہر کو تو [illegible] نظر سے دیکھنے لگے گی......"

۲۱ مئی "....... للی مجھ سے برابر ملنے آتی ہے، [illegible] تمہارا اور ہندوستان کا ذکر کرتی ہے، شاید اس ذکر سے اسے کچھ تسکین ہوتی ہے، اپنا غم چھپائے رہتی ہے مگر نگاہوں سے جھلک پڑتا ہے، تمہاری تو اس کے شوہر سے ملاقات ہوتی ہوگی، تم اسے سمجھاؤ نا کہ یہ کیا کمینی حرکت ہے ...!"

۷ جون "... یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ للی کا شوہر تمہارے سمجھانے سے راہ راست پر آ رہا ہے [illegible] کہنے کے مطابق میں للی سے کہہ دوں گی کہ اس کے شوہر پہ [illegible] جادو ہو گیا تھا، مگر تمہیں اس جادو کا رد معلوم ہے اور تم اُتار رہے ہو، بیچاری کی کچھ نہ کچھ تسکین ہو جائے گی، ہندوستانی جادوگر ہوں یا نہ ہوں مگر تم خود کسی جادوگر سے کم ہو، تم نے مجھ پر جادو کر رکھا ہے، نہیں، مجھے جادو کا قائل ہونا ہی پڑے گا!"

۱۵ جون "... آج غضب ہو گیا، للی بیچاری اپنے شوہر کے خط کے انتظار میں بے چین تھی، خط کی جگہ تار آیا، شوہر کا نہیں بلکہ شوہر کی موت کا، ہائے غضب خوفناک سیاہ حاشیہ کا تار، لکھا تھا "آپ کا پیارا شوہر اپنے ملک کے کام آگیا، ملک آپ کو ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھے گا" بیچاری قریب قریب بیہوش ہو گئی، میں نے بہت دلجوئی کی مگر کہیں پھونکوں سے آگ بجھتی ہے، میں تسلی تشفی کی باتیں کر تو رہی تھی مگر خود میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا، ایک نامعلوم ڈر کا غلبہ تھا، توبہ رات بھر تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی، صبح جھپکی سی لگی تھی......"

۲۲ جون "...... آج مسز براؤن بہت خوش ہے، اسکا شوہر آنے والا ہے جس قدر بھی خوش ہو کم ہے، جس دن تم واپس آؤ گے اس دن میرا کیا حال ہوگا، اُف، اُف......"

۲۶ جون "...... آج مسز براؤن کا شوہر آ گیا، اسے تو ذرا اچھا لگا، کھرا سا آدمی ہے گنوار قسم کا، آنے کے چند ہی گھنٹے بعد بیوی پر بگڑنے لگا، اس طرح بات کرتا ہے جیسے [illegible] ہو ڈانٹ رہا ہے، اس کے آنے سے پہلے کی [illegible] بھی آ رہی ہے ... مگر مسز براؤن [illegible]

چلی ہے قلی کی حالت دیکھ کے مجھے مسز براؤن پر غصہ آ رہا ہے۔"

---

۱۴ رجولائی کو ڈاک کا دن تھا، مسز ہارڈی کچھ بے چین بے چین سی تھی، ایک مبہم سا اضطراب، ابھی ڈاک کا وقت نہ ہوا تھا، اسے بار بار جھانکتے سے مگر کیہ جلد تو نہ آ جائیگا، کبھی وہ کھسیاتی، کبھی ہنستی مگر ہر پانچ دس منٹ کے بعد باہر جھانک ضرور آتی، اب ڈاک کا وقت بھی ہو گیا، وہ ڈاک خانے ہی جا کے دیکھ آتے، جانے کے لئے اٹھی ہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی، چشم زدن میں وہ دروازے پر تھی، نامہ لا سامنے کھڑا تھا، اس نے منہ لٹکا کے کہا: —— Sorry [illegible] اور خوفناک کالے حاشیہ کا لفافہ نکال دیا، ویسا ہی لفافہ جیسا قلی کو ملا تھا . . .

کئی روز تک مسز ہارڈی کے لئے زمین آسمان میں اندھیرا ہی اندھیرا سا، پھر ایک خفیف سی روشنی نظر آنے لگی، اسے اطلاع ملی کہ اس کے شوہر کا بہت کچھ سامان مل گیا ہے اور اس کے پاس بطور یادگار کے بھیجا جا رہا ہے، مسز ہارڈی کو یہ انتظار رہنے لگا کہ کب، وہ سامان آئے اور کب وہ اسے آنکھوں سے لگا لگا کے اپنے دل کی بھڑاس اچھی طرح نکالے!

وہ دن بھی آ گیا، مسز ہارڈی پاگلوں کی طرح ایک ایک چیز کو دلوچتی سینے سے ملتی، آنکھوں سے لگاتی اور پیار کر کے رکھ دیتی، ڈالی بھی اپنی ماں کا ساتھ دیتی جاتی تھی بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ رو رہی تھی، اس نے چمڑے کا بیگ کھولا، ادپر ہی تصویر نظر آئی، اس نے انگلیوں سے آنکھیں دبا کے آنسو گرا دئے تاکہ تصویر صاف نظر آئے، ماں کی طرف اس نے معصومیت سے دیکھ کے پوچھا "ممی، یہ تصویر کس کی ہے؟"

مسز ہارڈی نے مستفسر نگاہوں سے دیکھا، پھر تصویر پر بالکل جھک گئی اور منجمد سی ہو گئی، جب اس نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں جیسے کچھ دیکھنا چاہتی ہو مگر صاف دیکھ نہ سکتی ہو، اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے [illegible] خلا ہے اور اس خلا میں قہقہے آتی

ہوئی قہقہوں کی صدائے بازگشت میں قہقہے کبھی مسز براؤن معلوم ہوتے کبھی قلی کے کبھی خود اس کے پیارے اور شوہر کے اور کبھی ان سب کے ملے جلے، یہ قہقہے بھی ٹوٹ اب نہ اس کے کان کچھ سنتے تھے نہ آنکھیں دیکھتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا خالی ڈھیلے رہ گئے ہیں، نگاہ ہو چکی ہیں، وہ اس عالم میں معلوم نہیں کتنی دیر رہتی مسز براؤن کی کرخت آواز نے اُسے چونکا دیا اور خوفناک چیخ مار کے کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک حالت جذب میں آ گئی سامان اِدھر اُدھر پھینکنے لگی، کبھی ہاتھ سے لگاتی کبھی سے ٹھکراتی، مسز براؤن ہکا بکا رہ گئی، ایک آدھ اس نے سمجھنے کو کہا، مگر کون سنتا ہے، اتنے میں قلی اس نے بڑی محبت سے مسز ہارڈی کے شانے پر ہاتھ کہا "نہیں، ڈارلنگ، نہیں، ایسا نہیں کرتے، اس کی کو تکلیف ہو گی، مجھے دیکھو . . . "

مسز ہارڈی سسکیاں لے کے صوفے پر گر پڑی، اس نے اپنا منہ گدی میں چھپا لیا اور اس زور شور سے لینا شروع کیا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے صوفہ بھی سسک رہا ہے، قلی اپنی سہیلی کے سر پر تسلی و تشفی کا ہاتھ رہی جیسے اپنا غم بھول گئی ہو، مسز براؤن نے آہستہ سامان کا معائنہ شروع کیا، بڑبڑاتی جاتی تھی "اچھی محبت کوئی اس طرح بھی اپنے پیارے شوہر کی چیزوں کو ٹھکراتا ہے، میں ایسا کروں تو میرا میاں مجھے قتل کر ڈالے"۔

قلی کو اپنی سہیلی پر اعتراض برا لگا اور اس نے کہا "تم جانو نہ تمہارا شوہر، کہ محبت کیا چیز ہے اور صورتیں اختیار کر سکتی ہے"۔

مسز براؤن ایک طنزیہ "ہونہہ" کہہ کے چپ ہو گئی نظر کھلی ہوئی تصویر پر پڑی جسے ڈالی اب تک گھورے جا رہی تھی جیسے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو کہ آخر تصویر میں کون سی ایسی بات تھی جس نے اس کی ماں کی حالت دگرگوں کر دی، مسز براؤن نے تصویر اٹھا کے دیکھا اور عجیب انداز میں بولی "[illegible] اس [illegible] نے قلی کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور وہ اٹھ کے مسز

کے پاس گئی، تصویر کو اس نے بھی غور سے دیکھا اور پھر مسز ہارڈی کے پاس تصویر لے جاکے پوچھنے لگی "تم بتلاؤ یہ دیکھی ڈارلنگ؟ کون ہے یہ؟..."

مسز ہارڈی چیخی: "اوہ! چلی جاؤ یہاں سے، خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

مسز براؤن نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور للی سے مخاطب ہوکے کہا "تمہارے شوہر کے کاغذات میں بھی کسی غیر عورت کی تصویر نکلی تھی جس پر اس طرح "خاص تمہاری" لکھا ہو؟"

للی "نہیں تو اس کے پاس تو صرف میری تصویر تھی۔"

مسز براؤن نے بڑی شان کی کھنکھار لی جیسے کمان کھینچ رکھی ہے اور اب تمام طنز کے تیر چھوڑنے والی ہے، ابھی اس نے "اور دیا" ہی کہا تھا کہ مسز ہارڈی شیرنی کی طرح بپھر گئی، تصویر اس نے جھپٹ کے چھین لی، آنکھیں نم آلود، چہرہ غصہ ناک، آواز میں روحانی کرب اور گھٹی ہوئی چیخ، وہ گرجی "تم لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے.... یہ تصویر - تصویر میری ایک سہیلی کی ہے.. میں نے ہی.. ایڈمنڈ کو دی تھی... خاص میرا ایڈمنڈ... نہیں، نہیں.. اس کی بہن کی ہے... نہیں نہیں، میری ہے خود میری ہے.. میری ہے خاص میرا ایڈمنڈ.. میرا اپنا ایڈمنڈ نہیں ..نہیں... ..."

غزل

جو دل پہ گزرتی ہے وہ سمجھا نہیں سکتے
ہم دیکھنے والوں کی نظر آ نہیں سکتے

بے قیدِ رسوم آئی ہیں گلشن میں بہاریں
اب ہاتھ گریباں کی طرف جا نہیں سکتے

رنگینیٔ مستقبلِ روشن ہے نظر میں
ہم تلخیٔ ماحول سے گھبرا نہیں سکتے

مغرور نہ ہو فصلِ خزاں آکے چمن میں
ایسے بھی ہیں کچھ پھول جو مرجھا نہیں سکتے

مانا وہ مجھے اپنی نگاہوں سے گرا دیں
لیکن مرے احساس کو ٹھکرا نہیں سکتے

اربابِ خرد لاکھ سبک گام ہوں لیکن
بے فیضِ جنوں راہِ طلب پا نہیں سکتے

تعمیر کا اقدام ہے تخریبِ مکمل
کچھ کھو نہیں سکتے ہیں تو کچھ پا نہیں سکتے

مانا کہ ترے لطف و کرم خواب ہیں لیکن
ہر شخص کو یہ خواب نظر آ نہیں سکتے

اللہ رے مجبوریٔ آدابِ محبت
ہم اپنے کئے پر بھی تو پچھتا نہیں سکتے

کیا کہئے شکیل ان کے مقدر کی حکایت
جو اہلِ وفا دادِ وفا پا نہیں سکتے

شکیل بدایونی

ایک دیہاتی کنبہ

نیند کے آتے جو بیٹھے سرِ شام پھر ۔ چشم بے خواب تھی خواب کی منتظر
اتنے میں آکے پشہ نے آواز دی ۔ نیند آتی ہوئی خوف سے اڑ گئی
گھِر گئے نرغۂ فوجِ موذی میں ہم ۔ مچھروں کی جفا! کھٹملوں کا ستم
کروٹیں ہم بدلتے رہے دمبدم ۔ یہ ستمگر لہو پی کے ہوں تازہ دم
خون پیتے ہیں ٹلتے نہیں بے پیئے ۔ جسم کے سارے حصّوں پہ دوڑا کیے
سر پہ چڑھ کے جو اترے جھکے پاؤں پر ۔ ہے ہمارے سراپا پہ ان کا اثر
صبح ہونے کو ہے ہم ہیں مضطر ابھی ۔ منہ کھجایا کبھی، سر تلا سا کبھی
سوئے گردن بڑھا ہاتھ بیساختہ ۔ کر دیا ظالموں نے خرد باختہ

اٹھ کے بیٹھے رہے یا ٹہلتے رہے
ہاتھ دونوں بہرحال چلتے رہے

یہ رطوبت یہ ماحول یہ گندگی ۔ موریوں کی یہ افراط یہ خستگی
یاں کبھی ہلت آفیسر آتا نہیں ۔ ہم غریبوں کی اسکو بھی پروا نہیں
جھونپڑی یہ ہماری یہ ناچاریاں ۔ طرفہ ٹھنڈی ہوا کی دل آزاریاں
خوابِ راحت کے ساماں کی اتنی کمی ۔ ایک بوسیدہ کمل ہیں سات آدمی
دل میں اسدرجہ سونے کا ارماں تپاں ۔ نیند شرمائے یوں لے کے انگڑائیاں!
نیند کل آئی تھی کیا جو آج آئے گی ۔ نیند کی آرزو یونہی تڑپائے گی
کیوں نہ دیکھیں ہمیں انجم دیدہ ور ۔ قایم اللیل ایسے کب آئے نظر؟
قایم اللیل ہوتے تھے دیندار ہی ۔ بن گئے قایم اللیل نادار بھی

تلملاتے ہوئے رات بھر جاگنا!
صبحدم کھیتوں کی طرف بھاگنا!

علی منظور

حبیب اشعر دہلوی

غلامی

اِنسان، زندگی کا غلام ہے اور یہ غلامی اس کے دنوں کو ذلت و خواری کے پردہ میں لپیٹ دیتی اور اس کی راتوں کو اشک و خوں کے سیلاب میں غرق کر دیتی ہے۔

میری پیدائش اوّلیں کو سات ہزار برس ہوئے، لیکن آج تک میں نے تسلیم پیشہ غلاموں اور طوق و سلاسل میں جکڑے ہوئے قیدیوں کے سوا کسی کو نہیں دیکھا۔

میں نے دُنیا کے مشرق و مغرب کا سفر کیا، زندگی کی تاریکی اور روشنی کے گرد چکر لگائے، قوموں اور نسلوں کو گروہ در گروہ غاروں سے نکل کر محلوں میں جاتے دیکھا، لیکن ہنوز بوجھ میں دبی ہوئی گردنیں، زنجیروں میں جکڑی ہوئی کلائیوں اور بتوں کے سامنے جھکے ہوئے گھٹنوں کے سوا اور کچھ مجھے نظر نہ آیا۔

بابل سے پیرس اور نینوا سے نیویارک تک میں انسان کے ساتھ ساتھ رہا، میں نے اس کے نقوش قدم کے برابر اس کی بیڑیوں کے نشانات، ریگ زار پر مرتسم دیکھے اور وادیوں اور جنگلوں کو زمانہ اور قوموں کے نالہ و ماتم کی صدائیں دہراتے سنا۔

میں شاہی محلوں، علم کی درسگاہوں اور عبادت کدوں میں گیا، تختوں، قربان گاہوں اور منبروں کے سامنے کھڑا ہوا اور دیکھا، مزدور تاجر کا غلام ہے، اور تاجر، سپاہی کا، سپاہی سپہ سالار کا غلام ہے اور سپہ سالار بادشاہ کا۔ بادشاہ، پادری کا غلام ہے اور پادری صنم کا۔ اور صنم مٹی ہے جسے گوندھ کر شیطانوں نے مردہ کھوپڑیوں کے ڈھیر پر نصب کر دیا ہے۔

میں امیروں اور طاقت وروں کی حویلیوں میں داخل ہوا، غریبوں اور کمزوروں کی جھونپڑیوں میں گیا۔ ہاتھی دانت کی تصویروں اور طلائی سازوسامان سے سجے ہوئے کمروں میں بیٹھا، یاس و نومیدی کی پرچھائیوں اور موت کے سانسوں سے مکدر کوٹھڑیوں میں ٹھہرا اور دیکھا: بچے دودھ کے ساتھ غلامی کا زہر پی رہے ہیں، لڑکے الف بے تے کے ساتھ انکسار و خاکساری کا سبق سیکھ رہے ہیں، لڑکیاں عاجزی اور وفا بازی کے استر لگے ہوئے لباس پہن رہی ہیں، اور عورتیں اطاعت و فرماں برداری کے بستروں میں سو رہی ہیں۔

میں قوموں کے ساتھ ساتھ، گنگ کے کنارے سے فرات کے ساحل، نیل کے دہانے، سینا کے پہاڑ، ایتھنز کے میدانوں، روم کے کلیساؤں، قسطنطنیہ کی گلیوں، پیرس کی سیرگاہوں اور لندن کی عالی شان عمارتوں تک گیا اور دیکھا، ہر جگہ غلامی عظمت و جلال کے جلوس کے ساتھ ہے۔ لوگ اس کی قربان گاہوں پر نوجوان لڑکوں اور کنواری لڑکیوں کو بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اُسے "دیوتا" کے نام سے پکارتے ہیں، اس کے قدموں میں عطر و شراب بہاتے ہیں اور اُسے "بادشاہ" کا لقب دیتے ہیں، اس کی مورتیوں کے سامنے عود و لوبان سلگاتے ہیں اور اسے "پیغمبر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہوئے اس کے سامنے گرتے ہیں اور اسے "قانون" سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے لئے لڑتے اور ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں اور اس کا نام "وطنیت" رکھتے ہیں، خود کو اس کی مرضی کے سپرد کر دیتے ہیں اور اسے "زمین پر خدا کا سایہ" سمجھتے ہیں۔ اس کی ارادت و عقیدت کے جوش میں اپنے مکانوں کو آگ لگاتے اور عمارتوں کو ڈھاتے ہیں اور اسے "بھائی بندی" اور "مساوات" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس کی راہ میں جان توڑ کوشش کرتے ہیں اور اسے "مال و تجارت" کہتے ہیں۔

بالفاظِ دیگر وہ ایک حقیقت ہے اور ایک جوہر جس کے متعدد نام ہیں اور مختلف مظاہر، بلکہ وہ ایک ازلی اور ابدی روگ ہے جس کے جلو میں مختلف قسم کی بیماریاں اور جراحتیں ہوتی ہیں جنہیں اولاد، روحِ حیات کی طرح، اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں پاتی ہے اور جس کے بیج ایک زمانہ، دوسرے زمانہ کی مٹی میں ڈالتا ہے، جس طرح ایک فصل کے بیج، دوسری فصل میں بوئے جاتے ہیں۔

غلامی کی جتنی قسمیں اور صورتیں میں نے دیکھی ہیں بہت عجیب ہیں:

اندھی غلامی ——— جو انسان کے حال کو اس کے باپ

ـــے کاٹنی سے بجلا دیتی ہے اور اس کے نفس کو ان کی بوا جگاہ بنادیا ہے، تاکہ اس بھیڑئیے کے لئے یہ جسمانی روحوں کے لئے ایک نیا جسم اور بیمار بیویوں کے لئے ایک گلی شدہ قبر بنا دیتا ہے۔

گرہستی غلامی ـــــ جو مرد کی زندگی کو اس عورت کے دامن سے باندھ دیتی ہے، جس سے وہ نفرت کرتا ہے اور عورت کے جسم کو اس شوہر کے بستر سے وابستہ کر دیتی ہے، جس سے وہ بیزار ہوتی ہے اور اس طرح ان دونوں کو زندگی کے ایک ایسے رشتہ میں پرو دیتی ہے، جو پاؤں اور جوتی کے رشتہ سے مشابہ ہوتا ہے۔

بہری غلامی ـــــ جو افراد کو گرد و پیش کے رجحانات کی تقلید، ان کے رنگ میں رنگ جانے اور انہیں کا لباس پہننے پر مجبور کرتی ہے، جس کی وجہ سے وہ عالم اصوات میں صدائے بازگشت اور عالم اجسام میں پرچھائیوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔

لنگڑی غلامی ـــــ جو استقلال و استقامت کے تنکوں کی گردنیں پیچیدہ کاروں کی سیادت کا جوا رکھ دیتی اور اہل ہمت کے ارادوں کو عظمت و شہرت کے لالچیوں کی خواہشوں کے حوالے کر دیتی ہے، جس کی بناء پر وہ آن آلات کی مثال ہو جاتے ہیں، جنہیں انگلیاں پہلے حرکت دیتی ہیں، پھر ٹھہرا کر توڑ ڈالتی ہیں۔

ادھیڑ غلامی ـــــ جو بچوں کی روحوں کو وسیع فضائے سیاہ بختی کے ان مسکنوں میں پھینک دیتی ہے، جہاں ضرورت، جہالت کے ہم پہلو مقیم ہوتی ہے اور ذلت، مایوسی کے جوار میں، اور یہ بچے بدنصیبی کے سائے میں جوان ہوتے، مجرموں کی طرح زندگی بسر کرتے اور ذلت کے ساتھ مر جاتے ہیں

رنگ برنگی غلامی ـــــ جو اشیاء کو ان کی واقعی قیمت ادا کئے بغیر خریدتی اور انہیں اُن ناموں سے پکارتی ہے، جو اُن کے اصلی ناموں سے مختلف ـــ بلکہ ان کی ضد ـــــ ہیں، چنانچہ وہ مکاری کو عقلمندی، بکواس کو معرفت، کمزوری کو نرم دلی اور بزدلی کو انکار و بے نیازی سے تعبیر کرتی ہے

خمیدہ غلامی ـــــ جو کمزوروں کی زبان کو خوف و دہشت کے زیر اثر جنبش دیتی ہے، چنانچہ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں، جنہیں وہ نہیں سمجھتے، اُن چیزوں کا اظہار کرتے ہیں، جو اُن کے دلوں میں نہیں ہوتیں، اور بیچارگی کے ہاتھوں میں کپڑے کے تھان کی مثال ہو جاتے ہیں، جسے جب چاہو، لپیٹ لو اور جب چاہو کھول دو!

کبڑی غلامی ـــــ جو ایک قوم کو دوسری قوم کے قوانین کی طرف لے جاتی ہے۔

متعدی غلامی ـــــ جو شہزادوں کے سر پر حکومت کا تاج رکھتی ہے۔

سیاہ غلامی ـــــ جو بے خطا مجرموں کی اولاد کو ذلت و حقارت کے ناموں سے پکارتی ہے

اور خود غلامی نتیجہ ہے اُس غلامی کا، جسے "قوت استمرار" کہتے ہیں۔

. . .

میں قوموں کی ہمراہی سے تھک گیا اور میری نگاہ نسلوں اور قبیلوں کو دیکھتے دیکھتے اکتا گئی تو پرچھائیوں کی وادی میں تنہا جا بیٹھا جہاں گزرے ہوتے زمانے کے سائے روپوش اور آنے والے زمانے کی روحیں گھات میں بیٹھی تھیں ـــــ وہاں، میں نے دیکھا، ایک نازک سایہ، سورج پر نگاہیں جمائے، تنہا چلا جا رہا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا:

"تو کون ہے اور تیرا نام کیا ہے؟"

جواب دیا

"آزادی"

میں نے پھر سوال کیا

"اور تیرے بیٹے کہاں ہیں؟"

"ایک سولی پر چڑھا دیا گیا، دوسرا دیوانہ ہو کر مر گیا اور تیسرا ابھی پیدا نہیں ہوا"

یہ کہا اور کہہ کے میری نگاہوں سے روپوش ہو گیا۔

(جبران خلیل جبران)

محمد نصیر الدین

مہوبہ

بندیل کھنڈ کے مشہور راجہ دھنگ نے سلطان سبکتگین سے سنہ ۹۹۰ء میں شکست کھانے کے بعد پہاڑی علاقوں کے ناقابلِ عبور حصہ میں قصبہ مہوبہ کی نیو ڈالی جو اب جھانسی مانکپور لائن پر ایک ایسا سرسبز و شاداب خطہ بن گیا جہاں بندیل کھنڈ کے اجڑے دیار کو دیکھنے کے بعد تھکی ہوئی آنکھوں میں خنکی اور سرور محسوس ہونے لگتا ہے۔

مہوبہ کا آخری خود سر راجہ۔ راجہ پرمل تھا جو فطرتاً بزدل اور آرام طلب تھا مگر اس کی رانی اس کے بالکل برعکس بہادر اور جفاکش تھی۔ راجہ پرمل کا زمانہ وہی تھا جو دہلی میں پرتھوی راج اور قنوج میں جے چند کا تھا۔ پرتھوی راج بھارت ورش کا راج پتی راجہ بننا چاہتا تھا اس لئے اس نے راجہ پرمل پر حملہ کیا اور قلعہ کالنجر اور مہوبہ فتح کرکے ان علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا کچھ دنوں کے بعد شہاب الدین غوری نے اپنے دوسرے حملے میں پرتھوی راج کا خاتمہ کر دیا اور ایک بار پھر بندیل کھنڈ کا علاقہ راجہ پرمل کے زیر نگیں آ گیا۔

راجہ پرمل کی لافانی شہرت کا باعث خود اس کی اپنی شکست تھی جو اسے پرتھوی راج کے ہاتھوں ہوئی اور دوسری وجہ اس کے منچلے بہادر اور مشہور عالم مانے سپاہی الہا اودل اور ملکھان کی ذات تھی جو علی الترتیب اس کے سپہ سالار جسراج اور بچھراج کے بیٹے تھے۔

ان تینوں بھائیوں نے وسطی ہندوستان میں اپنی بہادری اور بے جگری کی وجہ سے اتنی شہرت پائی ہے کہ آج ان کا نام بندیل کھنڈ کے بچے بچے کی زبان پر ہے شام کے وقت جب دہقان گاؤں کے چوپال کے نیچے جمع ہوتے ہیں تو الہا اودل کے قصے گا کر پڑھے جاتے ہیں۔ یہ قصے بندیل کھنڈ کی ٹھیٹ زبان کی نظم میں ہیں اور ان میں شروع سے آخر تک ان بھائیوں کے محیر العقول کارناموں کا پُرجوش ذکر ہے۔ کہیں یہ بھائی جے چند راجہ قنوج کو شکست دیتے ہیں اور کہیں پرتھوی راج کی بہن کو راجہ پرمل کے بیٹے کے بیاہ کے لئے اٹھا لاتے ہیں ان قصوں میں زیادہ تر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور جہاں کہیں جا بجا یہ ہیرو گھر جاتے ہیں تو کوئی غیبی قوت آ کر ان کو اپنی پناہ میں لے لیتی ہے۔ قصے کے واقعات گو شاید عقلِ سلیم طنز سے مسکراتی ہے مگر یہ واقعات کسانوں کے گنوار خیالات میں آگ لگا دیتے ہیں سادگی بھدی اور جاہل تخیلات کی دنیا میں بھوت پریت جادو اور ٹونے سے کچھ عجیب قسم کا تہلکہ مچ جاتا ہے۔ قصہ جوں جوں آگے بڑھ کر سنسنی خیز ہوتا ہے یہ دہقان ڈھولک پر پڑتی ہوئی تھاپوں کے ساتھ ساتھ خود بھی جھومنے لگتے ہیں اور ان کے سانس زور زور سے چلنے لگتے ہیں اس وقت ان کی چلموں کی دبی ہوئی چنگاریاں دہکنے لگتی ہیں اور رات کی تاریکی میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے عفریت سانس لے رہے ہیں۔

الہا اودل کے قصوں کے ۵۲ باب ہیں اور ہر باب میں ان بھائیوں کی بہادری کی ایک نئی داستان ہے یہ داستانیں زیادہ تر رزمیہ ہیں مگر ان میں حسن و عشق کی چاشنی بھی ہے راج دربار کی گہما گہمی اور رونق بھی ہے خوفناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے بھوت پریت اور جادو کے کرشمے بھی ہیں۔ الغرض یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ الہا اودل کو بندیل کھنڈ میں وہی ہردلعزیزی اور اہمیت حاصل ہے جو صوبہ پنجاب میں ہیر رانجھا یا سوہنی مہینوال کو۔ الہا اودل وسطی ہندوستان کے باشندوں کے لئے لیجنڈری ہیرو ہو کر رہ گئے ہیں اور چونکہ یہ مہوبہ کے رہنے والے تھے اس لئے اب تک مہوبہ کے ہر فرد و بشر کی خیالی دنیا میں الہا اودل کی حکومت ہے۔ الہا اودل کے ان قصوں کو سننے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان بھائیوں نے دہلی، اجمیر اور قنوج کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی مگر تاریخی روشنی میں حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جب پرتھوی راج نے راجہ پرمل سے قلعہ کالنجر چھین کر مہوبہ کو اپنی سلطنت میں ملا لیا تھا تو بندیل کھنڈ میں چندیلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

چندیلوں کی یہ شکست اور وہ بھی اپنے ہم جنسوں کے ہاتھوں ایک شرمناک قومی سانحہ تھا جس کے خلاف ان کی روح نے بغاوت

یہاں شکست کی یاد کو مٹانے کے لئے آلہا جیسے بانکے سپاہیوں (آلہا اودل)
کی بہادری کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ یہی وہ زخمی
فخر و وقار کی آواز ہے جسے ہم آلہا اودل کی کہانیوں میں سنتے
ہیں۔ یہ کہانیاں کیا ہیں چوہان راجپوتوں کے خلاف زہریلے
چندیلوں کی بوچھار جس کی زد سے پرتھوی راج کی عظمت بھی نہ
بچ سکی ہے۔ ان کہانیوں میں چوہان راجپوتوں کی جس جس
طرح درگت بن سکتی ہے وہ بنائی گئی ہے اور چندیلوں نے اپنے
ہیرو سے خوب خوب کام لئے ہیں، ایسے نادر اور بعید از خیال
کام جو صرف الکاش پھید ہوتا یا مہابھارت میں باندھے سکتے تھے۔
آلہا اودل کے قصے شکست خوردہ چندیلوں کے جلے بھنے اور
حسد کے ستائے ہوئے دلوں کی پکار ہیں جن کو سن کر ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ یہ دہکتی ہوئی چنگاریاں آلہا اودل کی تلواروں میں
بھر گئی ہیں اور یہ تلواریں اپنی بے پناہ کاٹ سے ساری دنیا
کا دل چھلنی کر دیں گی۔ چندیلوں کی یہ کوشش کہ چوہانوں سے
شکست کی یاد مٹ جائے کامیاب ہوئی۔ اور آج ایک ہزار
برس سے آلہا اودل کے قصے پڑھنے یا سننے والا کبھی بھولے سے
بھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔

قطب الدین ایبک، ہندوستان کا پہلا سلطان جب
شمالی ہند کی فتوحات سے فارغ ہو چکا تو اس کی نگاہ بندیلکھنڈ
کی طرف اٹھی جہاں راجہ پرمل کی حکومت تھی اور چندیلے اپنی گردن
میں اکڑ پیدا کئے تنے کھڑے تھے۔ ان کی موجودگی میں دہلی کی نئی
قائم شدہ حکومت مستقل خطرہ میں تھی اس لئے سلطان
قطب الدین نے اپنی پہلی فرصت میں بندیلکھنڈ پر دھاوا بول
دیا۔ چندیلے جہاں اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے تھے وہاں وہ
اپنے ملک کے ناقابلِ عبور دریا، پہاڑ اور وادی کی پاسبانی
پر بھی اعتماد رکھتے تھے مگر سلطان قطب الدین ایک نئے جوش
اور ولولے کے ساتھ بڑھ رہا تھا، وہ بڑھتا ہی گیا حتیٰ کہ کالنجر
کی فلک بوس فصیلیں اس کی نگاہوں کے سامنے تھرتھرانے لگیں۔
راجہ پرمل کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے فوراً صلح کر لینی
چاہی مگر اس کی شیر دل رانی مالن دیوی نے اپنے بزدل شوہر کو
للکار کر لڑنے پر آمادہ کیا۔ راجہ پرمل نے زور آزمائی کی، اس کی
سپاہ نے اس کا ہاتھ بٹایا اور خوب خوب داد شجاعت دی مگر

آخرش راجہ پرمل نے ہتھیار ڈال کر صلح کرنا چاہی مگر عین اسی وقت
اس کا انتقال ہو گیا اور راجہ کے وزیر آج دیو نے اپنے مرحوم راجہ
کی منظور کی ہوئی شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ تلواریں ایک
بار پھر میانوں سے نکلیں، قلعہ کالنجر کے نیچے کشتوں کے پشتے
لگ گئے، خوب گھمسان کا رن پڑا مگر چندیلوں کا ستارہ غروب
ہو چکا تھا، خورشیدِ اسلام مطلع ہند پر طلوع ہو چکا تھا۔ چندیلے
شکست کھا کر پچاس ہزار کی تعداد میں قید ہوئے اور قلعہ کالنجر
قطب الدین کے زیر حکومت آ گیا۔

آلہا اودل کے زمانہ میں مہوبہ اپنے عروج پر ہوگا۔ ان بانکے
سپاہیوں کے کارنامے سن کر دور دور کے راج خوف کھاتے
ہونگے اور بندیلکھنڈ کی اس راجدھانی کو زائرین دیکھنے کے
لئے آتے ہونگے۔ اس کی سڑکیں اور دھرم شالے سات سمندر
پار کے لوگوں سے بھرے پڑے ہونگے اور شہر کا قلعہ، راجہ کا
محل، مدن ساگر، وشنو کا مندر ہر وقت طرح طرح کے آدمیوں
سے پُر رہتا ہوگا۔ آج جبکہ اس کے عروج و عظمت کو مٹے ساڑھے
سات سو سال ہو گئے ہیں اور اس کے سر پر ہزاروں طرح کی بلاؤں
کا نزول ہو چکا ہے اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جس کو دیکھ کر ہم
اس کے شاندار ماضی کا مبہم سا خاکہ بھی کھینچ سکیں۔ البتہ مہوبہ کی
سرزمین بندیلکھنڈ کے بنجر علاقہ میں نخلستان کی حیثیت ضرور
رکھتی ہے۔ اس کے آس پاس اور شہر سے ملحق کئی بڑے تالاب اور جھیلیں
ہیں جن سے پانی رستا رہتا ہے اور ملحقہ علاقوں کو شاداب
بنائے رکھتا ہے۔ ان جھیلوں کے کنارے ہر طرف چھوٹی بڑی
پہاڑیاں اونچے پاسبانوں کی طرح کھڑی ہیں اور ان کا سرخ و
سبز عکس جھیل کے پانی پر رنگوں کی آگ لگاتا رہتا ہے۔

انہیں پہاڑیوں میں سے ایک پر طالن چھپا کا مزار ہے۔ یہ
طالن چھپا (یا سید طالہ) بھی آلہا اودل کی طرح زمانہ ماضی کے
ہیرو تھے جو ان کے فن سپہگری کے استاد تھے۔ ہم ان کو آلہا اودل
کے قصوں میں ہر جگہ دیکھتے ہیں۔ کہیں یہ اپنی استادی کا واسطہ
دلا کر اپنے بہادر شاگردوں کو اپنی جگہ پر ڈٹے رہنے کے لئے
کہتے ہیں تو کہیں بزرگ کی حیثیت سے ان کو فلسفیانہ نکتے سمجھاتے
ہیں۔ میں اس پہاڑی پر یہ امید لے کر گیا کہ مزار پر کوئی کتبہ ہوگا،
مگر افسوس کہ یہاں کچھ نہ ملا۔ مزار پتھر اور چونے کا چبوترہ ہے

ایک بار یہاں میلہ لگتا ہے جس میں مسلمانوں سے زیادہ ہندو آتے ہیں اور نہایت محبت سے اس مزار کو چھو کر کہتے ہیں "کہو تا آلن چچا، اچھے تو ہو؟" کوئی منچلا بندیلا اس مزار کو مخاطب کر کے کہتا ہے "چاچا جی، ہمیں بھی کوئی لاکھا پاتر (الہا اودل کے قصے کی ایک خوبصورت عورت) دلوا دو تو جانیں!" طالن چچا کا مزار ہندو مسلم اتحاد اور پیار کا ایک ایسا نمونہ ہے جب اس علاقے میں شاید مسلمانوں کی حکومت آئی بھی نہ تھی۔

طالن چچا کی ذات میرے لئے ایک معمہ تھی۔ یہ الہا اودل کے استاد تھے اور ان کا زمانہ کم از کم بندیلکھنڈ میں طلوعِ اسلام سے پہلے یا اس کے ساتھ ساتھ گزرا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ اسلامی ممالک سے اس قدر دور ایک بجز امید بھی علاقے میں کیونکر آ گئے اور یہاں آکر مہوبہ کے امرا کے لڑکوں کے اتالیق مقرر ہو گئے۔ میں نے مہوبہ کے کم از کم دس ایسے آدمیوں سے پوچھا جو پڑھے لکھے تھے کہ یہ طالن چچا کہاں کے رہنے والے تھے۔ سبھوں نے یہی کہا کہ وہ مہوبہ کے تھے اور ان کا مکان قلعہ کے اس مزار کے احاطہ میں تھا جہاں کے صدر دروازہ پہ ایک بڑا سا انڈا لٹکا رہتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ چاچا جی بڑے بہادر تھے اور ان کے گھر سے ایک وقت میں ہزار تلواریں نکلتی تھیں۔

میں نے مہوبہ شہر جانے کا ارادہ کیا جو ریلوے اسٹیشن سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ راستے میں وہ پہاڑیاں ملیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور ایک جگہ ایک جھیل ملی جس کے کنارے کسی قدیمی عمارت کے کھنڈرات پڑے تھے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا یہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگا الہا اودل کی بیٹھک۔ آگے بڑھ کر ایک پہاڑی ملی جس پر کسی پرانی عمارت کے پسماندہ مجھے دکھائی دئے جن پر پتھر کی چھت پڑی تھی۔ میں نے ایک دوسرے آدمی سے پوچھا یہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگا الہا اودل کی بیٹھک۔ الغرض اہل مہوبہ کی نظر میں ہر پرانی عمارت کا کھنڈر الہا اودل کی بیٹھک ہے اور یہاں کی ہر چٹان میں ان کے گھوڑے کی نال کے نشان ہیں۔ ان شاندار بھائیوں نے کیا حیاتِ جاودانی پائی ہے کہ آج ۸ سو سال بعد بھی اس سرزمین کا ہر بچہ اپنی زمین کی ہر پرانی اور مقدس شے کو انہیں کے نام سے منسوب کر رہا ہے۔

موجودہ شہر میں غلاظت، گندگی اور افلاس کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں ایک مکان یا رہائشی عمارت بھی ایسی نہیں جس کا ذکر کیا جائے۔ البتہ چند مسجدیں ہیں جو سب کی سب آٹھ سو سال پرانی ہیں اور ان کا طرز تعمیر اس زمانہ کی یاد تازہ کرتا ہے جب ہندوستان میں اسلام کی بنا ڈالی جا رہی تھی۔

اب قلعہ کے اندر آئیے۔ یہ قلعہ قدرتی ہے یعنی اس کی فصیل پہاڑیوں کا وہ سلسلہ ہے جو اپنے حلقہ میں عظیم الشان جھیل مدن ساگر کو لئے ہے۔ اس پہاڑی کا سلسلہ جہاں پست ہو گیا ہے یا ٹوٹ گیا ہے وہاں مصنوعی فصیلیں چونے اور پتھر سے تیار کی گئی ہیں۔

قلعہ کے اندر داخل ہوتے ہی ایک چھوٹا سا مزار ملتا ہے جس کو شاہ مثل کا مزار کہتے ہیں۔ اس مزار سے بائیں طرف چل کر ایک پتھر کی چوکور لاٹ ملتی ہے جو ایک مندر کے سامنے زمین میں گڑی ہوئی ہے۔ اس لاٹ کی بلندی کوئی بارہ فٹ ہوگی اور عوام اس کو منیا دیو کا دیوٹ کہتے ہیں۔ غالباً جو اسی مندر میں رہتا تھا۔ ہر روز شام کو اس لاٹ پہ چراغ روشن کرتا تھا جس کی روشنی سارے مہوبہ میں پھیلتی تھی۔ اس لاٹ کو محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔

اس مندر اور لاٹ سے آگے چل کر چھوٹی سی فصیل سے گھرا ہوا ایک احاطہ آتا ہے جس کے اندر متعدد مزارات ہیں اور اس کے وسط میں ٹھوس، بھدے اور ابتدائی دور کے گنبد کے نیچے ایک مزار ہے۔ اس احاطہ میں داخل ہونے کے لئے داخل ہونے کے لئے ایک مستحکم صدر دروازے کے اندر جانا ہوتا ہے جس کی چھت سے کبھی شتر مرغ کا انڈا آویزاں تھا۔ یہ مزار مہوبہ کے سب سے بڑے بزرگ حضرت شاہ مبارک کا ہے۔ اس مزار کی جاگیر میں اب تک مسمات سو بیگھے زمین کی آمدنی چلی آ رہی ہے جو افسوس ہے کہ عام پبلک کی قومی ضرورتوں میں صرف ہونے کے بجائے سجادہ نشینوں کے ایک خاندان کی شکم پُری کر رہی ہے۔

اب اس راستے سے پلٹ کر مثل شاہ کے مزار تک آئیے اور سیدھا مدن ساگر تک چلے چلئے۔ یہ قدرتی جھیل پہاڑیوں کے سلسلے سے گھری ہوئی ہے جس کا رقبہ ۴ مربع میل سے کچھ زیادہ ہے۔ اس جھیل کا ایک کنارہ پرانے گھاٹوں سے پٹا پڑا ہے جن کی لمبائی جھیل کی لمبائی کے برابر ہے۔ جھیل کے اُتری بازو ...

[illegible] میں سے جیلے نظر آتے ہیں۔ ان ٹیلوں میں سے ایک پر پتھر کے
[illegible] کے کھنڈرات ہیں۔ اس مندر کا کافی حصہ اب تک کھڑا ہے
جس کی چوٹی کم از کم پچاس فٹ بلند ہے پتھر کی سلوں سے
یہ مندر بنایا گیا ہے اور یہ سلیں بغیر کسی مسالے کے اب تک
ہزاروں سال سے [illegible] قائم ہیں۔ اس مندر کی مجموعی
صورت دیکھ کر ایسا [illegible] ہوتا ہے کہ اس پر قدیم ویدک
طرز تعمیر کا زیادہ اثر ہے۔ غالباً یہ مندر چندیلہ راجپوتوں
کے دور حکومت سے پہلے کا ہے جب یہاں گونڈوں کا قبضہ تھا۔

اس مندر کے پاس ہی جو دوسرا ٹیلا ہے وہ صرف
چٹانوں کا ڈھیر ہے۔ ان چٹانوں میں زیادہ تر ایسے ہیں جن کی
کوئی شکل نہیں مگر بعض بعض چٹان کسی کھمبے، شہتیر یا
چھت وغیرہ کا ٹوٹا ہوا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ غالباً اس
ٹیلے پر کوئی عظیم الشان مندر تھا۔ اس ٹیلے کے چاروں
طرف لڑھکی ہوئی چٹانوں کے درمیان پانچ پتھر کے ہاتھیوں
کے مجسمے پڑے ہیں جن کی ٹوٹی ہوئی ٹانگوں اور سونڈ کے
نشانات باقی ہیں۔ ان ہاتھیوں کی پیٹھ پر مرصع جھول کے
نقوش اور زنجیروں اور رسیوں کے نشانات واضح طور پر دکھائی دیتے
ہیں۔ ان کے دونوں طرف گھنٹوں کے نشانات بھی ابھرے
ہوئے ہیں۔ ہاتھیوں کا جو کچھ حصہ محفوظ ہے وہ نہایت صاف
چکنا اور ہاتھی کے اصل قد کے برابر ہے۔ یہ ہاتھی فن سنگتراشی کے
نہایت اعلیٰ نمونے ہیں۔ یہ ہلکے سرخ پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور
ان پر نہایت اعلیٰ پالش کیا گیا ہے۔ یہ ہاتھی کے مجسمے غالباً
اس عالیشان مندر کے چاروں طرف صحن یا سیڑھیوں کے پاس کھڑے تھے۔

مہوبہ ہندوستان میں فتح اسلام کی سب سے پہلے فتح ہوا اور ایک
مٹتی ہوئی تہذیب کا واحد نمونہ ہو ہیں مہوبہ میں رہا مجھے یہ افسوس ہی
رہا کہ چندیلے راجپوت ابھی ابھی کالنجر سے شکست کھا کر لوٹے ہیں اللہ
جب تک یہاں قطب الدین ایبک، ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ
تھوڑی دیر کے لئے داخل ہوا ہے مہوبہ کی تاریخ اگر سچ پوچھئے تو بس
اتنی ہی ہے ہندوستان ہو سکے آگے کیا تھا نہیں معلوم اور اس کے بعد کیا
آیا اس کا کوئی نشان ہمیں سارے مہوبہ میں ملا اور ل کے وقت کے
مندروں، قطب الدین ایبک کے زمانہ کی مسجدوں کے سوا اور کچھ نہیں
[illegible] کا آفتاب روشن ہے جو تیرہویں صدی عیسوی
[illegible] خاموشی ہے اور اندھیرا گھپ۔

دریچے سے

میں نے دیکھا ہے دریچے سے کئی بار تجھے
شیشۂ دل میں انڈیلی ہے ترے حسن کی مے
تیری نوخیز جوانی کے حسیں جلووں سے
میری آوارہ نگاہوں نے خیالوں میں مرے
جال موہوم سے خوابوں کے بُنے ہیں اکثر،

یہ شب و روز کا اک سلسلہ لامتناہی!
زندگی رینگتی رہتی ہے ازل سے یونہی
کیا کوئی منزلِ مقصود نہیں ہے اس کی ——
اُڑتی پھرتی کبھی آزاد فضا میں روحیں
جسم کی قید کو کرتی ہیں گوارا کیونکر!
ٹوٹ جاتا ہے وہ معصوم اُمنگوں کا فسوں
کشمکش زیست کی بن جاتی ہے بغض اور حسد
مکر کا نام رکھا جاتا ہے انسانیت۔

اینٹ چونے کی جو آتی ہیں نظر دیواریں
اوٹ میں ان کی گناہوں کے ہیں انبار لگے
وہ گنہ جن کے تصور سے ہے لرزاں ابلیس
خود کو دھوکا یونہی انسان دیتے جاتا ہے
خودغرض دی نفسوں کا وہ عجیب ایک گروہ
جس کو کہتے ہیں سماج
رہنمائی کی جگہ راہزنی میں ہے محو
اس کے قانون و اصول
ابنِ آدم کے لئے ایک فریبِ اعظم

مجھ میں اور تجھ میں جو حائل ہے خلیج
جسمِ خاکی کو ہم آغوش نہ ہونے دے گی!
سوچتا ہوں کہ یہ لمحاتِ حسینِ ہستی
کیا یونہی فکر و تردد میں گذر جائیں گے؟
کیا تجھے دیکھ سکوں گا میں دریچے سے مدام؟
اینٹ چونے کی یہ دیوار یہ مکروہ سماج!

لگن

ناصر شمسی

افراد

مہاراج	سروپ
مان جی	چندا
شانتا	

وقت۔ شام منگلوار ۲۸ چیت۔ بکرمی سمت ۲۰۰۰

(مہاراج کا کمرہ۔ کمرے کے وسط میں دروازے کی جانب ایک بہت سی تخت بچھا ہے جس پر سوزنی بچھی ہوئی ہے۔ تخت سے ملا ہوا دائیں پہلو میں ایک موڑھا سا کیبنٹ رکھا ہے۔ اس کے پیچھے ایک ڈبا جو پشت کی دیوار کے ساتھ تخت کے پیچھے ایک شاستاسن سیلف رکھا ہے جس کی ایک جانب زہرہ کا خوبصورت مجسمہ رکھا ہے۔ پشت کی دیوار میں بائیں جانب ایک دروازہ ہے جس پر پردہ پڑا ہے۔ یہ دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔ دروازہ اور شیلف کے درمیان دیوار پر بارہ پھل کی بڑی سی تختی لگی ہوئی ہے جس پر بارہ برجوں کی تصویریں بنی ہیں۔ دائیں جانب لگی طاق میں ایک صوفہ رکھا ہے جس کے آگے تپائی رکھی ہے۔ بائیں جانب برآمدے کی چار کرسیاں ہیں اور ایک دروازہ ہے جو برآمدے میں کھلتا ہے جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو مہاراج تخت پر بیٹھے ہیں۔ عمر پچاس کی منزل سے گزر چکی ہے۔ ایک نہایت سفید دھوتی باندھے ہیں اور سلک کا ڈھیلا کرتا زیب تن ہے۔ مہاراج کاغذ پنسل لئے کچھ جانچ کر رہے ہیں۔ ایک دو کاغذ میں جن میں زائچے بنے ہیں کھلی پاس پڑی ہیں۔ آنکھیں بار بار اوپر کی طرف اٹھتی ہیں جن میں ستارے چمکتے نظر آتے ہیں)

مہاراج:۔ (ایکدم بے صبری سے پکارتے ہوئے) چندا! چندا! چندا!

چندا:۔ (دوڑتے ہوئے) آیا مہاراج!

مہاراج:۔ (بلند آواز میں) دو الماس!

(چندا جلدی سے داخل ہوتا ہے۔ ایک منحنی دبلا پتلا آدمی گلے میں جنیو اور ٹانگوں میں لنگی سی ہوتی ہاتھ میں اس سے بھی زیادہ میلا جھاڑن)

چندا:۔ جی مہاراج

مہاراج:۔ چندا۔ دو الماس! ایک ہفتہ میں دو الماس!

چندا:۔ اچھا مہاراج! اور میری دشائیں کیسی ہیں اس ہفتہ میں؟

مہاراج:۔ تیری دشائیں نہیں ہیں۔ تیری دشا اچھی نہیں... اچھا بتا تو کتنے زور سے پکار سکتا ہے؟

چندا:۔ بہت زور سے! اتنے زور سے کہ آسمان کے ستارے بھی سن لیں۔ کیوں کیا میرا ستارہ بہت مندہ ہے مہاراج؟

مہاراج:۔ تیرا ستارہ زوال میں ہے۔ لیکن تو جتنی بلند آواز نکال سکتا ہے لگا۔ گھر کی ہر کھڑکی میں سے اپنی لمبی گردن نکال اور پکار تاکہ سب لوگ سن لیں۔ اس ہفتہ میں دو الماس ہیں اور دوسرا الماس آج شام کو ساڑھے چھ بجے ہوگا.... آج شام کو ساڑھے چھ بجے!... سمجھا؟

چندا:۔ یہ الماس کوئی تماشا ہے جو مفت دکھایا جائے گا؟

مہاراج:۔ (رنگ اکڑ کر) میں تماشے نہیں دکھاتا۔ میں ستاروں کی گردش دیکھتا ہوں۔ [illegible] برج میں ان کا شرف [illegible] زائچہ دیکھ کر اور چالوں کا حساب لگا کر بتا دیتا ہوں کہ اب دنیا میں کیا ہونے والا ہے۔ کوئی ایک شخص کا [illegible] والا ہے اور اس کا کرنا سعد ہے یا نحس!

چندا:۔ مہاراج! یہ تو آپ روز ہی کہتے ہیں۔

مہاراج :- ہاں، لیکن آج وہ ہونے والا ہے جو روز نہیں ہوتا۔ جو نوّے سال سے نہیں ہوا۔

چندا :- ہاں نوّے سال!

مہاراج :- میں نے اس کتاب میں دیکھا ہوا ہے۔ بکرمی سمبت ایک ہزار نو سو دس میں کنوار اور چیت کے مہینوں میں دو ملماس ہوئے تھے۔

چندا :- یہ ملماس کیا ہوتا ہے؟

مہاراج :- تجھے معلوم نہیں سورج کی سنکرانت نہ ہونے سے ملماس ہوتا ہے۔

چندا :- سورج مہاراج؟

مہاراج :- ہاں ہاں سورج لیکن تیری سمجھ میں نہیں آئے گا تیری قسمت کا ستارہ تو زحل ہے جو سورج کا مخالف ہے اور سیاہ رنگ کا ہے۔

چندا :- تو کیا مہاراج میرے ستارے کا رنگ بھی کالا ہے لیکن میرا نام تو چندا ہے۔ چاند سا!

مہاراج :- نوّے سال سے ایک سمبت میں دو ملماس نہیں ہوئے اور آج نوّے سال بعد پھر دو ملماس ہوں گے۔

چندا :- اوہو!

مہاراج :- سورج ایک برج میں ایک مہینہ رہتا ہے لیکن ڈھائی سال اور سولہ دن بعد ایسا ہوتا ہے کہ مہینہ ختم ہونے پر بھی سورج اپنا برج نہیں بدلتا بلکہ اُسی برج ایک مہینے اور رہتا ہے۔

چندا :- سورج کی مرضی۔ ایک مہینہ نہیں دو مہینہ رہے

مہاراج :- اور یہ دوسرا مہینہ لوندھ کا ہوا جسے ملماس کہتے ہیں۔ سمجھی؟ اور نوّے سال بعد سورج ایک سال میں دو مرتبہ اپنا برج نہیں بدلتا۔ اور دو ملماس ہوتے ہیں۔ اس سال کنوار کے مہینے میں سورج نے اپنا برج نہیں بدلا تھا۔ اور آج اماوس کے وقت جب سورج اور چاند ایک ساتھ ایک بجے اور ایک دقیقہ پر ہوں گے تو سورج دوبارہ اپنا برج نہیں بدلے گا...... اور یہ دوسرا ملماس ہوگا۔ ایک سمبت میں دو ملماس!

چندا :- دو مہینے دو ملماس!

مہاراج :- یہ جو ملماس کا جوتش نوّے سال سے انتظار کر رہا تھی وہ یونہی بیت جائے گا۔

چندا :- اور پھر؟

مہاراج :- اور پھر سورج کا وہی لگا بندھا چکر ۳۶۵ دن میں ہوتا رہے گا۔ سورج ہر مہینہ اپنا برج بدلتا رہے گا۔ برج حمل، جوزا اور اسد میں مقررہ چرنوں پر شرف ہوتا رہے گا اور برج دلو میں زوال!

چندا :- ہوں۔

(بائیں جانب دروازہ یکدم کھٹ کھٹ ہوتی ہے)

مہاراج :- دیکھو باہر کون ہے؟

چندا :- اچھا مہاراج۔

(چندا چلا جاتا ہے کچھ لمحے بعد ماں جی اور شانتا داخل ہوتی ہیں۔ ماں جی کی عمر چالیس کے اوپر ہے کنپٹیوں پر سفید بال چمک رہے ہیں شکل اچھی ہے لیکن چہرے کے خطوط بہت سخت ہو چکے ہیں۔ جیسے مرمر کی سرد نیلی لکیریں پتھر میں گہری اُتر گئی ہوں۔ شانتا کی عمر پندرہ ہوگی ایک عامی عام لڑکی ہے)

ماں جی :- نمستے۔ مہاراج!

مہاراج :- نمستے!

ماں جی :- یہ میری لڑکی ہے شانتا!

مہاراج :- جی! مجھے دھیان پڑتا ہے جیسے کبھی آپ کو دیکھا ہو۔ بہت ورش پہلے

ماں جی :- ہاں میں اپنی کنڈلی دکھانے آئی تھی بائیس سال ہو گئے آئے۔ آپ کو بہت دھیان رہا مہاراج!

مہاراج :- (مطمئن ہو کر) تو وہ آپ ہی تھیں جو......

ماں جی :- (بات پوری کرتے ہوئے) میرے بیاہ کی لگن ٹھیک نہ بیٹھتی تھی!

مہاراج :- ہاں ہاں مجھے آپ کی کنڈلی اب بھی یاد ہے۔ ویسے بھاگ تو اچھے تھے لیکن بیاہ کا سہاگ نہیں تھا۔ کتنی عجیب کنڈلی تھی۔

شانتا :- ماں جی۔ یہ کنڈلی کیا ہوتی ہے؟

ماں جی :- تجھے یہ بھی نہیں معلوم، میں کتنی دفعہ بتا چکی ہوں۔

مہاراج :- کنڈلی جنم کے سمے ستاروں کی جگہوں کا چتر ہوتا ہے،

جسے دیکھکر ہم لوگ، زندگی کے سارے حالات بتا دیتے ہیں۔
شانتا:۔ (دلچسپی کے ساتھ) اچھا!
مہاراج:۔ (ماں [illegible] سے) آپ نے کہا تھا کہ یہ آپکی لڑکی ہے؟
ماں جی:۔ جی ہاں
مہاراج:۔ (متعجب) تو کیا آپ کا بیاہ ہوا تھا؟
ماں جی - ہاں!
مہاراج (ششدر) بغیر لگن کے؟
ماں جی - جی!
مہاراج: (ایک لمبے سکوت کے بعد) یہ بیاہ نحس تھا!
ماں جی:۔ (مغموم) ہاں مہاراج۔
مہاراج:۔ (رحم کھا کر) تو پھر کیوں بیاہ کیا تھا؟
ماں جی:۔ (آہستہ سے جیسے بہت کچھ کہہ دیا ہو) میں عورت تھی!
شانتا:۔ (مجھ سے) میرے پتا جی بہت خوبصورت تھے۔ ان کی تصویر پوجا کے کمرے میں لگی ہوئی ہے۔
ماں جی: (مہاراج سے پرسکون لہجہ میں) میں ایک کھیل کھیلنا چاہتی تھی کھیلتے کھیلتے میں ستاروں سے بھی کھیلنے لگی۔
مہاراج۔ کیا مطلب؟
ماں جی:۔ (ہنس کر) میں نے ستاروں سے آنکھ مچولی کھیلی۔ اپنی دوسری کنڈلی بنوائی اور اسکی جھوٹی لگن سے بیاہ کر لیا۔
مہاراج۔ (تنبیہ کے طور پر) ستاروں سے کھیل مذاق نہیں۔
ماں جی۔ میں جانتی تھی لیکن سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی
مہاراج۔ لیکن آپکے بھاگ میں بیاہ کا سہاگ نہیں تھا؟
ماں جی:۔ (مغموم) ہاں نہیں تھا!
مہاراج۔ تو پھر بیاہ بعد کیا ہوا؟
ماں جی۔ بیاہ کے بعد ہی اُن کی طبیعت نڈھال ہو گئی۔ ایک ہفتہ بعد سخت بیمار ہوئے اور دفعتاً مر گئے۔
مہاراج:۔ (مطمئن) یہ تو ہونا ہی تھا۔ ستاروں سے آنکھ مچولی کھیلنے کا نتیجہ۔
شانتا۔ میرے پتا جی کے مرنے کا آپ کو دُکھ نہیں؟
مہاراج:۔ جوتشی نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ ہوگا۔ ان کی نادانی تھی جو بیاہ کیا!
ماں جی:۔ میری تو اتنی عمر روتے بیت گئی۔ میں نے اپنا سہاگ نہیں دیکھا۔ میں چاہتی ہوں اپنی لڑکی کی ہی مانگ

بھری دیکھ لوں۔ میں اس کی کنڈلی آپ کو دکھانے لائی ہوں (بٹوہ میں سے کنڈلی نکال کر) میں کنڈلی چھوڑے جاتی ہوں۔ آپ دیکھکر اچھی سی لگن بتا دیجئے گا۔
مہاراج:۔ ہاں ہاں، میری بتائی لگن بہت شبھ نکلے گی۔
ماں جی:۔ مجھے آپ پر وشواش ہے۔
مہاراج:۔ (جو کنڈلی دیکھ رہے تھے حیرت سے) ایں.. ...یہ آپ کی لڑکی کی کنڈلی ہے؟
ماں جی:۔ جی ہاں مہاراج۔
مہاراج:۔ لیکن، (خاموش ہو جاتا ہے چند لمحے خاموشی)
ماں جی:۔ (پریشان) کیوں؟ ..کیا بات ہے؟
مہاراج اس میں ستاروں کی چال تو آپکی کنڈلی جیسی ہے۔
ماں جی:۔ (گھبرا کر) نہیں!
مہاراج:۔ ٹھہریئے میں ابھی دیکھکر بتاتا ہوں۔ لگن کے بارہویں خانہ برج حوت میں مشتری زوال میں ہے اور ستارہ قسمت رتب میں آتا ہے
ماں جی:۔ (بے اصرار) اور لگن مہاراج؟
مہاراج:۔ (آہستہ سے) اس کنڈلی میں بیاہ کی راس نہیں۔
ماں جی:۔ (مشکل سے آواز نکلتی ہے) مہاراج!
شانتا۔ (چیخ) ماں جی! (لپٹ جاتی ہے)
ماں جی - (چمٹا کر) شانتا!
(چند لمحے خاموشی)
مہاراج:۔ بڑی کرک گرہ پڑی ہے سارے مذکر ستارے ایسے گھر میں پڑے ہیں کہ برج بھی نوانسہ کا مذکر ہے اور ملک بھی اور موئث ستارے کیندا میں پڑے ہیں اور ان میں بھی موئنث کا نوانسہ ہے۔ ایسی صورت میں بیاہ کی راس کیسے نکل سکتی ہے۔
(ماں جی اور شانتا رو رہی ہیں)
مہاراج:۔ میں جانتا ہوں آپ دونوں کو بہت دکھ ہے۔ لیکن کیا کیا جائے ہمیں جوتش کا کیا دوش؟
شانتا۔ (بگڑ کر) ہمیں آپ کی جوتش نہیں چاہیئے!
مہاراج - میں کیا کر سکتا ہوں میں ستاروں کی چال نہیں بدل سکتا!
شانتا:۔ (تلخی سے) ستارے!

...ستارے بہت سخت ہیں شانتا. بہت سخت. یہ میرے
کا کی طرح سخت ہیں. انہوں نے میرا کلیجہ کاٹ ڈالا ہے۔
(چندا آہستہ سے دروازہ کھول کر کمرے میں
آتا ہے اور ایک نظر سب کو دیکھتا ہے)

چندا:۔ (آہستہ سے) مہاراج
مہاراج:۔ (چونک کر) کون؟ چندا!
چندا:۔ کیا مہاراج لماس ہو گیا؟
مہاراج:۔ (بے اختیار بلند آواز میں) لماس! ...اوہ!
ماں جی
شانتا :۔ (گھبرا کر) کیا ہوا مہاراج؟
مہاراج:۔ ٹھہریئے. میں کنڈلی پھر دیکھتا ہوں. لماس سے
ستاروں کی شرف اور ترتیب بدل جاتے ہیں شاید
اس لماس سے بیاہ کی راس نکل آئے۔
ماں جی:۔ سچ. مہاراج؟
مہاراج:۔ میں دیکھتا ہوں۔
(چند لمحے خاموشی. مہاراج غور سے کنڈلی
دیکھ رہے ہیں اور کچھ حساب لگاتے ہیں)
ماں جی:۔ مہاراج. گرہ کیسی پڑ رہی ہے؟
مہاراج:۔ (مسرور) دیکھا! تم نے دیکھا! میں نہ کہتا تھا
لماس بہت بڑی چیز ہے. نوے سال بعد لماس
ہوتا ہے کتنی بڑی بات!
ماں جی:۔ مہاراج. بتائیے تو. .
مہاراج:۔ مشتری لگن کے خانہ میں زوال کے تاثے ترف پر
آ رہا ہے. اور شانتا کا ستارہ قسمت نب کی بجائے
راس میں ہو رہا ہے۔
ماں جی:۔ اور لگن مہاراج؟
مہاراج:۔ ہاں ہاں. ٹھیک اماؤس کے وقت جب سورج اور
چاند ایک درجے اور ایک دقیقہ پر ہوں گے اور سورج
اپنا برج نہیں بدلے گا اور دوسرا لماس ہوگا . . .
اس وقت بیاہ کی راس ہو رہا ہے۔
ماں جی:۔ (خوشی سے) یعنی شانتا کا بیاہ ہو سکتا ہے۔
شانتا:۔ (خوشی سے ماں جی سے لپٹ کر) ماں جی!
مہاراج:۔ ہاں وہی وقت نکل رہا ہے. چند ماں اور لست کر

دو سبھا دُراس نہیں ہوں گے اور دونوں آپس میں دیکھتے ہوں گے
..(بے خود) بڑی اشبھ لگن ہو گی. بہت ہی اشبھ لگن!
ماں جی:۔ آپ کی جے ہو مہاراج!
مہاراج:۔ (بلند آواز میں) لماس... . دوسرا لماس یا...
کرک گرہ سبھک ہو گئی۔
ماں جی:۔ مہاراج. یہ اماؤس کیا ہے جس کی لگن نکلی ہے۔
مہاراج:۔ ..دس؟ . اماؤس آج ساڑھے چھ بجے ہے!
ماں جی:۔ (حیران) آج؟
مہاراج:۔ ہاں! ہاں! . اوہ صرف دس منٹ رہ گئے ہیں!
ماں جی:۔ (پریشان) لیکن اتنی سی دیر میں بیاہ کیسے ہو؟ میں
کیا کروں؟
مہاراج:۔ بیاہ کا سامان کرو. نہیں تو لگن کی گھڑی نکل جائیگی۔
ماں جی:۔ (گھبراہٹ) دولہا بغیر کیسے بیاہ ہو؟
مہاراج:۔ اس کا تو مجھے خیال ہی نہ آیا! میں جوتش جانتا
ہوں دولہا کیا جانوں؟
(دروازہ (بائیں جانب) پر کھٹ کھٹ ہوتی ہے)
چندا:۔ مہاراج. میں بھول گیا آپ کو بتانا. ایک صاحب آئے
ہیں کسی کو پوچھ رہے ہیں۔
مہاراج:۔ صاحب؟ تو کہتا ہے صاحب میں کہتا ہوں کوئی ہو.
بلا جلدی بلا . جلدی!
چندا:۔ ابھی ابھی لیجئے! (جلدی سے کمرے سے جاتا ہے)
(چند لمحے بعد سروپ داخل ہوتا ہے. کوئی پچیس
سال عمر ہو گی. شکل سے معقول آدمی معلوم
ہوتا ہے. سروپ ایک نظر دیکھتا ہے مہاراج
کو نہیں پہچانتا. شانتا کو منہ بنائے دیکھ کر گھبراتا
ہے اور ماں جی کو پھٹی آنکھوں سے گھورتے
دیکھ کر سٹ پٹاتا ہے)
مہاراج:۔ (خوشی سے) آہا!
سروپ:۔ شما کیجئے. مجھ سے بھول ہوئی۔
مہاراج:۔ آیئے آیئے (ماں جی سے) لیجئے. اب تو سب ٹھیک
ہو گیا!
ماں جی:۔ آپ کا مطلب ہے کہ. .....
مہاراج:۔ ہاں اور کیا... وقت بالکل نہیں ہے۔

سروپ - بہت پہلے ہوئی میں نوکر اور صحت کے لئے آیا تھا۔
مہاراج ۔ آپ [illegible] آئے آپ کو ستارے کھینچ لائے ہیں۔
(ہنس کر) میں جانتا ہوں!

ماں جی :- ستارے بڑے دیالو ہیں

سروپ :- مجھے آگیا دیجئے۔ مجھے بہت ضروری کام جانا ہے۔

مہاراج :- ایں! ضروری کام؟ اس سے زیادہ ضروری کام کیا ہو سکتا ہے نہیں نہیں!

ماں جی :- نہیں نہیں، آپ جا سکتے نہیں۔

سروپ :- میری سمجھ میں نہیں آتا کہ . .

مہاراج :- اوہو۔ جوتش تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی تم تو بس یہ سمجھ لو کہ

ماں جی :- میں بتاتی ہوں . . یہ میری لڑکی شانتا ہے!

سروپ :- جی ہاں!

ماں جی :- اس کے پتا جی کا نام ہرنام داس تھا وہ سورگ باس ہو گئے، ذات کے برہمن تھے۔ سمجھے!

سروپ :- جی لیکن مجھے ذرا جلدی ہے۔ مجھے آگیا دیں۔

مہاراج :- اوہو بات تو ختم ہو لینے دو!

ماں جی :- مہاراج نے شانتا کی جنم پتری دیکھ کر بتایا ہے کہ اسی سمے شانتا کا بیاہ ہو جانا چاہیئے۔ اگر یہ سمے گذر گیا تو پھر بیاہ نہیں ہو سکتا۔

سروپ :- (کچھ نہ سمجھ کر) تو پھر بیاہ کر دیجئے۔ اچھا میں جاتا ہوں۔

مہاراج :- اوہو۔ اگر آپ چلے گئے تو پھر بیاہ کس کے ساتھ ہو گا۔

سروپ :- (حیران) ایں؟

ماں جی :- ہاں ہاں بیاہ اسی سمے ہونا ہے ابھی

سروپ :- آپ کا مطلب ہے کہ . .

مہاراج :- بڑی شبھ لگن نکلی ہے چندرماں اور شکر دونوں راس میں ہونگے اور دونوں آپس میں دیکھتے ہوں گے میں کہتا ہوں آپ بیاہ کر لیجئے۔ بڑی اچھی لگن ہے ایسی لگن بھلا کسے کو ملتی ہے۔

سروپ - معلوم ہوتا ہے آپ مذاق کر رہے ہیں۔ نمستے!

ماں جی :- نہیں مذاق نہیں۔ میری لڑکی کی ساری عمر کے سہاگ کا سوال ہے میں آپ سے پرارتھنا کرتی ہوں۔

سروپ :- تو کیا یہ سب سچ ہے؟

ماں جی :- آپ کسی بات کی چنتا نہیں کیجئے شانتا بڑی اچھی لڑکی ہے آپ اس کے ساتھ بہت سکھی رہیں گے۔ پرماتما نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ کسی بات کا خیال نہیں کیجئے۔ آپ بس ہاں کر دیجئے۔

سروپ :- مجھے کچھ دیر سوچ لینے دیجئے۔

مہاراج :- صرف ایک منٹ۔

سروپ :- (سوچتے ہوئے) میں اتفاق سے ایک مکان میں داخل ہوا۔ اور اب چند منٹ بعد یکایک ہی بیاہ! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چوہے دان لگا ہوا تھا۔ اور جو بھی پہلا چوہا آیا اسے باندھ دیا گیا۔

ماں جی :- آپ یہ بھی تو خیال کیجئے کہ بیاہ کے لئے ضروری ہے کہ ابھی سمے ہو۔

سروپ :- یعنی آپ کو تو جو بھی پہلا آدمی ملتا اس سے بیاہ کر دیتیں۔

مہاراج :- آپ یہ سب کچھ سوچ کر کیا کیجئے گا۔ آپ یہ بتائیے کہ بیاہ کے لئے تیار ہیں!

ماں جی :- میرے لئے تو اب آپ ہی سب کچھ ہیں!

سروپ :- (ایک کرسی میں دھنس جاتا ہے) مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں کوئی ہوں ہی نہیں یہاں آنے سے پہلے میں تھا لیکن اب پتہ کیا ہوں۔ اور خبر نہیں چند منٹ بعد کیا ہو جاؤں گا۔

مہاراج :- جی آپ بیاہ کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟ بیکار وقت خراب کر رہے ہیں۔

سروپ :- مجھے پتہ نہیں کہ میں کیا سن رہا ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں

ماں جی :- انہیں ذرا آرام کر لینے دیجئے اتنی دیر میں ہم بیاہ کا سامان کر لیں۔

مہاراج :- لما اس میں بس منٹ رہ گئے ہیں۔ اتنے سمے میں کچھ سامان نہیں ہو سکتا۔ ہون منتر اور پھیرے ہو سکتے ہیں۔

ماں جی :- بس بیاہ ہو جائے اور کیا چاہیئے۔

مہاراج :- ہون کے لئے آگ تو ہو ہی گی میرے پاس موم بتی ہے۔ اس کے گرد پھیرے ہو سکتے ہیں۔ منتر میں پڑھ دونگا بس بیاہ ہو جائیگا۔

ماں جی :- ہاں ہاں۔ آپ موم بتی لائیے (جاتے ہیں۔ ماں [illegible])

سروپ کو دیکھتی ہیں کہ وہ سر جھکائے پریشان بیٹھا ہے۔

شانتا بھی بہت اُداس ہے) اور میں چندا سے کہتی ہوں کہ کہیں دھوپ پڑی ہو تو لائے۔ اس کی خوشبو سے شگون اچھا ہوگا!

(ماں جی چلی جاتی ہیں۔ شانتا سروپ کی طرف دیکھتی ہے اور ایک دم رونے لگتی ہے۔ سروپ گھبرا کر سر اُٹھاتا ہے)

سروپ:۔ ایں۔ ایں۔ آپ کو کیا ہوا۔ (شانتا زور زور سے روتی ہے۔ سروپ کھڑا ہو جاتا ہے)

سروپ:۔ آخر آپ بیٹھے بیٹھے رونے کیوں لگیں؟

(شانتا روئے جاتی ہے سروپ شانتا کے پاس جاتا ہے۔)

سروپ:۔ اوہو آپ تو روئے جاتی ہیں! کچھ بات بھی تو ہو!

شانتا:۔ مجھے نہیں معلوم کیوں رونا آ رہا ہے!

سروپ:۔ بس۔ بس۔ اچھا اب چُپ ہو جائیے۔۔ ہاں ہاں۔

شانتا:۔ (چُپ ہو جاتی ہے) اب تو میں نہیں رو رہی۔

سروپ:۔ آپ تو ایسی روئیں کہ میں گھبرا گیا۔

شانتا:۔ لیکن میں آپکو پریشاں کرنا تو نہیں چاہتی آپ بیٹھ جائیے۔

سروپ:۔ ہاں۔ ہاں (بیٹھ جاتا ہے)

شانتا:۔ مجھے پتا جی کا سایہ کبھی نہیں ملا۔ اب پتی کا سایہ بھی ملتا نظر نہیں آتا (اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیتی ہے) آپ مجھے کیسی لڑکی سمجھ رہے ہونگے!

سروپ:۔ میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں شانتا

شانتا:۔ اوہ!

سروپ:۔ اب تم یہ دُکھ نہیں اُٹھاؤ گی۔ ہمارا دُکھ میں اُٹھاؤنگا۔

شانتا:۔ (حیرت سے سروپ کی طرف دیکھتی ہے) آپ؟

سروپ:۔ ہاں۔ میں تمہارے [illegible] بیاہ کروں گا۔

شانتا:۔ آپ کتنے اچھے [illegible] اچھے ہیں!

سروپ:۔ میں تو تمہیں دیکھ [illegible] ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں ایک دُنیا دکھائی دے [illegible] ہم بیاہ کرینگے ابھی چند منٹ بعد بیاہ میں تو [illegible] منٹ ہی لگتے ہیں۔ اس سے کیا فرق [illegible] بیاہ کی بات چند سال پہلے ہو یا صرف

شانتا:۔ ماں جی کتنی خوش ہوں گی!

(مہاراج ایک روشن موم بتی لئے داخل ہوتے ہیں)

مہاراج:۔ میں موم بتی لے آیا۔ اب بہت کم سمے رہ گیا ہے۔

شانتا:۔ (آواز دیتے ہوئے) ماں جی!

ماں جی:۔ (داخل ہوکر) لگن کی گھڑی نکل تو نہیں گئی مہاراج؟

مہاراج:۔ نہیں ابھی اماوس نہیں ہوئی ہے لیکن بس اب سورج اور چاند ایک بُرج اور ایک دقیقہ پر آیا ہی چاہتے ہیں۔ اور پھر اماوس ہوگا!

سروپ:۔ یہ اماوس کیا ہے؟

ماں جی:۔ (جلدی سے خاموشی کا اشارہ کرتے ہوئے) شی! یہ بات اس وقت نہ پوچھئے۔ ورنہ مہاراج کو اس کی ساری جوتش بتانے میں لگن کا بھی خیال نہیں رہے گا۔

مہاراج:۔ لگن کی گھڑی ہوا ہی چاہتی ہے سروپ اور شانتا آپ دونوں موم بتی کے سامنے فرش پر بیٹھ جائیے۔

سروپ:۔ اچھا مہاراج!

(دونوں فرش پر بیٹھ جاتے ہیں مہاراج نے موم بتی کمرے کے اگلے حصّہ میں وسط میں فرش پر کھڑی کر دی ہے)

مہاراج:۔ میں منتر پڑھتا ہوں۔

ماں جی:۔ (خوشی سے) بیاہ۔۔ میری لڑکی کا بیاہ ہو رہا ہے۔

مہاراج:۔ اوہ! اگر آپ نے غل مچایا تو میں منتر بھول جاؤں گا۔ مجھے لگن کی گھڑی کا بھی خیال رکھنا ہے۔ مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ سورج اور چاند کب ایک درجے اور ایک دقیقہ پر ہوتے ہیں۔ آپ اس کرسی پر بیٹھئے اور اپنے منہ میں رومال ٹھونس لیجئے۔

ماں جی:۔ میں اب آواز بھی نہ نکالوں گی۔ آپ جلدی کیجئے۔

مہاراج:۔ میں جانچ کروں تاکہ ٹھیک لگن کے پھیرے ہو سکیں!

ماں جی:۔ آپ جانچ بعد میں کر لیجئے گا۔

مہاراج:۔ بس ابھی اتنی سی دیر میں! (چٹکی بجاتا ہے)

(چند لمحے خاموشی)

مہاراج:۔ (گھبرا کر) ایں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ گرہ اب بھی کرک پڑی ہی ہے!

ماں جی:۔ (گھبرا کر) کیا کہا آپنے مہاراج؟

مہاراج:۔ میں کہتا ہوں یہ ہوا کیسے؟ مشتری کو اس سمے شرف پر ہونا چاہیئے تھا۔ اور ستارہ قسمت کو رانی میں اماوس کے سمے چندرماں اور شنکر دو سجاؤ راس میں ہونے چاہیئے تھے اور موت راس نوانے میں۔

ماں جی:۔ (بے صبری سے) لگن کی گھڑی مہاراج؟

مہاراج:۔ (تنگ آکر) لگن لگن! لگن!!! میں کہتا ہوں ستاروں کی اس ٹھیک میں بیاہ کی راس نہیں ہوتی!

ماں جی:۔ تو کیا اب میری شانتا کا بیاہ نہیں ہو سکتا؟

مہاراج:۔ مصیبت بیاہ کی بڑی ہے۔ مجھے یہ دیکھنا ہے کہ ستاروں کی چال الٹی کیوں ہے؟

ماں جی:۔ (روتے ہوئے) میری لڑکی!

سروپ:۔ مہاراج جب بیاہ ہو سکتا تھا تو اب کیوں نہیں ہو سکتا؟

مہاراج:۔ (ان سنی کرتے) حساب ٹھیک۔ نقشہ ٹھیک۔ ترجون ٹھیک ستاروں کی چال کا حساب بالکل ٹھیک! لیکن ستاروں نے اپنی چال کیوں بدلی؟ راس کیوں بدلی؟ اب سمجھ کیوں نہیں سمجھا؟ (ایک دم بلند آواز میں) سمجھ گیا!

ماں جی:۔ (رونا بند کرکے) کیا مہاراج؟

مہاراج:۔ (بے خود) بتاؤں؟ میں بتاؤں؟ دوسرا الماس نہیں ہوا!

ماں جی:۔ نہیں ہوا؟

سروپ:۔ (تنگ آکر) میں نہیں جانتا الماس کیا ہوتا ہے میں جاننا چاہتا ہوں کہ بیاہ کیوں نہیں ہو سکتا؟

مہاراج:۔ اگر یہ دوسرا الماس ہو جاتا تو تمہارا بیاہ بھی ہو جاتا۔ بڑی شبھ لگن نکلی تھی!

ماں جی:۔ شاید کوئی اور لگن ہو!

مہاراج:۔ اب تو اکیاون سال بعد دو الماس ہونگے۔ اس سمے اس کنڈلی سے بیاہ کی راس ہوگی۔

ماں جی:۔ اکیاون سال؟ اوہ! (سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں)

مہاراج:۔ (آواز دیتے ہوئے) چندا! چندا!

(چندا جلدی سے آتی ہے)

چندا:۔ جی مہاراج!

مہاراج:۔ انہیں دوسرے کمرے میں لے جاؤ!

چندا:۔ آیئے! ذرا انہیں سہارا دیجئے بی بی جی!

شانتا:۔ آیئے ماں جی!

(شانتا ماں جی کو سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے جاتی ہے۔ چندا پیچھے پیچھے جاتی ہے۔)

(چند لمحے خاموشی! سروپ کچھ کھویا سا بیٹھا ہے)

مہاراج:۔ مجھے یاد پڑتا ہے آپ کو کوئی ضروری کام جانا تھا؟

سروپ:۔ (چونک کر) کیا کام؟

مہاراج:۔ جب آپ آئے تھے تو آپ نے کچھ کہا تھا!

سروپ:۔ مجھے کچھ یاد نہیں

مہاراج:۔ آپ کسی اور صاحب کے دھیان میں آئے تھے!

سروپ:۔ اوہ۔ مجھے لالہ جمنا داس سے ملنا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ اس سڑک کے نکڑ والے مکان میں رہتے ہیں۔

مہاراج:۔ لالہ جمنا داس! ہاں ہاں۔ وہ سامنے والے مکان میں رہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں ایسی چوک ہو جاتی ہے ویسے یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔ اچھا اب آپ جا سکتے ہیں۔

سروپ:۔ (حیرت سے) یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میں چلا جاؤں!

مہاراج:۔ آپ کو بیاہ کے لئے روکا تھا۔ اب بیاہ نہیں ہو سکتا شانتا کی کنڈلی میں بیاہ کی راس نہیں تو دوسرا الماس اب اکیاون سال بعد ہوگا۔

سروپ:۔ یہ تو آپ پہلے ہی بتا چکے ہیں۔

مہاراج:۔ (گھبرا کر) تو کیا آپ یہاں اکیاون سال بیٹھے رہیں گے۔ تو بڑی مصیبت ہے معلوم نہیں لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ ستارے کوک کی ریل گاڑی نہیں کہ جب چاہا کل موڑ دی۔

سروپ:۔ (غصے سے) اور آپ ہمیں کیا سمجھتے ہیں؟ کہ جب چاہا مورتی کے آگے بیاہ کے لئے بٹھا دیا اور جب چاہا کان پکڑ کر کھڑا کر دیا کہ جاؤ نہیں ہوتا بیاہ!

مہاراج:۔ لیکن بیاہ نہ ہونے میں میرا کیا دوش؟

سروپ:۔ دوش! آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے یہ کہنے سے بات ختم ہو جاتی ہے۔

مہاراج:۔ لیکن آپ اس قدر بے حال کیوں ہو رہے ہیں؟

سروپ:۔ مہاراج۔ انسان ستارے نہیں ہیں ستاروں [illegible]

ہنستے کنکر کی طرح چکر کاٹ رہے ہیں۔ ایک چکر کے بعد دوسرا چکر۔ لیکن ستارے ایک بے جان کنکر نہیں ہے۔ آپ انسان ستاروں کی طرح نہیں کھیل سکتے۔

مہاراج:۔ اس قدر فلسفہ کیوں بگھارتے ہیں آپ!

سروپ:۔ آپ بھی سمجھنے کی کوشش کیجئے مہاراج ستاروں کی ایک مسکراہٹ نے ہمیں ایک دوسرے کا کر دیا تھا۔ یہ ستارے آنکھیں میچ کر شانتا کو مجھ سے چھین نہیں سکتے۔

مہاراج:۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ کی یہ باتیں سُنکر ستارے اپنی جگہ نہیں چھوڑیں گے۔

سروپ:۔ کسی کی نیلی چادر میں چھید پڑ گئے ہیں کسی چھپانے کترکتر کر چھلنی کر دیا ہے۔ ان چھیدوں کو آپ لوگ خبر نہیں کیا سمجھ بیٹھے ہیں۔

مہاراج:۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

سروپ:۔ (چیخ کر) میں شانتا سے بیاہ کروں گا۔ میں ضرور بیاہ کروں گا۔ (آواز دیتے ہوئے) شانتا! شانتا! (دوسرے کمرے کی طرف جاتا ہے)

مہاراج:۔ ستارے تمہارے اس بچپن پر ہنس رہے ہوں گے۔ (ہنستا ہے) بیاہ کی راس کے بغیر بیاہ کریں گے (ہنستا ہے) میں بھی ہنس رہا ہوں۔

(خوب ہنستا ہے)

پردہ

ماضی کے سپنے

روپہلی دُھندلکوں کے آنچل کی جُنبش
یونہی رات دن وقت کی گود میں؛
مچلتی رہیگی ــــ تھرکتی رہیگی
تھرکتے ہوئے ہر قدم پر سمٹ کر سرکتی رہیگی!

مُسافر کو جیسے نظر آ رہا ہو کہیں دُور سے ٹمٹماتا چراغ
وہ بڑھتا ہی جائے،
نظر کے فریبوں پہ بڑھتا ہی جائے
مگر پاس پہنچے تو دیکھے!
سمندر نہیں۔ کوئی دریا نہیں، ریت ہی ریت ہو اور کچھ بھی نہیں!
فقط ایک جُنبش ہے جو رات دن
تھرکتی رہے گی ــــ

مری خشک پلکوں پہ بھی چند آنسو
تھرکتے ہیں لیکن ٹپکتے نہیں ہیں ــــ
مرا دل دھڑکتا ہے بے نام جُنبش سے یونہی دھڑکتا رہے گا
ہواؤں سے شعلہ بھڑکتا رہے گا
مچلتی ہوئی جُنبشوں میں تھرک کر
ستاروں کی مانند سو جائے گا

فیضی (جالندھری)

پرتھوی ناتھ شرما

بد سے بدتر

سوکھے ہوئے درخت کی کسی ٹہنی میں کوئی گھنڈی پھوٹ نکلے تو درخت کی ازسرِ نو شادابی کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن جس دھرتی میں تخریب کا بیج پڑ گیا ہو وہ دھرتی ضرور سوکھتے ہوئے درخت کی مانند ایک روز ویرانی کا منظر بن جائیگی۔ اور سوکھے مُرجھے ہوئے کھُردرے درختوں کے کسی ادھ سوکھے تنے کو ایک سمجھ ہی یا آبیاری سے ہرا بن جائیگا۔ کبھی کبھی بیج پھوٹتے ہی فنا ہو جاتا ہے۔ ننھے ننھے پودے پاؤں تلے کچل کر مر جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے بیج تانے تو جوان درخت پالے طوفان اور دیگر قدرتی حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک بار درخت جڑ پکڑے اور اتنا مضبوط ہو جائے کہ وہ آندھی اور طوفان کے حملوں کو سہہ سکے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک مدت وہ سوکھنا شروع ہو اور سوکھ کر ویرانی اور تخریب کی علامت میں تبدیل ہو کر دنیا والوں کو سبق دینا شروع کرے۔ کہ فنا ناقی عمل کا انجام افسردگی ہے۔ اور درخت کی مانند سوکھ جاتا ہے لیکن اُس سراب کے خیال کو کیسے رد کیا جائے جو انسانی دماغوں پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اور جو ہم کو وقت کے چکر کے تیزی سے گھومنے کے باوجود یہ امید دلاتا رہتا ہے کہ تہذیب کے درخت میں ابھی بھی ٹہنی میں شگوفہ کا پھوٹنا اُمید کی علامت ہے۔ دنیا کے نظام بدلنے کا اعلان ہے انسانی خوشیوں کی بڑھوتری کا شگون ہے۔

زندگی ایک بہت بڑا سراب ہے اور یہ اُس بڑے سے بڑے زمانے بے ستون ہی قائم ہے جسے ہم تہذیب کے من مادے کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تہذیب وہ بیج ہے جو انسانیت کی دھرتی میں تب پڑا جبکہ جیون کے کھیل میں تلخی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اور نسلِ انسان کو اس بات کا خیال تک نہ تھا کہ اس کے کل تہذیبوں میں اس قسم کی خرابی پیدا ہو سکتی ہے جو تشویش کا باعث ہو اور جس کے لئے بڑی بڑی کانفرنسیں بلا کر قطعی فیصلے کئے جائیں اور قدرتی بگاڑ کو روک کر معاملات کو اور زیادہ پیچیدہ اور تشویشناک بنایا جائے۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ زندگی نیلے آسمان کی طرح اٹل ہے۔ کتنا ہی گرد و غبار اُڑے، کتنے ہی سیاہ بادل اس قنات کو دنیا کی نگاہ سے روپوش کرنے کی کوشش کریں لیکن گرد و غبار چھٹ جانے کے بعد آسمان آئینہ کی طرح صاف رہتا ہے۔ تبدیلی کے ہوتے ہوئے بھی اس کی دلکشی قائم رہتی ہے دن میں مسافر کے سر پہ چھا کر رات کو ستاروں کی دلاویز سجا کر آسمان ہمیں بتاتا رہتا ہے کہ تبدیلی کا خیال غلط ہے۔ ابدیت یکسانیت وحدانیت میں اتنی لاکھوں کروڑوں دلکشیاں چھپی ہوئی ہیں جن کا اندازہ لگانا حدِ عقل سے باہر ہے۔ لہذا ناسمجھی کے باعث ابدی خوبصورتی کو مسخ کرنے کے عمل کو تبدیلی کا نام دے کر ہم اشیاء کو بد سے بدتر بنا دیتے ہیں۔

بدی کی تاریخ کا آغاز اُس سرحد سے شروع ہو جاتا ہے جہاں انسان نے بالآخر اپنی خوشیوں کو ایک ایک کر کے خیر باد کہنا شروع کر دیا تھا۔ خیال تھا کہ جنازہ نکل جائے گا لیکن سانس چلتے رہے۔ یہ سانس اب بھی چل رہے ہیں۔ نزع کی حالت کی اتنی زبردست طوالت تعجب خیز ضرور ہے لیکن اچھا ہے موت اور زیادہ دور ہو جائے انسانیت سرابوں کا سہارا چھوڑ دے اور اُس حقیقت کو منظور کرے جو وقت کی چوکھٹ پہ بیٹھی با آوازِ بلند پکار کر کہہ رہی ہے۔ اچھائی کا خیال چھوڑ دو اچھا ماضی کا خیال بن چکا ہے۔ اب ہم بدی کی سرحد میں داخل ہو گئے ہیں اور صرف بد کو بدتر ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ ہمارے لئے جو موجود ہے وہ ہی مقابلتاً اچھا ہے۔

مستقبل کی چھاؤنیوں میں سوائے لاش اور کسی چیز کا ڈیرہ ممکن نہیں ہے۔ بد کو بدتر بننے سے روکنے کی کوشش ہی تہذیب کو جلدی گھُن نہ لگنے دیگی۔ اور کم از کم ہم اس تلچھٹ کا مزا تو لے سکیں گے جو ابھی تک زندگی کے پیالے میں موجود ہے۔

بدی کی تاریخ دنیا کی ہر ایک تاریخ کے ماضی کے دھندلے میں شروع ہوتی ہے۔ یا اس کا آغاز مختلف انقلابوں کی مانند سالوں میں پھیلا ہوا ہو سکتا ہے۔ اصل میں اس تاریخ کے دور کا آغاز جب ہی ہوا ہو گا جب انسان نے کھانے کا سبق سیکھا

[illegible] یا کا مطلب سے مراد ہے [illegible] انسانی لہو و لعب
[illegible] مشغول نہ رہ سکتا۔ [illegible] جیون کا دان اسی واسطے ہی ملا
[illegible] کہ وہ اپنے [illegible] آنکھ ناک کان اور دوسرے اعضا کی
[illegible] سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکے۔
[illegible] شام تک وہ اس کھیل میں اتنا مصروف رہتا کہ تاروں
[illegible] نکلتے ہی اُسے نیند کی آغوش میں لے لے اور وہ پھر اگلی صبح
میدانوں میں دوڑنے بھاگنے، دریا میں نہانے اور پانی پینے، ہم
جنسوں کے ساتھ لڑنے اور کھیل کھیلنے، چشموں کے کنارے صنفِ
مقابل سے چشمک زنی کرنے غرضیکہ اُن تمام باتوں میں حصہ لینے
کے لئے تر و تازہ اُٹھے جو کہ زندگی کے پیالے کو چھلکاتی رہتی
ہیں۔ اور اُسے پیدائش اور موت کے درمیان اُن بھاری بھاری
لمحوں سے دوچار نہ ہونا پڑے جو ہمارے کندھوں پر ایک
بارِ گراں کے مانند جھکے جاتے ہیں وہ بکھرے ہوئے لمحے جو ہم
کو بے عمل بنا کر یاس کی گنگناہٹ میں گرا دیتے ہیں۔ اور ہم
دُکھوں کی عارضی جھلک کو ایک مستقل منظر میں تبدیل کر دیتے
ہیں۔ جو کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ سب کاہلی
کے آغاز کا نتیجہ ہے۔ زندگی کے لہو و لعب سے گریز نے کاہلی اور
ساتھ ہی ساتھ دماغ کو جنم دیا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا کاہلی
مصروفیت کہلائی جانے لگی اور زندگی کے لہو و لعب کو وقت ضائع
کرنے کا طریقہ اور آہستہ آہستہ اچھائی ختم۔

گذری صدیوں میں زندگی کو وسیع کرنے کے لئے جو کچھ کیا
گیا ہے وہ ترقی کے نام پر کیا گیا ہے۔ ترقی کاہلی اور دماغی غلامی
کا دوسرا نام ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم پڑتا ہے کہ ترقی
کے نام سے جتنا خون و خرابہ، قتل و غارت اس دُنیا میں ہوا
شاید کسی اور وجہ سے نہ ہوا ہو۔ شروع شروع میں ہم انسان
تھے صرف و محض۔ اس کے بعد انسان دو حصوں میں تقسیم ہوتا
گیا۔ انسانیت اور ترقی۔ جس کا سب سے پہلا روپ تھا ذہنی برتری،
جسمانی برتری اور جسمانی غلامی۔ انسان کو دُنیا میں بچے کی مانند
دھکیل دیا گیا تھا۔ نڈر، بے خوف بچے کی مانند جسے کسی چیز سے
ڈر نہیں تھا۔ تمام دن لہو و لعب میں مصروف رہنا اور رات
کو تھک کر سو رہنا۔ لیکن جوں جوں وقت بیتتا گیا پہلی سی تازگی
اور شادابی کم ہونے لگی۔ خاموش دھیان میں مگن بیٹھا ہوا
انسان دوڑتے بھاگتے اُچھلتے کودتے انسانوں کو اپنے سے کمتر
سوچنے لگا۔ اُسے خواہ مخواہ یہ خیال ستانے لگا کہ زندگی محض کھیلنے
کے لئے نہیں ہے۔ اس کا مقصد زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔ یہ
ترقی کا دُھندلا دُھندلا سا خیال تھا۔ مراد یہ کہ ترقی کا بیج نشوونما
پاتا گیا۔ ایک روز نہیں کتنے ہی سالوں تک یہ پھوٹنے کی کوشش
کرتا رہا۔ اور آج ترقی کا درخت بوڑھا ہو چکا ہے اس کی کمر
پرانے دُکھوں سے جھک گئی ہے۔ اس کے سائے میں جو جو ظلم
روا رکھے گئے ہیں اُن کی داستان طویل ہے۔

پہلے انسان آزاد تھا۔ اکیلا اور آزاد۔ گھر بنا، گاؤں نے
جنم لیا۔ آزادی غلامی میں تبدیل ہو گئی۔ تاریخ صدیوں میں چلتی
گئی۔ وقت ترقی کا راگ الاپنے لگا اور انسان اپنے آپ کو
انسان سے کچھ بالا سمجھنے لگا۔ اپنے آپ کو جو کچھ ہو گا سمجھنا ہی ترقی
کا پہلا زینہ ہے۔ تخریب کی پہلی سیڑھی ہے۔ روزِ ازل کی بازگشت
اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ روزِ ازل کا کھیل رچایا ہی
اس واسطے گیا تھا کہ انسان انفرادی طور سے زندہ رہے۔
آزادی میں سانس لے اپنی اعضا کی قوت، فطری جذبات
اور رجحانات کا صحیح اور صحت مندانہ استعمال سے زندگی کو
آرام کے ساتھ بسر کرنے کے بعد کسی روز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
آسمان تلے آنکھ میچ کر سو جاتے۔ مگر ہم کو یہ پسند ہوتا تب۔
ہم کو دوسری قسم کی پرواز کے لئے بنایا گیا تھا اور ہم نے اُڑنے
کی کوشش بھی اور طرح کی۔ ہم کسی حد تک اپنے جسموں اپنی
صحت مندانہ خوشیوں سے اپنے آپ کو وابستہ کرتے رہے ہیں اس
کے بعد ہم نے دماغ کی طرف رجوع کیا۔ اشرف المخلوقات نے
سمجھا کہ اب انسان کا راستہ خدا کی منزل تک صاف ہو گیا ہے
دماغ کی ایجاد پہ انسان بہت خوش ہوا۔ ہاں! اس نے اپنی
گردن کے گرد رسی ڈال کر پھندا لگانے کا پہلا سبق سیکھا
اور وہ اُن گذری ہوئی صدیوں میں اس پھندے کو اور زیادہ
مضبوط کرتا رہا ہے۔ یہ رسی کسی ایک قسم کے دھاگوں سے نہیں
بٹی گئی ہے بلکہ کتنے ہی قسم کے دھاگوں سے مل کر یہ مضبوط
سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ علم، فلسفہ، قدرت کی پوشیدہ
باتیں معلوم کرنے کا خبط، مذہب، سیاسی نظام یہ تمام کے
تمام وہ دھاگے ہیں جو رسی کو زیادہ مضبوط بناتے رہے ہیں
اور آئندہ زیادہ مضبوط بنائیں گے۔ زندگی میں نظام ترتیب
دینا انسان کا کام نہیں تھا۔ قدرت کے بھیدوں سے واقفیت

ستی تحویل میں چلنے والے انسانوں کو عمل اور تخریب کے جال
نسا یا گیا ہے۔ کھلے پہلدار جنگلوں، ندی نالوں اور چشموں
کی میں رہنے والے زندگی سے کٹ کر پورا انسانوں کو علاج بنایا
واہد بے قصور سمت سزائیں دی گئی ہیں۔ یہ ہے عمل کی
دنیا کے اس دور کا افسانہ جب کہ تہذیب کو غلط طریقے
ستعمال کیا گیا ہے۔ حاکم کو مہذب اور محکوم کو بدتہذیب
سے جب کارخانوں میں بچوں اور عورتوں کو بارہ بارہ
جودہ گھنٹے غیر صحت مندانہ ماحول میں کام کرنے سے
ٹ بھرنے کی خاطر مجبور کیا ہے۔ سپاہی اور مزدور کو
جیتنے کے بعد فاقہ، گمنامی اور دوسرے ٹیڑھے راستوں
بھٹکنے کے لئے دنیا کے پھیلاؤ میں پھینک دیا گیا ہے۔ تہذیب
د اپنا کر ابدی فرعونوں کا مقبرہ تعمیر جا رہی ہے جس کو مکمل
کے لئے نت نئے فرعون ابھرتے رہیں گے اور عوام الناس
ب کے مقبرہ کو گذرتی اور آنیوالی صدیوں میں مکمل طور
یر کرنے کے لئے میٹھے وعدوں سے اکساتے رہیں گے۔ عوام الناس
پہلے ہی ہو گیا ہے آنیوالے وقت کے جبر کے یہ سہہ سکے گی
بارے میں پیشین گوئی کرنا ناممکن تو نہیں مبہم ضرور ہے
ب تک عمل کی سلطنت ہو جو ابدی صورت اختیار کرتی نظر
ہے تب تک انسان تڑپتا رہے گا۔

انسانی جہالت کے اس دور میں کوششیں اب بھی کی جارہی
عظیم جنگوں کے بعد انسان اپنی غلطیوں سے آگاہ نہیں
ا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس قسم کی آوازیں اٹھی تھیں۔
ختم ہو گئی ہے۔ اور دوسری جنگ عظیم کے بعد اس قسم کی
شعلے تک کی نہ بستہ ہی نہیں سمجھی جارہی ہے کتنی زبردست
ی سے حقیقت کو قتل کیا جا رہا ہے۔ انسان اب تہذیب
دور میں داخل ہو رہا ہے جب وہ اپنے ہی بنائے ہوئے
ن اصولوں۔ نظاموں کے جال میں پھنس گیا ہے۔ گو
امن کی بحالی پر بظاہر خوش ہے لیکن تحت شعور کی سلیٹ
ئی ہوئی سیاہی غلط فہمیاں اور انسان اور انسان
ت خلیج اتنی بڑھ گئی ہیں کہ باہر کی مسکراہٹ اندر کی مایوسی
سیدہ نہیں رکھ سکتی۔ اب خلیج کو امن کے تصوراتی پلوں
ر کے پر کرنا بیکار ہے۔ انسان نے قدرت سے بغاوت کا
پ رکھا ہے وہ ہمیشہ سے قدرت سے بغاوت کرتا رہا ہے

آج قدرت انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے۔ صدیوں تلے انسانی ذہانت کی
زبردست سِل کے نیچے دبی ہوئی بھولی بھالی پرکرتی، اسرشٹی، ماں
قدرت آج اپنی قوتوں کو اکٹھا کر رہی ہے اور اپنے آپ کو ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے انسانی دماغ کے بیسٹائیل ——— (فرانس
کا مشہور قید خانہ) سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش میں مشغول
ہے۔ اس بغاوت کا اندازہ لگانا قیاس سے باہر ہے۔ ممکن ہے کہ
انسان نیست و نابود ہو جائے۔ اور نئے سرے سے اس دنیا
کا آغاز ہو جس میں انسان قدرت سے ہم آہنگ ہو۔ اور فطرت کے
سازوں پر ٹھیک طور سے انگلیاں رکھ سکے۔ فرانسیسی انقلاب، سرخ
ستارہ کا بڑھتا ہوا سیلاب، عوام الناس کا مختلف ادوار میں
زبردست کے خلاف احتجاج اس آنیوالی بغاوت کے سامنے تنکے سی
باتیں ہیں۔ لیکن صورتیں ہیں جن سے یہ بغاوت روکی جا سکتی
ہے۔ یہ ہے بد کو بدتر بننے نہ دینا۔ آج قوموں کا فرض ہے کہ وہ
دماغ کے قید خانوں میں سڑنے کی کوشش نہ کریں بلکہ موجودہ
نظام مستقبل سے آزاد کر کے اس میں ایسی خوبیاں پیدا کر دیں
جس سے کم از کم جو میسر ہے ملتا ہے۔ دماغ ہمیشہ ہماری خوشیوں
کو کم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ آئندہ کی امید محض ایک دھوکہ ہے۔
حال کو سدھارنا ہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔ دو جنگوں کے دوران
میں ہم نے مستقبل کے خواب دیکھے۔ دھندلے اور غیر مبہم خواب۔
آج بھی ہم خواب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اب وقت گذر چکا ہے
جب انسان انسان پر حکومت کر سکے۔ آج قدرت عوام الناس
کی مدد کے لئے تیار نظر آتی ہے۔ وہ تب تک چین نہیں لے گی
جب تک عام انسان سے صحیح سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ تب تک
مشینی دور کے حکمراں سائنس کو سموئل بٹلر کی مشہور کتاب
ایری وھان ——— کے عجیب و غریب شہر کے باشندوں کی
تقلید کرتے ہوئے محض ایک گذری ہوئی بات نہ بنا دیں۔ انسان
کی بہتری اس میں ہے کہ وہ بد کو بدتر بننے سے روکے۔ قدرت کی طرف
اپنا دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ عوام الناس کی آواز سنی جائے جدید
سے جو دھوکہ عام انسان کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے اسے دفنا
دیا جائے۔ تب ہی تو کچھ بن سکتا ہے ہیں تو تصویر کا دوسرا رخ
ہمارے سامنے ہے۔ اشیاء کا تباہ کن عمل۔ بد کا بدترین بننے
کا بے روک ٹوک کھلا راستہ ——— کاش ہم ایکبار پھر قدرت سے
آشنائی پیدا کر لیں۔ ایک بار پھر انسان کا بچپن جاگ اٹھے۔ ایکبار

ایٹم بم

کس نے پھونکا ہے اسرافیل کا صور

پھٹ پڑے کوہ فضا تھرائی
کانپ اٹھا ہے شبستانِ وجود
کوئی دیکھے تو خرد کا اعجاز
ایک ذرّے سے ہراساں ہے حیات
دیکھتے دیکھتے ڈوبی آواز
کسقدر سست تھی بنیادِ حیات
اب نظر میں نہ کوئی ہست نہ بود
اب نہ شمعیں نہ پتنگے باقی

میرے اللہ یہ انجامِ شعور
کس نے پھونکا ہے اسرافیل کا صور

پھٹ پڑے کوہ فضا تھرائی
اک نئے دور کا آغاز ہوا
اب نئے ڈھنگ سے ہوگی تنظیم
نئی راہوں کے نشاں لائیگا
ایک اک گام پہ اب فکرِ سلیم
کسے معلوم کہ انساں پھر بھی

اپنی منزل سے قریں ہوگا کہ دور

اختر ہوشیارپوری

پھر ہمارا دل آکاش پر سجے ہوئے تاروں، درختوں سے ڈھکے ہوئے پھولوں کے گچھوں، پہاڑوں کے نکیلے پتھروں پر دندناتے ہوئے ندی نالوں، طاؤس کے رقص، اور سچی اور پاکیزہ اشیاء کی طرف مائل ہو جائے۔ تب یہ اقتصادی، سیاسی، امتیازی نظاموں سے بھری ہوئی دُنیا رہنے کے لئے ایک پُرامن گھر بن سکے گی۔ نہیں تو آنکھ بند کر کے گہرائیوں میں دوڑتے جائیے۔ ... نئے نظام گھڑیئے۔ سب بڑی قوموں کو ہتھیار بندی کی تعلیم اور پست قوموں کو ذلت اور گمنامی کا سبق دیتے رہئے سرمُردہ قوم کو کچل کچل کر ذہنی اور جسمانی طور سے غلام بناتے جائیے۔ یہ ہی ہے تہذیب اور انسانیت کا عروج، یہ ہی ہے ہماری منزل، یہ ہی ہے ہمارا منتہائے مقصود — ہاں! اس کے سوا اس کے کھوئی ہوئی کو پھر آماجگاہ بنایا جائے کوئی چارہ نہیں شاید ... کو تاریکی سے محبت ہو گئی ہے۔ ماضی کے ایک فلاسفر نے مرتے وقت کہا تھا۔ روشنی، روشنی، اور روشنی۔ حال کا فلاسفر کہتا ہے۔ تاریکی، تاریکی اور تاریکی — ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا ... چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ مدتوں سے عدم کے دروازے پر شمع جلانے کے پروگرام باندھے جا رہے تھے لیکن آج کوئی تیار نہیں۔ آج جور و استبداد سے دبی ہوئی عوام الناس کی چیخ چلاہٹ کبھی کوئی نہیں سنتا۔ آج مایوسی کی سلطنت ہے۔ اس ماننے سے ممکن ہے معدودے چند ہی انکار کریں۔ جنگیں ہمیشہ عوام الناس کی پیٹھ ٹھوک ٹھوک کر وعدۂ فردا دلا کر لڑی گئی ہیں اور لڑی جائیں گی۔ انسان بیوقوف بنتا رہے گا۔ انسان آخر وہ اپنے دماغ سے محکومیت کے خیال کو کیوں نہیں باہر نکال کر پھینک سکتا۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اٹھے پھر وہ آزادی، مساوات اور برادرانہ اتحاد کا علم بلند کرے لیکن خون کی ندیوں سے سینچی ہوئی بنیادوں پر نہیں۔ بلکہ مصالحتانہ رویہ کے ساتھ۔ ورنہ تلخ حقیقت ہمارے سامنے ہے۔ انسان وقت سے پہلے ہی نیست و نابود ہو جائیگا۔ کیوں؟

کل، آج، کل

مخمور جالندھری

کل — (جو گذر چکا ہے)
پیڑ کے نیچے ایک الاؤ — اُس کے گرد
اُونگھ رہے ہیں ننگے وحشی، بھوکے وحشی غم سے نڈھال
اتنے میں اک وحشی اُٹھا — جھاڑی گرد
روغن کالی آنکھیں جس کی — چہرہ زرد
بولا: "میں ہونے نہیں دونگا اپنی قوم کا خستہ حال
اُٹھو، پڑوسی کے گھر میں ہے عزت، روٹی، کپڑا، مال"
اُونگھتے بھوکے — اُٹھے، جاگے — کاٹے پیڑ
ہلکے بھاری بنے سفینے — عالیشان
نیزے، بھالے، برچھے، چاقو، تیر کمان
ہوا فراہم قتل و غارت کا سامان
آندھی اُٹھی، اُمڈی، چھائی — ہر سو گونجی چیخ پکار
بوڑھے بسمل، بچے گھائل، گودیں ویراں، عصمت چاک
سارے پڑوسی زنجیروں میں — رقصاں اُن کے گھر میں خاک

—— (۲) ——

آج — (جو گذر رہا ہے)
گرم انگیٹھی پاس ہی اُس کے — میز کے گرد
سوچ رہے ہیں ریشم پہنے، شائستہ، برتر انسان
اُن میں سے ایک اُٹھا — ہاتھ میں لیکر جام
آنکھوں میں خنجر کی چمک، چہرہ گلفام
بولا: "پچھلی جنگ کا کرنا ہے پہلے پورا نقصان
اُٹھو، پڑوسی کے گھر میں ہے سونے چاندی کا دالان"
ناداروں کی پل میں بنی — اک بھاری فوج
حبّ وطن کا، ننگِ وطن کا لے کر نام
روٹی کپڑے کا لالچ دیگر انعام —
لے ہی آتے انسانوں کو زیرِ دام
لوہے نے لوہے سے کھیلی ہولی — گونجی چیخ پکار
بوڑھے بسمل، بچے گھائل، گودیں ویراں، عصمت چاک
مسجد، مندر، قصر و کلیسا ریزہ ریزہ — جزوِ خاک

—— (۳) ——

کل — (جو گذرے گا)
سر رکھے اُبھرے سینوں پر — حوض کے گرد
سوچ رہے ہیں "فردوسِ مستقبل" کے خالق انسان
ریشمی زلفوں پر ایک اُٹھا — پھیرتا ہاتھ
اُس کی محبوبہ بھی اُٹھی — اُس کے ساتھ
بولا: "اپنے پڑوسی کی جنت ہے کتنی عالیشان
اُٹھو حسینو، شہد کی نہریں، عیش و عشرت کا سامان"
"جوہر بم" — پُرسوز شعاعیں، پھیل گئیں
فاش ہوئے سب "ہنگامِ محشر" کے راز
ہوئے مصائب کے سنگیں دروازے باز
بوڑھی ڈائن موت نے چھیڑا اپنا ساز —
شہر کھنڈر — خاموش فضائیں، بادِ نکہت زا سموم
گھر والا کوئی نہ کوئی گھر — کوئی پیڑ نہ اُن پر بوم

بھوکے انسانوں سے توقع رحم و کرم کی — خام خیال
کب آئے گا دورِ مسرت — ذہن پہ کوئی بوجھ نہ ڈال

فصل

بلرام پور کا آدم خور

قصہ شروع کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ بلرام پور کا محل وقوع اور اس کے اطراف واکناف آپکو اچھی طرح سے سمجھا دوں۔ گو اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں۔

بلرام پور ۳۵ یا ۴۰ جھونپڑوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے گو آبادی کوئی سو کے لگ بھگ ہوگی۔ کچھ جھونپڑوں میں رہتے ہیں اور کچھ جانوروں کے رکھتے کھلے میدان میں پڑ رہتے ہیں۔ اس میدان میں چونکہ گاؤں کے سارے مویشی بندھتے ہیں اس لئے چاہے سردی ہو یا گرمی ساری رات آگ جلائی جاتی ہے تاکہ درندوں سے جانور بچے رہیں۔ درندے بھی اس آگ کے عادی سے ہوگئے ہیں جب جی چاہتا ہے حملہ کر بیٹھتے ہیں۔ اگر حملہ شور مچنے سے پہلے کامیاب ہوگیا تو جانور کو لے بھاگے اور ادھم مچنے سے پہلے یا شروع ہوتے ہوتے جنگل میں پہونچ گئے ورنہ جانور زخمی ہوکر بچ جاتا ہے۔ جبر گاؤں جنگل کے ایک صاف شدہ گول پلڑے کے بیچوں بیچ آباد ہے۔ اس دائرے کا قطر کوئی آدھ میل ہوگا گاؤں کے جنوب میں ایک چھوٹا سا تالاب ہے جس کا بند گاؤں کی طرف ہے۔ یہ تالاب کا پانی گاؤں کے مرد اور عورتیں کپڑے دھونے اور پینے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے دامن سے جنگل شروع ہوجاتا ہے اور دو تین میل کے بعد نیچی نیچی پہاڑیوں کی قطاریں شروع ہوجاتی ہیں۔ گاؤں کے مغرب میں ۵ میل پر ڈاک بنگلہ ہے۔ تالاب کا پانی برسات میں ڈاک بنگلے کے احاطہ تک پہونچ جاتا ہے۔ گرمیوں میں پانی کی کمی کے باوجود ایک نالہ باقی رہ جاتا ہے جو ڈاک بنگلے کے ۵۰ گز پیچھے سے گذرتا ہوا تالاب سے جا ملتا ہے۔ ڈاک بنگلے کا پچھلا احاطہ جنگل سے متصل ہے۔ یہ جنگل گاؤں کو شمال اور مشرق دونوں طرف سے ہی گھیرے ہوئے ہے۔ اردگرد میلوں ساگوان کے درختوں کا جنگل ہے زیادہ تر میدان اور بعض بعض جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جن کی [illegible]

نالوں سے کٹے ہوئے ہیں آس پاس کے گاؤں چھ چھ سات سات میل پر آباد ہیں۔ یہ سب کے سب تقریباً بلرام پور کی قسم کے ہی ہیں۔ بلرام پور سے تین راستے نکلتے ہیں۔ گاؤں کے مغرب والا راستہ پرتاب پور جاتا ہے۔ پرتاب پور تحصیل کا مستقر ہے اور تقریباً ۲۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ دوسرا راستہ مشرق کی طرف ہے اور یہ نندی گاؤں جاتا ہے۔ یہ راستہ ایک بڑے تالاب کے بند پر سے ہوکر گذرتا ہے جو لکھن پور کے تالاب کے نام سے مشہور ہے۔ اس تالاب کے بند کے نیچے تقریباً دو ہزار ایکڑ میں چاول کی کاشت ہوتی ہے جو آس پاس کے گاؤں کے کام آتا ہے۔ بلرام پور کے شمال کی طرف کریم آباد چھ سات میل پر آباد ہے۔ اس کا راستہ ایک اونچی پہاڑی کے دامن میں پیچ و خم کھاتا گذرتا ہے ان سب راستوں پر صرف ہلکی بیل گاڑیوں سے سفر کیا جاسکتا ہے۔ برسات میں تقریباً آمد و رفت بند ہوجاتی ہے۔

۱۹۳۸ء کی مارچ میں ایک دن پرتاب پور کے تحصیلدار نے مجھے وقت گذاری کے طور پر اس آدم خور کے قصے سنانے شروع کئے۔ قصوں میں اور خاص کر شکار کے قصوں میں عموماً ستر فیصدی مبالغہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ تحصیلدار صاحب کو شکار کا شوق نہ تھا اس لئے انہوں نے چند بعید از فہم واقعات بھی سنائے غالباً ان کو خود بھی ان پر سچے ہونے کا یقین تھا۔ میں حسب معمول ان کے قصوں میں سے ستر فیصدی واقعات منہا کرتا رہا۔ مگر بقیہ ۳۰ فیصدی کچھ غیر معمولی معلوم ہوتے۔ چنانچہ مستقر پر پہونچنے کے بعد میں نے اس آدم خور کے کردہ نقصانات کی تحقیق کچھ پولیس کی رپورٹ اور کچھ مال اور کچھ جنگلات کے دفتر سے مرتب کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

پچھلے ۳ سال میں تقریباً ۱۳۲ آدمی ہلاک ہوئے پہلے سال ۲۵ دوسرے سال ۴۴ تیسرے سال ۶۵ یعنی یہ آدم خور رفتہ رفتہ جانور ہلاک کرنے چھوڑتا چلا جارہا تھا میں نے [illegible]

...ست درخواست کی کہ وہ اس سلسلہ میں جو بھی واقعہ
...س کی تفصیل سے مجھے مطلع کرتے رہیں۔

قصہ مختصر ... ڈیڑھ میں بہت مصروف رہا۔
...یک ہفتہ میں ... کی چھٹی لے کر اور شکار کا پورا
انتظام کر کے بلرام پور جا پہونچا۔ ان ڈیڑھ مہینے کے عرصے میں
... نے غیر معمولی جانی نقصان کیا۔ یعنی دس آدمی مارے
... پانچ سات زخمی ہو گئے۔ اپنے ساتھ میں اپنے شکاری
... بہادر خاں کو لے گیا۔ یہ شخص غیر معمولی استقلال کا آدمی
... نشانہ اچھا لگاتا ہے۔ کھوج لگانے میں کافی مہارت
رکھتا ہے۔ شکار سے متعلقہ سارا انتظام اس کے سپرد رہتا ہے۔

بلرام پور میں ۵ مئی کی شام کو پہونچا۔ یہاں لوگوں
... میرے آنے کی خبر پہلے سے سرکاری طور پر مل چکی تھی۔ اس
... تقریباً سارا انتظام ہو چکا تھا۔ اتنے ہی میں مجھے خبر ملی
... تین تاریخ کی شام کو تقریباً چھ بجے شیر ایک عورت کو
... تالاب کے بند کی طرف پانی بھر رہی تھی اٹھا کر لے گیا ہے۔
... نے دریافت کیا کہ نعش کی تلاش کی گئی یا نہیں لوگوں
... صاف صاف تو نہیں بتایا مگر باتوں سے یہ پتہ چل گیا کہ کوئی
... اس کوشش نہیں کی گئی۔ غالباً کسی کی ہمت ہی نہ ہوئی
اس کے پیچھے جنگل میں جاتا۔ اور ٹھیک بھی ہے کہ صرف
... دس بیس تو کیا سو آدمی بھی جنگل میں قدم رکھنے کی
ہمت نہ کرتے اور پھر آدم خور کے پیچھے۔

اس شام کو کچھ نہ کیا جا سکتا تھا۔ تقریباً مغرب ہو
... چکی تھی۔ پھر میں بہت تھکا ہوا بھی تھا۔ کھانا کھا کر نماز
... پڑھی اور سونے کے لئے لیٹا تو تقریباً دس بج رہے تھے۔
بنگلے میں سخت گرمی تھی۔ باہر سونے کی ہمت نہ ہوتی تھی جب
... اندر نہ سو سکا تو برآمدے میں پلنگ نکلوایا اور احتیاطاً
... پندرہ بیس فٹ دور آگ جلوائی۔ پاس ہی ایک درخت
... سے ایک کتا بندھوا دیا۔ اس خیال سے کہ اگر کوئی جانور آیا
... کتا ضرور شور مچائے گا۔ اس انتظام کے بعد میں لیٹ گیا
اور سوچنے لگا کہ کارروائی کیسے شروع کی جائے۔ میں یہی
سوچ رہا تھا کہ شیر نے آواز دی معلوم ہوتا تھا کہ شیر
تالاب کے دامن میں ہے۔ غالباً پانی پینے آیا تھا۔ یقین جانئے
[illegible]

شیر کی گرج کافی دہشت انگیز ہوتی ہے۔ میں نے خیریت
اسی میں دیکھی کہ گرمی کو بھول جاؤں اور کمرے کے اندر سوؤں۔
نوکر سارے ملازموں کے کوارٹروں میں بند تھے اکیلا تھا
... سکا یہی تھا خود چارپائی اٹھا کر اندر لے گیا۔ کوارٹر بنگلے کے
اور کھڑکیاں کھول کر لیٹ گیا۔ ان کھڑکیوں میں لوہے کی
سلاخیں لگی ہوئی تھیں اس لئے کوئی خطرہ نہ تھا۔ بڑی مشکل
سے آنکھ لگی۔ رات میں شیر نے پھر آواز دی اور میری آنکھ
کھل گئی۔ یہ آواز شیر نے نالہ سے دی تھی اور جیسا کہ میں
اوپر بیان کر چکا ہوں یہ نالہ بنگلہ سے ... اگر پیچھے کی طرف
واقع ہے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد نیم کے سوکھے پتوں پر کسی
نرم پیر کے جانور کے چلنے کی آواز آئی۔ مجھے شیر کا خیال
ہوا۔ میں نے آہستہ سے اٹھ کر ٹارچ رائفل پر لگائی۔ کارتوس
بھرے اور کھڑکی میں سے بندوق کی نال نکال کر ٹارچ جلائی۔
غالباً شیر نے بندوق کی نال کی لوہے کے سلاخوں سے
ٹکرانے کی آواز سن لی تھی۔ مجھے یہ خیال ہے کہ وہ بہت
ہی تیزی سے ایک چھوٹی جھاڑی کے پیچھے ہو گیا جو نیم کے
تقریباً نیچے ہی تھی۔ میں نے قیاساً فیر کرنا مناسب نہ سمجھا۔
کچھ دیر اور انتظار کیا۔ پھر یہ سوچ کر کہ شیر یا جو کوئی
بھی جانور تھا وہ جھاڑی کی آڑ آڑ میں واپس جنگل چلا
گیا ہے۔ میں لیٹ گیا۔ نہ معلوم کب آنکھ لگ گئی۔ ہوا میں
ذرا خنکی آگئی تھی اچھی طرح سویا۔ جاگا تو صبح کے آٹھ بجے
تھے۔ سب سے پہلا کام میں نے اٹھنے کے بعد یہ کیا کہ رائفل لیکر
شیر کے نشان دیکھنے کے لئے چل پڑا۔ نیم کے پیڑ کے نیچے
تو نشان پتوں کی وجہ سے نہ بنے تھے مگر جھاڑی کے
نیچے ضرور تھے۔ معلوم ہوا کہ شیر وہاں کچھ دیر کھڑا رہا
اور اس کے بعد بنگلے کا ایک چکر لگا کر نالے کی طرف چلا گیا۔
ممکن تھا کہ اگر میں کچھ دیر اور انتظار کرتا تو مجھے فائر کرنے
کا موقع مل جاتا اور تقریباً پندرہ دن حیران نہ ہونا پڑتا۔
خیر نالے میں پہونچنے کے بعد مجھے گیلی مٹی میں چند بہت
اچھے پیروں کے نشان ملے۔ جن لوگوں نے شیر کا شکار
کھیلا ہے وہ ان نشانوں کی اہمیت سے خوب واقف
ہیں۔ چند باتوں کا تو ان کو دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے۔ کہ
مثلاً شیر کتنا بڑا ہے کتنی دیر ہوئی ... [illegible]

لومڑیا مارو وغیرہ وغیرہ۔

مجھے ان نشانوں سے یہ پتہ چلا کہ یہ مادہ ہے اور بائیں
جانب کا اگلا پنجہ اندر کی طرف مڑا ہوا ہے۔ غالباً کبھی یہ پیر
زخمی ہوا ہوگا۔ دائیں طرف کے پچھلے پنجے کی گدی میں زخم
کا نشان تھا۔ شیرنی ساڑھے آٹھ فٹ اور نو فٹ کے
درمیان ہے۔ شیرنی یہاں سے سیدھی جنگل کی طرف
چلی گئی۔ اس کے تعاقب میں فی الحال کوئی فائدہ نہ تھا
اس لئے ڈاک بنگلے چلا آیا۔ واپس ہوتے ہوئے اور راستہ
بھر یہ سوچتا رہا کہ ابتدا کیسے کی جائے نعش کی تلاش بیکار
تھی اگر تو شیرنی نعش کی کھا چکی تھی ورنہ وہ رات کو
چکر لگاتی نہ پھرتی۔ اس کے علاوہ دو تین راتیں گذر چکی
تھیں۔ یہ بھی ہڈیاں گیدڑ اور لگڑ بگے ختم کر گئے ہونگے۔
آخر فیصلہ یہ کیا کہ ابتدا حسب معمول کی جائے۔ تھوڑی سی
کہہ کر چار بھینس کے بچے جن کے بالشت بالشت بھر کے
سینگ تھے منگوائے ان میں سے دو کو میں خود لے کر
باندھنے چل پڑا۔ پہلا تو ڈاک بنگلے کے پیچھے ہی نالے میں
باندھا جہاں پیر کے نشانوں سے ظاہر تھا کہ شیرنی
عموماً آتی جاتی ہے۔ دوسرا تین نالوں کے سنگم پر باندھا
جو تالاب کی پچھلی طرف کی پہاڑیوں سے نکلتے تھے اور اس
وقت سوکھے تھے۔ یہ جگہ تقریباً ڈاک بنگلے سے چار میل
دور ہوگی۔ چونکہ ہم لوگ دوپہر کے کھانے کے بعد چلے تھے
اس لئے کٹڑوں کو باندھنے اور گھاس ڈالنے وغیرہ میں
تقریباً شام کے ساڑھے پانچ بج گئے تھے۔ ہم لوگ جلد
جلد واپس ہو رہے تھے تاکہ مغرب ہونے سے پہلے پہلے جنگل
سے باہر ہو جائیں۔ اس دوران میں ایک ایسا حادثہ پیش
آیا جس سے مجھے اس شیرنی کی چالاکی کا کافی ثبوت
مل گیا۔ عموماً گھنے جنگلوں میں زیادہ تر پگ ڈنڈیوں پر
نقل و حرکت ہوتی ہے یہ پگ ڈنڈیاں یا تو آدمی اور
مویشیوں کے چلنے سے بنتی ہیں یا خود جنگلی جانوروں
کی آمد و رفت سے بن جاتی ہے۔ ہم لوگ ایسی ہی ایک ایک
پگڈنڈی پر چل رہے تھے اور ہماری پارٹی کی تعداد سات
آٹھ ہوگی۔ راستے میں مجھے دفعتاً بائیں جانب ایک بہت
شاندار سینگوں والا چیتل نظر آیا۔ گو اسکو مارنا اصول کے
خلاف تھا مگر طبیعت نہ مان رہی تھی۔ اس لئے [illegible]
لار مار رہی ہیں مگر اس دوران میں چیتل چل [illegible]
تھا کہ میں اس کو پیچھا کر کے پانچ دس منٹ میں [illegible]
میں نے ساتھیوں کو وہیں ٹھہرے رہنے کی تاکید کی [illegible]
چیتل کا تعاقب شروع کیا۔ چیتل نے پہاڑی [illegible]
یعنی اس طرف جا رہا تھا جس طرف سے ہم واپس آ رہے
تھے۔ دس منٹ کے بعد جب میں نے یہ دیکھا کہ یہ چیتل
قابو میں آنے والا نہیں تو میں راستہ کاٹ کر واپس پگڈنڈی
پر آ گیا۔ زیادہ سے زیادہ میں اپنی پارٹی سے پچاس
یا سو گز پیچھے تھا میں نے تیز تیز قدم اٹھا کر چلنا شروع
کیا اتفاق سے میری نظر پگڈنڈی پر پیروں کے نشان پر
پڑی۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ شیرنی کے پیروں
کے نشان بھی اسی طرف جا رہے ہیں جس طرف کہ ہم
لوگ جا رہے تھے۔ اور پھر بالکل تازہ نشان تھے۔
دوسری بات قابل غور یہ تھی کہ شیرنی ہماری پارٹی
سے آگے نہیں بلکہ میرے اور پارٹی کے بیچ میں تھی کیونکہ
اس کے پیر کے نشان میرے آدمیوں کے پیر کے نشانوں پر
پڑے ہوئے تھے۔ یعنی یہ کہ وہ پیچھا کر رہی تھی اور پارٹی
سے بہت ہی قریب تھی۔ میں مشکل سے ان آدمیوں سے
۳۰۰ گز دور تھا اور مجھے ان کے اونچے اونچے بولنے کی آواز
صاف سنائی دے رہی تھی۔ موقع کافی نازک صورت
اختیار کئے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر شیرنی یہی
کھیل کھیلنا چاہتی تھی تو اس کو دو بھی کھیل سکتے ہیں۔
شیرنی پارٹی پر داؤ لگانے میں مصروف تھی اور میں
شیرنی کی تلاش میں تھا۔ مگر یہ کھیل تھا خطرناک کیونکہ
شیرنی جنگل میں اس کھیل کی ماہر ہوتی ہے اور شکاری
چاہے کتنا ہی تجربہ کار ہو اس کے مقابلے میں اناڑی ہوتا
ہے مگر چونکہ شیرنی کو اس کا علم نہ تھا کہ اسکا بھی کوئی
پیچھا کر رہا ہے اس لئے کامیابی کے امکانات میرے لئے
زیادہ تھے بشرطیکہ میرے شیرنی کو دیکھنے سے پہلے وہ
کسی کو اپنا شکار نہ بنا لے۔ میں بہت آہستہ آہستہ جھاڑیوں
کی آڑ لیتا آگے بڑھتا گیا کوئی پندرہ بیس منٹ
میں اپنی پارٹی سے ۵۰ گز پر پہنچ گیا مگر نہ تو [illegible]

[illegible] شیرنی نظر آتی۔ اس جگہ میں پانچ منٹ تک بالکل
[illegible] کہ شیرنی گئی کہاں۔ اس بات
[illegible] یقین ہے کہ ہم لوگوں میں سے ایک کی جان بچائی
[illegible] کیا کہ اگر میں شیرنی ہوتا تو کیا کرتا۔ مثال
[illegible] خیال [illegible]

[illegible] کھڑے تھے اس سے سو گز آگے چند پتھروں
کی اونچی چٹانیں تھیں جن کی بلندی غالباً ۵ فٹ ہوگی۔ اس
کے اوپر چند چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور لمبی گھاس اُگی ہوئی تھی
جو سوکھ کر زرد ہو گئی تھی۔ پگڈنڈی اس کے بالکل بازو سے گذرتی
تھی۔ مجھے کامل یقین تھا کہ شیرنی ان چٹانوں پر بیٹھی دشمنوں
کا پیچھے گذرنے کا انتظار کر رہی ہے۔ اگر میں بائیں طرف
جنگل میں سے ہو کر چٹان کے پیچھے پہونچ جاؤں تو اس کا
امکان تھا کہ مجھے شیرنی چٹان پر بیٹھی نظر آ جائے۔ جب میں
تقریباً چٹانوں کے پیچھے ۵۰ گز بائیں کو جا پہونچا تو مجھے چٹان
کے اوپر گھاس میں خفیف سی حرکت نظر آئی۔ یہ حرکت ایسی
نہ تھی جو ہوا کے چلنے سے گھاس میں پیدا ہوتی ہے اس سے
مجھے جو کچھ بھی شبہ تھا وہ جاتا رہا۔ مگر چونکہ کوئی چیز نظر
ہی نہ آتی تھی اس لئے کسی قسم کا فیصلہ ہی نہیں کیا جا سکتا
تھا۔ روشنی غائب ہوتی جا رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ اور
پانچ یا دس منٹ میں رائفل سے نشانہ لینا مشکل ہو جائیگا۔
جو کچھ بھی کرنا تھا وہ اسی دوران میں کیا جانا چاہیئے۔ میں
جھاڑی کی آڑ سے نکل آیا اور آواز دے کر اپنے ساتھیوں سے
کہا کہ شیرنی چٹان پر بیٹھی ہے اور مناسب یہ ہے کہ وہ
فی الحال درختوں پر چڑھ جائیں تاکہ میں اس پر فائر کروں۔
میرا آواز دینے سے یہ مطلب تھا کہ شیرنی کو پتہ چل جائے کہ
وہ دو طرف سے گھری ہوئی ہے یا تو وہ بھاگنے کی کوشش کریگی
یا یہ کہ [illegible] ان میں بھگدڑ مچ گئی ہے۔ یا وہ ڈر کر ان میں سے
کسی کو پکڑنے کی کوشش کریگی۔ چونکہ چٹانوں اور آدمیوں
میں سو گز کا فاصلہ تھا مجھے امید تھی کہ وہ حملہ نہ کریگی اور
اگر کیا بھی تو مجھے تقریباً دو دفعہ فیر کرنے کا موقعہ مل جائیگا۔
میرا پہلا خیال ٹھیک نکلا شیرنی نے حملہ کی کوشش نہ کی۔
[illegible] شیر سو گز سے زیادہ پر حملہ نہیں کرتے۔ گاؤں والوں
[illegible] تک تو اس کی قوت فیصلہ نے

کام ہی نہیں کیا اور جب وہ اس قابل ہوئے تو [illegible]
کے وہ درختوں پر چڑھتے چڑھتے کئی دفعہ گر پڑے۔ میری
نظر چٹانوں پر تھی خیال یہ تھا کہ شیرنی ضرور بضرور کوئی
نہ کوئی حرکت کریگی مجھے شیرنی قطعی نظر ہی نہ آئی۔ بہادر
خاں نے آواز دے کر مجھے بتلایا کہ شیرنی کو دیکر پگڈنڈی پر
کھڑی ان لوگوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ چونکہ پگڈنڈی کا
وہ حصہ چٹانوں کے پیچھے تھا مجھے شیرنی نظر نہ آ سکتی
تھی۔ میں نے بہادر خاں سے کہا کہ اگر وہ درخت پر بیٹھے بیٹھے
گولی چلا سکتا ہے تو چلائے۔ بہادر خاں جیسے کہ میں اس سے
پہلے کہہ چکا ہوں نشانہ اچھا لگاتا ہے۔ مجھے امید تھی کہ اگر
شیرنی وہیں نہیں گر گئی تو اتنی زخمی ضرور ہو جائے گی کہ
دوسرے دن تلاش کر کے اسکو مار لیا جائے۔ مگر قسمت ساتھ
نہ دے رہی تھی۔ بہادر خاں کی گولی خالی گئی اور جانی بھی چاہیئے
تھی۔ وہ بہت ہی بے ڈھنگے طریقہ سے درخت میں لٹکا ہوا تھا
اور وقت [illegible] دونوں ہاتھ استعمال کرنے تقریباً اُسکے
لئے ناممکن تھے۔ بندوق کی آواز کے ساتھ ہی شیرنی اس
قدر تیزی سے دوسری جانب بھاگی کہ جب مجھے دکھائی
دی تو نشانہ لینا مشکل تھا۔ ساتھیوں کو درخت سے اتارنے
میں کافی دقت پیش آئی اور واپسی اس سے بھی زیادہ تکلیف
دہ ثابت ہوئی۔ گاؤں والے نہ آگے چلنے کو تیار تھے اور نہ
پیچھے۔ لہذا ان کو بیچ میں رکھا گیا۔ بہادر خاں آگے آگے اور میں
پیچھے۔ تقریباً سارا راستہ کسی نہ کسی چیز سے یہ لوگ ڈرتے رہے۔
اس واقعہ کا گاؤں والوں پر اثر یہ ہوا کہ دوسرے دن
سے بہت سوں نے جنگل میں داخل ہونے سے قطعی انکار کر دیا۔
یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کو کسی نہ کسی طریقہ سے مجبور کیا جا
سکتا ہے میں نے مناسب یہی جانا کہ اُن کو مجبور نہ کیا جائے۔
اپنی ضرورت کے لئے میرے پاس کافی آدمی تھے اور دو ایک
جن کی ضرورت محسوس ہوئی وہ بھی مل ہی جاتے تھے۔
اس دن دوسرے دو بچھڑے میں نے ایک کو گاؤں کے
شکاریوں نے کریم آباد کے پہاڑی راستے کے دامن میں
باندھا اور دوسرا آہن پور کے تالاب کے بند کے قریب باندھا
تھا۔ مجھے رات کے واقعہ کے بعد یہ یقین تھا کہ شیرنی نے
ان چاروں بچھڑوں میں سے کسی کو چھوا تک نہیں۔ باشندے

پہنچ کر بہادر خاں اور دو گھسیاروں نے مل کر نالے اور چھوٹے بچھڑوں کو دیکھ ڈالا۔ وہ مرنے سے سو رہے تھے ... کر گھاس کاٹ لانے اور پانی پلانے کے بعد ہم لوگ واپس ہوئے۔ ناشتہ کیا اور گھن پور کے تالاب کی طرف چل پڑے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بچھڑے کو دو تیندوؤں نے مار کر اور کھا لیا ہے۔ یہ ایک نیا مسئلہ بیچ میں آ کھڑا ہوا۔ اگر ان کو نہ مارو تو یہ تقریباً ہر بندھے ہوئے بچھڑے مار دیا کریں گے اور شیر کے اور چوکنے ہو جانے کا امکان تھا۔ یہ بھی امکان تھا کہ وہ یہاں بھی بندوقوں کی آواز سن کر گھبرا کر چھوڑ بھاگے اور شاید کل رات کے واقعہ کے بعد چلی بھی گئی ہو۔ بہرحال ہم نے فیصلہ کیا کہ ان کو ختم ہی کر دیا جائے۔ یہ تیندوے بچھڑے کو کھینچ کر ۲۰۰ گز دور لے گئے تھے پیٹ کا بہت سا حصہ اور دو پچھلی ٹانگیں کھا لی تھیں اور ان کے واپس آنے میں کوئی شبہ ہی نہ تھا۔ میں نے بہادر خاں اور ان دونوں گھسیاروں میں سے ایک کو سدی گاؤں روانہ کیا تاکہ وہ مچان باندھنے کا سامان لے آئیں۔ مچان باندھنے کی ہدایتیں میں دے چکا تھا۔ دوسرے گھسیارے کو میں لیکر کریم آباد کی پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ یہاں کا بچھڑا ابھی مارا گیا ہے مگر شیر چھوٹا اور نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ اس سے وہ رسی بھی نہ ٹوٹی تھی جس سے کہ بچھڑا بندھا تھا یا اُس نے اس کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ اب میری قطعی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ تقریباً دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ میں نے تصفیہ یہ کیا کہ شیر نے بچھڑے کا بہت کم حصہ کھایا اس لئے وہ آج تو واپس ضرور ہی آئیگا اور شاید دوسرے دن بھی اگر نیا بچھڑا باندھ دیا جائے۔

میں واپس گھن پور کے تالاب چار بجے پہونچا۔ آدمیوں کو واپس کرتے اور کھانا کھاتے ساڑھے چار بج گئے۔ اور پانچ منٹ بعد مچان پر میں اور بہادر خاں جا بیٹھے۔ اس کے بعد لوگوں کو رخصت کر دیا۔ ساڑھے چھ بجے تک دونوں تیندوے آ گئے۔ بظاہر ان کو کوئی شبہ نہ ہوا تھا۔ چند منٹ کے اندر اندر ہم نے دونوں کو مار لیا۔ باقی رات مچان پر گذارنی بیکار تھی۔ ہم لوگ گھنٹے بھر میں ڈاک بنگلے پہونچ گئے۔

دوسرے دن صبح ہی بہادر خاں کو چند آدمیوں کے ساتھ گھن پور روانہ کیا۔ ہدایت یہ دی کہ دونوں تیندوے ... کے ہاتھ بلرام پور روانہ کر دے۔ گھن پور میں ایک نیا بچھڑا باندھنے کے بعد وہ کریم آباد کی پہاڑی کے پاس دوسرے بچھڑے کے ساتھ میرا انتظار کرے۔ ناشتے سے پہلے میں اُدھر کے دونوں بچھڑے دیکھ آیا۔ شیرنی دونوں بچھڑوں کے ۲۰ یا ۳۰ گز قریب سے گذری تھی اور یہ ناممکن تھا کہ اس نے ان کو نہ دیکھا ہو۔ اس سے یہ توقع بھی جاتی رہی کہ شاید وہ بچھڑوں میں سے ایک کو ماریگی۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ دونوں تیندوے آ گئے ہیں اور ان کی کھال کھینچنے اور سکھانے کے متعلق ہدایات دیتے کافی دیر ہو گئی، اس لئے دوپہر کے کھانے کے بعد کریم آباد کی طرف روانہ ہوا۔ پہاڑی کے پاس پہونچتے شام کے چار بج گئے۔ بہادر خاں نے مچان باندھ رکھی تھی۔ بچھڑے کا بہت کم حصہ باقی رہ گیا تھا اُس کو بہادر خاں نے چھپا دیا تھا اور اُس کی جگہ نیا بچھڑا باندھ دیا تھا۔ پانچ بجتے بجتے ہم لوگ مچان پر بیٹھ گئے۔ ۶ بجے کے قریب پہاڑی پر سے چھوٹے چھوٹے کنکریوں کے گرنے کی آواز آنے لگی اور دس پندرہ منٹ کے بعد ہی شیر کے غرانے کی آواز آئی۔ اس وقت تک شیر جھاڑیوں کی وجہ سے ہماری نظروں سے چھپا ہوا تھا۔ غالباً شیر کو نیا بچھڑا دیکھ کر کچھ تعجب ہوا اور کچھ غصہ آیا۔ غرض اس نے نوجوانوں کی طرح بہت جلد فیصلہ کر لیا اور بجلی کی طرح لپک کر حملہ کیا اور بچھڑے کی گردن پکڑ کر اُس کو زمین پر دبا کر بیٹھ گیا۔ شیر کے جانور مارنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں طوالت کی وجہ سے اس وقت مناسب نہیں سمجھتا اور نہ اس وقت خون پینے اور نہ پیٹ کے جگر کو اٹھایا جا سکتا ہے ... میں نے بھی گھڑی دیکھ کر جانور کے گرنے اور مرنے کے وقفہ کو نہیں ناپا مگر قیاساً دو منٹ سے زیادہ وقفہ نہیں لگا۔ گو اس وقت گولی چلانے کا بہت اچھا موقعہ تھا مگر چونکہ مجھے یقین تھا کہ شیر بھاگ نہیں جا سکتا، اسی لئے سوچا کہ لاؤ گھنٹہ آدھ گھنٹہ اس کے کھانے کا تماشہ دیکھا جائے۔ مغرب میں ابھی کافی وقت تھا اور شیر بچھڑے کو گھسیٹ کر لیجانا بھی نہ چاہتا تھا۔

[illegible] بہت ہی نوجوان شیر [illegible] ہوگا جسامت بھی [illegible] دیکھتا رہا جب یہ [illegible] منٹوں میں نشانہ لینا مشکل ہوجاتا [illegible] نشانہ کرتا [illegible] جیسے بیٹھا [illegible] بیچارہ گیا ہوا [illegible] جسم میں [illegible] ہوا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے دم لی۔

دوسرے دن علی الصبح میرے آدمی آ پہونچے۔ یہاں [illegible] باندھا اور ہم شیر کو اٹھا کر بلرام پور رہن پور جاتے ہوئے واپس پہونچے کہن پور کا بچھڑا زندہ تھا۔ انسپکٹر [illegible] پہونچ کر ناشتہ کیا اور دوسرے دونوں بچھڑوں کو دیکھنے گئے۔ وہ بھی زندہ تھے۔ شیرنی کے کوئی تازہ نشان نہ تھے۔

اس کے بعد تقریباً ہفتہ بھر یہی معمول رہا کہ صبح ہوئی اور بچھڑوں کو دیکھنے چل دیئے ان کو پانی اور گھاس دیا اور واپس چلے آئے۔ شیرنی کا سرے سے کوئی پتہ ہی نہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ گرد و نواح چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ سچ پوچھئے تو ہونا بھی یونہی چاہیئے تھا۔ آدمخور شیر کے شکار میں حتی الامکان کوشش اس بات کی کیجاتی ہے کہ کسی طرح سے اسکو خبردار ہونے کا موقع نہ دیا جائے مگر اس شکار میں تو اس وقت تک باقاعدہ چاند ماری ہوئی تھی اور ایک دفعہ خود مسٹر فائر بھی ہوچکا تھا۔ میں اپنی صفائی کے سلسلے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ سارے فائر ضرور تا کئے گئے تھے۔

مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً دس دن ہوگئے تھے اور چونکہ کہیں سے بھی کسی آدمی یا جانور مارنے کی اطلاع نہ آئی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ بہت جلد شیرنی کو ضرور کوئی نہ کوئی حرکت ایسی کرنی پڑیگی جس سے ہم کو اس کا پتہ چل سکے۔ چنانچہ دوسرے دن ہی دوپہر کو پتہ چلا کہ نندہال (کریم آباد سے [illegible] دوسری طرف گاؤں ہے) شیر کے بولنے کی رات بھر آواز آتی رہی گو یہ ضروری نہ تھا کہ وہ شیر ہماری آدمخور شیرنی ہی ہو مگر پھر بھی تحقیقات ضروری تھی۔ بہادر خاں کو ہدایات دیں کہ نندہال کیمپ کا سامان لے کر پہونچے اور خود اسی وقت چل پڑا۔ مجھے پہونچتے پہونچتے رات ہوگئی۔ سامان آدھی رات کو پہونچا۔ یہاں ہم لوگ جنگلات کے بنگلے میں ٹھہرے گاؤں والوں سے آتے ہی پتہ چلا کہ تقریباً دوپہر کے قریب شیر ایک آدمی کو پکڑ کر لے گیا ہے۔ قصہ یوں بتایا گیا کہ گاؤں کے بالکل قریب ہی یہ بدقسمت شخص اپنی بکریاں کے لئے درخت سے پتے کاٹ کر اتر رہا تھا اور جب وہ آخری ڈالی کو پکڑ کر لٹک کر اترنے لگا تو شیرنی نے نیچے سے اٹھ کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ اور کھینچ کر نیچے گرالیا۔ اور پھر اس کو چھوڑ دیا۔ جب وہ اٹھ کر بھاگنے لگا تو دوڑ کر کمر سے پکڑ لیا اور اس کو کھینچتا چلاتا جنگل میں لے گئی۔ اس واقعہ کو دو آدمیوں نے دیکھا تھا خوب شور اور غل بھی مچایا مگر شیر نے کوئی پروا نہیں کی، تقریباً دو تین گھنٹے آدمی جمع کرتے لگ گئے اور اس کے بعد پھر ۸ بندوقیں اور لاٹھیاں وغیرہ لیکر لوگ جنگل میں داخل ہوئے۔ کوئی دو سو گز ہی اندر گئے ہونگے کہ شیر نے دھمکی دی۔ انہوں نے سلامتی اسی میں سمجھی کہ واپس ہوجائیں اور مجھے اطلاع کروا دیں۔

بدقسمتی سے پھر ایک رات بیچ میں آگئی تھی اور آج دوسری گذر رہی تھی۔ اندھیری رات میں کچھ بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ مجبوراً صبح کا انتظار کیا۔ اس درخت کا معائنہ کیا۔ یہ درخت گاؤں سے مشکل سے ڈیڑھ سو گز پر تھا۔ اس شاخ پر اس بدنصیب کے ہاتھ کی کھال کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے موجود تھے جس سے ظاہر تھا کہ غریب نے اپنی حتی الامکان کوشش کی کہ درخت سے لپٹا رہے جنگل میں داخل ہوتے ہی شیرنی نے غالباً آدمی کو مارا تھا اور کوئی ۲۰۰ گز اندر جانے کے بعد اس کو کھانا شروع کر دیا تھا۔ باقی جو کچھ تھا وہ چند ہڈیاں تھیں۔ نقش پا کا تھوڑی دور پیچھا کیا وہ بھی ترک کرنا پڑا۔ یہ پہاڑی علاقہ میں غائب ہوگئے۔ مجبوراً واپس آگیا۔ تین چار دن اچھی اچھی جگہ بچھڑے بندھوائے۔ ایک مچان پر خود دوسری پہ بہادر خاں کو بٹھایا راتیں عموماً خاموش گذریں۔ دن میں ان سب خاص خاص جگہوں کو دیکھتا رہا جہاں شیر رہ سکتا ہے مگر کوئی چیز نظر نہ آئی۔ چار پانچ دن یونہی گذر گئے ایک دن صبح کے قریب نندی گاؤں سے یہ خبر آئی کہ شیرنی نے رات کے وقت ایک

جھاڑیوں میں چھپنے کی کوشش کی تھی۔ پہلے تو شور و غل کرنے پر بھی وہاں سے نہ ٹلی مگر جب پٹواری نے اپنی بھرمار بندوق سے فائر کیا تو وہ وہاں سے غراتے ہوئے چلدی۔ سنڈی گاؤں تھل سے کافی دُور ہے۔ یہ خبر بھی ایکدن پرانی تھی۔ میں اندازاً دس بجے کے قریب جا کر سنڈی گاؤں پہونچا۔ بہادر خاں اس دفعہ ساتھ تھا۔ راستے میں ہم دونوں اسی بات پر غور کرتے آئے تھے کہ یہاں پہونچ کر کیا کیا جائے گا۔ بہادر خاں کا میری طرح یہی خیال تھا کہ شیرنی غالباً بندوق کی آواز سے ڈر کر سنڈی گاؤں چھوڑ گئی ہوگی اور غالباً آج وہ بلرام پور کے علاقہ میں ہوگی۔ میں نے سنڈی گاؤں میں ٹھیرنا مناسب نہ جانا اور بلرام پور کی طرف چلدیا۔ راستے میں کہن پور کے بند پر شیرنی کے نقش پا بلرام پور کی طرف جاتے نظر آئے۔ اور یہ بالکل تازہ تھے۔ یعنی اسی دن صبح کے معلوم ہوتے تھے۔ بلرام پور پہونچتے پہونچتے ایک تجویز سوجھی۔ وقت دیر تنگ تھا مگر قسمت آزمائی ضروری تھی۔ بلرام پور پہونچے تو شام کے چار ساڑھے چار بج گئے تھے۔ بہادر خاں کے کہنے پر اتر کر گاؤں والوں سے بکرے منگوائے اور اس کو کلہاڑی دے کر تالاب کے دامن کی طرف چل دیئے۔

یہاں بہادر خاں کو ایک پیپل کے درخت پر چڑھا دیا۔ نیچے دو ایک بکریاں چھوڑ دیں اور پاس ہی ایک درخت پر میں جا بیٹھا۔ بہادر خاں کو ہدایت کر دی کہ وہ خوب زور زور سے درخت کی شاخیں اور پتے کاٹتا جائے۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد وہ ایسا ظاہر کرے جیسے کہ درخت سے وہ اتر رہا ہو مگر کسی صورت میں وہ پندرہ فٹ کی اونچائی سے نیچے نہ آئے۔ خیر یہ مداق ساڑھے چھ بجے تک ہوتا رہا۔ مجھے امید جاتی رہی تھی۔ میرا تقریباً آدھ گھنٹہ اور بیٹھنے کا ارادہ تھا۔ اسکے بعد اندھیرے میں بالکل فضول تھا۔

نہ معلوم کیوں مگر یکلخت مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ شیرنی آگئی ہے۔ بکریاں کوئی ۱۵ یا ۲۰ منٹ ہوئے گاؤں کی طرف بھاگ گئی تھیں۔ یہ حرکت انہوں نے عادتاً کی تھی یعنی غروب سے قبل سب گاؤں کے جانور گاؤں کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ میں نے کوئی غیر معمولی حرکت نہ دیکھی تھی جس سے میرے شبہ کو تقویت پہونچتی۔ بہادر خاں اپنی زبان میں گاتے جا رہا تھا۔ میں بہت غور سے ہر جھاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ تقریباً دس پندرہ منٹ کے بعد ایک جھاڑی میں جو بہادر خاں کے درخت سے تقریباً ۴۰ گز اور میرے سے ۶۰ گز دور تھی کچھ حرکت ہوئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ شیرنی اس جھاڑی کی آڑ میں ہے۔ میں مجسم انتظار بنا بیٹھا تھا اور یکلخت یہ دعا مانگ رہا تھا کہ یہ مجھے دس سیکنڈ کے لئے نظر آجائے۔ بہادر خاں نے اس وقت اپنا نیچے کی طرف اترنے کا عمل دوہرانا شروع کیا اور شیرنی نے غالباً یہ سمجھ کر کہ وہ اترنے والا ہے دوسری جھاڑی کا جو بہادر خاں سے اور نزدیک تھی رخ کیا۔ بہادر خاں اترتے ہوئے ایک ۱۰ سیکنڈ کے لئے رکا ہوگا۔ شیرنی بھی اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔ وہ بہادر خاں کے درخت کی طرف سے ایک جھاڑی کی آڑ میں تھی مگر مجھے صاف نظر آرہی تھی۔ ۶۰ گز پر گولی مارنا مشکل کام نہیں مگر بخدا انتشار اور تذبذب کے مارے ہاتھ بے قابو تھے۔ سوچ رہا تھا کہ اگر گولی خالی گئی تو؟

بسم اللہ کہکر میں نے بندوق اٹھائی اور 375 ۔ سے فائر کیا۔ گاؤں میں اودھم مچ گیا۔ جس طریقے اور جیسے شور کیا جا سکتا تھا۔ گاؤں والے شور مچا رہے تھے۔ بیسیوں آدمی آس پاس کے گاؤں اس خبر کے ساتھ روانہ کئے گئے کہ آئیں اور مردہ شیرنی کو دیکھیں۔

جیسے میں پہلے بیان کر چکا ہوں شیرنی کے اگلے پیر میں کبھی گاؤں والے نے اپنی بھرمار سے گولی ماری تھی۔ گولی ہڈی کے پاس جا کر رک گئی تھی اور کچھ دنوں بعد زخم اچھا ہو گیا تھا مگر ذرا سا پیر ٹیڑھا ہو گیا تھا پھر سیدھے پنجے کے تین ناخون غائب تھے اور اوپر کے جبڑے کے لمبے دانتوں میں سے ایک ٹوٹ گیا تھا اور دوسرا جڑ تک گھِس کر آدھا رہ گیا تھا۔ عمر تقریباً ۱۵ سال ہوگی۔ غالباً ان وجوہات کی بنا پر وہ آدم خور ہو گئی تھی۔ شیرنی کی لمبائی ساڑھے آٹھ فٹ تھی۔

غزل

[illegible] گورکھپوری

ایک تری [illegible] جس سے جلوۂ خُلد نظر آئے
ایک تری یاد ایسی ہے جس سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے

آج اس [illegible] میں آیا عشق خانہ خراب
جیسے دیس بدیس کا کوئی بھولا بھٹکا گھر آئے

وصل کی رات کے کشف کرامات آئینے میں صبح کو دیکھ
جیسے سہاگ دمک اُٹھے کنوارا پن اور نکھر آئے

اب بھی وہی دو شیزگی و معصومیٔ حُسن قاتل ہے
مقتلِ ناز میں جاکر کتنے مرنے والے مر آئے

غم خانوں میں اہلِ عشق کے تجھ سا کوئی یوں ہر روز
ہونٹوں پر ایک موجِ تبسم اور چشم تر آئے

یوں بھی کہیں دُنیا بدلی ہے یوں کہیں پلٹی ہیں تقدیریں
سُنتے تھے مرنا کام بڑا ہے لوگ یہ کام بھی کر آئے

چہرے روشن تھے محفل میں پھر بھی اُداسی چھائی تھی
ایک ہمیں وہ شمعِ وفا تھے بزم میں جو بجھ کر آئے

دھواں دھواں تھی شامِ محبت حُسن بھی تھا کچھ اُداس اُداس
یوں تھے چشم پُر آب ستارے عشق کی جیسے خبر آئے

لاکھوں دوزخ لاکھوں جنت لاکھوں سورج لاکھوں چاند
خاک کے ایک ایک ذرّے میں کیا کیا سنسار نظر آئے

خود کو سونپ دیا دُنیا نے اہلِ محبت کو یوں تو
اہلِ ہوس بھی اس دُنیا میں دنیا دنیا کر آئے

کھول دئے جس دم بال اُس نے خلوتِ راز ہوئی دُنیا
مثلِ فضائے نیم شبی وہ گیسو تا بہ کمر آئے

شرم و حیا کم ہوتے ہوتے حُسن پہ وہ جوبن آیا
جیسے گھٹا کے چھٹتے چھٹتے چاندنی رات نکھر آئے

خونِ تمنا کی موجیں ہیں جلوہ وہ گلزارِ جہاں
اور ذرا چھیڑیں جو ہوائیں بوئے مے کوثر آئے

سوئے اتفاق اس کو کہیں یا معجزۂ جذبِ نہاں
آنے والے یوں تو ادھر تم خیر کہاں تھے مگر آئے

خون میں ڈوبی ہوئی آواز سے ہم نے نکھارا حسنِ حیات
دُھندلے نقش و نگارِ جہاں میں رنگ محبت بھر آئے

موت کی وادی ڈھونڈھ رہے تھے آنکلے لبِ آبِ حیات
عشق کی گمراہی مت پوچھو ہم بھی فراقؔ کدھر آئے

مفتون احمد

"لامتناہی ـــــ..."

دھرتی کے سربلند پہاڑی مندروں کی چوٹی پر کھڑا میں اسرار بھری دھند کا نظارہ کرتے ہوئے جب میں نے گھوم کر دیکھا، تو میرا دم رُکنے لگا، اور ایک آہ کی مبہوت سانس کے درمیان وہ خوبصورت شہر میرے سامنے آگیا جو ڈوبتے ہوئے سورج کے جھٹپٹے میں حدِ نظر تک بیٹھا پڑا تھا۔ اس کے باغ، اس کی عمارتیں، اس کی سڑکیں ـــــ

اس کی اُجلی، سُتھری، ہری بھری سڑکوں کو دیکھ کر مجھے اپنی مری ہوئی بیوی کا خیال آگیا، اُس کے خوفناک ہاتھ اور اُن پر اُبھری ہوئی رگیں ـــ اُس وقت جبکہ میں اس سے آخری بار جدا ہو رہا تھا، اُس نے وہ ہاتھ میرے ہاتھوں میں دیدئے اور کھوئی نظروں سے خلا میں گھورتی رہی، اور یکایک چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ "میں نہیں، نہیں چھوڑوں گی، کبھی نہیں، کبھی نہیں، نہیں، نہیں، نہیں!!"

میں نے اُسے دھیرے سے الگ کیا اور سوچنے لگا کاش ایسے تپ دق تو نہ ہوتا، اس اٹھارہ برس کی جذباتی لڑکی کو۔

اس کے بعد پردیس میں مجھے اُس کا آخری خط ملا تھا "میں مر رہی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ پر لگا کر تمہارے پاس پہونچ جاؤں" بیوقوف لڑکی، بھلا کہیں کوئی بیکس بیوی بھی چڑیا بن سکی ہے؟

یہی سوچ کر میں اُداس ہوگیا اور دور دور اُفق کی ارغوانی لکیر پر زمین آسمان ایک دوسرے میں کھو سے گئے اور لال پیلے بادلوں کے غبارے ہوا پر سرکتے رہے، رواں دواں۔ بگلوں کی ایک قطار مغرب کی پہاڑیوں کی سمت بڑھنے لگی جہاں جنگل تھا اور سبزیوں کے قطعے تھے اور ہر تپّی اور پہاڑی کے بعد پہاڑی اُبھرتی چلی گئی تھی اور یہ شہر صدیوں کی گود میں اسی طرح بیٹھا ہوا تھا، ایک جزیرے کی طرح، ایک نومولود بچے کی معصوم حیرانی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ یہ اُفق نیا نہ تھا، بادل نئے نہ تھے، بگلوں کی قطار اور جنگل کے بیل بوٹے نئے نہ تھے، پھر میں کیوں اُداس تھا، انسان کی روح کیوں اُداس تھی، کیوں، کیوں، میرے خدا۔

وہیں ایک کوئل چیخ اُٹھی، مدھم، پیہم، شام کے قرمزی دُھندلکوں میں چیختی رہی اور کسی پیڑ کی گھنیری شاخوں میں بسنت کی مہک کو پیتی گئی، پیتی رہی۔ پھر جب نیچے اُتر کر میں شہر کی سڑکوں پر چلنے لگا تو اُس کا نغمہ میری روح کا بوجھ بن گیا۔ میں نے قسم قسم کے نغمے سُنے تھے، دیس دیس کے گیت، پر وہ نغمہ جو اس شہر کا نغمہ نہیں تھا، سنگِ خارا کی سیاہ چکنی سڑکوں کا نغمہ نہیں تھا، وہ نغمہ وہاں کیسے آگیا تھا۔ بسنت کی ہرا جھومتی سانس کے ساتھ وہ وہاں کیسے آ نکلا تھا، اور میں نے اور تم نے اور ان سڑکوں نے کیوں نہیں سمجھا کہ وہ نغمہ پاک ہے، ازلی ہے، سماوی ہے، اور اس کی طہارت، تازگی اور ترغیب کے سائے میں انسان کو ابھی اور جینا ہے، اور تریاقِ محبت پینا ہے۔ جب تک وہ نغمہ، وہ تریاقِ محبت باقی ہے انسان نہیں مر سکتا، انسان نہیں مرے گا، ابھی نہیں، ابھی نہیں!

"پونا کلب" کے بال روم میں آرکسٹرا کی دُھن بلند ہونے لگی۔ ناچتے ہوئے جسموں کی گردشیں سمندر کی لہروں کی طرح بیدار ہو گئیں اور آرکسٹرا کی پہلی دُھن کو سُن کر لب سڑک بیٹھے ہوئے گداگروں کی ٹولی کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ وہ سب کوڑھی تھے اور گداگر تھے اور اپنی کوڑھی عورتوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور جب کوئی آوارہ، کھلنڈرا سا شامی کلب کے دروازے پر اچانک اپنی سیٹیاں بند کر دیتا اور اپنے لبوں کی پیاس اور اکیلے بازوؤں کی اُداسی دیکھ کر لوٹ جاتا تو وہ گداگر من ہی من میں اس سے بہت ہمدردی جتاتے اور اُن کی آنکھیں جھپک کر کہتیں، جاؤ، چلے جاؤ، دیکھو کیا ہو اس بال روم میں، اس چراغاں میں، بیاباں میں، جہاں ناچتے ہوئے سوز سے جوانی کی کلیاں چٹختی ہیں اور پیر کا قافلہ کبھی نہ کبھی اپنا پھول گم کر دیتی ہے، کوئی شعلہ، کوئی جسم، کوئی صبح ضرور تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ یہاں ہی

[illegible] زندگی کا یکتا سیدھا اصول ہے جسے ہم نے [illegible] تم نے کیوں نہ سمجھا، اور اگر تم بھی ہماری طرح کوڑھی [illegible] تب اور بات تھی، تب یہ سڑک تمہاری تھی۔ پر تم تو ایک [illegible] سپاہی ہو اور آج تمہاری جیت کا دن ہے اور سارے [illegible] کا میٹھا سویرا مسکرا رہا ہے، اور آسمان کے مشرقی [illegible] وہ آگ روشن ہو رہی ہے جسے اُشا کے رُخساروں نے چھپا رکھا ہے۔ اُشا، اُشا کو تم نہیں جانتے؟ صبح کی دیوی، صبح کی دیوی۔ . .

ایک امریکن پائلٹ نے اپنی ہندوستانی محبوبہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "ہائے ڈارلنگ، تم نے یہ کیا پہن رکھا ہے۔ میرے دیس کی لڑکیاں ہلکے رنگوں کے لباس پسند کرتی ہیں، پھولوں کی گلابی یا آسمان کی نیلاہٹ اور اگر تم میرے دیس چلتیں تو میں تمہیں ایسا لباس ضرور پہناتا اور میری ماں تمہیں کافی پلاتی اور ہم تم —— اور۔ ."

ہندوستانی لڑکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ "ہائے تم چلے جاؤ گے اور میں تمہاری یاد میں چپکے چپکے آنسو بہاؤنگی۔"

ایمپائر ٹاکیز کے سامنے مجھے عبدل رکشا والا مل گیا۔ دُبلا پتلا، پیشانی پر ایک زخم کا نشان، اس نے مجھے سلام کیا۔ عبدل کبھی میرے دفتر کا چپراسی تھا، پھر ایک دن وہ فائلیں اٹھاتے اٹھاتے دفتر کی سیڑھیوں سے گر پڑا اور غائب ہو گیا۔ پچھلے سیزن میں جب مجھے ریس کھیلنے کا شوق پیدا ہوا تھا تو میں نے اسے اکثر گھوڑوں کو ٹہلاتے یا نہلاتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور اب اُس کے پاس ایک سائکل رکشا تھی اور وہ مجھے جھک کر سلام کر رہا تھا۔ میں نے اُسکی رکشا کو بے تعلقی کے انداز سے دیکھا، عبدل نے کہا: "صاب، نسیم۔"

"نسیم؟"

"میرا مطلب ہے صاب، کہ اس سینما میں ہندوستانی فلم نہیں چلتی اور نسیم میری رکشا کا نام ہے۔" اُفوہ، میں نے دوسری رکشاؤں کے نام پڑھے، خورشید، وینا، دلکالا، نرگس، نسیم، فہیم، عبدل مسکرایا، میں بھی مسکرایا، میں نے سوچا، یہ اچھا ہے بہت اچھا ہے کہ تم نے نسیم کے ساتھ اپنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ کیا ہوا جو تم ایک رکشا والے ہو اور تمہارے بدن پر [illegible] اور نیکر کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیا ہوا جو تم نے آج تک کسی اسٹوڈیو کی صورت نہیں دیکھی، خوشی کی بات تو یہ ہے کہ تمہیں اپنی رکشا، اپنی نسیم سے محبت ہے۔ نسیم کو اپنے ہیرو سے محبت ہے، کوئل کو اپنے نغمے سے محبت ہے، تمہیں اپنی رکشا سے محبت ہے، خوب، بہت خوب، زندگی ہے پیارے .....

میں رکشا میں بیٹھ گیا۔

میں چپ ہوں۔ عبدل چپ ہے، رینگتی ہوئی سڑک چپ ہے۔ بجلی کے تاروں سے دو چمگادڑیں چمٹی ہوئی ہیں، خاموش، بے جان، بدصورت، گل مہر کے درختوں پر چاند کا آویزہ لٹکا ہوا ہے ——— اور مصنوعی، کیونکہ اندھیرا ابھی گہرا نہیں ہوا ——— کہیں کہیں دکانوں پر فتح کی جھنڈیاں لہرا رہی ہیں، ایک درزی اپنے گاہک سے کہہ رہا ہے "تم نے سُنا، صلح کے بعد ہی سونے کا بھاؤ گر گیا۔ ابتدائے عشق ہے . . . قہ قہ قہ"

یکایک ایک پٹھان کسی دہی بیچنے والی عورت کو چلا چلا کر گالیاں دینے لگا اور اُس کی مٹکی نالی میں اُلٹ کر اُسے اپنے قریب کھینچنے لگا، بہت سے لوگ جمع ہو گئے، لچے، بھوکے، ننگے، اُس عورت نے کسی سے کچھ نہیں کہا، پٹھان سے بھی نہیں، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گئی اُس غلیظ نالی کے قریب، گل مہر کے پیڑ تلے وہ روئے جا رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ کیوں رو رہی ہے ایک بے نام جذباتی رَو میں اُسے اپنے خاوند کو یاد کیا جو اُسے اُس کے باپ کے گاؤں سے یہاں لایا تھا اور پٹھان کے روپے نہیں چکا سکتا تھا، حالانکہ اُس کے پاس تین بھینسیں تھیں اور ، اُسے اپنے خاوند پر بھی غصہ نہیں آیا اور گل مہر کے شگوفے چپکے چپکے بکھرتے رہے لمبے لمبے، سُرخ اور وہ پاگلوں کی طرح روتی رہی حتیٰ کہ ان شگوفوں نے اُسے ڈھک لیا اور چتا کے شعلوں کی طرح اُس کے انگ انگ پر کانپنے لگے، کیونکہ اس کی عصمت چھن چکی تھی اور اُس کا سہاگ اور اُس کی ہنسی۔ یکایک وہ روتے روتے چپ ہو گئی اور ہجوم منتشر ہو گیا اور سُرخ شگوفے اُس کے جسم پر سو گئے . .....

اُس رات کو میں نے ایک خواب دیکھا، ایک میٹھا، مختصر، سہاؤنا خواب، جس میں میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کی ہر چیز مجھ سے مانوس تھی، جہاں سرسوں کی زرد کونپلیں اور ادھر

سے گئے تھے، اور مہوے کے درختوں کی عجیب سی بُو ہوا میں گھلی ہوئی تھی اور ایک ندی کے نشیب میں کلبلاتے ہوئے مچھلیاں اور گھونگھے حرکت کر رہے تھے۔ اس جگہ مجھے کسی چیز کے کھو جانے کا غم نہیں تھا اور وہ سب چیزیں مجھے واپس مل گئی تھیں جو کبھی میری تھیں۔ یہ وہی جگہ تھی جس نے سالہا سال سے مجھے مانوس کیا تھا، جس کے خمیر سے میرا گوشت پوست اُٹھایا گیا تھا، اور جسے میرے تصور نے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا تھا۔ یہاں پہونچ کر میرے اندر کوئی منفی جذبہ باقی نہیں رہا، اور جو کچھ تھا وہ مثبت تھا، معصوم، دلکش۔ میرے پاؤں گھٹنوں گھٹنوں تک خاک میں اَٹے ہوئے تھے، میرے بدن پر ایک قمیص تھی جس کے پہلے سرے سے ایک گٹھری بندھی ہوئی تھی اور سورج کی روشنی تیز تھی، اور وہ لیک جس کے ساتھ ساتھ میں وہاں تک آیا تھا، ندی کے ڈھلوان میں کھو گئی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا، لیک کی لکیروں پر کسی چھکڑے کا نشان نہ تھا اور ندی کے کنارے سر جھکائے ہوئے بگلے اونگھ رہے تھے۔ یکایک کسی درخت کے کھوکھلے تنے سے دو نیلکنٹھیں چیختی ہوئی نکلیں اور فضا میں پر تولنے لگیں۔ میں نے اپنی گٹھری کھولی اور ستو اور گڑ نکال کر کھانے لگا، اور جب کھا چکا تو ندی کی نرم گرم ریت پر نیلکنٹھوں کی چیخوں میں اپنے گیت گھول دئے۔

امریکن پائلٹ کی ہندوستانی محبوبہ شہتوت کے درختوں پر ریشم کے تار بُننے لگی، ہلکے رنگوں کے تار۔ دہی بیچنے والی عورت ایک سُرخ شگوفہ بنکر بکھر گئی اور میری بیوی نے آنکھیں کھول کر چہکنا شروع کر دیا۔ چڑیا تھی نا وہ!

لیکن یہ سب کچھ خواب میں ہوا، اور جب میں جاگا تو میں نے سوچا کہ زندگی نہ ماحول ہے نہ حقیقت، اور ایسا کیوں ہے کہ میں ان غلیظ سڑکوں اور نالیوں اور تاریک گھروں کے آس پاس بھی خوابوں کے جال بنتا ہوں؟ اور تب کسی اَن دیکھی طاقت نے مجھ سے کہا، وہ طاقت جو خود میرے اندر تھی اور جس نے مجھے باغی بنا دیا تھا، اس طاقت نے مجھے آواز دی، اس لہلہاتے کے سینے سے وہ طاقت ایک انکھوے کی طرح پھوٹ نکلی...... پھوٹتی رہی......

کلیاں

اپنے بستر سے اُٹھا پھول کے انگاروں کو
کانپتے ہاتھوں سے میرے لئے گجرے نہ پرو
دیدۂ یاس میں رہنے دے ابھی غم باقی
نشۂ مے سے تھرکتی ہوئی برساتوں میں
اپنی گلرنگ جوانی کی صباحت نہ لُٹا
اتنی مستی کہ مجھے حُسن سے نفرت ہو جائے
تجھ سے بھی پیار، ترے غم سے بھی ہے پیار مجھے

تیری آغوش میں اشعار یہ گلدستوں کے
بارِ شفاف سُلگتی ہوئی آہوں کے امیں
ایسی نازک سی حسیں کلیاں ترے پاس بھی ہیں
شہد سے ہونٹ نگاہیں بھی گلاب آلودہ
بھیگے رخساروں پہ حسرت کی گہر خیز جلن
دستِ انساں کی رسائی سے کہیں دُور دراز
خون کے چھینٹے میں وہ صحنِ شفق کے نزدیک
سسکیاں بھرتی ہوئی دور سے تہذیبِ فرنگ
اپنے خونخوار ارادوں سے کٹی جاتی ہے
تیغِ برّاں کی کھنک، تیر و سناں کی جھنکار
وقت کا ساتھ صدا دیتا ہے سنگینوں سے
تو مجھے حُسن کی تخریب پہ مجبور نہ کر
ایسی خونخوار سی کلیاں تو ترے پاس بھی ہیں
زلفِ برہم کی جھپٹ، عشوۂ سوزاں کی لپک
توڑ لونگا میں انہیں تیرے شبستاں سے کبھی
تیرے گلدستوں سے میں گود سجا ہی لوں گا

منیر کمال

"ہلال"

از شاعرِ انقلاب قاضی نذر الاسلام ۔ مترجمہ محمد یونس احمر

بلال! بلال!!

دیکھو دامنِ مغرب پہ ہلال چمک رہا ہے اور تم
کس ریگستانی قبر میں روپوش ہو ۔۔۔؟ بتاؤ تو سہی!
تمہیں سوگند ہے ربّ لایزال کی فضا دیکھو کس طرح
کسانوں کے سُست قدم عیدگاہ کی طرف بڑھے جا رہے ہیں جیسے
معصوم گائے کی قطاریں قصاب کے مقتل میں چلی جا رہی ہیں؟
ان فاقہ زدہ کسانوں نے ایک ماہ تک اپنے آنسوؤں سے روزہ
افطار کیا ہے ۔۔۔ اُف کتنا دردناک ہے یہ منظر!
بلال! اگر تم ان کے گرد آلود چہرے کو دیکھ لو تو تمہاری
اذان تمہارے گلے میں گھُٹ جائیگی ۔۔۔ آج یہ مصیبت کے
مارے گھر کا سامان بیچ کر عیدگاہ کس خوشی سے جا رہے ہیں۔
انھیں خبر نہیں کہ اُن کے سینے چھلنی چھلنی ہیں، ان کے
سروں پر قرض کا انبار ہے، وہ تو اللہ کی راہ میں بڑھے
جا رہے ہیں!

جنھیں زندگی میں ایک دن بھی بھوک اور روزہ سے
نجات نہیں ملی کیا آج انہیں کی شکستہ کٹیا میں عید کی ترنگیں
پھوٹی ہیں؟ کیا آج وہی بھوکا اور نڈھال بچہ چاند بن کر
دُنیا کو پیغامِ مسرت سُنا رہا ہے جس نے ایک قطرہ دودھ
کے لئے تڑپ تڑپ کر جان دی تھی؟ سیاہ بادل میں یہ
باریک چاند تو ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی مردہ بچہ کفن
میں لپٹا پڑا ہوا اور یہ کسان عیدگاہ میں اسی کے جنازہ کی
نماز پڑھنے جا رہے ہیں ۔۔۔ اُداس اور ملول! ہر زبان سے
تکبیر کی آوازیں نکل رہی ہیں اور لاکھوں دلوں کو چھید جاتی
ہیں یہ مردہ بچہ، یہ گھٹی گھٹی چیخ پکار اور کہ مخلوق کی مسجد کے
اللہ اکبر ۔۔۔ کی یہ گونجیں ۔۔۔!

بتاؤ وہ امام کہاں ہے؟
کہاں ہے وہ امام ۔۔۔؟ کون سا خطبہ پڑھنے کی آج اُس نے
تیاری کی ہے؟
دیکھو ہمدم! چاروں طرف مُردہ اور بیجان لاشیں بکھری
پڑی ہیں اور ان مردہ ہڈیوں کے بیچوں بیچ ایک کمخواب و اطلس
میں ملبوس انسان بڑی شان و تمکنت سے آنکھیں بند کئے
کھڑا ہے ۔۔۔ کون؟ کیا اس عیدگاہ کے تم ہی امام ہو؟ کیا تم ہی
ان کے قائدِ اعظم ہو؟ بتاؤ ۔۔۔ بتاؤ تو سہی کیا کبھی ۔۔۔ تم نے
ان کی سوکھی زبانوں میں قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ امرت
کی بوندیں ٹپکائی ہیں ۔۔۔؟
ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ!
مجھے معلوم ہے تم نماز پڑھتے ہو، تلاوتِ قرآن کرتے
ہو، روزہ رکھتے ہو ۔۔۔ لیکن اے مغرورانسانو! کیا تم نے انکے
کمزور دلوں کو اپنے میٹھے بول سے تقویت بھی پہونچائی ہے۔
تم نے پھل کاٹا لیکن رس نہیں ملا ۔۔۔ کتنے
بدنصیب ہو تم!
لاکھوں سال آبشار میں غرق رہے پھر بھی جسم تر نہ
ہوا ۔۔۔ ستم پرور، جفا شعار!!

ایمان! ایمان!!
تم انھیں شب و روز حفظ کرتے ہو، کیا یہ الفاظ اتنے
آسان ہیں؟ انہیں رٹ کر بھی تم نے راہِ مستقیم حاصل نہیں
کی، پھر تمہیں ایماندار کیسے کہوں؟
اے راہِ باطل پر گامزن انسانو گوشِ ہوش سے
سُنو! ۔۔۔ جس کا ایمان مستحکم ہے وہی اس آسمان کے
نیچے امرت برسا سکتا ہے!
تم نے صرف زبان پر اللہ کا نام لانا سیکھا ہے ۔۔۔

لیکن یہ نہیں سکھا وہ کون ہے؟

پا تو یہ ہے جس نے خود اپنی بصارت کھو دی ہے وہ دوسروں کو روشنی کیسے دکھا سکتا ہے — جو خود غلامی کی جکڑ صدیوں میں اسیر ہے وہ اوروں کو درس حریت دے تو کیسے؟

ہمدم! بتاؤ وہ امام کہاں ہے جس کے شیریں لبوں میں آب زمزم کی مٹھاس موجیں مار رہی ہے —؟

سب ہے ایسے امام پر جس کا ایمان کمزور ہے — جو آج لاکھوں انسانوں کو اپنے فریب میں لائیگا جس کا خطبہ آج یہ بھولے بھالے مسلمان سنیں گے

مجھے ایسے امام کی ضرورت نہیں — ضرورت ہے اس امام اعظم کی جس کے میٹھے بولوں سے آج سارے گنہگاروں کی جھونپڑیوں میں جو تاریکیاں ناچنے لگیں جو آسمان کی مرمریں گود سے چاند کی سنہری ہنسی چرا لائے — ایسی ہنسی جس کی لمس زندگی میں برابر تازہ رہے، ہمیشہ باقی رہے!

میں نے کتنی بے چینی سے آٹھوں پہر ان کا انتظار کیا ہے کہ وہ کبھی نہیں آتے آئیں گے —؟

تم لوٹ ہمدم! میری عید اسی روز ہوگی جب ہم سب ایک ساتھ روزہ انتظار کریں گے!

نقد و تبصرہ

جامِ شکستہ: اُردو کے سب سے مشہور افسانہ نگار جناب ایم اسلم کے دس نئے افسانوں کا مجموعہ ہے جو ستمبر میں شائع ہوا ہے پہلا افسانہ "آزادی کے اُس پار" اِس سال کے بہترین افسانوں میں شمار ہوگا۔ بارکا علاقہ قدیم وحشی قبائل کی آماجگاہ ہے یہ افسانہ اس دلفریب سرزمین کا ایک دلپذیر رومان ہے جو محبوب و محبوب کے دلگداز گیتوں سے مُرتّب کیا گیا ہے اِن گیتوں میں نادر استعاروں اور اچھوتی تشبیہوں کا ایک بیش بہا خزانہ ہے یہ افسانہ ایک بچھڑی ہوئی غزل ہے جو کلیجہ سُننے والے کو تڑپا دیتا ہے۔ آخری افسانہ "عام سلسلہ" ایک طویل مختصر افسانہ ہے جسے "جنگل کی بگڑی ہوئی معاشرت کا آئینہ دار کہنا چاہیے۔ اس میں کئی معاشرتی خرابیوں اور بگڑی ہوئی اخلاقی قدروں کا ذکر کیا گیا ہے اور اپنے مجموعی تاثر کے اعتبار سے یہ افسانہ حد درجہ عبرت آموز ہے باقی آٹھ افسانوں کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ ایم اسلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ آپ انہیں پڑھیں گے تو آپ خوش ہوں گے کہ آپ کے وقت کا بہترین مصرف ہوا۔ کتاب مجلّد اور جلد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت تین روپے!

ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ دار الاشاعت محمد مکرم۔ میو روڈ۔ لاہور۔

پنکھڑیاں: مسز ... کا نام اُردو کے ادب میں نیا نہیں اُن کے افسانے ملک کے اکثر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں "پنکھڑیاں" اُن کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اُن کے افسانوں میں نسائی صلاحیتوں کی شدت ہے۔ خیال و تصور کی موہوم فضا میں وہ اسی دُنیا میں رہتی ہیں اور اسی دُنیا کے ٹھوس حقائق کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں۔ ان کی زبان بھی سادہ اور شگفتہ ہے اور بیان بھی سلیس اور رواں۔ ضخامت ۱۹۲ صفحے، کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ، مجلّد مع گردپوش۔ قیمت دو روپے چار آنے! (ر۔ م)

ملنے کا پتہ:۔ کُتب خانہ علم و ادب اُردو بازار دہلی!

اُجالے سے پہلے: ۲۱۶ صفحے لکھائی چھپائی اوسط درجے کی۔ کاغذ سفید۔ قیمت دو روپے دس آنہ (۲/۱۰) ملنے کا پتہ۔ اُردو محل معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد۔ دکن

مدھوسودن اُردو کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ زیر نظر کتاب اُن کے دس افسانوں کا مجموعہ ہے، جن میں زندگی کے بعض تلخ پہلوؤں کو "ترقی پسند ادب" کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جو دلچسپ بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔

دُنیا ہماری: پردیسی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ دنیا ہماری کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کتاب رامانند ساگر کے نام معنون کی گئی ہے اور مقدمہ راجندر سنگھ بیدی نے لکھا ہے۔ مصنف پر روسی تصورات غالب نظر آتے ہیں۔ افسانوں میں سادگی کے ساتھ انتقادی شان بھی ہے۔ صفحات ۲۲۹۔ لکھائی چھپائی خاص قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲/۸) ملنے کا پتہ۔ راج محل پبلشرز۔ جموں کشمیر۔

پہلو: لطف اللہ صاحب عدیل کے چند افسانے ہیں جنہیں دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) روشن (۲) تاریک۔ تین افسانے روشن پہلو کے تحت ہیں اور تین تاریک پہلو کے تحت۔ افسانوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف میں افسانہ نگاری کی صلاحیت موجود ہے اور اگر ان کی مشق جاری رہی تو ان کا شمار اچھے افسانہ نگاروں کی صف میں ہونے لگے گا۔ زیر نظر افسانے بھی دلچسپ اور مصنف کے ارتقائی تصورات کے آئینہ دار ہیں صفحات ۱۲۲ کتابت وطباعت نہایت نفیس کاغذ عمدہ۔ مجلّد مع گرد پوش۔ قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ۔ محمد امان اللہ خان نمبر ۳ نذر علی بلڈنگ دھرسی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۳!

پریشان جلوے: "حیات ترین" صاحب نے ملک کے افسانہ نگاروں اور شاعروں کے منتخب مضامین نظم و نثر کو جدید ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہر افسانہ یا نظم سے پہلے افسانہ نگار و شاعر کے خود نوشتہ حالات

محترم محمود قیسی صاحب نے بھی بعنوان سے ہر استاد شاعر کی شخصیت پر مختصر نوٹس لکھے ہیں۔ ابتدا میں سر عبداللہ صاحب کا تعارف ہے۔ اس مجموعہ میں اکثریت غیر معروف حضرات کی ہے۔ انتخاب میں سلیقہ کارفرما نظر آتا ہے۔ صفحات ۲۴۹۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت دو روپے بارہ آنے (۱۲/۲)، ملنے کا پتہ:۔ عباسیہ اکادمی۔ بغداد الجدید، ریاست بہاولپور

ضیاء الاسلام صاحب کی چند انتقادی

ادب پارے:۔ تقریریں، جو دلی اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے وقتاً فوقتاً نشر ہو چکی ہیں، ضروری ترمیم و اضافہ کے بعد "ادب پارے" کے نام سے شائع ہوئی ہیں جن میں مختلف شاعروں اور ادبی مباحث پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے انتقادی مضامین سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس مجموعہ میں اچھا خاصہ مواد ہے۔ ضخامت ۱۰۹ صفحے، مجلد مع گرد پوش

ملنے کا پتہ:۔ حلقہ ادب، ۱۲۷۔ اسٹینلے روڈ الہ آباد؛

آنسہ محمودہ رضویہ (ادیب فاضل)

دنیائے شہرزاد:۔ نے عراق کی تاریخ ادبی انداز میں لکھی ہے۔ جس سے غالباً یہ مقصود ہے کہ تاریخ کی خشکی سے پڑھنے والے کو بے کیف نہ ہونے دے۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ عراق کی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ ضخامت ۱۳۷ صفحے، مجلد مع گرد پوش، قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:۔ دفتر انجمن "فلاح خواتین" دہلی۔ ڈی۔ جی۔ چودھری روڈ۔ کراچی نمبر ۲؛

مرتبہ سعد مینر صاحب

عصر جدید سلور جوبلی نمبر۔ ضخامت ۱۶۴ صفحے قیمت ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ دفتر عصر جدید، کلکتہ؛

عصر جدید، کلکتہ کا ایک پرانا اردو روزنامہ ہے جس نے اپنی عمر کے پچیسویں سال میں قدم رکھتے ہوئے سلور جوبلی نمبر نکالا ہے۔ یہ نمبر نہایت محنت سے مرتب کیا گیا ہے اس میں علمی، ادبی، تنقیدی اور سیاسی مضامین بھی ہیں اور نظمیں اور غزلیں بھی، قصے کہانیاں بھی ہیں اور طنزیہ مزاحی مضامین بھی۔ آخر میں "کیا آپ کو معلوم ہے" کے عنوان سے سائنس کی ترقی کو تصاویر کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے اکثر مضامین اچھے اور مشہور ادیبوں کے لکھے ہوئے

جید لکھائی چھپائی بھی نفیس ہے، غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی یہ نمبر کامیاب ہے۔

مرتبہ پرویز شاہدی

جدید اردو بنگال نمبر:۔ ضخامت ۱۲۸ صفحے قیمت ۱۲/

ملنے کا پتہ:۔ دفتر جدید اردو نمبر ۳۶۔ ارسڈن اسٹریٹ کلکتہ؛

جدید اردو کلکتہ کا علمی و ادبی ماہنامہ ہے، جس نے ستمبر ۱۹۴۵ء کی زیر نظر اشاعت کو "بنگال نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں بنگال سے متعلق چند مفید مقالات کے علاوہ افسانے، ڈرامے، ادبی مضامین اور نظمیں اور غزلیں بھی ہیں۔ مضامین نگاروں کی فہرست میں بعض مشہور ادیبوں اور شاعروں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ ترتیب میں بھی سلیقہ سے کام لیا گیا ہے۔